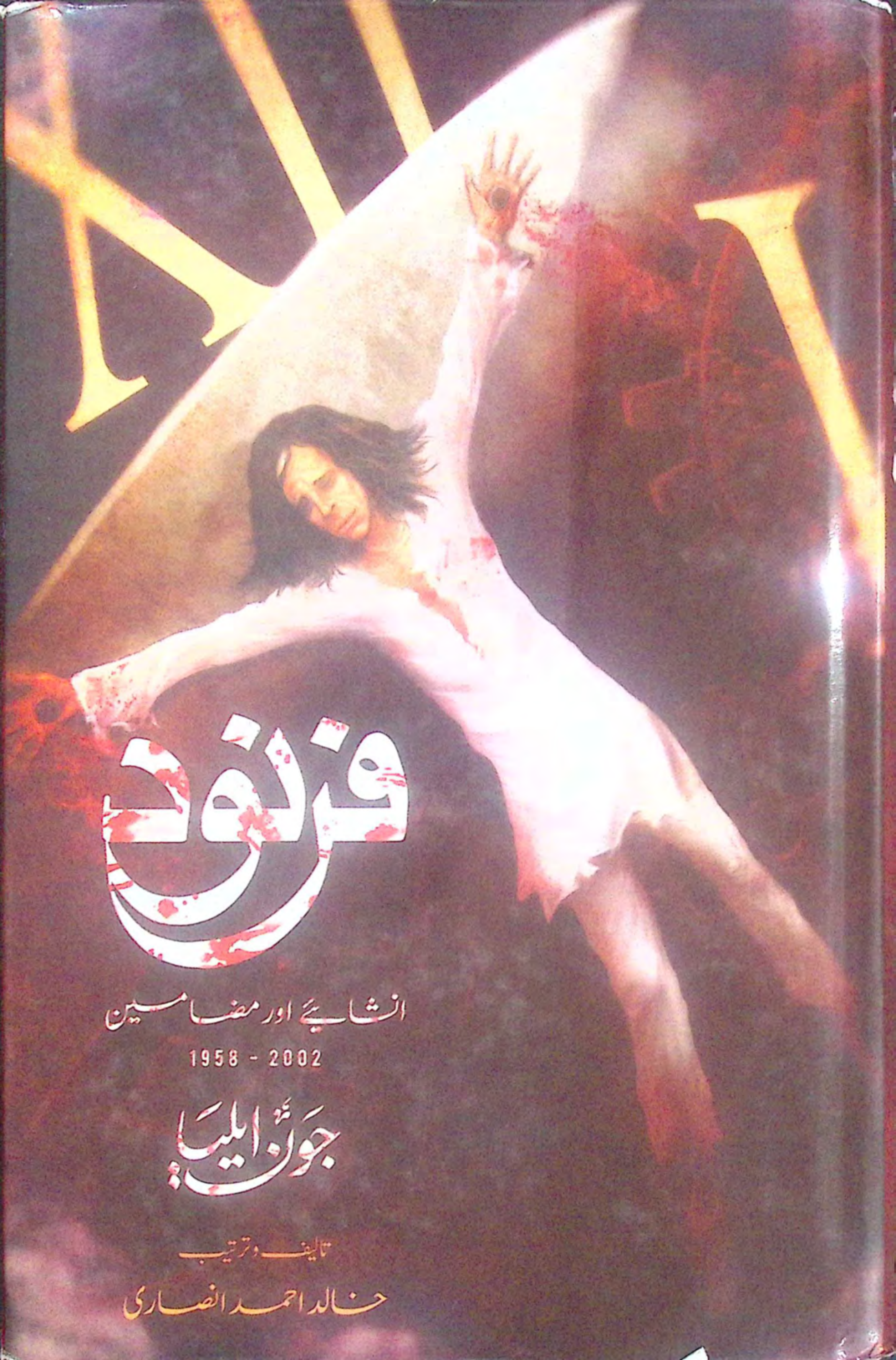


فرنود
انشائیے اور مضامین
1958 - 2002
جون ایلیا
تالیف و ترتیب
خالد احمد انصاری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فرنود

(جون ایلیا کے انشائیے اور مضامین)

1958 - 2002

فرنود

(جون ایلیا کے انشائیے اور مضامین)

1958 - 2002

تالیف و ترتیب

خالد احمد انصاری

الحمد پبلی کیشنز

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انار کلی)۔ لیک روڈ۔ لاہور

☎ 37231490 - 37310944

ھماری کتابیں .....
خُوبصورت ، معیاری اور
کم قیمت کتابیں
تزئین واہتمام اشاعت
صفدر حسین

alhamd_publication@yahoo.com

ضابطہ:-

اشاعت : 2012ء

اشاعت دوم : 2016ء

مطبع : حاجی حنیف پرنٹرز لاہور

تالیف وترتیب : خالد احمد انصاری

سرورق : شاہان زیدی

آرائش وعکاسی : سیّد محسن زیدی

انتساب

معراج رسول

کے نام

تاریخِ روزگارِ فنا لکھ رہا ہوں میں
دیباچۂ وجود پہ لا لکھ رہا ہوں میں

(جون ایلیا)

اِشاریہ

مضامین

انشائیے (اداریے)

ماہ نامہ انشا

عالمی ڈائجسٹ

مجلہ – مشاعرہ 90ء، جشنِ جون ایلیا

سسپنس ڈائجسٹ

ماجرا

جون ایلیا سرتاپا شاعر تھے۔ بچپن سے آخری سانسوں تک انھوں نے سخن کاری وقلم اندازی کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ شاید وہ کوئی کام کر بھی نہیں سکتے تھے۔ علم وحکمت، فکر ودانش کے معاملات ومسائل سے وابستگی ان کے اجداد کا شعار تھی۔ عربی وفارسی، منطق وفلسفہ، مذہب وتاریخ کی تعلیم اورادب وتہذیب کی تربیت انھوں نے بہت جلد اپنی خاندانی روایت کے مطابق مکمل کر لی تھی، لیکن یہ شاعری کی شوریدہ سری تو الگ ایک خاصّہ ہے۔ یہ تو بڑا خلقی اور جبلّی جوہر ہے۔ جون ایلیا گردوپیش میں بہ ظاہر بہ درجہٗ تمام شامل اور نہاں خانے میں اپنی ایک کائنات تخلیق کیے ہوئے تھے۔ عرصے سے ان کا گھرانا کچھ ایسا آسودہ حال نہیں رہا تھا۔ وراثتوں کی عطیہ ٹوٹی پھوٹی حویلیوں کے پاس بان اور چھوٹے بڑے قطعاتِ اراضی سے ہونے والی آمدنی پر قانع اور مطمئن، اپنے رفتگاں کی عظمت کا بھرم قائم رکھے ہوئے، عزت کو امارت اور ہنرِ علم کو اثاثہ سمجھنے والے شرفا، بزعمِ خود اشرافیہ۔

کم سنی میں جون شعر کہنے لگے تھے اور ضلع مرادآباد کی تحصیل، سرزمینِ سبزہ وگل، شہرِ دل براں، مردم آمیز ومردم خیز امروہے کے اطراف میں بپا ہونے والے مشاعروں میں مطلوب ہو گئے تھے۔ اِدھر جوانی کی ابتدا ہی میں سینہ چھلنی ہو چلا تھا۔ دِق کے عارضے نے صبح وشام ویران کر دیے تھے۔

پاکستان بن جانے کے بعد بھی کچھ متغیر ہو گیا۔ چند سال میں اُن کی آبائی حویلیاں مکینوں سے عاری ہونے لگیں۔ تینوں بڑے بھائی پاکستان کوچ کر گئے۔ چھوٹی بہن کے ساتھ ایک جون ہی وہاں رہ گئے تھے۔ بہن کی شادی کے بعد آخر اُنھیں بھی ہجرت زدہ

بھائیوں کے پاس پاکستان کا رُخ کرنا پڑا۔ ایسی حالت میں وہ یہاں آئے تھے کہ زخمی سینے کی اندمالی کے لیے سال بھر تسلسل و تواتر سے علاج ہوتا رہا، پھر کہیں تارِ نفس استوار ہوا۔ بھائیوں نے کچھ اُن کی دِل جمعی، کچھ اُن کے اعتمادِ ذات کے لیے ایک ماہ نامے کی اشاعت کا اجازت نامہ حاصل کر کے اُن کے حوالے کر دیا۔ فروری 58 میں انشا کے نام سے اِس رسالے کا اجرا ہوا۔

برادرم خالد انصاری نے اس مجموعے کے پیش لفظ میں تفصیل سے اپنے مجی کے احوالِ دروں کا احاطہ کر دیا ہے۔ میری خامہ فرسائی بے جا اعادہ ہوگی۔ میرا تعلق جون صاحب سے کچھ خاندانی قسم کا تھا۔ اُن کے پاکستان آنے کے ہفتے ڈیڑھ ہفتے بعد میں بھی یہاں آ گیا تھا اور گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے سب کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ جس وقت انشا کا پہلا شمارہ ترتیب کے مراحل میں تھا تو مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ اداریہ کون لکھے گا۔ دونوں بڑے بھائیوں کا شمار نام ور قلم کاروں میں ہوتا تھا۔ بڑی کش مکش اور تکرارِ بسیار کے بعد فیصلہ ہوا کہ جون ہی یہ معرکہ کریں۔

میرا نہیں خیال، جون صاحب کو امروہے میں باقاعدہ نثر نگاری سے کوئی واسطہ رہا ہوگا، یا یوں کہیے کہ انھیں وقت ہی کب اور کیوں ملا ہوگا۔ انشا سے پہلے اُن کی نثر نگاری کی کوئی شہادت نہیں۔ خطوط کی بات دگر ہے۔ خط تو اُنھوں نے یوں بھی کثرت سے لکھے ہوں گے کہ شاعری کے ساتھ عاشقی بھی اُن کا وظیفۂ جاں تھا۔ گلی کوچوں، کونے کھدروں میں کسی عشق کی جستجو اُنھیں ہر دم مستعد و مضطرب کیے رہتی تھی۔ امروہے میں لڑک پن کے دوست اُن سے سرزد ہونے والی ایک کے بعد ایک عشقیہ واردات کے گواہ ہیں۔ کسی خاص کیفیت میں کبھی وہ خود بھی یاس و حسرت سے داستانیں سناتے تھے۔ اپنی محبوباؤں کے نام بدل دینے کا انھیں شوق تھا۔ ''ف'' سے شروع ہونے والے نام جانے کیوں اُنھیں بہت مرغوب تھے۔

یہ دریچوں، جھروکوں، چلمنوں اور آنگنوں کا زمانہ تھا۔ کہتے تھے ''جانی! کیا وقت تھا۔ سال دو سال گلی کی ریاضتِ طواف کے بعد کہیں دریچوں میں آہٹ اور چلمنوں میں سرسراہٹ کی سرخوشی یا فتح نصیب ہوتی تھی۔ امروہے سے یک سر مختلف یہاں، کراچی میں

بھی یارانِ خلوت اُن کے متعدد 'رازہائے نیاز' سے آشنا تھے' اور کبھی معاون' کبھی شارح' کبھی مشیر کا کام کیا کرتے تھے۔ عاشقی کی شدتوں کے موسم میں جون خوب خوب نظمیں لکھتے تھے' نظمیں' غزلیں۔

ایک نازنیں' ناز آفریں کا ذکر ہے۔ پری زادوں کے قبیلے سے اُس ماہ جبیں کا تعلق تھا۔ جون کی شاعری کی دل دادہ' اور برملا اظہار میں پیش پیش۔ جون جیسے تشنہ دل' ہمہ لحہ آرزومند کو اشارہ غنیمت تھا۔ مستزاد اُس لالہ رُخ کی خوش نگہی و خوش سخنی۔ یہ تیور خاصے دل برانہ' دل ستانہ تھے۔ کون انھیں دل آویزی اور لطفِ خاص پر محمولِ نہ کرتا۔ جون کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو راتیں بے خواب کر لیتا۔

جلد ہی کچھ یوں ہوا کہ اُس نیک اختر کی بات کسی باحیثیت خاندان میں طے ہو گئی۔ اور دیکھتے دیکھتے' نہ جنوں رہا' نہ پری رہی' پری تو سمندروں پار پرواز کر گئی۔ جون اِس تعبیر سے بہت دل گیر ہوئے حالاں کہ ایسے تجربے اُن کے لیے نئے نہیں تھے۔ ان کی تُندی و تُرشی بے جواز تھی۔ بازار کے بھاؤ کا انھیں تھوڑا بہت اندازہ و احساس ہونا چاہیے تھا۔ یہاں ہر سُو پیمانے معیار ہیں۔ ترازوؤں کو اس کارِ خیالاں' کارِ سخناں سے کیا سروکار۔ کبھی سمائی ہو بھی جاتی ہے تو سب سے آخر میں......

پھر انھی دنوں ہوا یہ کہ کراچی کے ادبی رسالے میں شائع ہونے والے ایک افسانے سے منکشف ہوا کہ جون ہی نہیں' کئی اور فرہادِ نامراد بھی اُس ستم پیشہ کے مدّعی تھے۔ ادّعا کسی پذیرائی سے مشروط ہوتا ہے۔ یہ تحریر افسانے کے طور پر شائع ہوئی اور سرگزشت ہی سمجھی گئی۔ دیر تک شہر میں چرچے ہوتے رہے۔ شہر تو نت نئی خبروں کی تاک میں رہتے ہیں۔ جون کی بیزاری و برہمی دیدنی تھی۔ اُنھوں نے غصہ و غم' طنز اور لعن طعن سے آلودہ نظم لکھی۔

چائے خانوں میں تمھارا ذکر ہے

چند سطریں اور یاد آ رہی ہیں

داستانِ شرم کی سُرخی ہو تم
جانِ جاناں' جانِ جاناں' کیا کہوں

تم ! وفا کو قتل کر سکتی ہو تم!
تم کہ تھیں اُمید و ارمانِ وفا
تھے بھلا کھینچے ہی جانے کے لیے
جان ! دامان و گریبانِ وفا
یعنی آنسو ہچکیاں، سب کچھ تھا جھوٹ
تھا عبث ہر عہد و پیمانِ وفا

نظم نے شہر کے فسانہ سازوں، شوشہ طرازوں کو عرصے تک گرمائے، اُلجھائے رکھا۔ بڑی دھوم مچی۔

محبت نامے بڑی حد تک ذات نامے ہوتے ہیں۔ جون صاحب کو خط لکھنے کا بس کوئی موقع ملنا چاہیے تھا۔ خط کی ترسیل شرط تھی۔ کام رانی تو پھر لازم تھی۔ انھوں نے ایسے بے شمار خطوط لکھے ہوں گے۔ کراچی میں ایک صاحبہ کے نام اُن کے خطوط اتفاق سے محفوظ رہ گئے ہیں، ایک ضخیم مجموعے کے بہ قدر۔ لیکن ان کی اشاعت بہ وجوہ مناسب نہیں۔ ان خطوط کا اُردو کے اہم ترین خطوط مجموعوں میں کیا مرتبہ ہے؟ بہتر ہے، فی الحال محفوظ کرلیا جائے۔ اشاعت ہو تو کچھ کہتے ہوئے بھی اچھا لگے۔

مگر یہ عاشقانہ تحریروں کی رقم پذیری اور خالص علمی، ادبی، سماجی موضوعات پر اداریہ نگاری میں بڑا فرق ہے۔ انشا کے لیے پہلا اداریہ لکھتے وقت اُن کے انتشار و اضطرار کا میں شاہد ہوں۔ یہ اداریہ 'انشائیہ' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ایک عذاب مرض سے مہینے پہلے سنبھلنے والے تیس اکتیس سالہ ناتواں نوجوان نے مشّاقی اور پختہ کاری کی مثال کیسی توانا نثر تحریر کی تھی۔ اس اداریے کا ابتدائی حصّہ ملاحظہ ہو۔

''حیاتِ بشر کے تمام مظاہر اور تمام شعائر خود اسی حیاتِ اکبر کے رنگارنگ پہلو ہیں جو تمام کائنات میں جاری و ساری ہیں۔ نہ انسان جامد اور معطل ہے اور نہ اس کی شخصی اور اجتماعی زندگی پر جمود و تعطل کبھی وارد ہوتا ہے۔ یہی حال انسان کی فکری و تخلیقی زندگی کا ہے۔ ہم ہر لمحے کچھ نہ کچھ بناتے اور بگاڑتے رہتے ہیں۔ کون و فساد کا یہ عمل مسلسل ہمارے ہاتھوں

جاری ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر بناؤ ارتقائے بشر کے لیے ضروری ہو اور ہر بگاڑ انسانی ذہن و فکر کے لیے تخریب رساں۔ اس کون و فساد کی نوعیت درحقیقت اضافی ہے......"

شاید کسی کو توقع نہیں تھی کہ مشاعروں میں داد و تحسین سمیٹنے کے لیے ہلکے پھلکے رومانی اور معاملہ بندی قسم کے اشعار پڑھنے والے جون ایلیا محض شاعر ہی نہیں' اس کے سوا بھی بہت کچھ ہیں۔ دو باتیں ایک ساتھ وقوع پذیر ہوئیں۔ اُن کی ادارت میں شائع ہونے والے عام ادبی رسالوں سے مختلف ماہ نامے انشا کی اشاعت کا آغاز اور دوسرے اُن کے اداریے کا پُرعزم لہجہ ولب' اُن کا اعتماد بھرا پیرایۂ بیان۔ قارئین' اُن کے حلقۂ احباب اور متعلقین' سبھی کو رشک آمیز تعجب ہوا کہ ایک شاعر کیسی شان دار' پُروقار نثر پہ قادر ہے' ایسی نثر جو علم' فکر' زبان اور دانش کے بغیر ممکن نہیں۔ پہلے اداریے اور پہلے رسالے کے منفرد' متنوع مضامین کے استقبال سے جون ایلیا کی اداریہ نگاری اور پرچے کی ترتیب و تدوین میں انہماک فزوں ہو گیا۔ ہر مہینے پھر تو اُن کے جوہر کُھلتے گئے۔ وہ طرح طرح کے موضوعات پر جلال آمیز' جمال آفریں لہجے میں اداریے لکھتے رہے اور ان کے بیان کی تیزی اور کاٹ بڑھتی رہی۔ انشا کے پہلے اور سسپنس کے آخری اداریے تک اُن کی نثر کروٹیں بدلتی نظر آتی ہے' اور اس کا شکوہ وہی رہتا ہے جو پہلی مرتبہ تھا۔

ایک اچھی نثر کیا ہے۔ کوئی عامی بھی بآسانی جواب دے سکتا ہے کہ ایک خوش گوار' رواں' سادہ اور دل نشیں نثر' لیکن یہ سادگی و خوش گواری' روانی اور دل نشینی آسان کام نہیں۔ یہ ایک طرف تو عطیہ ہے تو دوسری طرف عشق و ریاضت' موضوع کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ' موضوع پر گرفت اور خود راقم کی شرکت بل کہ شرکتِ قلبی۔ اچھی نثر کے لیے بار بار چھاننا پھٹکنا پڑتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بار بار کی قطع و برید' ترمیم و اضافے سے نثر کی روانی میں شکن آ سکتی ہے۔ امریکا کے نامی گرامی قلم کار جیمس تھربر کی موشگافیوں کی یہی عادت اُنھیں نقصان پہنچاتی تھی۔ گو تھربر نے یادگار تحریریں انگریزی ادب کو نذر کیں لیکن اُن کے ناقد گلہ کرتے تھے کہ بار بار اپنی تحریر پر شک کرنے اور اصلاح کرتے رہنے کی بے کلی سے اُن کی نثر کی روانی اور دل کشی متاثر ہو جاتی تھی۔ اِسے کوئی کلیہ نہ سمجھا جائے۔ بار بار دیکھنے اور

بہ قول شخصے دھوپ دکھانے سے نثر کے جھول یا سقم دُور بھی ہو جاتے ہیں یعنی یہ بھی تو ممکن ہے کہ نظرِ اوّل، دوم، سوم وغیرہ کے بعد عبارت اور چست، رواں، شستہ وشگفتہ، توضیح میں بہتری اور تاثر میں اور شدت آ جائے۔

کسی شخص کی کھنک دار آواز، گونجتا لہجہ اور گفت گو کا جُدا گانہ ڈھب اُسے دوسروں سے ممتاز کر دیتا ہے۔ لکھنے والے کا بھی کچھ یہی ہے کہ کوئی مخصوص نثری انداز اُس کی شناخت بن جاتا ہے۔ اگر یہ دل نواز بھی ہو تو کیا خوب، اِسے عطیہ کہنا چاہیے کہ لفظ اُمڈ رہے ہیں، لفظ بہہ رہے ہیں اور لفظ کسی خاص آہنگ سے اُتر رہے ہیں، غیر شعوری طور سے۔ شعوری کوششوں سے کوئی صاحبِ طرز نہیں بن جاتا۔ اور یہ کیا طرفہ ماجرا ہے کہ صاحبِ طرز ہونے کی فضیلت، قبولیت کی سند بھی نہیں۔ بہت سے صاحبانِ طرز کی تحریریں بڑی گُنجلک اور پیچیدہ بھی ہوتی ہیں۔ اُن کے معانی ومفاہیم سمجھنے کی تگ ودو سے جی گھبرانے لگتا ہے۔

اپنے نفسِ مطلب میں غیر واضح قلم کار کو قلم اُٹھانے سے پہلے اچھی طرح مدّعا کی تطہیر وتقطیر کر لینی چاہیے۔ ورنہ تحریر میں سلوٹیں پڑ جانے کا احتمال رہتا ہے، لُکنت آ سکتی ہے۔ کوئی قلم کار نفسِ مطلب سے ہر طرح آگاہ، صاف اور مطمئن ہے اور بد قسمتی سے متناسب الفاظ کا انتخاب کرنے سے قاصر رہا ہے تو بھی کچھ یہی صورت پیش آ سکتی ہے۔ اسی سبب سے نظرِ ثانی پہ اصرار کیا جاتا ہے۔

کچھ ایسا ہے کہ ایک آدمی، بہ ظاہر ایک نظر آنے والا ایک آدمی نہیں ہوتا کہ وہ مستقلاً ایک حال میں نہیں ہوتا۔ بیک وقت کئی آدمی اُس کے ہاں نہاں ہوتے ہیں اور عیاں بھی ہوتے رہتے ہیں۔ جون ایلیا تو جانے کتنے آدمیوں کا مجموعہ تھے۔ میں نے اِس بے شمار آدمی کے ساتھ کوئی تیرہ برس کے صبح وشام گزارے ہیں۔ اور میں کیا، جو اُن سے بہت قریب رہے ہیں، کچھ وہی جانتے ہیں کہ یوں ایک شایستہ، نفیس طبع اور پُرسکون شخص اپنے کم زور جثّے میں کیسا سمندر اور کیسی آگ لیے پھرتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر شکوہ کناں اور بڑی سے بڑی بات پر بے حسی کی حد تک بے جنبش۔

عیب جوئی، مین میخ کے لیے ہر وقت کوشاں۔ بدگمان ہونے اور بدگمان کرنے میں

یک تا۔ ظاہراً روایت دوست‘ اصلاً روایت دشمن۔ کاہلی بہ درجۂ تمام‘ گھنٹوں الکسانا‘ اینڈتے رہنا‘ خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے اور دوسروں سے کام لینے کے فن میں طاق۔ فرمائشیں کرنے کا قرینہ کوئی اُن سے سیکھے‘ ایسے حسرت ناک انداز میں فرمائشیں کرتے کہ مراد پوری کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔ مجلس باز‘ دوست بدلتے رہنا‘ بہت سے دوست اور شاید کوئی بھی نہیں‘ سب سے بڑے اپنے آپ کے دوست۔ خودنما، قامت کی کوتاہی‘ مجموعی جسمی کم تری پر قدرت کے بخل سے نالاں۔

سنا ہے‘ امروہے میں تھیٹر بھی کرتے تھے‘ تن سازی اور پہلوانی بھی۔ خود کو عجوبہ بنانے کے شائق‘ رات کی شعری نشستوں میں سیاہ چشمے اور گرمیوں میں بالا پوش (اوورکوٹ) پہن کر شریک ہو سکتے تھے‘ کئی بار یہ مظاہرہ کیا بھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بھرے مشاعرے میں کلام سناتے ہوئے کسی شناسا سامع کے نظر آ جانے پر نام لے کر تعجب کا اظہار کریں۔ ”ارے کاشف! تم بھی۔۔۔۔ ہائیں۔۔۔۔“ خیریت بھی پوچھ لیں۔ ”اور وہ اپنی بٹیا کیسی ہے؟ پچھلی مرتبہ اُس نے کیا مرچ قیمہ کھلایا تھا۔ یہ ذائقہ تو اس پر ختم ہے“ کلام چھپوانے میں چور‘ مشاعرے پڑھنے کے دل دادہ‘ اور مشاعرے لوٹ لینے کے حیلوں‘ حربوں کے ماہر۔ یاد نہیں‘ کبھی ہُوٹ ہوئے ہوں۔ علامہ انور صابری کی طرح اُلٹا سامعین کو ہُوٹ کرنے کا ہنر خوب آتا تھا۔ لکھنو کی ایک شعری محفل کا وڈیو جمال احسانی مرحوم کے پاس تھا۔ وہاں واقعی ہُوٹ ہوئے۔ تھے‘ یقیناً پہلی اور آخری بار۔ کچھ یہی ان ہونی تھی کہ جمال نے یہ وڈیو محفوظ کر لیا تھا۔

گفت گو میں انوکھے اچھوتے فقروں‘ نت نئی تاویلوں سے مخاطب کو لاجواب کر دینے میں ملکہ حاصل تھا۔ برجستہ‘ ایسا سفاک‘ جارحانہ فقرے چست کرتے‘ ایسی دلیل وضع کرتے کہ تن بدن میں آگ لگا دے‘ آدمی آئینے سے چہرہ چھپانے لگے۔ کبھی ایسا شوخ و شگفتہ‘ ایسا زاویہ طراز‘ معنی خیز فقرہ کہ آدمی دیکھتا رہ جائے اور داد و تحسین کرتے بھی نہ بنے۔ بڑے بھائی رئیس امروہوی کے حادثاتی انتقال پر لوگ تعزیت کر رہے تھے اور صبر و استقامت کی تلقین کر رہے تھے۔ سنتے رہے اور آہ بھر کے بولے۔ ”ہاں صاحب! ہمیں اپنے بھائی کے قتل کا کوئی تجربہ تو نہیں تھا“۔ کسی دن گھریلو امور کا قصہ چل رہا تھا کہنے لگے۔ ”یار شکیل!

سنتے ہیں' پچھلے زمانوں میں بیویاں مر بھی جایا کرتی تھیں''۔ عبیداللہ علیم کے جنازے پر ایک ہم عصر شاعر بے حال تھے' پچھاڑیں کھا رہے تھے۔ ہر آنے والے سے لپٹ کر بین کرتے۔ ادھر جون صاحب کا بھی بیش و کم یہی حال تھا۔ نماز ہو گئی۔ قبرستان جانے کے لیے میت بس میں رکھ دی گئی تو کسی قریبی دوست نے مکان سے باہر آتے ہوئے غم زدہ ہم عصر شاعر کے بارے میں سرگوشیانہ تبصرہ کیا کہ اس کی حالت تو دیکھی نہیں جاتی۔ جون صاحب سر ہلاتے ہوئے ہونٹ سکوڑ کے بولے۔ ''ہاں جانی! وہ ہم سے بازی لے گیا''۔

ممتاز شاعر اور منفرد فسانہ نگار اسد محمد خان بھی اُن کے یاروں میں شامل تھے۔ ایک زمانے میں دونوں کا ایک دوسرے کے ہاں بہت آنا جانا تھا' اور طرزِ گفت گو مختلف ہوتی۔ اسد بھائی کو گھر میں سامنے دیکھ کر چہکتے۔ ''ارے دیدی! کہاں رہ گئی تھی نامراد' کتنی دیر کر دی۔ کب سے راہ تک رہی ہوں۔ گھڑی دیکھی ہے۔ اب کیا خاک جانا ہوگا''۔

اسد بھائی گویا کچھ اس طرح جواب دیتے۔ ''کیا بتاؤں بھتو! سمجھو' بس خیر ہو گئی۔ خدا جانتا ہے' کس مشکل سے پہنچی ہوں۔ کم بخت بس رستے میں تین جگہ ٹھپ ہوئی۔ معلوم تھا' تجھ سے تو انتظار برداشت ہی نہیں ہوتا۔ گھول رہی ہوگی۔۔۔ تُو تو۔۔۔''

''میں تو ہول رہی تھی''۔ جون کہتے۔ ''زمانہ برا آ گیا ہے۔ جانے کیسے کیسے وہم آ رہے تھے''۔

مذاہبِ عالم کا وسیع مطالعہ اور بے گانگی۔ مذہبی تقریبات میں شرکت سے گریزاں اور ازرہِ وضع شریک بھی۔ بعض اوقات نہایت بے شرم' بے غیرتی کی انتہا تک۔ دوسروں کے معاشقے اور راز و نیاز کی داستانیں سننے کے لیے بے چین' بچوں کی طرح کرید کرید کر پوچھتے اور زچ کر دیتے۔ سکّہ بند ترقی پسند ادیبوں شاعروں کے گروہ سے کوئی مغائرت سی' اور عملاً نظری وابستگی۔ علمِ نجوم' ہندسہ' دست شناسی اور دیگر ماورائی قسم کے علوم' توہمات میں دل چسپی کے علاوہ خیرہ کن سائنسی کرشموں کے معترف اور فکری مسائل پر منطقی استدلال کے مؤید۔ کبھی دعا کرتے نہیں دیکھا۔

دیسی بل کہ دیہی' مشرقی کھانوں کے مشتاق۔ پہناوے میں انگریزی لباس پسندیدہ۔

اُردو کے جاں نثار اور انگریزی میں مکمل دست رس نہ ہونے پر اُداس' خود سے ناراض۔ علاج اور دوا خوری ایک مستقل مشغلہ اور ضرورت بھی۔ آیورویدک' یونانی' ایلوپیتھی' ہومیوپیتھی' نفسیاتی' روحانی' ایکوپنکچر' شمسی شعائیں' ہر طریقِ طب سے استفادہ۔ عام لوگوں کے مشوروں پر قسم قسم کے ٹوٹکے بھی آزمائے جاتے رہے۔ مہینوں تک کچی کلیجی نچوڑ کر عرق پیتے رہے۔ چار مغز' سچے موتی' زعفران' مشک اور سونے کے سفوف سے مرکب جوارشوں کے تجربے بھی کیے جاتے رہے۔ سر پہ انڈوں' کبھی جسم پر سرسوں' زیتون اور روغنِ بادام کی مالش کی جارہی ہے۔ کسی حکیم ڈاکٹر نے نسخے پر ہوالشافی لکھ دیا یا نسخے پر پہلے ہی سے کندہ ہوا ہو تو مطب سے باہر نکلتے ہی بیزاری سے کہتے۔ ''اسے تو خود پر اعتبار نہیں سارا ذمہ تو اس نے خدا پر ڈال دیا ہے''۔

جرم پیشگاں سے رفاقت کا شوق' اُن کی سرگرمیاں اشتیاق سے سنتے' اُن سے خدمت بھی لیتے' اور ممکن ہوتا تو مدد بھی کرتے۔ ناز نخرے' نرگسیت بے پناہ۔ محبوب کی طرف سے پہل ہو جانے کے طلب گار۔ عشق میں سرخ روئی اور لمحاتِ وصل میں فزونیِ نشاط کے لیے ہر کسی سے مشورے۔ بہت لونڈھیارپن' چھچھوراپن قطعی نہیں۔ عذر تراشیوں کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنا نہیں پڑتا تھا' ایسا بے ساختہ' فی البدیہہ عذر کہ شکایت کار شرمندگی سے دوچار ہو۔

آخر میں شراب کی کثرت اور شراب بھی سستی یا جو بھی میسر آجائے۔ ڈاکٹروں کی تنبیہ کے باوجود باز نہیں آئے۔ سب کو یقین دلاتے تھے اور اپنے آپ کو بھی۔ ''بھیا! اللہ پاک کی قسم' ٹیسٹوں میں جگر ایسا صاف آیا ہے جیسے کسی بچے کا ہو''۔ اُن کی قریبی عزیزہ کا بیان ہے۔ ایک رات سردیوں کے موسم میں سلگتی سگریٹ ہاتھ میں تھی۔ بستر پہ آئے تو نیند نے آلیا۔ گھر میں کپڑا جلنے کی بو پھیلی تو افراتفری سی ہو گئی۔ اُن کے کمرے میں جا کے دیکھا تو رضائی جل رہی تھی۔ دھویں سے کمرا اَٹا ہوا تھا۔ وہ تو جانیے' بس خیر ہو گئی۔ دمے کا عارضہ بھی لاحق تھا۔ کبھی کبھی تو بڑی شدت ہو جاتی تھی۔ اِن ہیلر (اسے دم کش کہیے یا تنفس کشا) سے سانسیں بحال کرتے تھے۔ حساب کتاب میں صفر' پیسے پاس رکھنے سے بے نیاز۔ آخری برسوں میں جائداد کی فروخت سے ایک بڑی رقم ملی۔ رقم کی نگرانی کے لیے ایک دوست پر اعتماد کیا اور

کچھ غلط نہیں کیا۔ ایک روز مجھے فون کیا۔ کہنے لگے۔ ''اِن دنوں تجھے کچھ پریشان محسوس کیا ہے۔ مسئلہ کیا ہے؟'' سب رنگ کی عدم تواتری سے اُس وقت میرا ہاتھ واقعی تنگ تھا۔ میں نے جھجک کی تو بولے۔ ''جانی! میری باری بھی تو آنی چاہیے۔ جلدی سے فرماؤ' سرِ دست کتنے میں کام ہوسکتا ہے؟'' انھوں نے دوسرے دن مجھے چیک بھجوادیا۔

غصہ' کینہ' نفرت' حسد' انتقام بہ یک حالت اور بہ یک وقت کئی عام آدمی۔ عام آدمیوں کی تمام خامیوں سے آلودہ اور بے شک خوبیوں سے آراستہ۔ اُن کے تلوّن' تنوع اور تضاد پر کتابیں لکھی جاسکتی ہیں' لکھی جائیں گی۔

یہاں تو صرف چند پہلوؤں کا' وہ بھی اشارۃً احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اُن کے رفقا انھیں جتنا جاننے اور سمجھنے کا دعوا کرتے تھے' جون ایلیا کی شخصی بوقلمونی کا عُشرِ عشیر بھی نہیں تھا۔ وہ ایک بہت مشکل آدمی تھے۔ اُن سے نبھائے رکھنے کے لیے ایک حوصلہ درکار تھا۔ ہم سبھی کو اُن سے سخت شکایتیں' ناراضیاں ہوجاتی تھیں۔ بعض اوقات تو وہ بہت بُرے لگتے تھے، اور اُن سے بے اعتنائی' بے گانگی' انھیں ان کے حال پر چھوڑ دینے کو جی کرتا تھا۔

لیکن اِس واقعے کی صحت سے کون منکر ہوگا کہ وہ تو ایک بہت خاص آدمی تھے۔ ہم سبھی جون ایلیا' ایک عام آدمی کو اُس کی والا گہری' والا نگاہی کی رعایت دینے پر مجبور تھے کہ اُسی روز' دوسرے دن' اگلے ہفتے یا اگلے مہینے وہ ایک فکر انگیز نظم' ایک مرصّع غزل کے ہتھیار سے بے دست و پا کردیتے تھے۔ وہ خود کو کتنا ہی مظلوم و معصوم ظاہر کرتے رہے ہوں' وہ تو بڑے توانا اور بہت دولت مند آدمی تھے۔ اُن کی توانائی اُن کی شاعری اور اُن کی امارت اُن کی شاعری تھی' اُن کا کلام' فصاحت مقام' بلاغت نظام' دل آویز و دل نشیں' خیال آرا' جمال آرا۔ انھوں نے اپنے تیور' اپنے خاص رنگ و آہنگ کی شاعری سے ایک جہاں کو گرویدہ کیا تھا۔ وہ کتنے ہی عجیب اور نا قابلِ فہم رہے ہوں' اصل میں تو وہ محض شاعر تھے۔ باقی تو سارے اُن کے سائے تھے۔

اُن کی شاعری پر نقد و نظر' ستایش و ستائد کا یہ محل نہیں۔ اُن کی شاعری کے بارے میں فیصلے کیے جاچکے ہیں اور کیے جاتے رہیں گے۔ ادب و شعر کا معاملہ بڑا اسقاکانہ ہے۔ کوئی

سفارش اور سند کارگر نہیں ہوتی ۔ اچھا شعر طاقتِ پرواز رکھتا ہے اور بہ ہر سمت' بہ ہر حال گشت و گردش کرتا رہتا ہے۔ ادب و شعر کا ایک معیار تکرارِ افادیت کا بھی ہے کہ بار بار سُننے اور سُنائے جانے کے بعد اثر پزیری ماند نہیں پڑتی ۔ اُردو شاعری کے بحرِ بے کراں میں جس نے پہلے سے کچھ جُدا اور سِوا کیا ہو' بقا پھر اُسی کا نصیب ہوتی ہے۔ ناقدین کے فیصلے ایک طرف' زمانی فیصلے ہی مقتدر ہوتے ہیں ۔ زمانہ کانٹ چھانٹ کرتا رہتا ہے' صرف چند ہی عزت کے سزاوار ٹھہرتے ہیں۔ باقی ایک ہجوم اندھیروں کی نذر ہو جاتا ہے۔

جون ایلیا کی سخن کاری کا مقدمہ ایک جانب اُٹھا رکھیے۔ اُن کا ایک دوسرا رُخ بھی تو ہے۔ ایک باکمال شاعر کی حیثیت سے اُن کی شناخت تسلیم کی جا چکی ہے۔ مگر انھوں نے صرف شاعری ہی نہیں کی' فکر و نظر' خیال و خواب کی یہ نثری تعبیریں بھی تو کچھ ثابت کیا چاہتی ہیں۔

یہ کتاب آخری برسوں میں جون ایلیا کے رفیقِ خاص برادرم خالد انصاری نے مرتّب کی ہے ۔ مجموعہ کلام 'یعنی' کے پیش لفظ میں مجھ بدگُمان نے شبہ ظاہر کیا تھا کہ خالد انصاری نے جون صاحب کا اثاثہ دبوچ کے رکھا ہے ۔ مجھے ہی نہیں' اُس وقت جون صاحب کے بہت سے احباب کو یہی اندیشہ تھا کہ اب جانے کیا حشر ہو' یہ کلام کِن ہاتھوں میں ارزاں ہو' لیکن خالد انصاری' یہ جواں مرد تو جون صاحب سے رفاقت کے دعوا کاروں' سبھی وفا شعاروں سے سبقت لے گیا۔ 'یعنی' کے بعد خالد نے اور تین مجموعے ترتیب دیے' گمان' لیکن اور گویا۔ جون ایلیا کے عشاق کو مژدہ ہو کہ آخری ایک اور مجموعے کی آمد بھی بعید نہیں۔

پھر خالد کو خیال آیا کہ نثر میں بھی تو جون ایلیا نے کچھ الگ کیا ہے۔ اُن کے نثر پارے یک جا کرنے کی ایک کوشش کیوں نہ کی جائے ۔ خالد نے کسی مشن کی طرح یہ بکھری ہوئی تحریریں اکٹھی کرنی شروع کیں ۔ کام یابی کے لیے نیّت کی پاکیزگی چاہیے ۔ یہ ہم خوش گزراں' خوش کلاماں کے بس کی بات نہیں تھی ۔ کتاب میں خالد کی زبانی اِس رُوداد کی گزشتنی تفصیل اور انکسار سے درج ہے۔ واضح ہو کہ ایم ۔ بی ۔ اے سند یافتہ اِس نوجواں کا

روزگاری وسیلہ بینکاری ہے لیکن سرمستوں' سرکشوں کے دشتِ بے اماں پر جی جان سے ملتفت ہے' سواُدھر سے اِدھر بھٹک جاتا ہے۔کئی بار اچھے بھلے مناصب سے بے انصافی کا مرتکب ہو چکا ہے۔سرِ دست تو اپنے مخدومی جون ایلیا کی یادوں پر قناعت ہے اور خوش حالی ہے۔

اِس نثری مجموعے کی قریباً ساری تحریریں ضرورتہً لکھی گئی ہیں۔انشا کے مدیر کی حیثیت سے اداریہ نگاری جون ایلیا کے فرائض کا حصّہ تھی۔ سسپنس ڈائجسٹ کے لیے لکھے جانے والے اداریوں کا اُنھیں باقاعدہ ماہانہ اعزازیہ ملتا تھا۔اُن دنوں اُن کے بہت سے مسائل اس اعزازیے سے آسان ہو گئے تھے۔پھر ایک رسم بن گئی۔ سسپنس کے مدیر و مالک معراج رسول کی درخواست پر' دوراں کی گردش سے باہر آنے کے باوجود اُنھوں نے یہ سلسلہ آخر دم تک برقرار رکھا۔ہم اُن کے حاشیہ نشینوں کا چشم دیدہ ہے کہ اِن کثیر الموضوعات تحریروں پر قلم اُٹھاتے ہوئے اُنھیں کیسی کشاکش' کش مکش سے گزرنا پڑتا تھا۔اِن میں سے شاید ہی کوئی نوشتہ' قلم برداشتہ ہو۔وہ بار بار اُنھیں دیکھتے' نفسِ مضموں کی موثر رسائی کے لیے لفظ چُنتے' لفظ بدلتے' سطروں کی شکنیں ہموار کرتے' عبارتیں تراشتے رہتے۔ہر بار ایسا لگتا کہ پہلی بار کچھ لکھ رہے ہیں۔

ذہنی غُبار ہو یا اعصابی فشار' سفر درپیش ہو یا کوئی اور مصروفیت' ناسازیِ طبع اور ناسازگاریِ حالات میں چند سطری مدّعا پر اکتفا کیا جا سکتا تھا۔حاضری لگا دینے کی اِس عام روش سے وہ ہمیشہ مجتنب رہے کہ ایک عہد اُنھوں نے عزم و جوش' تمام تر استطاعت اور استقامت سے زندگی بھر نبھایا' قلم سے پیمانِ وفا کا۔کبھی ناغہ نہیں کیا۔اُن کی تحریر کے انتظار میں رسالوں کی اشاعت میں اکثر تاخیر ہو جایا کرتی مگر اس تذبذب و تامل سے ہوتا یہ کہ کسی گم شدہ نکتے کی بازیابی ممکن ہو جاتی یا کوئی دُور اُفتادہ دلیل دریچہ فکر میں در آتی۔وزن کچھ بیش ہو جاتا' دریا کچھ اور رواں۔اداریے' انشائیوں کی شکل اختیار کر لیتے۔اِس خامہ کشی کے دوران اُن کا انہماک دیدنی ہوتا تھا اور حسبِ منشا انجامِ کلام کے بعد نشاطِ خاطر کا بھی۔

کہتے تھے' یہ نثر کاری میں بڑی حجت کرنی پڑتی ہے۔یہ شاعری نہیں جو چلتے

پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، ہر حال میں سرزد ہو جائے۔ نثر کے لیے خود کو باندھ کے، جکڑ کے بیٹھنا پڑتا ہے۔ عام طور پر شعرا کی نثر میں ایک دل کشی ضرور ہوتی ہے۔ مثلاً غالب، حالی، محمد حسین آزاد، جوش، میرا جی، ساقی فاروقی وغیرہ۔ جون ایلیا تو شاعر ہی صحرا نوردوں، تیشہ بدوشوں، کج اداؤں، کج کلاہوں، آئینوں اور آئینہ خانوں کے تھے۔ اُن کا جلال آمیز بیانیہ جمال آگیں، خیال و احساس کی تازگی سے عبارت تھا، لپکتا، کھنکتا، دھمکتا، گونجتا لہجہ۔ اِن کی نثر میں ایک آہنگ، شکوہ، یقین، حکم، تمکنت اور خطاب نمایاں نظر آتا ہے۔ اُن کے پیرایۂ اظہار میں ایک جرأت مند، بے باک، ناراض اور تونگر شخص کی تصویر اُبھرتی ہے، اور یقیناً ایک ہم نفس، غم ساز دانش مند شخص کی بھی۔ اُس جون ایلیا کی نہیں جو ہمارے سامنے موجود تھے۔ لوگ کہتے ہیں ہمارا کھیل شاطری جیسا ہے۔ لفظ مہروں کی طرح ہوتے ہیں۔ کون کس تحمل، تدبّر سے مہرے بڑھاتا ہے، مگر صرف شاطری، دانائی، تجربہ، مشاقی اور ارتکاز ہی نہیں، کون کتنا شامل ہے، کس نے اپنی جاں، اپنی انا کا مسئلہ بنا رکھا ہے، کون سینۂ تپاں کا حامل ہے۔ جون ایلیا ہر سمت سے بے نیاز ہو کر بساطِ سخن بچھاتے تھے اور حاصلِ کلام تو ہم تمام کا آزمودہ ہے۔

وہ سراپا اُردو کے آدمی تھے۔ عربی و فارسی کو اُردو کی بیساکھیاں قرار دیا جاتا ہے۔ یہ فرمودہ گراں گزرے تو یوں کہیے کہ اُردو کی زینت و شوکت عربی و فارسی کی مرہون ہے۔ یہی آمیزہ برصغیر کی زبانوں خصوصاً ہندی سے اُردو کو ممتاز کرتا ہے۔ گھر اور مکتب کے عربی و فارسی میں رچے ماحول کی اساس پر استوار جون ایلیا کے تخلیقی سفر کی ابتدا ہوئی تھی۔ کچھ اپنے رجحان اور ترجیحات کی بات بھی ہوتی ہے۔ سنا ہے، سات سال کی عمر میں انھوں نے پہلا شعر کہا تھا۔ اُس کے بعد یہ سلسلہ کہیں نہ رُکا۔

خیال کی تاثیر زبان و بیان کی ہنرکاری سے دو آتشہ ہو جاتی ہے۔ ہمارے دور میں اُردو لسانیات کے معدودے چند حضرات میں جون ایلیا کا شمار کیجیے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اُن کی نثر سے اُردو کی بہت سی یادگار کتابوں کا پیرایۂ بیاں تازہ ہو جاتا ہے۔ عہد نامۂ عتیق، باغ و بہار، عذرا اور عذرا کی واپسی، تائیس، غبارِ خاطر وغیرہ، اور بہت سے نثر نگار یاد آتے ہیں، رجب علی بیگ سرور، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد، مولوی عنایت اللہ دہلوی،

حبیب اشعرؔ، نیاز فتح پوری وغیرہ جیسے نادرِ روزگار قلم کار۔

بے شمار دُنیوی مظاہر کی طرح اُردو نثر کے معیار کے پیمانے بھی ہر عہد میں بدلتے رہے ہیں۔ کسی ایک عہد میں زبان و بیان اور اُسلوب کا کوئی طور مستند و معتبر سمجھا گیا ہے تو دُوسرے دور میں کوئی اور طرزِ ادا/ ادائے نگارش خاص و عام میں مرغوب خاطر ہو جاتی ہے۔ وجوہ متعدد ہو سکتی ہیں کہ ایک ہی قسم کے طریق اظہار سے طبیعت اُکتا جاتی ہے۔ بہت سے لفظ کثرتِ استعمال سے بے وقعت بل کہ متروک ہو جاتے ہیں، نئے لفظ نئے اسالیب اُن کی جگہ لے لیتے ہیں۔ لفظوں کے معانی و مفاہیم بھی زمانے کی گردش میں کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔ اُردو نثر بھی گزرتے وقت میں رنگ بدلتی رہی ہے۔ 82 سال پہلے اردو نثر کی تاریخ پر ایک اہم تحقیقی کتاب شائع ہوئی تھی۔ ادوار کا تعین مشکل ہے لیکن محقق جناب احسن مارہروی نے چھ ادوار میں اُردو نثر تقسیم کی ہے۔ 1398ء سے شروع ہونے والے پہلے دور کی پہلی اور واحد کتاب حضرت خواجہ گیسو دراز کی تصنیف 'معراج العاشقین' کا چند سطری اقتباس ملاحظہ ہو۔

''انسان کے بوجنے کوں پانچ تن، ہر ایک تن کوں پانچ دروازے ہیں، ہور پانچ دربان ہیں۔ پیلا تن واجب الوجود مقام اُس کا شیطانی۔ نفس اُس کا اتارہ یعنی واجب کی آنک سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ حرص کے کان سوں غیر نہ سنا سو۔ حسد نک سوں بدبوئی نہ لینا سو۔ بغض کی زبان سوں بدگوئی نہ لینا سوں۔ کینہ کی شہوت کوں۔ غیر جا گا خرچنا سوں پیر طبیب کامل ہونا۔ نبض پچھان کو دوا دینا۔''

مصنف کی تشریح سے معانی کی تشویش دُور کی جا سکتی ہے۔

(بوجنا' بُوجھنا' سمجھنا۔ کوں' کو۔ ہور' اور۔ پیلا' پہلا۔ آنک' آنکھ۔ سوں' سے۔ دیکھنا سو' دیکھنا۔ نک' ناک۔ جا گا' جگہ۔ بدبُوئی' بدبُو۔ پچھان' پہچان)

1930ء میں شائع ہونے والی کتاب 'نمونۂ منثورات' میں 532 سال کے عرصے پر محیط کروٹیں بدلتی مختلف تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ہر تحریر کسی عہد میں رائج بول چال کا پرتو ہوتی ہے، اور قصہ مختصر، ہر عہد میں بولے اور لکھے جانے والی زبان کے ڈھب ڈھنگ

بدلتے رہتے ہیں۔شروع اور درمیانی اَدوار کے یہ مضامین دیکھیے تو ایک انقلاب نظر آتا ہے۔

احسن مارہروی کی کتاب کی اشاعت کو 82 سال گزر چکے ہیں ۔کتاب میں منقسم ادوار کے اعتبار سے 1930ء کے بعد کا دور اُردو نثر کا ساتواں دور قرار دیا جاسکتا ہے۔اِس مدّت میں بھی اُردو نثر کی وضع قطع میں تغیر کا عمل کم نہیں رہا ہے۔ازل سے یہ پہلو بدلنا'رُخ بدلنا تو زندگی کا شیوۂ رندانہ ہے۔گزشتہ کی طرح آیندہ بھی زبان کے نو بہ نو پیرائے سامنے آتے رہیں گے ۔نئے عہد کے کارواں کی رفتار پچھلے وقتوں سے خاصی تیز ہے۔رسل و رسائل کی حیرتی کرشمہ سازیوں سے کرۂ ارض سکڑ رہا ہے۔انگریزی اور دیگر زبانوں کی رفاقت سے اُردو کے خال وخط بھی بدل رہے ہیں ۔اِس صورتِ حال پر رنج وملال کا کیا محل ہے کہ یہ کوئی نیا وتیرہ نہیں ۔سکوت و جمود سے زندگی کو کب کوئی علاقہ رہا ہے۔ایک جبلت جس کا ذکر گِنائے جانے والی مسلّمہ جبلتوں میں نہیں کیا گیا' آدمی کے تلوّن متنوّع کی جبلت ہے۔آدم زادوں کو یک سانی راس نہیں آتی ۔ثقہ اور جیّد روایت شعار بھی روایت کے پنجرے میں ایک دن پھڑ پھڑانے لگتا ہے۔ہر پُرانی نسل' نئی نسل کو مشکوک سمجھتی ہے اور مآلِ کار شرمندگی سے دوچار ہوتی ہے اور ہر نئی نسل بھول جاتی ہے کہ وہ آسمانوں سے نہیں اُتری ۔سب کچھ گزشتہ سے پیوستہ ہے اور سلسلے کی کڑی ہے ۔ہر نئی نسل' پُرانی نسل کی کوتاہیوں کی تلافیاں کرتی 'سزائیں کاٹتی رہتی ہے اور علم و ہنر کا ترکہ نصیب ہو تو زندگی سے اَٹکھیلیاں بھی خوب کرتی ہے' پیش رووں کے عظیم ترکے کی سرمایہ کاری سے آنے والے کل بھی محفوظ کر لیتی ہے۔

مناسب ہوگا' یہ بحث یہیں تک رہنے دی جائے کہ اِن سماجیاتی مسائل سے خلطِ مبحث کا امکان ہے۔

وہ جو کہتے ہیں' کچھ ایسا ہی تھا ۔جون ایلیا کی عمر بیس پچیس سال کی عمر تک ٹھیر سی گئی تھی۔ پچاس ساٹھ سال کی منزلوں میں کچھ اضافہ ہوا ہو تو چند سال کا۔پینتیس برس کے ہو گئے ہوں ۔آخر تک لڑکے بالوں کی طرح مچلتے پھڑکتے رہے۔نومبر 1970ء میں طویل

دوراہیے کی رسم وراہ کے بعد شادی ہوئی' بچے ہوئے' دو بیٹیاں' ایک بیٹا۔ الگ ایک گھر بھی بس گیا تھا۔ بچے بھی بڑے ہوئے اور ایک مدّت بعد علاحدگی کی الم ناکی پیش آ گئی۔ پھر اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے اور سنجیدگی سے ایک اور شادی کی ضد کرنے لگے۔ شناساؤں میں شاید ہی کوئی بچا ہو جسے اُنھوں نے شادی کے لیے کہیاں نہ ماری ہوں۔

ستائیس سو گز پر پھیلی' کلیم میں ملی ہوئی' چار بھائیوں کی مشترکہ مِلک وسیع کوٹھی کی فروخت سے اچھا حصہ مل گیا اور ایک میعادی کھاتے میں جمع کرانے سے معقول ماہانہ رقم ملنے لگی تو شادی کی فرمایش میں شدّت آ گئی۔ ستم یہ کہ شرائط بھی فرمایش میں شامل تھیں' یہ ناک نقشہ' یہ رنگ رُوپ۔ شادی کی تو حسرت ہی رہی۔ آخری برسوں' خُردوں میں ایک قریبی عزیز' روشن خیال اور سعادت مند علاّمہ علی کرار نقوی کے ہاں آخر اُنھیں پناہ مل گئی۔ علاّمہ نے سائباں مثال اپنے بزرگ' اُس پیچیدہ آدمی کا بڑا خیال رکھا۔ جون صاحب بھی اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے کا تاثر دینے لگے تھے۔ مگر اُنھیں تو کہیں اور جانا تھا۔ علاّمہ کے گھر میں ایک شام حالت دگرگوں ہوئی۔ علاّمہ کا کہنا ہے کہ انھوں نے قابو میں کرنے کی بڑی کوشش کی۔ قبلۂ عالم کو بڑی جلدی تھی۔ ویسے ہی وہ بہت بے قرار مٹّی کے بنے ہوئے تھے۔ آئے دن ہٹ دھرمیاں کرتے' تماشے کرتے رہتے تھے۔ اُس شام پھر ایسا کیا کہ سب دیکھتے رہ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مٹّی ہو گئے۔

ادب و شعر سے علاّمہ کا گدازِ واقعی ایک مستزاد جوہر ہے۔ شکر ہے' جون صاحب کے نہایت مختصر ساز و سامان کتابوں اور مسوّدوں کی قدر دانی' پاس بانی وہ کسی امانت کے طور کرتے رہے۔ اُن کی معاونت سے بعد کے کئی شعری مجموعوں کے لیے غیر مطبوعہ کلام دست یاب ہو سکا اور اس نثری مجموعے کے لیے بھی کاغذوں میں دبی کئی نایاب تحریروں تک رسائی ممکن ہو سکی۔

تاریخ' تنقید' مذہب' مختلف علوم و فنون' افسانہ' داستان' طنز و مزاح' اخباری خبر وغیرہ' اِنھیں نثر کی اصناف کہیے تو تمام اصناف میں لفظ تو ایک ہی ہوتے ہیں' سانچے جدا جدا'

لفظ برتنے کا سلیقہ الگ الگ۔ خالص علمی موضوعات کی داستانی انداز سے مطابقت نہیں ہوتی۔ داستاں نگاری کا اپنا ایک طور ہے۔ رسالوں اور اخباروں کے اداریے تحریر کی متانت چاہتے ہیں لیکن سانچا کوئی بھی ہو' موضوع کتنا ہی علمی و فکری۔ انشا پردازی کی گنجایش ہر جگہ ہوتی ہے۔ انشا کی پُرکاری سے تحریریں جاذب نگاہ ہو جاتی ہیں اور متن میں وزن ہو' فکر کا عمق بھی تو موثر و موقر۔ تحریریں یادگار بن جاتی ہیں۔

جون ایلیا نے اِن تحریروں میں انشا کے حُسن کا اہتمام رکھا ہے تو متن کی توانائی کا التزام بھی۔ سو یہ تحریریں خاصے کی تحریریں بن گئی ہیں' ان کا زور واثر کچھ اور ہو گیا ہے۔

اِردگرد کوئی نظر نہیں آتا جس نے جون ایلیا کے زمانے میں اور اُن کے جانے کے بعد اُن جیسے انشائیے تخلیق کیے ہوں۔ کوئی ہو تو جون ایلیا کے نیاز مند اُس قیصرِ قلم' خسروِ سخن کی بارگاہ میں باریابی اور بندگی کے لیے مضطرب ہیں۔

وما علینا الا البلاغ

شکیل عادل زادہ عفی عنہ

خون تھوکنے کے کارخانے میں

جون ایلیا کے مجموعۂ کلام ''شاید'' کی پشت پہ موجود کتابوں کی فہرست پر نگاہ ڈالتے ہوئے میں نے جون بھائی سے سوال کیا۔ ''جون بھائی! یہ ''فرنود*'' کون سی کتاب ہے؟''

''جانی! یہ میرے اُن انشائیوں کا مجموعہ ہے جو ''انشا''، ''عالمی'' اور ''سسپنس'' میں لکھتا رہا ہوں۔''

''لیکن جون بھائی! یہ مجموعہ شائع تو نہیں ہوا؟''

''جلد شائع ہو جائے گا' وہ دیکھ!'' انھوں نے ایک باکس فائل کی طرف اشارہ کیا اور ہمیشہ کی طرح بہلاتے' آس دلاتے لہجے میں بولے۔ ''سب تیار ہے' بس ''یعنی'' آجائے' اس کے بعد اگلی کتاب فرنود ہی ہوگی۔''

یہ تھا فرنود سے میرا پہلا تعارف' اس وقت میں نے یہ گمان بھی نہیں کیا تھا کہ اُن کا یہ نثری شاہ کار مرتب کرنے کا اعزاز مجھے ملے گا۔

اس عظیم و پراسرار' ہر شے سے وابستہ و پیوستہ اور ہر شے سے بے نیاز کائنات' اس خون تھوکنے کے کارخانے میں' زندگی وقت کی تھرتھراتی' تیز دھار سوئیوں تلے' اپنے نامعلوم اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے رواں دواں ہے۔ وقت کے اس جابرانہ بہاو میں زندگی ہر کسی کو اپنے طور سے آزماتی اور حسبِ استطاعت خون تھکواتی ہے۔ زندگی کے غیر متوقع وار سنبھلنے کا موقع ہی کب دیتے ہیں کہ کوئی یہ سوچ بھی سکے' زندگی کو اسی طور اور اُسی انداز میں

فرنود: دلیل' سند' مثال

پر کھے اور برتے جیسے کہ زندگی اسے برتتی آ رہی ہے لیکن ان ہونیاں بھی گویا اسی نظام کا حصہ ہیں۔ شاذ و نادر سہی، پر اِس کارخانے میں کبھی ایسا کوئی فرد بھی وارد ہو جاتا ہے جو اس بہاو کی مخالف سمت بہتے ہوئے، زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے برتنے کی کوشش کرے۔ اس جرم کی پاداش میں جہاں فرد مصلوب و معتوب ہوتا ہے تو اس جرأت کے عوض زندگی اسے ایسے گوہروں سے بھی نوازتی ہے جو نسلِ انسانی کے لیے سرچشمۂ حیات بن جائیں۔

جون ایلیا بھی ایسے ہی ایک سرکش و باغی کا نام ہے، جس نے یہ نظام اپنے زاویوں سے اُلٹا کر دیکھا اور پرکھا، خود خون تھوکا تو زندگی سے بھی تھکوایا اور اپنی شاعری اور نثر کے ذریعے دانش و حکمت کے ایسے جواہر پارے بکھیرے جو غور و فکر کرنے والے ذہنوں کے لیے سامانِ فکر و خیال ہیں۔

کارخانے میں خون تھوکنے کے
اپنی روزی کما رہا ہوں میں

جون ایلیا

جون ایلیا 30 ویں دسمبر 1956 کو امروہہ، ہندستان سے روانہ ہو کر یکم جنوری 1957 کو کراچی، پاکستان آئے تھے۔ اُن کے بڑے بھائی رئیس امروہوی، سید محمد تقی اور سید محمد عباس پہلے ہی پاکستان ہجرت کر چکے تھے۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور اکلوتی چھوٹی بہن سیدہ شاہِ زناں نجفی شادی کے بعد اپنے گھر کی ہو چکی تھیں۔ ایک نوکر کے ساتھ جون صاحب کا اپنے آبائی شہر میں رہنا اب کسی طور مناسب نہ تھا۔ یہ صورتِ حال ان کی بہن نے محسوس کی اور جون کو اپنے بھائیوں کے پاس جانے پر رضامند کر لیا۔ پاکستان میں رئیس صاحب ''روزنامہ شیراز'' (سابق ہفت روزہ) کے نام سے ایک اخبار نکال رہے تھے۔ سید محمد عباس بھی اسی اخبار کے بعض امور دیکھا کرتے تھے۔ سیّد محمد تقی ''روزنامہ جنگ'' کے مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے تھے۔ غرض پاکستان کے ادبی حلقوں میں رئیس امروہوی اور سیّد محمد تقی نہ صرف جانے پہچانے جاتے تھے، خاصا اثر و رسوخ بھی رکھتے تھے۔ خاص طور پر رئیس امروہوی، شاعری، کالم نگاری، خصوصاً قطعات اور اپنی

مقناطیسی شخصیت کے باعث ایک بڑا حلقہ اسیر کیے ہوئے تھے۔ ایسے حالات میں جون ایلیا کا کراچی کے علمی و ادبی حلقوں میں متعارف ہونا ایسا دشوار ثابت نہ ہوا اور جہاں خود کوئی شخص اپنے اندر علمی توانائی اور قاتلانہ سخن آرائی کی صلاحیت رکھتا ہو وہاں یہ تعارف رسمی و واجبی حیثیت رکھتا ہے۔ جلد ہی وہ شہر کی ادبی نشستوں میں بلائے جانے لگے اور اُن کا شمار ممتاز ادبی شخصیت کے طور پر ہونے لگا۔ دونوں بڑے بھائیوں (رئیس امروہوی اور سیّد محمد تقی) نے چھوٹے بھائی (جون ایلیا) کی آبادکاری کے لیے ایک اُردو ماہ نامے انشا کا اجازت نامہ حاصل کیا۔ اس رسالے نے فروری 1958 میں اشاعت کی ابتدا کی۔ یہ ادبی سے زیادہ علمی رسالہ تھا۔ اس میں شامل سائنسی، تاریخی، فلسفیانہ مضامین و تراجم اس زمانے میں موجود دیگر رسائل سے انشا کو جدا کرتے تھے۔ جون صاحب رسالے کا اداریہ خود تحریر کیا کرتے تھے جسے سنجیدہ ادبی حلقوں میں توجہ سے پڑھا جاتا تھا۔ وہ اس وقت اِن اداریوں میں ممنوع سمجھے جانے والے موضوعات زیرِ بحث لائے اور نہ صرف ملکی بل کہ بین الاقوامی سطح پر بھی کہیں کوئی ناانصافی یا بڑا واقعہ رونما ہوا، انھوں نے قلم اُٹھایا اور کیا انشا پردازی کی۔

خواتین کے ایسے مسائل جن پر کسی کو لب کشائی کا حوصلہ نہ تھا، ان پر فرضی نسوانی نام ذہینہ سائیکی کے نام سے لکھا اور اپنی بے باک تحریر سے خواتین میں بیداری کی ایک نئی بحث چھیڑ دی۔ افروز آتشید کے نام سے کئی کہانیاں لکھیں اور کچھ تراجم کیے۔ جون صاحب کے وضع کیے ہوئے مختلف اچھوتے نسوانی ناموں کے فریب میں اُن کے کئی احباب نے ان خیالی یا قیاسی خواتین سے عشق فرمایا، بعد میں حقیقت آشکار ہونے پر خجلائے بھی۔ اس کے علاوہ ان کی کچھ تحریریں آدم افرودیسی کے نام سے انشا میں کئی جگہ نظر آتی ہیں۔

انشا، تجارتی اعتبار سے اوسط درجے کی کامیابی حاصل کر سکا، جو عموماً ادبی پرچوں کا مقسوم ہے۔ بدلتے تقاضوں کے پیشِ نظر اس کی ہیئت 1964 میں تبدیل کر دی گئی۔ شروع میں اس کا نام انشا اور ضمنی لوح کے طور پہ عالمی ڈائجسٹ لکھا گیا، بعد میں صرف عالمی ڈائجسٹ رہ گیا۔ اب اس رسالے میں علمی کے پہلو بہ پہلو ادبی موضوعات بھی شامل کیے جانے لگے اور عام دل چسپی کے دیگر سلسلے بھی۔ اسی زمانے میں جون کا زاہدہ حنا سے

عشق پروان چڑھااور 1970 میں شادی پر منتج ہوا۔1963 سے 1968 تک سربراہِ شعبۂ تحقیق و تصنیف کی حیثیت سے اسماعیلی ایسوسی ایشن میں جز وقتی وابستگی رہی' یہاں انھوں نے کئی اہم کتابیں تصنیف کیں اور تراجم کیے۔غالباً یہی وجہ ہوگی کہ 1964 سے 1968 تک کا عالمی ڈائجسٹ جون صاحب کے اداریوں سے محروم نظر آتا ہے۔1969 میں عالمی ڈائجسٹ سے دوبارہ رشتہ استوار ہوا۔اب ان کی تحریر انشا کے دور والی تحریر سے مزید پختہ ہو کر مکمل ''جون ایلیائی'' تحریر بن چکی تھی۔1971 کی پاک بھارت جنگ' سقوطِ ڈھاکا' اُردو سندھی مسئلہ غرض اس اکھاڑ پچھاڑ کے دنوں میں' واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے قلم کا حق ادا کر دیا۔ان انشائیوں کا شعلے اُگلتا جلالی لہجہ جون کے جذبات اور کرب کا عکاس ہے۔

1968 تا1976' جون ایلیا نے اُردو ترقی بورڈ میں ''لغتِ کبیر'' کی تدوین کے سلسلے میں کام کیا۔1976' وہ اپنی بہن سے ملنے ہندستان چلے گئے۔1971 کی پاک بھارت جنگ کے بعد جون پہلے پاکستانی تھے جنھیں ہندستان کا ویزا ملا۔اُن کی عدم موجودی میں عالمی ڈائجسٹ کا اداریہ زاہدہ تحریر کرتی رہیں۔وطن واپسی کے بعد بھی عالمی ڈائجسٹ کے لیے جون کی تحریریں خال خال ہی دکھائی دیتی ہیں۔80 کی دہائی میں صحت کے کچھ مسائل ہو گئے اور وہ عالمی ڈائجسٹ کے معاملات سے دُور ہوتے چلے گئے۔1988 میں بے شمار اُردو جریدوں کی طرح عالمی ڈائجسٹ بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

1990 میں پہلے مجموعۂ کلام ''شاید'' کی اشاعت کے بعد جون کا بہ حیثیت شاعر ظہورِ ثانی ہوا' وہیں اُن کی نثر نگاری بھی' یوں کہیے کہ ایک نئے عہد میں داخل ہوتی ہے۔اس مجموعے نے ایک طرف شعری حلقوں میں اُن کا مرتبہ معین کیا' دوسری جانب اس کے دیباچے ''نیازمندانہ'' کی نثر نے بڑے بڑے نثر نگاروں کو حیرت سے دوچار بھی کیا۔اسی زمانے میں سسپنس ڈائجسٹ کے مدیرِ اعلیٰ اور جون صاحب کے دوست معراج رسول نے اُن سے اپنے ڈائجسٹ کے لیے انشائیے لکھنے کی درخواست کر دی۔اس درخواست کے کئی مقاصد تھے۔یعنی' ایک دوست کو بیماری کے خول سے باہر لا کر مصروف رکھنا' اُس کی علمی و

فکری اُفتاد سے استفادہ اور ساتھ ہی کچھ مالی معاونت' حالاں کہ جون صاحب کا مزاج اورتحریری خاصہ سسپنس ڈائجسٹ کی تحریروں سے مطابقت نہیں رکھتا تھا مگر انھوں نے معراج رسول کی یہ پیش کش بہ وجوہ قبول کر لی اور 1989 سے نومبر 2002 تک اُردو ادب کو ایسے نثری فن پارے عطا کیے جن کا شمار بلاشبہ اُردو کی اچھوتی اور شاہ کار تحریروں میں کیا جانا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں' اُردو ادب معراج رسول صاحب کے اس فیصلے کا تا ابد مقروض رہے گا۔ چناں چہ واجب ہے' میں اس مجموعے کا انتساب جناب معراج رسول کے نام کروں۔

جون ایلیا کی پاکستان آمد سے لے کر ان کی وفات تک کے پُر ماجرا اور ہنگامہ خیز 44 سال' 1958 سے 2002 کے دوران لکھی گئیں شائع شدہ، بکھری ہوئی نثری تحریروں کا یہ مجموعہ فرنود آپ کی نذر ہے۔ اسے جون کا ''عجائب خانہ نثر'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں دنیا کے نام ور فلسفی اُن کے ہم مشرب دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی شاعری سے واقفیت رکھنے والے اس میں موجود دوئی اور ہم کلامی کے اسرار آمیز عنصر سے بہ خوبی آشنا ہیں۔ یہی عنصر ان کی نثر میں بھی بہ کمال موجود ہے' جو 90 کی دہائی میں ''نشیان'' کے نام سے سامنے آتا ہے۔ یونانی خط و خال' اُلجھے ہوئے لمبے بالوں والا یہ نوجوان' جون ایلیا کا ہم زاد ہے' جو ہر وقت انسانی اقدار کی پامالی پر فسردہ و رنجیدہ یا طیش و غیظ کی حالت میں رہتا ہے۔ اس کی آمد ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے اور جب کبھی وہ جون ایلیا سے ہم کلام ہوتا ہے تو ان دونوں کی فلسفہ و منطق سے مرصّع گفت گو قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ انشائیہ ''خیر اعلیٰ کی قسم'' میں نشیان کی جون ایلیا سے گفت گو کے دوران کھائی گئی ''فرنود کی قسم'' سے ہوتا ہے۔ اسی نشیان کے نام سے جون ایلیا نے اپنے رسالے انشا کے مختلف شماروں میں کتابوں پر تبصرے بھی کیے' اس سلسلے کا عنوان ''یاں وہی ہے جو اعتبار کیا'' رکھا گیا تھا۔ یہاں میں جون صاحب کی پیش آگہی کی رمز بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو وجدان کا آدمی قرار دیا' اِس کا ثبوت ان کا نومبر 2002 میں لکھا گیا اور دسمبر 2002 میں شائع ہوا انشائیہ ''تمھارا شکریہ'' ہے۔ اس انشائیے میں وہ

رقم طراز ہیں کہ "جون ایلیا مر گئے"۔ واحسرتا! یہ ان کی آخری تحریر ہے جو انھوں نے اپنی وفات سے کچھ دن قبل سپردِ قلم کی۔ یہ تحریر پڑھنے والوں کو چونکاتی ہی نہیں، بہت کچھ سوچنے پر بھی مجبور کر دیتی ہے۔

"گویا" کی اشاعت کے دنوں، 2008 میں لاہور جانا ہوا تو صفدر بھائی (الحمد پبلی کیشنز کے بانی وروحِ رواں) نے جون صاحب کا نثری کام مجموعے کی شکل میں لانے کا مشورہ دیا اور ہاتھ میں چند انشائیے تھماتے ہوئے بولے: "بھائی! یہ کام تمھی کر سکتے ہو۔"

لاہور سے واپسی پر جب تلاش کا عزم کیا تو پہلا خیال اس باکس فائل کا آیا، جس میں بہ قول جون صاحب "سب تیار" تھا۔ آخری دنوں میں وہ اپنے ایک قریبی عزیز (رشتے کے بھتیجے) علامہ کرّار نقوی کے گھر آ کے بس چکے تھے، یہیں اُن کا انتقال ہوا۔ میں نے علامہ صاحب سے اس فائل کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا۔ "چچا جون کے ایک نیازمند اُن کے انتقال کی رات وہ فائل اپنے ساتھ لے گئے تھے۔" یہ سُن کر احساس ہوا کہ سلسلہ اتنا آسان نہیں اور کام کو یک سر نئے سرے سے شروع کرنا ہوگا۔ بہ ہر طور، کتابوں کے ٹھیوں کا رُخ کیا۔ انشا اور عالمی ڈائجسٹ ہر جگہ ناپید تھے۔ سسپنس ڈائجسٹ کہیں ملے تو محض چند سال پرانے۔ اُدھر سے مایوس ہو کر غالب لائبریری کا رُخ کیا، جہاں انشا اور عالمی ڈائجسٹ کے بیش تر رسائل موجود تھے۔ یہاں بھی حالت حوصلہ افزا نہ تھی۔ چند رسائل دیمک کھا گئی تھی تو کچھ اتنے بوسیدہ تھے کہ فوٹو اسٹیٹ تک ممکن نہ تھی، اور یہ بھی ہوا کہ جون ایلیا پر تحقیق کے جُویا فوٹو اسٹیٹ کی زحمت سے بچنے کے لیے رسالوں کے اوراق ہی اُڑا لے گئے تھے اور بعض کتابوں کے انبار میں ایسے خلط ملط کہ ڈھونڈنا محال تھا۔ غرض جیسا بھی، جو بھی، وہاں سے دست یاب ہو سکا، اُسے فوٹو اسٹیٹ یا پھر خود نقل کر کے حاصل کیا۔ اسی طرح کچھ شمارے بے دل لائبریری، رنگون والا لائبریری اور مشفق خواجہ ٹرسٹ سے دست یاب ہوئے۔

ایک شام حضرت علامہ کرّار نقوی کے ہاں حاضری دی تو میری خوش بختی، وہ خسروانہ موڈ میں تھے اور شاید میرے منتظر، فرمایا "ارے تم سے جس فائل کا تذکرہ ہوا تھا، وہ تو میرے

پاس نکل آئی' یہ دیکھو!۔'' انھوں نے ازراہِ نوازش فائل میرے حوالے کردی۔ میرا مسئلہ حل ہوگیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طور علامہ صاحب سے اپنی ممنونیت کا اظہار کروں۔ اس فائل میں انشا اور عالمی ڈائجسٹ کے زمانے کے کئی ایسے اداریے موجود تھے جو تمام تر کوشش کے باوجود یہ عاجز حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔

سسپنس ڈائجسٹ کے سلسلے میں خیال تھا کہ بات اتنی پرانی نہیں' شاید رسالے کے دفتر سے مدد مل جائے پر وہاں معلوم ہوا کہ دفتر کی بار بار منتقلی کی وجہ سے رکارڈ منتشر ہوگیا ہے' صرف تین سال کے شمارے میسر ہیں' اور اب وہ جون صاحب کے پرانے انشائیے نام بدل بدل کر شائع کرتے رہتے ہیں۔ اس مایوس کن صورت حال میں ہمارا اضطراب دیکھتے ہوئے ادارے کے منیجر پرویز بلگرامی صاحب نے سسپنس ڈائجسٹ میں جاری سلسلے ''دیوتا'' کے ایک مداح الیاس صاحب سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا۔ بتایا گیا کہ اُن کے پاس سسپنس ڈائجسٹ کا تمام رکارڈ موجود ہے۔ فون پر الیاس صاحب نے کہا کہ آج کل ان کا قیام سانگھڑ میں ہے اور وہ ایک ہفتے بعد کراچی آئیں گے تو اس سلسلے میں کچھ مدد کرسکیں گے۔ الیاس صاحب نے اپنی بات کا پاس رکھا اور ایک ہفتے بعد سسپنس ڈائجسٹ کے شمارے مہیا کردیے۔ اس تمام تلاش و جستجو میں جون صاحب کے عاشق اور مداح جوہر عباس نے خوب ساتھ دیا۔ الیاس صاحب' نسیم احمد (غالب لائبریری)' محمد زبیر (بے دل لائبریری) اور ناصر جاوید (مشفق خواجہ ٹرسٹ) کے تعاون کے بغیر یقیناً یہ کام ادھورا رہ جاتا۔

1990' دبئی میں جون ایلیا کے جشن کے موقع پر شائع ہونے والے دستاویزی مجلّے سے بھی انشائیے شامل کیے گئے ہیں۔ یہ مجلّہ ڈاکٹر خورشید عبداللہ نے مجھے عطا کیا تھا۔ ''محاسبہ'' اور ''افسوس'' بھائی عقیل عباس جعفری کے عنایت کردہ انشائیے ہیں' انھوں نے نیشنل لائبریری (اسلام آباد) میں موجود عالمی ڈائجسٹ کی فائل کی بھی نشان دہی کی۔ قائد اعظم یونی ورسٹی' اسلام آباد میں زیرِ تعلیم عاشقِ جون' خرم عباس مگسی کے توسط سے ان کے دوست علی رضا قریشی نے مطلوبہ فائل کی نقول حاصل کرکے مجھے ارسال کردیں۔

اب اگلا مرحلہ ان 250 سے زائد حاصل شدہ تحریریں پڑھنے اور مرتب کرنے کا تھا۔ دوستوں کا خیال تھا' سب کچھ شائع کر دیا جائے لیکن میں سوچتا تھا' اُن کی صرف نمایندہ یا ایسی تحریریں مرتب کی جائیں جو کسی خاص پس منظر یا واقعے کا احاطہ کرتی ہوں۔ ڈائجسٹ کی ضرورت پوری کرنے والی تحریریں نظر انداز کرنا مناسب سمجھا گیا۔ تمام تحریریں ماہ و سال کے حساب سے ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے' سوائے انشائیے "رائگاں" (سسپنس' جنوری 1996) کے' جسے سوانحی خاکہ کہا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی انشائیہ بعد میں کسی اور نام سے کسی دوسرے رسالے میں شائع ہوا تو اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

میری خوش قسمتی کہ مجھے جون صاحب کے مزاج شناس و رازداں' شکیل بھائی (شکیل عادل زادہ) کی رفاقت کا موقع مِل گیا۔ انھوں نے کمال شفقت سے اس مجموعے کی ترتیب و تالیف' صحتِ زبان و تاریخی حوالہ جات کے سلسلے میں میری رہ نمائی کی اور جون بھائی سے محبت کا حق ادا کیا۔ میرے لیے شکیل بھائی کی سرپرستی باعثِ اعزاز ہے۔

جون ایلیا کی شخصی وحشت عیاں کرتا' اس مجموعے کا غیر روایتی سرورق شاہان زیدی کے ہنر اور جون شناسی کا آئینہ دار ہے۔ محسن زیدی نے اس کتاب کے دیگر آرایشی پہلوؤں پر توجہ دی اور آخری وقت تک جزئیات کا خیال رکھتے ہوئے تراش خراش کا عمل جاری رکھا۔ ارشد اظہار صدیقی کی لاجسٹک سپورٹ تمام مراحل میں شاملِ حال رہی۔ سید سلیم ساجد (کرن بھائی)' ڈاکٹر مسرور پیرزادہ اور ناصر طفیل نے پروف ریڈنگ کی سخت دشوار مہم میں میرا ساتھ دیا۔ اُردو لسانیات کے اُستاذ ہمارے محترم رفیق نقش نے فارسی اشعار کی صحت کے سلسلے میں رہ نمائی فرمائی۔ جوانِ عزیز' محمد عرفان نے دُھندلائی تحریریں' متروک یا دُور افتادہ الفاظ پڑھنے اور سمجھنے میں میری معاونت کی۔ جون ایلیا سے محبت کرنے والے ان تمام حضرات کا شکریہ لازم ہے۔

آخر میں اپنے شفیق استاد اور محترم دوست سید مجتبیٰ حسین کاظمی (کنٹری کارپوریٹ ہیڈ، بینک اسلامی) کا خصوصی طور پر شکریہ کہ انھوں نے دورانِ ملازمت مجھے وہ ماحول میسّر

کیا کہ میں پوری ذہنی یکسوئی سے یہ کام کرنے کے قابل ہو سکا۔ ملازمت کے روایتی تقاضے ادا کرتے ہوئے شاید میں سوچتا اور ارادے باندھتا ہی رہ جاتا۔

تاریخ، فلسفہ، منطق، زبان و ادب کا یہ نثری خزانہ مرتب کرتے وقت احساس ہوا کہ ہم کیسے یکتا و یگانہ شخص کے ادبی ورثے کے امین ہیں۔ ہو سکے تو میری کوتاہیاں نظر انداز کرنے کے بجائے ان کی نشان دہی ای میل اور فیس بک کے ذریعے کرتے رہیے گا۔

خالد احمد انصاری
Email: jaun_elia@yahoo.com
Facebook: www.facebook.com/Jaun.Elia.legend
Website: www.jaunelia.com

رائگاں

وہ خوابوں اور خیالوں کا شہر تھا۔ مصحفی کی نوجوانی اسی شعر انگیز شہر کی گلیوں سے گنگناتی ہوئی گزرا کرتی تھی۔ میں اُتر پردیش (یوپی) کے اسی مردم خیز شہر امروہے میں پیدا ہوا۔ اس شہر کا تقریباً ہر چوتھا آدمی اگر جَم تَم شاعر نہیں تو تک بند ضرور تھا۔

شاعری، تاریخ دانی، علم و ادب کا سلسلہ ہمارے خاندان میں پشت ہا پشت سے چلا آرہا ہے۔ میرے بابا علامہ سیّد شفیق حسن ایلیا چار بھائی تھے اور چاروں کے چاروں شاعر تھے۔ کیسے سوختہ بخت لوگ تھے وہ بھی! ماشاءاللہ میرے دادا، پردادا اور ان کے دادا اور پردادا بھی شاعر واقع ہوئے تھے۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے چاروں طرف صبح سے شام تک شاعری، تاریخ، ادب، مذاہب عالم اور فلسفے کا دفتر کھلا ہوا تھا اور بحث و مباحثے کا ایک عجب ہنگامہ گرم پایا۔ میں نے اپنے گھر میں دنیا کے معاملوں زندگی کے خارجی مسئلوں اور عملی حقیقتوں کے بارے میں کبھی کوئی گفت گو ہوتے ہوئے نہیں سنی۔ میں ایک ایسے ماحول میں پروان چڑھا جسے مادّہ اور شکم سے کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ سروکار بھی نہیں تھا۔ جب مجھ میں شعور پیدا ہوا تو اپنے ماحول کی یہ صورتِ حال دیکھ کر میرے دل میں ایک ان جانی اُداسی کی کیفیت نے جنم لیا جو وقت کے ساتھ ساتھ گہری ہوتی چلی گئی۔ میرے اندر جو اذیت ناک احساس پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ہمارا گھر کسی بھی لمحے تباہ ہوسکتا ہے اور یہ کہ آیندہ ہمیں شاید بھیک مانگ کر زندگی گزارنا پڑے گی۔ عجیب بات ہے کہ اس زمانے میں بھی ایک اصیل بوا نورن اور دو ملازم ہمارے

گھر کی خدمات انجام دیتے تھے لیکن یہ محض ایک بہت ہی بوداڈراما تھا جس کے ہدایت کار بابا نہیں بل کہ ابا جی (ہمارے بڑے تائے) تھے۔ لیکن میں اپنے گھر کی یک سر بے بنیاد معاشی صورتِ حال کا ذمے دار اپنے بابا علامہ سیّد شفیق حسن ایلیا کو قرار دیتا ہوں۔ خدا اُن کی مغفرت کرے۔ ان کی علمی، تخلیقی اور تحقیقی قلندری نے میرے معصوم ذہن کو ایک عذابِ الیم میں مبتلا کر رکھا تھا۔

بابا بدنصیبی سے کئی علوم کے جامع تھے اور کئی زبانیں جانتے تھے یعنی فارسی، عربی، سنسکرت، عبرانی اور انگریزی۔ موصوف نے اُردو اور فارسی کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی شاعری فرمائی اور عربی میں ایک کتاب ''سوط العذاب'' لکھی۔ علمِ ہیئت (Astronomy) سے انھیں غیر معمولی شغف تھا۔ علمِ ہیئت کے مسائل سے متعلق رصدگاہ گرینچ (Greenwich Observatory) انگلستان کے ماہرین اور مشہور فلسفی برٹرینڈ رسل اور جنوبی ایشیا کی ایک رصدگاہ کے ڈائریکٹر مسٹر نرسیان سے ان کی خط کتابت ہوتی رہتی تھی۔ میں جو اُن کا قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کر رہا ہوں تو وہ اس لیے کہ ان کا ذکر حقیقت میں ان کا ذکر نہیں، میری سوختہ بختی کا ذکر ہے۔ اگر وہ میرے باپ نہ ہوتے، ان کے بجائے کوئی اور شخص کوئی اور معقول اور دنیا شناس شخص ہوتا تو میں آج وہ نہ ہوتا جو ہوں۔ میں ایک کامیاب ترین، صحت مند اور قابلِ رشک آدمی ہوتا اور میری زندگی عیش ہی نہیں بل کہ بے حد شان دار عیاشی کے ساتھ گزر رہی ہوتی۔

میری پیڑھی کے افراد کی اکثریت نے بھی اپنی قدیم ترین خاندانی عادت اور روایت کے مطابق علم، ادب اور شاعری سے اپنا رشتہ استوار کیا جیسے رئیس امروہوی، کمال امروہوی اور انٹرنیشنل فلاسفی کانگریس کے رکن فلسفی، علامہ محمد تقی۔ یہ سب کے سب کامیاب رہے، نام وری حاصل کی۔ مگر میں غریب اول جلول قسم کا آدمی بُری طرح مارا گیا اور وہ اس لیے کہ میں ان سب سے زیادہ خیال پسند، مثالیہ پرست (idealist) اور اپنے رجحانات میں بے حد ضدی واقع ہوا تھا۔

میں نے سب سے پہلا شعر اس وقت کہا جب میں سات آٹھ برس کا تھا۔ وہ شعر یہ ہے۔

چاہ میں اس کی تمانچے کھائے ہیں
دیکھ لو سرخی مرے رخسار کی

میں نے اسی زمانے میں پہلا عشق، پہلا نا کام عشق کیا۔ لیکن عرضِ شوق نہیں کی اور وہ یوں کہ عرضِ شوق یا اظہارِ عشق کو میں ایک بہت ہی بے ہودہ اور غلیظ حرکت سمجھتا رہا ہوں۔ یہاں مجھے اپنا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

حُسن سے عرضِ شوق نہ کرنا حُسن کو زک پہنچانا ہے
میں نے عرضِ شوق نہ کر کے حُسن کو زک پہنچائی ہے

عرضِ شوق یا اظہارِ عشق میرے گمان یا مزاج کے مطابق ایک بہت ہی ذلیل کام ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اظہارِ عشق جیسی حرکت کا ارتکاب کرنے کی ذلت اُٹھانے سے اس لمحے تک محفوظ رہا ہوں۔

اگر آپ کامیاب عشق کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو ایک غیر عاشق اور عاقل قسم کا آدمی ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی ایک بہت عیار اور گھٹیا شخص بھی۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے ''عشق'' کے ساتھ ''کرنا'' کا لفظ کیوں استعمال کیا۔ عشق تو ہو جاتا ہے، کیا نہیں جاتا۔

بھائیو! یہ ایک بحث طلب بات ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ عشق ہوتا نہیں ہے کیا جاتا ہے اور چوں کہ میں ایک شاعر ہوں اور عشق کے موضوع پر سب سے بڑی سند شاعر ہوتے ہیں اس لیے آپ کو میری بات ماننا پڑے گی۔ اگر عشق کے موضوع پر مجھے یعنی ایک شاعر کو سند نہیں مانا جائے گا تو کیا کسی آئی جی، ڈپٹی کمشنر اور ان سے بھی اُوپر جا کر کسی کمانڈر انچیف، وزیر اعظم یا کسی صدر مملکت کے قول کو سند مانا جائے گا۔ یہ لوگ تو یک سر نا بجا طور پر وہ خوش نصیب ترین اور عام قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو نہ عشق کرتے ہیں اور نہ جنھیں عشق ہوتا ہے۔ ان سے تو، ان ظالموں اور قاتلوں سے تو عشق لڑایا جاتا ہے۔ ہر بد ذوق، بے شعور، بد باطن اور

دنیادار حسینہ انھی لوگوں کو پٹانے کی فکر میں رہتی ہے۔

میں نے حسین عورتوں کو عام طور پر بے ضمیر اور لالچی پایا ہے۔ کم سے کم مجھے تو کسی باضمیر اور بے غرض حسینہ سے ملنے کا آج تک موقع نہیں ملا۔ میں نے کوئی اور کارنامہ انجام دیا ہو یا نہ دیا ہو مگر ایک کارنامہ ضرور انجام دیا ہے اور وہ یہ کہ میں نے حسین لڑکیوں کو بُری طرح ذلیل کیا ہے۔ اس لیے کہ مجھے ان سے میر تقی میر اور اپنے معصوم ترین بھائی حضرت عبدالعزیز خالد کا انتقام لینا تھا۔ مجھے اُمید ہے کہ میرا ''خدائے غیور'' مجھے اس کا اجر دے گا۔

مجھے لکھنا تھا اپنے بارے میں مگر لکھنے لگا ان کے بارے میں جن کی صرف ہجو کہنی چاہیے بل کہ میں نے تو واقعی ان کے بارے میں ہجو کہی بھی ہے۔

میری شہرت کا آغاز اپنے شہر کی نوخیز نسل کی حد تک ڈراما کلب کے ایک ''ڈائریکٹر'' اور سب سے مقبول ایکٹر کی حیثیت سے ہوا۔ اس ڈراما کلب کا نام ''جون ڈراما کلب'' تھا۔ اس وقت میری عمر تیرہ چودہ برس کی تھی۔ میں نے اسی زمانے میں خود بھی ایک ڈراما لکھا تھا جس کا نام ''خونی خنجر'' تھا۔

جب میرا لڑک پن تھا تو میرے کچھ دوستوں نے مجھے ایک مصرع دیا اور کہا کہ اس پر تین شعر کہو۔ وہ مصرع مولانا صفی لکھنوی کی اس غزل کا تھا جس کا مطلع یہ ہے۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

دراصل اس دوران میرے بڑے بھائی حضرت رئیس امروہوی کی زود گوئی کا ذکر ہو رہا تھا چناں چہ وہ میری زود گوئی کا امتحان لینا چاہ رہے تھے۔ بہ ہر حال میں نے اس مصرع پر ایک منٹ میں تین شعر کہے۔ ان میں سے ایک یاد رہ گیا ہے۔

غلط راستے پر چلی جا رہی ہے
ذرا بڑھ کے دنیا کو آواز دینا

اب میں اپنی نام نہاد تعلیم کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ میں انتہائی بدشوق اور کدڑ قسم کا طالب علم رہا ہوں۔ میں عام طور پر تھرڈ ڈویژن میں پاس ہو پاتا تھا بل کہ میں

دوسرے درجے میں پاس نہیں ہوا تھا بل کہ مجھے ترقی ملی تھی یعنی پروموٹ کیا گیا تھا۔ میں ایک ابوجہل قسم کا لڑکا تھا اور اپنی جماعت کے شوقین اور محنتی (اپنی زبان میں پڑّھو) لڑکوں کو ہمیشہ نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ مجھے کورس کی کتابوں سے اللہ واسطے کا بیر تھا اس لیے میں کورس کی کتابوں کے بجائے دوسری کتابیں پڑھتا تھا اور دن رات پڑھتا تھا۔

بہ ہر حال میں نے اُردو میں ایم اے کیا۔ فارسی میں الہ آباد بورڈ سے کامل (یعنی فارسی کا سب سے آخری امتحان) کیا۔ فلسفے کا ''فاضل'' ہوں۔ امروہے کے دیوبندی مسلک کے دارالعلوم ''دارالعلوم ملاّنہ'' سے عربی ادب، منقولات اور معقولات میں فارغ التحصیل ہوا۔ مولانا مفتی محمود، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا محمد طاسین اور مولانا محمد عمر میمن نے بھی اسی دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے شیعہ دارالعلوم سیّدالمدارس سے ''سیّدالافاضل'' کی سند حاصل کی۔ میں نے پہلوی اور عبرانی زبانیں بھی سیکھیں بل کہ یوں کہنا چاہیے کہ سیکھ کر بھلا دی ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں کیتھولک عیسائیوں کی سیمنری میں جو گلشن اقبال میں واقع ہے، اٹلی کے ایک عالم سے میں نے عبرانی ازسرنو سیکھی اور آفرین بر حافظۂ من کہ دوبارہ تقریباً بھلا دی۔ میری بے خوابی کی عذاب ناک بیماری نے تو مجھے اُردو تک یاد نہیں رہنے دی۔ میں نے اُردو کے علاوہ فارسی، پہلوی اور عربی میں بھی شاعری کی ہے، جس کی کوئی بھی ادبی حیثیت نہیں ہے۔ خود میری کون سی ادبی حیثیت ہے؟

میں نے ۱۹۵۸ء میں ایک علمی ادارے ''ادارہ ذہنِ جدید'' کی بنیاد رکھی اور ایک علمی ماہنامہ ''انشا'' جاری کیا جس نے چند سال بعد ترقی یا تنزل کر کے ''عالمی ڈائجسٹ'' کا تخلص اختیار کیا۔ ۱۹۶۳ء میں مجھے آغا خانیوں کے عالمی تحقیقی اور علمی ادارے میں کام کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس زمانے میں مجھ سے ایک عالی مرتبت دوشیزہ شدت کے ساتھ عشق فرمارہی تھیں۔ اس لیے میں ہر کام بہت لگن کے ساتھ کرتا تھا۔ میں نے اس ادارے میں تاریخِ عرب قبلِ اسلام، مذاہبِ عالم، تاریخِ اسلام اور مسلم فلسفے خاص طور پر باطنی فلسفے پر متعدد کتابیں ترجمہ اور تالیف کیں۔

۱۹۶۸ء میں ایک نامناسب صورتِ حال کے سبب حضرت جوش ملیح آبادی نے اُردو

ڈویلپمنٹ بورڈ سے لاتعلقی اختیار کر لی۔ بورڈ کے ناظمِ اعلیٰ جناب شان الحق حقی نے مجھے اُردو کے ''لغتِ کبیر'' کی تدوین کا فرض انجام دینے کے لیے مدعو کیا۔ وہاں میں نے ۱۹۷۶ء تک کام کیا۔ اس وقت تک اُردو لغتِ کبیر بنیادی طور پر مکمل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد نہ وہاں حقی صاحب رہے اور نہ مولانا قائم رضا نسیم امروہوی مرحوم۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ اوّل تو میں نے کچھ کیا نہیں یعنی کوئی قابلِ ذکر کام اور اگر کیا بھی تو سچ بات یہ ہے کہ کرنے کی طرح نہیں کیا۔ میں اپنی نہاد اور اُفتاد میں ایک یک سر جاہل آدمی ہوں۔

میں نے ۱۹۷۷ء سے لے کر ۱۹۸۹ء تک ایک عذاب ناک زندگی گزاری۔ اس دوران میں ہر لحہ وجود کے جہنم میں جلتا رہا۔ ۱۹۸۸ء میں عالمی ڈائجسٹ بند ہو گیا۔ اس کے کچھ دن بعد برادرِ عزیز معراج رسول مجھے ملے۔ یہ ہماری پہلی ملاقات نہیں تھی لیکن میرے اعتبار سے یہ ایک بے حد اہم ملاقات تھی۔ معراج مجھے وقت کے اس موڑ پر ملے جہاں میرا تباہ شدہ وجود لڑکھڑا کر گرنے والا تھا۔ انھوں نے مجھے سنبھال لیا۔ معراج رسول نے میری ذاتی اور قلمی زندگی میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔

میرے مجموعے کی اشاعت میں ناقابلِ قیاس تاخیر ہوئی۔ اسے ۱۹۶۱ء میں چھپنا تھا مگر ۲۹ برس بعد ''شاید'' کے نام سے ۱۹۹۰ء میں چھپا۔ اس کا سبب بہت اذیت ناک ہے۔ جب میں اپنی کسی بھی تصنیف کی اشاعت کے بارے میں سوچتا تھا تو مجھے احساسِ جرم ہوتا تھا اور اس کا سبب یہ ہے کہ میرے لڑکپن کے زمانے میں ایک دن موسمِ سرما کی سہ پہر کے وقت میرے بابا مجھے شمالی کمرے میں لے گئے۔ نہ جانے کیوں وہ بہت اُداس تھے۔ میں بھی اُداس ہو گیا۔ وہ مغربی کھڑکی کے برابر کھڑے ہو کر مجھ سے کہنے لگے کہ تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔ میں نے پوچھا ''بتایئے بابا! کیا وعدہ؟''

انھوں نے کہا ''یہ کہ تم بڑے ہو کر میری کتابیں ضرور چھپواؤ گے''۔

میں نے کہا: ''بابا میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب بڑا ہو جاؤں گا تو آپ کی کتابیں ضرور ضرور چھپواؤں گا''۔

مگر میں بابا سے کیا ہوا یہ وعدہ پورا نہیں کر سکا' میں بڑا نہیں ہو سکا اور میرے بابا کی

تقریباً تمام تصنیفات ضائع ہو گئیں۔ بس چند متفرق مسودے رہ گئے ہیں۔ یہی وہ احساسِ جرم ہے جس کے سبب میں اپنے کلام کی اشاعت سے گریزاں ہی نہیں، متنفر رہا ہوں۔ دن میں ایسا وقت بہت کم گزرتا ہے جب مجھے اپنی شاعری پسند آتی ہو۔ میری تخلیقی زندگی کا زیادہ حصہ اپنے انکار میں گزرا ہے بل کہ اب تو میں یہ سوچتا ہوں کہ میں شاعر ہوں بھی یا نہیں۔ مجھے لکھنا آتا بھی ہے یا نہیں۔ بہ ہر حال میرے بارے میں ایک بات یقینی اور حتمی ہے اور وہ یہ کہ میں ایک نکما اور ناکام ترین آدمی ہوں۔ میں بُری طرح رائگاں گیا۔ میں بھلا آپ کو کیسے بتاؤں کہ میں کس بُری طرح رائگاں گیا۔

آپ کو سالِ نو مبارک ہو۔ لیجیے شعر ہو گیا۔

عشرتِ حالِ نو مبارک ہو
آپ کو سالِ نو مبارک ہو

سسپنس، جنوری 1996

مضامین

بارے میں حق کے اور حقیقت کے باب میں
رُودادِ لکنتِ فصحا لکھ رہا ہوں میں

جون ایلیا

اسلامی فکر اور تخلیقی شعور

عصرِ جدید کے ممتاز عالم و دانش ور ڈاکٹر علی سامی نشار نے تاریخ فکرِ اسلامی پر ایک گراں قدر کتاب ''نشاۃ الفکر الفلسفی فی الاسلام'' تصنیف فرمائی ہے۔ زیرِ نظر مضمون اسی کتاب کے مقدمے کا ترجمہ اور خلاصہ ہے۔ جون ایلیا۔

وہ کون سا طریقہ ہے جس کے ذریعے اسلام کی ذاتی فلسفیانہ فکر کو متعین کیا جا سکے؟ اور اُن مباحث میں جو اَب مسلمانوں کی میراث بن چکے ہیں اُن کے اپنے ادراک اور شعور کی نشان دہی کی جا سکے؟ اُمتِ اسلامی اور ثقافتِ اسلامی کا وہ خاصّہ کیا ہے جو اُن کے حقیقی جوہر کو واضح کرتا ہو؟ اس سلسلے میں اسلامی فلسفے پر بحث و نظر کرنے والے جدید و قدیم علما نے بحث و نظر کے جو طریقے اختیار کیے ہیں ان میں غیر معمولی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض مسلمان مبصّرین اور مستشرقین نے مسلمانوں کے ذاتی تفکر اور اختراعی شعور سے یکسر انکار کیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ اسلامی فلسفہ، یونانی اور لاطینی فلسفہ سے علیحدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ اپنی جزئی تفصیلات کے ساتھ سر بہ سر لاطینی اور یونانی فلسفے ہی سے عبارت ہے۔

برخلاف اس کے بعض دوسرے اصحاب مسلمانوں کی فکری جدت اور علمی انفرادیت کے قائل ہیں۔ اس قبیل کے چند اہل الرائے یہ رائے رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی فلسفیانہ ژرف نگہی، بالغ النظر اور مجتہدانہ عظمت کو مسلمان فلاسفہ کی تصنیفات کے بجائے متکلمین اور علمائے اُصول و عقائد کی مجلدات میں۔ تلاش کرنا چاہیے۔ عصرِ جدید کے مشہور فاضل مصطفیٰ عبدالرزاق نے اپنی کتاب ''تمہید فی تاریخ الفلسفہ الاسلامیہ'' میں ایک نیا طریقِ بحث اختیار کیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی ذاتی فکر کو اسلامی علوم و

معارف کے اس ذخیرے میں ڈھونڈنا چاہیے جو فلسفۂ یونان کی ترویج واشاعت سے پہلے ہی فراہم کرلیا گیا تھا۔ کیوں کہ اسلامی حلقوں میں فلسفۂ یونان کے شائع ہوجانے کے بعد تو مسلمان مفکرین نے اسلامی فکر وثقافت اور اس نو وارد، واجنبی فلسفے کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش شروع کردی تھی۔

مندرجہ بالا رائے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کی ایک تخلیقی فکر بھی تھی جس کا آغاز خود انھوں نے ہی کیا تھا۔ نیز یہ کہ اُن کی فکر میں ایک ایسی تنظیم تھی جو موجدانہ ومجتہدانہ شعور کے بغیر ممکن نہیں۔ فاضل موصوف نے اپنے اس طریقِ بحث ونظر کے ذریعے غور وفکر کا ایک نیا رُخ متعین کیا ہے 'ایک نیا رُخ' ایک نئی سمت جو ثقافتِ اسلامی کی مکمل ''تعبیر'' ہے۔ ایسی تعبیر جو اسلامی ثقافت کے ایک خاص اور امتیاز آفرین مزاج کو نمایاں کرتی ہے اور وہ ہے علمِ اُصولِ فقہ۔

اسلامی فلسفے کے اصلی رُخ کو جاننے کے لیے ان نظاماتِ فکر کو سامنے لانا ضروری ہے جن کو مسلمانوں میں ''دائرۂ معارف'' کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ نظاماتِ فکر یہ ہیں:

۱- **مشائیت:** جو نوفلاطونیت سے کافی متاثر ہوگئی تھی۔ مسلمان اربابِ فلسفہ نے مشائیت ہی کو منضبط ومنظم کرنے کا فرض انجام دیا تھا اور اسی کی روشنی میں یونان کے مختلف مکاتب کو باہم متحد ومتفق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ حالاں کہ یہ کوشش رائگاں گئی۔[۱]

۲- **تصوف:** یونان کے مختلف ملے جلے فلسفیانہ نظریات، مشرقی افکار، نوفلاطونی خیالات اور صابی عقائد پر مشتمل ہے۔ بعد کو اس میں مسیحی اور اسلامی عقائد و خیالات شامل ہوگئے۔

۳- **علمِ کلام:** مذہب کو عقل سے ثابت کرنے کا علم ہے۔

۴- **علمِ اُصولِ فقہ:** ان قواعد کے علم کو کہتے ہیں جن کے ذریعے تفصیلی دلائل کے ساتھ احکامِ شرعی کا استنباط کیا جاسکے۔ اس علم کو طریقِ فقہ اور منطقِ فقہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

۱..... ڈاکٹر نشار کا اشارہ خاص طور پر ابونصر فارابی کی ''الجمع بین الرائین'' کی طرف ہے جس میں افلاطون وارسطو کے اختلافِ افکار کی تاویلات کرکے ان دونوں کو متفق الخیال ثابت کیا گیا ہے۔ جون ایلیا۔

اسلام اور فلسفۂ یونان (مشائیت)

اسلام اور فلسفۂ یونان کے درمیان اسی دن جنگ چھڑ گئی تھی جس دن یونانی فلسفہ دنیائے اسلام میں داخل ہوا۔ اس جنگ کی آگ سلگتی رہی۔ یہاں تک کہ جس وقت غزالی نے فلاسفۂ اسلام یعنی فارابی، ابن سینا اور ابنِ رشد کی تکفیر اور ان کی ''اسلامی'' نسبت سے انکار کیا تو اس آگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔

اسلام اور فلسفہ۔ ان دونوں کا مزاجی اختلاف ظاہر ہے۔ اسلام ایک نظامِ حیات ہے اور فلسفہ ''وجود'' کی مطلق و مجرد بحث کا نام ہے۔ اسی لیے فلسفہ مسلمانوں میں آ کر فنا ہو گیا۔ فلسفے کے اس زوال و فنا میں قرآن کا ''دباؤ'' بھی کارفرما تھا۔

یونانی ذہن کو مجرد فلسفیانہ مباحث اور خالص مابعدالطبیعی اور وجودیاتی دقائق و غوامض سے خاص رغبت رہی ہے۔ مسلمان مفکرین میں کوئی ایک شخص بھی اس پر امر پر قادر نہ ہو سکا کہ ان مباحث میں کوئی مسئلہ اپنی طرف سے ایجاد کرے۔

بعض مسلمان فضلا اور مستشرقین نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فلاسفۂ اسلام کے یہاں کچھ نہ کچھ فکری جدت ضرور پائی جاتی ہے اور یہ کہ ان کے افکار میں ایسا امتیازی انداز موجود ہے جس کے ذریعہ اسلامی فلسفے کو یونان فلسفے سے جدا کر کے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ اس رائے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ فلسفۂ اسلامی اور فلسفۂ یونان میں شدید مطابقت پائی جاتی ہے۔

جو مسلمان مصنفین اور مغربی مبصرین مسلمان فکر کے غیر تخلیقی ہونے پر مصر ہیں ان میں فرانسیسی دانشور ارنسٹ رینان (Ernest Renan) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس نے سامی نسل (جس میں عرب مسلمان اور یہودی دونوں شامل ہیں) کی تحلیلِ عقلی کرتے ہوئے اس نسل کے فکری نقص و قصور کا ذمے دار ایک مخصوص مزاج اور ذہنی اُفتاد کو ٹھہرایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سامی ایک خاص دائرے میں بطورِ نتیجہ ایک خاص امر کا استنباط کرنے کے خوگر ہیں۔ وہ امر ''توحید'' ہے۔ رینان کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ سامی اس نظریے (توحید)

کے علاوہ اور کوئی نظریہ ایجاد نہیں کر سکے۔ اور یہ نظریہ بھی طویل فکر، منظم استدلال اور تدریجی نظر کا ثمرہ نہیں بل کہ ان محرکات و استعدادات کا نتیجہ ہے جو اس نسل کی طبیعت اور جبلّت میں جاگزیں ہیں۔ نظریۂ توحید دراصل سامیوں کی فطرت اور جبلّت ہے۔ اسی جبلّت اور فطرت نے ان کو ایک ایسے مذہب کی بنیاد ڈالنے پر آمادہ کیا جس میں ایک باعظمت، عظیم القدرت اور جلیل الصفات ہستی کو مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ یا یہ کہ اس کو خالقِ ارض و سما مانا جائے۔ اس اُفتاد اور رجحان کا ظہور سامیوں میں ذہنی یا فطری طور پر ہوا ہے۔ ایک قوی الہام اور قوّتِ وجدان کی طرح۔ یہ الہام اور وجدان نوعِ انسان کی اس باطنی قوت سے مشابہ ہے جو تاریخِ انسانیت میں مذہب اور زبان کے ظہور تکوّن کا سبب بنی ہے اور سامیوں ہی سے مخصوص نہیں بل کہ نوعِ انسانی کا خاصّہ ہے۔ البتہ اس باطنی قوت کے ذریعے سامی نسل میں ایک مخصوص مزاجی اور ذہنی کیفیت کا ظہور ہوا۔ اس مخصوص مزاجی کیفیت کو پیشِ نظر رکھ کر سامی عقل کے نقص و قصور کی مکمل تشریح کی جا سکتی ہے اور ضمناً یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی ذہن تخلیقی فکر پر کس لیے قادر نہ ہو سکا۔

صورت یہ ہے کہ سامی ذہن میں پیچ در پیچ مسائل کی گنجایش نہیں۔ ان کا ذہن سادہ اور فکر بسیط ہے۔ اُن کا ادراک، تنقید و ترکیب کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ سادگی، وحدت اور بساطت کا ایک عام اور مطلق احساس ان کی زندگی کے ہر شعبے میں کارفرما ہے۔ اُن کا کمال ہی یہ ہے کہ وہ اپنی فکری سادگی اور ذہنی بساطت کو برقرار رکھنے پر قادر ہیں۔ چناں چہ اس ژولیدگی، تنوع، تعدّد اور کثرت سے محفوظ رہے جن میں آریوں کی دینی فکر سرگرداں رہی ہے۔

ایک دوسرے مستشرق (Gautier) نے اسلامی عقل کے فکری نقص و قصور کی تشریح عرب کے طبعی حالات اور ماحول کو پیشِ نظر رکھ کر کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ عرب قبائل کے مزاج و ذہن پر عرب کی نرم و سبک ہواؤں، بادِ سموم کے تیز و تند جھونکوں، وسیع میدانوں اور اونچے اونچے ٹیلوں کا خاص اثر ہے۔ ان کی مزاجی کیفیت اس متضاد صورتِ حال کے عین مطابق واقع ہوئی ہے اور اسی صورتِ حال نے ان کی عقل کو بدوی اور صحرائی عقل بنا دیا ہے۔

یہ صحرائی عقل متناقض اور متضاد پہلوؤں کی طرف مائل رہتی ہے یعنی کبھی بے حد رحم، کبھی دہشت ناک قساوت اور بے رحمی، کبھی انتہائی بخل اور کبھی حد درجہ فیاضی۔ ان کی طبیعتوں میں اعتدال مفقود ہے، یہی کیفیت عرب نظامِ فکر و ثقافت کا خاصہ ہے۔

عرب مختلف چیزوں کے درمیان ربط پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان کے ذہن اور مزاج کا رُخ ایک انتہا سے دوسری مخالف انتہا کی طرف رہتا ہے۔ اس کے برخلاف آریہ مختلف اُمور کے مابین ربط و تلازم کا رشتہ تلاش کر کے ان کو ایک سلسلے سے وابستہ کرنے کی قدرت اور استعداد کے حامل ہیں۔ چناں چہ سامی فکر منتشر ہے اور آریائی فکر منظم۔

یہ تنقید تاریخ کی رُو سے درست نہیں۔ رینان کی یہ رائے تو یقیناً صحیح ہے کہ مسلمان فلسفیوں نے یونانی فلسفے ہی کو اپنا لیا تھا اور خود کسی اختراعی شعور کا ثبوت فراہم نہیں کر سکے مگر اس کی یہ رائے تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ ان کی فکر کے نا قابلِ تخلیق ہونے کا سبب ان کی عقلی خامی یا ان کے دماغ کی مخصوص ساخت ہے یا یہ کہ "سامیت" یا "عربیت" اس کی ذمّے دار ہے۔ اس لیے کہ اسی عقل اور اسی نسل نے مختلف ادوار میں متعدد نظام ہائے فکر اور مکاتبِ نظر کی بنیاد رکھی۔

خود رینان ہی نے علمِ کلام کے سلسلے میں مسلمانوں کی ذاتی فکر اور ذہنی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ عربوں کی ذاتی فکر اور حقیقی شعور کو ان کے دینی نظامات میں تلاش کرنا چاہیے اور (Gautier) نے بھی اپنی اس رائے میں انصاف پسندی کا ثبوت نہیں دیا کہ عربوں کے تفکر میں ترتیب و تسلسل معدوم ہے۔ کیوں کہ اسلام کے مشائی فلسفے کا تو خاص وصف ہی یہ ہے کہ وہ مرتب اور منظم ہے[1] نیز یہ حقیقت کس طرح نظر انداز کی جا سکتی ہے کہ عربوں نے نظریۂ توحید اور علمِ اُصولِ فقہ کے سلسلے میں تنظیمِ فکر اور تسلسلِ نظر کا بے حد شان دار مظاہرہ کیا ہے۔

---

[1]...... لیکن اسلام کا مشائی فلسفہ عربی النسل مسلمانوں کا مرتب و منظم کیا ہوا نہیں ہے۔ ڈاکٹر سامی کو چاہیے تھا کہ وہ عربی النسل مسلمانوں کے تنظیمی شعور کو ثابت کرتے۔ جون ایلیا

اسلام اور تصّوف

اسلام فلسفے کا ممتاز ترین دشمن ہے جب کہ ہم فلسفے سے مابعد الطبیعات اور وجودیات کے مباحث مراد لیں کیوں کہ اسلام اس قسم کی تعلیمات کو برداشت نہیں کر سکتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اسلام اور تصّوف میں کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اس لیے کہ تصّوف فلسفے سے بہت قریب ہے۔ تصّوف خود بھی ایک طرح مابعد الطبیعی نظریہ ہے۔ دوسری طرف اس کا تعلق زہد (Asceticism) سے ہے یعنی ریاضت کا وہ طریقہ جو اسلامی نظامِ حیات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اسلام نے زہد کی شدید مخالفت کی ہے۔ قرآن میں زہد کا لفظ صرف ایک جگہ آیا ہے جس کا تصّوف سے معنوی طور پر کوئی علاقہ نہیں ہے۔ نیز یہ کہ تصّوف ترکِ دنیا اور وصول الی العقبیٰ کے مسئلے میں مسیحیت سے غیر معمولی طور پر اثر پذیر ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام مسیحیت کی اس مسئلے میں قطعاً تائید نہیں کرتا۔

دراصل تصّوف ایک مابعد الطبیعی مسلک ہے۔ اس نے متعدد فلسفیانہ نظریات سے اثر لیا ہے۔ مثلاً ویدانتی فلسفہ، ایرانی اشراقیت، افلاطونیت اور مشائیت اور اثر پذیری کا یہ سلسلہ نظریۂ وحدت الوجود تک پہنچتا ہے۔ اسلام نظریۂ وحدت الوجود، فنائیت اور عقیدۂ حلول کا سخت مخالف ہے۔ مسیحیت اور اسلام کے درمیان اس مسئلے میں شدید نزاع رہی ہے۔ اسلامی کلمہ لا الٰہ الا اللہ اور صوفیوں کا لا موجود فی الحقیقت الا اللہ دونوں باہم نقیض ہیں۔

اسلام اور علمِ کلام

علمِ کلام اسلام کی فلسفیانہ توجیہ، مفکرانہ تشریح اور فکری تعبیر کا نام ہے۔ علمِ کلام ہی اسلامی فکر کا اختراعی پہلو اور مسلمانوں کے ذاتی تفکر کا حاصل ہے۔

متکلمین کا دور اُن مختلف فلسفیانہ نظریات اور قدیم مشرقی عقائد کی ہنگامہ آرائی اور کشاکش کا دور ہے جو مسلمانوں کے مفتوحہ علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ مسلمان اربابِ فکر کا ان سے متاثر ہو جانا ناگزیر تھا۔ اس کے باوجود پانچویں صدی ہجری تک علمِ کلام خالص

اسلامی رہا مگر بعد کو اس میں یونان کے فکری عناصر شامل ہو گئے۔ فقہائے اسلام نے اس شمول و امتزاج کے خلاف آواز بلند کی۔ انھوں نے اعلان کر دیا کہ متکلمین بدعتی ہیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ متکلمین نے فلسفے کے تجریدی مسائل کی طرف متوجہ ہو کر اس فکر سے بے گانگی برتی جس کی طرف اسلام بلا رہا تھا لیکن متکلمین ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ ان مسائل و مباحث کا جاننا ان کے لیے ضروری تھا۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے مسیحی ممالک میں داخل ہوتے ہی اسلام اور مسیحیت میں شدید علمی معرکہ گرم ہو گیا تھا۔ آبائے کلیسا نے اسلامی عقائد پر بڑی درشتی اور سختی سے حملہ کر دیا تھا۔

اسلام اور اُصولِ فقہ

اُصولِ فقہ یا منطقِ فقہ کا آغاز صحابہ ہی کے عہد میں ہو گیا تھا۔ اس کے ابتدائی قواعد صحابہ ہی نے وضع کیے۔ اس کی ابتدا اس وقت ہوئی جب احادیث و اخبار کے سلسلے میں صحیح و غلط کا معیار بنانے اور قیاس کو استعمال کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے بعد امام شافعی اور ان کے تلامذہ نے اس کے اُصول و ضوابط مدوّن کیے اور پھر معتزلہ و اشاعرہ نے خاص توجہ سے کام لے کر ان کو ایک باقاعدہ علم کی حیثیت عطا کر دی۔

مسلمانوں نے اس علم کے ذریعے ایک منطقی فکر پیدا کی اور اس طریقِ تجربی سے دنیا کو متعارف کرایا جس سے اکتسابِ فیض کر کے یورپ جدید ثقافت کا بانی بن سکا۔

انشا فروری 1958

ڈاکٹر عبدالحق کے ساتھ ایک شام

ہیلو!

جی! کون صاحب؟

السلام علیکم! کہیے حضرت مزاج بخیر!

اوہو' نجمی صاحب! سرکار کی دعائیں ہیں' اور فرمایئے کیا حکم ہے؟

کیا کر رہے ہیں آپ اس وقت؟

بس وہی کائنات کی باتیں۔ ایک شعر سُن لیجیے!

ان کو دیکھا کہ گفت گو کر لی
ایک شے ہے تجلّی و آواز

سبحان اللہ! آواز کے ساتھ ساتھ آپ کو تجلّی کی زحمت بھی دے رہا ہوں۔

تشریف لا رہے ہیں کیا؟

جی ہاں! اس وقت ڈاکٹر عبدالحق کے یہاں چلنا ہے' مولانا تنزیل بھی تشریف رکھتے ہیں' ہم آپ کی خدمت میں پہنچ رہے ہیں' آپ کو بھی چلنا ہے۔

کتنی دیر میں؟

بس دس پندرہ منٹ میں۔

بہت اچھا' میں حاضر ہوں۔ السّلام علیکم!

رئیس صاحب نے مجھے حکم دیا کہ تیار ہو جاؤ! تھوڑی دیر میں مولانا تنزیل الرحمٰن صاحب اور نجمی صاحب تشریف لے آئے۔ اور یہ کاروانِ مستی و قلندری دفترِ انجمن ترقی اُردو پاکستان

کی سمت روانہ ہو گیا۔ بہتر ہے کہ ان دونوں حضرات کے بارے میں تبرکاً کچھ عرض کر دیا جائے۔ بطورِ خاص مولانا تنزیل صاحب کی شخصیت و ہیئت کا یہی اقتضا ہے کہ تبرکاً کی شرط ضرور لگا دی جائے۔ رہے نجمی صاحب میرٹھی تو ان کو دیکھتے ہوئے احتیاطاً کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ نجمی صاحب کی طویل' عریض اور عمیق شخصیت کو خوش اخلاقی' مروّت' سادہ کاری' ادب پروری اور علم دوستی کی ایک ضخیم کتاب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اور کتاب بھی مجلد آرٹ پیپر کا نفیس گرد پوش' قیمت صرف خلوص' صرف انسانیت' پہلی نظر میں ان کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آں جناب ایکسپورٹ' امپورٹ قسم کے بزرگ ہیں...... بزرگی بعقل است نہ بسال...... لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ضخامت و حجم کے اندر نہ جانے کتنی ادبی' تہذیبی اور انسانی نزاکتیں پوشیدہ ہیں' نجمی صاحب ایک نکتہ رَس' صاحبِ نظر اور ایک برشتہ شاعر بھی ہیں۔ ان کا ایک شعر سُنتے چلیے!

جنوں کے خوف سے ہم نے پناہِ عقل ڈھونڈی تھی
مگر پھر عقل ہی نے ہم کو دیوانہ بنا ڈالا!

اور صحیح بات یہ ہے کہ ان کو دیوانہ بنانے کا فرض عقل ہی نے بڑے ہی خلوص' تپاک اور مرتبہ شناسی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اب جناب مولانا تنزیل الرحمٰن صاحب کو ملاحظہ کیجیے۔ موصوف جدید فارسی زبان و ادب کے سلسلے میں سَند کی حیثیت رکھتے ہیں' غالباً اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے جب تک فارسی کو خالص ایرانی لہجے میں ادا نہ کر دیں۔ کبھی کبھی اُردو بھی فارسی ہی میں بولتے ہیں' پہلے ایک بہت ہی کامیاب اور قانون داں ادیب تھے اور اب ایک قادر الکلام اور نادرہ کار وکیل ہیں ان کی خالص ادبی فطرت شاید اب تک یہ شعر گُنگُناتی ہوگی!

گرمیِ نالم بہ ''قانوں'' بر نہم
زخمۂ بیگانہ برتار آمدہ

ہیئت و صورت بل کہ صرف صورت کے اعتبار سے موصوف کو کسی تبلیغی جماعت کا سرگرم اور باعمل کارکن کہا جا سکتا ہے...... لیجیے انجمن ترقی اُردو کا دفتر آ گیا۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب

دفتر کی چوتھی منزل میں رہتے ہیں۔ ہم لوگ آخری سیڑھی پر تھے، دیکھا کہ سامنے کمرے میں مولوی صاحب کھانا کھا رہے ہیں۔ واضح رہے کہ ہم لوگ کھانے میں شریک نہیں ہوئے۔ صحن میں کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، چناں چہ وہیں بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب صبح کے ناشتے کے بعد بس شام ہی کو ۶، ۷ بجے کے درمیان کھانا کھاتے ہیں۔ اگر ہم سرکاری محکمے کے کسی افسر یا عبدالغنی عبدالسّلام بمبئی والا قسم کے کسی صاحبِ خیر بزرگ سے ملنے جاتے تو نہ جانے کتنے واسطوں اور وسیلوں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے، چپڑاسی کو ملاقاتی کارڈ پیش کیا جاتا۔ اور پھر نہ جانے کتنی دیر تک چچا غالبؔ کی اس غزل کے لطیف اور باریک نکتوں کی داد دینا پڑتی۔

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

لیکن اُردو کے اس سب سے بڑے سرپرست کی خدمت میں پہنچنے کے لیے نہ کسی سیکریٹری کی خوشامد کرنا پڑی اور نہ کسی چپڑاسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ معلوم نہیں کہ اس بات پر خوش ہونا چاہیے یا غمگین۔

مختصر سے انتظار کے بعد مولوی صاحب کھانے سے فارغ ہو کر تشریف لے آئے، اسّی یا پچاسی سال کے مولوی عبدالحق ایک عہد، ایک مکتبۂ فکر بلکہ ایک تاریخ ہیں۔ انیسویں صدی کی پیرانہ سالی نے انھیں پایا تھا، اور بیسویں صدی کا آخری نصف دور دھڑکتے ہوئے دل اور پریشان نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہا ہے...... کہیں نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں۔ سفید بُرّاق بال۔ میانہ قد۔ آنکھوں میں حالات شناسی کی متوجہ کر لینے والی چمک، اکہرا بدن، تن زیب کا کُرتا، علی گڑھ تراش کا پاجامہ۔ وہ بیٹھے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ زمانہ بیکراں اور لامحدود زمانہ، صرف لمحوں اور دقیقوں ہی سے تو عبارت ہے۔

مولوی صاحب گران گوش ہیں۔ ہو گئے ہیں...... جب کوئی سُنتا ہی نہیں تو وہ بھی آخر کیا کریں...... شہر کی رسم یہی ہے تو پھر اب یوں ہی سہی۔

لیکن اب بھی دوسروں کی بات وہ مکرّر کہے بغیر ہی سُن لیتے ہیں اور دونا التفات نہیں چاہتے۔ لیکن لوگوں کے یک گونہ التفات ہی نے ان کی سماعت میں زہر گھول دیا ہے۔ اس زمانے میں ان کو جن لہجوں سے نوازا گیا ہے، اُن کی داد دینے کے لیے جگر چاہیے۔ بعض لوگ

اس حقیقت کو بالکل فراموش کر چکے ہیں کہ یہ عبدالحق ہی تھے جنھوں نے اُردو کو ایک زندہ اور توانا تحریک بنا دیا۔ مگر آج اُردو کی زندہ و توانا تحریک کا یہ عظیم بانی فقط ''ملامت ہائے بے درداں'' سُننے کے لیے رہ گیا ہے۔ تاریخ کا یہ عجیب و غریب المیہ ہے کہ تحریک کے بانی آخر میں اپنی تحریکوں ہی کے شکار ہو جاتے ہیں۔

رئیس صاحب نے کہا کہ آپ اس قوم کے سقراط ہیں، سقراط کو جامِ زہر پیش کیا گیا تھا اور آپ کو زہرِ ملامت، مآلِ کار تاریخ آپ ہی کے حق میں فیصلہ صادر کرے گی۔ مولوی صاحب ایک اُداس تبسّم کے ساتھ خاموش ہو گئے اور پھر داغ کا یہ شعر پڑھنے لگے:

ملاتے ہو اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے
مری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

اب ہمارے لیے چائے اور ان کے لیے کافی آ گئی تھی۔ دورانِ گفت گو میں وہ لمحات بھی کتنے برگزیدہ اور منتخب ہوتے ہیں جب ہاتھ میں چائے کی پیالی ہو اور منہ میں سگریٹ۔ چائے اور مولانا ابوالکلام آزاد میں ''صنعت ایہام تناسب'' ہے چناں چہ بغیر کسی تمہید کے ان کا ذکر شروع ہو گیا۔

بیاد آر حریفانِ بادہ پیما را!

سوال کیا گیا کہ مولانا آزاد کی انشا پردازی کے سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا کہ آزاد کی نثر میں وہ متانت، خلوص اور انشائی مقصدیت نہیں پائی جاتی جو حالؔی کا خاصہ ہے، پھر علامہ شبلؔی کے بارے میں معلوم کیا گیا، لیکن وہ علامہ شبلؔی کو بھی حالؔی کے پائے کا نثر نگار ماننے کے لیے تیار نہیں، وہ حالی اسکول کے راسخ العقیدہ نمایندہ ہیں، اس لیے وہ مولانا آزاد کی حسبِ فرمایش اور ''بطورِ خاص'' ملاحظہ ہو، قسم کی عبارت پسند کر بھی نہیں سکتے، خصوصاً وہ عبارت جو...... سیّد احمد المکنّٰی بابی الکلام آزاد...... نے لکھی ہو۔ مولانا آزاد کے ذکر میں انھوں نے کہا کہ تقسیمِ ہند کے دوران میری رائے یہ تھی کہ اُردو کے لیے ہندوستان ہی میں رہ کر کام کیا جائے کیوں کہ پاکستان میں اُردو کے لیے زیادہ جدوجہد درکار نہیں ہے۔ اس ارادے کا ذکر مولانا آزاد سے بھی کیا گیا۔ انھوں نے فرمایا کہ

"اگر آپ ہندوستان میں رہ کر اُردو کے لیے کوئی تحریک چلائیں گے تو آپ کے مکان میں افیون اور چرس رکھوا کر آپ کو گرفتار کر لیا جائے گا۔"

گفت گو اُردو اور انجمن ترقی اُردو کے موضوع پر ہی ہوتی رہی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ حالات سے بالکل بے دل اور مایوس نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا بھی کہ جو کام بعض موانع کی بنا پر پچھلے دس سال میں نہیں ہو سکا' وہ ایک سال میں ہو سکتا ہے اور یہ بات میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ رہا ہوں' مگر شرط یہ ہے کہ لوگ فرض شناسی' بے غرضی اور ہمتِ افزائی سے کام لیں۔ اُن کی رائے ہے کہ اُردو کے مترجمین اور مصنفین کو ادبیات کے بجائے سائنس اور دوسرے علوم پر زیادہ توجہ دینا چاہیے۔

آج کل مولوی صاحب گداختہ اور خوں شدہ قسم کے شعر بہت پسند کرتے ہیں۔ رئیس صاحب کا ایک شعر پڑھنے لگے۔

جو ہماری برائیاں ہیں آج
کل ہماری بھلائیاں ہوں گی

وہ خود بھی اس شعر کے صحیح مصداق ہیں۔ یہ کتنی حسرت ناک صورتِ حال ہے کہ ہمارے معاشرے میں بھلائیوں اور خوبیوں کے اعتراف کو کل پر اُٹھا رکھا گیا ہے۔ آج کیا ہے؟ صرف طعنے' ملامتیں اور مخالفتیں...... دیر یا بعد...... جب تقدیرِ ایام پوری ہو جائے گی تو انھی عبدالحق کے یوم منائے جائیں گے' یادگاریں قائم ہوں گی اور یہی لوگ جو آج ان کے ساتھ کوئی رعایت روا رکھنا نہیں چاہتے' کل ان کے سجادہ نشین بن جائیں گے۔ غرض ہم لوگ بھی خوب ہیں' ہم سے مجاوری اور سجادہ نشینی کا فن تو خوب آتا ہے لیکن ایک معقول ایثار پیشہ اور مرتبہ شناس' ہم عصر اور رفیقِ کار ثابت ہونے کی ہمارے اندر ذرا سی بھی صلاحیت نہیں۔ اور یہ بڑی افسوس ناک بات ہے' بہ ہر حال............

یہ تھا اس شام کا تاثر یا تذکرہ جو اُن کے ساتھ بسر کی گئی۔

انشا' جولائی 1958

نیلی آنکھوں والا نوری السعید

بغداد کے ایک عالی شان مکان کا واقعہ ہے کہ ایک برقع پوش عورت انتہائی سراسیمگی اور دہشت زدگی کے عالم میں دروازے سے باہر نکلی۔ اس کے ساتھ ایک اور برقع پوش عورت بھی تھی۔ جس کی رفتار میں پریشانی اور گھبراہٹ کے باوجود ایک خاص وقار پایا جاتا تھا۔ یہ خاتون حسین بھی تھی اور جوان بھی۔ شہر کے گلی کوچوں میں ایک غیر معمولی اور پراسرار ہما ہمی پائی جاتی تھی۔ چاروں طرف ایک نامانوس شور برپا تھا۔ دُور سے نعروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر ان دونوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ ان آوازوں سے سہمی جا رہی تھیں۔ اپنے آپ کو چھپاتی ہوئی دونوں ایک گلی میں آ گئیں اور کچھ دُور چل کر ایک مکان میں داخل ہوئیں لیکن تھوڑی ہی دیر میں اس مکان سے بھی نکل آئیں۔ وہ کہیں پناہ لینا چاہتی تھیں مگر انھیں کہیں بھی پناہ نہ مل سکی۔

پہلی عورت ستر سال کی ایک بڑھیا تھی۔ چہرے پر موٹی موٹی جھریاں۔ پستہ قد، بھاری بدن، بڑا اور باوقار چہرہ، گہرے اور موٹے نقوش اور خاص طور پر نیلی آنکھیں جنھوں نے اس کو کچھ اور بھی پراسرار اور پُر جلال بنا دیا تھا۔ ویسے بھی اس کی شخصیت میں ایک غیر معمولی متوجہ کر لینے والی کیفیت پائی جاتی تھی۔ اب اس نے ایک اور عمارت کے اندر داخل ہونا چاہا اور دونوں کچھ توقف کے ساتھ اندر چلی گئیں مگر تھوڑی ہی دیر میں لوٹ آئیں۔ اب ان کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بادل ناخواستہ باہر نکلا ہے۔ باہر نکلتے ہی اس نے عجلت اور پریشانی کے ساتھ اپنے ڈرائیور سے کچھ کہا اور اس طرح عمارت کے اندر داخل ہو گیا جیسے یہ عورتیں انسان نہیں کوئی آسیب ہیں۔

ڈرائیور نے انتہائی بددلی کے ساتھ گیراج سے موٹر نکالی اور ان دونوں کو دجلے کی

طرف لے گیا۔ دونوں عورتیں اس بات پر مُصر تھیں کہ ہمیں پل کے دوسری طرف پہنچادیا جائے لیکن ڈرائیور کسی طرح آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ پہلی فرصت میں ان دونوں کو موٹر سے اُتار دینا چاہتا تھا اور اس نے انھیں وہیں ایک جگہ اُتار دیا اور موٹر لے کر چلا گیا۔ اب ان دونوں کے سامنے پھر یہ سوال تھا کہ کہاں جائیں؟ آخر کوچوں سے نکلتی ہوئی یہ دونوں پھر ایک محلّہ میں آ گئیں اور گلیوں میں گھبرائی ہوئی پھرنے لگیں۔ پشت کی طرف سے عراقی فوج کے کچھ جوان آرہے تھے انھیں کسی کی تلاش تھی۔

''اسے یہیں کہیں ہونا چاہیے۔''

ایک نے دوسرے سے کہا۔

مگر یہاں تو کوئی بھی نہیں...... پھر وہ کہاں ہے؟ ان کی نگاہیں آپس میں سوال کر رہی تھیں۔ بوڑھی عورت شدید ترین گھبراہٹ اور ناگزیر احتیاط کی غیر متوازن حالت میں گلی کے موڑ سے آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ جوان عورت ہمت ہار چکی تھی، اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ آخر اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ فوجی جوان قریب آ گئے تھے۔ بڑھیا شاید بہری تھی وہ آنے والوں کے قدموں کی آواز نہ سُن سکی۔ یہاں تک کہ وہ بالکل قریب پہنچ گئے۔ اب آنے والے ہاتھوں میں پستول لیے اس کی پشت پر کھڑے تھے اس نے ان کی طرف اس طرح گھوم کر دیکھا جیسے اس پر جاں کنی کی کیفیت طاری ہو۔ کتنا عجیب اور دہشت انگیز تھا یہ منظر......!

''ہیں!''...... ''یہ!''...... ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ بڑھیا نہیں عراق کا وزیر اعظم نوری السعید ہے۔ نوری السعید پستول چلانا ہی چاہتا تھا کہ اس کی لاش زمین پر تڑپنے لگی۔ فوجی اس جوان عورت پر بھی گولی چلا چکے تھے۔ وہ بھی گلی کے ایک جانب پڑی ہوئی تڑپ رہی تھی۔ یہ تھی صبیحہ، نوری السعید کی جوان بیوی۔

تین سو سال پہلے کی بات ہے کہ بغداد کی کسی پرانی مسجد میں بولو نامی ایک مولوی رہتا تھا۔ یہ بہت چالاک اور چوکنا آدمی تھا۔ سیاست سے بھی اسے خاص دل چسپی تھی۔ اسی زمانے میں ایرانیوں نے بغداد پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرلیا۔ بولو وہاں سے فرار ہو کر قسطنطنیہ پہنچا۔ وہ سلطانِ ترکی سے ایرانیوں کے خلاف امداد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سلطان

نے اس کی درخواست قبول کر لی اور ترک فوج کو اس کے ہمراہ بغداد روانہ کر دیا۔ ایرانیوں اور ترکوں کے درمیان جنگ ہوئی اور ایرانی ہار گئے' بولو کا وظیفہ مقرر ہوا۔ اس وظیفے کا ایک حصہ ایک دینی ادارے کی معرفت نوری کی بہن صبریہ خانم کو بھی ملتا رہا۔ وہ ۱۳ جولائی ۱۹۵۸ء کی شام تک وظیفہ یاب شمار ہوتی تھی۔ بولو کو حرم سلطانی سے نیلی آنکھوں والی ایک ترک دوشیزہ بھی عطا کی گئی۔ نوری السعید اسی بولو اور نیلی آنکھوں والی لڑکی کی نسل سے تھا۔

کبود چشم نوری السعید ۱۸۸۸ء میں حسن آفندی کے گھر پیدا ہوا۔ عراق کے اعلیٰ خاندانوں کے دستور کے مطابق اس کو فوجی تعلیم دی گئی۔ بعد کو اس نے قسطنطنیہ کی فوجی اکیڈمی میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ ایران کے ایک قبائلی علاقے میں کمانڈر مقرر ہو گیا۔

یہاں سے اس کی دل چسپ داستانِ محبت کا آغاز ہوتا ہے۔ ہوا یہ کہ یہاں اس کی ملاقات ایک جوان فوجی افسر جعفر العسکری سے ہوئی اور انتہائی گہرے تعلقات قائم ہو گئے۔ اب وہ دونوں عموماً ساتھ ہی رہتے تھے۔ اسی سلسلے میں نوری نے اپنے دوست کی جوان اور حسین بہن کو دیکھا۔ وہ حقیقتاً بے حد حسین تھی۔ نوری جیسا مغرور نوجوان جس نے انتہائی کھردری طبیعت پائی تھی اور جو نوجوان اور عاشق مزاج کم اور فوجی افسر اور سیاست پسند زیادہ تھا' جو بغداد کی حسین و جمیل دوشیزاؤں کی طرف بے نیازانہ نگاہیں ڈال کر آگے بڑھ جانے کا عادی تھا۔ اس ساحرہ کی پرفسوں نگاہوں سے محفوظ نہ رہ سکا اور اس سے شدید محبت کرنے لگا۔ دوسری طرف حال کا نوجوان فوجی افسر اور مستقبل کا وزیر اعظم عراق نوری السعید بھی دوشیزہ کی نظروں میں کھب جانے والے خدّ و خال اور نسوانی شعور پر چھا جانے والی مردانہ وجاہت اور شخصیت کا مالک تھا۔ ویسے بھی فوج کے نوجوان افسر لڑکیوں کے ذہنوں پر جلد مسلّط ہو جاتے ہیں۔ آخر دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ نوری کی بھی ایک بہن تھی۔ ترکستان کی مشہور طنازی اور صید افگنی اور عراق کی خوش قامتی اور عشوہ فروشی کا بے مثال نمونہ۔ جعفر العسکری یعنی نوری کا دوست اسے بُری طرح چاہنے لگا۔ آخر ان دونوں بے تکلف دوستوں میں یہ قرار پایا کہ دونوں ایک دوسرے کی بہنوں سے

شادی کرلیں اور شادیاں ہو گئیں۔ شادی کے بعد یہ دونوں قسطنطنیہ کے اسٹاف کالج میں داخل ہو گئے۔ ان کے پہنچنے کے کچھ عرصے بعد ہی جنگِ بلقان شروع ہو گئی۔ نوری نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ مگر ترکوں کے قریب رہ کر اسے شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ ترک عراقیوں اور عربوں سے نفرت کرتے ہیں اور ان میں عرب کی طرف سے شدید نسلی تعصب پایا جاتا ہے اور خود وہ بھی اس تعصب کا شکار ہو رہا ہے۔ وہ اس صورتِ حال سے بہت متاثر تھا۔ اب اس نے طے کر لیا کہ ترکوں کے اقتدار و تسلّط سے رستگاری حاصل کرنے کے لیے وہ عربوں کو منظم کرے گا۔ عراق میں اس تنظیم کے لیے پہلے ہی سے حالات سازگار تھے اور ۱۹۱۳ء میں احد العراقی کے نام سے ایک وطن پرست جماعت منظّم ہو چکی تھی۔ بغداد میں اس کی سرگرمیاں اور خفیہ کوششیں برابر جاری تھیں۔ نوری نے بھی اپنے حلقے میں پروپیگنڈا شروع کیا مگر ترک افسروں پر یہ راز جلد ہی فاش ہو گیا۔ اب نوری وہاں کسی طرح بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ چناں چہ وہ فرار ہو کر بصرہ آ گیا لیکن یہاں اس کو انگریزوں نے گرفتار کر کے ہندوستان بھیج دیا جہاں وہ دو سال قید رہا۔ ادھر شریف حسینؑ شاہ فیصل کے دادا اپنی حکومت کے لیے کوشاں تھے۔ انھیں انگریزوں کی حمایت حاصل تھی۔ چناں چہ انگریزوں نے ان قیدیوں کو رہا کر کے شریف حسین کی فوج میں شامل کر دیا۔

۲۰ مارچ ۱۹۱۹ء میں پیرس میں چار بڑوں کی کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس سے عربوں کو بڑی اُمیدیں تھیں لیکن وہ پوری نہ ہو سکیں۔ شریف حسین کا بیٹا فیصل ہر طرف سے مایوس ہو گیا۔ آخر میں اس نے امریکا کی طرف رجوع کیا اور تجویز پیش کی کہ امریکا کے ماتحت عرب شیوخ کی ایک فیڈریشن بنا دی جائے مگر یہ بات منظور نہ ہو سکی۔ اب اس نے یہ تجویز پیش کی کہ عرب امرا کو بڑی طاقتوں میں سے کسی ایک طاقت کی تولیت و سربراہی (MANDATE) میں دے دیا جائے۔ اس نے اس سلسلے میں امریکا کا نام پیش کیا مگر اس وقت یہ تجویز بھی نامنظور ہو گئی۔ اب فیصل عرب قوم کی طرف متوجہ ہوا اور ان کی کوشش و حمایت سے شام کا حکم ران ہو گیا۔ نوری السعید کو چیف آف اسٹاف مقرر کیا گیا۔ فرانسیسی اس صورتِ حال سے برہم تھے۔ آخر انھوں نے فیصل کو دمشق سے نکال دیا۔ انگریزوں نے

اس کو عراق کا والی بنا دیا۔ نوری کو سپہ سالار کا عہدہ تفویض ہوا اور ۱۹۳۰ء میں یہ سپہ سالار وزارتِ عظمیٰ کے عہدۂ جلیل پر فائز ہوا۔ یہ اعزاز اس کو تیرہ بار حاصل ہوا۔

اس میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ بیرونی اقتدار کے خلاف عرب قومیت کے احساس کو اس نے کافی تقویت پہنچائی مگر افسوس وہ انسان جس کی خرابیاں اس کی خوبیوں پر غالب آ جائیں۔ وہ پکا انگریز پرست تھا۔ اپنے عہدِ اقتدار میں اس نے عوام کے جذبات کا ذرا بھی لحاظ نہیں رکھا۔ دراصل مشرقی عوام مغرب کے سیاسی اور صنعتی استعمار سے تنگ آ چکے ہیں۔ اب مغرب ان کے لیے انتہائی ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ نوری نے اس بات کا کوئی خیال نہیں کیا۔ اس نے وطن پرستوں کو عذاب ناک سزائیں دیں۔ اخباروں پر شدید ترین پابندیاں عائد کیں اور عوام کے احساسات و جذبات کو کچل دیا۔

عراق کے باشندے بھی دجلہ و فرات کی بے قرار موجوں کی طرح ہمیشہ سے سیمابی طبیعت کے مالک ہیں۔ وہ اس صورت کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے تھے اور آخر وہی ہوا جو ہوا اور وہی ہونا تھا۔

آج بغداد میں سرِ بازار نوری کی لاش کو گھسیٹا جا رہا ہے۔ اس کی صورت مسخ ہو چکی ہے۔ یہ وہی بغداد ہے جہاں اس شخص نے خلافتِ عباسی کے وزیروں کی طرح جاہ و جلال اور عظمت و اُبہت کی زندگی بسر کی تھی۔ آج اسی بغداد میں لوگ اس کی ہڈیوں کو جوتوں کی ایڑیوں سے ریزہ ریزہ کر دینا چاہتے ہیں۔ اس کے محلات پر مرگ و ہلاکت کی ویرانیاں چھائی ہوئی ہیں۔ ویسے بھی حادثات کے سناٹے اور انقلابات کی ویرانیاں ہمیشہ محلوں کی تاک میں رہا کرتی ہیں۔

انقلاب کے چند روز بعد شام کے وقت ایک عرب نے دجلہ کے پُل سے گزرتے ہوئے اپنے رفیق سے کہا...... ''یا اخی! دن انسانوں کے درمیان اسی طرح گردش کرتے ہیں اور تقدیریں اسی طرح بدل جایا کرتی ہیں۔''

تلک الایام نداولھا بین الناس

انشا، اگست 1958

تختِ طاؤس کا پروردگار

اس مضمون کا مواد آقائے حسین نخجوانی کے مضمون "سعیدائے گیلانی وتختِ طاؤس" سے حاصل کیا گیا۔ جون ایلیا

فن کی شہرت اور فن کار کی گم نامی ایک ایسا حادثہ ہے جس کا اعادہ تاریخ میں عموماً ہوتا رہا ہے۔ کون ہے جس نے تاج محل اور تختِ طاؤس کا نام نہ سُنا ہو۔ مگر کتنے ہیں جواُن کے صناعوں سے واقف ہیں! ایران کا نادرہ کار، سخن وراور ماہر صناع سعیدائے گیلانی، انھی لوگوں میں سے ہے جو اپنے کارناموں کی نسبت سے شہرت اور نام وری حاصل نہ کر سکے۔

سعیدائے گیلانی، لاہجان کا رہنے والا تھا۔ گیارھویں صدی ہجری کے آغاز میں جب لاہجان میں آگ لگی تو اس کا تمام سروسامان اور اثاثہ نذرِ آتش ہوگیا۔ سعیدائے گیلانی نے بے سروسامانی کے عالم میں سفرِ غربت اختیار کیا۔ اور مختلف شہروں کی خاک چھانتا ہوا ہندوستان پہنچا۔ یہ جہاں گیر کا زمانہ تھا۔ سعیدائے گیلانی سے پہلے بھی مغل دربار نے اس کے ہم وطن ایرانی شعرا، علما اور اربابِ فن کو بڑے احترام اور تپاک کے ساتھ قبول کیا تھا۔ چناں چہ اسے بھی دربار میں شرفِ باریابی حاصل ہوا۔

تذکرہ نصرآبادی کے علاوہ ان کے کسی تذکرے میں اس کا ذکر نہیں ملتا...... مذکورہ تذکرے میں بھی سعیدائے گیلانی کے لیے چند سطور پر اکتفا کیا گیا ہے، البتہ ہندوستان کے بعض تذکرہ نگاروں نے کہیں اجمال اور کہیں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ تذکرہ نصرآبادی کا بیان ہے:

"سعیدائے، فرزند حاجی خواجہ علی لاہجانی، ایک معتبر اور صاحبِ مقدرت تاجر تھا۔ لاہجان کے حادثۂ آتشیں میں اس کا تمام اثاثہ جل کر خاک ہوگیا۔ وہ ایک صاحبِ دل

جوان گزرا ہے' اس کو فنِ نقاشی میں غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ اس کی شاعری بھی لطف اور کیفیت سے خالی نہیں۔"

ہندوستان سے اشاعت پذیر ہونے والی جن کتابوں میں اس کا ذکر کیا گیا ہے' وہ یہ ہیں: مآثر الامرا' از صمصام الدولہ شاہ نواز خان۔ بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری۔ شاہ جہاں نامہ صالح۔ مجموعۂ مقالات ڈاکٹر ہادی حسن۔ ان تمام کتابوں کا ماحصل یہ ہے کہ فن کار گیلانی' شاعری' بطورِ خاص تاریخ گوئی' نقاشی اور صناعی میں ممتاز ترین حیثیت کا حامل تھا۔ ہندوستان آ کر دربارِ جہاں گیری میں تقرب حاصل کیا۔ جہاں گیر کی وفات کے بعد شاہ جہاں نے اس کو اپنے الطافِ شاہانہ اور مراحمِ خسروانہ سے نوازا اور بے بدل خاں کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ سعیدائے شاعری اور نقاشی کے علاوہ زرگری' الماس تراشی' حکاکی اور خطاطی میں بھی یدِ طولیٰ رکھتا تھا۔ اس مہارت اور ہنرمندی کے سبب زرگر خانۂ شاہ جہانی کی نظامت و نگرانی اس کے سپرد کی گئی۔ سعیدائے ان تین افراد میں سے ایک ہے جنھیں عہدِ جہاں گیر اور دورِ شاہ جہانی میں سونے میں تلوایا گیا۔ دوسرے دو شخص ابو طالب کلیم اور حاجی جان محمد جان قدسی ہیں۔ گیلانی دو بار اس انعام کا مستحق قرار پایا۔ ایک بار جہاں گیر کے دور میں اور دوسری بار اس وقت جب شاہ جہاں کے سامنے تختِ طاؤس تیار کر کے پیش کیا گیا' غیر معمولی صناعانہ عظمت و رفعت کے ساتھ' وہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھا۔

جہاں گیر اپنی تزک میں رقم طراز ہے:

امیر معزی نے سلطان سنجر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا' جس کا مطلع یہ ہے:

اے آسماں مسخرِ حکمِ روانِ تو
کیوانِ پیر بندۂ بختِ جوانِ تو

سعیدائے گیلانی زرگر باشی نے بھی جو ایک خوش طبع شاعر ہے' معزی کی پیروی کرتے ہوئے ایک قصیدہ ہماری خدمت میں پیش کیا ہے۔ یہ قصیدہ خوب ہے۔ بروز شنبہ بتاریخ ۱۴ شہر یور ۱۰۲۷ھ اس قصیدے کے صلے میں ہم نے حکم دیا کہ اس کو سونے میں تلوایا جائے۔

قصیدے کا مطلع یہ ہے:

اے! مہ فلک نمونۂ از آستانِ تو
دورانِ پیر گشتہ جواں در زمانِ تو

۱۰۳۰ھ...... عہدِ جہاں گیر...... میں فضا سے ایک شہابِ ثاقب گرا۔ ''شعلۂ برق بادشاہی''...... مادّہ تاریخ نکالا گیا۔ جہاں گیر نے حکم دیا کہ اس شہابیے سے تین حصّہ لوہا لے کر ایک حصّہ لوہا اور شامل کیا جائے اور اس سے ایک چاقو کا دستہ، ایک خنجر کا قبضہ اور دو تلوار کے قبضے بنائے جائیں۔ سعیدا نے اس موقع پر ایک رباعی لکھی:

از شاہِ جہاں گیر جہاں یافت نظام
اُفتاد بعہدِ او زبرق آہنِ خام
زاں آہن شد بہ حکمِ عالمگیرش!
یک خنجر و کارد با دو شمشیر تمام

اس کی ابتدائی زندگی کے حالات معلوم نہیں، یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ پیدایش و وفات کی تاریخ کیا ہے؟ البتہ یہ معلوم ہے کہ ۱۰۴۷ھ تک بقیدِ حیات رہا، اس لیے کہ اس نے مسجدِ شاہ جہانی (مسجد جامع دہلی) کی تعمیر مکمل ہونے پر اس کی تاریخ کہی ہے۔

قبلۂ اہلِ جہاں شد، مسجدِ شاہِ جہاں...... ۱۰۴۷ھ

جہاں گیر کی سلطنت کے آخری دس سال سے لے کر شاہ جہاں کی سلطنت کے اوّلین دس سال تک وہ تاریخ کے سامنے موجود رہا۔ صمصام الدولہ شاہ نواز خان مآثر الامرا میں لکھتا ہے کہ بے بدل خان سعیدائے گیلانی عمدہ شعر کہتا تھا۔ جنت مکانی نورالدین محمد جہاں گیر کے عہد میں ہندوستان آیا۔ اور ملازمانِ شاہی میں منسلک ہو گیا۔ اس کا شمار درباری شعرا میں ہوتا تھا۔ فردوس آشیانی شاہ جہاں کے دور میں اپنی ذہانت و لیاقت کے باعث بے بدل خان کے خطاب سے مشرف ہوا۔ وہ مرصّع تخت جو تختِ طاؤس کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی نگرانی میں سات سال کے عرصے میں بن کر تیار ہوا۔

عبدالحمید لاہوری کہتے ہیں کہ تختِ طاؤس پر ایک کروڑ روپے کی لاگت آئی تھی۔

شاہی کارخانے کے وہ جواہر جن کی مالیت تین کروڑ روپے کے لگ بھگ تھی۔ ان میں سے ۸۶ لاکھ کی مالیت کے جواہر بے بدل خان کے حوالے کیے گئے، تاکہ ڈھائی لاکھ مثقال

زرِ خالص سے جن کی قیمت اس وقت ۱۴ لاکھ روپے ہوتی تھی' ایک ایسا تخت اپنی نگرانی میں تیار کرائے جس کا طول سوا تین گز' عرض ڈھائی گز اور بلندی پانچ گز ہو۔ تختِ طاؤس کے نصف اندرونی حصّے میں میناکاری اور مرصّع تختی سے کام لیا گیا ہے۔ بیرونی حصّے میں لعل و یاقوت استعمال ہوئے ہیں۔ تخت کو بارہ زمردیں پائے اُٹھائے ہوئے ہیں۔ تخت کے اُوپر دو مور ہیں جنھیں جواہر سے مکمل کیا گیا ہے۔ موروں کے درمیان لعل' الماس' زمرّد اور مروارید کے دو پیڑ بنائے گئے ہیں۔ تخت پر چڑھنے کے لیے تین زینوں کی سیڑھی ہے جسے جواہر آب دار سے آراستہ و پیراستہ کیا گیا ہے۔ تخت کے گرد و پیش مرصّع تختیاں نصب ہیں۔ درمیانی تختی کی قیمت جس پر بادشاہ تکیہ لگا کر بیٹھتا ہے' دس لاکھ روپے ہے' تختِ طاؤس میں ایک خاص لعل بھی لگا ہوا ہے' جس کی قیمت ایک لاکھ روپے ہے۔ یہ لعل شاہ عباس صفوی نے جنت مکانی نورالدین محمد جہاں گیر کو بطور تحفہ بھیجا تھا۔ جہاں گیر نے فتحِ دکن کے صلے میں یہ لعل شاہ جہاں کو عطا کیا۔

جب تختِ طاؤس بن کر تیار ہوگیا تو جشنِ نوروز کی تقریب کے موقع پر بتاریخ تین ماہ شوال ۱۰۴۴ھ شاہ جہاں نے اس پر جلوس فرمایا' حاجی محمد جان قدسی نے تخت کی تعریف میں ایک مثنوی لکھی اور تاریخ نکالی' مثنوی کے چند شعر یہ ہیں:

زہے فرخندہ تختِ پادشاہی
کہ شد ساماں بہ تائیدِ الٰہی
فلک روزے کہ می گردش مکمّل
زرِ خورشید را بگداخت اوّل
چو تاریخش زباں پرسید از دل
بگفت (اورنگِ شاہنشاہِ عادل) ۱۰۴۴ھ

تخت پر جس قدر دولت صرف کی گئی' اس کا اندازہ قدسی کے ان اشعار سے ہوسکتا ہے:

بہ خرجش عالم از زر شد چناں پاک
کہ شُد از گنج خالی سینۂ خاک
کند شاہِ جہاں بخشِ جواں بخت
خراجِ عالمے را خرج یک تخت

اگر یہ بات صحیح ہے کہ ہر دور کا شاعر بل کہ شاعر ہی کیا ایک عام حساس و باشعور انسان بھی اپنے زمانے کی عوامی زندگی اور عوامی حالت کا احساس رکھتا ہے تو پھر ہم بڑی آسانی سے اس شعر کو ایک طنز خیال کر سکتے ہیں۔ایک تیکھا طنز۔

تختِ طاؤس کے پروردگار سعیدائے گیلانی کی شاعرانہ قادر الکلامی اور اُستادانہ مہارت کا اندازہ اس امر سے ہوگا کہ اس نے شاہ جہاں کی ولادتِ کشمیر سے آگرے کی طرف مراجعت اور تختِ طاؤس پر جلوس فرمانے کے سلسلہ میں ایک سو چونتیس شعر کا ایک قصیدہ نظم کیا، جس کے ہر مصرع سے مادّہ تاریخ نکلتا ہے، اس کے باوجود نہ لہجہ غیر مانوس ہے اور نہ زبان غیر معروف۔

شروع کے بارہ اشعار کا ہر مصرع ولادتِ شاہ جہاں کی تاریخ (۱۰۰۰ھ) ہے اور بعد کے ۱۳۲ اشعار کا ہر مصرع تخت نشینی کی تاریخ (۱۰۳۷ھ) ہے۔

اب نوّے اشعار باقی رہے۔ ان نوّے اشعار میں سے ایک مصرع دارالخلافہ سے لاہور و کشمیر روانہ ہونے کی تاریخ ہے، وہ مصرع یہ ہے:

ہزار بود و چہل سہ بسال از ہجرت

تاریخ گوئی کا یہ کمال ہے اس مصرع سے لفظاً و معناً دونوں طرح تاریخ نکلتی ہے۔ نوے اشعار کے بقیہ ۱۷۹ مصرعے شاہ جہاں کے تختِ طاؤس پر جلوہ فرما ہونے کی تاریخ ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ اب اس قصیدے کے صرف چھبیس اشعار پائے جاتے ہیں۔ باقی اشعار کا نشان نہیں ملتا۔

تختِ طاؤس جیسے نادرِ روزگار شاہ کار کی تخلیق کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز ادبی صلاحیت اور شاعرانہ قدرت اس بات کا ثبوت ہیں کہ سعیدائے گیلانی کی شخصیت میں کس درجہ غیر معمولی پائی جاتی تھی۔ حیرت یہ ہے کہ اس کو اپنی شخصیت اور استحقاق کے مطابق شہرت حاصل نہ ہو سکی اور یہ ایک ایسا المیہ ہے جس کا اعادہ تاریخ میں بار بار ہوتا رہا ہے۔

انشا، ستمبر 1958

معتزلہ-ایک فکری تحریک

اگر مجھ سے اسلامی مشرق کی فکری تنظیموں کے بارے میں سوال کیا جائے تو میں بلا توقف معتزلہ اور اخوان الصفا کا نام لوں گا۔ یہ نشست معتزلہ ہی سے مخصوص ہے اور ارادہ ہے کہ اس سلسلے کو کئی نشستوں تک جاری رکھا جائے۔ فی الحال تحریکِ معتزلہ کے سلسلے میں ایک سرسری جائزہ پیش کرنا ہے۔ اس کے بعد اکابرِ معتزلہ اور فلسفۂ معتزلہ کی بحث شروع کی جائے گی۔ معتزلہ کا یہ امتیاز ہمیشہ باقی رہے گا کہ انھوں نے اسلامی تاریخ کے خالص سیاسی دور میں اس قدیم ترین فکری ورثے کی حفاظت اور احیا کا فرض انجام دیا جو اسرائیلی دانش وروں نے چھوڑا تھا۔ علاوہ ازیں رہبانِ مسیحیت اور آبائے کنیسہ سے متاثر ہو کر یونان اور روم کے ان علمی افکار کو اسلامی حلقوں میں ایک تحریک و تنظیم کے ساتھ روشناس کرایا جو انطاکیہ اور اسکندریہ کی خانقاہوں میں زیرِ بحث رہا کرتے تھے۔ ابتدا میں تحریکِ اعتزال کے اکابر نے انھی موضوعات کو اپنی توجہات کا مرکز بنایا تھا۔ جو خالصتاً عقائد سے متعلق تھے لیکن جس دن سے معتزلہ کی دوسری نسل کا آغاز ہوا تو بتدریج یہ تحریک بنیادی طور پر ایک علمی اور عقلی تحریک کا انداز اختیار کرتی چلی گئی اور اس نے اشاعرہ کے برخلاف نقل کے بجائے عقل کو حَکَم قرار دیا اور واضح طور پر اعلان کر دیا کہ خیر و شر کا تعین اور حُسن و قبح کا فیصلہ عقل کرتی ہے اور ہمیں محض عقل پر اعتماد کرنا چاہیے جب کہ اشاعرہ اس کے برعکس رائے رکھتے تھے۔ نکلسن کہتے ہیں کہ

''اشعریت کا عروج فلسفے کی موت اور عقل پر سے اعتماد اُٹھ جانے کا اصل سبب تھا۔''

معتزلہ کا تاریخی اور سیاسی پس منظر

چیزیں اپنے عہدِ آغاز سے قبل ہی موجود ہوتی ہیں۔ بہ ہر حال تاریخی طور پر جس دور میں تحریکِ اعتزال کا باقاعدہ آغاز ہوا وہ دوسری صدی ہجری کا پہلا عشرہ ہے۔ اس تحریک کے ساتھ مبصرانہ خلوص برتنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلی صدی ہجری کے ذہنی اور واقعاتی نشیب و فراز کو پوری طرح ملحوظ رکھیں اس لیے کہ یہ تحریک پہلی صدی ہجری کے بطن ہی سے پیدا ہوئی تھی۔ میں بعض بنیادی محرکات اور عوامل کو واضح کرنے کے لیے اپنی گفت گو کا سلسلہ ۴۰ھ سے شروع کروں گا۔ لہٰذا آپ یوں تصور کیجیے کہ جنگِ صفین اپنے عواقب و نتائج کے ساتھ ختم ہو چکی ہے۔ صحرائے عرب کے دہشت پسند قبائل لاحکم الا اللہ کے نعرے بلند کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ حضرت علیؓ کو مسجدِ کوفہ میں دہشت انگیز طور پر قتل کیا جا چکا ہے اور گویا شام کے مقابلے میں عراق کو ناگہانی طور پر مکمل شکست ہو چکی ہے۔ اس وقت اسلامی معاشرہ خفیف استثنا کے ساتھ لازماً دو ہی قسم کے افراد پر مشتمل ہے، یعنی ان میں سے بعض قاتل ہیں اور بعض مقتولین کے سوگ وار یعنی علی العموم حالات اور ان کے نتائج سے غیر متعلق کوئی نہیں۔ غیر جانب دار افراد کے لیے غیر جانب دار رہنا مشکل ہو گیا ہے۔

مثبت اور منفی اقدار آپس میں کچھ اس طرح پیوست ہیں کہ تمیز محال ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے ذہن ایک عذاب میں مبتلا ہیں۔ افکار میں توازن اور طبیعتوں میں رسوخ و وثوق باقی نہیں رہا ہے۔ ۴۰ھ کے بعد ۶۲ھ اور ۶۳ھ تک پہلے سے کہیں زیادہ شدید حالات پیش آ چکے ہیں۔ ہم سنتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عبداللہ ابنِ عمرؓ کے پاس آیا جس کی تلوار مقدس انسانوں کے خون سے رنگی ہوئی تھی اور اس نے سوال کیا کہ مجھ سے ایک مچھر ہلاک ہو گیا ہے۔ اس کی دیّت (خون بہا) کیا ہو گی؟ اس ذہنی تضاد اور دماغی انتشار کا اصل سبب یہ ہے کہ عہدِ صحابہ سے لے کر عہدِ تابعین تک اسلامی تاریخ کی بیش قیمت ترین ہستیاں خود مسلمانوں کے ہاتھوں ہلاک ہو چکی ہیں۔ اگرچہ پہلی صدی ہجری کا دوسرا نصف حصہ بھی قریب الختم ہے اور اس عرصے میں اُموی حکومت نے سیاسی طور پر کئی منظم اور مستحکم دور بھی گزار لیے ہیں مگر ذہنی سطح پر اب بھی اضطراب اور تموّج باقی ہے بل کہ بڑھ رہا ہے۔

کوفہ و دمشق کے مابین قریوں، خیمہ گاہوں، نخلستانوں اور شہروں میں مخالفانہ اور موافقانہ انداز میں گزرے ہوئے واقعات کا تذکرہ اب بھی جاری ہے لوگ اپنی صبح وشام کی سیر گاہوں میں اکثر انھی واقعات پر گفت گو کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ عراق اور شام کے درمیان کی مسافتیں قطع کرنے والے راحلے ایک زمانے سے ان باتوں کو سُنتے رہے ہیں۔ کوفے میں آئے تو یہاں مسجدوں میں یہی بحثیں جاری ہیں۔

یہی وہ فضا تھی جس میں اسلامی تاریخ کا مشہور ترین نظریہ مرجئیت وضع کیا گیا مرجئیت کا لفظ ارجا سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں اُمید دلانا آپ مرجئیت کو اخلاقی مجرموں اور ظالموں کا وکیل قرار دے سکتے ہیں۔ اس مکتبۂ خیال کی مخلصانہ کوشش یہ تھی کہ جرائم اور مظالم کے ساتھ خیر اندیشی اور حسنِ ظن کا سلوک اختیار کیا جائے۔ بہ ہر حال انسانی اقدار کے ساتھ اس مکتبۂ خیال کا برتاؤ کافی دل چسپ تھا اسی ماحول میں جبریت نے بھی اپنے مدرسے کا افتتاح کیا۔ جہم ابنِ صفوان جبریت کا ایک ممتاز مبلغ تھا اس لیے اس دور کے جبری خیالات جہمیت کے نام سے مشہور ہوئے جہمیت اور مرجئیت کے خلاف حسنؒ ابنِ محمد حنفیہ نے نظریۂ قدر واختیار کی اساسیں قائم کیں۔ وہ اسلامی تاریخ کے پہلے قدری مفکر تھے ان کے ایک دوسرے ہم عصر دانش ور، معبد جہنی نے بھی اسی نظریے کی تائید و تبلیغ کی، قدریت کا یہ تیز زبان دانش ور اکثر شاہ راہوں سے یہ کہتا ہوا گزرتا تھا کہ:

> **هولاء الملوک لیسفکون دماء المسلمین ویاخذون اموالهم ویقولون انما تجری اعمالنا علی قدر الله.**
>
> ”یہ حکم ران مسلمانوں کا خون بہاتے ہیں، انھیں لُوٹتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال تو قضائے الٰہی کے مطابق ہیں“۔

۸۰ھ میں عبدالملک نے معبد کو اس کے انھیں خیالات کی بہ دولت قتل کرادیا۔ اس قتل کے بعد غیلان دمشقی نے جو حسنؒ ابنِ محمد حنفیہؒ اور معبد جہنی کا شاگرد تھا قدریت کی پُر زور تبلیغ شروع کی اس کی تبلیغ کے زیرِ اثر عراق ہی نہیں حجاز میں بھی اکثر اکابر مرجئیت و جبریت کے خلاف ہونے لگے تھے۔ یہ صورتِ حال حکومت کے لیے ناسازگار ثابت ہوتی اس لیے

ہشام نے غیلان دمشقی کو قتل کرادیا۔ یہ تاریخ کا بڑا ہی دردناک قصہ ہے۔ اولاً اس کے ہاتھ قطع کیے گئے پھر پیر اور زبان، اس کے بعد ذبح کر دیا گیا۔ اس کے ہم خیال دوست اور رفیقِ کار صالح کو بھی یہی سزا دی گئی۔ کہتے ہیں کہ یہ دونوں آخر وقت تک اپنے نظریات پر قائم رہے یہ ۱۰۵ھ کا واقعہ ہے۔ غیلان کو اس کی ہمت، دانش وری اور انجام کے اعتبار سے سقراطِ مشرق کا لقب دیا جانا چاہیے۔ دنیائے اسلام میں اس وقت جو مکاتبِ فکر قائم تھے ان کو غالباً اس طرح تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ اُموی مکتبۂ فکر: اسے سرکاری مکتبۂ فکر کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ مرجئیت اور جبریت کا قائل تھا۔ اس مکتبے کی توجیہ اس کے سیاسی مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر ہی کی جاسکتی ہے۔

۲۔ مکتبۂ اہلِ حدیث: یہ علیؓ و معاویہؓ دونوں کے اسلام و ایمان کا قائل تھا البتہ اس کے خیال میں حضرت علیؓ حق پر تھے اور حضرت امیر معاویہؓ سے خطائے اجتہادی سرزد ہوئی تھی۔

۳۔ مکتبۂ زہاد: اس کے سرِ حلقہ امام حسن بصریؒ تھے۔ اس مکتبے کا ارتقا مختلف اثرات وعوامل کے تحت تصوف کی شکل میں ہوا۔

۴۔ ہاشمی مکتبۂ فکر: اس کے بانیوں میں حضرت علیؓ کے پوتے امام ابو ہاشم عبداللہؒ اور ان کے بھائی حسن ابنِ محمد حنفیہؒ کے نام آتے ہیں اور ممتاز داعیوں میں معبد جہنی اور غیلان دمشقی شامل ہیں۔ یہ لوگ حریّتِ ارادۂ انسانی یا نظریۂ اختیار کے مبلغ تھے۔ خلفائے عباسی کے مورثینِ اعلیٰ بھی اس مکتبۂ فکر میں شامل تھے اور امام ابو ہاشم کی وفات کے بعد انھوں نے کہا کہ ہم ان کے جانشین ہیں۔ اس مکتبۂ فکر کے پیشِ نظر کچھ سیاسی مقاصد بھی تھے۔ اس مکتبے نے بنو اُمیہ کے خلاف خفیہ تحریکیں چلائیں جن کے نتیجے میں خاندانِ عباسی کی عظیم خلافت قائم ہوئی البتہ ان سیاسی مقاصد کو اس مکتبے کے بانی امام ابو ہاشمؒ سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا۔ یہ مقاصد خلافتِ عباسیہ کے داعیوں نے تجویز کیے تھے۔

۵۔ فاطمی مکتبۂ فکر: اس کے نگراں امام محمد باقرؒ تھے یہ مکتبہ بھی حریّتِ ارادہ اور قدریت کا قائل تھا۔ ہاشمی مکتبۂ فکر اور اس مکتبۂ فکر کے درمیان کوئی نظریاتی اختلاف نہیں

اس مکتبے میں مابعد الطبعی اندازِ نظر بہت مقبول ہوا اور علمِ کلام تو گویا اس سے مخصوص ہے۔

۶۔ خوارج: یہ جماعت ہر مکتبے کے خلاف تھی اس کا خیال تھا کہ حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ اور ان کے ساتھی کافر ہیں۔

ان مکاتب میں مرجیۂ اور خوارج کے علاوہ کم وبیش سب ہی قدیم فلسفیانہ افکار سے متاثر تھے۔ البتہ مکتبۂ اہلِ حدیث پر فلسفیانہ افکار کا بہت ہی کم اثر تھا۔ تحریکِ اعتزال کے ظہور میں ان مکاتب کا بڑا دخل ہے۔ انھی کا نہیں بل کہ جہمیہ اور خوارج کا بھی۔

معتزلہ کا آغاز

پہلی صدی ہجری کے اس ذہنی پس منظر میں معتزلہ کا ظہور ہوا' ۱۱۰ھ یا ۱۱۱ھ کا واقعہ ہے۔ امام حسن بصریؒ شاید عصر کی نماز کے بعد مسجد میں اپنے حلقے کے درمیان بیٹھے ہوئے بعض مسائل پر گفت گو کر رہے تھے کہ ناگاہ ایک شخص داخل ہوا اور اس نے امام حسن بصریؒ سے مخاطب ہو کر کہا کہ:

> ''یا امام الدین! ہمارے زمانے میں ایک جماعت ظاہر ہوئی ہے جو گناہِ کبیرہ کے مرتکب کو کافر بتاتی ہے۔ یہ لوگ خارجیوں کے ایک فرقے وعیدیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک دوسری جماعت ہے جو گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے کے لیے مغفرت کی اُمید رکھتی ہے۔ اس کے خیال میں گناہِ کبیرہ کے ارتکاب سے مسلمان کے ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا جس طرح حالتِ کفر میں اطاعت وعبادت کرنے سے کفر میں کمی نہیں آجاتی۔ یہ لوگ مرجیۂ کہلاتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی رائے کیا ہے؟''

امام حسن بصریؒ نے یہ تقریر سُن کر سر جھکا لیا اور کچھ غور کرنے لگے' اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتے' ایک ۳۰ یا ۳۱ سالہ جوان جو اپنی ہیئت اور کیفیت سے فلسفی معلوم ہوتا تھا حلقے کے درمیان سے یہ کہتا ہوا اُٹھا کہ ''میں گناہِ کبیرہ کے مرتکب کو مومن یا کافر نہیں کہوں گا بل کہ وہ ان دونوں منزلوں کے درمیان ہے''۔ (المنزلۃ بین المنزلتین) یعنی نہ وہ کافر ہے نہ مومن اور ایک ستون کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اسی موضوع پر تقریر کر رہا تھا۔ امام حسن بصریؒ

نے یہ تقریر سُن کر کہا کہ "اعتزل عنا واصلؒ" واصل نے ہم سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

امام عبدالکریم شہرستانی نے بھی اپنی مشہورِ عالم تالیف "کتاب الملل والنحل میں یہ واقعہ اسی ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے یہ جوان معتزلہ کے بانی واصل ابنِ عطا غزال تھے اس دن سے ان کو اور ان کے ہم خیالوں کو معتزلہ کہا جانے لگا۔ واصل ابنِ عطا ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱ھ میں وفات پائی۔ امام ابو ہاشم اور ان کے بھائی حسنؒ ابنِ محمد حنفیہؒ نے ان کو تربیت دی تھی۔ وہ انھی دونوں کے شاگرد تھے اور نظریۂ اعتزال انھی بھائیوں کی تعلیمات کے زیرِ اثر قائم کیا۔ خود امام ابو ہاشم کی شخصیت واصل ابنِ عطا سے کہیں زیادہ تشریح طلب ہے وہ بڑی پراسرار اور سوالات آفریں شخصیت کے مالک تھے۔ اسلامی مشرق کی کئی فکری تنظیمیں اور تہ نشین تحریکیں انھی کے زیرِ اثر ظہور پذیر ہوئیں وہ فلاطونی خانقاہوں کے دانش وروں سے مشابہہ تھے۔ نوافلاطونی راہبوں کی طرح ان کی مبہم شخصیت کے گرد بھی عظمت و اسرار کے ہالے نظر آتے ہیں۔ امام ابو ہاشم کی وفات کے بعد واصل، امام حسن بصریؒ کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ معتزلہ کے یہ عظیم بانی اپنے وقت کے ایک متبحر عالم، جید ادیب اور بے مثال خطیب تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی زبان سے حرف (ر) کا صحیح تلفظ نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے بسیط خطبوں میں بے تکلف ایسے الفاظ استعمال کرتے چلے جاتے تھے جن میں (ر) کا حرف ہی نہ آئے۔ کسی نے کہا کہ جناب آپ "اسرج الفرس" (گھوڑے پر زین لگاؤ) کے بجائے کیا جملہ استعمال کریں گے۔ کہا کہ: "البدالجواد۔"

ایک بار کسی اور شخص نے امتحاناً سوال کیا کہ "رکب فرسہ وجر رمحہ" (وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور نیزہ تان لیا) کی جگہ آپ کیا کہیں گے؟ یہ ایسا جملہ ہے جس کے ہر لفظ میں حرف (ر) آیا ہے بہ ہر حال واصل نے فوراً کہا کہ استوی علی جوادہ و سحب عاملہ اس لیے ایک شاعر نے ان کی مدح میں کہا تھا۔

علیم بابدال الحروف و قامع　　　لکل خطیب یغلب الحق باطلہ

وہ ایک حرف کے بجائے دوسرا حرف استعمال کرنا جانتے ہیں اور ہر مقرر کو شکست دے دیتے ہیں۔ ان کی غلط رائے بھی دوسروں کی صحیح رائے پر غالب آ جاتی ہے۔

انھوں نے دوسرے مذاہب کے رَد اور اپنے مسلک کی تائید میں کتابیں بھی تحریر کی تھیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) کتاب المنزلۃ بین المنزلتیں (۲) اصناف المرجیہ (۳) طبقات اہل العلم والجہل اور ایک کتاب مانویت کے رَد میں۔ معتزلہ کی ایک شاخ واصلیہ انھی سے منسوب ہے۔

دیگر توجیہات

لفظ معتزلہ اور بانیانِ معتزلہ کے سلسلے میں بعض اور رائیں بھی ہیں ان میں سے ایک رائے یہ ہے کہ جب امام حسنؓ خلافت سے دست بردار ہوئے تو پیروانِ علیؓ نے طے کر لیا کہ اب ہم تمام مشاغل کو ترک کر کے اپنی زندگیاں علم و ریاضت میں بسر کر دیں گے۔ چناں چہ اس عزلت گزینی کے باعث یہ لوگ معتزلہ یعنی عزلت گزیں کہے جانے لگے۔ ایک دوسرے خیال کے مطابق معتزلہ کے سرگروہ اصل میں سعدؓ ابنِ مالکؓ سعدؓ ابنِ ابی وقاصؓ، حضرت عبداللہ ابنِ عمرؓ، محمدؓ ابنِ مسلمہ انصاریؓ اور اسامہؓ ابنِ زید وغیرہم ہیں۔ ان حضرات نے غیر جانب دار رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا' ان میں سے ایک شخص احنف ابنِ قیس نے اعلان کیا کہ:

ایھا الناس اعتزلو الفتنہ اصلح لکم لوگو! فتنے سے بچو یہی تمھارے لیے بہتر ہے۔ اس خیال کے مطابق یہی فقرہ معتزلہ کا ماخذ ہے۔ عام طور پر لوگوں کو لفظ اعتزال سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ پہلی صدی ہجری کے جن فقروں میں ان کو اعتزال کا لفظ یا اس کا کوئی مشتق نظر آیا اس کو تحریکِ معتزلہ کا ماخذ قرار دے دیا اور فرقۂ معتزلہ کے نظریات کو قطعاً ملحوظ نہیں رکھا۔ طے شدہ امر یہ ہے کہ واصل ابنِ عطا ہی معتزلہ کے بانی تھے۔ معتزلہ کو اصحاب التوحید والعدل بھی کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح ان کے مذہبی عقائد کو ظاہر کرتی ہے۔ عقائد کے سلسلے میں معتزلہ کے پانچ اُصول ہیں۔ (۱) توحید و عدل (۲) وعد و وعید (۳) المنزلۃ بین المنزلتین (۴) امر بالمعروف (۵) نہی عن المنکر معتزلہ اپنے اُصولِ خمسہ میں مختلف مکاتب سے متاثر ہوئے ہیں اور ان کے ذریعے مختلف اسلامی فرقوں کو متاثر کیا ہے۔ ان کے عقلی مزاج اور نظامِ فکر کے پیشِ نظر اُن اُصول کے بعض اجزا کچھ غیر متعلق اور نامربوط معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً المنزلۃ بین المنزلتیں۔ یعنی گناہِ کبیرہ کا مرتکب نہ مومن ہوتا

ہے اور نہ کافر۔ یہ اصل ان کے دوسرے نظریات سے مناسبت نہیں رکھتی۔ مثلاً حریّتِ ارادۂ انسانی کا نظریہ غالباً انھوں نے المنزلۃ بین المنزلتین کا عقیدہ قائم کر کے بنواُمیہ کے سیاسی اقتدار وتسلّط کے دور میں اپنی مصلحت اندیشی اور وقت شناسی کا ثبوت دیا تھا۔ اس کے علاوہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مسئلہ بھی ان کے فلسفیانہ اندازِ نظر سے مناسبت نہیں رکھتا۔

فلسفہ اعتزال کے فکری مآخذ

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عرب دوسری صدی ہجری کے بعد یونانی علوم سے واقف ہوئے تھے۔ نیز قبائلِ عرب کا تذکرہ کرتے ہوئے ہر شخص طے شدہ طور پر یہ فیصلہ صادر کر دیتا ہے کہ ظہورِ اسلام سے قبل صحرائے عرب ظلمت کدۂ جہالت بنا ہوا تھا۔ یہ عرب کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے۔ ممکن ہے کہ عرب کی یہ تصویر کشی کسی خاص مصلحت کے پیشِ نظر کی گئی ہو یقیناً کوئی تو مصلحت ہوگی ہی۔ جاہلیت کی اصطلاح سے اس خیال کو اور بھی تقویت پہنچی۔

حالاں کہ جاہلیت کو جہالت کے ہم معنی قرار دینا بالکل غلط ہے۔ الشعرا الجاہلیہ یا الادب الجاہلی کے معنی۔ شعرائے جہالت اور جہالت کا ادب ہرگز نہیں۔ اصل یہ ہے کہ عہدِ اسلام کے مقابلے میں عہدِ جاہلیت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرح جاہلیت سے بے دینی اور گم راہی مراد ہے نہ کہ جہالت۔ اسلام سے قبل عرب کے حاشیوں پر قدیم دنیا کی عظیم ترین ثقافتوں کے رنگ ونقش صاف نظر آتے ہیں۔ یونانی فکر کے بعید اثرات عرب وعراق کے مختلف حصّوں پر پڑ چکے تھے۔ اسکندریہ، انطاکیہ اور حران میں رواقی اور نوفلاطونی افکار کی نو آبادیاں ایک مدت سے قائم تھیں۔ احبارِ یہود، رجالِ مسیحیت اور صابی ستارہ شناسوں کے ذریعہ اکابرِ عرب کے حلقے بیرونی افکار سے متعارف ہو چکے تھے۔ عربی ادب کے سب سے زیادہ بدنام اور مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کے رند مشرب قصیدہ طراز، امراء القیس کندی کو قابلِ اعتماد قرائن اور قیاسات کی رُو سے عرب میں ابیقوریت کا ادبی نمائندہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان قیاسات کو اس وقت اور بھی تقویت پہنچتی ہے۔ جب ہم اس کو ان تہذیبوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے دیکھتے ہیں جو مسیحیت کے زیرِ اثر یونانی ثقافت سے متاثر ہو چکی تھیں۔ شامی اور بازنطینی ساربانوں کے ذریعے یونان وروم کی فکری رسد عرب وعراق

میں قدیم زمانے سے جاری تھی۔ عجمی اور ہیلنی افکار کے مراکز ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہے، تھے۔ نصرانیت' صابیت' یہودیت' مانویت اور زرتشتیت کی موجودگی نے اس اثر و تاثر میں ایک خاص کیفیت پیدا کر دی تھی جسے روحانی عقلیت سے تعبیر کرنا بالکل مناسب ہوگا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں ہمیں ایسے افراد ملتے ہیں جو یونانی افکار و علوم کے محرم تھے۔ مثلاً یحیٰ نحوی جو مسلمان اکابر سے قریبی تعلق رکھتا تھا۔ بنواُمیہ کے لائق احترام شہزادے خالد ابنِ یزید نے بعض مستند روایات کی رُو سے یونانی کتابوں کے ترجمے کرائے تھے جن میں ارسطو کے مجموعے ''منطق ارغنون'' کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ خیال کہ عرب ظہورِ اسلام سے قبل اور صدرِ اسلام میں بیرونی اثرات سے بے گانہ تھے' ہمارے لیے نا قابلِ فہم ہے۔ اسلافِ معتزلہ اور اکابرِ معتزلہ نے بحث و مناظرہ کے سلسلے میں ان ثقافتوں کے افکار کو رَد بھی کیا اور قبول بھی اس طرح ایک خاص ذہنی فضا پیدا ہوگئی جس نے ایک طرف علمِ کلام ایجاد کرایا اور دوسری طرف فکر و فلسفہ کے لیے ایک تمہیدی دور کی ابتدا کر دی۔

خود بانیِ معتزلہ واصل ابنِ عطا جنھوں نے مانویت کا رَد بھی لکھا مگر اپنے نظریۂ عدل کی تہذیب و تنزیہہ میں مانویت سے اثر پذیر بھی ہوئے۔ مستشرق وان کریمر کا یہ خیال غلط نہیں کہ معتزلہ نے حریّتِ ارادہ کا نظریہ آبائے کنیسہ سے حاصل کیا تھا۔ معبد جہنی اور غیلان دمشقی جو معتزلہ کے سرپرستوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسیحیت کے ذریعے یونانی افکار سے یقیناً باخبر تھے۔ غیلان کے اساتذہ میں ایک مسیحی عالم کا نام بھی آتا ہے۔ انھی علمی ثقافتوں کا اثر تھا جو معتزلہ نے اپنے عہد میں عقل کی پُرزور حمایت کی اور کچھ عرصے تک دنیائے اسلام پر چھائے رہے۔ یہاں تک کہ مامونِ اعظم کے عہد میں ان کے مکتبۂ فکر کو سرکاری حیثیت حاصل ہوگئی۔ وہ ایک دانش دوست اور عقل پسند جماعت کی حیثیت سے تاریخِ فکرِ مشرق میں ہمیشہ ممتاز رہیں گے۔ انھوں نے عربی فلسفے میں نظریۂ طفرہ ایجاد کیا اور فلسفۂ علمِ کلام اور ادب کو ابوہذیل' علاف نظام' جاحظ' احمد بن ابی داؤد' علامہ ابنِ ابی الحدید معتزلی اور قاضی عبدالجبار جیسے حکما' ادبا اور متکلمین عطا کیے۔

مشرق کا عظیم مؤرّخ۔ مسعودی

''میں ایک دن مشرقِ بعید میں ہوتا ہوں اور ایک دن مغربِ قریب میں''۔

مسعودی

میں نے اس مضمون کی ترتیب میں کتاب الفہرس اور بطورِ خاص مجلۂ دانش تہران کے سلسلۂ مؤرخینِ اسلام سے استفادہ کیا ہے، شروع میں میرا خیال تھا کہ دانش نے مسعودی پر جو مقالہ شائع کیا ہے اسی کا ترجمہ کر دوں مگر مجھے وہ مقالہ پڑھ کر کچھ تشنگی محسوس ہوئی، ویسے زیرِ نظر مضمون بھی احساسِ تشنگی ہی پیدا کرتا ہے کیوں کہ مسعودی تو اس بات کا مستحق ہے کہ اس پر ایک مستقل کتاب مرتب کی جائے۔ جون ایلیا

کیا آپ مشرق کے عظیم ترین مؤرخ اور معتزلہ کے نام ور فرزند ابوالحسن علی ابنِ الحسین کو جانتے ہیں؟ شاید نہیں، اس لیے کہ وہ مسعودی کے نام سے مشہور ہے۔ مسعودی کو اس کے دادا سے نسبت دی جاتی تھی، اسی لیے وہ ابوالحسن علی کے بجائے مسعودی کہلایا۔ اس کی ولادت بغداد میں ہوئی، یہ تیسری صدی ہجری کا آخری زمانہ تھا۔ یہ زمانہ علم، ادب، فنونِ لطیفہ اور مختلف مکاتبِ فکر کی گرم بازاری کے اعتبار سے عراق کا عہدِ زرّیں کہلاتا ہے۔ اس نے بغداد ہی میں تعلیم حاصل کی اور تاریخ جغرافیہ، ہیئت، ادب، اخلاقیات، فلسفہ، فقہ، علمِ عقائد و اُصول اور طب میں دست گاہِ کامل بہم پہنچائی۔ اس کی علمی جامعیت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، آج ہمارے سامنے اس کی صرف مؤرخانہ حیثیت ہے مگر جب ہم یہ سُنتے ہیں کہ وہ اپنے عہد کے جیدّ اطبا میں شامل تھا تو حیران ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ عنفوانِ شباب میں مسعودی، بغداد سے نکل کر اپنی سیاحانہ مہم جوئیوں پر روانہ ہو گیا۔ اور اسلامی مشرق کے بعید ترین شہروں،

قریوں اور قبیلوں میں گھومتا رہا۔ یہ سفر اس کی مؤرخانہ زندگی میں اساسی اہمیت کا حامل ہے' اس سفر میں اس کو ممالکِ اسلامیہ کی مختلف تہذیبوں اور قومیتوں کے مطالعے کا موقع ملا۔ ۳۰۵ھ کے دوران ہم اس کو اصطخر کے کھنڈروں میں گھومتے ہوئے دیکھتے ہیں' خیال یہ ہے کہ وہ منہدم ایوانوں اور شکستہ و ریختہ محرابوں کے سائے میں ساسانی عہد کی عظمت اور ایران کی شوکتِ پاستاں کا اندازہ لگا رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے ہندوستان کا قصد کیا اور منصورہ وملتان تک آیا۔ اور یہاں کچھ دن قیام کر کے کھمبایت اور سائمور روانہ ہو گیا' ان مقامات میں وہ مدتوں قیام پذیر رہا اور پھر سیلون چلا گیا۔ مروج الذہب کی ایک نیم واضح عبارت سے یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ وہ مانسری کے جزیروں اور چین کے ساحلوں تک جا پہنچا تھا' البتہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بحرِ خزر اور بحرِ احمر کے مشرقی کناروں تک گیا تھا یا نہیں؟ بہ ہر حال اس نے یہاں کے بعد اپنا رُخ زنجبار کی طرف موڑ دیا اور عمان' شام' مصر اور دیارِ مغرب کے قافلوں میں شامل ہوتا ہوا اسپین کی سرحدوں میں داخل ہو گیا' ممکن ہے کہ وہ اس سفر میں اسپین کے مشہور مؤرخ احمد الرازی سے بھی ملا ہو۔

مسعودی کا عہد

مسعودی کی شخصیت کا پس منظر جاننے کے لیے تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے بغداد کو جاننا ضروری ہے۔ جعفر و عباس کے خلوت افروز رومانوں' ابونواس کے جذبات انگیز شعروں' معتزلہ اور اشاعرہ کے پُرشور مباحثوں اور الف لیلہ کی خواب ناک داستانوں کا شہر بغداد تیسری صدی ہجری کی ابتدا میں اسلامی علوم وآداب کا سب سے بڑا مرکز تھا لیکن چوتھی صدی ہجری سے اس کا زوال شروع ہو گیا' اس لیے کہ اب بغداد سیاسی طور پر منقسم ہو گیا تھا۔ اس کی تہذیبی اور سیاسی مرکزیت آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ ہر طرف نئے نئے مراکز قائم ہونے لگے تھے جو علم وادب کے میدان میں بغداد کے حریف تھے۔ نئے ذہن جو اسلامی مشرق کے بعید ترین گوشوں میں اُبھر رہے تھے ان کے لیے بغداد کے مدرسی جمود میں کوئی دل چسپی نہیں رہی تھی' چناں چہ وہ ان نئے مرکزوں کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ مسعودی کو فکر تھی کہ وہ کہیں ان نئے رجحانات کی رو سے کٹ کر قدامت کا شکار نہ ہو جائے۔

بغداد کے مکاتب میں بہ تدریج زوال پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ محسوس کر رہا تھا اس کے برخلاف نئے مکاتب جدید خیالات کو قبول کر رہے ہیں' دوسری طرف اس کو یہ بھی خیال تھا کہ ابھی مجھے اپنا مطالعہ متعلمانہ تندہی کے ساتھ جاری رکھنا چاہیے۔ علاوہ ازیں' جہاں گردی اور صحرانوردی کا فطری رجحان بھی اس کو سفر پر اُکساتا تھا' چناں چہ اس نے نئے مراکزِ فکر و فرہنگ کی طرف جانے کا مصمّم ارادہ کر لیا اور ایک دن اپنے مسوّدوں اور یادداشتوں کے ساتھ بغداد سے روانہ ہونے والے قافلوں میں شامل ہو گیا۔

مسعودی کی تصنیفات

فرانسیسی خاورشناس' سلوسٹر دی ساسی' جس نے اس کی مشہور تصنیف التنبیہ والاشراف کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے' اس کی تصانیف کی تعداد اُنیس بتاتا ہے۔ ابن الکتبی نے فوات الوفیات میں ان کتابوں میں سے صرف دس کے نام لکھے ہیں۔ مسعودی کی مشہور تصنیفات یہ ہیں:

1- اخبار الزمان

2- کتاب الاوسط

3- مروج الذہب

4- نظم الجواہر

5- کتاب فنون المعارف

6- خزائن الدین

7- نظم الدلل

8- تقلب الدلل

9- المسائل والعلل

10- ذخائر العلوم

11- کتاب الاستذکار

12- المقالات

رائگاں

وہ خوابوں اور خیالوں کا شہر تھا۔ مصحفی کی نوجوانی اسی شعر انگیز شہر کی گلیوں سے گنگناتی ہوئی گزرا کرتی تھی۔ میں اُتر پردیش (یوپی) کے اسی مردم خیز شہر امروہے میں پیدا ہوا۔ اس شہر کا تقریباً ہر چوتھا آدمی اگر جَم تَم شاعر نہیں تو تک بند ضرور تھا۔

شاعری، تاریخ دانی، علم و ادب کا سلسلہ ہمارے خاندان میں پشت ہا پشت سے چلا آرہا ہے۔ میرے بابا علامہ سیّد شفیق حسن ایلیا چار بھائی تھے اور چاروں کے چاروں شاعر تھے۔ کیسے سوختہ بخت لوگ تھے وہ بھی! ماشاء اللہ میرے دادا، پردادا اور ان کے دادا اور پردادا بھی شاعر واقع ہوئے تھے۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے چاروں طرف صبح سے شام تک شاعری، تاریخ، ادب، مذاہب عالم اور فلسفے کا دفترِ کھلا دیکھا اور بحث و مباحثے کا ایک عجب ہنگامہ گرم پایا۔ میں نے اپنے گھر میں دنیا کے معاملوں زندگی کے خارجی مسئلوں اور عملی حقیقتوں کے بارے میں کبھی کوئی گفت گو ہوتے ہوئے نہیں سنی۔ میں ایک ایسے ماحول میں پروان چڑھا جسے دام اور شکم سے کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ سروکار بھی نہیں تھا۔ جب مجھ میں شعور پیدا ہوا تو اپنے ماحول کی یہ صورتِ حال دیکھ کر میرے دل میں ایک ان جانی اُداسی کی کیفیت نے جنم لیا جو وقت کے ساتھ ساتھ گہری ہوتی چلی گئی۔ میرے اندر جو اذیت ناک احساس پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ہمارا گھر کسی بھی لمحے تباہ ہوسکتا ہے اور یہ کہ آیندہ ہمیں شاید بھیک مانگ کر زندگی گزارنا پڑے گی۔ عجیب بات ہے کہ اس زمانے میں بھی ایک اصیل بوا نورن اور دو ملازم ہمارے

گھر کی خدمات انجام دیتے تھے لیکن یہ محض ایک بہت ہی بوداڈراما تھا جس کے ہدایت کار بابا نہیں بل کہ ابا جی (ہمارے بڑے تائے) تھے۔ لیکن میں اپنے گھر کی یک سر بے بنیاد معاشی صورتِ حال کا ذمے دار اپنے بابا علامہ سیّد شفیق حسن ایلیا کو قرار دیتا ہوں۔ خدا اُن کی مغفرت کرے۔ ان کی علمی، تخلیقی اور تحقیقی قلندری نے میرے معصوم ذہن کو ایک عذابِ الیم میں مبتلا کر رکھا تھا۔

بابا بد نصیبی سے کئی علوم کے جامع تھے اور کئی زبانیں جانتے تھے یعنی فارسی، عربی، سنسکرت، عبرانی اور انگریزی۔ موصوف نے اُردو اور فارسی کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی شاعری فرمائی اور عربی میں ایک کتاب ''سوط العذاب'' لکھی۔ علمِ ہیئت (Astronomy) سے انھیں غیر معمولی شغف تھا۔ علمِ ہیئت کے مسائل سے متعلق رصدگاہ گرینچ (Greenwich Observatory) انگلستان کے ماہرین اور مشہور فلسفی برٹرینڈ رسل اور جنوبی ایشیا کی ایک رصدگاہ کے ڈائریکٹر مسٹر نرسیان سے ان کی خط کتابت ہوتی رہتی تھی۔ میں جو اُن کا قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کر رہا ہوں تو وہ اس لیے کہ ان کا ذکر حقیقت میں ان کا ذکر نہیں، میری سوختہ بختی کا ذکر ہے۔ اگر وہ میرے باپ نہ ہوتے، ان کے بجائے کوئی اور شخص کوئی اور معقول اور دنیا شناس شخص ہوتا تو میں آج وہ نہ ہوتا جو ہوں۔ میں ایک کامیاب ترین، صحت مند اور قابلِ رشک آدمی ہوتا اور میری زندگی عیش ہی نہیں بل کہ بے حد شان دار عیاشی کے ساتھ گزر رہی ہوتی۔

میری پیڑھی کے افراد کی اکثریت نے بھی اپنی قدیم ترین خاندانی عادت اور روایت کے مطابق علم، ادب اور شاعری سے اپنا رشتہ استوار کیا جیسے رئیس امروہوی، کمال امروہوی اور انٹرنیشنل فلاسفی کانگریس کے رکن فلسفی، علامہ محمد تقی۔ یہ سب کے سب کامیاب رہے، نام وری حاصل کی۔ مگر میں غریب اول جلول شخص کا آدمی بُری طرح مارا گیا اور وہ اس لیے کہ میں ان سب سے زیادہ خیال پسند، مثالیہ پرست (idealist) اور اپنے رجحانات میں بے حد ضدی واقع ہوا تھا۔

مباحث کا تعلق ہے'اس کا جواب نہیں' مگر ترتیب کے اعتبار سے ناقص ہے۔ مسعودی نے اس میں رطب ویابس سبھی کچھ جمع کر دیا ہے مگر اسے اتنی فرصت نہ مل سکی کہ انتخاب اور ترتیب سے کام لے سکتا۔ ہوا یہ کہ وہ اپنی طویل سیاحتوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی عراق میں چین سے نہ بیٹھ سکا' اسے بعض نامعلوم اسباب کے باعث مجبور ہو کر عراق کے باہر قیام کرنا پڑا' چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تھکا ہارا جہاں گرد اپنی زندگی کے آخری دس سالوں کے دوران کبھی شام جانے پر مجبور ہوتا ہے اور کبھی مصر۔ مروّج الذہب میں کیا نہیں ہے' سبھی کچھ ہے' مذاہب' خرافیات' ادبیات' تاریخی و جغرافیائی معلومات' محاربات' زراعت و تجارت' معدنی تحقیقات' فنِ جہاز رانی' لطائف وظرائف غرض دنیا بھر کی معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔

حسبِ دستور اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ بھی سب سے پہلے علمائے مغرب ہی نے لگایا اور اسے گم نامی کے اندھیرے سے نکالا' تب جا کر مشرق والوں کو معلوم ہوا کہ اس کتاب کی بھی کوئی قیمت ہے۔ غلامی اور بطورِ خاص ذہنی غلامی قوموں سے فیصلے کی قوت چھین لیتی ہے۔ پھر ان کا ہر فیصلہ مستعار ہوتا ہے' بہ ہر حال لندن کی انجمنِ ترجمہ نے انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں اس کا ترجمہ کیا۔ اور مفید یادداشتوں کے ساتھ شائع کرایا۔ اس کے بعد اس کتاب کے ترجمے اور اس کی اشاعت کا سلسلہ یورپ میں برابر جاری رہا۔

مسعودی اور طبری

مسعودی بعض اعتبارات سے اپنے مشہور پیش رو' ابنِ جریرِ طبری کے مقابلے میں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ طبری بنیادی طور پر ایک فقیہہ اور محدث تھا' ساتھ ہی ساتھ ہمیں اس کے تیز حافظے کی تعریف بھی کرنا چاہیے جس پر اعتماد کر کے وہ لاکھوں حدیثیں سُنا سکتا تھا۔ خود تاریخِ طبری دیکھ کر بھی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ تاریخ میں زیادہ تر احادیث سے کام نکالتا ہے' پھر یہ کہ طبری ان عرب مؤرخین میں شامل ہے جنھوں نے تاریخ نگاری کے عجمی اُصول سے استفادہ نہیں کیا تھا' وہ بنیادی طور پر عرب روایات سے متاثر رہا۔ ایرانی اُصولِ تاریخ نویسی کی رُو سے مؤرخ کو غیر متعلق' غیر متاثر اور درایت پسند ہونا چاہیے' وہ اقوام و ملل کے اعمال و افکار کی خبریں لاتا ہے' ان کی وکالت نہیں کرتا۔ میرا یہ مطلب ہرگز

نہیں کہ طبری کے مقابلے میں مسعودی ایک مثالی مؤرخ ہے' اس کی تاریخی دستاویزیں خامیوں سے پاک ہیں' ہرگز نہیں' اس کے یہاں بھی ہمیں مہمل اور دوراز کار حکایات ملیں گی' وہ بھی اس عہد کے مؤرخین کی طرح اپنی تاریخ کا آغاز عہدِ ماقبلِ تاریخ ہی سے کرتا ہے۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس کا رجحان تحقیق' تلاش' تفحص اور تجسس کی طرف ہے' وہ بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں ہر کامیابی اس کا مقدر نہیں تھی مگر اس میں کدوکاوش کا ایک جذبہ تو تھا پھر ان دونوں میں ایک خاص فرق یہ بھی ہے کہ طبری جس مقام پر ایک محدث کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے' مسعودی وہاں ایک عالم اور محقق بن جاتا ہے۔ تاریخ نگاری کا یہ صحت مند تصور مسعودی کے علاوہ حمزہ اور یعقوبی کے یہاں بھی ملتا ہے' بہ ہر حال وہ کوشش یہ کرتا ہے کہ اسلامی علاقوں سے آگے نکل کر بھی زندگی کا مطالعہ کرے' اقوام کا جائزہ لے۔ عیسائیوں سے ملے' ان کی کتابوں سے استفادہ کرے۔ ان کے دلائل سُنے' وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اسلامی علوم کے علاوہ دوسرے علوم سے بہرہ مند نہ ہو اور ایک مخصوص چار دیواری میں محصور ہو کر رہ جائے۔ اس نے خود لکھا ہے کہ وہ مسیحی علما سے برابر ملتا رہا ہے' اُس نے اُن کی کتابوں کا کافی غوروخوض سے مطالعہ کیا ہے' وہ یونانِ قدیم اور ہندوستان کے افکار کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس نے اسلامی تاریخ کا صحیح جائزہ لینے کے لیے احبارِ یہود' صابی اور مسیحی علما اور قرامطہ کے داعیوں سے دوستی پیدا کی اور اس طرح ان کے خیالات' عقائد اور اخلاق سے متعلق صحتِ بیان کے امکانات کو تقویت پہنچائی۔ وہ اسکندریہ کے دورانِ قیام میں وہاں کے بطریق اور مؤرخ اوتیکوس (Eutychius) سے ملا اور اس کی تصانیف کا مطالعہ کیا اور بہت سے مسائل کے بارے میں مصنف سے مزید وضاحت چاہی۔ بغداد میں یعقوبی فرقے کے ایک عالم ابوزکریا سے تعلقات استوار کیے اور اس کے مکان پر گیا' جو محلام جعفر میں واقع تھا اور مسئلہ تثلیث پر اُس سے دیر تک بحث کی۔

غالباً ان بحثوں کو اس نے اخبار الزمان میں بیان کیا ہے مگر افسوس کہ آج اخبار الزمان ناپید ہے۔ عیسائیوں کی طرح وہ یہودیوں سے بھی بہت قریب رہا۔ ان کے

ساتھ طویل صحبتیں رہیں، چناں چہ ہم اس کے ایک مناظرے کا حال پڑھتے ہیں جو اس نے فلسطین جا کر ابو کثیر نامی ایک یہودی عالم سے نسخِ شریعت کے بارے میں کیا تھا۔ شہر رقہ میں بھی اس نے مشہور ریاضی داں اور عرب کے نام ور طبیب ثابت ابنِ قرہ کے ایک شاگرد سے فلسفہ و طب کے موضوع پر کافی گفت گوئیں کیں۔ جس زمانے میں قرامطہ بغداد کی عظمت کو دھمکیاں دے رہے تھے، وہ اپنی انھی تحقیقات میں مصروف تھا۔ مسعودی نے متکلمین پر سخت تنقید کی ہے، وہ کہتا تھا کہ یہ لوگ قرامطہ کے اُصول وعقائد کو تو جانتے نہیں، ان پر اعتراض کر دیتے ہیں۔

مسعودی، معلمِ ثانی ابونصر فارابی کا نام بڑے احترام سے لیتا ہے، اس نے کہا ہے کہ "ابونصر فارابی سے زیادہ جیّد فلسفی میری نظر میں کوئی نہیں۔" یہ رائے اس نے ایک مؤرخ کی حیثیت سے قائم نہیں کی تھی، صرف ایک مؤرخ کو تو یہ حق بھی نہیں پہنچتا کہ وہ فلسفیوں کے درجے متعین کرے۔ وہ علوم کا محقق اور اجتماعیات کا دانش ور بھی تھا۔ ہیئت داں اور طبیب بھی، اس کی شخصیت کی علمی جامعیت قابلِ رشک ہے۔ ہاں! تو آخر کار مشرق کا یہ وسیع النظر عالم، ہمہ داں مؤرخ اور سیماب پا صحرا نورد، فسطاط، یعنی قدیم قاہرہ میں اپنے طے کیے ہوئے وسیع ترین فاصلوں پر آخری نظر ڈالتا ہوا عدم کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ معلوم نہیں کہ ۳۴۶ھ کا یہ کون سا مہینا تھا اور مہینے کی کون سی تاریخ تھی!

انشا، جولائی 1959

مرد برقع اوڑھیں

چند ماہ کی بات ہے کہ ''صدر ایوب کے نام ایک کُھلا خط'' کے عنوان سے انشا میں میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں محترم صدرِ مملکت کی توجہ جہالت، رجعت پرستی اور عورتوں کے حقوق کی طرف مبذول کرائی گئی تھی۔ قوم کی بھیانک غربت، خستہ حالی اور مولویوں کی عقل دشمنی کا رونا رویا گیا تھا۔ اس کے بعد میرا ایک اور مضمون ''کیا پاکستان میں صرف مرد رہتے ہیں'' انشا ہی میں اشاعت پذیر ہوا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ افلاس، جہالت، رجعت پرستی اور مولویوں کی بے حسی اور بے ضمیری کا گلہ کرنا ایسا جرم ہے کہ جس کے مجرم کو بخشا ہی نہیں جا سکتا اور عجیب ترین بات یہ کہ میری چند بہنیں ہی مجھ سے اس سلسلے میں سب سے زیادہ ناراض اور برہم ہیں۔ میں نے جہالت اور بے شعوری کا خاص طور پر گلہ کیا تھا۔ کیا یہ جہالت اور بے شعوری کی انتہا نہیں کہ خود عورتیں ہی عورتوں کے حقوق کی مخالفت کرنا اپنا مقدّس فرض خیال کر رہی ہیں۔ کیا یہ ذہنی دیوالیا پن کی حد نہیں ہے کہ آدمی خود اپنے ہی مطالبات اور جذبات کے خلاف زہر اُگلنے لگے اور یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ وہ کہہ کیا رہا ہے؟ کاش تحریر کا یہ زور اور خلوص اور دماغ کی یہ قابلِ رشک صلاحیتیں کسی معقول کام میں صرف ہوتیں، کیا لے دے کر اب صرف یہی کام رہ گیا ہے کہ ہماری بہنیں بے پردگی و بے باکی کے خلاف واویلا کریں اور جن باشعور خواتین نے پردے جیسی دقیانوسی اور احمقانہ رسم کے خلاف آواز بلند کی ہے ان کے لیے کفر کے فتوے صادر کریں۔

ان لوگوں پر کبھی آپ کا عتاب نازل نہیں ہوتا جو عوام کو لُوٹ رہے ہیں۔ جب قوم کی ناموس سڑکوں پر بھیک مانگتی ہے تو آپ کی رگِ حمیت ذرا نہیں پھڑکتی۔ آپ کو غصہ آتا ہے

تو صرف اس بات پر کہ فلاں بے پردہ ہے' فلاں بے باک ہے۔ آپ سوچیے کہ آپ کس دور اور کس ماحول میں زندگی گزار رہی ہیں۔ دنیا کے کیا تقاضے ہیں اور آپ نے انھیں کہاں تک پورا کیا ہے؟

میری ایک بہن نے مراسلے میں لکھا ہے کہ "ہماری پردہ نشیں بوڑھیاں اور باعصمت لڑکیاں اب بھی بے پردگی و بے باکی کو لعنت سمجھتی ہیں۔ وہ مرد کے دباؤ کے تحت یا کسی چال اور کسی مکر کے باعث پردہ نہیں کرتیں بل کہ خلوصِ نیت کے ساتھ اس کو اپنے عورت پن کا اچھوتا پن سمجھتی ہیں" میرے لیے مناسب تو نہیں ہے کہ اس سلسلے میں کچھ کہنے کی جرأت کروں لیکن پھر بھی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ ہماری پردہ دار بہنیں پردے کے نام سے سماج کو دھوکا دینے کی پرانی عادت اب ترک کر دیں۔ اب اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ جب ہماری صنف کی طرف سے اس قسم کی باتیں سُننے میں آتی ہیں اس وقت ہم میں سے ہر معقولیت پسند فرد اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ صنفِ نازک میں جہالت کے علاوہ دوغلاپن' ریاکاری اور فریب دہی جیسے اخلاقی اور انسانی عیوب بھی مردوں سے کچھ زیادہ ہی پائے جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ان باتوں کا دعویٰ کرتی ہیں جن سے دُور کا بھی واسطہ نہیں رکھتیں فقط یہی نہیں بل کہ دردل ان باتوں کی سخت مخالف ہوتی ہیں لیکن اس کے بجائے کہ ان عیوب کو دُور کرنے کی کوشش کریں جب سچی بات کہی جاتی ہے' اس وقت اُلٹی سیدھی باتیں کرنا شروع کر دیتی ہیں جو حق گوئی کی جرأت کرتا ہے اس کے پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ شاید صرف اس لیے کہ یہ جرأت ان میں کیوں نہیں۔ چلیے میں اپنا مطالبہ چھوڑے دیتی ہوں۔ آپ شوق سے پردہ کیجیے لیکن خدارا پردے کے نام پر دھوکا تو نہ دیجیے پردہ کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو سچ مچ کا پردہ کیجیے۔ واقعی اگر آپ نے پردہ کرنا چھوڑ دیا تو پھر ہماری قوم دنیا کو کس طرح منہ دکھا سکے گی۔ یہ پردہ ہی تو ہے جس کی برکت سے آج آپ کی قوم دنیا کی سب سے زیادہ "تعلیم یافتہ" "دولت مند" "مہذب" اور "ترقی یافتہ" قوم سمجھی جاتی ہے۔ آپ نے علوم وفنون کے ہر شعبے میں ساری دنیا کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر پردہ نہ ہوتا تو یہ معجزے بھلا کس طرح ظاہر ہوتے۔ اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو میں اپنی

پردہ دار اور باحیا بہنوں سے بہ صدِ ادب واحترام یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ......

کیا آپ سچ مچ پردہ کرتی ہیں؟

کیا آپ نے آج تک کسی نامحرم پر نظر نہیں ڈالی؟

جھوٹ زندگی کی بہت بڑی ضرورت ہے لیکن اگر کبھی کبھی سچ بھی بول لیا جائے تو کوئی بُری بات نہیں ہے۔ میں پوچھتی ہوں کہ جب ہماری باحیا' باعصمت اور باحجاب بیبیاں پیدل یا سواری میں بازاروں سے گزرتی ہیں' دکانوں میں جاتی ہیں' سینما دیکھتی ہیں' قوالی اور میلاد خوانی کی محفلوں اور مجلسوں میں شریک ہوتی ہیں، میلوں اور نمایشوں میں گھومتی ہیں، جلسوں اور جلوسوں کا نظارہ کرتی ہیں تو کیا اس ساری مدت میں ان کی آنکھیں بند رہتی ہیں؟ آخر وہ بات کیوں کہی جائے جس کو سُن کر لوگ مذاق اُڑائیں۔ سچ پوچھیں تو پردہ بھی مرد ہی کرتے ہیں آپ نہیں کرتیں، کر ہی نہیں سکتیں' یہ کہیں آپ کے بس کی بات ہے؟ یہ پردہ خوب ہے کہ آپ تو نقاب کی جالیوں سے بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی شرم وحیا کی شعاع افگنی کرتی رہیں اور مرد کی پلک بھی جھپک جائے تو دیدہ دلیر کہلائے۔ سیدھی سی بات ہے کہ آپ پردے کو بالکل اس طرح استعمال کرتی ہیں جس طرح مرد گہرے رنگین چشمے کو' مقصد دونوں کا ''نظر بازی'' اور ''چشم پوشی'' ہے۔ میں قوم کے اربابِ حل وعقد سے گزارش کروں گی کہ پردے کو اس کی اصل شکل میں نافذ کیا جائے۔ ثواب ہی کمانا ہے تو پھر جی کھول کر کمایا جائے۔ پردے کے حامیوں کو چاہیے کہ وہ مردوں سے بھی برقع اوڑھنے کی اپیل کریں تا کہ پردے کی غایت پوری ہو اور ''پردہ دار' باعصمت اور باعفت بیبیوں کو پورا پورا لطف آجائے اور ان کی مغفرت میں کسی شک اور شبہے کی گنجایش باقی نہ رہے''۔

ہماری حرم سراؤں اور حویلیوں کی داستانیں شاہد ہیں کہ پردے کے پیچھے کیسے کیسے ناٹک کھیلے گئے ہیں۔ کیا پردے نے ''پردہ پوشی'' کے علاوہ کوئی اور فرض بھی انجام دیا ہے؟ پردے کے ذریعے صرف پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور اگر اس کوشش کو آیندہ بھی جاری رکھنے کی کوشش کی گئی تو اس سے فضیحت اور رسوائی کے علاوہ اور کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ ہمیں اپنے طبقے کی اخلاقی اور نفسیاتی پستیوں کا جائزہ لینا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ اس پردے نے

ہماری سیرت کو کس قدر شرم ناک بنا دیا ہے۔ ہماری شخصیت دوغلی ہو کر رہ گئی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری لڑکیاں سماج کی اس گمراہ کن اور مخربِ اخلاق قدر کے خوف میں گھر سے تو برقع اوڑھ کر نکلتی ہیں لیکن جب کالج یا یونی ورسٹی میں پہنچتی ہیں تو وہ برقع بحفاظت ''کامن روم'' میں پہنچا دیا جاتا ہے یا جب ہماری بہت سی بیگمات اپنے شوہروں کے ساتھ شاپنگ کے لیے بازار جاتی ہیں تو پڑوسیوں کو دکھانے کے لیے چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے نکلتی ہیں لیکن گھر سے ذرا آگے بڑھ کر جب سواری میں بیٹھتی ہیں تو یہ برقع اخبار میں لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے اور یہ بات تو بہت ہی عام ہے کہ برقع اوڑھے ہوئے ہیں اور نقاب اُلٹا ہوا ہے۔ اس دوغلے پن نے ان کے ذہن و ضمیر کو بُری طرح گندہ کر دیا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس زمین پر کوئی ایسی عورت پیدا نہیں ہوئی جس نے پردہ کیا ہو۔ صرف ظاہری پردہ رہ جاتا ہے۔ تو میں کہوں گی کہ اس رسم کو شروع ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور یہ رسم بھی ان قبیلوں تک محدود رہی ہے جہاں مرد عورتوں کو ایک جیتی جاگتی نعمت اور زندہ نجاست و غلاظت سمجھ کر زمین میں دفن کر دیتے تھے تاکہ معاشرہ ان کے تعفن سے محفوظ رہے۔ اس ماحول کی عورتوں نے پردے جیسی رسوم کو اپنا فرض اور اپنی قسمت خیال کر لیا۔ آج وہ یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ انھوں نے اس سزا کو اپنی مرضی سے قبول کیا ہے اور بڑا تیر مارا ہے۔ حیرت ہے کہ یہ اس معاشرے کی وکالت کرتی ہیں جس نے انھیں پردہ کرنے ہی پر نہیں، حتیٰ ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا اور انھوں نے اسے بھی قبول کیا۔ ہماری بہنوں کو چاہیے کہ وہ اس فریب خوردگی کی پرانی عادت کو اب ترک کر دیں جس نے ان کے اندر فریب دہی اور فریب کاری پیدا کر دی ہے۔ انھیں تحمل کر اپنی ان بہنوں کی تقلید کرنی چاہیے جو کسی ذہنی پیچیدگی کے بغیر زندگی میں مردوں کے دوش بہ دوش چل رہی ہیں جنھوں نے سماج کی نصف ذمّے داریوں کو بجا طور پر قبول کر لیا ہے اور اس طرح اپنا فرض انجام دیا ہے۔ جو گھر میں بیٹھ کر ناز اور نخرے کرنے کے بجائے زندگی کی سنجیدہ اور سنگین حقیقتوں کا سامنا کر رہی ہیں۔

آپ کان کھول کر سُن لیجیے کہ مرد کی جنسی تسکین کر دینے سے حق ادا نہیں ہو جاتا۔ جو عورتیں مرد کو جنسی تسکین پہنچانے کے بعد اپنے آپ کو مرد کی دولت کا حصے دار سمجھنے لگتی ہیں ان میں

اور طوائفوں میں آخر کیا فرق ہے؟ اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ ایک جرأت مند ہے اور اعلانیہ اپنی حیثیت کا اعتراف کرتی ہے اور دوسری ڈھٹائی سے اپنی عصمت و عفت کا ڈھنڈورا پیٹتی رہتی ہے۔

مشرق کی معصومیت اور شرم وحیا کے قصیدے پڑھ کر' جہالت منافقت' حرام خوری اور دوغلے پن کا کوئی جواز پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ وقت گزر چکا ہے اور وہ اقدار مر چکی ہیں جن کے سہارے آج تک حقیقتوں کو جھٹلانے کی ناکام کوشش کی گئی۔

ایک محترمہ نے میرے مضمون کے خلاف بڑے ہی خلوص سے یہ تحریر فرمایا ہے کہ......

''کیا ان کی خواہش (یعنی میری خواہش) یہ ہے کہ ہر مرد کے ساتھ عورت بھی کمائے تاکہ شراب کا خرچ پورا ہو'' ان الفاظ سے ہم اپنی عبرت ناک جہالت اور بدنصیبی کا پوری طرح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جن محترمہ نے یہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں ان کا سادل وگردہ شاید ہی کسی اور کا ہو۔ بڑی ہمت ہے ان کے اندر! وہ شاید زمین پر نہیں آسمان پر رہتی ہیں اور یہ کہ چشمِ بددُور ان کے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے جو انھیں مبارک ہو۔ لیکن وہ فاقہ کش اور مظلوم عوام کا مذاق تو نہ اُڑائیں جو اللہ کی اس زمین پر اللہ کے چند برگزیدہ فرزندوں کی برکت سے سِسک سِسک کر زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ ان محترمہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس ملک کی ۸۰ فیصد آبادی بھوک سے نڈھال ہے۔ کیا ان صاحبہ کے خیال میں ان کی قوم اب اتنی آسودہ حال ہو چکی ہے کہ اگر آج مردوں کے ساتھ عورتیں بھی کمانے لگیں تو یہ آمدنی غذا' لباس' مکان اور تعلیم کے تمام اخراجات پورے کرنے کے بعد بچ رہے گی اور شراب کے علاوہ اس کا اور کوئی مصرف نہیں رہے گا۔ کیا اس ملک کے عوام کی تمام ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں اور اب اسے فقط شراب کے لیے روپے درکار ہیں۔ محترمہ! آپ کی اس جرأت و ہمت کا بھلا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ان کی قوم کے بوڑھے اور جوان صبح کو کہیں ملازمت کرتے ہیں دوپہر کو کسی اور جگہ جا کر کام کرتے ہیں اور رات کو کہیں اور ڈیوٹی دیتے ہیں اور پھر بھی ایک وقت کے کھانے کا خرچ نہیں نکلتا۔ کیا آپ نے سڑکوں پر اپنی عزت و ناموس کو بھیک مانگتے ہوئے نہیں دیکھا؟

لیکن ان صاحبہ کا کوئی قصور نہیں وہ جس سماج میں زندگی گزار رہی ہیں اس کی برکت سے انسان کی عقل کو زائل ہو جانا ہی چاہیے۔ اس سماج کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انسان کو جانور بنا دیا ہے اور اس جانور کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ماضی کی وحشت اور درندگی کے ساتھ عقیدت اور ایک دوسرے کے ساتھ نفرت و عداوت سے پیش آئے اور یہی اس کا مسلک اور مذہب ہے جو کوئی اس کے خلاف آواز اُٹھائے وہ کافر ہے لیکن اب اس فتوے بازی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ اب ہم مُلاّؤں اور مُلاّنیوں کے نام پر احمق اور بے وقوف بننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمارے ہرگز وہ فرائض نہیں ہیں جو اِن مداریوں نے ہم پر مسلّط کیے تھے۔ ہمارے فرائض یہ ہیں کہ ہم غربت، جہالت، رجعت پسندی، غلامانہ ذہنیت اور لُوٹ کھسوٹ کے خلاف اظہارِ نفرت کریں۔ سماجی ناانصافیوں کو دُور کریں اور ان آبرو باختہ قدروں کے قحبہ خانوں کو نیست و نابود کریں جہاں معصوم انسانیت جھوٹے سکّوں کے بدلے اپنی سچائی اور شرافت کو بیچنے پر مجبور کر دی گئی ہے۔

ذہینہ سائیکی

انشا، ستمبر 1961

انشائیے (اداریے)

پہنائی سکوت میں گُم ہے تمام تر
اور اس تمام تر میں صدا لکھ رہا ہوں میں

جون ایلیا

انشائیہ

زندگی میں کہیں ٹھہراؤ اور رُکاؤ نہیں پایا جاتا۔ ایک قوّت ہے جو اُبل رہی ہے۔ ایک رو ہے جو بہہ رہی ہے اور ایک طوفان ہے جو اُمڈ رہا ہے۔ انسانی زندگی کے مظاہر کا عالم بھی یہی۔ ہے کیوں کہ حیاتِ بشر کے تمام مظاہر اور تمام شعائر خود اسی ''حیاتِ اکبر'' کے رنگا رنگ پہلو ہیں جو تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔ نہ انسان جامد اور معطل ہے اور نہ اس کی شخصی اور اجتماعی زندگی پر جمود و تعطل کبھی وارد ہوتا ہے۔ یہی حال انسان کی فکری و تخلیقی زندگی کا ہے۔ ہم ہر لحہ کچھ نہ کچھ بناتے اور کچھ نہ کچھ بگاڑتے رہتے ہیں۔ کون و فساد کا یہ عمل مسلسل ہمارے ہاتھوں جاری ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر بناؤ ''ارتقائے بشر'' کے لیے ضروری ہو اور ہر بگاڑ انسانی ذہن و فکر کے لیے تخریب رساں۔ اس ''کون و فساد'' کی نوعیت درحقیقت اضافی ہے۔ کبھی ایک تعمیر ہزاروں تخریب کاریوں کا سبب بن جاتی ہے اور کبھی ایک تخریب بے شمار تعمیری صلاحیتوں کو بروئے کار لے آتی ہے۔ خیر فی الحال بحث اس نکتے سے ہے کہ انسان کی تخلیقی اور مادّی زندگی کبھی جمود و تعطل سے آشنا نہیں ہو سکتی کیوں کہ جمود اور تعطل یہ دونوں کیفیتیں اس مادّہ و قوّت سے ترکیب پائی ہوئی کائنات کے مزاج و کردار سے مناسبت ہی نہیں رکھتیں۔ زندگی اپنا عمل ضرور جاری رکھے گی خواہ وہ فساد کا عمل ہو یا کون کا۔ تخریب کا مشغلہ ہو یا تعمیر کا۔ بناؤ کی مصروفیات ہو یا بگاڑ کی۔

زندگی میں کہ ہمہ معرکہ آرائی ہے
کس قدر نظم ہے، ترتیب ہے، رعنائی ہے!

پھر کوئی کیوں کہے کہ ادب، جو انسانی زندگی کا ایک تخلیقی عمل ہے، جمود سے دوچار ہو گیا

ہے۔ ادب کی تخلیق کوئی مشینی عمل تو ہے نہیں کہ مشین چلتے چلتے رک جاتی ہے اور نیا ایندھن فراہم کر کے پھر مصروفِ کار ہو جاتی ہے بل کہ ادبی تخلیق ایک وظیفۂ حیات ہے یعنی انسانی زندگی کی دو مسلسل فعال مستعد قوّتیں (ہمارا اشارہ جذبات وتخیّل کی طرف ہے) ہمیشہ نئی ذہنی دنیاؤں اور نئے فکری اُفقوں کی تلاش وجستجو میں مصروف رہتی ہیں تو پھر یہ کہنا کہ پچھلے دس سال میں ادبی تخلیق کی رفتار منجمد ہوگئی ہے۔ گویا یہ کہنا ہے کہ پچھلے دس برس میں انسانوں نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ ان سے متاثر ہونے کی صلاحیتیں سلب کر لی گئی ہیں۔ ان سے جذبات چھین لیے گئے ہیں۔ ان کے دل ودماغ کو مردہ بنا دیا گیا ہے۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ادبی تخلیق صرف اس وقت جمود سے دوچار ہو سکتی ہے جب کہ انسان فکری، ذہنی اور روحانی اعتبار سے مر جائے لیکن انسان کبھی نہیں مر سکتا۔ انسان امٹ ہے۔ انسان امر ہے۔ انسان کا دل اور اس کا دماغ۔ اس کے جذبات اور اس کا تخیّل ہمیشہ مصروف وفعال اور مشغول وبرسرِ کار رہتے ہیں اس لیے نہ انسان جمود سے دوچار ہوا ہے اور نہ اس کا تخلیقی عمل یعنی ادب!

اس وقت ہمارا موضوعِ نظر ''عالمی ادب'' نہیں۔ صرف فکری تخلیقات کا وہ ذخیرہ ہے جو ۱۹۴۷ء (حصولِ آزادی) کے بعد اُردو زبان کی وساطت سے عالمِ ظہور میں آیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ پچھلے دس سال میں اُردو کی حد تک تخلیقِ ادب کی رفتار بہت سُست رہی ہے۔ کتنے ستم ظریف لوگ ہیں یہ' ہاں یہ ممکن ہے کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک ان لوگوں نے جنھیں دس سال قبل اُردو ادب کے تخلیقی شاہ کاروں کا بانی سمجھا جاتا تھا اس دس سال میں کچھ نہ لکھا ہو یا لکھا ہو تو بہت بے دلی کے ساتھ لیکن یہ کہنا کہ اُردو زبان وادب کے ذخیرے میں کوئی اضافہ ہی پچھلے دس سال میں نہیں ہوا۔ میکانیکی ذہنیت کا ثبوت دینا ہے یعنی اس محالِ عقلی کو ثابت کرنا ہے کہ پاکستان اور بھارت کے آزاد ہو جانے کے بعد اُدھر سرحد پار کے تمام ذہن مر گئے اور اِدھر پاکستان میں زندگی نے اپنی تخلیقی قوّت ضائع کر دی۔ کیسی عجیب سی بات ہے یہ؟

ہم اس یقین کے ساتھ انشا کا پہلا شمارہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں کہ اُردو

ادب ہرگز جمود سے دوچار نہیں۔ اہلِ فکر کے ذہنوں کے سرچشمے اب بھی اُبل رہے ہیں۔ انسانی زندگی کا تخلیقی دھارا آج بھی اپنی مسلمہ شان وشوکت کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ آج بھی زندگی اپنی انھی ''آفریدگارانہ'' صلاحیتوں کے ساتھ ہم میں موجود ہے جن اوصاف کے ساتھ وہ ہمیشہ انسانوں کے درمیان موجود رہی ہے۔

''انشا'' کسی معروف یا مسلمہ ادبی اسکول یا مکتبۂ فکر کا ترجمان نہیں۔ تاہم ایک لکھنے والے کی حیثیت سے چند ''مہماتِ اُمور'' اور ''کلیاتِ اُصول'' پر ہماری نظر رہتی ہے، رہی ہے اور آیندہ رہے گی۔ ہم ادب کو زندگی کا ترجمان سمجھتے ہیں۔

جو زندگی سے تہی ہو وہ عاشقی کیا ہے!
مگر سوال تو یہ ہے کہ زندگی کیا ہے؟

زندگی کیا ہے؟
تخلیقی کام کرنے والوں کے لیے یہی سوال بنیادی حیثیت رکھتا ہے!

زندگی اتنی ہی ''بے کراں'' ہے جتنی بے کراں اور لامحدود خود کائنات ہے۔ ہم مصنوعی سیارے (Sputnick) کے ذریعے ابھی تک اس کرۂ ارض کی حدود سے صرف نو سو یا ایک ہزار میل دور پہنچے ہیں لیکن ہمیں کائنات کا سفر طے کرنا ہے۔ بہتر ہے کہ سفرِ کائنات سے پہلے سفرِ حیات طے کرلیں۔ کیوں کہ کائنات اور حیات یہ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رُخ۔ اور ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ کائنات کا سفر کہا جاتا ہے کہ ''راکٹ'' کے ذریعے طے کیا جائے گا لیکن حیات کی حدودِ معلومہ وغیر معلومہ کی پیمایش کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی ''فکر'' اور اپنے ''سماجی شعور'' اور اپنے تخلیقی مطالعے کے ذریعے اسرارِ زندگی کی عقدہ کشائیاں کریں۔

ادبِ عالی کی تخلیق کے لیے حیات کے اعلیٰ فکری مظاہر کے فلسفیانہ مطالعے کے ساتھ انسانی سماج اور ان رشتوں کی بناوٹ کا مطالعہ بھی ضروری ہے جو معاشرے کی شیرازہ بندی کرتے ہیں یا ایک معاشرے کو وجود میں لاتے ہیں۔ ہمیں ستاروں، پھولوں، جلووں، کرشموں، تجلّیوں مختصر یہ کہ لطائفِ روحانیہ اور حقائقِ فکریہ کی ''نقاب کشائی'' سے قبل یا اسی

کے ساتھ ان حقائق کو بھی سمجھنا اور اپنے وجدان میں جذب کر لینا چاہیے جو ماڈی محض ماڈی صرف ماڈی اور مطلق ماڈی ہیں۔ ادب اُگتا اسی زمین سے ہے لیکن آہستہ آہستہ اس کا حجم اور اس کا قد بڑھتا چلا جاتا ہے اور بڑھتے بڑھتے وہ درخت آسمان تک جا پہنچتا ہے۔ تاہم ادب کی پیدائش ہوتی اسی زمین سے ہے۔ یہ بات ہم کو یاد رکھنا چاہیے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ ہم ادب کے ذریعے اپنی روزمرہ کی زندگی کے مسائل سلجھا سکتے ہیں۔ ادب کو عوام کی زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہیے اور وہ اپنی سماجی زندگی اور فکری اور روحانی زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے دانش وروں کے ذہن اور شاعروں کے قلم کو تو آخر کار اپنا فرض ادا ہی کرنا چاہیے۔

ہم موجودہ سماجی نظام سے نفرت کرتے ہیں جو دو طبقوں پر منقسم ہے۔ ایک طبقہ لوٹنے والوں کا ہے اور دوسرا لوٹے جانے والوں کا۔ آج پوری نوعِ انسانی آجروں اور اجیروں محنت کشوں اور سرمایہ داروں اور ظالموں اور مظلوموں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ نہ صرف انسانوں کا جسمانی استحصال ہو رہا ہے بل کہ ان کی رُوحوں کو بھی لوٹا جا رہا ہے اور آہ کس دھڑلے کے ساتھ! دولت آفرینی کے تمام ذرائع چند انسانوں چند سو انسانوں یا چند ہزار انسانوں کے ہاتھوں میں مرکوز ہو گئے ہیں اور یہی بااثر طاقت ور اور صاحبِ ثروت زندگی کی رُوحانی ماڈی اور تخلیقی صلاحیتوں کے ان مول اور رنگارنگ خزانے پر سانپ بن کر بیٹھ گئے ہیں۔ مذہبی ملاّ اور دھرم پروہت ان کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں اور وہ کب نہ تھے! سیاسی رہ نما ان کے مرید ہیں اور انھوں نے ارادت سے انکار ہی کب کیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آج ادب اور ادیبوں شعر اور شاعروں فن اور فنکاروں کو بیک وقت کئی محاذوں پر اپنی جنگ جاری رکھنا ہے یعنی موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جو ہم پر پاکستان میں مسلّط ہے۔ نام نہاد مذہبیت کے خلاف جس کی تخلیقی قوّت ختم ہو چکی ہے اور ''ترقی دشمن سیاست'' کے خلاف جو چند خاندانوں کے محور پر گھومتی رہی ہے اور آج بھی گھومتی ہے۔

لیکن انشا ان تخلیقی ذمّے داریوں کو کس طرح پورا کرے گا وہ آخر کس طرح ادب کا فلسفیانہ منطقیانہ (منطق بھی ارسطو کی) اور وہ سماجی تصور باقی رکھے گا جس کے ہم نقیب و

ترجمان ہیں۔ یہ ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے بل کہ مسئلے ہیں جن پر ہم آیندہ لکھیں گے۔

آخر میں ان احباب سے معذرت طلبی ضروری ہے جنھوں نے ہماری درخواست پر پہلی ہی اشاعت کے لیے ہماری قلمی معاونت فرمائی لیکن ہم بعض مجبوریوں کی بنا پر ان کے افسانے، نظمیں اور مضامین شریکِ اشاعت نہ کر سکے۔ بہ ہر حال اب وہ مواد ''جمہوریت نمبر'' کے لیے محفوظ ہے۔

بسوخت عقل!

چوں کہ پاکستان کے ملّایانِ کرام کے نزدیک ملّتِ پاکستان اپنے تمام مسائل حل کر چکی ہے اور بحمد اللہ ملک کے بھیانک افلاس، دہشت ناک بے روزگاری، فلاکت زدہ عوام و مہاجرین کی حسرت ناک پریشاں حالی، خانماں بربادی، شرم ناک جہالت، تباہ کن طبقاتی و علاقائی عصبیت اور علمی و صنعتی پسماندگی پر پوری طرح قابو پایا جا چکا ہے اس لیے اب اگر یہ حضرات روز نت نئے شاخسانے نکال کر اپنی مذہبی حرارت اور اصلاحی حرکت کا ثبوت پیش نہ کریں تو پھر اور کیا کریں!

چناں چہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے سو روپے کے نوٹوں پر قائداعظم کا فوٹو چھاپ کر جو انتہائی قابلِ ستایش اقدام کیا تھا وہ بھی اس عقل دشمن طبقے کے لیے فتنہ پروری اور شرانگیزی کا ذریعہ بن گیا۔ بیانات ''چل نکلے''۔ تقریریں ''سرزد'' ہونے لگیں۔ بھلا یہ سب کیوں نہ ہوتا؟

نوٹوں پر بانیِ پاکستان کا فوٹو چھپ جانے سے آخر تو قصرِ شریعت میں ایک عظیم رخنہ پڑ گیا تھا نا۔ بغداد۔ اسپین۔ مصر۔ ترکی اور دہلی کی ''مشہورِ عالم'' اور شہرۂ آفاق اسلامی سلطنتوں کے سلاطین و خلفا اور ''محافظینِ شریعت'' شہنشاہوں کی قبریں ہل گئی تھیں۔ اسلامیانِ عالم کی تاریخ میں پہلی بار اسٹیٹ بینک آف پاکستان ہی سے تو ایک غیر شرعی فعل سرزد ہو گیا تھا، دامنِ ملّت پر ایک یہی دھبا تو پڑ گیا تھا۔

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بدطینت اور بدباطن کب اپنی حرکتوں سے باز آئیں گے۔

نوٹوں پر فوٹو چھاپنے کی مخالفت ہو یا غلط طور پر مذہب اسلام کا نام لے کر بے مقصد نعرے لگانا غرض اس قسم کی تمام کوششوں کے ذریعے یہ غلط کار طائفہ حسبِ دستورِ سابق تاریخِ فکروثقافت کو پیچھے لوٹانا چاہتا ہے۔ تہذیب وتمدن سے دُور' دورِ وحشت کی وحشت انگیز تاریکیوں کی طرف۔ علاوہ ازیں ان باتوں کا مقصد یہ بھی ہے کہ حقیقی مسائل کی طرف سے غریب وسادہ لوح عوام کی توجہ ہٹادی جائے اور ان کو اپنی ملائیت کے پُر فریب وپُرفسوں جال میں اسیر رکھا جائے۔ کیا قائداعظم کی عظیم خدمات کا یہی صلہ ہے؟ کیا کوئی پاکستان دوست اس قسم کی باتیں کر کے پاکستان دوستی کا دعویٰ کر سکتا ہے؟

یہ ملاّ اور ملاّؤں کے حاشیہ بردار ومرید ملک وقوم کے ازلی دشمن ہیں ورنہ سوچیے کہ کیا اس حشر انگیز اور اضطرابی دور میں اس قسم کے شوشے چھوڑنا مناسب ہے۔ کیا ''سیاسی فواحش'' کی اس بستی اور ''اخلاقی ومعاشری منکرات'' کے اس شہر میں اعلائے کلمۃ الحق کا نیک فرض یہ فتویٰ صادر فرمانے سے پورا ہوتا ہے کہ معمارِ ملّت اور محسنِ قوم کا فوٹو چھاپنا حرام ہے۔

انشا' فروری 1958

فکر، فنونِ لطیفہ اور معاشرہ

کسی معاشرے کی تقدیر کو جاننے کے لیے اس طریقِ کار کو جاننا چاہیے جو وہ معاشرہ اپنے ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور دانش وروں کے باب میں اختیار کرے کہ یہی لوگ معاشرے کی ذہنی زندگی کے نمایندہ ہوتے ہیں اور یہی اس کے خالق۔ ذہنی زندگی جو افراد کے ذہنوں سے مرکّب ہو کر ایک منفرد ذہن کی حیثیت حاصل کرے۔ آپ اسے معاشرے کا "عقلی مزاج" کہہ لیجیے۔

کوئی معاشرہ اپنے عقلی مزاج کے بغیر متعین اور مستحکم حیثیت حاصل نہیں کر سکتا۔ عقلی مزاج ہی معاشرے کو مختلف حیثیتوں سے استحکام اور امتیاز بخشتا ہے۔ جس معاشرے کا کوئی عقلی مزاج نہ ہو، اسے صحیح ترین معنی میں ایک مکمل و منظم معاشرے سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

ظاہر ہے کہ کسی معاشرے کا عقلی مزاج دفتروں، دکانوں، صنعت گاہوں، عدالتوں، ہوٹلوں اور رقص گاہوں میں نہیں، دانش و فن کی خانقاہوں میں جنم لیتا ہے۔ چناں چہ معاشرے کی تقدیر دراصل معاشرے سے تعلق رکھنے والے فنکاروں اور دانش وروں سے وابستہ ہوتی ہے نہ کہ تاجروں، وکیلوں، کارپردازوں اور انجینئروں سے۔ معاشرے کا عقلی مزاج اعلیٰ مثالیوں کے شعور، جمالیاتی صداقتوں کے احساس اور بعض اقدار کے احترام سے قوام حاصل کرتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اعلیٰ مثالیوں اور جمالیاتی صداقتوں کا وجود محض اوہام تراشی پر مبنی ہے تو ہم اس بات کو قبول کر لیں گے لیکن خود زندگی بھی کوئی صداقتِ ثابتہ نہیں جس سے انکار نہ کیا جا سکے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ زندگی خواہ جیسی بھی ہو، اپنے استحکام اور ارتقا کے لیے بعض اعلیٰ مثالیوں کے شعور اور جمالیاتی صداقتوں کے ادراک کی محتاج ہے خواہ یہ مثالیے اور صداقتیں محض اوہام ہی کیوں نہ ہوں۔

روسی ادیب پیسٹرناک نے سچ کہا ہے کہ:

''بہت عرصے سے انسان کو جو سر بلندی حاصل ہے، اس کا سبب اوزار نہیں بل کہ کچھ اور چیزیں ہیں یعنی اس کی روحانی موسیقی، مسلّم صداقتوں کی ناقابلِ مقاومت طاقت اور اعلیٰ مثالیوں سے اس کا شغف۔''

روحانی موسیقی، مسلّم صداقتیں اور مثال طلبی ہی دراصل معاشرے کی ذہنی زندگی سے عبارت ہیں اور انھیں کے ذریعے کسی جماعت کا عقلی مزاج مرتب ہوتا ہے۔

گہواروں میں پرورش پا کر شمشانوں میں جل جانے اور قبرستانوں میں دفن ہو جانے والی زندگی تاریخی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ زندگی تو ذہن و روح کی زندگی ہے جو اپنے ساتھ قوموں اور قبیلوں کو زندہ رکھتی ہے اور جب وہ فنا ہو جاتی ہے تو قوموں اور قبیلوں کا معنوی وجود بھی ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔

یونانیوں میں جب ان کی ذہنی زندگی نے جنم لیا تو یونان کو وہ ثبات و استحکام نصیب ہوا جس کی محرابِ عظمت و جلال میں صدیاں سر بہ سجود نظر آتی ہیں۔ اس ذہنی زندگی کے صورت گر یونان کے حکام، عدلیہ، اہلِ حرفہ، کارپرداز اور زندگی کے عملی شعبوں سے تعلق رکھنے والے معاملہ دار افراد نہیں تھے بل کہ ایتھنز کی ہیکلوں کے وہ گلیم پوش دانش ور تھے جو اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو کر خیر و جمال، نہایت و لانہایت، علّت و معلول اور حیات و کائنات کے بارے میں بحثیں کیا کرتے تھے اور جن کے بارے میں یونان کے معاملہ داروں کا یہ خیال تھا کہ یہ لوگ پاگل ہیں اور فضول اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ ہم جب یونان کا ذکر کرتے ہیں تو دراصل وہ یونان کے دانش وروں اور تخلیقی ذہانت رکھنے والے فن کاروں کا ذکر ہوتا ہے جن کے ذہنوں سے یونان کی ذہنی زندگی نے جنم لیا تھا۔

ہومر، سولن، تاسیس ملیٹی، سقراط، افلاطون، پروتا گورس اور ارسطو کے نام دراصل عظیم یونان کے عظیم ذہن کی علامتیں ہیں۔

اسی طرح جب عرب اپنی ذہنی زندگی کی حرارت لے کر شاہراہِ تمدّن کی طرف نکلے تو نہ جانے کتنی محرابوں پر چراغاں کر گئے۔ بغداد، قاہرہ، قرطبہ اور شیراز قصرِ تہذیب کی یہ

شفق انگیز محرابیں آج تک تاریخِ تمدّن کا عنوانِ جمیل ہیں۔ ان محرابوں کے روشن گر، محمود غزنوی، صلاح الدین ایوبی، اسماعیل صفوی اور سلاطینِ عثمانیہ نہیں تھے بل کہ ابنِ مسکویہ، فارابی، ابنِ رشد، ابنِ سینا، طوسی، ناصر خسرو، ابوالعلا، خیام اور سعدی تھے جن کا ذکر اس تفصیل کا اجمال ہے جو فخر و ناز، فرّ و فروغ اور وقار و تمکنت کی فضاؤں میں بازو پھیلاتی ہے۔

ہم دیکھتے رہے ہیں کہ مدّتوں سے ہمارے شہروں میں دانش وفن سے معاندانہ بے گانگی اختیار کرلی گئی ہے۔ ہمیں چاروں طرف سے ایک ہجوم گھیرے ہوئے ہے۔ ایک ہجوم جو نہ سُنتا ہے اور نہ سمجھتا ہے۔ ہماری بستیوں میں ایک عجیب وغریب نسل پیدا ہوگئی ہے۔ اس نسل کے پاس نہ حافظہ ہے اور نہ تخیّل جو ماضی کے قابل ہے اور نہ مستقبل کے شایان۔ اس کا مقدّر یہ ہے کہ صرف حال میں معلّق رہے اس نسل کا وجود، بالکل غیر طبعی ہے۔

ان کے سامنے اگر علوم وفنون کا ذکر کیا جائے تو ان کے چہرے متغیّر ہو جاتے ہیں۔ ان میں بعض ایسے ہیں جو سوال کرتے ہیں کہ علوم وفنون کا ذائقہ کیا ہوتا ہے؟ ان کے خیال میں حقیقتیں صرف وہی ہیں جنھیں گزوں سے ناپا اور باٹوں سے تولا جا سکے۔ یہ لوگ ادب، فلسفہ اور شاعری کو عام زندگی کی اشیائے ضرورت اور اسبابِ تعیّشات کی نسبت سے جانچتے ہیں۔ ان کے گمان میں فلسفہ، ادب اور شاعری محض خسارے کا سودا اور بے کاری کا مشغلہ ہیں۔ انھیں تو صرف عملی ضرورتوں سے سروکار ہے۔ ان کے مصنفوں نے تفکّر و تخیّل کو ذہنی عیّاشی سے تعبیر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تاریخ کی نظر میں خارش زدہ بھیڑ کی چھینک سے زیادہ ان لوگوں کی کوئی وقعت نہیں۔

جن کو ایک زندہ اور تاریخی قوم کی طرح زندگی گزارنا ہے، جنھیں اپنی زندگی میں صدیوں کا رچاؤ پیدا کر کے صدیوں پر اثر انداز ہونا ہے، ان کو بہ ہر طور اپنا اندازِ نظر بدلنا پڑے گا اور فلسفہ، ادب، فنونِ لطیفہ اور ذہنی زندگی کے شاہ کاروں اور آفریدگاروں کے باب میں وہی موقف اختیار کرنا پڑے گا جو زندہ، باشعور اور حسّاس قوموں کا موقف ہے۔

انشا، دسمبر 1958

سماج اور دانش ور

یہ واقعہ ہے کہ صدیوں سے دانش وروں اور ادیبوں کو سماج میں وہ حیثیت حاصل نہیں جو اُن کا حق ہے۔ ہم سُنتے ہیں کہ عہدِ ملوکیت میں عالموں اور شاعروں کو انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا مگر یہ سب کچھ مراحمِ خسروانہ کے طور پر ہوتا تھا۔ اسے صرف بخشش وعطا کی صورتِ حاصل ہوتی تھی نہ کہ ادائے حق کی حیثیت۔

ہم اپنا حق کسی سے بقوّت نہ لے سکے
جو کچھ یہاں مِلا بطریقِ عطا ملا

رئیس امروہوی

ہمارے ادیبوں اور دانش وروں کے لیے تاریخ کا سب سے زیادہ ناسازگار دور انگریزوں کا دور تھا۔ اس دور میں ان سے جس قدر بے نیازی اور بے اعتنائی برتی گئی اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ سو سال کی مدت میں کوئی بھی اس جنسِ ناروا کا خریدار نہ ہوا۔ آزادی سے اس طبقے کو بڑی اُمیدیں تھیں لیکن آزادی کے بعد کوئی ایک اُمید بھی پوری نہ ہو سکی۔ البتہ اس مدت میں ادیبوں اور شاعروں کی خدمات نے سماج پر یہ بات ضرور ثابت کر دی کہ ان کی بھی ایک ضرورت اور قیمت ہے۔ ان کے قلم نے تحریکِ آزادی کے سلسلے میں تلوار سے زیادہ کام کیا تھا اور آج اس حقیقت سے کوئی ایک فرد بھی انکار نہیں کر سکتا۔ حصولِ آزادی میں سب سے زیادہ حصّہ اہلِ قلم ہی کا ہے اور وہ بھی اُردو کے اہلِ قلم۔

ہمارا سماج چیزوں کی قیمت متعین کرتے وقت محض خارجی پیمانوں کو ملحوظ رکھتا ہے بل کہ عام طور پر ہر سماج کا یہی رجحان رہا ہے۔ لوگ صرف یہ بات دیکھتے ہیں کہ مادّی فائدہ کس چیز میں ہے۔ علاوہ ازیں وہ طلبِ منفعت میں انتہائی عجلت پسند واقع ہوئے

ہیں۔ بھلا شاعرانہ تخیّل اور فلسفیانہ دانش پژوہی سے انھیں کیا ہمدردی ہوسکتی ہے۔ اگر ان کے بس میں ہو تو وہ غور و فکر اور تجسّس و تخیّل کو جرم قرار دے دیں۔ ایک ایسا جرم جس کی سزا موت ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو جب کہ فلسفہ و ادب سماج سے اپنا احترام تو کرا لیتے ہیں مگر اس کی کسی ضرورت کو پورا کرنے کے اہل ثابت نہیں ہوتے۔ انھوں نے آج تک نہ کسی مریض کا علاج کیا نہ کسی ملزم کی وکالت کی بل کہ خود ان کے لیے زہر کا پیالہ تجویز کر دیا جاتا ہے اور وہ خاموش رہتے ہیں۔

عہدِ جدید کے صنعتی اور سائنسی ارتقا میں بھی سماج کو ظاہر بظاہر فلسفۂ و ادب کا دخل دکھائی نہیں دیتا نہ انھوں نے ایجادات کی ہیں اور نہ اکتشافات۔ ہمیں روزمرّہ کی زندگی میں نہ کسی فلسفی کی ضرورت پیش آتی ہے نہ کسی شاعر کی پھر سماج ان کی حیثیت کو بھلا کس لیے تسلیم کرے۔

مگر یہ اندازِ نظر نہ صرف تاجرانہ اور معاملہ ورانہ ہے بل کہ منطقی طور پر غلط بھی ہے اگر ہر شے کی افادیت کو محض عاجلانہ منفعت پسندی کے ساتھ ناپا گیا تو پھر سماج کا سارا نظام تباہ ہو جائے گا اور دنیا صرف ایک تجارتی منڈی ہو کر رہ جائے گی۔ اگر چہ اس کے تجارتی منڈی ہونے میں اب بھی کوئی شبہ نہیں مگر چوں کہ اس اندازِ نظر کو ابھی ایک طے شدہ ضابطے کی حیثیت حاصل نہیں اس لیے سماج میں ابھی تک بعض ذہنی اقدار کا احترام باقی ہے۔

اس اندازِ نظر کی سب سے زیادہ مایوس کن خرابی یہ ہے کہ اس میں واقعات و حالات کے اسبابِ اوّلیہ کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ سماج اس اندازِ نظر کے پیشِ نظر مادّی ترقیوں کو معجزے کے طور پر تسلیم کر لیتا ہے اور ان موثرات و عوامل کو قطعاً نظر انداز کر دیتا ہے جن پر ان تمام ترقیوں کی عمارت بلند ہوئی ہے۔ جدید صنعتی اور سائنسی عہد کی اگر تحلیل کی جائے تو ہمیں چند مفکرین کے نظریات اور چند دانش وروں کے خیالات ملیں گے انھی نظریات و خیالات پر ہر مادّی ترقی کا انحصار ہے۔ اس تمام بحث سے قطع نظر ہم یہ کہیں گے کہ مادّی ارتقا بذاتِ خود کوئی چیز نہیں وہ تو صرف ایک ذریعہ ہے ذہنی اور روحانی لذتوں کے حصول کا۔ اس سلسلے میں انگلستان کے مشہور ارتیابی دانش ور ڈیوڈ ہیوم نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

''دانش وحکمت سے تفکر وتحقیق کی ایک طبعی تشنگی بجھانے کے علاوہ فرض کر لیجیے کہ اگر کوئی اور فائدہ نہ بھی ہوتا پھر بھی یہ علوم ومعارف حقیر نہ تھے اس لیے کہ انسان کو فطرت کی طرف سے جو چند بے ضرر لذتیں اور سعادتیں ودیعت ہوتی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے تفکر وتجسّس کی تسلی سے لذت یاب ہوتا ہے۔ زندگی کی سب سے زیادہ خوش گوار اور بے خطر رہ گزر دانش وحکمت ہی کے سایہ دار وسبز پوش درختوں سے ہو کر گزری ہے۔ جو شخص اس رہ گزر سے کوئی کانٹا صاف کرتا ہے یا اس کی آرایش وزیبایش میں کچھ اضافہ کرتا ہے تو وہ بلاشبہ نوعِ بشر کا محسن ہے اور اگر چہ فلسفیانہ دقت پسندی اور کدوکاوش عوام الناس پر بے حد گراں گزرتی ہے لیکن غیر معمولی ذہانت وفطانت رکھنے والے افراد اپنی اس کاوش سے لطف اُٹھاتے ہیں۔ تیرگی ذہن کے لیے بھی اسی قدر ایذا رساں ہے جس قدر آنکھوں کے لیے اور اس تیرگی کو روشنی میں بدلنے کے لیے خواہ کتنی ہی زحمت کیوں نہ برداشت کرنا پڑے وہ ہر حال میں لذت بخش اور مسرت آفریں ہوتی ہے''۔

بہ ہر حال سماج کے سطحی مذاق کو کسی طرح بھی زندگی کے اُمور ومسائل کا متولّی اور حَکَم نہیں بنایا جاسکتا۔ اسے چیزوں کے بارے میں فیصلے صادر کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ دنیا چند انسانیت پرست اور مثالیت پسند دانش وروں کی دنیا ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ وہ سماج کے رحم وکرم پر ہوں دراں حالے کہ سماج صرف ان کی حفاظت کے لیے وجود میں آیا ہے۔ اگر ضمیرِ فطرت اور سماج کے درمیان کوئی واسطہ ہے تو وہ صرف دانش ور ہیں۔ وہ سماج جس میں دانش ور موجود نہ ہوں وہ وحوش وبہائم کا سماج ہے۔ سماج کے سامنے صرف وہی معیار ہونا چاہییں جو انھوں نے تجویز کر دیے ہیں اس لیے کہ بلندیوں اور پستیوں کے درمیان اگر کوئی معیار موجود ہے تو وہ صرف انھی کا بخشا ہوا ہے۔

مگر دانش ور ہیں کون لوگ؟

کیا ہمارے زمانے کے وہ مسخرے جن کا سب سے زیادہ نمایاں وصف جہالت ہے

اور خود نمائی، جہالت اور لاف زنی' لاف زنی اور ہیچ نویسی' جن کے بارے میں کسی دانش ور نے کہا تھا کہ میری سنجیدگی کو ان مسخروں سے بچاؤ! ہمارے عہد میں دانش ور' ادیب اور شاعر کے مصداق و مفہوم میں جس قدر انحطاط واقع ہوا ہے اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ آج ہر وہ شخص دانش ور' شاعر اور نقاد ہونے کا مدعی ہے جو سماج کا سب سے زیادہ نالائق فرد ہو۔ مشہور تذکرہ نگار والہ داغستانی نے عہدِ صفوی سے قبل کی ادبی فضا کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی تصنیف ریاض الشعرا میں لکھا تھا کہ:

"فنِ شاعری کہ فضیلتِ علوم را لازمہ داشت از علم جدا شد و ہر بے مایہ بہ محض طبیعتِ موزوں ارادۂ شاعری کرد' رفتہ رفتہ فنِ شاعری کہ الطف فنون بود از درجۂ اعتبار افتادہ بہ مضحکہ انجامید۔"

بالکل یہی حال آج بھی ہے بل کہ اس سے بھی زیادہ بدتر۔ آج ہر بے مایہ صرف موزونی طبع کے سہارے میر و غالب بنا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب ادب و شعر کا ذرا بھی اعتبار و وقار باقی نہیں رہا اور ثقافت کے یہ معزز ترین شعبے مضحکہ خیز ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہر پیشہ کچھ نہ کچھ ریاض چاہتا ہے یہاں تک کہ ایک گداگر بھی ریاضت کے بغیر اگر چاہے تو ایک پیسا بھی حاصل نہیں کر سکتا لیکن ہمارا شاعر و دانش ور ایک سطر پڑھے بغیر آٹھ دیوانوں کا خالق اور دس کتابوں کا مصنف ہو سکتا ہے اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ اُردو زبان کا اہلِ قلم ہے مگر اسے اُردو ہی نہیں آتی یہاں تک کہ بعض حالات میں اس کا اِملا بھی درست نہیں ہوتا۔

ایسے عالم میں ہم سماج کے سامنے کیا منہ لے کر جائیں' اس سے کس احترام کی توقع رکھیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سماج میں اگر کسی کو کسی پر برتری حاصل ہے تو صرف دانش ور ہی سب سے زیادہ بلند مرتبہ قرار پائیں گے مگر کیا ہم نے دانش وری کی کسی ایک شرط کو بھی پورا کیا ہے؟ ہمیں اس تمام بحث کے بعد اپنے دانش وروں سے صرف یہی سوال کرنا ہے اور بس۔

انشا' جون 1959

سقراط سے سرمد تک

کون باور کرے گا کہ اس دور میں بھی علم وعقل اور فکر ونظر کی مخالفت کی جاسکتی ہے۔ فلاسفہ اور مفکرین کا مذاق اُڑایا جاسکتا ہے اور اس عہد میں بھی لئیموں کو حکیموں پر ترجیح دی جاسکتی ہے، ہمارا تو سب سے بڑا جرم ہی یہ قرار دیا گیا ہے کہ علم وفکر کی بات کرتے ہیں، شیخ الرئیس بوعلی سینا، ابنِ ماجہ، ابنِ رشد اور شہاب الدین سہروردی کے نام عقیدت واحترام کے ساتھ زبان پر لاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم شدید ترین جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ہمیں ان جرائم کی عقوبت میں وہی اذیتیں برداشت کرنا چاہییں جو حنین ابنِ اسحاق، ابنِ رشد، گلیلیو، فردوسی، البیرونی اور ابوالعتاہیہ کو برداشت کرنا پڑی تھیں۔ ہم اسی سزا کے مستوجب ہیں جو سقراط، برونو، شہاب الدین سہروردی، منصور حلاج اور سرمد کے لیے تجویز کی گئی تھی یعنی الم ناک مشقتیں اور دردناک موت۔ ہمارے اور ہمارے پیش رووٴں کے لیے کلیسائے جہالت کے پادریوں کے پاس شوکران اور شمشیر کے علاوہ اور ہے بھی کیا۔ شوکران اور شمشیر۔ ان دو چیزوں کے ذریعے ہی ہمیشہ علم اور انسانیت کی زبان کو خاموش کیا گیا ہے۔

حیرت ہے کہ لوگ اپنے نامۂ اعمال پر شرمندہ کیوں نہیں ہوتے۔ انھیں انسانیت کا سامنا کرنے کی جرأت کس طرح ہوتی ہے۔ ان میں جہالت ووحشت پر اصرار کرنے کی جسارت کہاں سے آئی۔ کس قدر مظلوم تھے ہمارے پیش رو اور کس قدر بدنصیب ہیں ہم کہ ہمیں انسانوں کی اس دنیا میں ہمیشہ علم اور عقل کی اہمیت ثابت کرنا پڑی ہے، ہمیں اس دعوے پر دلیل لانا پڑتی ہے کہ آفتاب رنگ ونور کا نقیب ہوتا ہے، آج جب کہ ترقی یافتہ

قومیں کرۂ ارض کو پوری طرح مفتوح کر کے سیاروں کی طرف بڑھ رہی ہیں، ہم اسی بحث میں مبتلا ہیں کہ علم و عقل کی واقعتاً کوئی قدر و قیمت ہے یا نہیں! ہمیں فکری مسائل چھیڑنے سے پہلے اب بھی یہ سوچنا پڑتا ہے کہیں جبینِ جہالت پر شکن نہ پڑ جائے کہیں مزاجِ رجعت پرستی برہم نہ ہو جائے۔ ہم پر قوم اور ملک کے اَن گنت حقوق ہیں مگر ہم ان میں سے اب تک کوئی حق ادا نہیں کر سکے۔ البتہ ہم نے اپنی قوم کی ذہنی اور فکری تعمیر کے لیے کچھ نہ کچھ سوچا ہے۔ کچھ عہد کیے ہیں اور طے کیا ہے کہ اس سلسلے میں اپنا فرض ضرور ادا کریں گے' لیکن رجعت پرستی اپنی قدیم دنایت اور عداوت کے ساتھ آج بھی ہمارے خلاف صف آرا ہے۔ ہم پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم اپنے مقاصد میں خلوص رکھتے ہیں اور خلوص کے ساتھ عزم بھی تو ہمیں ان تمام الزامات کو برداشت کرنا چاہیے۔ دانش و حکمت کو ہمیشہ تہمتوں اور ملامتوں کا نشانہ بنایا گیا ہے، صدیاں صدیوں کو، نسلیں نسلوں کو اپنا وارث بناتی چلی آئیں اور یہی ہوتا رہا۔ یہ کوئی آج کی بات نہیں اور ویسے بھی علم اس دنیا میں نووارد ہے، رہی جہالت تو اس کو بلاشبہ طوالتِ سن اور قدامتِ عہد کا قابلِ رشک امتیاز حاصل ہے۔ وہ اپنی قدیم جاگیر میں کسی دوسرے کا تصرف آسانی سے گوارا نہیں کر سکتی۔

تاریخ کا ہر معتبر طالب علم جانتا ہے کہ اگر دوسری صدی ہجری کی علمی رَو کو نہ روکا جاتا تو فکر و ثقافت کی تاریخ دوسرے ہی عنوان سے لکھی جاتی اور متمدّن دنیا کی دانش گاہوں میں ڈیکارٹ، لاک لیبنز، ابنِ ہیثم' خیام اور ان کے تلامذہ پر تقریریں کی جاتیں اور ان کی تصنیفات کے درس دیے جاتے۔ مگر ایسا کیوں ہوتا۔ مشرقی کلیسا کے رجعت پرست ایسا کیوں ہونے دیتے۔ مشرقی کلیسا کے رجعت پرست، جنھوں نے علوم و افکار کی طاقت ور رَو کو مشرق ہی میں نہیں روکا، مغرب میں بھی اپنی تباہ کن تصنیفات کے ذریعے اس کی مزاحمت کی اور اٹلی کے عقل دشمن پادریوں کو تقویت پہنچائی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہاں ان کو اور ان کے مغربی حلیفوں کو مآلِ کار شکست کھانا پڑی اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا پُرجلال آفتاب طلوع ہو گیا مگر ہمارے علاقوں میں یہ مقابلہ اور مقاومت ابھی جاری ہے اور جو

داستان سقراط سے شروع ہو کر سرمد تک کئی خونیں ابواب سے گزر چکی تھی ابھی کچھ اور فصلوں کا اضافہ چاہتی ہے مگر یہ فصلیں اب نہیں لکھی جائیں گی۔ اب ان قلموں کو شکستہ ہونا پڑے گا۔

سوال کرنے والے اکثر ہم سے سوال کرتے ہیں کہ اسلامی مشرق کی فکری خانقاہیں اور علمی خانوادے کیوں صدیوں سے بے چراغ ہیں؟ وہ روشنیاں کن اُفقوں میں گُم ہو گئیں جنھوں نے کبھی انسانیتِ کبریٰ کو فروغ بخشا تھا، ذہنوں کی محرابیں روشن کی تھیں، وہ ذہن کیا ہوئے جنھوں نے اقوام و ملل کے لیے نسخہ ہائے شفا تحریر کیے تھے۔ وہ اپنے سوالات کا جواب چاہتے ہیں اور کوئی جواب نہیں دیتا۔ وہ پوچھتے ہیں کہ آخر اسلامی مشرق میں صنعتی انقلاب کیوں نہیں آیا؟ یہاں سائنسی ارتقا کے لیے فضا سازگار کیوں نہ ہو سکی؟ کیا اس کا سبب یہ ہے کہ فطرت نے مشرق کے حق میں معاندانہ بخل اختیار کر لیا ہے کہ یہاں نظریات وضع کرنے والے ذہن اور اکتشافات و ایجادات کرنے والے دماغ پیدا ہی نہیں ہوتے، یا پھر یہ کہ ہماری زبانوں ہی میں یہ صلاحیت نہیں کہ اعلیٰ نظریات و افکار کا ذریعہ بن سکیں، اس ذہنی جمود و تعطل اور دماغی انحطاط و تنزل کا آخر سبب کیا ہے؟

بتایئے ان سوالات کا جواب کون دے؟ کیا ہم جو اس تباہ کن صورتِ حال کے خلاف جنگ کر رہے ہیں یا وہ جو اس صورتِ حال کے ذمے دار ہیں جن کی علم دشمنی اور ارتقا گریزی نے یہ سوالات پیدا کیے ہیں۔ جنھوں نے ماضی میں یونانی، اسکندریائی، بازنطینی اور عجمی علوم و افکار کو عقلی مغالطوں سے تعبیر کیا تھا اور ان تمام تصنیفات کے دیکھنے اور پڑھنے کو حرام قرار دے دیا تھا، جن میں فلسفہ و منطق کی اصطلاحات ہوتی تھیں، جنھوں نے محققوں، دانش وروں اور فلسفیوں کے لیے قتل کے فتوے صادر کیے تھے، جو تاریخ کی اندھیری گلیوں میں رہ زنوں اور قاتلوں کی طرح مارے مارے پھرتے تھے تا کہ اگر شاہراہِ علم و ارتقا سے کوئی معارف بدوش اور حکمت متاع، قافلہ گزرے تو جھپٹ کر حملہ کر دیں۔ آج بھی رجعت و جہالت کی تاریک کمیں گاہوں میں بیٹھے ہوئے دانش و بینش کی روشنیوں کو اپنی عداوت و نفرت کا ہدف بنا رہے ہیں۔ اسلامی مشرق کی ذہنی، اخلاقی اور تہذیبی پس ماندگی کا سبب انھیں سے دریافت کیا جائے اور بہ جبر دریافت کیا جائے۔

مشرق یقیناً صدیوں سے پس ماندہ ہے مگر اس کا یہ سبب ہرگز نہیں کہ یہاں اختراع واجتہاد کی صلاحیت رکھنے والے ذہن پیدا نہیں ہوتے اور عقل کا تختِ رواں صرف یورپ ہی میں نازل ہوا ہے نہ ہم یہ مان سکتے ہیں کہ ہماری زبانوں میں کوئی نقص ہے۔ ہم فرانس کے مستشرق ارنسٹ رینان کی یہ بات تسلیم نہیں کر سکتے کہ عربی فلسفیانہ مسائل کے لیے موزوں نہ تھی، یہ سب کچھ غلط ہے۔ اسلامی مشرق کے فکری اور ذہنی زوال کی ذمے داری صرف ان لوگوں پر ہے جو دوسری صدی ہجری سے لے کر آج تک علم وفکر کی مزاحمت کرتے رہے ہیں اور کبھی چین سے نہیں بیٹھے۔ سرسیّد کی مسائل شناسی، عقلیت پرستی اور روشن خیالی کو انھوں نے کفر وبدعت سے تعبیر کیا۔ قائداعظم کے خلاف انھوں نے سازشیں کیں۔ پاکستان میں ان کو شرمندہ ہو کر منہ چھپا لینا چاہیے تھا مگر یہ اپنی مفسدہ پردازی پر قائم رہے اور عجیب عجیب طریقوں سے سازشوں کے قمار خانے چلاتے رہے۔

پاکستان بے معنی اور فتنہ انگیز نعروں سے نجات پا چکا ہے، وہ عقل پرستی اور مسائل شناسی کے سہارے وجود میں آیا تھا اور انھی کے سہاروں کے ساتھ مستقبل کی نئی منزلوں پر خیمہ انداز ہوگا۔ اس سلسلے میں ہم پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں، ہم نے انھیں خلوص اور عزم کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔

ہم ماضی کی قدیم علمی خانقاہوں اور علم وحکمت کے رواقوں سے زادِ سفر لے کر قوموں اور قرنوں کا جائزہ لینے نکلے تھے۔ ہم نے اس سفر میں پاکستانی ذہن کی حیاتِ نو کے لیے کچھ سرمایہ انتخاب کیا ہے۔ یہ سرمایہ یونان کے فلسفیوں، اسکندریہ کے معلموں، عرب کے شارحوں، بغداد وبخارا کے حکمت شناسوں، قرطبہ وقاہرہ کے دانش وروں اور جدید عہد کے مفکّروں کی بخششوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ماضی کی حکمتیں، حال کی بصیرتیں اور مستقبل کی سعادتیں پوشیدہ ہیں۔ یہ سرمایہ دانش ودلیل اور حبِّ حکمت کا سرمایہ ہے۔ کیا پاکستان کی نئی نسلیں اس سرمائے کو قبول کریں گی؟

انشا، جولائی 1959

(یہی انشائیہ سسپنس، مئی 2002 اور جون 2002 میں دو قسطوں میں شائع ہوا)

سائنسی ارتقا اور عظیم ادب

عہدِ جدید کی صنعتی اور سائنسی آشوب گاہوں کو دیکھ کر اکثر دل میں یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ ادب اس تخیل سوز اور جذبات کش ماحول میں زندہ نہیں رہ سکے گا اور تصوراتِ خیر و جمال کی وہ روحیں اپنی پُرسکون وادیوں کی طرف واپس چلی جائیں گی جنھوں نے انسانی ذہنوں کو صدیوں تک سرور و سوز سے آشنا رکھا ہے۔ یہ وہی خوف ہے جس سے انیسویں صدی میں فلسفے کو دوچار ہونا پڑا تھا مگر بیسویں صدی میں انیسویں صدی کا یہ خوف بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ بالآخر سائنس نے پھر فلسفے کی اوّلیت تسلیم کر لی ہے۔ یہ خوف دراصل اختلالِ حواس کا پیدا کردہ ہے۔ ہمیں سب سے پہلے اس اختلال کو دُور کرنا پڑے گا۔ اس کی بنیاد ایک بے مایہ غلط فہمی اور غلط اندیشی پر قائم ہے۔ جو لوگ اس خوف و خلجان کا شکار ہیں انھوں نے صنعت و سائنس کو انسانی احساسات و جذبات کا حریف سمجھ لیا ہے۔ وہ بظاہر ایسا سمجھنے میں حق بہ جانب بھی ہیں۔ سائنس کا روّیہ کچھ ایسا ہے کہ وہ انسانیت کی حلیف نہیں حریف معلوم ہوتی ہے۔ اس نے سکون بخشنے کے بجائے دہشتیں پھیلائی ہیں۔ مگر اس کا ذمّے دار کون ہے، سائنسی قوّتیں یا انسان؟ سائنس تو درحقیقت مظلوم ہے جسے انسان جیسی بے رحم نوع سے سابقہ پڑا۔ انسان بربریت کا خداوند اور دہشتوں کا پروردگار، باشعور درندہ، ذہین ترین قاتل۔ ہمیں علم و سائنس کے بارے میں اگر کوئی فیصلہ صادر کرنا ہے تو علم و سائنس کی انسانیت دوستانہ اور ارتقا پسندانہ غایات و تعبیرات کو سامنے رکھنا چاہیے۔ سائنس کوئی مقصود بالذات وجود نہیں رکھتی اس کا اعتبار اس کی غایت کی بنا پر ہے یعنی انسانی سعادتوں کا حصول۔ انسان سائنسی تجربات و اکتشافات

کے لیے پیدا نہیں ہوا' سائنسی تجربات واکتشافات انسان کے لیے وجود میں آئے ہیں۔ ہم جب فلسفہ وادب کے سلسلے میں مختلف وسوسوں میں مبتلا ہوتے ہیں تو دراصل سائنس کو ایک مقصود بالذات شے سمجھ لیتے ہیں۔ ایک ایسی شے جو انسانی مشیّت کے علاوہ کوئی وجود رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ علوم کے تمام شعبے انسانی مشیّت کے پابند ہیں۔ انھیں انسانی مسرتوں میں اضافہ کرنے کے لیے باقی رہنا ہے ورنہ فنا ہو جانا ہے۔

لہٰذا اس امر کا تو بظاہر کوئی امکان نہیں کہ سائنس انسان کی تخلیقی اُمنگ' ادبی روح اور وجدانی ضمیر کو فنا کر دے گی۔ اس کا کام انسانی جبلتوں کی تربیت ہے نہ کہ تخریب۔ پھر یہ کہ خود انسان کی عقلی جبلّت ہی اس کی خالق ہے۔ ہمیں اس سے ڈرنا نہیں اُنس پیدا کرنا چاہیے۔ ادب کے وجود کو اس وقت تک کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا جب تک انسان اپنی لطیف آرزوؤں' پراسرار جبلّتوں' ناگزیر حسرتوں' نظریاتی غموں اور دل انگیز اُمنگوں کے ساتھ اس کرّۂ ارض پر موجود ہے' جہاں سائنس تھک کر بیٹھ جاتی ہے ادب وہاں سے روانہ ہوتا ہے۔ جو لوگ ادب کی زندگی سے نا اُمید ہیں ان کے ذہن میں ادب کا بہت ہی معمولی اور حقیر تصور ہے اور یہ تصور وسیع طور پر اسی صدی میں پیدا ہوا ہے۔ اس حقیقت کی علمی توجیہ انیسویں صدی کے اس ذہنی ماحول کو پیشِ نظر رکھ کر کی جا سکتی ہے جس میں فلسفہ وفکر کو تجربیت کے مقابلے میں نسبتاً کم اہمیت دی جاتی تھی۔ انیسویں صدی کی اس فکری زوال آمادگی کو تاریخی طور پر بیسویں صدی کے ادبی تصور پر اثر انداز ہونا چاہیے تھا چناں چہ ایسا ہی ہوا اور اُردو ادب کو اس صورتِ حال سے بطورِ خاص متاثر ہونا پڑا کیوں کہ اُردو کے مقبول ناقدوں کی اکثریت اس بات پر مُصر تھی کہ ادب کو اعلیٰ فکر اور علمی اندازِ نظر سے علیحدہ کر کے دیکھا جائے' یہ لوگ خود بھی گم راہ ہوئے اور ہماری نسل کو' نئی نسل کو بھی گم راہ کیا۔ انھوں نے ادب کے جو مثالیے قائم کیے وہ انتہائی ارزاں اور حقیر تھے۔ ان مثالیوں اور معیاروں پر ہر بے سروپا پورا اُتر سکتا تھا۔ چناں چہ پچھلے بیس پچیس سال میں عظیم فنکاروں کی ایک فوج تیار ہوگئی۔ ایک ایسی فوج جو ہمارے کسی کام کی نہیں۔ ہم علامہ اقبال کی علمی تعبیرات سے شدید اختلاف رکھتے ہیں۔ فلسفیانہ سطح پر ہمارے اور ان کے درمیان کسی مفاہمت کا امکان نہیں

لیکن یہ واقعہ ہے کہ بیسویں صدی نے ان کی سطح کا شاعر اب تک دریافت نہیں کیا۔ رہے نقاد تو انھیں فرصت ہی نہیں تھی کہ اپنے حلقۂ ارادت کے علاوہ بھی کسی پر نظر ڈالیں اور نئے ذہنوں کو سامنے لائیں۔

کاوشوں کا اعتراف فن کار میں تخلیقی اُمنگیں پیدا کرتا ہے۔ اس کی ہمت بڑھاتا ہے۔ آج جو ادب میں ایک اضمحلال کی سی کیفیت پائی جاتی ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جو لوگ نام و نمود سے بے نیاز ہو کر تخلیقِ ادب کے لیے مطالعہ و نظر اور اجتہاد و تفکر کی مشقتیں برداشت کر رہے ہیں ان کا اعتراف نہیں کیا جاتا۔ ان کا ادبی تصور عظیم ادب سے ماخوذ ہے۔ وہ علم و ادب کے درمیان دوئی نہیں کرتے ان کی شاعری لمحاتی ہیجانات کی شاعری نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ادب اس عہد میں اپنے عظیم تصور کے ساتھ ہی زندہ رہ سکتا ہے اور زندہ رہے گا۔ ان کا ادبی شعور منظم، توانا اور تربیت یافتہ فکر کی اُمنگوں سے عبارت ہے۔ یہ فکر، نفسِ انسانی کی گہرائیوں سے اُبھر کر حیات و کائنات کے عظیم ترین اسرار میں سفر کرتی ہے۔ یہ سفر صوفیانہ، راہبانہ اور مجذوبانہ سفر نہیں۔ یہ دانش پسندانہ اور طالبانہ سفر ہے جس میں انسانی مسرتوں اور سعادتوں کو تلاش کیا جاتا ہے۔ اس سفر کے دوران تخلیقی فکر کو مختلف مراحل سے گزرنا، مختلف احوال و ظروف سے ہم آہنگ ہونا پڑتا ہے۔ یہ غنودگی کا سفر نہیں بیداری کا سفر ہے، اس سفر میں عظیم ادب کا ذہن ہر عہد کی تعمیر و تکمیل کا فرض انجام دیتا ہے اور اپنی مثالیت پسندی کو غیر مطمئن پا کر نئی منزلوں کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔

یہ معجزہ کہ ہر اک عہد کی ہوئی تکمیل
یہ حادثہ کہ ہر اک داستاں ادھوری ہے

عظیم ادبی شعور کا یہ سفر ہمیشہ جاری رہا ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ اس سفر کے دوران نہ جانے کتنے ازل اور ابد آئیں گے۔ آتے رہیں گے اور یہ جاری رہے گا۔ اس وقت تک جب تک نفسِ شاعرہ باقی ہے، ذہنِ خلّاق زندہ ہے اور یہ کائنات اپنے احوال و اسرار کے ساتھ لامحدودیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ادب کے اس تصور کو سائنسی عہد سے ذرا

بھی خطرہ نہیں بل کہ اب تو اس تصور کو اپنے بازوؤں میں اور بھی توانائی پیدا کرنا ہے اب تو کائنات کچھ اور بھی پراسرار، کچھ اور بھی پیچیدہ اور کچھ اور بھی عظیم ہو گئی ہے۔ سائنس نے کائنات کو تنگ نہیں وسیع کیا ہے، وہ برابر پھیل رہی ہے، پھیلتی ہی چلی جائے گی اور ادب اس وسعت، عظمت اور متحرک لامحدودیت میں پرواز کرتا رہے گا۔ ہمیں اسی ادب کو معیار بنانا ہے۔ یہ وہ ادب نہیں جسے ہمارے سادہ لوح ناقدوں نے متعارف کرایا تھا۔ اس ادب کا نشان تاریخِ فکر و فن کے ان عظیم الشان سلسلوں میں ملے گا جن تک ہمارے ناقدوں کی رسائی نہیں اور جس کی محرمی اس وقت تک حاصل نہیں ہوگی جب تک ہم اپنی سہل انگاری، کم نظری، عقیدہ پرستی اور فکر دشمنی سے باز نہیں آئیں گے۔ گزشتہ بیس پچیس سال میں عام ادب جس زوال سے دوچار رہا ہے اس کی ذمّے داری ادب پر نہیں ادیبوں اور ناقدوں پر ہے، جنھوں نے علم و فن کے آتش خانوں کو چھوڑ کر بے مایہ چنگاریوں کی آنچ پر قناعت کی اور پرتو کے بجائے سائے کو پوجا۔ یہ لوگ تخلیقِ ادب کے سلسلے میں اولوالعزم نہیں کاہل، متوکل اور قناعت پسند ہیں۔ یا تو یہ لوگ عظیم ادب کے معیار اور اس کی شرائط سے واقف نہیں یا اخفا سے کام لیتے ہیں کیوں کہ اگر یہ معیار سامنے آ جائے تو پھر ان کے شوقِ غزل سرائی اور ذوقِ تنقید کے لیے وجۂ جواز کہاں سے آئے گی خصوصاً ناقدوں نے تو دانستہ طور پر معیار کُشی سے کام لیا۔ ان لوگوں نے اب تک جن شاعروں کو سراہا اور جن کے مجموعہ ہائے کلام کو اپنے لیے دستاویزِ شہرت و امتیاز بنایا ہے وہ علی العموم ناقابلِ ذکر تھے۔ انھیں دنیا کے عظیم ادیبوں کی محفل میں حاشیہ نشینی کا اعزاز بھی حاصل نہیں، ان کو صفِ نعال میں بھی جگہ نہیں مل سکتی۔ ادبی مفکرین کا فرض تھا کہ وہ ادبی شعور کی تربیت کرتے نئے ذہنوں کو دریافت کرتے، ان کو پرکھتے مگر ان میں دریافت و اکتشافات کی جرأت ہی نہیں، کسے معلوم کہ نئے عہد کے کتنے روشن فکر فن کار گم نامی کے اندھیروں میں پڑے ہیں انھیں کوئی پوچھنے والا بھی نہیں لیکن ان کا فرض ہے کہ وہ اب خود اپنے آپ کو پہچنوائیں اس لیے کہ وہی اس عہد کے ادبی اعتراف کی امانت اور وہی اس عہد کا مقدر ہیں۔ وہ اپنے عظیم و قدیم پیش روؤں سے کسی طرح بھی کم نہیں بل کہ ان کی صحیح یادگار ہیں۔ انھیں اپنے ادبی خلوص و

دیانت کو باقی رکھ کر شدید جہد و ریاض کو کام میں لانا چاہیے۔ انھیں ابھی فکری و فنی تربیت کی ضرورت ہے اور یہ فرض اسی وقت انجام دیا جاسکتا ہے جب ادب کو علم کی طرح ایک منظم اور اہم ادارہ خیال کیا جائے' تفریح و تفنن کا ذریعہ نہیں اور اب تو یہ بات مناسبِ حال بھی ہے کیوں کہ پاکستان کا یہ دور ادب کے لیے کافی سازگار ہے اور ہم ایسا محسوس کر رہے ہیں جیسے اس دور میں برِصغیر کے ادب کی نشاۃ الثانیہ کا ظہور ہو رہا ہے۔

انشاء اگست 1959

عصمت فروشی - چند سوال

معلوم نہیں کہ مرد نے سب سے پہلے کس جنسِ تجارت کی قیمت ادا کی؟ غالباً وہ عورت ہوگی، عورت کا جسم۔ عصمت فروشی کا ادارہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ خود انسانی سماج، یہ بازار کسی دور میں بھی سرد نہیں ہوا۔ عصمت فروشی کی اپنی ایک منطق بھی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اخلاقیات کے فلسفی اسے تسلیم نہ کریں۔ اس منطق کی رُو سے یہ بدنامِ عالم یا مشہورِ زمانہ پیشہ ایک جرأت مندانہ احتجاج ہے۔ جنسی احتجاج، سماج کی مفروضہ روایات واقدار کے خلاف اس منطق کو سقراط، افلاطون اور ارسطو نے نہیں ان کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں نے ایجاد کیا ہے۔ اپنے بزرگوں، شوہروں اور بیٹوں کی اخلاقی منطق کے جواب میں عورت کی اس مجتہدانہ ایجاد کو جس نے سب سے پہلے قبول کیا وہ مرد تھا اور وہ بھی مرد ہی تھا جس نے سب سے زیادہ اس کی مخالفت کی۔ یہ مسئلہ اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ صدیوں سے موجود ہے مگر آج اس کی پیچیدگیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔

ہر اصلاح پسند حکومت کے سامنے یہ سوال رہا ہے کہ عصمت فروشی کے ادارے کو کس طرح ختم کیا جائے۔ ہماری حکومت بھی اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے اور اس کا سدِ باب کرنا چاہتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس سوال سے متعلق کچھ وضاحتیں پیش کر کے اسے آسان بنانے اور حل کرنے کی کوشش کریں۔ ملک کے اہلِ رائے حضرات کو بھی اپنے طور پر مسئلے کو سمجھنے اور سلجھانے کی سعی کرنا چاہیے کہ یہ حکومت اور قوم کے ساتھ ایک تعاون ہوگا۔

عصمت فروشی کے سماجی، تہذیبی اور معاشی اسباب تو کچھ ایسے پیچیدہ نہیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ خراب ماحول، غلط تربیت، ناواجب قیود، سماج کے بے جا ضابطے، غیر منصفانہ نظامِ معیشت اور بعض دوسرے محرکات ہیں جنھوں نے عصمت فروشی کو ایک ادارے کی شکل اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یقیناً یہ صورتِ حال کا صحیح مطالعہ ہے مگر اسے مکمل اور جامع نہیں کہا جا سکتا۔ مکمل مطالعے کے لیے ضروری ہے کہ ہم انسانی فطرت کی تنہائیوں میں بھی سفر کریں۔ اس لیے کہ عصمت فروشی ایک رجحان کی حیثیت سے خود انسانی فطرت سے تعلق رکھتی ہے۔

یہ خیال شاید غلط نہیں کہ مرد و عورت دونوں جنسی طور پر تنوع پسند ہوتے ہیں اور ان میں بسیار زوجی رجحان پایا جاتا ہے۔ ان کا جنسی جذبہ کسی ایک معمول اور مطلوب پر قناعت نہیں کر سکتا۔ کم از کم ذہنی اور نفسیاتی طور پر اس بات میں کوئی شک نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ عورتوں کو سماجی ضابطوں کے زیرِ اثر عملاً ایک ہی شوہر پر قناعت کرنا پڑتی ہے۔ اگرچہ عصمت فروش عورتوں کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد ایسی عورتوں کی بھی ہمیشہ موجود رہی ہے جو ایک مرد پر قانع نہیں ہوتیں۔ اگر یہ مطالعہ درست ہے تو پھر ہمیں کُل انسانی سماج کو عصمت فروش قرار دینا پڑے گا، نہ صرف عصمت فروش بل کہ عصمت فروشی کا ایک منظم ادارہ۔ تو ایسی صورت میں مسئلہ اور بھی زیادہ غور طلب ہو جاتا ہے کیوں کہ اس حالت میں یہ تو ممکن ہے کہ ہم عصمت فروشی کے بازاروں کو بند کر دیں لیکن کرۂ ارض کے ان تمام حصّوں کو کس طرح کُھرچ پھینکیں گے جہاں جہاں انسانی سماج موجود ہے۔

یہاں جو اَن گنت سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ان کے ساتھ توجہ اور کشادہ پیشانی سے پیش آئیں۔ ایک سوال تو یہی ہے کہ اگر انسان جنسی لحاظ سے تنوع پسند ہے، بسیار زوجی رجحان رکھتا ہے تو پھر تعدّدِ ازواج پر کیا اعتراض ہے؟ خاص طور پر جب کہ مرد اپنی بیویوں کے درمیان معاشی اور جسمانی انصاف بھی کر سکتا ہو۔ لیکن تصویر کا دوسرا رُخ بھی ہے فرق صرف یہ ہے کہ اس پر عورت کا نام لکھا ہوا ہے یعنی عورتوں کو بھی بیک وقت کئی شادیوں کی اجازت ہونا چاہیے۔ کیا یہ بات بھی پہلی بات کی طرح معقول اور مدلل نہیں؟ بل کہ اس میں کچھ معاشی سہولتیں بھی ہیں ورنہ ہمیں یہ ثابت کرنا چاہیے کہ صرف مرد ہی جنسی

طور پر تنوع پسند ہوتا ہے عورت نہیں لیکن کیا یہ بات ثابت ہو سکے گی؟

غالباً ہمارے لیے یہی مناسب ہے کہ ہم مسئلے کو اس کی صحیح ترین منطق اور معنویت کے ساتھ پیش کر دیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ عصمت فروشی میں از روئے علم و عقل آخر کون سی خرابی ہے؟ اور یہ کہ عصمت کا سائنسی مفہوم کیا ہے آیا کوئی مفہوم ہے بھی یا نہیں؟ اس بحث کا مقصد یہ ہے کہ ہم اور ہمارے سماجی مفکر عصمت فروشوں کے مقابل کوئی مضبوط اور طاقت ور دلیل استعمال کرنے کے لیے تیار ہو سکیں۔

قدیم معاشروں میں جنسی محرکات اتنے طاقت ور اور موثر نہیں تھے جتنے کہ آج ہیں۔ عریاں رقص، ہیجان انگیز تصویریں، جذبات آفریں فلمیں، جسم و جمال کی نمائشیں ان سب محرکات نے مل کر صنعتی دور کے پراگندہ خاطر انسان کو جنسی بحران میں مبتلا کر دیا ہے۔ دوسری طرف جدید زندگی کی ضرورتیں اور ذمّے داریاں ہیں جن کے پیشِ نظر شادی آج ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے خاص طور پر مشرق کی نو آزاد قوموں کے نوجوان آج غیر معمولی فرائض میں گھرے ہوئے ہیں۔ انھیں نئے عہد کے علمی، تہذیبی اور سائنسی معیار اور ماحول سے ہم آہنگ ہونے کے لیے شدید ترین محنت کرنا باقی ہے۔ ایسے عالم میں وہ انتہائی سرگرداں ہی نہیں، ذہنی طور پر تنہا بھی ہیں بل کہ صنعتی عہد کا ہر انسان اپنے مصروف ترین ہجوم کے درمیان تنہائی کی زندگی بسر کر رہا ہے اس پُرانبوہ تنہائی نے صنعتی سماج کو نفسیاتی طور پر سماجی اکائیوں میں بکھیر دیا ہے۔

تنہا، تنہا، جدا، جدا، ایک، ایک
آدمی وقت کے جزیرے ہیں

شیر افضل جعفری

ان جزیروں کی خاموشیاں پکار رہی ہیں، تنہائیاں چیخ رہی ہیں۔ اس مشغول، اجنبی، حیران اور پُرشور عہد کا انسان ہر فرد اور ہر شے سے جلد از جلد فراغت پا جانا چاہتا ہے۔ زندگی چل نہیں رہی، چھلانگیں لگا رہی ہے، دوڑ رہی ہے۔ آج کسی نقطے پر ٹھہرنا ممکن نہیں اس لیے نیا عہد روایات و اقدار سے آہستہ آہستہ کٹتا جا رہا ہے۔ اقدار و روایات کے لیے جس نفسیاتی

توجہ، نظریاتی یقین اور مزاجی استقلال کی ضرورت ہے، وہ اب بالکل ناپید ہے۔ بظاہر فاصلے کم ہو گئے ہیں، انسانیت ایک برادری میں تبدیل ہو گئی ہے، جیسے سب ایک جگہ سمٹ آئے ہوں لیکن شخصیتیں سیاروں کی طرح ایک دوسرے سے بعید، بے گانہ اور اجنبی ہیں۔ اس فضا میں خاندان کا ادارہ آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں غور کرنا چاہیے کہ آیا آج ہمارا قدیم اور مقدّس جنسی اخلاق برقرار رہ سکتا ہے یا نہیں؟ اب شادی مسئلے کا حل نہیں رہی خود ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم ہے جو شادی کے معاشی تقاضوں کو واقعی پورا کر سکیں اور انھیں مزید اُلجھنوں کا شکار نہ ہونا پڑے۔ عصمت فروشی کے شرم ناک اور قابلِ ملامت ادارے کو بہ ہر قیمت ختم ہونا چاہیے مگر کیا اس کے ختم ہو جانے سے سماجی پیچیدگیوں میں اضافہ نہیں ہو جائے گا۔ کیا ہم یہ نہیں دیکھ رہے کہ آنے والے زمانے میں عورت اور مرد شادی کے بجائے عارضی معاہدے کرنے پر مجبور ہوں گے۔ بہ ہر حال ہم نے مسئلے کو اس کی پوری شدت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ اسی شدت کے ساتھ اسے حل کرنے کی سعی کی جائے۔

انشا، فروری 1960

بن مانسوں کا سماج

اکلیز 'یونانی دیومالا کا ایک انتہائی تیز رفتار فرد اگر اپنی تمام تر قوّت کے ساتھ ایک کچھوے کے پیچھے دوڑنا شروع کرے' ماہ و سال گزرتے رہیں اور وہ اسی طرح دوڑتا رہے' صدیاں بسر ہو جائیں اور یہ سلسلہ جاری رہے اور پھر ہزاروں سال' لاکھوں سال' کروڑوں سال' اربوں سال گزر جائیں اور تیز رفتار اکلیز سُست رفتار کچھوے کا تعاقب کرتا رہے تب بھی وہ کسی طرح اس تک نہیں پہنچ سکتا۔

وہ تیر جو کمان سے نکل کر چشم زدن میں اپنے نشانے تک پہنچ چکا ہے اس نے درحقیقت ایک بال برابر بھی حرکت نہیں کی وہ اس دوران میں بالکل ساکن رہا ہے۔ ہم ایک چیز کو دوبار نہیں دیکھ سکتے اس لیے کہ آنکھ جھپکتے ہی وہ بالکل بدل جاتی ہے۔ کائنات کی ہر شے اپنی جگہ ٹھہری ہوئی ہے' اس میں کوئی فرق نہیں ہوتا اگر ہمیں چیزوں میں کچھ فرق و تغیر کا احساس ہوتا ہے تو یہ ہمارا وہم ہے۔

وجود موجود ہی نہیں ہے۔

یہ تھے وہ خیالات جو یونان کے ان آئی اونیائی' ایلیائی اور سوفسطائی مفکروں نے پیش کیے تھے جو سقراط سے پہلے گزرے ہیں یہی وہ استعدادِ فکر تھی جس نے یونان میں دنیا کی عظیم ترین ثقافت کی بنیاد استوار کی اور افلاطون ، ارسطو جیسے فرزندوں کو جنم دیا۔

اس وقت ہمیں ان نظریات و خیالات کی تائید یا تردید کرنا نہیں ہے۔ صرف ایک قوم کی جرأتِ تفکر کا اندازہ لگانا ہے اور بتانا ہے کہ ان کے ذہنوں میں افکار و خیالات کے لیے کتنی آمادگی پائی جاتی تھی۔ وہ لوگ ہر تصور اور ہر خیال کے لیے مستعد رہتے تھے۔

''ایک طرف تو یہ ہے''

''مگر دوسری طرف یہ بھی تو ہے''۔

یونانیوں کا یہی وہ انداز تھا جس نے انھیں انسانی فکر کا ''معلّمِ اوّل'' بنا دیا ذرا ہمیں بھی تو سوچنا چاہیے کہ ہم کس طرح سوچتے ہیں، سوچتے رہے ہیں۔ ہمارا شیوہ تو یہ ہے کہ خواہ جان چلی جائے مگر اپنے یقین پر آنچ نہیں آنے دیں گے مگر ہمارا یہ شیوہ اس کائنات سے جس قدر ہم آہنگ ہے، وہ ظاہر ہے۔

''ہمارا ہر خیال ابدی صداقت کا حامل ہے''۔

مہذب دنیا کے کسی پڑھے لکھے مجمع میں اگر کوئی شخص یہ اندازِ بیان اختیار کرے تو اسے کان پکڑ کے باہر نکال دیا جائے۔ ہمیں اس بات کا اعتراف تو کر ہی لینا چاہیے کہ قدیم یونان اور پھر جدید یورپ میں آخر کوئی تو ایسی بات تھی ہی جس کے نتیجے میں وہ تمام دنیا پر ذہنی اور مادّی حکومت کر رہے ہیں مگر ہم؟ تو اس مرحلے پر ہمیں سکوت اختیار کر لینا چاہیے کیوں کہ تفکر ایک ایسا معجزہ ہے جو ہماری زندگی میں کبھی رونما نہیں ہوا۔ وہ اگر کوئی رنگ ہے تو ہم پیدائشی نابینا ہیں، اگر کوئی آواز ہے تو ہم ہمیشہ سے بہرے ہیں، اگر کوئی قابلِ اظہار شے ہے تو ہم گونگے ہیں اور اگر وہ کوئی متاعِ گمشدہ ہے تو ہماری قوّتِ حافظہ ختم ہو چکی ہے۔ ہمارے پاس صرف جذبات ہیں اور یہی وہ مقدّس دولت ہے جس کے استعمال کرنے کا سب سے زیادہ حق قدرت نے ہمارے ہی سپرد کر رکھا ہے۔

یہی جذبات ہیں جو کبھی مذہبیات کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی ادبیات کی صورت میں۔ ہمارے اہلِ قلم کی تمام تر کاوشیں محض برائے نام ادب اور مذہب کے موضوعات میں محصور ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہمارے قلمی سماج میں مولویوں، فنکاروں اور ناقدوں کے علاوہ مصنفوں کی اور کوئی قسم موجود نہیں ہے۔ آج سے دو ہزار سال پہلے کا کوئی معاشرہ بھی اپنے اہلِ قلم کی اس غیر ذمے داری، ناعاقبت اندیشی اور ہٹ دھرمی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا چہ جائے کہ بیسویں صدی کا کوئی معاشرہ جو دنیا کی سیارہ شکار ثقافتوں کے عہد میں زندگی بسر کر رہا ہو۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ایسے معاشرے کو صحیح معنی میں معاشرے سے تعبیر بھی نہیں

کیا جا سکتا اور اگر ہم پھر بھی مُصر ہوں تو سوچنا پڑے گا کہ غاروں میں رہنے والے وحشیوں اور بن مانسوں کو بھی صاحبِ معاشرہ قرار دیا جائے یا نہیں۔ ہمیں حالات نے اپنی بیجا عنایتوں سے ایک ایسی منزل پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جہاں ہماری تہذیب اور ذہنی نمایندوں کا یہ روّیہ نا قابلِ برداشت ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ علما اور اہلِ قلم کا نام سُنتے ہی ہمارے ذہن میں صرف مولویوں، فنکاروں اور تنقید طرازوں کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ ہم نے تو مہذب دنیا کی ان محترم اصطلاحوں کو بھی رُسوا کر دیا ہے۔ تحریر و تصنیف کا غیر کلیسائی، غیر جذباتی اور خالص علمی و انسانی تصور ہمارے یہاں ناپید ہے۔ ہمیں اپنے شہروں میں ان مصنفین کی تنظیمیں کہیں نظر نہیں آتیں جو حیات و کائنات کے مسائل و معاملات کے درمیان غیر جانب دار مبّصر اور حَکَم بننے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم میں بعض دانش پسند اور دانش ور لوگ بھی پائے جاتے ہیں مگر اس قسم کی کسی برادری کا یہاں کوئی وجود نہیں ہے۔ ترقی یافتہ سماجوں میں مختلف مدرسہ ہائے فکر اور مکتبہ ہائے نظر ہوا کرتے ہیں۔ سماج کے ذہنی نمایندے اپنی تہذیب و ثقافت کے مختلف شعبوں کی تحریری نمایندگی کرتے ہیں۔ زندگی کی وسیع معنویت کو سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے مگر ہمارے ذہنوں پر تو مسکنت و فلاکت کا عذاب نازل ہو چکا ہے۔ جن مصنفوں میں برائے نام کچھ متانت اور سنجیدگی پیدا ہوتی ہے وہ علمی موضوعات کو ترک کر کے ''مذہب اور تہذیب'' ''مذہب اور تنظیمِ معاشرہ'' ''مذہب اور انسانی مساوات'' جیسے موضوعات پُرزورِ تحقیق و تحریر صرف کر ڈالتے ہیں۔ اور بات وہیں کی وہیں رہتی ہے۔ جو حضرات کچھ زیادہ ترقی یافتہ ہیں وہ غالب کے غیر مطبوعہ مکاتیب، ان کے تلامذہ یا بعض قدیم شاعروں کے نایاب کلام کے سلسلے میں اپنی تحقیقاتِ انیقہ پیش فرما کر گویا تاریخ کا ایک عظیم ترین کارنامہ انجام دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ ہے جو اُن سے بھی زیادہ سنجیدہ واقع ہوا ہے اور اس نے قوم کو ریاضیات، طبعیات، علمیات، الہیات، فلسفۂ قانون، فلسفۂ تمدن اور فلسفہ و سائنس کے دوسرے شعبوں کا درس دینے کے لیے غالب و اقبال کے کلام سے ایک نصابِ تعلیم مرتّب کیا ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ جو قومیں فلسفہ و سائنس کی تعلیم فلسفہ و سائنس ہی کی کتابوں کے

ذریعے حاصل کرتی ہیں وہ احمق ہیں اور یقیناً یہ ایک عظیم انکشاف ہے۔ یہ گروہ ان ذہین شعرا کی طرف کوئی توجہ کرنے کے لیے آمادہ نہیں جو بے چارے ان کے ہم عصر ہونے کا شرف رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک دل چسپ بات یہ بھی ہے کہ اگرچہ ہمارے یہاں ابھی سائنسی عہد پوری طرح شروع بھی نہیں ہوا مگر برگزیدگانِ روحانیت ہیں کہ اس کے خلاف بدعاؤں میں مصروف ہیں اور ادیب اس غم میں نحیف و لاغر ہوئے جا رہے ہیں کہ یاالٰہی اب ادب کا کیا ہوگا۔

غرض فکر و فن کے اصل مفہوم سے کسی کو خلوص نہیں صرف چند لوگ ہیں جو علم میں ہمہ گیر تفکر اور ادب میں تفنن و فطانت کے آئینہ نما ہیں۔ وہ سائنس کی فتح مندیوں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ وہ اس طرح نہیں سوچتے کہ سائنس کی آب و ہوا ادب کو راس نہیں آئی، وہ سخت بیمار ہے اور عن قریب ہی مر جائے گا۔ ان کے نزدیک یہ دور اوہام کی ہزیمت اور علم کی کشور کشائی کا دور ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو قوم کی ذہنی پیش رفت اور اس سے آگے بڑھ کر مشرقِ عزیز کے ہمہ گیر ارتقا کے سلسلے میں اپنی ذمّے داریوں سے عہدہ برآ ہوں گے۔ یہ مختصر اور غیر منظم سہی لیکن ان کا وجود مشرق کے ہر گوشے میں پایا جاتا ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہ تہذیب اور سماج کے یک قومی اور یک ملکی تصورات سے بہ حُسن و خوبی عہدہ برآ ہوتے ہوئے بین الاقوامی سماج کی نقابت کا مثالی فرض انجام دیں کہ یہی وہ جنت ہے جس کا علم نے انسانیت سے وعدہ کیا تھا۔ یہاں پہنچ کر ہمیں پاکستان کے عقلیت پسند ادیبوں اور عالموں سے یہ کہنا ہے کہ وہ تحریر و تصنیف کے غیر مذہبی، انسانی اور خالص علمی و سائنسی موضوعات کو فروغ دینے کی پوری سعی کریں کہ اسی طرح وہ اپنے ملک اور قوم کی بے مثل خدمت انجام دے سکیں گے اور ایک ایسا کام کریں گے جس کی توفیق تاریخ کے منتخب اور محبوب لوگوں ہی کو ہوا کرتی ہے۔

انشا اپریل 1960

سفید فام درندے

''ہم اُس قوم کا انتظار کرتے رہے جو بچا نہیں سکتی تھی...... انھوں نے ہمارے پاؤں اس طرح باندھ رکھے ہیں کہ ہم نکل نہیں سکتے...... ہمارا انجام نزدیک ہے، ہماری مدت پوری ہوگئی، ہمارا وقت آ پہنچا، ہمیں کچلنے والے آسمانوں کے عقابوں سے بھی زیادہ تیز ہیں۔''

عہد نامہ عتیق، مراثی یرمیاہ

معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا انجام بھی نزدیک ہے، اُن کی مدت بھی پوری ہو چکی اور اُن کا وقت بھی آ ہی گیا، وہ زمانہ شاید بہت ہی قریب ہے جب انسانیت کے سینے میں شگاف ڈالنے والے سفید فام وحشی، جنوبی افریقہ میں تہذیب کا قتلِ عام کرنے والے سیاہ کار درندے قوموں کے درمیان اپنی ہلاکت کا نوحہ کریں گے۔

جنوبی افریقہ میں جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے اس نے انسان کے تہذیبی وقار کو خاک میں ملا دیا ہے۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ بیسویں صدی میں دنیا کے بعض حکم ران اور شہزادے یہ فرمان صادر کر رہے ہیں کہ فلاں نسل پست اور حقیر ہے اور فلاں گروہ عظیم اور عزیز۔ معلوم نہیں کہ انھیں غاروں سے باہر نکلنے اور شہروں میں داخل ہونے کی اجازت کس نے دی اور اب ہم سُن رہے ہیں کہ انھوں نے جنوبی افریقہ کے باشندوں سے انسان ہونے کا اعزاز بھی چھین لیا ہے اور گویا وہ جانوروں کو تہذیب سکھانے کا مشہورِ عالم فرض انجام دے رہے ہیں۔ ہم ضمناً یہ بھی واضح کر دیں کہ قوموں کو تہذیب سکھانے کا یہ احمقانہ نعرہ اب کافی پرانا ہو چکا

ہے۔ نسلی امتیاز پسندی کا یہ بے ہودہ اور جاہلانہ خبط شریف انسانیت کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ افسوس کہ نسلی غرور کے اس پاگل پن نے بعض مہذب ترین ملکوں سے تقویت حاصل کی ہے، ہم انسانوں کو ایشیائی، افریقی اور یورپی خانوں میں تقسیم کرنا جہالت اور حماقت خیال کرتے ہیں۔ لیکن ہم کسی قوم کو ہدفِ ظلم و شقاوت بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ آپ نے سُنا ہوگا کہ جنوبی افریقہ کے سفید فام حکم رانوں نے وہاں کے اصل باشندوں پر کتنا عجیب و غریب قانون عائد کیا ہے، کتنا عجیب ہے یہ قانون کہ ملک کے حقیقی مالک شناخت نامے کے بغیر ایک قدم بھی اپنے گھروں سے باہر نہیں نکال سکتے۔ شناخت نامہ موجود نہ ہونے کی صورت میں پولیس انھیں پکڑ کر جیل میں ڈال دیتی ہے یا پھر جرمانہ وصول کیا جاتا ہے۔ اس طرح اُن کا وطن اُن کے لیے ''زنجیر خانۂ حادثات'' ہو کر رہ گیا ہے۔

اس صورتِ حال کے خلاف وہاں کے حریّت پسند عوام نے جو تحریک شروع کی ہے، اس کی کام یابی پر دراصل تمام انسانوں کا وقار منحصر ہے۔ انھیں لُوٹا جا رہا ہے، اُن پر زندگی حرام کر دی گئی ہے لیکن تاریخ کے فیصلے نہیں بدلا کرتے، مستقبل اپنی عظیم مشیّت کو منوا کر رہے گا، ممکن ہے کہ وقتی طور پر آزادی کی روح کو کچل دیا جائے مگر کب تک؟ یہ عہد اقتدار پسند قوموں کی استعمار پسندانہ بربریت اور بدمعاشی کے لیے قطعاً ناسازگار ہے۔ جنوبی افریقہ کے بدمعاش اور جرائم پیشہ حکم رانوں کی اس بدتہذیبی، کمینگی اور درندگی نے دنیا میں نفرت اور غیظ و غضب کی لہر دوڑا دی ہے۔ ہم لندن کے ان شریف اور انسانیت دوست انسانوں کا ذکر کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں جنھوں نے نسلی تعصّب کے خلاف پُرزور احتجاج کیا ہے۔ ہم عالمی اداروں سے سفارش کریں گے کہ وہ اپنی تہذیبی اور سیاسی تنظیموں سے مجرموں کے اس ذلیل گروہ کو نکال دیں۔ یہ غنڈے قطعاً اس قابل نہیں کہ انھیں انسانوں کے برابر بیٹھنے کی اجازت دی جائے۔ جنوبی افریقہ کے عوام کا مطالبہ اب صرف یہی نہیں کہ غاصب حکومت اپنے ذلیل قانون میں ترمیم کرے، اب تو مکمل آزادی کا سوال ہے، حق کا مطالبہ ہے۔ جمہوریت پسند قوموں کا فرض ہے کہ وہ انھیں اُن کا حق دلائیں۔

جنوبی افریقہ کی یہ ذلیل حکومت، دولتِ مشترکہ کی رکن ہے۔ ہم دنیا کے تمام انسانیت

دوست دانش وروں' ادیبوں اور جمہوریت پسند عوام کی طرف سے دولتِ مشترکہ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس کی رُکنیت منسوخ قرار دے۔اقوامِ عالم کوکم ازکم ایک قدر پر تو متفق ہونا ہی چاہیے اور وہ قدر ''انسانیت'' ہے۔ہمیں ملال ہے کہ ہم نے ایک انسانی گروہ کے لیے یہ سخت لہجہ اختیار کیا مگر وہ انسان ہی کب ہیں؟ اُن کی وحشیانہ حرکات' جامع انسانیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ یہاں ہمیں ان مسکین اور مظلوم قوموں سے بھی کچھ کہنا ہے جنھیں یہ تہمتیں اور گالیاں سُننا اور سہنا پڑتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گالی' نسل اور رنگ کو نہیں دی جاتی 'صورتِ حال کی اتنی براہِ راست اور سادہ توجیہ کرنا صحیح نہیں' یہ گالی تو دراصل علمی پس ماندگی' تہذیبی محکومیت اور سیاسی ماموریت کو دی جاتی ہے۔ جب یہ ہوتا ہے تو پھر یہی ہوا کرتا ہے۔ مختلف سماجوں اور ثقافتوں کے درمیان توازن کا ناپید ہو جانا تاریخ کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ قدروں کو توڑنے والے ہی قدروں کے آفریدگار کہلاتے ہیں۔ کیا کوئی سفید فام قوم ان غیر مغربی اقوام کو نسل کا یہ طعنہ دینے کی جرأت کرسکتی ہے جو سائنسی اور سیاسی طور پر ہمت شکن قوتوں کی مالک ہیں' کیا یہ ممکن ہے؟

انشا' مئی 1960

شرم ناک

''میں نے زمین پر نظر کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ ویران اور سنسان ہے۔ آسمانوں کو بھی تاریک پایا۔ میں نے پہاڑوں کی طرف دیکھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ وہ کانپ گئے اور ٹیلے لرزنے لگے۔ میں نے دیکھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی آدمی نہیں اور سب ہوائی پرندے اُڑ گئے۔ پھر میں نے دیکھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ زرخیز زمین بیابان ہوگئی''۔

یہ ہے جنگ کا تصور جس پر صدیوں کی گرد جم چکی ہے۔ لیکن آج! آج تو اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ آج تو ہم اس کی تباہ کاری کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پہاڑوں کی ہڈیاں پگھل چکی ہیں، زمین دھواں بن کر اُڑ چکی ہے۔ لیکن نہیں اس کا عذاب اِس سے کہیں زیادہ عظیم ہے۔ ان لوگوں کا دماغ خراب ہوگیا ہے جو آج انسانیت کو جنگ کی آگ میں جھونک دینا چاہتے ہیں۔ وہ افراد جنھوں نے اس نازک دور میں روس کی طرف سراغ رساں طیارہ اُڑانے کی جرأت کی، تہذیب، تمدن، انسانیت اور زندگی کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ تاریخ ان سے زیادہ مہیب اور خوف ناک مجرموں کے پیدا کرنے پر آج تک قادر نہیں ہوئی۔ آج جنگ کے امکانات کو تقویت پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ پورے کرۂ ارض کو داؤ پر لگا دیا گیا۔ روس کی فضاؤں میں امریکا کے جاسوسی طیارے کی پرواز اس بات کا ثبوت ہے کہ ہماری تہذیب، دہشت و بربریت میں قدیم عہد کی تاریک صدیوں کو بہت پیچھے چھوڑ چکی ہے۔ اور جہالت وسفاکی میں ہم متمدن انسان، نیزہ بردار وحشیوں سے ہزاروں سال آگے ہیں۔ امریکا کے جنگ پسند عناصر کا انداز بتاتا ہے کہ وہ اپنی بے ہودہ شرم ناک اور اشتعال انگیز حرکت پر شرمندہ نہیں ہیں بل کہ اسے صحیح ثابت کرنے پر مُصر ہیں۔ حیرت ہے کہ مقدس چرچ میں امنِ عالم کی دعائیں مانگنے والے آئزن ہاور ہی امن

سوز اور زندگی دشمن سازشوں کے ''پیشوا'' بنے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف وزیرِاعظم روس خروشیف اپنے غیر ذمّے دارانہ لہجے سے مسئلے کو اور بھی سنگین بنائے دے رہے ہیں۔ ایسے عالم میں انسانیت آخر کس سے فریاد کرے۔ کاش! ان لوگوں کو احساس ہوتا کہ اُن کے لبوں کی ایک جنبش اور اُن کی آنکھوں کا ایک اشارہ اس کرّۂ ارض کو ایک آن میں جہنم بنا سکتا ہے۔ کہنا ہی پڑتا ہے کہ تاریخ نے قوّت و اقتدار کے لیے غلط افراد کا انتخاب کیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا کے یہ سب سے زیادہ طاقت ور رہنما آخر کس صدی کی باتیں کر رہے ہیں۔ کیا یہ لوگ اپنا دماغی توازن کھو چکے ہیں یہاں ہم یہ کہے بغیر نہیں رہیں گے کہ ارتکابِ جرم امریکا نے کیا ہے' وہ تاریخ کی عدالت میں ایک سفّاک اور خیرہ چشم مجرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج کوئی نہیں جو اس کی وکالت کر سکے۔ سب کچھ معاف کیا جا سکتا ہے لیکن حیات دشمنی کسی طرح معاف نہیں کی جا سکتی۔ جہاں تک ہماری اپنی ذمّے داری ہے تو ہماری حکومت امریکا سے احتجاج کر کے اپنی ذمّے داری سے عہدہ برآ ہو چکی ہے۔ ہم طیارہ انگیزی کے اس مجرمانہ اقدام کو شدّت کے ساتھ قابلِ نفرین قرار دیتے ہیں۔

سوچنا چاہیے کہ وہ بنیادی اسباب کیا ہیں جو انسان کو درندہ بنا دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمّے داری عقیدوں پر بھی ہے۔ دنیا کے اقتدار پسند عناصر نے اقتدار پسندی کو در اصل ایک عقیدے کی حیثیت دے دی ہے۔ آج عقیدوں کی گرفت ہمہ گیر ہے۔ اس حقیقت کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ اب سائنس بھی ایک عقیدہ بن گئی ہے' ایک ایسا عقیدہ جو اپنی غایت آپ ہے' جس کا رُخ صرف اپنی طرف ہے چاہے اس کا انجام کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ جدید سائنس کے اس کردار کو دیکھ کر متمدن انسانوں کے بارے میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ کرّۂ ارض کے قدیم ترین وحشیوں نے اپنے جسم پر تہذیب یافتہ صدیوں کے غلاف چڑھا لیے ہیں اور ان غلافوں کے اندر عہدِ قدیم کی وہی مہیب وحشتیں سانس لے رہی ہیں۔ آخر ترقی و تہذیب کا یہ کون سا مفہوم ہے کہ شریف انسانیت کو ایک ذہنی عذاب میں مبتلا کر دیا جائے۔ اب تو ہر وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین ہلاکت کی پُشت پر سوار ہے اور ابدی موت کی طرف دوڑ رہی ہے۔ اگر سائنس کی حیات دشمن سرگرمیاں اسی

طرح جاری رہیں تو وہ زمانہ بہت قریب ہے جب علم اور تہذیب کا حقیقی شعور "علم اور تہذیب" کے خلاف چیخ چیخ کر احتجاج کرے گا اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ ہمیں سائنس کی کوئی ضرورت نہیں۔ دنیا کی جرائم پیشہ قوموں نے سائنس کا جو کردار متعین کیا ہے وہ علم و سائنس کے خلاف سب سے بڑی سازش ہے اور رجعت پسند عناصر سے یہی توقع رکھی جا سکتی تھی۔

انسان نے سائنس میں غیر معمولی ترقی کر لی لیکن سائنسی اندازِ نظر آج تک پیدا نہیں کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس کی زیادہ تر ترقیاں غلط سمت میں ہو رہی ہیں۔ حیرت ہے سائنس جیسا محترم شعبہ اس تہذیب و تمدن کے دور میں بھی جنگی اداروں کی سرپرستی کر رہا ہے۔ کیا انسان اس وقت تک اپنی تہذیب و متانت کا کوئی دعویٰ کر سکتا ہے جب تک دنیا میں جنگی ادارے موجود ہیں اور انسانی ذہن کی اعلیٰ صلاحیتیں اُن کی تربیت کر رہی ہیں۔ آج انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ جنگ کے تمام اداروں، صنعتوں اور تجربوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ آخر یہ ہول ناک مذاق کب تک جاری رہے گا؟

آخر میں ہمیں روسی وزیراعظم سے یہ کہنا ہے کہ انھوں نے پاکستان کے سلسلے میں جو لہجہ اختیار کیا وہ امن سے متعلق اُن کے بیانات کی تردید کرتا ہے۔ کیا پاکستان سے زیادہ کوئی ملک امن پسند ہو سکتا ہے؟ ہمارے تو زمین و آسمان ہی چند سال پہلے عالمِ وجود میں آئے ہیں۔ امن کی جس ملک کو سب سے زیادہ ضرورت ہے، وہ ہم ہیں اس سلسلے میں پاکستان کا رویّہ بالکل واضح ہے، ہم جنگ کے امکانات سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ ہم ان وحشیانہ سرگرمیوں کو برداشت نہیں کر سکتے جنھوں نے ایٹم اور ہائیڈروجن بم کے بعد اب نیوٹرون بم ایجاد کرنے کی تیاریاں شروع کی ہیں۔ آخر اس غیر ذمّے داری اور نادانی کی کوئی انتہا ہے کہ امریکا کے بعض ماہرینِ جنگ بڑے فخر سے یہ کہتے ہیں کہ ہماری برّی فوج کے پاس ایسے میزائل موجود ہیں جن سے ۳۷ ہزار فٹ کی بلندی پر نشانہ لگایا جا سکتا ہے۔

زندگی کے خلاف نشانہ بازی کرنے والی تہذیب ہمارے لیے قابلِ نفرت ہے اور اسے نیست و نابود ہو جانا چاہیے۔

انشا، جون 1960

ایک بحث۔چند سوال

سالِ رواں کے شروع میں حکومت نے ''اسلامی تحقیقی ادارہ'' کی از سرِ نو تنظیم و تشکیل کی تھی۔ پچھلے دنوں ادارے کی مجلسِ نظما کا افتتاح عمل میں آیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ موجودہ حکومت کی توجہ سے پہلے ادارہ بے عملی اور تعطل کا شکار رہا۔ اب اسے ایک فعال ادارہ بنایا گیا ہے۔ اس کے مقاصد متعین کیے گئے ہیں۔ وزیرِ تعلیم جناب حبیب الرحمٰن نے جو مجلس نظما کے چیئر مین ہیں، ادارے کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''اس ادارے کا سب سے اہم کام یہ ہوگا کہ اسلام کی جدید تشریح و توضیح کا فرض انجام دے اور اسے ایک ایسے ضابطۂ حیات اور نظامِ فکر کی حیثیت سے پیش کرے جس کے ذریعے نئے عہد کے مسائل کا مقابلہ کیا جا سکے اور سائنسی معاشرے کے مطالبات پورے ہو سکیں''۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ گزشتہ دو تین صدیوں سے لے کر آج تک مذہب برابر پیچھے ہٹتا جا رہا ہے اور سائنس برابر آگے بڑھ رہی ہے۔ اس طرح جو صورت پیدا ہو گئی ہے وہ یہ ہے کہ آج دنیا کا کوئی مذہب انسانی معاشرے کی تہذیبی، سماجی، سیاسی علمی اور سائنسی ذمّے داریاں قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ البتہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کے بعض ذمّے دار اور حوصلہ مند معتقدین اسے آج بھی ایک ایسے نظام کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کرنے پر آمادہ ہیں جو سائنسی عہد میں بھی پوری کام یابی کے ساتھ اپنے تمام فرائض سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے مگر یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جذبہ ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں میں دوسرے مسلمان عوام اور اکابر کے مقابلے میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے حالاں کہ قیاس یہ چاہتا ہے کہ یہ رجحان اسلام کے تاریخی مراکز یعنی عرب، عراق، مصر اور ایران میں پاکستان و ہندوستان کی نسبت سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ پایا جاتا۔ ظاہر ہے کہ برِ صغیر کی مسلمان

ثقافت مذکورہ ممالک کی ثقافتوں کے مقابلے میں ایک بالکل نومسلم ثقافت ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ تحریکِ اسلامی کے تاریخی علاقوں میں یہ رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی نے انسانی تاریخ کی مشکل ترین ذمّے داری قبول کی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس باب میں اپنی طرف سے چند صراحتیں پیش کر کے ادارے پر اس کی انتہائی نازک اور نزاعی حیثیت واضح کر دیں۔ اس موقع پر سکوت اختیار کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمیں مسئلے سے کوئی دل چسپی نہیں۔ مذہب سے تعلق رکھنے والی ہر بحث کا آغاز اُصولی طور پر کائنات کی ایک باشعور علّت (یعنی علّتِ اولیٰ یا علّت العلل) کے تصور سے ہوتا ہے۔ چناں چہ مذہب کے بارے میں جب بھی کوئی ذمّے دارانہ اور سنجیدہ بحث کی جائے گی تو سب سے پہلے یہ سوال زیرِ بحث آئے گا کہ خدا ہے یا نہیں؟ یہ سوال فلسفے کے آغاز سے لے کر آج تک ہر فلسفی کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ فلسفے کا سب سے زیادہ دقیق شعبہ مابعد الطبیعیات یا فلسفۂ اولیٰ اسی سوال سے بحث کرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فلسفیوں سے جس چیز کے بارے میں بار بار سوال کیا جاتا ہے وہ یہی ہے۔ ایک مرتبہ یونان کے سوفسطائی مفکر پروتاگورس سے کسی دانش طلب سائل نے سوال کیا کہ وجودِ خدا کے باب میں آپ کی رائے کیا ہے؟ سوفسطائی مفکر نے جواب دیا: ''اے شخص! مسئلہ پیچیدہ ہے اور عمر کم، لہٰذا میں کوئی جواب نہیں دے سکتا''۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کا کوئی ذمّے دار فلسفی بھی اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ فلسفیوں میں ایسے بہت سے افراد گزرے ہیں جو وجودِ باری کے قائل تھے اور انھوں نے مختلف دلائل سے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش بھی کی لیکن آج بھی یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے۔ یہاں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ ان فلسفیوں کا خدا اربابِ مذہب کے خدا سے بالکل مختلف ہے۔ فلسفی دراصل کائنات کی رُوحانی توجیہ کرتے ہیں اور کائنات کی رُوحانی توجیہ اور منظم مذہب کو ایک ہی شے قرار نہیں دیا جاسکتا۔ چناں چہ مذہبی علما، روحانیت پسند فلسفیوں سے تقریباً اتنا ہی اختلاف رکھتے ہیں جتنا ملحد فلسفیوں سے۔ اب رہے مادّیت پسند، سوفسطائیت پسند اور ارتیابیت پسند فلسفی تو جب مذہب اور روحانیت پسند فلسفے ہی میں مفاہمت نہیں ہو سکتی تو پھر ارتیابیت، مادّیت اور

سوفسطائیت کا تو ذکر ہی بے کار ہے۔ اب صرف یہی صورت رہ جاتی ہے کہ ہم خود مذہب سے رجوع کریں اس لیے کہ فلسفے کا کوئی اسکول بھی اس سوال کی تسکین نہیں کر سکا۔ مگر مذہب کو یہ دقت پیش آئے گی کہ وہ اس بحث کے دوران مذہب نہیں رہے گا بل کہ فلسفہ یا منطق بن جائے گا اور اگر اس نے بہت زیادہ احتیاط برتی تو کم سے کم علم الخلاف کی شکل اختیار کیے بغیر چارہ نہیں اور علم الخلاف، فلسفے اور منطق ہی کے کارخانے کا ڈھلا ہوا ایک ہتھیار ہے۔ مختصر یہ کہ مذہب اپنی حدود میں رہ کر اس مسئلے کا کوئی حل نہیں پیش کر سکتا اور حدود سے تجاوز کرنا کم سے کم مذہب کا شیوہ نہیں۔ بہ ہر طور یہ ہیں وہ پیچیدہ تضادات اور تناقضات جو خدا ہے یا نہیں؟ کی اصل بحث کے افتتاح سے پہلے ہی سامنے آ جاتے ہیں، چہ جائے کہ خود اصل بحث!...... واضح رہے کہ یہ صورتِ حال ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ ہی نہیں تمام مذاہب کے لیے قابلِ غور ہے اور تمام مذاہب کو مل کر اس سوال کا جواب دینا چاہیے لیکن ظاہر ہے کہ ہم اس وقت انتہائی غیر عملی اور ناحقیقت پسند ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔ دنیا میں صرف ایک ہی ایسا مقام ہے جہاں دو مختلف مذہب یکجا نظر آتے ہیں اور وہ ہے میدانِ جنگ۔ اس موضوع پر کسی بین الاقوامی مجلسِ مذاکرہ کا انعقاد کسی طرح ممکن نہیں۔ ہم چوں کہ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے سلسلے میں گفت گو کر رہے ہیں لہٰذا اس گفت گو کی حد تک ہمیں مذہب کو ایک حقیقتِ ثابتہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ خود ادارۂ مذکورہ بہ ہر حال ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ اب جب کہ یہ ادارہ اپنے طور پر اسلام کی تعمیرِ نو کا تاریخی فرض انجام دینا چاہتا ہے تو ہمیں اس کی راہ میں دشواریاں پیدا کرنے کے بجائے آسانیاں بہم پہنچانا چاہییں۔ یہ ہم سب کا اخلاقی فرض ہے۔ پس ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ اسلام کی جدید توجیہ کس ماخذ کو سامنے رکھ کر کی جائے۔ یہاں یہ بات بالکل صاف ہے کہ قرآن ہی اسلام کا ایک ناقابلِ انکار ماخذ ہے لیکن قرآن کی نوعیت یہ ہے کہ اس کا ایک حصہ آیاتِ متشابہات پر مشتمل ہے اور دوسرا آیاتِ محکمات (واضح اور غیر مشتبہ آیتیں) پر۔ آیاتِ متشابہات کے بارے میں کوئی مفسّر قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پس اسلام کی سیاسی، سماجی، معاشی اور تمدنی تعبیر کے سلسلے میں محکمِ قرآن (آیاتِ محکمات) ہی کو ماخذ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن تاریخِ اسلامی کسی

ایسے دور کا پتا نہیں دیتی جب قرآن کی ان واضح اور صاف آیات کی رُوشنی میں مسلمان علماو مفسّرین نے اسلامی ثقافت کو منظم کرنے کی کوشش کی ہو۔ حالاں کہ ان کے لیے حالات اب سے کہیں زیادہ سازگار تھے۔ حیرت ہے کہ اسلام کے یونان یعنی بغداد میں یہ بحثیں تو پورے زور وشور سے ہوتی تھیں کہ قرآن قدیم ہے یا حادث؟ نیز اسی سطح کی اور دوسری بحثیں اور فقہ و حدیث کے متعدد مسائل مگر جہاں فلسفہ و منطق، ریاضیات وطب، اخلاقیات اور سیاسیات اور دوسرے علوم وفنون کا ذکر آتا تھا تو یہ حضرات یونانی ماخذ کے علاوہ کسی بھی ماخذ کا نام نہ لیتے تھے۔ اگر قرآن مجید کسی سیاسی، سماجی، علمی اور تمدنی نظام کا ماخذ یا اس کی ازسرِنو توجیہ و تنظیم کا ذریعہ بن سکتا تھا تو اس سلسلے میں کوئی کوشش کیوں نہیں کی گئی، خاص طور پر ایسے عالم میں جب کہ اس کام کے لیے حالات بھی ہر لحاظ سے سازگار تھے۔ حد یہ ہے کہ فلسفے جیسا حریف بھی اس وقت تاریخی اور سیاسی طور پر مذہب کے حلقۂ اقتدار میں محصور تھا مگر دنیائے اسلام کے جیّد مفسّرین دیکھتے رہے کہ اسلامی حکومت کی دولت یونانی علوم کے عیسائی اور یہودی مترجموں پر بے دریغ صرف کی جارہی ہے اور خاموش رہے۔ حالاں کہ وہ نکاتِ قرآنی کے ذریعے معاشرے کے ذہنی اور مادّی نظامات مرتّب کرنے کی ہمارے عہد کے علما سے کہیں زیادہ اہلیت رکھتے تھے۔ یہ اور ایسے بہت سے سوالات اپنا جواب چاہتے ہیں۔ اب جب کہ اسلامی تحقیقی ادارہ اسلام کو ایک ایسے ضابطۂ حیات اور نظامِ فکر کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتا ہے جس کے ذریعے سائنسی معاشرے کے تمام مطالبات پورے ہو سکیں تو وہ خود سائنس کے ساتھ کیا سلوک اختیار کرے گا؟ جدید سائنسی معاشرے کی ذہنی اور مادّی تشکیل میں مختلف علوم، صناعات اور فنون نے حصّہ لیا ہے۔ مثلاً تاریخ، معاشیات، اقتصادیات، طب، طبیعات، حیاتیات، کیمیا، مصوری، فنِ تعمیر، موسیقی، رقص، غرض علوم وفنون کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ یہاں ذہن میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

کیا اسلامی علوم، اسلامی ثقافت اور اسلامی تاریخ کی تحقیق سے فراغت پانے کے بعد تحقیقی ادارہ دنیا بھر کے علوم وفنون کو اسی تحقیق کے نتائج کی روشنی میں قبول کرے گا؟

کیا علوم وفنون کے وہ تمام شعبے رَد کردیے جائیں گے جو شرعاً غیر اسلامی ہیں؟

کیا خود سائنس انسانی ذہن کے ایک غیر مذہبی شعور کا نتیجہ نہیں؟

کیا آرٹ اور سائنس کے تمام شعبوں کو اسلامی طریقِ تفکر کے مطابق از سرِ نو منتخب کیا جائے گا؟ اگر ایسا ہے تو پھر اس کام کے لیے کتنی مدت مقرّر کی گئی ہے؟

اگر نتیجے میں آرٹ اور سائنس کو جوں کا توں باقی رکھنا ہے اور غالباً ادارے نے یہی فیصلہ کیا ہوگا تو پھر کسی مزید کاوش کے بغیر پہلے ہی سے یہ کیوں نہ فرض کر لیا جائے کہ ان کو اسلامی تفکر کی تائید حاصل ہے۔ بہ ہر حال اب ان تمام علوم وفنون کی قسمت ادارے کے فیصلے پر منحصر ہے۔ ہم اس بحث کے بعد جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس کا ماحصل یہ ہے کہ عقیدے اور عقل کو دو جداگانہ کرّوں اور حیزوں میں رہنے دیا جائے جہاں وہ دونوں خود مختار ہوں اور ان دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے معاملے میں دخل انداز نہ ہو۔ اس لیے کہ مذہب انسان کے جس جذبے کی تسکین کرتا ہے اس کو مطمئن کرنے کی اہلیت فلسفہ وسائنس میں قطعاً نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح فلسفہ وسائنس سماج کی جن ضرورتوں کے کفیل ہیں ان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ان حدود سے تجاوز کیا گیا تو ہمیں شدید ترین سیاسی، تہذیبی اور علمی نقصانات برداشت کرنا پڑیں گے۔

موجودہ حکومت کی توازن پسندی اور معاملہ فہمی کے پیشِ نظر ہمیں اُمید ہے کہ وہ تحقیقی ادارے کے ارکان کو مسئلے کے ان پہلوؤں کی طرف توجہ دلائے گی۔ محترم صدرِ مملکت نے مجلسِ نظما کے افتتاحی جلسے میں جو تقریر کی ہے وہ اپنی معنویت کے اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔ انھوں نے مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے کہ "کوئی شخص بھی جدید عہد سے آنکھیں نہیں چُرا سکتا۔ ہمیں اس دنیا میں زندہ رہنا اور حقائق کا مقابلہ کرنا ہے"۔ صدر نے کہا کہ "سب سے بڑی غلطی اس وقت ہوئی جب جمہور سے یہ کہہ دیا گیا کہ وہ خود غور وفکر نہ کریں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ ان سے ہمیشہ یہی کہا جاتا رہا کہ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ اب انھیں یہ بھی تو بتایا جائے کہ انھیں اس دنیاوی زندگی میں کون سے کام کرنا چاہئیں"۔

ہمیں یقین ہے کہ صدر کی اس تقریر سے ادارے کے ذمّے دار افراد پوری طرح بصیرت حاصل کریں گے۔

انشا، اگست 1960

دماغ کے بغیر

اولمپی کھیلوں میں پاکستان نے ہندوستان سے ہاکی کا مقابلہ جیت کر جو عالمی امتیاز حاصل کیا ہے وہ یقیناً ہم سب کے لیے باعثِ مسرت ہے۔ صرف ہمارے ہی لیے نہیں بل کہ ہندوستان کے لیے بھی' اس لیے کہ ہار اور جیت کا تعلق دو اجنبی ملکوں میں نہیں ایسے دو ملکوں میں قائم ہوا ہے جن کا نام زبان پر ایک ساتھ آتا ہے اور جو ایک دوسرے سے قریب تر ہیں۔ ایسے مقابلوں میں قوموں کی زندگی اور زندہ دلی کے امکانات نمایاں ہوتے ہیں اس لیے کھیلوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ افلاطون نے بھی اپنے نظامِ تعلیم و تربیت میں کھیلوں اور جسمانی ورزشوں کو قابلِ ذکر حیثیت دی ہے۔ بعض فلسفی تو خود زندگی کو فطرت کا ایک کھیل سمجھتے ہیں اور وہ ایک کھیل ہے بھی تو۔ کہنا چاہیے کہ وہ ایک عظیم الشان کھیل ہے۔ ہم ان لوگوں سے متفق نہیں جو اسے زہد' تقشف اور ریاضت سے تعبیر کرنا چاہتے ہیں۔ زندگی میں اگر رنگ و آہنگ اور اُمنگ اور ترنگ نہیں تو پھر وہ موت ہے۔

مگر اس موقع پر ہمیں انتہائی دردمندی اور سنجیدگی سے جو کچھ کہنا ہے وہ یہ ہے کہ بات کو حد سے آگے نہیں بڑھانا چاہیے۔ یہ بڑی ہی دردناک بات ہے کہ ہم عموماً حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ چناں چہ کھیل کے سلسلے میں ہم نے گزشتہ عرصے میں جس غیر ذمّے دارانہ طرزِ عمل' بے اعتدالی اور ناقابلِ برداشت انتہاپسندی کا مظاہرہ کیا ہے وہ بے حد تشویش ناک ہے اور اب تو بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ پچھلے دنوں اولمپی کھیلوں کے موقع پر کسی اور نے نہیں بل کہ وزارتِ تعلیم کے رکنِ اعلیٰ جناب حبیب الرحمٰن نے قوم سے اپیل کی کہ پاکستانی کھلاڑیوں کی فتح کے لیے مسجدوں میں دعائیں مانگی جائیں۔ گویا ان کے خیال میں پاکستان

کے کھلاڑی قوم کی طرف سے تاریخِ انسانی کا کوئی عظیم الشان فرض انجام دینے گئے تھے۔ اس لیے قوم پر واجب تھا کہ ان کی فتح وظفر کے لیے نمازیں پڑھے اور منتیں مانے۔

ملک کے وزیرِ تعلیم کی جانب سے کھلاڑیوں کی اتنی ہمت افزائی ہمارے لیے قطعاً ناقابلِ فہم ہے۔ محترم وزیرِ تعلیم نے یہ تکلیف دہ رویہ اختیار کر کے قوم کے سنجیدہ طبقے کو سخت صدمہ پہنچایا ہے۔ جب وزارتِ تعلیم بھی کھیلوں کی تعظیم وتمجید پر تلی ہوئی ہے تو پھر نہیں کہا جا سکتا کہ اس قوم کا حشر کیا ہوگا؟ بات ایک حد تک تو ٹھیک ہے۔ ہم بھی کھیلوں کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں مگر کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمارے نوجوان کھلاڑیوں کو قوم کا ہیرو سمجھ لیں اور اپنے تمام فرائض فراموش کر کے صرف ایسے کاموں میں امتیاز حاصل کرنے کو اپنا سب سے اہم فرض خیال کر لیں جو اکثر حالات میں ترقی کی ضد واقع ہوئے ہیں۔ آج کل ایک عجیب بات دیکھنے میں آ رہی ہے یہ کہ جن مشاغل میں دماغ سے کام لینے کی سب سے کم ضرورت پیش آتی ہے بل کہ بالکل ہی ضرورت پیش نہیں آتی وہی ہمارے سماج میں سب سے زیادہ عظیم اور عزیز قرار پاتے ہیں۔ جہالت کو جتنی رعایتیں ہمارے سماج میں دی گئی ہیں اس کی مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہم اپنی ترقیِ معکوس کا جشن منا رہے ہیں۔ یہاں اگر کسی کو عوام وخواص میں مقبول ہونے کی خواہش ہو تو اسے علم وہنر کے بجائے ہاکی' کرکٹ' باکسنگ اور رقص وموسیقی میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں کے نوجوان تاریخِ انسانی کے دانش وروں' مفکروں' حکیموں اور شاعروں کی بے کیف صحبت میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ہالی وڈ کے اداکاروں کی ہدایت ورہنمائی میں جدید عہد کے مرحلے طے کر رہے ہیں۔ گویا تاریخ نے پاکستان کا اسٹیج محض اس لیے تیار کیا تھا کہ اس پر چند بہروپیوں' نقالوں اور کھلنڈروں کی نمایش ہو سکے۔ غضب یہ ہے کہ اب انھی مساعی اور مصروفیات کو ترقی وتہذیب کی علامت اور آرٹ کی سرپرستی وقدردانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ کیوں ہے؟ فقط اس لیے کہ اس ہونہار قوم کو مغرب کی نقالی' دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔

یہ ایک تلخ ترین حقیقت ہے کہ ہم مغرب کی ذلیل ترین غلامی سے ذہنی طور پر آج تک

نجات حاصل نہیں کر سکے۔ کسی ترقی یافتہ قوم کی تقلید بُری چیز نہیں مگر دیکھنا یہ ہے کہ تقلید کے فرائض کن میدانوں میں انجام دیے جا رہے ہیں۔ یہ کتنا المناک حادثہ ہے کہ ہم نے اپنی پوری زندگی کا دستورِ عمل مغربی اقوام کے صرف تفریحی اوقات کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے۔ گویا ہمارے خیال میں برطانیہ، امریکا اور فرانس میں صبح سے شام تک صرف کھیلوں کے مقابلے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ عظیم مغرب کے ساتھ کتنی بڑی ناانصافی ہے! آپ ضرور کھیلیے، کھیلنے والوں کو دیکھ کر جوشِ مسرت میں تالیاں بجائیے لیکن آپ میں اتنی جسارت تو نہیں ہونا چاہیے کہ اپنے اس شغل کو علمی، تہذیبی اور سماجی فرائض کا بدل اور اپنی ذات کو قوم کے اصل نمایندوں کا قائم مقام سمجھ بیٹھیں اور پھر قومی سطح پر اس خیرہ سری اور خیرہ چشمی کی داد بھی حاصل کریں۔ اس کیفیت کو دیکھ کر کبھی کبھی تو یہ خیال پیدا ہونے لگتا ہے کہ یہ عہد کہیں فکری زوال کا عہد تو نہیں اور یہ قوم ذہنی طور پر دیوالیا تو نہیں ہو گئی۔

آپ پر صدیوں کا قرض اور قرنوں کا دَین ہے۔ آپ ذہنی اور مادّی طور پر جانوروں اور وحشیوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس لیے کہ آپ کے شکستہ و درماندہ ماضی میں سو سال غلامی کے بھی شامل ہیں۔ ہم جب اپنے وجود پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم صدیوں اور قرنوں کی ایک مقہور و معتوب قوم کو دیکھتے ہیں۔ وہ قوم جسے اس کی خواہش کے بالکل برخلاف ارتقائے تاریخ کے بھرے ہوئے سیلاب کی زد پر پھینک دیا گیا ہے جس نے سفینوں سے کود کر تنکوں کی طرف تیرنا سیکھا ہے جو چٹانوں کے بجائے جھاگوں پر اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتی ہے۔ واقعی ہم تاریخ کا ایک تماشا اور انسانیت کا ایک عجوبہ ہیں۔ ہمیں پوچھنا یہ ہے کہ آخر یہ قوم چاہتی کیا ہے؟ کیا قوم کے وہ دردمند افراد جو قوم کے لیے عظیم مستقبل کے خواب دیکھتے رہے ہیں، دیکھ رہے ہیں جنھوں نے اس کی تعمیرِ نو کے لیے اپنی زندگیاں تج دی ہیں وہ کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے؟ ہماری عاجزانہ گزارش ہے کہ کھیلوں اور ایسے ہی دوسرے مشغلوں کی اس قدر ہمت افزائی نہ کی جائے۔ اس طرح جہالت کا دماغ اور بھی خراب ہو جائے گا۔ ہمارے نوجوان اور عوام خود ہی کافی بے حس اور بے شعور ہیں۔ انھیں اس سلسلے میں کسی تائید و ترغیب کی کوئی ضرورت نہیں۔

پاکستان کے مفکروں، ادیبوں، شاعروں، تہذیبی دانش وروں اور قومی رہنماؤں کے لیے سماج کا یہ روّیہ انتہائی ناقابلِ برداشت اور دل شکن ہے کہ سماج ان کے مقابلے میں تیسرے درجے کے لوگوں کو اتنی اہمیت دے دے جس کے نتیجے میں تمام نظامِ اقدار تباہ ہو کر رہ جائے۔ ہمیں اندازہ ہے کہ ہم نے اس نشست میں کھیلوں اور کھلاڑیوں کا بار بار ذکر کر کے اور ان کے مسئلے میں بہت زیادہ متوحش اور سنجیدہ ہو کر بُردباری کا ثبوت نہیں دیا صرف یہ کہہ دینا کافی تھا کہ کھلاڑیوں، مداریوں اور سماجی مسخروں کو سماج کی جانب سے بڑی کشادہ دلی کے ساتھ خوش رہنے اور خوش کرنے کا حق ملنا چاہیے اس سے زیادہ ان کی کوئی حیثیت نہیں لیکن طولِ کلام کا سبب دراصل یہ ہے کہ قوم کے عوام کہیں گم راہ کن معیاروں اور غلط مثالیوں کا شکار نہ ہو جائیں۔ غلط طرزِ عمل برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن غلط اندازِ نظر برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

جگر کی وفات

کوئی جنازہ کبھی تنہا نہیں اُٹھتا۔ اس کے ساتھ کئی جنازے اُٹھتے ہیں اور پھر جگر کا جنازہ۔ جگر اکیلے نہیں مر گئے ان کے ساتھ کئی نسلیں اور کئی فصلیں ختم ہو گئیں۔ غزل اور جگر یہ دونوں لفظ گویا ایک دوسرے کے ہم معنی تھے۔ یہ بھی ایک عجیب داستان ہے۔ غزل جگر کے پاس اپنے پورے ہوش و حواس میں پہنچی تھی لیکن انھوں نے پی پی کر اسے بھی مدہوش کیا اور خود بھی مدہوش ہوئے۔ یہ ان کی پہلی شرارت تھی دوسری شرارت یہ کہ خود تو ہوش میں آ گئے اور اسے بے ہوش رکھا۔ زندگی اگرچہ خود ایک افسانہ ہے لیکن یہ بہت مشکل ہے کہ کوئی شخص اپنی زندگی ہی میں ایک افسانہ بن جائے۔ جگر اپنی زندگی ہی میں ایک افسانہ بن گئے تھے۔ انھیں جیتے جی ایک روایت کی طرح چاہا گیا۔ عجیب ظالم و کافر شخصیت تھی۔ اب سُنا ہے کہ مر گئے اور اصرار یہ کہ اس خبر پر یقین بھی کرو۔ دُور اُفتادہ شہر سے آئی ہوئی اس خبر نے ہمارے دلوں کو بُری طرح مجروح کر دیا ہے۔

انشا، اکتوبر 1960

فلسفہ-شیطان کا شعار

جنوری میں کراچی یونی ورسٹی کے زیرِ اہتمام پاکستان فلسفہ کانگریس کے سالانہ اجتماعات منعقد ہوئے جن میں بعض بیرونی فلسفیوں نے بھی شرکت کی۔ پاکستان فلسفہ کانگریس ملک کے علمی اور ثقافتی اداروں میں سب سے اہم ادارہ ہے۔ اس لیے کہ پاکستان کی ذہنی تعمیر و تشکیل کی اصل ذمّے داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ فلسفیانہ افکار و نظریات کی اشاعت کے ذریعے قوم میں ایک فکری انقلاب برپا کرے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس نے اپنی اس ذمّے داری کو محسوس نہیں کیا۔ اس وقت پاکستان کا دانش ور طبقہ مختلف سوالات سے دوچار ہے۔ یہ سوالات خالص تاریخی اور علمی نوعیت کے حامل ہیں۔ ان متعدد سوالات میں سے ایک سوال یہ بھی ہے کہ گزشتہ چند صدیوں سے ہم جس فکری انحطاط اور ذہنی زوال سے دوچار ہیں' اس کے اسباب کیا ہیں......؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب پاکستان فلسفہ کانگریس ہی کو دینا چاہیے۔ اس سوال کے غالباً دو ہی جواب ہو سکتے ہیں یعنی یا تو اس کی ذمّے داری عقیدے پر ہے یا عقل پر۔ اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم نے اپنے اخلاقی' سیاسی' تہذیبی اور ذہنی زوال کی اس طویل مدت میں عقیدے کی بات مانی ہے یا عقل کی۔ ہمیں اس مسئلے میں پوری وضاحت سے کام لینا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ ہم نتائج تک پہنچتے ہوئے جھجکتے ہیں اور یہ بڑی ناانصافی ہے۔ فلسفہ کانگریس کے طریقِ کار سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں فیصلہ کرنے کی جرأت نہیں۔ مجموعی طور پر پاکستان کے اہلِ علم کا اندازہ کچھ یہی ہے ان میں ایسے افراد کی اکثریت ہے جو عقل کو عقیدے کے زیرِ اثر رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ رجحان قرونِ وسطیٰ کے کلیسائی فلسفے سے ماخوذ ہے۔ قرونِ وسطیٰ

کا کلیسائی فلسفہ اس بات پر مُصر تھا کہ ایمان عقل پر مقدّم ہے اور فلسفے کو عقیدے کا خادم بن کر رہنا چاہیے۔ اس دور کا سارا فلسفہ عقیدے اور عقل کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کا نام ہے۔ اس کوشش نے تاریخِ فکر کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تفصیل بڑی الم ناک ہے۔ یہی وہ منطق تھی جس کی عدالت میں انسانیت کے عظیم مفکروں اور فلسفیوں کو موت کی سزائیں سُنائی گئیں۔ سینٹ انسلم جو مدرسیت کا پُر جوش اور مہم جو معلم گزرا ہے کہتا ہے کہ "میں ایمان لاتا ہوں تاکہ میں سمجھوں" یہی اندازِ نظر ماضی میں ہمارے یہاں بھی اختیار کیا گیا۔ کاش ہمارے لیے اس کی تفصیل پیش کرنا مناسب ہوتا۔ ایسی صورت میں بہتر یہی ہے کہ اس کی شہادت صفحاتِ تاریخ سے طلب کی جائے۔ بہ ہر طور اس کا جو انجام ہوا وہ مشرق کے فکری انحطاط اور ذہنی بانجھ پن کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ آج بھی صورتِ حال کچھ زیادہ مختلف نہیں وہی باتیں آج بھی کی جارہی ہیں۔ البتہ انداز میں ذرا "جدیدیت" پیدا ہو گئی ہے۔ بڑے لطیف طریقے سے عقل و فکر کی مخالفت جاری ہے اور ان شخصیتوں کو زندہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جنھوں نے اپنے عہد میں تفکر و تعقل کی ہر طرح مزاحمت کی اور اکابرِ فکر کو ملزم و مجرم قرار دیا۔ یہ سب کچھ علم و تحقیق کے نام پر کیا جارہا ہے اور ان لوگوں کو پوچھنے والا کوئی نہیں جو تاریخِ فکر کے محسن ہیں جن کی عظیم و محترم شخصیتوں نے مشرق کو سربلند کیا۔ قرونِ وسطیٰ کی مدرسیت کے عقل دشمن اندازِ نظر کے خلاف بیکن نے اعلان کیا تھا کہ "مذہب کے آسمانی اسرار کو انسانی عقل کے مطابق بنانے کی کوشش فضول ہے" ہمارے یہاں بھی صدیوں سے یہ اندازِ نظر اپنی عجوبہ آفرینیوں میں مصروف ہے لیکن کون ہے جو بیکن کی اس بات کو دہرا سکے! دیکھا جائے تو یہ فرض فلسفہ کانگریس ہی پر عائد ہوتا ہے۔ اس کے نمایندوں کو محسوس کرنا چاہیے کہ وہ فلسفے کے عظیم الشان ادارے سے وابستہ ہیں وہ اس تحریک سے تعلق رکھتے ہیں جس نے سقراط، برونو اور شہاب الدین مقتول کو جنم دیا جو افلاطون، ارسطو، شیخ الطائفہ فارابی، شیخ الرئیس ابنِ سینا اور ابنِ رشد سے منسوب ہے۔ فلسفہ انسانی ذہن کی انتہائی جرأت کا نام ہے کیا پاکستان فلسفہ کانگریس کے اکابر اس سے اختلاف کریں گے......؟ تھی سی ڈیڈس کی تحریروں میں ہمیں یہ جملے ملتے ہیں "ہم حُسن کے

دل دادہ ہیں لیکن اپنے مزاج میں سادہ ہم اپنے ذہنوں کو ترقی دیتے ہیں لیکن ہماری جرأت میں کوئی کمی نہیں ہوتی''، لیکن ہمارے یہاں ذہنی ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ جرأتِ فکر قطعاً مفقود ہو جائے۔ اس وقت پاکستانی قوم اپنے اساسی عہد میں ہے۔ قوم کے دانش وروں کو اس وقت اپنے فرض میں کوتاہی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ وہ فرض کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ عقلیت پرستی کے رجحان کی ترویج اور جذبات زدگی کی مزاحمت کی جائے اور اس کے لیے جرأتِ فکر کی ضرورت ہے۔ فلسفہ قومی، نسلی اور عقیدانی اعتبارات سے بلند ہو کر حیات و کائنات کو سمجھنے اور سمجھانے کی بے لوث اور غیر جانب دارانہ کوشش و کاوش کا نام ہے۔ مناسب ہے کہ ہم یہاں فلسفے سے متعلق کچھ وضاحتیں پیش کریں۔ فیلوسوفیا (فلسفہ) کے لغوی معنی عشقِ حکمت یا دانش دوستی کے ہیں۔ ابتدا میں یہ لفظ اپنے وسیع ترین مفہوم کے لحاظ سے ذہنی ترقی اور ان تمام کوششوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جو کسی تازہ علم کو حاصل کرنے کے لیے کی جائیں۔ یہ لفظ ہمیں سب سے پہلے ہیروڈوٹس کی کتابوں میں ملتا ہے ''کری سس'' ایک جگہ سولن سے کہتا ہے کہ ''ہم نے تیری حکمت اور ان مسافرتوں کے بہت سے قصّے سُنے ہیں جو تُو نے ہی حکمت کی محبت اور دنیا کو دیکھنے کی خواہش میں اختیار کیں'' دیکھا جائے تو لفظ فلسفہ کے اصطلاحی تعین سے بہت پہلے ہی اس کا مفہوم متعین ہو چکا تھا چناں چہ اس سادہ اور غیر اصطلاحی عبارت میں وہ تمام مفاہیم موجود ہیں جن کی تفصیل و توضیح بعد میں ہوئی۔ اس کے ذریعے ہم فلسفے کے کردار کو بھی سمجھ سکتے ہیں اور اس کے اصطلاحی مفہوم کو بھی۔ سقراط اپنے آپ کو سوفسطائی یعنی حکیم کہلوانے کے بجائے ازراہِ انکسار فیلسوف یعنی حکمت دوست، کہلوانا پسند کرتا تھا۔ افلاطون اور ارسطو نے اس لفظ کو خالص اصطلاحی معنی میں استعمال کیا چناں چہ ارسطو نے سائنس سے تعبیر کیا ہے یہاں ہمیں رواقی مفکروں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے جنھوں نے اس کو ایک بالکل متعین اصطلاح کی حیثیت دینے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ سسرو کی رائے میں فلسفہ زندگی کی ترتیب و تنظیم کا فرض انجام دیتا ہے۔ وہ نیکی کا دوست اور بدی کا دشمن ہے۔ کرسچین ولف کے نزدیک وہ تمام اشیائے موجودہ کا امکانی علم ہے۔ کانٹ کہتے ہیں کہ فلسفہ عقلی علم ہے جو تصورات سے ماخوذ ہے۔ جے۔ جی فشٹے کی رائے ہے کہ فلسفہ

علم کا علم ہے اور ہیگل اسے ''مطلق'' کا علم قرار دیتے ہیں۔

فلسفے کی جو بھی تعریف ہو بہ ہر طور وہ انسانی فکر کا علم ہے۔ اس سے قطع نظر کہ فکر کرنے والا کس عقیدے سے تعلق رکھتا ہے۔ پس ہمیں چاہیے کہ اسے انسانی ذہن کی ایک غیر جانب دارانہ فعلیت سے تعبیر کریں۔ فلسفے کو اپنے جذبات اور اپنی خواہشوں کا تابع بنانا اسے فنا کر دینے کے برابر ہے۔ پاکستان کے فلسفیانہ حلقوں کو چاہیے کہ وہ اس کی اصل معنویت کو ذہن نشین کر کے اپنے ان عظیم الشان فرائض کو انجام دینے کی کوشش کریں جو قوم کے ذہنی نمایندوں کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتے ہیں۔ ہم کیا چاہتے ہیں......؟ ہم کچھ بھی چاہتے ہوں، لیکن علم وہ سب کچھ بھی چاہتا ہے یا چاہ سکتا ہے جو ہم نہیں چاہتے۔ اس نکتے کو ملحوظ رکھ کر ہی ہم مسائل و معاملات کے ساتھ عملی اور نظری طور پر انصاف کر سکتے ہیں اور اگر ہم اس کے لیے تیار نہیں تو پھر ہمیں فلسفے کے نام کو رُسوا کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ ہم نے جس اندازِ نظر کی اب تک مخالفت کی ہے اس کی ذمّے داری دراصل پاکستان فلسفہ کانگریس پر نہیں ہے بل کہ ان لوگوں اور ان اداروں پر ہے جو عقلیت پرستی کے خلاف تبلیغ میں مصروف ہیں اور عقل کو شیطان کا شعار قرار دیتے ہیں۔ البتہ فلسفہ کانگریس پر یہ ذمّے داری ضرور عائد ہوتی ہے کہ وہ اس گروہ کے خلاف ایک زبردست محاذ بنائے اس لیے کہ وہ عقل کے سب سے زیادہ اہم ادارے یعنی فلسفے کی نمایندگی کرتی ہے۔

انشا، فروری 1961

شرم ناک جرم

افریقہ کی تحریکِ آزادی کے ہیرو پیٹرس لوممبا کے حادثۂ قتل نے دنیا کے امن پسند اور انسانیت دوست عوام کے دلوں کو بُری طرح مجروح کر دیا ہے، یہ المیہ نہ صرف کٹنگا، نہ صرف کانگو، نہ صرف افریقہ بل کہ تمام دنیائے انسانیت کا المیہ ہے۔ جو لوگ اسے کانگو کا داخلی مسئلہ قرار دے کر عالمی احتجاج کے نعروں کو دبا دینے کی سازش کر رہے ہیں، وہ قاتلوں کے ہوا خواہ اور وکیل ہی نہیں، بل کہ اس شرم ناک جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ ان کی بدنیتی اب پوری طرح واضح ہو چکی ہے اور انسانیت نے اپنے قاتلوں کو پہچان لیا ہے، ان لوگوں کو شرم آنا چاہیے جو امن، تہذیب اور انسانیت دوستی کے نقیب ہو کر انسانیت کی تخریب میں کوشاں ہیں۔ تاریخ ان وحشیوں، ان مجرموں اور ان خوں خوار بھیڑیوں کو کسی طرح بھی معاف نہیں کر سکتی، شومبے، موبوتو اور کاساووبو انسانیت کے بدمعاش قاتلوں اور سفاک مجرموں کے جس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ دنیا کے سامنے پوری طرح بے نقاب ہو چکا ہے، جن سامراجی بھیڑیوں نے لوممبا کا خون پیا ہے، تاریخ کا عتاب ان کی ہڈیوں کو پیس ڈالے گا، تحریک کے رہنماؤں کو قتل کیا جا سکتا ہے لیکن تحریک کو قتل نہیں کیا جا سکتا، پیٹرس لوممبا کے قاتلوں نے شرم ناک جرم ہی نہیں کیا، مضحکہ خیز غلطی بھی کی ہے، وہ تحریک جو پہلے افریقی قوم پرستی کا آتش کدہ تھی، اب مغربی سامراجیوں کے حق میں بین الاقوامی عتاب کا ایک جہنم بن چکی ہے، جسے اب کوئی نہیں بُجھا سکتا۔

افراد کی نیتیں واضح ہو گئی ہیں اور خیالات عریاں ہو کر پوری طرح سامنے آ چکے ہیں، اب دنیا کے لیے فیصلہ کرنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہی، یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوتا ہے کہ اس موقع پر اقوامِ متحدہ نے مجرمانہ غفلت سے کام لے کر اپنے اعتماد کو بُری طرح زائل کر دیا ہے۔ یہ بات بڑی دردناک ہے کہ اس کے سیکرٹری جنرل مسٹر ہیمر شولڈ سامراجیوں کے

ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ گئے ہیں۔ افریقہ کے زعیمِ آزادی پیٹرس لوممبا کا قتل کوئی ناگہانی حادثہ نہیں تھا جو اقوامِ متحدہ اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے سکے، واقعات کا ہر موڑ دنیا کے سامنے تھا، حالات قدم قدم پر فریاد کر رہے تھے، دنیا کے سامنے لغو اور بے ہودہ بیانات دینے والے گونگے اور بہرے نہیں ہو گئے تھے، پھر بھی سب کچھ ہوتا رہا اور سب کچھ ہو گیا، اس جرم میں دنیا کی تمام سامراجی طاقتیں ماخوذ ہیں، بہت سے افراد ہیں جن کی آستینوں اور دامنوں کی طرف دنیا کی نگاہیں بار بار اُٹھ رہی ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ مجرموں میں سب سے بڑا مجرم اور قاتلوں میں سب سے بڑا قاتل کون ہے!

کیا یہ واقعہ دنیائے انسانیت کو غیظ و غضب سے بے قابو نہ کر دے کہ شومبے کی غدّار اور غلام حکومت نے انتہائی بے غیرتی اور بے حیائی کے ساتھ لوممبا کے قاتلوں کو انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ جن لوگوں نے اس شرم ناک اعلان کو پورے اطمینان و سکون کے ساتھ سُنا ہے، کیا وہ دنیا کو منہ دکھانے کے قابل رہ گئے ہیں؟

وہ افراد امن و انسانیت کے محسن ہیں، جنھوں نے پورے خلوص کے ساتھ اس حادثے کے خلاف اظہارِ نفرت کیا ہے، ہم صدر ایوب اور پاکستان کے وزیرِ خارجہ مسٹر منظور قادر کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں، جنھوں نے اس موقع پر اپنے انسانیت دوستانہ جذبات کا اظہار کر کے سامراج دشمنی اور انسانیت دوستی کے موقف کو تقویت پہنچائی۔

آزادی، جمہوریت اور انسانیت کی اقدار پر یقین رکھنے والی تمام حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ اقوامِ متحدہ کو شومبے موبوتو اور کاساووبو کے خلاف مقدمہ چلانے پر آمادہ کریں اور ان کے سامراجی آقا بلجیم کو شدید تنبیہ اور عتاب کا ہدف قرار دیں۔ جن لوگوں نے واقعات کو اس خونیں نقطے پر پہنچا کر عالمی امن کو خطرے میں ڈالا ہے اور بین الاقوامی قانون اور انسانی آداب کی توہین کی ہے، وہ سخت ترین سزا کے مستوجب ہیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ دنیا کا کوئی بھی ذمّے دار ادارہ بلاواسطہ یا بالواسطہ اس جرم کی حمایت کر سکتا ہے مگر اس کے باوجود بعض ملکوں نے حیرت انگیز طور پر اپنی مجرمانہ ذہنیت کا اظہار کیا ہے، ان حالات میں اقوامِ متحدہ کی حیثیت بھی مشکوک ہو گئی ہے اور حالات اس منزل پر آ گئے ہیں کہ اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل ہیمر شولڈ سے مستعفی ہو جانے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اور یہ مطالبہ ان واقعات

کے بعد بالکل قابلِ فہم ہے بہ ہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ اس خونیں حادثے نے ان کی ذمّے دار حیثیت کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس نوع کے حادثات کی موجودگی میں اگر اقوامِ متحدہ نے اپنی ضرورت اور افادیت کو از سرِ نو ثابت نہ کیا تو پھر اس کے وجود کو تسلیم کرنے کے لیے کوئی بھی تیار نہ ہوگا۔ صدر کینیڈی نے اس واقعے کے بعد جس ردِّ عمل کا اظہار کیا ہے اس سے عالمی حلقوں میں بڑی مایوسی پھیل گئی ہے۔ دنیا کے سامراج دشمن اور امن پسند عوام نے ان سے جو توقعات وابستہ کی تھیں، اس ردِ عمل کی روشنی میں وہ پوری ہوتی نظر نہیں آتیں، خیال یہ تھا کہ وہ اس معاملے میں کافی ذمّے دارانہ اندازِ نظر کا ثبوت دیں گے، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کے بیان میں اس حادثے کی طرف سے غیر مخلصانہ سرد مہری پائی جاتی ہے، حالاں کہ ان سے کچھ اور ہی توقع تھی، ان کے انتخاب کے بعد عالمی سیاست میں جو ایک صحت منداور خوش آیند علامات پیدا ہوگئی تھیں، یہ بیان اُن سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی شخصیت کے بارے میں ان نیک خیالات کو اتنی آسانی سے زائل نہ ہونے دیں گے جو اس بیان سے قبل عالمی حلقوں میں پائے جاتے رہے ہیں۔ انھوں نے لومبا کے قتل کو کانگو کا داخلی معاملہ قرار دیا ہے، دنیا نے یہ سُنا اور بصیرت حاصل کی، اگر لومبا کا قتل واقعی ایک داخلی معاملہ ہے تو مختلف ملکوں میں اس حادثے کے خلاف جو شدید احتجاج ہو رہا ہے وہ بھی ان ملکوں کا قطعاً داخلی معاملہ ہے، آخر موصوف کہنا کیا چاہتے ہیں؟

تمام آزادی پسند حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ کانگو کے قوم پرست عوام اور رہنماؤں کے موقف کی پُر زور تائید کریں۔ کانگو کے قضیے کو طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بلجیم کے تمام باشندوں کو کانگو سے نکال دیا جائے اور سامراجی طاقت وروں کو کچل کے شہیدِ آزادی پیٹرس لومبا کی تحریک اور مطالبات کو سامراجیوں سے کوئی بھی سمجھوتا کیے بغیر کامیاب بنایا جائے اور شومبے، موبوتو اور کاساووبو سے لومبا کے خون کا بدلہ لیا جائے کہ ان قاتلوں کا اس گستاخانہ انداز سے زندہ رہنا مہذب دنیا کے لیے باعثِ شرم ہے۔

انشا، مارچ 1961

تاریخ کا عظیم کارنامہ

ایک طرف تو ہمارے اخبارات میں صفحۂ اوّل پر جلی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی کہ روس نے انسان کو خلا میں بھیج کر زمین پر زندہ اُتار لیا اور دوسری طرف انھی اخبارات کے مراسلاتی کالموں میں رویتِ ہلال کے ''مہتم بالشان'' موضوع پر محکمۂ موسمیات اور سائنس کا مذاق اُڑایا گیا اور اب بھی اخبارات میں یہ دونوں سلسلے ایک ساتھ جاری ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان دو باتوں میں سے کون سی بات انسانی جرأت کا زیادہ اظہار کرتی ہے اور زیادہ حیرت انگیز ہے پھر بھی ہمیں اُمید ہے کہ پاکستان کو چھوڑ کر باقی تمام انسانی تاریخ کے اس سب سے زیادہ عظیم الشان کارنامے کی رُوداد کو پڑھنے والوں نے غور سے پڑھا ہوگا۔ یہ کارنامہ جس نے علم اور انسانیت کی عظمت کو واقعی آسمانوں تک پہنچا دیا ہے۔

''بائبل'' نے آدم کو آسمانوں سے زمین پر پھینک دیا تھا جہاں اس نے کہا تھا۔

> ''اور خداوند خدا نے کہا' دیکھو انسان خیر وشر کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی طرح ہو گیا اور اب وہ شاید اپنا ہاتھ بڑھائے اور شجرِ حیات سے بھی کچھ لے کر کھائے اور ابد تک زندہ رہے۔ پس خداوند نے اسے باغِ عدن سے نکال دیا''

مگر اشتراکیت کی بائبل ''داس کیپٹل'' نے اسے پھر آسمانوں میں پہنچا دیا۔ اس حقیقت سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ گگارین نامی فاتحِ خلا کا وجود انسانوں کے درمیان انسانیت کے سب سے زیادہ عظیم الشان معجزے کی حیثیت رکھتا ہے۔ روسی سائنس دانوں کی یہ کام یابی دراصل انسانی فکر' انسانی شعور اور انسانیت کی کام یابی ہے اور

اسے فقط اسی حیثیت سے پیش کرنا چاہیے۔ ہم اس یادگار موقع پر انسانیت کے ان شہدائے علم وفکر کو کسی طرح نہیں بھول سکتے جنھیں علم وشعور کی سزا میں زہر پلایا گیا' سولیوں پر لٹکایا گیا' فصیلوں سے نیچے گرایا گیا اور آگ میں زندہ جھونک دیا گیا۔ جس وقت روس کا خلائی انسان ۱۸۸ میل کے فاصلے پر کرۂ ارض کے گرد اجنبی اور مہیب خلاؤں میں گھوم رہا تھا اس وقت قرنوں اور صدیوں میں بہتی ہوئی ایک آواز بھی سنی جا رہی تھی۔ یہ انسانیت کے قابلِ احترام علم اور علم کے باعظمت شہید سقراط کی آواز تھی "علم حُسن ہے' علم نیکی ہے" پھر ایک اور آواز' نشاۃ ثانیہ کا جرأت مند مفکر بیکن کہہ رہا تھا "علم سب سے بڑی طاقت ہے" پھر اس سے قبل اور بعد کی کتنی ہی حکمت آفریں آوازیں تھیں جو تاریخ کی فضاؤں میں گونج رہی تھیں اور کتنی ہی صدائیں تھیں جنھیں مجروح سینوں میں قید کر دیا گیا تھا۔ انھیں میں سے ایک اور آواز اُبھری اور یہ کلیسا کے معتوب ہیئت داں گلیلیو کی آواز تھی جو اپنے اس خیال کا زیرِ لب اظہار کرنے سے کسی طرح باز نہ آ سکا "مگر زمین حرکت تو کرتی ہے" تاریخِ انسانی کے نڈر مفکروں اور حکیموں نے ان علمی اور سائنسی فتح مندیوں کی ماضی میں جو قیمت ادا کی ہے اس کی وضاحت ضروری ہے تاکہ جاہل' پس ماندہ اور قدامت خوردہ سماجوں میں علم' آگہی اور انسانی عظمت کا رَجز پڑھنے والے اپنے فرائض کو نہ بھولیں۔ جاننا چاہیے کہ عقل و دانش کا وہ جہاز جو آج خلاؤں میں انسانی جلال و جبروت کا پرچم لہراتا ہوا اُن کی زندہ و تابندہ امانت کو زمین پر واپس لے آیا ہے اسے کسی زمانے میں بحرِ خوں' دریائے آتش اور سیلِ زہر سے بھی گزرنا پڑا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ حیاتِ انسانی کا یہ سب سے بڑا کارنامہ تاریخ کے کس گروہ کی فتح اور کس گروہ کی شکست ہے۔ دنیا کے سیاسی حلقے اس واقعے کے ساتھ کس طرح پیش آئے ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ تسخیرِ خلا کی یہ حیران کن مسرت' ایوان ہائے سیاست سے نہیں درحقیقت فکر کی خانقاہوں' عقل کے دبستانوں اور علم کی دانش گاہوں سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ دن تجربہ واستدلال کے مقابلے میں توہمات وخرافات کی فیصلہ کن شکست کا دن ہے "غیر مدلّل یقین" کو عشق و وجدان کا خوب صورت نام دینے والے سُن لیں کہ یہ صرف عقل ہے جس نے سنسان' اجنبی اور

مہیب خلاؤں میں پوری متانت اور تمکنت کے ساتھ چھلانگ لگا دی ہے۔

اب یہ دنیا جذبات پرستی اور عقل دشمنی کے لیے قطعاً ناساز گار ہو چکی ہے اور اب یہ صرف علم کی دنیا ہے اور اس طرح وہ دنیا اپنی تمام روایات' اقدار' معتقدات اور حوالوں کے ساتھ مر چکی ہے جس میں لاعلمی کو علم و عرفان کا نام دیا جاتا تھا۔ اب ہمیں آخری بار طے کر لینا چاہیے کہ ماضی کے ان تمام رجحانات کے ساتھ ہمارا کیا برتاؤ ہوگا جنھوں نے انسان کو علمی و عقلی مسرتوں کے حصول سے ہمیشہ محروم کرنے کی کوشش کی اور انسانی سعادتوں کا راستہ تلاش کرنے والے قافلوں پر شبِ خون مارا۔ اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم اپنی ذہنیت کا منصفانہ طور پر جائزہ لیں اور اپنے ساتھ خلوص سے پیش آئیں' ہم یعنی وہ تمام انسان جنھوں نے تاریخ کی قبیح عادتیں ابھی تک ترک نہیں کیں' ان میں پس ماندہ ممالک ہی نہیں ترقی یافتہ ممالک کے انسان بھی شامل ہیں بل کہ اس عہد کے انسانوں کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ وہ اپنی لاشعوری زندگی میں ابھی تک ماضی سے باہر نہیں نکلے اور ان میں جو پس ماندہ ہیں وہ شعوری طور پر بھی ماضی ہی میں زندگی بسر کرتے ہیں چناں چہ ان لوگوں کے لیے یہ دور سخت آزمایش کا دور ہے اور اسی دور کے لیے انھیں اپنے آپ کو تیار کرنا ہے ورنہ وہ اس خلانورد انسانیت کے عہد میں خود اپنے لیے ناقابلِ قبول ہو کر رہ جائیں گے۔ سائنس کی ان چونکا دینے والی کامیابیوں سے اُنس پیدا کرنا ہی ہماری تاریخی اُلجھنوں کا سب سے بڑا علاج ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ روسی رہ نما مسٹر خروشیف نے تسخیرِ خلا کے اس کارنامے کو امن و انسانیت کی فتح قرار دیا ہے اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ روس کی اس حیرت انگیز کام یابی اور سائنسی برتری کے باعث امریکا کے سیاسی حلقوں میں جو خوف و ہراس پھیل گیا ہے وہ اس بیان کی روشنی میں بے بنیاد ثابت ہوگا۔

انشا' مئی 1961

علامہ اقبال اور اقبال اکیڈمی

گزشتہ دنوں کراچی میں یومِ اقبال کے موقع پر متعدد مشاعرے اور ادبی اجتماعات منعقد ہوئے اور یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا۔ یومِ اقبال کے ان اجتماعات میں وہ اجتماع خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو اقبال اکیڈمی کی جانب سے ہوٹل میٹروپول میں انعقاد پذیر ہوا۔ اقبال اکیڈمی کو پاکستان کے علمی اداروں میں ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں اس نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اقبالیات کی شرح و تفسیر کے ضمن میں اس نے اپنے قارئین کو بہت سے ان دقیق علمی مسائل اور فلسفیانہ مباحث سے بڑی حد تک روشناس کرادیا ہے جن کے اصل ماخذوں کا مطالعہ کرنا آج کل کے سہولت پسند قاری کے لیے ایک عذاب ناک مشقت سے کسی طرح کم نہیں اور یہ بلاشبہ ایک خدمت ہے۔

لیکن علامہ اقبال کی تخلیقات کو اقبال اکیڈمی جس انداز سے اپنا موضوع قرار دیتی ہے اس انداز سے ہمیں اختلاف ہے۔ ہمارے خیال میں علامہ اقبال کی حقیقی عظمت ان کے فن کی ادبی اور جمالیاتی اقدار میں پوشیدہ ہے۔ مختصر یہ کہ ان کی عظمت کا اصل مظہر ان کی شاعری ہے لیکن اکیڈمی انھیں ایک عظیم شاعر کے بجائے ایک ''مجدِّد'' کی حیثیت سے پیش کرتی ہے حالاں کہ وہ ایک ہی زبان نہیں بل کہ بیک وقت دو زبانوں کے عظیم ترین شاعر تھے چناں چہ علامہ اقبال کے نظریات کی تشریح میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا تعلق علامہ اقبال کی شاعری سے صرف اسی قدر ہے کہ ان میں جا بجا علامہ اقبال کا نام آجاتا ہے لیکن اگر ان کے نام کی جگہ شاہ ولی اللہ یا مجدد الف ثانی کا نام لکھ دیا جائے تو صورتِ حال

میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ ہمارے خیال میں یہ ان کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہے۔ ایک دوسرے درجے کے شاعر کے ساتھ اگر یہ طریقہ روا رکھا جائے تو شاید اس کا کوئی جواز نکل آئے لیکن اقبال جو اوّل و آخر ایک شاعر تھے اور ایک قد رِ اوّل کے شاعر۔ اُن کے ساتھ یہ غیر شاعرانہ برتاؤ کسی طرح بھی مناسب نہیں اور اس کا کوئی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔

صورت یہ ہے کہ ان کی مخصوص تعلیمات اور فلسفۂ حیات سے ہر شخص متفق نہیں ہو سکتا لیکن ان کی شاعریٔ ان کے فن کی جمالیاتی اقدار اور ان اقدار کے پیچھے زندگی کی جو اُمنگیں بال کشا ہیں ان کے عظیم حسن و جمال سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا لیکن اس پہلو کی طرف توجہ کرنے کے بجائے ان کے کلام کی اخلاقی' فقہی' سیاسی اور روحانی توجیہات پر سارا زور صرف کر دیا جاتا ہے۔ وہ توجیہات جو ایک غیر متعلق قاری کے لیے کوئی جاذبیت نہیں رکھتیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اقبال ایک ہی حلقے میں محدود ہو کر رہ جاتے ہیں جب کہ ان کے فن کی اپیل عالم گیر ہے۔ اگر دنیا کے عظیم شاعروں کی ایک فہرست مرتب کی جائے اور ہم سے پوچھا جائے کہ تم اس فہرست میں اُردو کی طرف سے کن شاعروں کے نام شامل کرو گے تو ہم بلا تامل جن شاعروں کا نام لیں گے ان میں اقبال و غالب سرِ فہرست آتے ہیں۔ اب اس کے بعد جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلامی فقہ کی تشکیلِ جدید اور احیائے ملّت کی تحریک کے ضمن میں تو اقبال کے تمام اجتہادات گنائے جا رہے ہیں مگر ان کی شاعری کا کوئی ذکر نہیں تو ہمیں تعجب بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی' ہم یہ نہیں کہتے کہ ان کی تعلیمات پر اظہارِ خیال نہ کیا جائے کہ یہ بہ ہر حال خود علامہ اقبال اور ان کے نظریات سے اتفاق رکھنے والے مبصرین اور مصنفین کا ایک ایسا حق ہے جسے کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔ ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ ادب کے ان بے شمار قارئین کے حق کی بھی کچھ رعایت ملحوظ رکھی جائے جو اقبال کی شاعری سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں یا لطف اندوز ہو سکتے ہیں مگر ان کے مخصوص نظریات کے ساتھ کوئی مفاہمت نہیں کر سکتے۔

اب تک اقبال اکیڈمی کی سب سے بڑی خواہش اور کوشش یہ رہی ہے کہ دنیا اور خاص طور پر اسلامی دنیا اقبال کی تعلیمات سے پوری طرح واقف ہو جائے۔ اس کوشش نے

اقبال کی فنی قدروں ہی کو نقصان نہیں پہنچایا' انھیں ملک کے ادبی سماج سے بھی کافی دُور کر دیا ہے۔ ہمیں ایک بات کو نہیں بھولنا چاہیے وہ یہ کہ تمام تفصیلات کو چھوڑ کر اگر ان کی تعلیمات اور پیام کے بارے میں مجملاً کچھ کہا جائے تو وہ یہ ہے کہ ان کی اساس اسلامی قومیت کے خالص روحانی تصور پر قائم ہوئی ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلامی ممالک میں اسلامی قومیت کا یہ تصور ''عرب قومیت'' کے مقابلے میں کتنی مقبولیت حاصل کر سکتا ہے؟ وہ اسلامی ممالک' تاریخِ اسلامی کے وہ سابقین اوّلین جن کی ''نامسلمانی'' کا پاکستان جیسے ''نومسلم'' ممالک تک کو گلہ ہے صورتِ حال بالکل واضح ہے عرب صرف عرب قومیت' افغانی صرف افغانی قومیت اور ایرانی صرف ایرانی قومیت کا مفہوم سمجھتے ہیں اس کے علاوہ قومیت کا کوئی تصور ان کے لیے قطعاً ناقابلِ فہم ہے۔ اب رہی غیر مسلم دنیا تو ظاہر ہے کہ غیر مسلم دنیا کو اسلامی قومیت اور اس کے پس منظری اور پیش منظری افکار و نظریات سے کیا تعلق' لیکن یہ تمام حلقے کلامِ اقبال کی مشترک انسانی اور فنی قدروں کی پوری طرح قدر دانی کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ہم اس گفت گو کے دوران مختلف تضادات سے دوچار ہوئے ہوں ممکن ہے کہ ہماری یہ تحریر متعدد تناقضات کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہو لیکن ہم نے کہنا یہی چاہا ہے کہ ادب کے قارئین کا اسی طرح اقبال پر بھی کچھ حق ہے جس طرح حافظ' خیام' دانتے' ابوالعلا معری' ملٹن اور غالب پر' چاہے ان اکابرِ فن کے عقائد و افکار سے ان قارئین کو کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔

اس کے بعد اب ہم یومِ اقبال کے اس اجتماع کا ذکر بھی ضروری سمجھتے ہیں جو اکیڈمی کی جانب سے ہوٹل میٹروپول میں منعقد ہوا تھا۔ اکیڈمی سے ہماری یہ گفت گو خالص قومی نوعیت کی حامل ہے۔ ہمارے خیال میں وہاں جس ذہنیت کا مظاہرہ کیا گیا وہ اس عظیم شخصیت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی جس کا ہر شعر غلامانہ ذہنیت کے خرمن میں ایک شعلے کی حیثیت رکھتا تھا۔ سب سے پہلے تو ہوٹل میٹروپول کا انتخاب ہی قابلِ اعتراض ہے کیا اس طرح ان عوام کے جذبات کی توہین نہیں کی گئی جو اقبال سے محبت کرتے ہیں لیکن ہوٹل میٹروپول کے آئینہ خانے کو اپنے کہنہ اور گرد آلود لباس کے عکس سے میلا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے اور اس جرأت کا حق بھی نہیں رکھتے اور کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ

اقبال چند سرکاری افسروں اور صوفہ نشینوں کے شاعر تھے اور عوام سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ صوفہ نشین حضرات، یہ شہر کے معززین جن میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اپنی جہالت اور احساسِ کمتری کو چھپانے کے لیے اس قسم کے جلسوں کی سرپرستی اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں اور جو مشاعروں میں احتیاطاً سب سے آگے جا کر بیٹھتے ہیں تا کہ فوٹوگرافروں کو شکایت نہ ہو جو محفلِ سماع میں فارسی قوالی کی فرمایش کر کے ہر شعر کی داد دینا ضروری خیال کرتے ہیں تا کہ داد و تحسین کے اندھیرے کا کوئی نہ کوئی تیر تو نشانے پر لگ ہی جائے۔ اس جلسے میں شروع سے آخر تک صرف انگریزی دانی کا مظاہرہ کیا گیا۔ خطبۂ صدارت انگریزی میں پڑھا گیا، تقریریں انگریزی میں کی گئیں، کارروائی انگریزی میں ہوئی اور اس طرح بڑی خوش اسلوبی سے یہ ثابت کر دیا گیا کہ ہم انگریزی میں طاق اور شہرۂ آفاق ہیں۔ قوم نے بھی یہ مژدۂ جاں فزا سنا اور اطمینان کا سانس لیا کہ ''ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں''۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ اس اجتماع کے واحد مقرر تھے جنھوں نے اپنی زبان میں تقریر کی اور مولانا ماہرالقادری نے ایک نظم پڑھی۔ ملک کے ممتاز عالم اور اُردو کے فاضل اہلِ قلم ڈاکٹر سیّد عبداللہ ہماری تعریف و تحسین کے محتاج نہیں۔ وہ ان بزرگوں میں شامل ہیں جن سے ہماری نسل نے بولنا اور لکھنا سیکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس غیر سنجیدہ ماحول اور طفلانہ ذہنیت کے خلاف سخت احتجاج کر کے اپنا فرض ادا کیا لیکن اس کے جواب میں ایک ممتاز رکن نے یہ فرمایا کہ ''علامہ اقبال کا پیام صرف پاکستان یا اُردو والوں کے لیے نہیں تھا بل کہ عالم گیر تھا پھر یہ کہ یہاں غیر ملکی حضرات بھی تشریف رکھتے ہیں اس لیے جلسے کی کارروائی انگریزی ہی میں ہونا چاہیے تھی''، اظہار کی یہ جرأت یقیناً قابلِ داد ہے اور ہم سب کو اس سے سبق لینا چاہیے، ہم جو اپنی جرأتِ اظہار کو بُری طرح گنوا بیٹھے ہیں۔ بہ ہر حال، ہم نے جب اس رُوداد کو سُنا تو کچھ زیادہ حیران نہیں ہوئے لیکن اس وقت ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے علاوہ ہمارے سلسلے کے کئی اور مشائخ اور قبیلے کے کئی اور شیوخ بھی وہاں مَوجود تھے جن کا کسی اجتماع میں موجود ہونا ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ اجتماع قومی آداب، قومی تہذیب اور قومی اندازِ نظر کا مظہر ہوگا اور یہ

کہ یہ حضرات صرف وہاں موجود ہی نہیں تھے بل کہ یومِ اقبال کی قومی تقریب میں انگریزی زبان دانی کا یہ مقابلہ انھی کی نگرانی میں اختتام پذیر ہوا۔ ان محترم بزرگوں میں جناب ممتاز حسن، ڈاکٹر محمود حسین اور اے ڈی اظہر صاحب کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں بل کہ ڈاکٹر محمود حسین نے تو اس اجتماع میں صدارت کے فرائض انجام دیے۔ یہ حضرات ہمارے معاشرے کے ان ذمّے دار اور حسّاس بزرگوں میں شامل ہیں جنھوں نے اپنے نوجوانوں کو قومی شعور اور قومی زبان کے حق میں کتنی ہی دلیلیں سکھائی ہیں، کتنے ہی نکات تعلیم کیے ہیں اور اس طرح اپنے فرائضِ منصبی کو انجام دیا ہے۔ ہمارا یہ منصب نہیں کہ ہم ان کے ان بزرگانہ فرائض کو انجام دیں۔ ہمارے لیے خاموش رہنا مناسب ہے۔

ہزار گونہ شکایت بضمنِ خاموشیست

انشا، جون 1961

سب سے پہلے

جو سماج افلاس اور جہالت کے دردناک عذاب میں مبتلا ہو وہ زندگی کا کوئی صحت مند خواب نہیں دیکھ سکتا اور نہ شاید اس کا حق ہی رکھتا ہے۔ ہم بار بار تعمیر و ترقی کا ذکر کرتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ تعمیر و ترقی کی باتیں اسی قوم کو زیب دیتی ہیں جو معاشی استحکام اور تعلیمی ترقی کے ایک خاص نقطے تک پہنچ چکی ہو اس سے پہلے تعمیر و ترقی کے امکانات پر غور کرنا دماغی عیاشی اور ذہنی بدکاری کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ہم قومی حیثیت سے افلاس اور جہالت کے جس نقطے پر کھڑے ہیں وہاں سے تعمیر و ترقی کی منزل اتنی دُور ہے' اتنی دُور ہے کہ اس کے بارے میں سوچنا بھی اپنے آپ کو ہمت شکنی اور زبوں ہمتی کے آزار میں مبتلا کرنا ہے۔

ہم اپنی اس پس ماندگی و درماندگی کے سلسلے میں قابلِ ملامت بھی ہیں اور قابلِ رحم بھی اور ایک حد تک قابلِ معافی بھی کیوں کہ ہماری موجودہ زندگی کے پس منظر میں صرف غلامی ہی کی ایک صدی نہیں سماجی' اخلاقی' معاشی اور تعلیمی انحطاط کی بھی کئی صدیاں شامل ہیں اور ہمیں ماضی کے اس زبردست نقصان کی تلافی کے لیے جو مہلت ملی ہے وہ یقیناً بہت مختصر ہے اور اسی مختصر مہلت میں ہمیں صدیوں اور نسلوں کے قرضے چکانا ہیں لیکن اس معقول عذر کے باوجود ہم اپنی غیر ذمّے داریوں کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتے۔ یہ عذر صرف اسی صورت میں قابلِ سماعت تھا جب ہم نے اپنے فرائض کو پوری طرح ادا کیا ہوتا۔ اصلاحِ حال کے لیے ہر وہ کوشش کی ہوتی جو ممکن تھی لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ یہی نہیں بل کہ قوم کے بعض طبقوں نے تو اس نازک دور میں وہ طرزِ عمل اختیار کیا اور اختیار کیے ہوئے ہیں جس کو سہہ لینا ایک نوآزاد' پس ماندہ اور پریشاں حال قوم کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

اس موقع پر کس کس سے مواخذہ کیا جائے۔ کس کس کا نام لیا جائے کہ یہ سیاہ نامہ

بہت طویل الذیل ہے مگر ایک خاص طبقے کا ذکر کیے بغیر چارہ بھی نہیں۔ ہمارا اشارہ قوم کے دولت مند طبقے کی طرف ہے۔ ہمارے اس رعایت یافتہ اور برگزیدہ طبقے نے آزادی کے بعد جس مجنونانہ اور مجرمانہ ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ ان حضرات نے لکھ پتی سے کروڑ پتی بننے کی جو شان دار مہم چند سال میں سر کر لی ہے اسے دوسرے شاید صدیوں میں بھی سر نہیں کر سکتے۔ پاکستان میں اگر کسی طبقے نے اپنی غیر معمولی اور قابلِ رشک صلاحیتوں سے دنیا کو مبہوت کر ڈالا ہے تو وہ یہی طبقہ ہے اس کی موجودگی میں جو لوگ علمی، ادبی، تہذیبی اور سماجی میدانوں میں پاکستانی قوم کی صلاحیتوں کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں، ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ غلطی پر ہیں اور انھیں اس ہونہار قوم کا کوئی عرفان حاصل نہیں، اگر اس قوم کی استعداد اور کارکردگی کا اندازہ لگانا ہے تو اس کے لیے دولت کشی اور منفعت اندوزی کے شعبے کا انتخاب کرنا چاہیے کہ یہی تو ایک شعبہ ہے جس میں ہماری قوم نے حیران کن فتوحات انجام دی ہیں اور محیّر العقول معجزے دکھائے ہیں۔ سماج کا یہی وہ ادارہ ہے جس کے حوصلہ مند نمایندوں نے ایک ایک رات میں بنجر زمینوں سے محل اُگائے ہیں اور ایک ایک دن میں دولت و ثروت کی فصلیں کاٹی ہیں۔ یہ بات انھی لوگوں نے ثابت کی کہ آزادی ایک نعمت ہے اور غلامی ایک لعنت۔ اگر یہ ارجمندانِ دولت نہ ہوتے تو پاکستان میں کوئی بھی آزادی کی نعمتوں اور برکتوں کا قائل نہ ہوتا۔ ہمیں اس موقع پر عبارت آرائی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس ضمن میں پوری متانت اور سنجیدگی سے کام لیں، اس گروہ نے سماج کی صحت مند قدروں کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ یہ لوگ ''زرگری'' اور زرپرستی کے علاوہ کوئی قدر نہیں مانتے، ان کا صرف ایک نصب العین ہے یعنی دولت کھینچنا قوم جہنم میں جائے انھیں تو اپنے کام سے کام ہے۔ زندگی میں ان کا سب سے بڑا ہتھیار دولت ہے اور سب سے مضبوط سپر جہالت، ان کے نزدیک تعمیر و ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ کوٹھیوں کے نئے نئے ڈیزائنوں اور کاروں کے نئے نئے ماڈلوں کے ذریعے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی جائے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ پاکستان کی فاقہ کش، فلاکت زدہ اور درماندہ قوم ان مجنونانہ

حرکات اور مجرمانہ رجحانات کی آخر کہاں تک متحمل ہو سکتی ہے۔ واقعی ہمیں اپنی قوتِ برداشت کا اندازہ لگانا چاہیے۔ جس ملک کی ۷۳ فیصدی یا غالباً اس سے بھی کچھ زیادہ آبادی کے پاس رہنے کو گھر، پہننے کو کپڑا اور کھانے کو روٹی نہ ہو کیا اس ملک کے چند افراد کو ان عیاشیوں کا حق دیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلے میں نہ کسی بحث کی گنجایش ہے اور نہ کسی سیاسی نظریے یا سماجی فلسفے کا حوالہ دینے کی ضرورت، یہ تو ایک بالکل صاف اور سادہ سی بات ہے۔ اس ملک کو آزاد کرانے میں قوم کے ہر طبقے نے حصّہ لیا تھا۔ پاکستان پوری قوم کی قربانیوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اسے بھی چھوڑیے، اس بات کا جواب دیجیے کہ وہ کون سی منطق اور کون سا نظامِ اخلاق ہے جس کے پیشِ نظر چند بے ضمیر، موقع پرست اور قابو یافتہ افراد نے پوری قوم کو لوٹنے اور کھسوٹنے کا حق پا لیا ہے اور سماج میں ان تباہ کن اور ہلاکت آفریں رجحانات کو فروغ دینے کی اجازت حاصل کر لی ہے جن کی موجودگی میں ایک شریف، صحت مند اور باضمیر سماج کے قیام کا تصور دیوانے کے خواب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

یہ دور پاکستان کی زندگی کا بڑا نازک دور ہے۔ اگر اس دور میں سماج کی منفی قدروں کو استحکام حاصل ہو گیا تو یہ ملک نفسیاتی، اخلاقی، تہذیبی اور سیاسی اعتبار سے دیوالیا ہو کر رہ جائے گا اور پھر اس کا ازالہ کسی طرح بھی ممکن نہ ہو سکے گا لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ قوم کے بااثر طبقے نے ان زہرناک اور ہلاکت خیز قدروں کو سماجی زندگی میں بنیادی حیثیت دے دی ہے یہاں تک کہ اب ان قدروں کو حوالے کے طور پر پیش کیا جانے لگا ہے۔ چناں چہ آج پاکستان میں امیر اور غریب جیسے شرم ناک الفاظ گفت گو میں بار بار استعمال کیے جاتے ہیں اور گویا اخلاق اور سماجی طور پر اس بات کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ پاکستان میں دو قومیں آباد ہیں۔ ایک غریب اور ایک امیر، ایک کرسی نشین اور ایک خیمہ بردار۔ وہ قوم جو زندگی کا کوئی اعلیٰ تصور نہ رکھتی ہو جو شرم ناک جہالت اور الم ناک غربت میں مبتلا ہو اس کے حق میں بااثر طبقے کا یہ اندازِ نظر اور طرزِ عمل نفسیاتی طور پر جس قدر مہلک ثابت ہوگا اس کا تصور مشکل نہیں۔ آج ہمارے ملک میں امیر سے امیر ترین بننے کی جو دوڑ ہو رہی ہے اس نے پوری قوم کے دماغ کو ماؤف اور ذہن کو خراب کر دیا ہے، جو لوگ ملک کی ذہنی تعمیر و ترقی سے

دل چسپی رکھتے ہیں جنھیں اس قوم کے مستقبل سے ذرا بھی ہمدردی ہے انھیں اس صورتِ حال کے خلاف سخت احتجاج کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں اہلِ قلم کا فرض ہے کہ وہ اعلیٰ سماجی تصورات اور اقدار کو فروغ دینے کی کوشش کریں لیکن وہ تو اپنا یہ فرض پہلے ہی سے انجام دے رہے ہیں۔ قوم میں یہی تو ایک طبقہ ہے جس نے اپنے فرائض کو کبھی فراموش نہیں کیا جس نے اس ملک میں آج تک صرف فرائض کی زندگی گزاری ہے۔

کسی اعلیٰ تصورِ حیات اور سماجی نصب العین کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی لہٰذا اس سلسلے میں قوم کے ذمّے دار افراد کو سب سے پہلے جو کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ افلاس اور جہالت کے خلاف ایک ہمہ گیر اور طاقت ور مہم شروع کی جائے کیوں کہ ہم اس وقت معاشی پستی، سماجی زبوں حالی اور تعلیمی پس ماندگی کی جس منزل میں ہیں وہاں کوئی اعلیٰ تصورِ حیات اور کوئی بلند نصب العین ہمارے درد کا درماں نہیں بن سکتا۔ تعمیر و ترقی کا سفر اسی وقت شروع ہو سکتا ہے جب ہم موجودہ منزل سے کافی دُور نکل جائیں۔ یہ ہے وہ بنیادی مسئلہ جس پر ہمارے اربابِ اقتدار کو سوچنا اور عمل کرنا ہے ورنہ خوش آیند باتیں کرتے رہنا ایک دل چسپ مشغلہ سہی لیکن ایک ہوش مندانہ اور نتیجہ خیز طریقِ کار ہرگز نہیں۔ قوم کو شان دار کوٹھیوں اور قیمتی کاروں کی کوئی ضرورت نہیں اسے اسکولوں، کالجوں، تربیت گاہوں، شفاخانوں، لہلہاتے کھیتوں اور کارخانوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں اس انداز میں سوچنا ہے۔ سوچنا ہی نہیں عمل کرنا ہے کہ ان مسئلوں کے سامنے باقی تمام مسئلے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

انشا، جولائی 1961

(یہی انشائیہ عالمی، مارچ 1964 میں "نصب العین" اور سسپنس، ستمبر 2002 میں "اندازہ" کے عنوان سے شائع ہوا)

بنیادی مسئلہ

پاکستان کا ایک بنیادی مسئلہ جہالت ہے۔ وہ بہت سے مسئلے جو معمولی توجہ سے حل ہو سکتے ہیں جہالت اور تہذیبی پس ماندگی کے باعث لاینحل ہو کر رہ گئے ہیں۔ جب کسی ملک کے عوام کو یہ بھی نہ معلوم ہو کہ انھیں کیا چاہنا چاہیے اور کیا نہیں تو پھر مسئلوں کے حل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے دیہات میں آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو لکھنے پڑھنے کو گناہ سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف شہروں میں رہنے والے وہ عوام ہیں جنھیں قدم قدم پر علم کی حقارت اور دولت کی عظمت کا احساس دلایا جاتا ہے جو اہلِ علم کی معاشی اور سماجی ناکامیوں اور جاہل اربابِ دولت کی اقبال مندیوں کا روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس طرح علم کی عظمت روز بہ روز کم ہوتی چلی جا رہی ہے اور زندگی کی اعلیٰ اقدار کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس صورتِ حال کی ذمّے داری ہمارے معاشرے کی ساخت پر عائد ہوتی ہے جس معاشرے میں علم کو سیہ بختی کے نشان کی حیثیت حاصل ہو جائے جہاں ترقی اور خوش حالی کا ہر راستہ علم کی مخالف سمتوں سے گزرتا ہو وہاں اس کے علاوہ بھلا اور کس بات کی توقع کی جا سکتی ہے۔ بات وہی ہے کہ ہم نے ابھی تک آزاد قوموں کی طرح زندگی بسر کرنا نہیں سیکھا چہ جائے کہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے کسی بہتر نظامِ حیات اور سماجی نظریوں کا انتخاب کہ یہ منزل تو اس وقت آتی ہے جب قوم کو آزادی کی حقیقی معنویت کا پوری طرح ادراک حاصل ہو چکا ہو۔ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ہمارے اصل مطالبات کیا ہیں اور ہمیں کس بات سے اتفاق اور کس بات سے اختلاف کرنا چاہیے مثال کے طور پر عائلی قوانین ہی کو لے لیجیے۔ حکومت نے یہ قوانین عوام ہی کے فائدے کے لیے بنائے تھے ان کی افادیت

خالص سماجی افادیت تھی۔ اس کا کوئی سیاسی پہلو نہیں تھا۔ کیا ہمیں ان کی مخالفت کرنا چاہیے تھی؟ لیکن ہم نے ان کی مخالفت کی اور قرآن وحدیث کے حوالے دینا شروع کر دیے۔ اگر سماجی اونچ نیچ اور معاشی ناہمواری کا گلہ کیا جائے تو خود ہمارے فاقہ کش اور فلاکت زدہ عوام اس کی مخالفت شروع کر دیں گے اور کہیں گے کہ یہ تو اللہ کی مشیّت ہے اس نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ بتائیے اس کا کیا جواب دیا جا سکتا ہے؟ لیکن وہ بے چارے بے قصور ہیں۔ سارا قصور ان کی جہالت کا ہے، وہ اپنی جہالت کے باعث عہدِ جدید کے ایک خوش حال معاشرے کا تصور بھی نہیں کر سکتے وہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ ان کے حقوق کیا ہیں اور کیا کچھ ان سے چھین لیا گیا ہے۔ جب ایسا ہے تو پھر ان کے اندر مطالبات آخر کس طرح بیدار ہوں۔ انھیں علم ہی نہیں کہ اس کرّۂ ارض کے بعض حصّوں پر انسان نے وہ جنت حاصل کر لی ہے جس سے وہ نکالا جا چکا تھا۔ یہاں تو جہالت کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی صاحبِ ریش بزرگ یہ نعرہ لگا دیں کہ انسان فانی ہے اور کوئی فانی مخلوق خلا کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتی اور روس و امریکا نے تسخیرِ خلا کا قصہ مشہور کر کے ہمیں بے وقوف بنایا ہے تو ہمارے عوام کی اکثریت یہ ارشاد سُن کر تعظیم وعقیدت سے سرنگوں ہو جائے گی۔ صنعتی اور سائنسی ترقیوں کی دشمنی اور بدخواہی ہماری رگوں میں خون کی طرح دوڑتی ہے۔ جدید عہد کے اعلیٰ سماجی اور سیاسی تصورات کے ساتھ ہمارا برتاؤ منافقانہ ہے۔ ہمارا بس نہیں چلتا ورنہ ہم انسانیت کو پھر اس تاریک عہد میں پہنچا دیں جہاں نیزہ بردار وحشی ایک دوسرے پر حملہ آور رہا کرتے تھے۔ ہمارا روشن خیال اور جدیدیت پسند طبقہ ان افراد سے عبارت ہے جو قدامت پرستی اور رجعت پسندی کی تائید میں دلیلیں فراہم کرنے کا کاروبار کرتے ہیں۔ اس کاروبار کو ''ریسرچ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ریسرچ کے شان دار نتائج کو سامنے رکھ کر قومی تہذیب اور ثقافت کے احیا کی تدبیریں سوچی جاتی ہیں لیکن ایسی تدبیریں سوچنے کی اجازت وہی معاشرہ دے سکتا ہے جو مادّی اور ذہنی طور پر حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہا ہو۔

انشا، اگست 1961

آہ! بابائے اُردو

سولھویں اگست، بدھ کا دن، آج ہم نے ایک جنازہ اُٹھایا ہے۔ ایک پوری نسل کا جنازہ، آج ہم نے ایک میّت دفن کی ہے۔ ایک پورے دور کی میّت۔ بابائے اُردو کیا مر گئے، ایک مکمل عہد مر گیا۔ ایک مفصّل تاریخ دفن ہوگئی۔ اب ان کی یادیں رہ گئی ہیں وہ دن جو اَب کبھی نہ آئیں گے۔ آج اُردو کا عظیم خانوادہ، عظیم جلیل خانوادہ سوگ وار ہے۔ عظیم اُردو سوگ وار ہے۔ عبدالحق ایک فرد کا نام نہیں تھا ایک صدی کا نام تھا۔ مرنے والے! تیرے ساتھ ایک پوری صدی کی نبض ڈوب گئی ہے۔ اس حادثے کو برداشت کرنے کے لیے دلوں میں کئی دن سے ہمت پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی تھی، محسوس ہوتا تھا جیسے لمحات کی سانس اُکھڑ رہی ہے، وقت کی نبضیں ڈوب رہی ہیں اور پھر وقت کی نبضیں ڈوب گئیں۔

اُردو ایک عظیم زبان ہی نہیں ایک زندہ و توانا تحریک بھی ہے لیکن جس نے اسے تحریک بنایا وہ صرف عبدالحق کی ذات تھی۔ لوگ مرتے ہیں تو مکان جائیداد، اولاد اور اثاثہ چھوڑ کر مرتے ہیں لیکن عبدالحق نے اپنے بعد کیا چھوڑا......؟ نہ ان کا کوئی گھر ہے، نہ جائیداد نہ بیوی بچے۔ یہ کوئی مذاق نہیں کہ ایک شخص صرف ایک مقصد، ایک نصب العین اور ایک تحریک کے لیے پوری زندگی وقف کردے۔ انسان کی کچھ ذاتی خواہشیں بھی ہوتی ہیں۔ ایک شخصی زندگی بھی ہوتی ہے مگر عبدالحق کی نہ کوئی ذاتی خواہش تھی نہ کوئی شخصی زندگی، بس ایک ہی خواہش اور ایک ہی زندگی تھی جو اُردو اور ترقی اُردو سے عبارت ہے۔ صبح ہوتی ہے لوگ اپنے گھر سے نکلتے ہیں اور سورج ڈوبتے واپس آجاتے ہیں اپنا گھر جو سماج کی تنظیم کے بعد سے آج تک فرد کے لیے زندگی کا سب سے زیادہ دل کش نقطہ رہا

ہے لیکن ذرا اس شخص کا تصور کیجیے جس نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے مرتے دم تک محض اجتماعی اور دفتری زندگی بسر کی۔ جلسوں، محفلوں اور مجلسوں کے اختتام کے بعد اس کے ساتھی اس سے رخصت ہو کر اپنے اپنے گھروں کو جاتے جہاں ان کے گھر والے ان کے منتظر ہوتے اور عبدالحق......؟ تو عبدالحق ایک ایسی عمارت میں داخل ہوتے جہاں صرف کتابیں ہوتیں، کاغذات ہوتے اور ایک سکوت ہوتا جس کے ساتھ ایک قطعاً غیر ذاتی اور غیر شخصی مقصدیت کی زندگی بسر کی جاتی۔ کیا یہ اس زندگی کا جہاد نہیں تھا جو قبر کے اندھیروں میں گم ہو گئی ہے، ہمیشہ کے لیے کھو گئی ہے۔ ہمیں بابائے اُردو کی خاطر ''عبدالحق'' کو بالکل ہی فراموش نہیں کر دینا چاہیے۔ اس لیے بھی کہ خود ''بابائے اُردو'' نے کبھی عبدالحق کا خیال نہیں کیا۔ انھوں نے اس شخص کے بارے میں کبھی نہیں سوچا جو اپنی تمام حیثیتوں سے پہلے بہ ہر حال ایک انسان تھا۔ انجمن ترقی اُردو کے مرحوم صدر کو اُردو کے علاوہ نہ کسی چیز کا غم تھا اور نہ کسی چیز کی خوشی۔ عظیم تھا وہ دل جو اپنے لیے کبھی نہیں دھڑکا، عظیم تھا وہ ذہن جس نے اپنے لیے کبھی نہیں سوچا۔ یہ دور بڑا ہی قاتل دور ہے اس دور میں اقدار مر رہی ہیں، اعتبارات بدل رہے ہیں، عجیب دور ہے کہ جس میں نہ کوئی رنگ چڑھتا ہے نہ کوئی نقش بیٹھتا ہے، شخصیتیں اُبھرتی ہیں اور ڈوب جاتی ہیں۔ نئے لوگ سامنے آتے ہیں اور جلد ہی پرانے ہو جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے اس صدی کے ربع اوّل میں ہوش سنبھالا تھا وہ آج ذہنی اور نفسیاتی طور پر حالات کا ساتھ نہیں دے پا رہے مگر وہ عبدالحق جو بیسویں صدی کے ظہور کے وقت پورے تیس سال کے تھے جنھوں نے انیسویں صدی کے جلوس کو اپنی آنکھوں سے اُفق میں ڈوبتے دیکھا تھا وہ مرتے وقت بھی ذہنی طور پر اتنے ہی جدید اتنے ہی تازہ اور اتنے ہی جوان تھے جتنے آج سے ستّر سال پہلے۔ یہی نہیں بل کہ انھوں نے اس دور کی جدید تہذیبی قدروں کی پیشوائی اور رہ نمائی کا فرض انجام دیا جو لوگ ان سے دو تین سال چھوٹے تھے وہ ان کے سامنے اندازِ فکر کے اعتبار سے بوڑھے نظر آتے تھے۔ وہ قوّت و حیات کا ایک آتش کدہ تھے جو مرتے دم تک روشن رہا اور جس سے اس عہد کے نوجوان شعور نے تابش و توانائی کا

اکتساب کیا۔ سوچیے تو سہی ان کے سامنے کتنی تحریکوں نے جنم لیا، پروان چڑھیں اور اپنی عمر پوری کر کے ختم ہوگئیں۔ وہ تاریخ کی ایک جیتی جاگتی دستاویز تھے جس کا شیرازہ ہمیشہ کے لیے بکھر گیا۔ وہ کئی ماضیوں کا حال اور کئی حالوں کا مستقبل تھے۔ آج جس نوجوان نسل نے ان کا جنازہ اُٹھایا ہے ان کے غم میں سیاہ نشان بلند کیے ہیں۔ وہ جانتی ہے کہ ان کی ضعیفی اس کے نوجوان ولولوں کے لیے کتنی بڑی اُمید گاہ تھی۔ انھوں نے مرتے مرتے بھی اس نسل کو ایک نعرہ دیا۔ اُردو یونی ورسٹی کا نعرہ جو ہماری تہذیب اور ہمارے موجودہ سماج کا سب سے زیادہ دانش افروز اور حیات آفریں نعرہ ہے۔ وہ آنسو ہمیشہ بے لوث ہوتے ہیں جو نوجوانی نے کسی بڑھاپے کے لیے بہائے ہوں۔ عبدالحق کے جنازے پر ہمارے طلبہ کے محترم اور باشعور طبقے نے جو آنسو بہائے ہیں ان کی صداقت اور معصومیت عبدالحق کی عظمت کا موثر ترین اعتراف ہے۔ اس دور میں کتنے ہی عالی شان اور بالانشین لوگ مر گئے لیکن نئے عہد کے ذہن نے ان کے بارے میں سوچا تک نہیں اس لیے کہ وہ زندگی کی قوّت و حرارت کھو چکے تھے لیکن عبدالحق مرے تو ایسا محسوس ہوا جیسے نوجوانوں کے درمیان سے ان کا ایک نوجوان ساتھی اُٹھ گیا ہے جو اُن کے قومی ضمیر اور تہذیبی شعور کا رہ نما تھا۔

ان کے طریقِ کار سے بہت سے لوگوں کو اختلاف ہوسکتا ہے۔ ان سے بہت سی غلطیاں اور کوتاہیاں بھی سرزد ہوئی ہوں گی لیکن کیا یہ کوتاہیاں اور غلطیاں اس سماج میں قابلِ معافی نہیں ہیں جس میں ایک محدود طبقے کو چھوڑ کر تمام افراد کی زندگی صرف غلط کاریوں اور کوتاہیوں سے عبارت ہے جنھوں نے اس مقصد کے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں جس کے لیے عبدالحق نے اپنی ساری زندگی تج دی۔ آج کون ہے جو یہ کہہ سکے کہ مولوی عبدالحق نے تحریکِ اُردو کے مفاد کو داؤ پر لگا کر ایک موقع پر فلاں شخصیت یا فلاں جماعت سے سمجھوتا کر لیا تھا، کون ہے جو اس کے ادنیٰ امکان پر بھی سوچ سکے۔ علم و دانش کی عظمت کا احساس جس قدر عبدالحق میں تھا وہ بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے اور اس کے اِظہار کو وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ انھوں نے اربابِ دولت کو کبھی اہمیت نہیں دی، یہی نہیں بل

کہ وہ اس طبقے کے ساتھ ہمیشہ تحقیر آمیز انداز سے پیش آتے تھے، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آج تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ علم وفن کے نمایندوں نے صرف دولت واقتدار کی چاپلوسی اور کاسہ لیسی کو اپنا وظیفہ قرار دے لیا ہے۔ مرنے والے میں بڑی خوبیاں تھیں۔ بڑے پہلو تھے، کسی ایک شخص کو کسی سماج کے لسانی ارتقا میں کبھی اتنی اہمیت حاصل نہیں ہوئی جتنی اہمیت اُردو سماج کے ارتقا میں عبدالحق کو حاصل ہے۔ اگر ہم ان کی ۵۰ سالہ سرگرمیوں کی نفی کر کے اُردو زبان کا تصور کریں تو محسوس ہوگا کہ ہم نے کئی نسلوں کی نفی کر دی ہے۔ اس طرح عبدالحق کی موت پر ہم ایک فرد سے نہیں کئی نسلوں سے بچھڑ گئے ہیں۔

اُردو یونی ورسٹی

اب آخر میں مولوی صاحب کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اُردو یونی ورسٹی قائم ہو جائے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اُردو یونی ورسٹی صرف ایک یونی ورسٹی ہی نہ ہوگی بل کہ وہ اپنے وسیع ترین اطلاق کے اعتبار سے علم ودانش کی ایک پُرسکون بستی ہوگی۔ ایک سماج ہوگا جہاں قوم کے ذہنی ارتقا کے لیے خالص تحقیقی، تخلیقی، علمی اور سائنسی فرائض انجام دیے جائیں گے۔ افسوس کہ یہ "دانش آباد" ان کی زندگی میں تعمیر نہ ہو سکا۔ دراصل یہ وہ کم سے کم مطالبہ تھا جو ایک آزاد اور خود مختار سماج اپنی تہذیبی اُمنگوں اور قومی تمناؤں کی پیہم ناکامیوں سے عاجز آ کر پیش کر سکتا ہے۔ ویسے اصل مطالبہ تو یہ ہے کہ مغربی پاکستان کی ہر یونی ورسٹی کو اُردو یونی ورسٹی ہونا چاہیے، ہونا ہی چاہیے مگر کیا کیا جائے کہ یہ کم سے کم مطالبہ بھی ان کی زندگی میں پورا نہ ہو سکا، یہ مطالبہ جو انیسویں صدی کے کسی ہندوستانی یا پاکستانی گاؤں یا قصبے میں نہیں بل کہ بیسویں صدی میں پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی کے ایک آزاد اور خود مختار سماج کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

بہ ہر حال جو کچھ ہوا وہ ہوا لیکن اب تو ہمیں اس کوتاہی کی تلافی کر ہی دینا چاہیے آخر اب کس بات کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس فرض کو انجام دینے کا سب سے زیادہ آسان طریقہ یہ ہے کہ حکومت مغربی پاکستان کی کسی بھی یونی ورسٹی کو اُردو یونی ورسٹی کی حیثیت دے دے۔ مالی نقطۂ نظر سے بھی مسئلے کا بہترین حل یہی ہے۔ گویا یہ وہ یونی ورسٹی ہوگی جس کے

قیام کا خواب بابائے اُردو نے دیکھا تھا۔ اس طرح برسوں کا کام مہینوں میں مکمل ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد اس کام کو بہ تدریج آگے بڑھایا جائے تاایں کہ مغربی پاکستان کی ہر یونی ورسٹی اُردو یونی ورسٹی کے قالب میں ڈھل جائے۔ ان باتوں کو ذہن کی خوش فعلیوں سے تعبیر نہ کیا جائے۔ یہ گفت گو اس تاریخی وتہذیبی حقیقت پسندی کا ناگزیر نتیجہ ہے جس کے بغیر کوئی سماج صحیح العقل اور سلیم الحواس ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

انشا، ستمبر 1961

خلافِ قانون

گزشتہ دنوں لندن میں جارحیت پسندانہ رجحانات اور ایٹمی تجربات کے خلاف احتجاجی مظاہرے کیے گئے جن میں ہزاروں لوگوں نے حصّہ لیا۔ مظاہرین میں ممتاز ادیب، دانش ور اور فن کار بھی شامل تھے۔ مظاہروں کی قیادت مشہور فلسفی پروفیسر برٹرینڈ رسل نے کی جنھوں نے لندن میں تحریکِ امن کو منظم کیا ہے لیکن عدالت کے خیال میں انھوں نے امن کے لیے مظاہرے کر کے نقضِ امن کا ارتکاب کیا تھا لہٰذا اُن کے لیے قید کی سزا تجویز کی گئی اور وہ ایک ہفتے کے لیے جیل بھیج دیے گئے۔ جس عدالت نے انھیں مجرم قرار دیا ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ خود دو جرموں کی مرتکب ہوئی ہے۔ اوّل تو یہ کہ اس نے عالمی امن کی مقدّس و محترم قدر کی توہین اور جنگ بازی کے رجحان کی ہمت افزائی کی دوسرے یہ کہ رسل جیسے قابلِ احترام فلسفی کو مجرم کی حیثیت سے قید کی سزا دی۔ انگلستان جیسے مہذب، متمدن اور جمہوری ملک میں کسی عدالت کا جنگ بازی کے خلاف احتجاج کرنے کو جرم قرار دینا اور ایک امن پسند فلسفی کے لیے قید کی سزا تجویز کرنا یقیناً ایک عبرت ناک واقعہ ہے۔ اس واقعے کے تیوروں سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انگلستان میں کلیسائی عہد کی ذہنی آبرو باختگی اور انسانیت دشمنی کو زندہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ لندن میں اس واقعے کا ظہور بلاشبہ ایک الم ناک حادثہ ہے۔ ویسے بھی یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے کسی طرح بھی اس ترقی یافتہ عہد کے مناسبِ حال نہیں اس سے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہم تہذیبی اور سماجی طور پر کئی صدی پیچھے لوٹ گئے ہوں۔ فی الحال ہم اس بحث سے قطع نظر کرتے ہیں کہ امن اور انسانیت کی قدر زیادہ مقدّس اور قیمتی ہے یا وہ قانون جس کی رُو سے

امن کے نعرے بلند کرنے کو جرم قرار دیا گیا۔ ہمیں تو یہ کہنا ہے کہ جس تحریک کو ایک فلسفی کی قیادت حاصل ہو اور جس میں عقلیت پسند اور انسانیت دوست فنکاروں، مصنفوں اور دانش وروں نے حصہ لیا ہو اس کے خلاف اس علمی اور سائنسی عہد میں قانون کے حوالے پیش کرنا خود سب سے بڑی قانون شکنی ہے، جو لوگ قوموں اور نسلوں کے لیے دستورِ حیات بناتے اور صدیوں اور قرنوں کے لیے قوانین وضع کرتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں عدالتوں کے تنخواہ دار بن مانسوں کو یہ حیثیت کس طرح حاصل ہو گئی کہ وہ خیرہ چشمی سے چند فیصلے صادر کر دیں اور پھر ان پر عمل درآمد بھی ہو جائے۔ آخر اس دنیا میں چیزوں کو غلط اور صحیح قرار دینے کا حق صحیح معنی میں فلسفیوں اور دانش وروں کے علاوہ اور کس طبقے کو حاصل ہو سکتا ہے۔ قانون آسمان سے نازل نہیں ہوا وہ چند سماجی ضابطوں کا نام ہے جن کی تشکیل اور حفاظت کا فرض تاریخی اور عالمی سطح پر صرف مفکر ہی انجام دیتے ہیں۔

امن کی تحریک اور انسانیت کی تخریب و تباہی کے تجربوں کی مخالفت کو خلاف قانون قرار دینے کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ انگلستان کا شہری قانون عالمی جنگ اور انسانیت کی عالمی تباہی کا موافق ہے، جو طاقتیں اپنی جارحیت پسندی اور انسانیت دشمنی کے شرم ناک مظاہرے کر کے انسانی وجود کو دھمکیاں دے رہی ہیں انھوں نے آخر سوچا کیا ہے؟ یہ لوگ آخر چاہتے کیا ہیں؟ ہمیں دنیا میں کیسے کیسے غم برداشت کرنا پڑتے ہیں لیکن کیا اس دنیا کو تباہ ہو جانا چاہیے؟ کیا اس زندگی کو جس میں اگرچہ کتنی ہی تلخیاں اور محرومیاں پوشیدہ ہیں، اس مختصر زندگی کو، جس کا کبھی اعادہ نہیں ہوگا ہلاکت کے جہنم میں جھونک دیا جائے؟ اگر نہیں تو پھر ان جارحیت کوشیوں کا آخر کیا مطلب ہے؟ کیا ان لوگوں کو اب یہی کام رہ گیا ہے کہ جنگی مشقوں اور ایٹمی تجربوں کے ذریعے انسانوں کی نیندیں حرام کر دیں؟ اب تو کچھ اس انداز سے جنگ کی دھمکیاں دی جاتی ہیں جیسے انسانیت کو کوئی مژدہ سنایا جا رہا ہو۔ تہذیب اور تمدن کے موجودہ نقطۂ ارتقا تک پہنچنے کے باوجود یہ لوگ قدیم عہد کے وحشیوں کی طرح ہلاکت اور بربریت کی باتیں کرنے سے باز نہیں آئے، کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسانی فطرت کی وحشت اور بربریت قطعاً ناقابلِ علاج ہے ورنہ اس عہد میں یہ

باتیں کسی طرح بھی مناسب نہ تھیں۔ انسان ویسے ہی کیا کم بدنصیب ہے جو اسے بار بار تباہی اور بربادی کی دھمکیاں بھی دی جائیں۔

ہم اس مہیب اور بے نیاز کائنات میں کس قدر تنہا اور بے سہارا ہیں۔ فطرت کو ہم سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ اگر تم اپنی آنکھیں پھوڑلو تو کیا کوئی تمھیں روک لے گا؟ اگر تم چٹانوں سے ٹکرا جاؤ تو کیا وہ موم ہو جائیں گی؟ مگر ہم ہیں کہ ہم نے خود اپنے وجود کو اپنے لیے عذاب بنالیا ہے۔ کیا یہ ایک الم ناک حقیقت نہیں ہے کہ انسان خلاؤں کو مسخر کر لینے کے باوجود آج بھی زمین پر بے موت مر جاتا ہے۔ انسانی آبادی کی بڑی اکثریت آج بھی دردناک جہالت اور الم ناک افلاس کا شکار ہے۔ کتنی ہی بیماریاں ہیں جن پر ہم اپنی حیرت انگیز سائنسی حکمت کے باوجود قابو نہیں پا سکے۔ مگر ہم کیا کریں ہمیں تو تیسری عالمی جنگ کی تیاریوں ہی سے مہلت نہیں ملتی۔

جدید عہد کی سیاست کارانہ ذہنیت نے جس مردم آزاری کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی مثال قدیم عہد کے وحشی بھی پیش نہیں کر سکتے اس لیے آج کے دانش وروں پر امن اور انسانیت کے سلسلے میں پہلے سے کہیں زیادہ ذمّے داریاں عائد ہوگئی ہیں۔ آج بھی انسانیت کی اُمید گاہ یہی لوگ ہیں۔ یہ انھی کا فرض ہے کہ وہ انسانیت اور تہذیب کی بقا اور اس کے ارتقا کے لیے جنگ اور ہلاکت کی قوتوں کے خلاف ایک عالمی محاذ بنائیں۔ جنگ کون چاہتا ہے؟ جنگ کون چاہ سکتا ہے؟ شاید وہی طاقتیں جو اپنے تدریجی زوال کے خطرے سے دوچار ہیں جو آہستہ آہستہ اپنے وجود کا جواز کھوتی جا رہی ہیں اور جنھیں تاریخ نے سیاسی قسمت آزمائی کے آخری مرحلے پر لا کھڑا کیا ہے۔

پروفیسر رسل اور ان کے ساتھی ایٹمی تجربوں کی مخالفت میں جو تحریک چلا رہے ہیں ہم پاکستانی دانش وروں کی طرف سے اس کی پُرزور تائید کرتے اور اس سلسلے میں دنیا کے دانش وروں کی طرف سے ایک عالم گیر تحریک کو منظم کرنے اور آگے بڑھانے کی شدید ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ جنگ کے اداروں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانا چاہیے۔ دنیا میں جب تک جنگی ادارے اور جنگی صنعتیں باقی ہیں اس وقت تک انسان کسی طرح بھی

مہذب ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ مشکل یہ ہے کہ فلسفیوں اور فنکاروں کو اچھی باتیں سوچنے اور ظاہر کرنے کے علاوہ انسانی سماج نے اور کوئی حق نہیں دیا اور بعض حالات میں یہ حق بھی زندگی کے مول حاصل ہوتا ہے، اچھی باتیں کرنے والے کاش اچھی باتوں کو منوانے کا حق بھی رکھتے۔ لیکن پھر بھی انھیں اپنا یہ فرض ادا کرنا ہے کہ بہ ہر حال یہ عہد ان فرائض کو ادا کرنے کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ سازگار ہے۔

انشا، اکتوبر 1961

زمین پر

جمعیت متحدہ اسلامیہ کے زیرِ اہتمام لاہور میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے رہنماؤں کا ایک نمایندہ اجتماع منعقد ہو رہا ہے۔ جمعیت خالص مذہبی اور روحانی بنیاد پر قائم کی گئی ہے۔ جمعیت کے سیکرٹری علامہ علاء الدین صدیقی نے ایک پریس کانفرنس میں جمعیت کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ "وہ بے دینی اور شرک کے خلاف جدوجہد اور اخلاقی اقدار کے احیا کے لیے کام کرے گی۔ فرقہ وارانہ خصومتوں کا سدِّ باب اور ملک کی آزادی اور سالمیت کا تحفظ بھی جمعیت کے نصب العین میں شامل ہے"۔

مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے رہنماؤں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش بلاشبہ ایک ایسی مستحسن کوشش ہے جس کے لیے جمعیت تمام اسلامی فرقوں کی طرف سے داد و تحسین کی مستحق قرار پائے گی۔ فرقہ وارانہ مناقشات کے سدِّ باب اور ملک کی آزادی اور سالمیت کے تحفظ کو اپنے دائرۂ فرائض میں شامل کرنا جمعیت کا دوسرا پسندیدہ اقدام ہے۔ یہ ایسے مقاصد ہیں جن کی اہمیت اور افادیت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ ہماری دلی آرزو ہے کہ جمعیت اپنے ان نیک مقاصد میں پوری کامیابی حاصل کرے۔ لیکن جہاں تک جمعیت کی خالص مذہبی اور روحانی بنیاد کا تعلق ہے، ہم اس سے متفق نہیں۔ نیز اغراض و مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے جہاں یہ کہا گیا ہے کہ جمعیت بے دینی اور شرک کے خلاف جدوجہد کرے گی۔ وہاں ہمیں یہ کہنا ہے کہ پاکستان میں بے دینی اور شرک کا کوئی مسئلہ ہی سرے سے موجود نہیں جس کے خلاف تحریک چلائی جائے۔ ہمیں گزشتہ کئی صدیوں سے اور خاص طور پر حصولِ آزادی کے بعد جن دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے ان کا بے دینی اور شرک سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ جمعیت اگر محض ایک تفریحی مشغلے کے طور پر وجود میں نہیں آئی تو اسے پوری سنجیدگی کے ساتھ قوم کے مسائل کا جائزہ لینا پڑے گا۔ اس طرح

اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مذہبی بنیاد کے بجائے خالص سماجی بنیاد پر کام کرے۔

آج ہم جن تضادات اور مشکلات میں مبتلا ہیں ان کا بے دینی اور شرک سے کوئی تعلق نہیں، آپ ہی بتایئے کہ آپ کی قوم کا جو طبقہ ہر قدم پر سماجی اقدار اور انسانی شرافت کا مذاق اُڑاتا ہے، کیا وہ بے دین ہے؟ جو حضرات عوام کا خون چوس کر حج کرنے تشریف لے جاتے ہیں کیا وہ مشرک ہیں؟ جن بزرگوں نے مسجدوں اور مذہبی اداروں کو تجارت گاہوں میں تبدیل کر دیا ہے کیا وہ ملحد ہیں؟ جو لوگ انسانوں کو غریب و امیر کے خانوں میں بانٹتے ہیں کیا وہ لامذہب ہیں؟ جو قابو یافتہ افراد اپنی غلامانہ ذہنیت کی قربان گاہ پر قوم کا ہر تاریخی و تہذیبی سرمایہ قربان کر دینا چاہتے ہیں کیا وہ مذہب کے منکر ہیں؟ یہ شوخ چشم تو وہ ہیں جو مذہب کا نام لیتے ہوئے کسی وقت بھی نہیں تھکتے۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ پاکستان میں دس گیارہ سال تک جو ناٹک کھیلا جاتا رہا اس کے بہروپیے کیا غیر مذہبی لوگ تھے؟ کیا کوئی ایسی مثال پیش کی جاسکتی ہے کہ کسی موقع پر بے دینوں نے ملک کی تہذیبی، سماجی اور معاشی ترقی میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کی ہو۔

بل کہ ہمیں تو یہ پوچھنا ہے کہ دنیا کی اس سب سے بڑی اسلامی مملکت میں بے دین آخر ہیں کہاں؟ ہمیں تو ملّتِ بیضا کے علاوہ یہاں کوئی چیز نظر آئی نہیں۔

اگر پاکستان میں چند بے دینوں کا وجود فرض بھی کر لیا جائے تب بھی صورتِ حال میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بے دینی انسانیت کے لیے کبھی کوئی خطرہ نہیں رہی اور نہ وہ آج کوئی خطرہ ہے۔ منطق کبھی کسی کا سر نہیں پھاڑ سکتی، فلسفہ کبھی کسی کی محنت کا لہو نہیں نچوڑ سکتا۔ دلیلوں نے انسانیت کی ہموار سطح پر فرقِ مراتب کی سیڑھیاں کبھی تعمیر نہیں کیں۔ منطق جو صرف ایک طریقہ ہے جو صرف ایک جستجو ہے، دلیل جو صرف ایک نشان ہے۔ ان میں سے کسی کو اپنے حتمی ہونے کا دعویٰ نہیں، پھر کسی خطرے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ یہ دو آدمی آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص کی رائے یہ ہے کہ "یہ دنیا نہ تو ہندوستان کے رام نے بنائی ہے نہ پاکستان کے خدا نے، اس کی پیدائش کا فلسفہ کچھ اور ہے" لیکن یہ شخص اس فلسفے کو آیت اور حدیث نہیں سمجھتا وہ اپنی رائے بدلنے کے لیے ہر وقت تیار ہے۔ کیا آپ کو اس شخص کی مصروفیات معلوم ہیں؟ کیا آپ اس کے خیالات سے باخبر ہیں؟ یہ شخص

اس گفت گو سے پہلے انسانوں کی عالمی برادری اور برابری کے موضوع پر غور کر رہا تھا۔ وہ ہر انسان کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ان انسانوں کے عقائد اور خیالات کیا ہیں۔ سماج نے اس شخص کی معیشت کے سلسلے میں آج تک کوئی ذمّے داری قبول نہیں کی لیکن یہ ہر وقت سماج کی خوش حالی اور ترقی کے لیے فکر مند رہتا ہے۔ یہ پاگل انسان آپ سے جُدا ہوتے ہی ایک ایسی کتاب کے مطالعے میں غرق ہو جائے گا جسے پڑھ کر سر میں درد تو ضرور ہونے لگتا ہے لیکن کسی مقوی اور مفرّح مرکب کا نسخہ حاصل نہیں ہوتا۔ اس کتاب کے کسی صفحے کو کیش نہیں کرایا جا سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ سماج کا تمام قابلِ فخر سرمایہ انھی صفحات کے طفیل وجود میں آیا ہے۔ کیا سماج کے خیرہ سر مفتیوں میں اتنی جرأت ہے کہ اس شخص پر کوئی فردِ جرم لگا سکیں کیا خدا کا کوئی برگزیدہ بیٹا شریف انسانیت کی محفل میں اس ژولیدہ مُو آدمی سے نگاہیں ملانے کی جسارت کر سکتا ہے؟

لیکن ایک دوسرا شخص ہے جسے آپ کے معاشی مسائل سے کوئی سروکار نہیں' اس کا اصرار تو صرف یہ ہے کہ آپ اس کے عقائد مان لیجیے نہیں تو آپ کی گردن اُڑا دی جائے گی۔ اس کی بے فیض ہمدردیاں صرف ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو اُس کے آبا و اجداد کے عقیدے کو کائنات کی سب سے بڑی صداقت اور غایت سمجھتا ہو۔ بتایئے کہ ان میں سے کون شخص آپ کو نقصان پہنچانے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے؟

یہ کوئی مسئلہ نہیں کہ کون دین دار ہے اور کون بے دین' جسے بھوک لگتی ہے اسے غذا اور جسے سردی لگتی ہے اسے لباس چاہیے اس کے علاوہ سماجی برائیوں کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو بطورِ خاص جمعیت متحدہ اسلامیہ جیسے اداروں ہی کی سرپرستی چاہتا ہے۔ جمعیت اگر سماجی برائیوں کا سدِّ باب کرنے کے لیے ایک تحریک چلائے تو یہ بات اس کے منصب کے عین مطابق ہوگی' مسئلے زمین پر پائے جاتے ہیں' ان کی مزاحمت زمین ہی پر کیجیے' آسمان پر نہیں۔ اس لیے ہمارا یہ خیال ہے کہ جمعیت کو مذہبی اور روحانی بنیادوں کے بجائے خالص سماجی بنیادوں پر کام کرنا چاہیے۔ جب یہ مسئلے حل ہو جائیں تو پھر آپ جن بنیادوں پر چاہیں کام کریں آپ کو کوئی نہیں روکے گا بلکہ آپ کی ہر بات پوری توجہ کے ساتھ سُنی جائے گی۔

انشا' نومبر 1961

پُرانے اور نئے سوال

وقت نہ شروع ہوتا ہے اور نہ ختم، وہ ایک آن ہے جو دوام میں پھیلی ہوئی ہے، وہ ایک دوام ہے جو آن میں سمٹا ہوا ہے، مگر پھر بھی ہم تقویم ماہ و سال کا ایک نیا ورق اُلٹ رہے ہیں، نیا سال نئے سوال لے کر ہمارے سامنے آیا ہے۔ اور گزرا ہوا سال ہم سے ایک محاسبہ چاہتا ہے، اس طرح ذہن میں خود بخود کچھ سوال پیدا ہوتے ہیں۔ سوال جو ہماری گزشتہ اور آیندہ زندگی کو محیط ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ آیا ہم واقعی آزاد ہیں؟ بلاشبہ ہم نے ۱۴ اگست، ۱۹۴۷ء میں آزادی کا جشن منایا تھا اور اخباروں کے فائلوں سے بھی اس امر کی شہادت پیش کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس نوع کی شہادت کے ذریعے ہم اس سے زیادہ اور کیا ثابت کر سکتے ہیں کہ انگریز یہاں سے چلے گئے، رہی آزادی تو وہ کسی جشن کا نام ہرگز نہیں، جشن جس کے چراغ صبح تک بُجھ جاتے ہیں اور نہ وہ کوئی خبر ہے جو شام تک باسی ہو جاتی ہے، عجیب تر بات یہی ہے کہ ہم نے آزادی کو کاخ وکو کی روشنی اور کاغذوں کی روشنائی سے زیادہ اور کچھ نہیں سمجھا۔

آزادی، غلامی کے عہد میں بھی موجود تھی اور غلامی، آزادی کے دور میں بھی باقی ہے۔ کیا زمانہ ان افراد سے ناواقف ہے جو برطانوی سامراج کی موجودگی میں بھی آزاد تھے اور کیا دنیا ان لوگوں سے واقف نہیں جو غلامی سے نجات پانے کے بعد غلام ہوئے۔ کیا اقبالؔ غلام تھے؟ کیا قائداعظم محمد علی جناح اور لیاقت علی خاں ۱۴ اگست، ۱۹۴۷ء کے بعد آزاد ہوئے تھے؟ حصولِ آزادی کے بعد ہم نے ایک گروہ کو دیکھا جس کے جسم آزاد ہیں اور روحیں غلام۔ گزشتہ غلامی جبر سے قبول کی گئی تھی لیکن یہ غلامی پوری رضامندی کے ساتھ

قبول کی گئی ہے، لیکن ہم اپنے سماجی، تہذیبی اور تمدنی فیصلوں کو ایک آزاد قوم کے فیصلوں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ جب ہم نے آزادی، احتجاج اور انقلاب کے نعروں سے آسمان سر پر اُٹھا لیا تھا، آخر اُس وقت ہم چاہتے کیا تھے؟ واقعی سوچنے کی بات ہے کہ آزادی اور انقلاب سے ہمارا مطلب کیا تھا؟

آج تحریکِ آزادی کے دور اور اس دور کی سرگرمیوں کو یاد کر کے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم کوئی مذاق کر رہے تھے۔ آج آزادی حاصل کیے ہوئے ہمیں کئی سال ہو چکے ہیں، بتائیے اس مدت میں ہمارے اندر آخر ایسی کون سی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے جسے آزادی کا نام دیا جا سکے۔

نیا سال مقامی اور بین الاقوامی مسائل کے اعتبار سے بڑا اہم سال ہے، اس لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ صورتِ حال کا سنجیدگی سے جائزہ لیں اور غور کریں کہ دنیا کی آزاد اور ذمّے دار قوموں میں ہماری کیا حیثیت ہے یا ہم خود اپنے آپ کو دیانت داری کے ساتھ کس حیثیت کا مستحق قرار دے سکتے ہیں۔ اس موقع پر ہمیں چند حقیقتوں کو کسی طرح نہیں بھولنا چاہیے۔

اس قوم کا ذمّے دار شعور گزشتہ سو سال سے ایک بنیادی انقلاب کا آرزومند رہا ہے۔ اس انقلاب کا پس منظری فلسفہ مختلف لوگوں کے نزدیک چاہے مختلف رہا ہو لیکن جہاں تک انقلاب کا تعلق ہے یہ سب کا دلی مقصود رہا ہے، ہمیں پوری صفائی کے ساتھ اعتراف کر لینا چاہیے کہ وہ مقصود و مطلوب انقلاب آج تک نہیں آ سکا۔ یہ حقیقت تو یقیناً ہم سب جانتے اور مانتے ہیں کہ ۴۷ء کے بعد یہ قوم کئی قدم بلاشبہ کئی قدم آگے بڑھی ہے، قصبے، شہروں میں اور شہر، ملک کے عظیم مرکزوں میں تبدیل ہو گئے، جہاں پہلے جنگل تھے، وہاں اب عظیم الشان کارخانے نظر آتے ہیں، جہاں کتاب کا کوئی ورق بھی اُڑ کر نہیں گیا تھا، وہاں اب شان دار درس گاہیں تعمیر ہو چکی ہیں اور یہ اس مفلوک الحال قوم کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس سے انکار کرنے والے یا تو اس ملک اور قوم کے بدخواہ ہیں یا دیوانے۔ لیکن ان تمام حقیقتوں کے باوجود کوئی ایسی چیز ضرور ہے جو بُری طرح دل میں کھٹکتی ہے، ایک ایسی کمی ہے جو ابھی تک

پوری نہیں ہو سکی۔ کئی سال سے یہ قوم مستقل طور پر ایک گونہ حسرت، ہزیمت اور حرمان کے احساس میں مبتلا ہے۔ جیسے انھوں نے اپنا تابوتِ عہد اور خیمۂ اجتماع گم کر دیا ہے اور اب وہ ہر وادی میں سرگرداں ہیں، یہ سب کچھ کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ عمارتیں اُوپر اُٹھ رہی ہیں، بازار آگے بڑھ رہے ہیں، تعمیر و ترقی کے دائرے پھیل رہے ہیں یا کم سے کم اتنا ضرور ہے کہ ہم مادّی طور پر ٹھہرے ہوئے نہیں ہیں، کسی نہ کسی درجے میں آگے ہی بڑھ رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ قوم کی ذہنی اور نظری معنویت کے بغیر سب کچھ بے معنی ہے، یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اسے آپ صرف بقا کی ایک ناگزیر کوشش سے تعبیر کر سکتے ہیں، یہ ارتقا کا ہنگامہ ہرگز نہیں ہے، ہمارا البطون ویران ہے، ہمارے اندروں میں سناٹے ہیں، یہ ایک سخت آزمایش ہے، ممکن ہے کہ بہت سے لوگ اس بات کو محسوس نہ کرتے ہوں لیکن جو اسے محسوس نہیں کرتے وہ ایک یہی بات نہیں، کسی بھی بات کو محسوس نہ کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔

ہم نے حصولِ آزادی کے بعد کی اس مدت میں متحدہ قومیت کا کوئی ثبوت پیش کیا؟ کیا ہم علاقائی اور گروہی تعصبات سے نجات پا چکے ہیں؟ یہ قوم آج صوبوں اور علاقوں کی اصطلاحوں میں سوچتی ہے۔ کیا ذہنی اور اخلاقی دیوالیاپن کا اس سے بڑا ثبوت کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟ کتنے لوگ ہیں جو پاکستانی ہونے کی حیثیت سے چیزوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان تمام حالات کی تاویل پیش کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم ساری ذمّے داری حکومت پر ڈال دیں، جیسا کہ ہم انگریزی عہد میں کیا کرتے تھے اور یہ بات اس وقت بالکل صحیح تھی لیکن اب ایسا کرنا مسئلے کے ساتھ سب سے بڑی ناانصافی ہے، ایک آزاد قوم اپنی ساری ذمّے داریوں سے جان بچا کر اگر اس طرح سوچنے لگے تو پھر کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ آپ اپنی نجی اور سماجی زندگی میں جس غلامانہ ذہنیت اور متعصبانہ اندازِ نظر کا مظاہرہ کرتے ہیں، کیا اس کی ذمّے داری حکومت کے سر عائد ہوتی ہے؟

ہم قومی مسائل پر غور کرتے ہوئے قوم کو عوام اور حکم رانوں کے طبقے میں تقسیم کر دیتے ہیں اور پھر انھیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف سمجھتے ہیں۔ یہ انداز بڑا ہی غلط انداز اور مضر ہے۔ بتائیے کہ اس طرح آپ اپنی ذمّے داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ اس

تقسیم اور اس صف بندی کے بعد جو گفت گو شروع ہوتی ہے اس سے کچھ اس قسم کے نتیجے برآمد ہوتے ہیں کہ

زندگی در گردنم اُفتاد بیدلؔ چارہ نیست
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

مگر مشکل یہ ہے کہ بیدلؔ اس طرح زندہ نہیں رہ سکتے بل کہ بیدلؔ کو اس طرح زندہ رہنا بھی نہیں چاہیے۔ ملک کے عوام کہیں باہر سے درآمد نہیں کیے گئے۔ قوم کا حکمراں طبقہ آسمان سے نہیں ٹپک پڑا۔ یہ اندازِ نظر قوم میں مجرمانہ غیر ذمّے داری اور مخالفانہ غیر جانب داری کے رجحان کا سبب بنا ہے بتایئے کہ یہ فرائض سے گریز نہیں تو اور کیا ہے؟ یہی اندازِ نظر رہا تو شان دار حال اور مستقبل کا وہ خواب کیسے پورا ہوگا جس کی تعبیر حاصل کرنا کسی ایک فرد یا ایک طبقے کا نہیں، ساری قوم کا فرض ہے۔

حکومت اور عوام کے اس مسئلے کا ایک پہلو اور بھی ہے جس کی وضاحت بے حد ضروری ہے۔ دنیا کے تمام عوام اور حکومتوں میں ایک نوع کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ حکومتیں عام طور پر غیر جذباتی ہوتی ہیں اور عوام بے حد جذباتی۔ اگر عوام جذباتی نہ ہوں تو قوم کی تاریخی، تہذیبی، تمدنی اور تخلیقی اساسیں تباہ ہو کر رہ جائیں اور قومی زندگی کی وہ روح فعال اور روحیتِ جامعہ فنا ہو جائے جس سے کوئی قوم اپنی زندگی کے لیے قوّت وحرارت کا اکتساب کرتی ہے۔ حکومت اور عوام کے اس ذہنی اختلاف پر قابو پانا ہی کسی قوم سے ایک خاص حکمتِ عملی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور ایک دوسرے کو اس کے مناسبِ حال رعایتیں دیں۔ ہمارے یہاں شروع ہی سے اس تعامل اور مراعات کی کمی رہی ہے۔ اس لیے طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں، ہمیں ایک دوسرے کو اس کے حال پر نہیں چھوڑ دینا، ایسا کرنا ملک کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی ہے۔

ہم نہیں جانتے کہ ہم نے جو کچھ سوچا اور کہا ہے وہ غلط ہے یا صحیح لیکن بہ ہر حال ہماری کوشش اور خواہش یہی ہے کہ قومی معاملات اور مسائل کے سلسلے میں ہم پر سوچنے اور لکھنے کی

جو ذمّے داری عائد ہوتی ہے اسے کسی نہ کسی طرح ادا کرتے رہیں۔ یہی ہمارا کام ہے اور یہی ہمارا انعام' انشا کے صفحات ہماری اس بات کے شاہد ہیں یا نہیں؟ اس کا فیصلہ معزز قارئین ہی کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ہم نے صحیح راستوں کی تلاش میں غلط راستے طے کیے ہوں' اگر ایسا ہے تو قارئین کا فرض ہے کہ وہ ہمیں سختی سے متنبہ کریں۔ یہ نئے سال کا پہلا شمارہ ہے' ہم اس شمارے میں پھر اپنے عہد کی تجدید کرتے ہیں۔ وہ عہد' قوم کی تحریری خدمت' حقیر خدمت اور انسانیت کی شریف اقدار کے ابلاغ کا عہد ہے بل کہ یہ بات ہماری حقیر حیثیت سے بہت زیادہ ہے' ہمیں تو مقامِ عہد میں صرف اس قدر کہنے کی جرأت کرنا چاہیے کہ ہم اس باب میں اپنی حقیر کوششوں سے دریغ نہ کریں گے۔ آپ کو سالِ نو مبارک ہو!

انشا' جنوری 1962

فی سبیل اللہ فساد

نعرے جنھوں نے پاکستان کو اضحوکۂ روزگار بنا رکھا تھا' آخر کار پھر زندہ ہو گئے' وہ نفرتیں جنھوں نے معاشرے کو سماجی اور سیاسی جاں کنی میں مبتلا کیا تھا پھر جاگ اُٹھیں۔ خیال تھا کہ لوگوں کو اب ہوش آ گیا ہوگا اور وہ ان فتنہ انگیز اور تباہ کن باتوں کا اعادہ نہیں کریں گے جو پہلے ہی کافی نقصان پہنچا چکی ہیں۔ سمجھا گیا تھا کہ قوم پوری ہوش مندی کے ساتھ حقیقی مسائل اور بنیادی اُمور کو توجہ کا مرکز بنائے گی۔ کہا جاتا تھا کہ مارشل لا کے دور میں اس پراگندہ خاطر سماج کو یک سوئی کے ساتھ سوچنے کا موقع ملا ہے اور لوگ گزشتہ تجربوں کی روشنی میں اس نتیجے تک پہنچ چکے ہیں کہ نعرے بازی سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ مذہب کے نام کو بے ضرورت استعمال کر کے ملک کی کوئی خدمت انجام نہیں دی جاسکتی۔ لیکن ہوا کیا......؟ ہوا یہ کہ مارشل لا کے ہٹتے ہی مفتیانِ دینِ متین آستینیں چڑھا کر میدان میں آ گئے اور وہی باتیں دہرائی جانے لگیں جنھوں نے اس فلاکت زدہ قوم کو ساری دنیا میں رُسوا کیا ہے۔

آپ حالات سے کب تک آنکھ مچولی کھیلتے رہیں گے؟ زندگی کو کب تک ایک غیر سنجیدہ اور بے ہودہ مذاق خیال کیا جائے گا؟ آپ تاریخ کی کوئی ناز پروردہ نسل ہر گز نہیں ہیں۔ سُنتا چاہیے کہ حقائق و حادثات کی اس سیل گاہ میں ناز اور نخروں سے کام نہیں چلے گا۔ رات اور دن اس کام پر مامور نہیں ہیں کہ آپ کے سونے اور جاگنے کا انتظار کیا کریں۔ تاریخ کے جاوداں جولاں قافلوں سے آپ کا یہ معاہدہ کب ہوا تھا کہ وہ آپ کے اُٹھنے تک ٹھہرے رہیں گے۔ زمان کی قاہر و قیوم مشیت کے مقابل چند منکوب و مضروب مدعیوں کی

یہ شوخ چشمی آخر کب تک جاری رہے گی اور اگر یہی ہے تو پھر وہ وقت بھی قریب ہے جب تمھاری نشستیں ہلاکتوں کی کاٹھیوں پر درست کی جائیں گی اور تمھارے سارے واجبات پورے کر دیے جائیں گے کہ تم وہ گروہ ہو جس نے ہمیشہ ناموسِ روزگار کو جھٹلایا اور کبریائے ایام سے ٹھٹول کیا۔ قومیں تمھارے بارے میں سُنتی ہیں اور ہنستی ہیں۔ تہذیب کی بارگاہ کے مسند نشینوں اور مقربوں نے اپنی محفل کے لیے مسخروں کا انتخاب کر لیا ہے اور تمھیں مژدہ ہو کہ وہ مسخرے تم ہو۔

ان میں سے بعض نے ماضی کے مزبلوں کی دلّالی کو اپنا پیشہ بنایا ہے اور تہذیب کی شاہراہوں پر بطورِ نمونہ غلاظتیں بکھیرتے پھرتے ہیں۔ یہ ہے ان کی متاع اور یہ ہے ان کا کاروبار۔ ان کے ساتھ مشرق کے وہ زرّیں سلسلے بھی بدنام ہوتے ہیں جن کے فکری اور معنوی مورثوں نے دلیل و دانش کے سرنامے لکھے تھے اور جنھیں دبستانِ فرہنگ و فراست کا معلّمِ ثانی کہا گیا تھا۔ کون ہے جو جامعۂ مشرق کے ان داعیوں اور مدعیوں اور شاہدوں اور شُہدوں میں تمیز کرے اور ایک کی تہمت دوسرے کو نہ لگائے۔ مشکل یہ ہے کہ تاریخ کے ان عادلوں اور عدولوں نے ایک ہی اونٹنی کا دودھ پیا ہے اور انھیں ایک ہی خیمہ گاہ پر آواز دی جاتی ہے۔ مگر اب وقت آ گیا ہے کہ حصارِ تہذیب کے دیدبانوں اور نقب زنوں میں پوری طرح فرق قائم کیا جائے۔ وہ جو ماضی کے بڑے قوی حافظ نساب ہیں کیا انھوں نے کبھی سوچا ہے کہ ماضی میں ان کی کیا سرگرمیاں رہی ہیں مگر مت کہو اور مت کہلواؤ وہ باتیں جن سے تاریخ کے زخم تازہ ہوتے ہیں۔ جن سے نفرت و ہلاکت کا زہر ٹپکتا ہے۔ پاکستان اس لیے نہیں حاصل کیا گیا کہ یہاں ماضی کی گلی سڑی ہڈیوں کا سفوف تیار کرنے کے لیے ایک کارخانہ قائم کیا جائے گا' نہ یہ کوئی ایسا میدان ہے جہاں لوگ اُلٹے پاؤں دوڑنے کی مشق کرنے کے لیے جمع کیے گئے ہوں۔

قومیں اپنے اپنے راستوں پر دُور تک آگے بڑھ چکی ہیں اور ہم ہیں کہ وقت کے ٹیلوں پر کھڑے یہ دعا کر رہے ہیں کہ یا تو تہذیب و تمدن کے یہ بڑھتے ہوئے قافلے راستے میں کہیں لُٹ جائیں یا پیچھے لوٹ آئیں۔ ہمارے ذہنوں اور ہماری ذہنیتوں نے بھی کتنا

دل چسپ مشغلہ اختیار کیا ہے۔ زندگی میں اس اندازِ نظر کی تباہ کاریوں سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ قوم کے وجود میں زندگی کی آگ بجھتی چلی جا رہی ہے۔ یہاں ہر اُس بات کی مخالفت کی جاتی ہے جس سے انسانی مسرتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک جماعت کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ ہم ناخن بڑھائیں اور جسم پر پتّے لپیٹ کر جانوروں بل کہ انسانوں کو شکار کرتے پھریں۔ انسانی معاشرے کی ترقی اور خوش حالی کے خلاف یہاں ہر وہ بات کہی جا رہی ہے جو کہی جا سکتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تہذیب اور انسانیت کو خودکشی کر لینا چاہیے۔ آج بعض حضرات نے عورتوں کے سماجی اور انسانی حقوق کو پامال کرنا ہی اپنا سب سے مقدّس فرض خیال کر لیا ہے۔ عائلی قوانین کو منسوخ کرانے کی یہ مہم عبادت کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ چار نکاحوں کی خاطر نفوسِ قدسیہ کا یہ جہاد کیا اس عہد میں کسی طرح بھی قابلِ فہم ہے۔ کیا کوئی مہذب انسان سوچ بھی سکتا تھا کہ اس عہد میں بھی یہ باتیں کی اور کہی جا سکتی ہیں۔ قومی اسمبلی کے ایک رکن نے جو مفتی ہیں فرمایا ہے کہ ''اگر نکاح پر پابندیاں لگائی گئیں تو حرام کاری میں اضافہ ہوگا''۔ ظاہر ہے کہ یہ اضافہ فرزندانِ ملّت ہی کی کارکردگی کا نتیجہ ہوگا کہ انھیں سے بیک وقت چار شادیوں کا حق چھینا جا رہا ہے۔ یوں سمجھیے کہ مفتی صاحب نے یہ دھمکی دی ہے کہ اگر ہم سے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا حق چھینا گیا تو ہم احتجاجاً وسیع پیمانے پر حرام کاری شروع کر دیں گے۔ پوچھنا یہ ہے کہ کیا عائلی قوانین کے نفاذ سے پہلے حرام کاری مفقود تھی۔ ہمارے خیال میں پاکستان کے ماہرینِ مذہب اور ذمّے دار مولوی، رکنِ اسمبلی کے اس قول سے اپنے آپ کو بری الذّمہ قرار دیں گے۔ اس لیے کہ وہ حرام کاری سے متعلق قوانین سے قبل کی تفصیلات کا ہم سے اور آپ سے کہیں زیادہ علم رکھتے ہیں کہ بہ ہر حال ان مسائل کے مالہ اور ماعلیہ پر حاوی ان کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ کیا وہ اس حقیقت کو فراموش اور اس حرکت شنیعہ کو معاف کر سکتے ہیں کہ چودہ سو سال کی مدت میں اسلام کو بدنام کرنے والے کتنے ہی بدبخت افراد چار بیویوں اور متعدد کنیزوں کے ہوتے ہوئے حرام کاری سے باز نہیں آئے اور یہ کاروبار پورے اہتمام سے چلتا رہا۔

ایک صاحب نے فرمایا ہے کہ اسلامی ممالک میں ناجائز نسل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ بہ ہر حال یہ عمر اور یہ کچّی کچّی باتیں کچھ اچھی نہیں لگتیں۔ ہمیں یہاں ایک اور بات بھی کہنا ہے وہ یہ کہ اسلام اور مسلمان دو ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ الفاظ کو ہمیشہ احتیاط سے استعمال کرنا چاہیے۔ بہ ہر حال جن بزرگ نے یہ انکشاف فرمایا ہے وہ شاید کسی دوسرے سیّارے سے تعلق رکھتے ہیں اور اگر اسی کرّے کو اُن کی جنم بھومی ہونے کا شرف حاصل ہے تو وہ یقیناً ہوش وحواس سے منزّہ ہیں۔ کیا اسلامی ممالک میں ناجائز نسل کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا......؟ اسلام کو بے وجہ خطرے میں ڈالنا کوئی ثواب نہیں۔ مسلمان ممالک کہیے! مسلمان ممالک میں تو اس نسل کا ایسا سوال پیدا ہوتا ہے جس کا کوئی جواب ہی نہیں۔ آپ مسلمان معاشرے کو اس ذمّے داری سے کسی طرح نہیں بچا سکتے۔ کیا مسلمان معاشرے نے پہلی صدی ہجری ہی میں ایک ناجائز مگر شہرۂ آفاق مولود کو اسلامی ولایتوں کا والی اور عامل بنا کر سندِ توثیق عطا نہیں کی۔ اسے کبارِ اُمّت کی جانوں کا مالک نہیں بنایا......؟ یہ بلند اقبال بچہ، یہ عظیم الشان مولود جو ولاۃِ عرب میں شامل ہے جسے تاریخِ اسلام میں زیادؓ ابنِ ابیہ کے افسانہ خیز اور داستان انگیز نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا حضرت زیادؓ ابنِ ابیہ اسلامی ممالک کے باشندے تھے یا یورپ کے؟ اور ہاں یہ بھی فرمایئے کہ مدینۂ منورہ اسلامی ممالک میں واقع ہے یا اسلامی ممالک کے باہر، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد کیجیے کہ واقعہ حرّہ کی تفصیلات کیا ہیں......؟ جب مسلمان مجاہدین نے مدینے پر چڑھائی کر کے عصمت دری کا بازار گرم کیا اور تب ایسا ہوا کہ اس سال کوئی باپ اپنی بیٹی کے کنوارپن کا دعویٰ نہ کر سکتا تھا۔ کیا یہاں مسلمان ممالک کے شبستانوں کی چہار صد سالہ تاریخ دہرانا ضروری ہے؟ بہتر یہ ہے کہ ان موضوعات کو آیندہ نہ چھیڑا جائے، یہ موضوعات جن میں فضیحتوں اور رُسوائیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

ہمارے مسائل یہ نہیں ہیں ان بحثوں کو اُٹھانا قوم کے ساتھ سب سے بڑی غدّاری ہے۔ یہ وہ بحثیں ہیں جن میں نہ تو جیت کر کوئی مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہار کر۔ مذہب کو بے ضرورت زیرِ بحث نہ لایئے، اپنے ماضی اور حال کے جواب وہ خود آپ ہیں۔ مسائل

آپ کے منتظر ہیں اور آپ ان سے منہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔ غربت و افلاس کے مسائل، جہالت کے مسائل، گروہی اور علاقائی تعصّبات کے مسائل، مغرب کی تہذیبی اور لسانی غلامی کے مسائل۔ آپ مشرقیت کے بہت بڑے علم بردار ہیں مگر آپ کو مغرب کے سیاسی اور سماجی استعمار اور پاکستان میں انگریزی زبان کے اشتعال انگیز اقتدار پر کبھی غصہ نہیں آتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج آپ کی اپنی مذہبی منطق پاکستان کی تہذیبی اور قومی اقدار کے تحفّظ کے بجائے سامراجی قوّتوں کو تقویت پہنچا رہی ہے۔ آپ کا فرض تھا کہ آپ پاکستان کے قومی محاذ پر اس غلامانہ ذہنیت کے خلاف جنگ کرتے جو مشرق میں مغرب کی دلّالی کرتی ہے اور جس نے زوال آمادہ اور انسانیت دشمن یورپ کے سیاسی شارعین اور متشرعین کو اپنا خداوند ٹھہرایا ہے لیکن آپ نے نظریۂ پاکستان کو قبول ہی کب کیا تھا جو آج اس کے مسائل سے خلوص برتیں۔ آپ کو پاکستان پر شاید کبھی رحم نہیں آئے گا۔ مگر آپ اپنے اُوپر تو رحم کیجیے۔ اگر پاکستان بے وقار اور تباہ حال ہوگا تو آپ بھی بے وقار اور تباہ حال ہوں گے۔ کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ حکومتِ پاکستان کے قانون میں تحریکِ جہاد کے لیے بھی ایک دفعہ شامل ہونا چاہیے۔ واضح رہے کہ اعلائے کلمۂ حق کے لیے سب سے پہلے ملحد روس اور مشرک امریکا ہی کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا جائے گا۔ چناں چہ ایک وفد خروشیف اور ایک کینیڈی سے ملے گا اور کہے گا کہ:

یا تو اسلام قبول کرو!

یا جزیہ دو!

نہیں تو ہم سے جنگ کرو......

اس نقطے پر پہنچ کر ہم قارئین سے معذرت چاہتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ ہم مزید گفت گو کرنے کی نہ استعداد رکھتے ہیں اور نہ استطاعت۔ سچ ہے پاکستان بڑا مشکل اور بڑا ہی مظلوم ملک ہے۔

انشا اگست 1962

وقت کے دوام میں

"حین ترجیت الخیر جاء الشرو انتظرت النور فجاء الدجی' امعائی تغلی ولاتکف' تقدمتنی ایام المذلة' اسوددت لکن بلا شمس' قُمْت فی الجماعة اصرخ' صرت اخاللذئاب وصاحباً لریال النعام' حرش جلدی علّی وعظامی احترقت من الحرارة' وصارَعودی للنوح ومن مزماری خرجت صوت الباکین."

"جب میں بھلائی کا اُمیدوار تھا تو بُرائی پیش آئی اور جب میں نے روشنی کا انتظار کیا تو اندھیرا آ پہنچا۔ میری انتڑیاں اُبل رہی ہیں اور چین نہیں پاتیں۔ مجھے ذلّت کے دنوں نے آلیا ہے۔ میں دھوپ کے بغیر کالا پڑ گیا ہوں۔ میں جماعت کے درمیان کھڑا چیختا ہوں۔ میں گیدڑوں کا بھائی اور شتر مرغوں کا ساتھی ٹھہرا ہوں، میری کھال کُھرچ ڈالی گئی اور میری ہڈیاں حرارت سے جَل گئیں۔ میرے ستار سے نوحہ گروں کی فریاد اور میری بانسری سے رونے والوں کی آواز نکلتی ہے۔"

یہ ماحول کے حسّاس وجود کا نوحہ ہے۔ اس عذاب نے ہماری نصف زندگی کو جَلا کر راکھ کر دیا اور پھر یہ راکھ ہمیں لباس کی طرح پہنا دی گئی۔ ایک غیر مختصر مدّت سے ذہن اُداس اور سینے ویران ہیں۔ جنھوں نے آرزوؤں اور اُمیدوں کے ذخیرے اکٹھے کیے تھے ان کے پاس کیا رہا؟ یہ آزمایش ان لوگوں کے سروں پر ٹوٹی ہے جو سوچنے والے اور سمجھنے والے ہیں۔ اُمنگوں کے قحط اور محرومیوں کی گرم بازاری نے حوصلہ مندی کی کمر توڑ دی ہے اور ہوا یہ کہ روحیں اپنے وطن میں غریب الوطن ہو گئیں۔ تلخ کامی اور تلخ کلامی کی صدیاں

گزارنے کے بعد بھی انھیں ایلوا چٹایا گیا۔ ایسا ہے کہ ہم لوگ اندھیروں کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہیں اور اندھیروں میں گھسیٹے جا رہے ہیں۔ اس فضا میں زندگی اپنے بازو نہیں پھیلاتی۔ میں اپنے گرد و پیش نظر ڈالتا ہوں تو وہاں تہذیب کے مبروصوں اور معاشرت کے جذامیوں کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا۔ ان کی نیتوں کو اہانت انگیز روگ لگ گئے ہیں اور میں سوچنے والا، محسوس کرنے والا اور لکھنے والا شہر کا ایک شہری ان میں سے ایک ہوں۔ ہم سب شارعِ عام کے ایک جانب مسکنتِ خذلان کے چبوترے پر بیٹھے ہیں۔ میں ندامت سوچنے، خسارت محسوس کرنے اور ملامت لکھنے کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں۔ کیا ایسوں کے لیے مناسب نہ ہوگا کہ وہ محسوس کرنا، سوچنا اور لکھنا ہی چھوڑ دیں۔ یہ اچھا ہے۔ یہ اس سے اچھا ہے کہ محسوس کیا جائے اور بطلان محسوس کیا جائے، سوچا جائے اور بطلان سوچا جائے، لکھا جائے اور بطلان لکھا جائے اور یہی ہوا بھی، ان کی ساری باتیں اور کہاوتیں محض جھوٹ کا طومار ہیں۔

جب سعادت اور خوش حالی کی قسمتیں بانٹی گئیں تو جہالت، بے حسی اور خودغرضی نے دہرا حصہ پایا اور احساس و شعور کو ان کی محرومی کے گوشوارے تیار کرنے کی خدمت سپرد کی گئی۔ یہ عمر بھر کا کام تھا جو اُن کے لیے چُنا گیا تھا اور اس خسارے کی تلافی حشر کے دن ہونے والی تھی۔ اُمیدوں کے بہت سے مذہب اور بہت سے مسلک ہیں سو ہم نے مدتوں ان راتوں میں اپنے بستر درست کیے جن کی شامیں بھی ابھی نہ سنولائی تھیں اور ان صبحوں میں بیداری کے گہرے گہرے سانس لیے جن کی راتیں بھی نہ بھیگنے پائی تھیں۔ اتحاد و اتفاق نے اپنے لیے ایک حصار بنایا تھا۔ تفرقے جاگے اور انھوں نے اپنے اپنے مورچے سنبھال لیے۔ یہ ہے ان بستیوں کا تاریخ نامہ، اب کون کہے گا کون کہہ سکے گا کہ یہ ایک قوم ہے، یہاں کے نوجوان بزرگ، حاکم اور شہری کسی ایک اصل اور ایک سرچشمے کے وارث ہیں۔ یہ تو ایک بھیڑ ہے، مکھیّوں کے ڈنگاروں سے بھی زیادہ حقیر اور لئیم، انھیں قرنوں کی درس گاہوں میں ایک درس دیا جاتا رہا، خدا کو یاد رکھو اور انسان کو بھول جاؤ، ان درس گاہوں میں اقتدار کو دلیل اور قوّت کو برہان کے طور پر پیش کیا گیا۔ چاہا گیا کہ عقل کو عقیدوں کا محکوم

بنا کر رکھا جائے۔ اس فرض کی بجا آوری نے محضر تیار کیے اور مقتلوں کا حق ادا کیا۔ استغاثہ اور احتجاج کرنے والے ہر دور میں اپنے فریضے پورے کرتے رہے وہ آج بھی اپنا خون جلا رہے ہیں اپنے گلے خشک کر رہے ہیں مگر ان کی رائے ہی کیا جن کی باتیں سُنی نہ جائیں۔ پس، جو ہوا ہے اگر وہ نہ ہوتا تو آخر اور کیا ہوتا۔ جو بویا گیا تھا وہی کاٹا جا رہا ہے۔ پھر یہ حیرت کیوں ہے؟

ہم سب کو دوبارہ پیدا ہونا چاہیے۔ ہمارے وجود کی سرنوشت یک سر قابلِ تنسیخ ہے۔ ہر پہلو اور ہر پہلو سے دیکھ لیا گیا اور نتیجے میں جھنجلاہٹ کے سوا اور کچھ بھی نہ پایا گیا۔ آخر کار وہ سب کچھ ماننا پڑے گا جس سے انکار کیا جا رہا ہے اور یہ ہمارا میلادِ ثانی ہوگا، وہ صرف مستقبل ہے جو انسانیت کے لیے اسمِ اعظم کا حکم رکھتا ہے، ہم نے آج تک ماضی کے نفوس اور نفوذ سے تمسک کیا اور اس کا بھگتان بھگتا، کیا یہ لوگ اب بھی مستقبل سے منہ موڑے رہیں گے۔ مگر مستقبل نے افراد کی سفارش کبھی نہیں سُنی، اس نے قوموں سے ہمیشہ اقدار کے حوالے طلب کیے ہیں۔ جہاں افراد کو اقدار کا بدل سمجھا جائے ان آبادیوں سے مستقبل کی سفارتیں اور رسالتیں بھی نہیں گزرتیں۔ اگر اقدار کا محکمۂ قضا انسانوں کے لیے مرگ و ہلاکت کا فیصلہ صادر کرے تو انھیں اطاعت میں گردنیں جُھکا دینی چاہییں۔ اقدار کی تجویز کی ہوئی موت افراد کی بخشی ہوئی زندگی سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ ان اقدار میں سب سے بڑی قدر خود زندگی ہے۔ ہوا یہ کہ ہم نے اقدار کا دامن چھوڑ دیا۔ اس کا ڈنڈ یہ ہے کہ ہم اِدھر اُدھر بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں اور ایک دوسرے پر اپنا بوجھ ڈال رہے ہیں۔ تاریخ کے بہاؤ سے انکار کرنے والوں کا نصیب ہلاکت ہے چاہے اس کے خوشے آج توڑے جائیں، چاہے کل۔

انشا، اکتوبر 1962

(یہی انشائیہ 'سسپنس' فروری 2002 میں ''ہلاکت نصیب'' کے عنوان سے شائع ہوا)

مالی اراکم

مالی اراکم اشباحاً بلا ارواح وارواحاً بلااشباح...... و تجاراً بلا ارباح وایقاضا نوما و شهودا غیباو ناظرةً عمیاء وسامعة صماء وناطقة بکماء. رَایت ضلالة قد قامت علی قطبها وتفرقت بشعبرواتکیلکم بصاعرها وتخبطکم بیاعها...... این تذهب بکم المذاهب وتتیه بکم الغیاهب و تخدعکم الکواذب ومن این تؤتون وانی تؤفکون.

''کیا ہے کہ میں تمھیں دیکھتا ہوں کہ تم اجسام ہو بے ارواح اور ارواح ہو بے اجسام...... تاجر فائدوں کے بغیر' جاگ رہے ہومگر سو رہے ہو' حاضر ہومگر غائب ہو' دیکھ رہے ہومگر اندھے ہو' سن رہے ہومگر بہرے ہو' بول رہے ہومگر گونگے ہو' میں نے دیکھا کہ گم کردہ راہی اپنے مقام پر قائم ہوگئی ہے اور اس نے اپنی شاخیں پھیلا دی ہیں۔ وہ تمھیں اپنے پیمانے سے ناپ رہی ہے اور اپنے ہاتھوں سے اِدھر اُدھر بھٹکا رہی ہے...... راستے تمھیں کہاں لیے جا رہے ہیں اور اندھیاریاں تمھیں کہاں گھما رہی ہیں۔ جھوٹے سہارے تمھیں فریب دے رہے ہیں' کہاں سے لائے جاتے ہو اور کہاں پلٹائے جاتے ہو''۔

بولیں یا چُپ رہیں......؟ جنھوں نے اپنی زندگی دوسروں کی خاطر تلخ کر لی۔ وہ سوچتے ہیں کہ بولیں یا چُپ رہیں۔ اس لیے کہ ساتھ رہنے میں کینہ ہے اور لفظوں کو چھیلنے اور کھرچنے والے بے رحم ہیں اور اس لیے کہ لفظ خیالوں کا حق مار لیتے ہیں۔ ہے یہی کہ چُپ

رہنے میں سینے کی استراحت ہے اور بولنا مشقت۔ پر ایسا ہے کہ انسانوں میں سے بعض انسانوں کے لیے ایک عذاب مقرر ہوا ہے۔ دلوں میں بھڑکتا' ذہنوں میں دہکتا اور زبانوں پر آنچ دیتا ہے۔ ہمیں دل جلانے' سینہ دُکھانے اور سانس پگھلانے کا کون سا انعام ملا جو ہم چُپ نہیں رہ سکتے۔ کسی نے کہا کہ جب میں بولنے کی جاں کنی سے نڈھال ہو جاتا ہوں اور میرے سینے میں چبھنے والی چنگاریوں کی دُھول اُڑنے لگتی ہے۔ جب میری رگیں سوکھ جاتی ہیں اور سانسوں سے میرا گلا چھلنے لگتا ہے تو رگوں کے حلق میں پانی کے پیالے اُنڈیلنے لگتا ہوں جیسے پھیپھڑے کی خراشیں پانی سے دُھل جائیں گی۔ ہم اپنی سوکھی ہوئی رگوں کے تڑختے ہوئے ہونٹھوں کے لیے جب کچھ تری چاہتے ہیں تو اپنا ہی خون پیتے ہیں۔ میرے اندر نہ جانے یہ کون ہے جو کسی دردناک اذیت میں مبتلا ہے اور جو بے قابو ہو کر چیخنے لگتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جیسے یہ میری ہی آواز ہے۔

جو چُپ ہیں ان کی زبانیں سَڑ جائیں گی اور ان کے منہ سے عفونت کی بھاپ نکلے گی اور جو دیکھتے ہیں اور نہیں دیکھتے نابینائی ان کے پپوٹے چاٹ جائے گی۔ وہ سب زندگی کی آزمائش گاہ میں کھڑے کر دیے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جنھیں جواب دہی کے موقف میں آنا ہے مگر وہ جواب دہی کے جھکا دینے والے بوجھ سے ابھی تک ان جان ہیں۔ جو باقی رہے انھیں کچھ پوچھنا ہے ان کے سوالوں کی گرفت توڑ دینے والی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ہم سب تماشائی ہیں اور یہ بستیاں تماشا گاہ' ان سے کہا گیا تھا کہ تم ایک قوم ہو اور یہ زمین ان کی وعدہ گاہ قرار پائی تھی۔ پس اُٹھ کھڑے ہو اور وہ سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اب جنھوں نے ان میں انتشار ڈالا ہے کیا ان میں انتشار نہ ڈالا جائے گا؟ جو اپنی سینوں کی گہرائیوں سے نعرے بلند کیا کرتے تھے' وہ اب کراہتے ہیں' ان کے ساتھ یہ ٹھٹول کس نے کیا ہے؟ کچھ لوگ ہیں اور یہ لوگ نہ جانے کیا ہیں' نہ ان کی زبانیں ان کے قابو میں ہیں نہ انھیں بات کرنے کا اوسان ہے۔

درمیان والوں نے داہنے اور بائیں دونوں کو بہکایا' یہ درمیان والے کون ہیں؟ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو حریت طلبی کی رست خیز میں دشمنوں کا دل بڑھا رہے تھے۔ تاریخ

کے مجرموں کی جوتیاں سیدھی کرنے والے اب امر وقدر کے مقدس میں جا کھڑے ہوئے ہیں اور آنے والوں سے کہا جارہا ہے کہ جوتے اُتار کر آئیں۔ ان ناکسوں کا وجود ہمارے بدن کا کوڑھ ہے۔ یہ جماعت کا بد گوشت ہیں۔ کاش یہ پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے اور اگر پیدا ہوئے تھے تو ایسا ہوتا کہ ہم ان کے نام بھی نہ جانتے۔ سڑے ہوئے لوگ جن کے ناموں کی عفونت سے بستیوں میں گھناؤنی بیماریاں پھیل گئی ہیں۔

ماضی کا ورثہ بانٹا گیا تو انھوں نے اپنی شناعتوں کو دوبارہ چُنا' شناعتیں سوچتی ہیں اور مکر سوچتی ہیں۔ شناعتیں بولتی ہیں اور مکر بولتی ہیں وہ اِدھر بھی ورغلاتی ہیں اور اُدھر بھی۔ یہ ملک اپنے غدّاروں کی پناہ گاہ ہے۔ یہاں کی فصلوں کا حاصل اپنے بدخواہوں کا ہدیہ ٹھہرا ہے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو اَب بھی یہ سوچتے ہیں کہ یہ بچّہ جنا ہی کیوں گیا۔ یہی تھے جنھوں نے پہلے یہ کہا تھا کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کے گمان میں تاریخ کی سب مائیں اس مولود کے حق میں بانجھ تھیں۔ اور وہ بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اس بچے کے تعویذ بس انھیں کی خاطر مشقت بھرنے کے لیے اُتارے گئے ہیں۔ تم پر افسوس ہے کہ تمھارا دودھ بڑھایا گیا تو ان ارادوں کے ساتھ کہ تم اپنے پہلے میلاد کے بعد دوسرے میلاد کی غلامی کے لیے دے دیے جاؤ!

شہرو! تمھارے نمک حرام بڑے سینہ زور ہیں۔ غدّاروں نے اپنے نام تک نہیں بدلے' وہ اپنی غدّاریوں کے قبالے شیشوں میں سجا کر رکھتے ہیں۔ یوں ہی تو خوددار اور حسّاس دلوں میں آگ بھڑکتی ہے اور لہجے جھنجلا اُٹھتے ہیں۔ اس ملّت کے محترم باپ نے کہا تھا کہ یہ ملک چند اسیروں کے لیے نہیں' کروڑوں غریبوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ لٹیرے چلے گئے اور اپنے غیر منہضم فضلے کا غلیظ انبار ہمارے شہروں میں بکھیر گئے' جن میں گنڈاریں کلبلا رہی ہیں۔ یہ عفونت اور غلاظت کی خبیث نسل اس قوم کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکا ہے۔

ہٹ دھرمی کو بڑی رعایت دی گئی' چوروں کے شریک چور اور غاصبوں کے شریک غاصب ہیں' جو لوگ آزادی سے پہلے سامراجیوں کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے تھے وہ مجرم ہیں اور جنھوں نے ان کا ساتھ دیا وہ قاتل۔ اگر یہ مجرم اور قاتل موجود نہ ہوتے تو پھر تم دیکھتے کہ گلیاں کتنی مہربان ہیں اور بازار کتنے بارونق' ہم نے یہی کہا اور یہی کہتے رہیں گے۔

حالات بدلیں تو انھیں یک سر بدلنا چاہیے۔

کیا چاہا تھا اور کیا ہوا' عظمت لکھی گئی تھی اور حقارت پڑھی گئی' ابھی کان میں ایک آواز آئی ہے۔ یہ مرحوم لیاقت علی کی آواز ہے جو ان کی یاد میں شہر کی نشر گاہ سے نشر کی جا رہی ہے۔ آج ہی کے دن اس آواز کو بڑی احتیاط اور حفاظت سے قتل کر ڈالا گیا تھا' آواز آ رہی ہے۔

''جس طرح یہ مملکت عالمِ وجود میں آئی اس کی مثال دنیا نہیں پیش کر سکتی''۔

یہ مملکت کس طرح عالمِ وجود میں آئی؟ اسے کون عالمِ وجود میں لایا؟ یہ سب کچھ بُھلا دیا گیا ہے' اب تو یہاں ہر بات جھٹلائی جانے لگی ہے۔ اب مستقبل کے لیے محض جھوٹی معلومات مہیا کی جائے گی۔ شاہراہوں پر گھسٹنے والے اس مطعون ہجوم کے سوا کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اس مملکت کو عالمِ وجود میں لانے والے ہم ہیں۔ ہاں کچھ خاص لوگ بھی تھے جو مر گئے' کیا یہ وہی ہجوم نہیں ہے' جس کی صفیں نعرے بلند کرتی ہوئی شاہراہوں پر اُمنڈا کرتی تھیں۔ یہ آج بھی وہی ہیں مگر جو انھیں پہچانتے تھے جن کو یہ جانتے تھے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور یہ ایک کڑوی سچائی ہے کہ جو اَب ہیں وہ ایک دوسرے کو نہیں جانتے' کھینچنے والے ہمیں سے کہتے ہیں کہ سطر ٹیڑھی کھنچی ہے' سُنو اور سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ۔

شعور اپنے مرحلوں پر پکار رہا ہے اور دانش راستوں میں آواز دے رہی ہے۔ پر گزرنے والوں نے تو نہ سُننے کی ٹھان لی ہے۔ دانش مند ہر شہر میں کم ہوتے ہیں پر ہمارے شہروں میں تو بہت ہی کم ہیں۔ یہ سب نہ جانے کیوں ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا' دوسرے کے بعد تیسرا اور پھر دوسرے' بھلا پہلے ہی نے کون سا مژدہ سنایا تھا جو یہ کوئی بشارت دیں گے۔ کسی شے یا کسی شخص کا صرف ہونا اس کا نہ ہونا ہے۔ ہمارے ہونے سے کیا ہوا' ہم ہیں مگر صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم نہیں ہیں۔ ہمارا ہجوم اپنی ناپیدی کا جلوس ہے۔ اتنے دن ہو گئے مگر ابھی تک ان سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا نہیں آیا۔ یہ لوگ دل جمی کے ساتھ رینگ رہے ہیں' جو رینگ رہے ہیں وہ روندے جائیں گے اور سینے کے بَل گھسٹنے والوں کو تاریخ کی دَوادَوِش میں رگیدا جائے گا۔ بولنے کا الزام نہ بولنے کے الزام سے اچھا ہے اور

ہم نے اسے قبول کیا۔ جو بولتا ہے وہ کائنات کو کچھ نہ کچھ بدل ڈالتا ہے جنھوں نے اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیا وہ بس اپنے ہی لیے زندہ ہیں۔ افلاس جسم کی اور جہالت روح کی فاقہ کشی ہے یہ گروہ جسم و روح کی فاقہ کشی میں مبتلا ہے۔ ان کے درمیان کچھ انسان نما جانور ہیں جنھیں ان کے جسموں کی بدہضمی سے پہچانا جاتا ہے۔ جو دوسروں کا خون چُوستے ہیں' وہ نچوڑے جائیں گے' جو زندگی کی جدلیت اور اس کے جلال کے پھاٹکوں میں اَڑنگا بنے کھڑے ہیں وہ توڑے جائیں گے۔ سُنو اور سمجھو' تم سے جو کہا گیا اسی کو ماننے میں عافیت ہے۔ عوام اور ملک کے وفادار بن جاؤ اور قوم کے سامنے اپنی وفاداری کا حساب پیش کرو۔ افرادقوم کے سامنے جواب دہ ہیں اور قوم تاریخ کے سامنے' جو اس میں تحریف کرے گا وہ رُسوا کیا جائے گا۔ اب اس خبر کو تمام دفتروں' محکموں اور محلوں میں پہنچا دیا جائے کہ پاکستان بن گیا ہے۔ ایسا ہے کہ بہت سوں نے ان ایاّم اور حالات سے اپنی وفاداریاں ابھی تک باقی رکھی ہیں جب پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا۔ تاریخ پڑھو اور بصیرت حاصل کرو' نہیں تو پھر تمھارے انجام سے عبرت حاصل کی جائے گی۔

انشا' نومبر 1962

تیرے دیوانے یہاں تک پہنچے

بستیاں سوالوں کے انبوہ میں گھری ہوئی ہیں، ساتھ ہی وہ مسئلے ہیں جن سے ساری دنیا دوچار ہے۔ ہر مسئلہ اپنے سے بڑے مسئلے کا حل چاہتا ہے اور یہ دائرہ پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔ اگر ہماری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی نہیں ہے، زبان گُل نہیں گئی ہے اور عقل کو جنون نہیں ہوگیا ہے تو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم زندگی کی ان تیز وتُند حقیقتوں سے بھاگ کر اپنے اندر پناہ لینا چاہیں، مسئلوں کے اس ہجوم میں انسانیت کے کھوے چھل گئے ہیں۔ تم ذرا دیکھو تو انسانیت کی جواں ہمتی پر کس قدر بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ پر انسانیت کا یہ قافلہ افتاں و خیزاں برابر آگے بڑھ رہا ہے۔ جاننے، نہ جاننے اور سب کچھ جان کر ان جان بننے کے درمیان ایک جنگ ہے جو صدیوں سے جاری ہے۔ آج بھی سچائی کو جھٹلایا جاتا ہے، پر ایسا ہے کہ لہجے کی کھوٹ اور کپٹ اب چھپائے نہیں چھپتی۔ انسان کی تمام بدبختیوں نے نادانی اور ناحق کوشی کی کوکھ سے جنم لیا ہے، جھگڑا بس یہ ہے کہ بعض مسخرے اس کرۂ ارض پر سر کے بل چلنا چاہتے ہیں۔ ہم نے انھیں ٹوکا اور برابر ٹوکتے رہیں گے، یہ ملکوں اور قوموں کا جھگڑا نہیں ہے، قدروں کا جھگڑا ہے۔

انسانیت ایک خاندان ہے، نہ اس میں کوئی امتیاز ہے اور نہ تفریق، جو تفریق پیدا کرتے ہیں وہ اس مقدّس خاندان میں شامل نہیں۔ لکھنے والوں اور بولنے والوں کا جتنا بھی مقدور ہو اس کے مطابق عالم گیر سماج کے قیام کی کوشش کرنا ان کا سب سے پہلا فرض ہے۔ یہ وہ مقصد ہے جو ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ جب ہم امریکا یا انگلستان کو بُرا کہتے ہیں تو وہاں کے شریف عوام اور دانش ور مراد نہیں ہوتے، وہ تو ہمارے خاندان کے محترم رکن ہیں۔

انسانیت دشمن چاہے پاکستان کے رہنے والوں یا امریکا اور انگلستان کے، وہ ہماری نفرت کے یکساں طور پر مستحق ہیں۔ دنیا میں صرف دو عقیدے پائے جاتے ہیں۔ انسانیت اور انسانیت دشمنی اور صرف دو قومیں رہتی ہیں، انسان اور انسان دشمن۔ یہ دنیا کے ہر حصّے میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ یہ شاید ایک اتفاق ہے کہ ہمیں ایک ایسے دور میں اپنے انسانی فرض کی بجا آوری کا موقع ملا ہے جب انسانیت کے دشمنوں نے مغرب کو اپنا مرکز قرار دیا ہے۔ اگر یہ مرکزیت مشرق کو حاصل ہو جائے تو پھر ہماری تمام سخت کلامیوں کا ہدف مشرق قرار پائے گا۔

پیشہ ور مجرموں کے اس عالمی جتھے سے خبردار رہو جو نہ مغرب کا دوست ہے اور نہ مشرق کا۔ تمھاری تمام مصیبتوں اور محرومیوں کے ذمے دار یہی لوگ ہیں۔ یہ اور ان کے ہوا خواہ انسانوں کو بہلانے اور بہکانے کے ہنر میں طاق ہیں۔ دیکھو، صرف اچھی باتوں ہی کو اپنا مداوا نہ سمجھو، صرف باتوں سے بدن پر گوشت نہیں چڑھتا۔ ان جھوٹے اور باتونی چارہ گروں کی باتوں میں نہ آنا، یہ تمھیں محض خوش آیند لفظوں پر قانع رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر زندہ رہنا ہے تو ایسی قناعت سے پناہ مانگو۔ اور ہاں، عالمی اُخوت کے جعلی نعروں کا فریب کبھی نہ کھانا، کچھ لوگ ہیں جو اِس باب میں بہت عجیب باتیں کرتے ہیں، یہ اپنے سرپرستوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ انھوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔

لو، انھیں پہچانو! یہ گروہ اپنے ذاتی عقیدے کو دوسروں پر مسلّط کرنا چاہتا ہے۔ انھیں اس کی کوئی فکر نہیں کہ ایک شخص فاقے کی آگ میں جل رہا ہے، انھیں تو صرف اس بات سے سروکار ہے کہ وہ ان کا عقیدہ تسلیم کرتا ہے یا نہیں۔ یہ حضرات زمین اور اس کے معاملوں سے بہت بلند ہیں۔ انھوں نے تو آسمانوں کو گویا پہن لیا ہے۔ ان کے مقدّس عقیدے کا نہ کوئی وطن ہے اور نہ کوئی زبان۔ یہ بستیوں کی اُمنگوں کو بُجھا دینا چاہتے ہیں۔ عالمی سماج کا نظریہ تمھیں وطن دشمنی اور اپنی تہذیب سے غدّاری کرنے کی تعلیم نہیں دیتا۔ مگر جس عالمی اُخوت کا نعرہ یہ لوگ بلند کرتے ہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ تم اپنی آزادی، استحکام، حبِّ وطن، سماجی سالمیت اور اپنی تخلیقی انا سے یک سر دست بردار ہو جاؤ، اچھا فرض کرو کہ ان کا

مطلب یہ نہیں ہے اور ہم بہتان تراشی سے کام لے رہے ہیں، پر یہ سوچو کہ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں اور تم اپنی زبان، تہذیب اور اپنے وطن کی محبت سے یک سر بیگانہ ہو جاؤ تو اس کا فائدہ کون اُٹھائے گا، تم یا تمھارے دشمن؟ یقین کر لو اس کا فائدہ تمھارے دشمن اُٹھائیں گے، جو خود اُن حضرات کے بھی دوست نہیں ہیں۔

کچھ لوگ ہیں جو اس ملک کو بُرا کہہ کر ہی سکون پاتے ہیں۔ ایسے لوگ صرف یہیں پائے جاتے ہیں، دنیا کی کوئی قوم بھی ایسی نہیں ہے جو ایسے لوگوں کو اپنے درمیان پائے اور انھیں برداشت کرتی رہے۔ جنھیں اس قوم پر غصہ آتا ہے، ان کا احترام کرو، ان کے سامنے محبت اور عقیدت سے گردنیں جھکاؤ، مگر جو صرف بُرائی کرنا اور پاکستان کی تحریک کو طعنے دینا جانتے ہیں، انھیں نمک حرام اور غدّار جانو کہ بُرد ں کو بُرا کہنا اور سمجھنا بھی بڑی نیکی ہے۔

انشا، جنوری 1963

(یہی انشائیہ سسپنس، اپریل 2002 میں ''نیکی'' کے عنوان سے شائع ہوا)

ہارون رشید اور ریڈیو پاکستان

برِصغیر کے مسلمانوں کو اسلامی تاریخ سے غیر معمولی عقیدت رہی ہے۔ یہ رجحان اپنی ماہیت کے اعتبار سے بلاشبہ ایک پسندیدہ رجحان ہے کہ اس طرح ہمیں ماضی کے درخشاں سلسلوں سے وابستہ ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ہم تاریخ کے گراں مایہ ورثوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اگر کوئی قوم اپنی تاریخ کو بھول کر بیٹھ جائے تو پھر وہ یک سر بے بنیاد ہو کر رہ جائے گی۔ تاریخ حرارت و قوت کا وہ آتش کدہ ہے جس سے قومیں زندگی اور آگہی کے شعلوں کا اقتباس کرتی ہیں مگر برِصغیر کے مسلمانوں نے تاریخ کو مجموعی طور پر جس انداز سے قبول کیا ہے وہ انداز بڑا مہلک ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہاں تاریخ کو سر کے بل کھڑا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاریخ کا جائزہ لینے اور اس کا مطالعہ کرنے کے دوران ہماری یہ خواہش رہتی ہے کہ ظالم کسی طرح بے قصور اور مظلوم کسی ترکیب سے قصوروار ثابت ہو جائے۔ یہ انداز روز بہ روز عام ہوتا جا رہا ہے۔ پاکستان میں عام طور پر جتنی تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں ماہرینِ تاریخ نے یہی ہنر دکھایا ہے۔ مسلمان تاریخ کو اپنے جدید مبصروں سے یہ شکایت ہے کہ ان مظلوموں کی داد دینے والے کہیں نظر نہیں آتے۔ تاریخ کے قارئین کو پورے اہتمام کے ساتھ ظالموں کی وکالت اور مظلوموں کی مخالفت کرنے کا عادی بنایا جا رہا ہے۔ پاکستان کا مصنف جب محمود غزنوی اور فردوسی کے سلسلے میں کچھ لکھتا ہے تو کچھ ایسی فضا قائم کرتا ہے کہ خواہ مخواہ محمود غزنوی معصوم اور رحم دل اور فردوسی ناشکر گزار قسم کا ایک بد دماغ شاعر نظر آئے۔ عالم گیر اور دارا شکوہ کے معاملے میں خوش عقیدہ مسلمان ہمیشہ عالم گیر کی حمایت کرتا ہے۔ بہت سے مضامین میں ہمارے ہنرمندوں نے یہ ثابت کرنے

کی کوشش کی ہے کہ عظیم الشان دانش ور منصور حلاج ایک خطرناک اور گم راہی پھیلانے والا قلندر تھا جسے تختۂ دار پر چڑھا کر عباسی خلیفہ نے اسلام اور شریعتِ اسلامیہ کی ناقابلِ فراموش خدمت انجام دی۔

تاریخ نویسی کا یہ انداز سماج میں جرائم پیشگی اور بربریت کے رجحانات پھیلانے کے ہم معنی ہے۔ یہ کہنا کسی طرح بھی درست نہ ہوگا کہ مسلمان سماج میں تاریخ کے ساتھ یہ برتاؤ شروع ہی سے رہا ہے۔ یعقوبی' علامہ ابنِ طباطباء طقطقی' طبری اور مسعودی کے لیے کون شخص ہے جو یہ کہہ سکے کہ تاریخ کے یہ اکابر واقعات کے ساتھ مذاق کیا کرتے تھے۔ مسلمان مؤرخین نے تاریخ کے فن کو عام طور پر جس دیانت' غیر جانب داری اور تحقیق پسندی کے ساتھ استعمال کیا ہے اور اس سلسلے میں جو اعلیٰ روایات قائم کی ہیں ان سے کون انکار کرسکتا ہے۔ توقع یہ تھی کہ اس روشن عہد میں ان کی شان دار روایات کو آگے بڑھایا جائے گا۔ اس سلسلے میں جدید مصر کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں اسلامی تاریخ کے ماخذوں کے ساتھ پوری طرح انصاف کرنے کا رجحان اب عام ہوتا جارہا ہے۔ یہ صورتِ حال اس دور کی ذہنی ساخت کے عین مطابق ہے۔ اب حقیقتوں کو چھپانا یا مسخ کرنا کسی کے بس میں نہیں رہا ہے۔ آپ لاکھ چھپانے کی کوشش کریں لیکن مستشرق جو موجود ہیں۔ امریکا' برطانیہ' فرانس اور جرمنی کے محققین کو آپ بھلا کس طرح روکیں گے۔

تاریخ کسی مقدمے کی پیروی کرنے والے وکیل کی وہ بحث نہیں ہے جو اپنے مؤکل کی طرف سے کی جائے۔ وہ ایک غیر جانب دار مبصر کا بے لاگ اظہار ہے۔ وہ حقائق اور واقعات کو اپنے پورے تسلسل میں دیکھنے اور دکھانے کا فن ہے مگر ہمارے مؤرخین اس بات کو تسلیم نہیں کریں گے۔ ان حضرات نے جو فن سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ حال میں بیٹھ کر ماضی کے سفاک قاتلوں کی ہمتیں بڑھائیں' قتل و غارت گری کرنے والے لشکروں میں جوشِ ایمانی پیدا کرنے کے لیے عالمِ خیال میں جنگی باجے بجائیں اور اس طرح اپنی قیادت وشقاوت کے جذبے کو تسکین پہنچائیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ رجحان برابر بڑھتا جارہا ہے اور تاریخی ناول اور تمثیلیں لکھنے والے حضرات نے اس کی خاص طور پر تبلیغ کی ہے۔

پچھلے دنوں جشنِ تمثیل کے سلسلے میں ریڈیو پاکستان سے ایک ڈراما "ہارون رشید" نشر ہوا تھا جس میں ہارون رشید اور برمکی خاندان کے مشہور واقعے کو موضوع بنایا گیا تھا۔ ہارون رشید کے ہاتھوں برمکی خاندان کی تباہی اور بربادی کا سانحہ اتنا دردناک سانحہ ہے جسے پڑھ کر ایک سنگ دل آدمی کی آنکھیں بھی اشک بار ہو جاتی ہیں۔ یہ برمکی خاندان کے بزرگ یحییٰ ہی کی ذات تھی جس نے ہارون رشید کو ہارون رشید بنایا اور وہ شخص یحییٰ کا باپ وزیرِ خلافت خالد ہی تھا جس نے خراسان میں عباسی خاندان کی محبت وعقیدت کے نقش قائم کیے مگر ہم نے ایک دن یہ بھی دیکھا کہ آتش کدہ نو بہار کے درخشاں نژاد موبد و متوّلی برمک کا یہ نام ور بیٹا بے مائیگی اور تہی دامنی کے عالم میں خلیفہ منصور کی عائد کی ہوئی رقم ادا کرنے کے لیے بغداد کی گلیوں میں مارا مارا پھر رہا ہے اور نگاہیں جھکائے ہوئے اپنے احسان مندوں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہا ہے۔ پھر یحییٰ کا دور آیا اور اس نے ہارون کے لیے اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیا وہ ہارون کو اپنے بیٹے فضل اور جعفر سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ہارون، فضل اور جعفر کی ماں کا دودھ پی کر پروان چڑھا تھا لیکن اس کا انجام کیا ہوا؟ خالد اور یحییٰ کو کیا خبر تھی کہ وہ جس تلوار پر صیقل کر رہے ہیں وہ انھی کی شہ رگ کو قطع کر ڈالے گی۔

اگر سوال کیا جائے کہ مسلمانوں کی ادبی، تہذیبی اور علمی ترقی کے اعتبار سے مسلم تاریخ کا سب سے زیادہ شان دار عہد کون سا ہے تو ایک باخبر شخص بلا تامل عظیم الشان عباسیوں کے زرّیں عہد کا ذکر کرے گا۔ وہ زرّیں اور قابلِ فخر عہد جو منصور سے شروع ہو کر عباسی خاندان کے نام ور اور محترم فرزند مامون رشید پر ختم ہوا۔ مامون، مشرق کا فلسفی حکمراں جسے ہم روم کے فلسفی حکم ران مارکس آریلیس سے تشبیہ دے سکتے ہیں اور جو کئی اعتبار سے اس سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ اس روشن حقیقت کے باوجود اس عہد کے تین خلیفہ سفاح، منصور اور ہارون رشید اور خاص طور پر منصور اور ہارون رشید اپنی محسن کُشی کے باعث تاریخ میں ہمیشہ بدنام رہیں گے۔ سفاح نے اپنے جاں نثار وزیرِ خلافت یعنی وزیر آلِ محمد ابوسلمہ خلال کو قتل کرایا۔ منصور نے اپنے سب سے بڑے محسن وزیرِ اعظم ابومسلم خراسانی کا خون بہایا اور

ہارون نے اپنے سب سے بڑے وفادار اور مددگار خاندان یعنی برمکیوں کو تباہ کیا، اپنے منہ بولے باپ یحییٰ کو رُسوائی اور اسیری کے عذاب میں مبتلا کیا اور منتخب روزگار ادیب، مدبّر اور عالم، جعفر کو عبرت ناک موت کی سزا دی۔

ریڈیو پاکستان سے نشر ہونیوالی تمثیل میں بڑے شرم ناک طریقے سے یہ ثابت کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ اس مظلوم خاندان کی ہلاکت اور تباہی بالکل حق بہ جانب تھی۔

قاتلوں کو ہر مرحلے پر نوازنے اور سراہنے کی یہ شہوت اس سماج کے اخلاق کو تباہ کر ڈالے گی۔ یہ اقدار کا مسئلہ ہے، ہم اس نوع کے واقعات میں ایک ظالم کی وکالت کر کے دراصل یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ظلم ایک پسندیدہ قدر ہے اور خوں ریزی کی بہ ہر حال حمایت کرنا چاہیے۔ قوم کے ذہن کی اس طور پر تربیت کرنا اسے اخلاقی اعتبار سے ہلاک کرنے کے برابر ہے۔ ریڈیو پاکستان کوئی نجی ادارہ نہیں ہے جسے تاریخ کو اس طرح مسخ کرنے کی اجازت دے دی جائے وہ ایک عوامی اور قومی ادارہ ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ ریڈیو پاکستان کے ذمّے دار اور باخبر حضرات نے ایک ایسی گمراہ کن تمثیل نشر کرنے کی کیسے اجازت دے دی۔ ہارون اور جعفر کے کردار افسانوی کردار نہیں ہیں جنھیں حسبِ خواہش توڑا مروڑا جا سکے۔ جب آپ کسی تاریخی کردار سے متعلق کوئی بات کہتے ہیں تو آپ کو اس سلسلے میں عائد ہونے والی تمام ذمّے داریاں قبول کرنی چاہییں۔ تمثیل میں جعفر برمکی کو ایک غدّار وزیر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اگر واقعات کو مسخ کرنے کی یہ روش عام ہو گئی تو مستقبل کی پاکستانی نسل تاریخ کے تمام مظلوم مقتولوں کو قاتلوں کی شکل میں دیکھا کرے گی اور سقراط و مسیح اس کو ظالموں کی صفوں میں کھڑے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس ذہنیت کو ختم ہونا چاہیے۔ انسانی اقدار کے مقدّس نظام کو تباہ کرنے کی یہ کوشش بڑی ہلاکت خیز کوشش ہے جو تاریخی اور تہذیبی خیر و شر کے تمام پیمانوں کو توڑ ڈالے گی۔

آپ کی تاریخ میں ایسی شخصیتوں کی کوئی کمی نہیں جنھیں فخر و اعتماد کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ خود ہارون رشید ہی کی شخصیت کے دوسرے پہلوؤں کو پوری طرح سراہا جا سکتا ہے۔ وہ اس سلسلے کا ایک ممتاز رکن تھا جس نے مشرق کی محرابوں کو دانش و

حکمت کے چراغوں سے روشن کیا اور انسانیت کی ذہنی تاریخ میں نشاۃ ثانیہ کا بانی بنا۔ اگر حکومت و شاہی کے سلسلوں ہی کی تعریف کرنا مقصود ہے تو پھر بنو اُمیہ کے لائق شہزادے خالد ابنِ یزید کی تعریف کیجیے جس نے یونانی علوم کی اشاعت کا آغاز کیا۔ حاکم بامر اللہ فاطمی اور مامون اعظم کو سراہیے جو آپ کی تاریخ کے لیے قابلِ فخر ہیں لیکن ظلم کا کوئی جواز پیش نہ کیجیے چہ جائے کہ اس کی حمایت کرنا۔ اس عہد میں ماضی کی صرف وہی اقدار زندہ رہیں گی وہی حوالے قبول کیے جائیں گے جن کی فضا میں انسانی سعادتیں اپنے بازو پھیلاتی ہیں۔

انشا فروری 1963

خاکے

یہ ایتھنس ہے، یونان کا قابلِ احترام شہر ایتھنس۔ ہم چوک میں ایک اُلجھے ہوئے بالوں والے گلیم پوش بوڑھے کو دیکھتے ہیں جسے نہ اپنے لباس کا ہوش ہے اور نہ اپنے بُرے بھلے کا خیال۔ وہ شہر کے ذہین نوجوانوں کی ایک جماعت کے درمیان بحث و گفت گو میں مصروف ہے، یہ لوگ جانتے ہیں کہ حُسن کیا ہے اور حقیقت کسے کہتے ہیں؟ یہ گفت گو بہت دیر، بہت دن سے جاری ہے۔ شہر کے دو ذہین ترین نوجوان زنوفن اور افلاطون سَر جھکائے ہوئے زیرِ بحث مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔ آؤ پہلے لفظوں کے معنی طے کرلیں۔ سوچنا یہ ہے کہ صداقت سے ہماری کیا مراد ہے؟

اور یہ شہروں کا شہر بغداد ہے۔ جواں سال دانش ور اور نام ور وزیرِ اعظم جعفر برمکی وقت کے سب سے بڑے فلسفی نظام سے ارسطو کے فلسفے پر بحث کر رہا ہے۔ نظام کو ارسطو کے نظریات سے شدید اختلاف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے ارسطو کی کتاب پر تنقید کی ہے جو آپ کی نظر سے گزرے گی۔

نظام! میرا خیال ہے کہ تم نے ارسطو کی کتاب کو اچھی طرح پڑھا نہیں ہے۔ نظام کا جواب یہ ہے کہ کہیے تو اس کتاب کو شروع سے سُنانا شروع کروں اور کہیے تو آخر سے۔

ان خاکوں کے ذریعے ہمارے ذہن میں ان سماجوں کی ایک تصویر بنتی ہے، ان کا مزاج سمجھ میں آتا ہے۔ یہی وہ سماج ہے جن کے لیے قوموں اور قرنوں نے عقیدت و احترام کے سجدوں کی متاع جمع کی ہے۔ ہر سماج اپنے مسئلوں کی نوعیت اور اپنی مصروفیتوں سے پہچانا جاتا ہے۔

اگر ہمارا سماج اپنی طفلانہ سرگرمیوں کے ذریعے پہچانا جائے تو یہ کوئی عجیب بات نہ ہوگی۔ سطحیت اور نمایش پسندی ہمارے سماج کے خمیر میں شامل ہیں۔ ہمارا طبقہ ذہن کی ناکردہ کاری کا شکار ہے۔ افسوس کہ اب قوم میں دانش طلبی عنقا ہوتی جارہی ہے۔ اب تو صرف بونے نظر آتے ہیں، جو اپنے کاندھوں پر کھڑے ہوکر بھی پستہ قد ہی رہیں گے، بہ ہر حال یہی کیا کم ہے کہ انھیں دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو آجاتی ہے۔ انھوں نے تو بڑی دل چسپ مصروفیات اختیار کر رکھی ہیں۔ چند حضرات قوم کی ساری دولت کو نگلنے کا عہد کیے ہوئے ہیں۔ ایک طبقہ صرف اظہارِ دولت کے خبط میں مبتلا ہے کچھ بزرگ دوسروں کے جرائم کو صحیح ثابت کرنے کے لیے مقدّس کتابوں کے حوالے تلاش کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک برگزیدہ گروہ صرف شہرت حاصل کرنے کی فکر میں ہلکان ہورہا ہے۔ انھوں نے اس عہد کے مسئلے سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے۔ سب سے زیادہ الم ناک واقعہ یہی ہے کہ دانش وَر، دانش وری کے فرائض بُھولتے جارہے ہیں۔ یہ لوگ سماج پر اپنا حق جتاتے ہیں، کاش وہ کبھی یہ بھی سوچیں کہ جس سماج کی انھیں کوئی پروا نہیں اس سے وہ کیا رعایت طلب کرسکتے ہیں۔ کیا کسی بھی عہد کے معقول اور پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے یہ مسئلہ رہا ہے کہ شہرت کس طرح حاصل کی جائے، ہمارے لوگوں نے بھی عجیب وغریب مسائل کو اپنایا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے دور کی سماجی، تہذیبی اور فطری سطح سے بہت نیچے کھڑے ہیں۔ ہمارا سماج نابالغ لڑکوں کے شعور کی سطح پر سانس لے رہا ہے۔ ہم سب کی پیشانیوں پر یہ لکھا ہوا ہے کہ فی الحال کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں۔ آیندہ کا خدا بھلا کرے گا۔

ہم سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے یک سر عاری ہوچکے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس قوم کو اپنے ذہن کی تربیت کے لیے درکار سنجیدگی اور متانت کی فضا میسّر نہیں ہوئی۔ یہاں بھی کچھ ایسی بات کہنا سخت دشوار ہے جس سے لوگوں کو ٹھیس پہنچتی ہو۔

ہم سب صرف ایسی باتیں کرنے کے عادی ہیں جو سب کو پسند آتی ہوں۔ کسی نے کہا تھا کہ جن کے غم کو اپنا غم سمجھتا ہوں وہ مجھے اپنا دشمن سمجھنے لگتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ لوگوں کو ان کے اصل مسائل کی طرف متوجہ کیا جائے تو انھیں غصّہ آجاتا ہے۔

یہاں صرف ایک ہی معیار اور ایک ہی مثالیے کو اپنایا گیا ہے اور وہ ہے ماضی۔ ماضی کا ایک حصّہ قابلِ فخر اور ایک حصّہ قابلِ ملامت۔ ان گانٹھ کے پورے آدمیوں نے قابلِ ملامت ماضی کو اختیار کیا ہے معلوم نہیں کہ لوگ اپنے آباواجداد کی زندگی کب تک بسر کریں گے؟ اگر قومیں اپنے آپ سے خلوص برتنے لگیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ تاریخ کتنی مہربان ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ ہم زندگی کے بارے میں کوئی سنجیدہ نقطۂ نظر نہیں رکھتے۔ یہاں صرف تضاد ہی زندگی کا سب سے مقبول نظریہ ہے۔ ہم عقل ہی نہیں عقیدے کے ساتھ بھی انصاف نہیں کر سکے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمیں زندگی کی کسی بھی سنجیدہ قدر سے کوئی خلوص نہیں۔ اس قوم نے بستیاں تو بسالی ہیں لیکن ذہن وضمیر کو ویران کرلیا۔ قوموں کی زندگی ان نظریات سے جنم لیتی ہے جو روزمرّہ کی ضرورتوں میں بہ ظاہر کبھی کام نہیں آتے۔ ہمارے یہاں ان نظریات کے ساتھ جو تعلق قائم کیا گیا ہے، وہ ناقابلِ عمل ہے۔ یہاں پہنچ کر ہمیں بھی ماضی کا خیال آتا ہے لیکن وہ ماضی جس نے شعور وآگہی کے لیے قابلِ فخر راستہ چھوڑا تھا۔ اصل حقیقت ہے کہ ہم اس ماضی سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

ہمارا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہم صرف دنیادار ہیں لیکن صرف دنیاداری سے کوئی قوم اپنی دنیا نہ بنا سکی۔ قوم کے ذہن کو ایک نیم درویشانہ انداز اپنانا پڑے گا۔ اس کے بغیر بصیرت ودانش کی بخششیں کبھی حاصل نہ ہوں گی اور اس قوم کا وجود محض ایک غیر سنجیدہ تماشا بنا رہے گا۔

انشا، اپریل 1963

(یہی انشائیہ سسپنس، دسمبر 2002 میں بھی شائع ہوا).

روگ

ایک روگ ہے جو ہمارے وجود میں رینگ رہا ہے اور ہمارے جسم سے رِسنے لگا ہے اور بستیوں میں اس کی سڑاند پھیل رہی ہے اور ایسا ہے کہ جب جسم کو غسل دیا جاتا ہے تو غلاظت اور بھی دُور تک پہنچتی ہے۔ ایسے میں یا تو اذیت اور ندامت ہے اور یا ایک دوسرے کے لیے ملامتیں۔ حالاں کہ نہ ایک قصور وار ہے اور نہ دوسرا کہ یہ سب کے سب اسی پیپ کو چاٹتے اور اسی سڑاند کو اُگلتے ہیں۔

جس سماج نے کچھ گھرانوں کو اُجالے اور باقی کو اندھیرے سونپے ہیں اس نے بستی میں کوڑھ پھیلایا ہے اور اب یہی کوڑھ اپنے کیڑوں کا رزق بھی ٹھیرا ہے۔ روگی ایک دوسرے پر الزام دھرتے ہیں پر اِس روگ پر کوئی نظر نہیں ڈالتا۔ کاش وہ جانتے کہ یہ روگ ان کے وجود کو مسخ کر ڈالے گا یہاں تک کہ پہچاننے والے اسے پہچان بھی نہ سکیں گے۔ جو طبیب اس صورت میں اصلاحِ حال چاہتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں انھیں معذور سمجھو' کوششیں کی جاتی ہیں اور رائگاں جاتی ہیں۔ کوششیں کی جائیں گی اور اسی طرح رائگاں جائیں گی۔ یوں ہے کہ جسم جب تک اندر سے اپنے اس روگ کو اُگل نہیں دے گا اسی طرح سڑتا رہے گا۔

برائی کو اس کے بہاؤ پر روکنا بے کار ہے۔ دھویں کو پھونکیں مار کر اُڑانے سے کہیں آگ بجھ سکتی ہے پر جو لوگ ایسا کرتے ہیں انھیں قصوروار نہیں ان جان اور نادان کہو۔ ہم سب فتنوں کے سرچشمے کو نظر انداز کر گئے ہیں اور اب ہمارا کوئی قابو نہیں چلتا۔ ایسا ہے کہ جیسے یہ ابتلا اب ہماری عادت بن گیا ہے اور اب یہ قوم اپنی زندگی کے اس روگ سے اس قدر مانوس ہو چکی ہے کہ صحیح تشخیص سے ڈرتی ہے اور اپنا غلط حال بیان کرتی ہے جب کسی قوم

کی آزار پسندی اس حد تک پہنچ جائے تو پھر نہ جانے کیا کچھ ہوتا ہے۔ کیا ہوا۔ بس یہی کہ پوری کوشش کے ساتھ مرض کی غلط تشخیص کرائی گئی اور یہ سچ مچ ایک عجیب بات ہے۔ اس ملک میں خدمتِ خلق کی خاطر علاج کرنے والوں کے کتنے ہی جتھے گھومتے نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس ہر اس مرض کا شرطیہ علاج موجود ہے جس کا مریض سے کوئی تعلق نہیں۔ پر اُن کا اصرار ہے کہ تمھاری بیماریاں صرف وہی ہیں جن کا علاج کرنا ہم جانتے ہیں۔ ایسا کب تک ہوگا اور کب تک یہ معذور اور مسکین گروہ اپنی پیپ اور اپنے پھوڑوں میں پڑا سڑتا رہے گا۔ تمھارا روگ تمھارے سماج کے اندر کا روگ ہے۔ جب تک اس سماج کا علاج نہ کیا جائے گا اس وقت تک تمھاری صحت کی کوئی اُمید نہیں۔ کیا زندگی کی صحت اور اس کے حُسن کی خاطر سماج کی ہڈیوں میں سرایت کر جانے والی اس بیماری کا کوئی علاج کیا جائے گا؟

انشا' جون1963

اولٰئک ھم المفسدون

پاکستان کے بعض شہروں میں دو مذہبی فرقے آپس میں ٹکرائے اور خونا خون ہو گئے۔ کیا ہم اس مرحلے پر خاموش رہیں کہ مصلحت اندیشوں کا ہمیشہ سے یہی شیوہ رہا ہے۔ پھر یہ کہ یہ معاملہ مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور ہمیں اس سلسلے میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا اور یہ کہ مسئلوں کے درمیان بے تعلقی برتناسب سے زیادہ آسان کام ہے اور ہمیں اپنے لیے آسانیوں کو چُننا چاہیے۔ ہمارے لیے خود ہمارے ہی مسئلے کیا کم ہیں کہ دوسروں کی ذمّے داریوں کو بھی لباس بنا کر پہن لیں۔ ہم سماج کے ذہین نوجوانوں کی مشکلوں پر قلم کیوں نہ اُٹھائیں۔ ہم ادیبوں اور شاعروں کے زخموں کا شمار کیوں نہ کریں۔ کیا ہماری برادری کے غم کو کسی نے آج تک اپنایا ہے۔ پھر ہم دوسروں کی خود انگیختہ مصیبتوں کو اپنی روح کا عذاب کیوں بننے دیں، پر لکھنے والے اگر اتنے ہی عقل منداور اتنے ہی ہوشیار ہوا کرتے تو بات ہی کیا تھی۔ احساس کے جہنم میں جلنے والے لاکھ بچنا چاہیں پر وہ اپنی سرنوشت سے بچ نہیں سکتے۔ یہ ان کا مقسوم ہے اور انھیں اپنا یہ مقسوم پورا کرنا ہے، کاش ان کے لیے گرد و پیش کے حالات سے بے نیاز اور بے تعلق رہنا ممکن ہوتا۔

یہ لوگ کون ہیں جو ایک دوسرے کو قتل کر ڈالتے ہیں اور یہ قتل کرنے والے ہمیشہ مذہب ہی کے قبیلے سے کیوں اُٹھتے ہیں۔ یہاں ہمیں ذرا کچھ دیر رُک کر سوچنا چاہیے۔ شہروں اور شہریتوں کی تاریخ میں دو چیزیں ایک دوسرے کی حریف رہی ہیں یعنی عقل اور عقیدہ یا فلسفہ اور مذہب۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عقل اور فلسفے کے لوگ کبھی ایک دوسرے کو قتل نہیں کرتے۔ افلاطون اور دیمقراطیس کے گروہ کبھی ایک دوسرے سے نہیں ٹکرائے۔ فارابی کے

مکتبۂ خیال نے شیخ شہاب الدین سہروردی کی خانقاہ کے مفکروں پر کبھی حملہ نہیں کیا۔ ایتھنس کی ہیکل کے دروازے سے کبھی کوئی ایسا ہجوم نہیں نکلا جس نے انسانوں کی گردنیں اُڑا دی ہوں اور شہروں کو آگ لگا دی ہو۔ فتنہ و فساد کی آگ ہمیشہ مذہبی فرقوں کے درمیان ہی کیوں بھڑکتی ہے؟ یہ ایک سوال ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اس کا جواب دیا جائے۔ ہمیں اندازہ ہے کہ یہ کوئی خوش گوار سوال ہرگز نہیں ہے۔ یہ وہ موضوع ہے جس پر جرم و گناہ کی مہر ثبت کر دی گئی ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کو سُن کر ہماری بستیوں کے لوگ برہم ہو جاتے ہیں۔ پر مشکل یہ ہے کہ ہم نے لوگوں کو خوش کرنے کی ذمّے داری کبھی قبول نہیں کی۔ ہم تلخ کام ہیں اور صدیوں سے اس پر قانع بھی اور جب ایسا ہے تو پھر ہم اپنی تلخ کلامی سے بھی باز نہیں آئیں گے۔

آتش و خوں کی یہ داستان آج سے نہیں صدیوں سے دہرائی جا رہی ہے۔ وہ کون سا دور تھا جب عقیدوں کی قربان گاہ پر انسانوں کا خون نہیں بہایا گیا۔ آج یہ بات کہی جائے تو لوگوں کے چہرے بگڑ جاتے ہیں پر اب حقیقتوں کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ ہماری طرف سے انسانوں کے ہجوم میں عام اعلان کر دیا جائے گا کہ اب نفرتوں کے خلاف نفرتیں ہیں اور دعووں کے خلاف دعوے اگر کلام کا زہر کانوں سے اُتر کر کلیجوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی خاصیت رکھتا تو انسانیت دشمنوں کے رُو بہ رُو سب سے زیادہ بولنے والے ہم ہوتے اور اب بھی ایسا ہے کہ بولتے بولتے ہمارے سینوں میں دُھول اُڑنے لگی ہے۔

قہر و نفرت کی ماؤں نے انھیں جنم دیا اور بہیمیت اور بَربَریت کی چھاتیوں سے انھیں دودھ پلایا گیا۔ ہم اس وقت سے پناہ مانگتے ہیں جب ہماری تلخ کلامی ان میں سے کسی ایک گروہ کی تسکین کا باعث بنے اور جب ہمارے پیش کیے ہوئے شواہد کو ان میں سے کوئی ایک اپنے دعووں کی تائید میں کسی دوسرے کے خلاف استعمال کرنا چاہے کہ ہماری نگاہ میں ان میں سے ہر ایک حد سے تجاوز کرنے والا اور بستیوں میں فساد برپا کرنے والا ہے۔ اگر بزرگانِ مذہب زندہ ہوتے تو وہ اپنی اُمتوں اور ملتوں سے بریّت ظاہر کرتے اور کہتے کہ تم ہم میں سے نہیں ہو۔ تم وہ ہو جن کے خلاف ہم نے زندگی بھر جنگ کی اور پھر تم نے ہماری

ہی صفوں میں آ کر ہمارے ہی خلاف فتنے قائم کیے۔

یہ وقت کے وہ قیدی ہیں جو اپنی زنجیروں سے ایک دوسرے کے جسموں کو لہولہان کرتے ہیں، انھیں مل کر بیٹھنا تھا پر یہ ایک دوسرے پر جھپٹتے ہیں۔ ماضی کی وہ کون سی سازش ہے جو انھیں کسی طرح چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ تاریخ کا آخر وہ کون سا بازار ہے جہاں نفرتوں کا زہر فروخت ہوتا ہے اور زہر کی وہ کون سی قسم ہے جس کی قیمت میں زندگی تک پیش کر دی جاتی ہے۔ یہ سوچو کہ تمھاری سرنوشت میں کس نقطے سے خرابی پیدا ہوئی ہے اور ہلاکتوں کا یہ سلسلہ کہاں جا کر رکتا ہے۔ سوچو اور سمجھو، تمھیں اپنی زندگی کے وار جھیلنے ہیں۔ ماضی کی ضربوں کا قرضہ نہیں چکانا۔

انشا، جولائی 1963

محاسبہ

اگست اور ستمبر کے مہینے اس قوم کے لیے محاسبے کے مہینے ہیں۔ ایک مہینا قوم کے یومِ نجات سے منسوب ہے اور دوسرا مہینا اس کے بانی کے یومِ وفات سے۔ اُن دنوں یہ ایک قوم تھی اور اس قوم کے افراد اجتماع میں سانس لیتے تھے۔ اب صرف ایک انبوہ رہ گیا ہے جو صرف بکھرتے رہنے کے لیے بڑھ رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک صرف اپنے اندر اور اپنے لیے زندہ ہے اور دوسروں کے لیے مر چکا ہے۔ یوں سب لاشیں ہیں اور معاشرے کی ان لاشوں میں سے ہر لاش برائیوں اور بدبختیوں کا بیج ہے۔ یہ بیج مناسب کھاد ملتے ہی چھتنار درخت بن جاتا ہے۔

جو تلخ کام ہو کر جلی کٹی سُنانے لگتے ہیں ان کا سینہ چیر کر دیکھو۔ یہ گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہاں کوئی چیز نظر آئے جسے سراہا جا سکے اور مسرت حاصل کی جا سکے۔ پر ایسی باتیں کم ہیں جنھیں سراہا جا سکے۔ یقیناً ایسی باتیں بہت کم ہیں جنھیں سراہا جا سکے اور ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں جنھیں نباہا جا سکے۔ لوگ تین قسم کے ہیں کچھ تو ایسے ہیں جن سے محبت کی جاتی ہے۔ کچھ وہ ہیں جنھیں برداشت کر لیا جاتا ہے اور باقی وہ ہیں جو یکسر ناقابلِ برداشت ہیں۔

افسوس کہ یہ سب اپنے دشمن ہیں اور افسوس کہ ان کا کوئی دوست نہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو راتوں اور دنوں کا محبوب سمجھ لیا ہے۔ اور ان کے خیال میں حالات کو ان کے ناز اُٹھانے چاہئیں۔ ان کا یہ رجحان بڑھتا ہی جا رہا ہے کہ بس اپنے کام سے کام رکھو۔ ان کے بزرگ اور برتر افراد اپنے سوا سب کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ یاد رکھا جائے کہ جو زندگی کے اس جنگل میں سب کا ساتھ چھوڑ کر چلے گا وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالے گا۔ کچھ ایسا ہو گیا

ہے کہ ان دیاروں کے دانش منداور ان شاہ راہوں کے شاہ انداز بس اپنی طرف دیکھتے ہوئے چلتے ہیں۔ کہہ دیا جائے کہ یہ جلد ہی اپنے سامنے کی سنگین اور سنگلاخ حقیقتوں سے ٹکرائیں گے اور چکنا چور ہو جائیں گے۔ وقت کے اس ہجوم میں جو ایک دوسرے کو دیکھ کر نہیں چلے گا وہ بُری طرح چوٹ کھائے گا۔

کسی کو کسی کی پروا نہیں رہی۔ ہر شخص اپنے اسم اور جسم میں جاگزیں ہیں۔ اس طرح انسانوں کی یہ بستی ایک ڈراؤنا جنگل بن گئی ہے جس میں رہنے والے وحشی ایک دوسرے کا خون پیتے' گوشت کھاتے اور ہڈیاں چباتے ہیں۔ کچھ آدمی ہیں جو برتری اور فوقیت کی مچانوں پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کو شکار کر رہے ہیں۔ یا تو سب اُوپر چڑھ جائیں یا سب نیچے اُتر آئیں۔ اور ایک دوسرے سے نگاہیں ملا کر بات کریں۔ بلندی اور پستی کا یہ فتنہ قائم رہا تو آدمیت اپنا ہی گوشت نوچ نوچ کر کھا جائے گی۔

برائی بے وقوفی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ لوگ بے وقوف ہیں ورنہ بُرے ہی نہ ہوتے اور ہر بے وقوف آدمی اپنے آپ کو عقل منداور ہوشیار سمجھتا ہے نہیں تو پھر اسے بے وقوف ہی کون کہتا۔ جو آج اچھا نظر آتا ہے وہ کل بُرا بن جائے گا۔ یعنی حماقت اور بے وقوفی میں مبتلا ہوگا اور کوئی نہیں سمجھ سکے گا کہ وہ اس طرح کس چیز کی قیمت ادا کر رہا ہے۔ اچھے اور بُرے سب ایک ہی راستے پر جا رہے ہیں اور سوچو تو سب بے قصور ہیں۔ وہ کون ہے جسے دولت کی بے فکری اور بے فکری کی دولت نصیب ہو رہی ہو اور وہ اسے قبول نہ کرے اور پھر ساری دنیا سے بے تعلق اور بے نیاز نہ ہو جائے۔ شاید کوئی ہو۔ مگر ماننا چاہیے کہ یہ بہت بڑی اور بہت ہی بُری آزمائش ہے۔ اس آزمائش میں رسوائی سے بچنا آدمیوں کے بس کی بات نہیں۔

پندرہ سولہ سال سے یہ معاشرہ دراصل اسی گمراہ کن آزمائش میں مبتلا ہے۔ ہر شخص کو یہ موقع حاصل ہے کہ اُٹھے اور لوٹنا کھسوٹنا شروع کر دے؟ وہ ایسا کیوں نہ کرے؟ وہ تم سے پوچھتا ہے کہ میں ایسا کیوں نہ کروں؟ تم اس معاشرے میں رہتے ہوئے اسے کیا جواب دو گے؟ یقیناً اسے قوم' ملک اور انسانیت سے کوئی غرض اور کوئی دل چسپی نہیں۔ لیکن کیا قوم'

ملک اور انسانیت سے غرض رکھنا اور محبت کرنا قانوناً فرض ہے؟ کیا اس ملک کے دستور کی یہ کوئی دفعہ ہے کہ جو معاشرے سے خلوص نہیں رکھے گا وہ غدار قرار پائے گا۔ ایک شخص معاشرے سے بس اپنا مطلب نکالنا چاہتا ہے تم اسے بھلا کس چیز کا حوالہ دے کر روک سکتے ہو؟ اسے حق حاصل ہے کہ وہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کے حقوق اور ان کی مسرتوں کا واحد حق دار اور مالک بن کر بیٹھ جائے۔ حق بھی حاصل ہے اور موقع بھی۔ تم اسے کس طرح باز رکھ سکتے ہو؟ تمھارے پاس کیا دلیل ہے؟

محاسبہ کیا جائے اور مان لیا جائے کہ پندرہ سولہ سال کی مدت اس برگزیدہ دلیل کو بُھلانے میں صرف کی گئی ہے جس کی رُو سے معاشرہ ایک خاندان ہے اور اس خاندان کے سب افراد برابر ہیں اور کوئی کسی سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

اگر یہ دلیل اور یہ آیت سامنے نہیں تو پھر کسی کو خطا کار نہیں کہا جا سکتا بل کہ ایسی صورت میں خطا کار نہ ہونا سب سے بڑی خطا ہے۔

انشا، ستمبر 1963

اس دوران میں

آج کل ایک خاص بات جو بُری طرح کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ بدی پہلے سے زیادہ منہ پھٹ ہوگئی ہے اور نیکی نے ہکلانا شروع کر دیا ہے۔ اگر جبر کی حالت میں نہ بولنے والے کو بھی اپنے اس گمان کا ثواب پہنچتا ہے کہ جبر نہ ہوتا تو میں ضرور بولتا تو پھر جو لوگ اختیار پا کر بولنے کے بجائے گالیاں بکنا شروع کر دیتے ہیں، ان کی کچھ سزا بھی ہونا چاہیے۔

گزشتہ دنوں بہت اچھی باتیں بھی کہی گئی ہیں پر انھیں بڑے معاندانہ جذبے کے ساتھ سُنا گیا ہے۔ بہت سے نیک جذبے بھی معرضِ اظہار میں آئے ہیں پر اُن کے باب میں بڑی بدنیتی اور بدطینتی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ قوم میں کچھ اور بیداری پیدا ہوگئی ہے اور اپنے حق کا شعور بھی پہلے سے کچھ زیادہ ہے پر ایسے لوگوں کی اب بھی کوئی کمی نہیں جو اپنے دردمندوں کی بات سُن کر بھڑک اُٹھتے ہیں اور اپنے حق میں بولنے والوں کو اپنی برہمی کا ہدف بناتے ہیں۔

سیاست کی دنیا میں فتویٰ فروشی کا بازار گرم ہے۔ اب ہر وہ شخص جہنمی ہے جو عوام کے حق کی بات کرتا ہو۔ جماعتیں اور جمعیتیں قوم کو جمع کرنے کے بجائے اس میں تفرقہ ڈال رہی ہیں۔ دلوں میں نفرتیں بٹھائی جا رہی ہیں اور محبت کو درمیان سے اُٹھا دیا گیا ہے۔

اس طرح ایک عجیب بددلی اور دل برداشتگی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ کچھ اتنی لغو اور بے معنی بولیاں بولی گئی ہیں کہ سُننے والوں نے تنگ آ کر سُننا ہی چھوڑ دیا ہے۔ یہ ہے اس سیاست کی دین جو زمین و آسمان کے سارے دُکھوں کو دُور کرنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ قوم اپنے حق ناشناس رہ نماؤں سے عاجز آ چکی ہے۔

مقاماتِ ہدایت وارشاد میں یہ فرمایا جاتا ہے کہ لوگوں کو اپنے دور میں نہیں بل کہ اپنے دور سے پہلے کے دور میں رہنا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ جو اپنے زمانے کی فضا میں سانس لینا چاہتے ہیں وہ نابکار اور گناہ گار ہیں۔ حال کو ماضی کی صلیب پر چڑھانے کا یہ شوق بڑے گہرے معنی رکھتا ہے۔

ہر نسل اپنے زمانے میں پیدا ہوتی ہے اور اپنے ہی زمانے میں سانس لے سکتی ہے۔
ہر دور کا اپنا ایک رمز ہوتا ہے۔ جس دور میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، اس کا اپنا ایک رمز ہے جو اس رمز سے انکاری ہیں وہ خود بھی ہلاکت میں پڑیں گے اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی ہلاکت میں ڈالیں گے۔ تاریخ کے نظامِ قضاوقدر کو جھٹلانا اُمتوں اور ملتوں کو کبھی راس نہیں آیا۔ یہ وہ مسخرگی ہے جو تاریخ کی کبریائی نے کبھی برداشت نہیں کی۔

اختلاف کرنے والوں کو اس امر پر تو اتفاق کرنا ہی پڑے گا کہ ہم اپنے آبا و اجداد کے زمانے میں نہیں، اپنے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں اور اگر ہم اپنے زمانے میں پیدا نہیں ہوئے تو پھر مژدہ ہو کہ ہم پیدا ہی نہیں ہوئے۔ پچھلی نسلیں اپنا اپنا بوجھ اُٹھا کر اپنے دن گزار گئیں۔ ہمیں اپنا بوجھ اُٹھانا ہے اور ان کے تجربوں سے سبق حاصل کرنا ہے۔

مشکل یہ ہے کہ اس نسل کے بعض آسمان نژاد رہ نما اس کی موجودگی ہی کے قائل نہیں ہیں۔ وہ محلِ خطاب میں اس ہجوم کی طرف سے منہ موڑے کھڑے ہیں جو اُن کے سامنے موجود اور اس کارواں کی گرد سے مخاطب ہیں، جو کبھی کا گزر چکا ہے۔

پورا سچ تو خیر بولا ہی کہاں گیا ہے یہ لوگ تو آدھے سچ کی بھی تاب نہیں رکھتے۔ یہی نہیں بل کہ انھیں وہ بات بھی سخت گراں گزرتی ہے جو سچ سے کچھ مشابہت رکھتی ہو۔ لوگوں کو ان کے حقوق اور ان کے حقیقی مسئلوں سے بے خبر رکھنے کی کوششیں کی جارہی ہیں اور نہ جانے کیا چاہا جارہا ہے۔

اس قوم کو ایک ایسی فضا درکار ہے جس میں حقیقتوں کو حقیقتوں کے طور پر برتا جائے۔ یہ فضا اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب حق طلبی کے ساتھ سوچا جائے، چلایا نہ جائے اور لوگوں کی نیتوں پر حملے نہ کیے جائیں۔ یہ بڑی الم ناک بات ہے کہ لوگ اپنے آپ کو سند قرار دے کر دوسروں کی ہر بات کو مسترد کر دیتے ہیں۔ پر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کلیسائی انداز قوم کے حق میں تباہ کن فتنوں کا سبب بن سکتا ہے۔

عالمی ڈائجسٹ، دسمبر 1969

(یہی انشائیہ سسپنس، جون 2008 میں "تباہ کن فتنہ" کے عنوان سے شائع ہوا)

نئے سال کے حاشیے پر

زمانے پر ازل سے ایک ابدی استغراق طاری ہے اور زمانے کے اس ازلی اور ابدی استغراق میں لمحے ہیں کہ گزر رہے ہیں، ساعتیں ہیں کہ تمام ہو رہی ہیں اور وقت ہے کہ بہہ رہا ہے۔ زندگی نے دنوں اور راتوں کی ایک اور میعاد پوری کر لی ہے اور ایک اور سال تاریخ کے وجود میں گم ہو گیا ہے۔ قوموں نے تجربوں کی کچھ اور زادو جنس اکٹھی کر لی ہے۔

لمحوں کے بے زنہار ریلے میں وجود کے کھوے چھل گئے ہیں پر زندگی ہے کہ برابر آگے بڑھ رہی ہے۔ ہم نئے سال کے حاشیے پر کھڑے ہیں اور منفعت اور خسارے کی فردِ حساب ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ دنوں اور راتوں سے ہماری اب تک جو معاملت رہی ہے اس میں ہمیں منفعت کم ہوئی ہے اور خسارہ زیادہ۔ آنے والا سال شاید تلافی کا سال ہو۔ اور اسی سے ہماری تمام اُمیدیں وابستہ ہیں۔ اس سال میں ایک خیر ہے اور وہ یہ کہ ہمیں چیزوں کو قبول کرنے یا رَد کرنے کا اختیار ہو گا، اور یہ ہماری وہ خواہش ہے جو بڑی حسرتوں کے بعد پوری ہو رہی ہے۔ ساتھ ہی یہ دور ہماری آزمایش کا دور بھی ہو گا۔

سمجھنا چاہیے کہ یہ آنے والے دن بڑے واقعات انگیز دن ہیں۔ یہ واقعات ہمارے حق میں کتنے مہربان ہوں گے یا کتنے نامہربان، یہ خود ہم پر منحصر ہے۔ اب ہمیں خود ہی جواب دہ ہونا ہے اور خود ہی جواب طلب۔ جمہوریت کے اہتمام کا یہ دور ہم سے بڑی احتیاط کا متقاضی ہے۔ ہم کو اپنے نفس کی اصلاح کرنی ہو گی۔ ہم جمہوریت سے بچھڑ کر بہت خراب ہوئے ہیں۔ سو اب ہمیں اس سے بغل گیر ہونے کے لیے بہت کچھ سدھرنا پڑے گا۔

جمہوریت کا مزاج بولنے کی سلیقہ شعاری اور سننے کی بردباری سے عبارت ہے۔

جمہوریت ہر اس فرد کو لب کشائی کی دعوت دیتی ہے جو کچھ بھی کہنا چاہتا ہے۔ جمہوریت کی صورت میں ہم ایک ایسی فضا کو قبول کرتے ہیں جس میں ہم سے کھل کر اختلاف کیا جا سکے۔ جو لوگ جمہوریت کی حمایت کرتے ہیں وہ گویا یہ چاہتے ہیں کہ معاملے دلیل سے طے ہوں نہ کہ طاقت سے۔ مخالف دلیلوں کو سُنا جائے اور دعووں پر نظرِ ثانی کی جائے۔

اس نظام کے زیرِ اثر ہم میں سب سے پہلے اس امکان کو قبول کرنے کی آمادگی پیدا ہونی چاہیے کہ صداقت شاید ہمارے ساتھ نہ ہو دوسرے کے ساتھ ہو۔ جمہوریت ان لوگوں کے لیے یقیناً ایک نامناسب ترین نظام ہے جو اپنے قول کو قولِ فیصل سمجھتے ہیں اور دوسرے کی بات سننے کا کوئی حوصلہ نہیں رکھتے۔

کامل صداقت انسانوں کی دست رَس سے ہمیشہ دُور رہی ہے۔ ہاں اس کی کچھ شباہتیں ہیں جن پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔ یہ شباہتیں مختلف دائروں میں بکھری ہوئی ہیں۔ سیاست کے دائرے میں صداقت کی گہری شباہت ایک ایسے نظام میں پائی جاتی ہے جو انسانوں کی مسرت کو اپنی اساس قرار دیتا ہو۔ اس زمین پر اور اس زندگی میں انسان کی مسرت کیا ہے۔ جمہوریت اس امر کے تعین کے لیے ایک مناسب ماحول پیدا کرتی ہے۔

ہم جمہوریت کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں مگر یہ عمل بڑی عجیب فضا میں شروع ہو رہا ہے۔ نیتوں میں فساد ہے اور لہجے زہریلے ہیں۔ رائے کے اختلاف کو بغض و عناد کے ساتھ مسترد کیا جا رہا ہے۔ بیانات نے دھمکیوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ بعض لوگوں میں اپنے مخالفوں کو کافر اور مرتد قرار دینے کی ایک عجیب شہوت پیدا ہو گئی ہے جو ملک کو سیاسی بدکاریوں کا چکلا بنا سکتی ہے۔ جمہوریت کو جس صفائے باطن کی ضرورت ہے وہ مدعیوں میں مفقود ہے۔ بے چارے لوگ یہ سوچتے اور کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ نہ جانے کیا ہوگا۔ یہ بدنصیبی ہے کہ شدید جدوجہد کے بعد اُمیدوں کا دور شروع ہوا تو اندیشوں کے ہجوم میں۔

بہ ہر حال حالات یہ ہیں۔ اگر ہمیں جمہوریت اور جمہوریت کی اقدار عزیز ہیں تو پھر جمہوریت کے تقاضوں کو بھی محسوس کرنا پڑے گا اور اس مدت کو فرض شناسی کے ساتھ گزارنا ہوگا جو تاسیسِ جمہوریت کے لیے مقرر کی گئی ہے ورنہ سب کچھ محض ایک ٹھٹول ہو کر رہ

جائے گا اور اس کی ذمّے داری نہ حکومت پر عائد ہوگی اور نہ عوام پر۔ ذمّے دار صرف وہ خطیب قرار پائیں گے جو نفرتوں کے زہر سے اپنے لوگوں کے جذبات کی آب یاری کرتے ہیں۔ پھر بھی خیر کی اُمید رکھنا ایک خیر ہے اور ہمارے آپ کے اختیار میں اس کے سوا اور ہے بھی کیا۔ قوم کو ایک بہترین موقع ملا ہے جس سے پوری طرح فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ کاش ہم اس سے پوری طرح فائدہ اُٹھا سکیں اور اس بدترین سرنوشت کو بدل سکیں جو ایک مدت سے ہمارا مقسوم رہی ہے۔

عالمی ڈائجسٹ، جنوری 1970

میدانِ حشر میں

پاکستانی قوم کو بائیس تیئیس سال میں جو تجربے حاصل ہوگئے ہیں وہ دوسری قوموں کو شاید ایک صدی میں بھی حاصل نہ ہوئے ہوں گے۔ اس لیے توقع یہ تھی کہ جب کچھ کہنے اور منوانے کا موقع ملے گا تو یہ قوم کسی گزشتہ غلطی اور بے احتیاطی کا اعادہ نہیں کرے گی۔ معاملات و مسائل پر متانت، سنجیدگی اور حقیقت پسندی کے ساتھ غور کیا جائے گا اور وہ سب کچھ نہیں کیا جائے گا جس کا تحمل ایک ایسی قوم کے بس کی بات نہیں جو اپنی غلط کوشیوں کی پہلے ہی کافی سزائیں بھگت چکی ہے۔

مگر یہ دیکھ کر بڑا دُکھ ہوتا ہے کہ اس قوم کا انداز اب بھی وہی ہے جسے وقت قابلِ تعزیر قرار دے چکا ہے، سنگین مسائل کے ہجوم میں بحث و اصرار کے لیے پھر ان ہی اُمور کو انتخاب کیا گیا ہے جو صرف غیر ضروری ہی نہیں، تباہ کن بھی ہیں۔ گیارہ کروڑ مسلمانوں کے اس ملک میں کفر و اسلام کا مسئلہ اُٹھانا اور غوغا برپا کرنا یقیناً تاریخ کا ایک شرمناک اضحوکہ اور حقائق کے ساتھ ایک اشتعال انگیز تمسخر ہے۔ سوچنا یہ ہے کہ گزشتہ گیارہ سال میں یہ قوم واقعی کن حالات سے دوچار رہی ہے اور وہ کیا مسائل تھے جن کے زیرِ اثر مجبور عوام کے برافروختہ ہجوم برزنوں اور بازاروں میں نکل آئے تھے اور اقتدار کے خلاف کُھل کر جنگ چھڑ گئی تھی۔ کیا یہ سب کچھ اس لیے ظہور میں آیا تھا کہ کوئی یہودی یا کافر دارالاسلام کا سلطان بن بیٹھا تھا اور مسلمانوں پر ہلاکت و اسیری مسلّط کر دی گئی تھی؟ کیا ہمیں یاد نہیں رہا کہ ہم سب نے یک زبان ہو کر جن حالات کے خلاف آواز بلند کی تھی وہ غاصب آمریت کے پیدا کردہ تھے۔ یہ کوئی مسلمان اور کافر کی کشمکش نہیں تھی۔ اُس آمریت سے نجات پانے کے

بعد ہمیں اُن مسائل کو حل کرنا تھا جو اُلجھا دیے گئے تھے' اُن حقوق کی بات کرنا تھی جو چھین لیے گئے تھے اور اُن رکاوٹوں کو دُور کرنا تھا جو عوام کی مسرتوں اور سعادتوں کی راہ میں حائل تھیں۔

جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ توقعات اور تقاضوں کے یک سر برعکس ہے' یہاں عوام کے حقوق کو منوانے کے بجائے فساد انگیز مناظرے کا حق ادا کیا جا رہا ہے۔ اب جو بات سب سے زیادہ اہم فرض کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کون کافر ہے اور کون مسلمان؟

عزیزو! اسلام ایک دین ہے اور اس کے کچھ بنیادی اُصول ہیں جو ان اُصول کو مانتا ہے وہ مسلمان ہے اور جو منکر ہے وہ یقیناً غیر مسلم۔ وہ اُصول اصلاً تین ہیں عقیدۂ توحید' عقیدۂ رسالت اور عقیدۂ قیامت۔ ان پر مسلمان ہونے کا انحصار ہے۔ اب رہی یہ بات کہ مسلمانوں کا فلاں گروہ بعض سیاسی اور معاشی مسائل کے سلسلے میں اسلام کی کیا تعبیر پیش کرتا ہے اور کس طریقِ کار کو اسلام کے مطابق سمجھتا ہے تو اس کا مسلمان یا مرتد ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔

دیکھیے! عقائد اور نظریات کے فرق کو ملحوظ رکھیے۔ ایک زمانے میں ساری دنیا کی اکثریت کے مانند مسلمان علما کا نظریہ اور عوام کا خیال یہ تھا کہ زمین چپٹی اور ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ آج سب مانتے اور جانتے ہیں کہ زمین گول ہے اور سورج کے گرد گھوم رہی ہے' جو لوگ زمین کو چپٹا مانتے تھے وہ بھی مسلمان تھے اور جو گول مانتے ہیں وہ بھی بہ ہر حال مسلمان ہیں۔ علمائے ملّت اور ملّت نے صدیوں تک فلک کو ایک ''گنبدِ بے در'' سمجھا ہے اور جب معراج کے سلسلے میں فلک کے پھٹنے اور جُڑنے کا سوال سامنے آیا ہے تو مسئلہ خرق والتیام کے عنوان سے اس کی موافقت میں علمائے اسلام نے فلاسفہ سے پُر زور بحثیں کی ہیں جو لوگ فلک کو ایک گنبدِ بے در سمجھتے تھے وہ بھی مسلمان تھے اور جو لوگ اسے محض ایک حدِ نظر جانتے ہیں' وہ بھی مسلمان ہیں۔ یا کہیے کہ نہیں ہیں؟

اب ہم سیاسیات کی طرف آتے ہیں۔ خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی معاشرے میں ملوکیت کا پُر جلال دور شروع ہوا اور ملوک و سلاطین کو خلفا' ظلِ اللہ اور نائب رسول کہا گیا۔ دنیائے اسلام میں صدیوں تک ان ملوک کے نام کے خطبے پڑھے گئے۔ مفتیوں نے انھیں

واجب الاطاعت قرار دیا۔ علما اور فقہا نے جو کتاب بھی لکھی اس کے دیباچے میں حمد و نعت کے بعد ان کی مدح و ثنا رقم کی گئی۔ حالاں کہ آپ مانتے ہیں کہ اسلام ملوکیت کے خلاف ہے۔ لیکن اسلام کی اس خلاف ورزی کے باوجود یہ تمام ملوک، سلاطین، علما، فقہا، مفسرین، محدثین اور عوام غیر مسلم قرار نہیں دیے گئے (اس لیے کہ طرزِ حکومت کا مسئلہ اُصولِ دین میں شامل نہیں ہے) تو ایک طرف تو یہ صورت کہ جابرانہ ملوکیت و قیصریت کی صورت میں اسلامی مزاج کی خلاف ورزی کی جائے اور خلاف ورزی کرنے والے خلفا اور ظلِ اللہ کہلائیں اور دوسری طرف یہ عالم کہ جو لوگ معاشی مساوات کے نظریے کو اسلامی حوالوں کے ساتھ قبول کر کے غریبوں اور مجبوروں کے دُکھ درد کا علاج کرنا چاہیں وہ مرتد اور کافر۔ یہ بڑی ہی بے ہودہ اور قابلِ شرم بات ہے۔ مسلمان یا کافر و مرتد ہونے کا تعلق اُصولِ دین کے اقرار یا انکار سے ہے۔ میدانِ حشر کو کراچی، ڈھاکا یا لاہور پر قیاس نہ کیجیے اور مطمئن رہیے کہ جب عقیدے کے بارے میں سوال ہوگا تو یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تم بھاشانی کے ساتھ تھے یا مودودی کے ساتھ؟

عالمی ڈائجسٹ، فروری 1970

ہم جس سماج میں رہتے ہیں

یہاں ہر قدم پر یقین و اعتماد کو ٹھیس پہنچتی ہے اور ہر لمحے ایک رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ پر ہمیں سوچنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہے؟ یقین کی اس قحط سالی اور بے یقینی کی اس گرم بازاری کا آخر سبب کیا ہے؟ کیا انسان فطرۃً اچھے اور فطرۃً بُرے ہوتے ہیں؟ یہ ایک طویل بحث ہے۔ اس سلسلے میں تاریخ کی درس گاہ نے جو علم ارزانی کیا ہے۔ اس کی روشنی میں سماجی قدروں اور رشتوں کا یہ مسئلہ بڑی حد تک واضح ہو جاتا ہے۔

ہم جس سماج میں رہتے ہیں، خود غرضی اور خود مرادی اس کا دستور اور حق تلفی اس کا رواج ہے۔ اگر ایک شخص اپنی خوشی کے لیے دوسرے کا دل دُکھاتا ہے، اگر ایک آدمی اپنے فائدے کے لیے دوسرے کو دھوکا دیتا ہے، اگر کسی نے کسی کے ساتھ غداری کی ہے اور ایک گروہ نے دوسروں کا حق مار رکھا ہے تو یہ سب کچھ اس سماج کی نہاد اور بنیاد کے عین مطابق ہے جو میدان تیار ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اس میں دوڑنے والے دوسروں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے آگے نکل جائیں وہاں جو شخص سلامت روی اختیار کرے گا وہ اپنا حقیقی کردار ادا نہیں کرے گا۔

اس سماج میں جو آدمی بُرا نہیں ہے وہ بے وقوف ہے۔ اب رہے "بُرے ہوشیار" تو ظاہر ہے کہ ان کا کچھ زیادہ قصور نہیں ہے۔ جس شخص سے بُرائی سرزد ہوتی ہے وہ اپنی بُرائی میں تہائی کا ذمّے دار ہے باقی کی ذمّے داری اس سماج پر ہے جس کی بنیاد شر پر رکھی گئی ہے۔ یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہی ہونا بھی چاہیے۔

برف و باراں کی شام کو اگر کوئی خستہ حال مسافر کپکپاتا اور کھانستا ہوا تمھارے مسکن کی

طرف سے گزرے تو اسے پناہ دو، اپنا کمبل اسے اوڑھا دو اور اس کی مدارات کرو، پر اس کے لیے تیار رہو کہ جب وہ واپس جائے گا تو تمھارے سینے میں چاقو گھونپ کر تمھارا سامان کمبل میں لپیٹ کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اس لیے کہ اسے آنے والی زمہریری شام کا خوف ستا رہا ہے اور آج شام جس کمبل نے اسے سردی سے بچایا ہے وہ تمھارا ہے۔ اب اگر چلتے وقت وہ کچھ زادِراہ اور یہ کمبل تم سے مانگتا ہے یا تم خود ہی یہ چیزیں اسے بخش دیتے ہو تو یہ احسان ہوگا۔ اور ایک مغربی دانش ور کا کہنا ہے کہ انسانوں میں ابھی اتنی اہلیت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ احسان کا بوجھ سہار سکیں۔ جو شخص بولنا نہیں جانتا اسے بولنا سکھاؤ، پر اس توقع کے ساتھ کہ جب وہ پہلی بار روانی سے بولے گا تو تمھیں گالی دے گا۔ جسے لکھنا نہیں آتا اسے لکھنے کی مشق کراؤ، پر نفس کی اس آمادگی کے ساتھ کہ جب وہ اپنا نام لکھنا سیکھ لے گا تو سب سے پہلے تمھارے قتل کے محضر پر دست خط کرے گا۔ اس سماج میں اگر تم یہ سنو کہ قاتل مقتول کا دوست نہیں تھا تو اس پر تعجب کرو۔

دوستی، مروّت، خلوص، محبت، دیانت اور شرافت یہ وہ اقدار ہیں جو ہمیشہ کچھ افراد کی حد تک بامعنی رہی ہیں ورنہ یہ محض الفاظ ہیں جنھیں اس سماج کی منافقت نے اپنے ضمیر کے جرائم اور اپنی نیت کے مفاسد کو چھپانے کے لیے اپنے استعمال میں رکھا ہے۔ اس سماج میں ہماری داہنی طرف بھی جھوٹ ہے اور بائیں طرف بھی، سامنے بھی اور پیچھے بھی۔ جھوٹ ہی جھوٹ ہے جس کے سبب یہ جھلاہٹیں ہیں اور کھوٹ ہی کھوٹ ہے جس کے باعث یہ جھنجھلاہٹیں ہیں۔ جھوٹ کے اس چوطرفہ ہجوم میں اگر تم اپنے سچ کو بچا سکو تو یہ بہت غنیمت ہے۔ پر اس سچ کے ساتھ بڑی اذیتیں ہیں، ہجوم میں احساسِ تنہائی کی اذیتیں اور اذیتوں میں تنہائی کا احساس۔

مگر یہ بددل ہونے کی بات نہیں ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان سے مایوس ہو سکتا ہے لیکن انسانیت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ انسان صرف زمانے میں سانس لیتے ہیں اور انسانیت زمانوں میں زندہ ہے۔

کہنا یہ ہے کہ وہ سماج ہی کیوں باقی رہے جس میں ایک شخص دوسرے کی لاش ہی پر

سے گزر کر آگے بڑھتا ہے۔ جس میں ایک انسان کو دوسرے کا احسان مند ہونا پڑتا ہے۔ جہاں ایک طبقہ دوسرے تمام لوگوں کے حقوق غصب کرنے کے بعد بھی مجرموں اور بدمعاشوں کا گروہ نہیں کہلاتا بلکہ "طبقۂ اعلیٰ" کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔

عالمی ڈائجسٹ، مارچ 1970

(یہی انشائیہ سسپنس، جنوری 1992 میں "ہمہ رُخ" کے عنوان سے معمولی قطع و برید کے بعد شائع ہوا)

اس طویل سفر میں

انسان نے ہزاروں سال کے اس طویل سفر میں آخر کیا پایا جس میں وہ نامعلوم تاریخ کے تاریک غاروں سے نکل کر سیاروں کی تاب ناک دنیا تک جا پہنچا ہے۔ مانا جاتا ہے کہ حجری وحشیت سے جوہری مدنیت تک انسانیت کی پیش رفت زمین کے زمانوں کی سب سے زیادہ عظیم الشان سرگزشت ہے اور ابھی تو انسانی علم کی دودھ بڑھائی ہوئی ہے، ابھی تو وہ گھٹنوں کے بَل چل رہا ہے، ابھی تو اسے اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا ہونا ہے۔ پھر بھی اس بچّے نے کتنی چیزیں اُلٹ پلٹ کر ڈالی ہیں اور وجود کے صحن میں کیا کچھ لا بکھیرا ہے، کیا کچھ توڑا ہے اور کیا کچھ جوڑا ہے اور اس طرح کیا کچھ پایا ہے اور کیا کچھ بنایا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس نظامِ شمسی کی عجیب تر آیتیں اس کرّہ ارض کے سینے پر لکھی گئی ہیں اور یہ کہ یہ سب سے زیادہ ماجرا ناک کرّہ ہے، ایک راست قامت جانور کتنا جوہر دار نکلا ہے جس کے بَل پر اس زمین نے آسمان سر پر اُٹھایا ہے۔

یہ سب کچھ ہوا ہے پر یہ سب کچھ کس لیے ہوا ہے؟ انسان نے ہزاروں سال کے اس سفر میں کیا پایا؟ چاند تمھاری مٹھی میں آ گیا ہے اور آیندہ تم سورج کو اپنی بغل میں دبا لو گے۔ پر اس سے تمھارا مقصد آخر کیا ہوگا؟ اکتشاد، ایجاد اور تسخیر، دانش کا سب سے بیش قیمت وظیفہ ہیں مگر کیا انسانوں کا یہ شان دار انہماک اپنے شرم ناک جرائم کو بھلانے کی کوشش تو نہیں؟ قرن ہا قرن اور ہزار ہا ہزار سال کے اس بادیہ نشین نے اپنے گرد پُر ہجوم شاہ راہوں اور پُر شکوہ شہروں کی ایک بھیڑ لگا رکھی ہے۔ پر سوچنا یہ ہے کہ اس بھیڑ میں اس نے کہیں اپنے آپ کو تو نہیں کھو دیا؟

وہ دانش تاریخ کے یوم القیام میں اپنا کیا جواز پیش کرے گی جس نے اس زمین پر زندگی کو کچھ اور بھی مشکل، کچھ اور بھی ناسازگار بنا دیا ہے۔ اس تہذیب کو تباہ کن اسلحے کے بجائے اپنے وجود کے جواز میں کوئی معقول دلیل پیش کرنا تھی اور یہ ایک الم ناک حقیقت ہے کہ وہ دلیل ابھی تک پیش نہیں کی جا سکی۔ کیا اس عہد کا انسان نیزہ بردار وحشیوں کی نسبت سے زیادہ مطمئن اور زیادہ مسرور ہے۔ کاش یہ دعویٰ کیا جا سکتا کہ ہر آنے والی نسل گزشتہ نسل سے اور ہر آنے والی صدی گزشتہ صدی سے زیادہ سعید اور خوش بخت ثابت ہوئی ہے۔

اس تہذیب کے بطن میں وہ عفونت آخر کس نے انڈیل دی ہے جس نے اس کے سانسوں کو زہرناک بنا ڈالا ہے؟ یہ حقیقت بہ شدت معرضِ اظہار میں آنا چاہیے کہ تہذیب کے اس بے مہر اور سطح شور ارتقا کی فضا زندگی کے لیے ناسازگار ثابت ہو چکی ہے۔ ارتقا ایک اصطلاح ہے اور انسانی سکون و سعادت کو بہ ہر حال اصطلاحوں سے زیادہ قیمتی قرار پانا چاہیے۔

عالمی ڈائجسٹ، جون 1970

(یہی نثاریہ سسپنس، مئی 2006 میں "گراں قدر" کے عنوان سے شائع ہوا)

تلخ اور تند

یہ اُکتائے ہوئے دلوں اور ترسائے ہوئے ولولوں کی زندگی ہے۔ گلیاں اس حقیقت کو چھپاتی ہیں اور بازار بے تکان جھوٹ بولتے ہیں۔ قدآور عمارتیں بیّنات کا آگا باندھے کھڑی ہیں۔ یہ ایک ایسی شہرگاہ ہے جہاں بصیرتیں کُڑھتی ہیں اور بے دانشی ٹھٹھے لگاتی ہے۔ یہاں محروم اور درماندہ لوگ خود اپنی محرومیوں اور درماندگیوں کے جواز میں تلخ اور تند بحثیں کرتے ہیں اور اشتعال انگیز دلیلیں ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ لنگڑے بڑے سوچ بچار کے بعد اس نکتے کو پاسکے ہیں کہ ہمارے لنگڑے پن ہی میں راستوں کے نشیب وفراز کی فلاح ہے اور جن کی آنکھیں پھوڑ دی گئی ہیں وہ اس پر شکرگزار ہیں کہ چلو چکاچوندھ سے نجات پائی۔ اس مریض کو صد آفریں جو دوا سے بھرا ہوا قدح اپنے معالج ہی کے منہ پر دے مارے۔

لفظوں نے یہاں کون سے رَخنے بھرے ہیں اور سطروں نے بھلا کس تعمیر کی داغ بیل ڈالی ہے۔ پڑھنے والوں کا مقسوم ہی یہ ہے کہ وہ لکھیں اور اپنے لفظوں کی بے اثری کے گواہ قرار پائیں۔ ویسے ان شہروں اور شہریوں کا مرتبہ اس سے کہیں زیادہ بلند ہے کہ ان کے باب میں خامہ فرساؤں کا بے بضاعت گروہ کچھ لکھنے کی جسارت کرے۔ ہر حال میں قلم کی سرنوشت صرف گھِسنا ہے اور روشنائی کی نمود صرف ضائع جانا اور پھر ہم تو اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو لکھنے والوں میں سب سے حقیر اور پست ہے۔ ہم تو لفظوں کے محض بازی گر ہیں۔ پڑھنے والوں کی ایک تماشا پسند بھیڑ کو اپنے گرد اکٹھا کرنا ہمارا پیشہ اور خوش باش فرصتوں کو بہلانا ہمارا ہنر ہے۔ لفظوں کا یہ استعمال صرف ہماری بے ضمیری ہی کا تحریری ثبوت نہیں بل کہ شاید اس معاشرے کا بھی ایک کرشمہ ہے جہاں چہروں کی چمک کے لیے ان پر تارکول ملا جاتا ہے۔

ان لوگوں کا وہ خستہ حال ماضی اس پر مایہ حال سے شاید بہتر ہی تھا جب یہ فیصلہ کرنا کہ لکھنا کیا ہے، لکھنے والوں سے تعلق رکھتا تھا۔ اب یہ فیصلہ کرنا کہ کیا لکھنا ہے اور کیا نہیں لکھنا ہر اس عزیز سے متعلق ہے جو الف کو بہ ہر حال ''الف'' اور بے کو بہ ہر طور ''ب'' ہی سمجھتا ہے۔ گزشتہ زمانہ لکھنے والوں کے ابہام کا زمانہ تھا اور یہ زمانہ پڑھنے والوں کے الہام کا زمانہ ہے۔ لوگوں کا احتساب حکومتوں کے احتساب سے زیادہ درشت اور سخت گیر ہے۔ اس احتساب کا ماحصل یہ ہے کہ خبردار ہمارے حق میں زبان نہ کھولنا' جو ہمیں گڑھے میں گرنے سے باز رکھے گا، ہم اسے زمین میں گاڑ دیں گے۔ کہنے کے لیے بہت سے نکتے ہیں اور لکھنے کے لیے بہت سے نسخے۔ پر تم یقین کرو کہ کہنے والے سننے والوں سے خوف زدہ' لکھنے والے پڑھنے والوں سے ہراساں ہیں۔ راست گوئی اور حق نگاری ہمارے لوگوں کو شاید ہی کبھی خوش آئی ہو۔

وہ باتیں کب تک سنے جاؤ گے جو آج تمھیں فقط پسند آ رہی ہیں۔ وہ باتیں کب کہنے دو گے جو کل تمھارے کام بھی آئیں گی۔ یقین جانو کہ تمھارے حق میں سب سے مفید بات وہ ہے جس سے تمھاری سماعت میں زہر گھل جائے۔ وقت کی اس پُر انبوہ اجتماع گاہ کو اس چیں بہ جبیں اور کف در دہن خطیب کی ضرورت ہے جو آ کر یہ کہے کہ لوگو! جو باتیں تم خوش دلی اور شوق مندی کے ساتھ سنتے رہے ہو وہ سب کی سب جرم و خباثت کی زبان سے کہی گئی ہیں اور ہوس ناکی اور شر طلبی کے کانوں سے سنی گئی ہیں۔ اب تک صرف تعفن اُگلا گیا ہے اور صرف غلاظتیں نگلی گئی ہیں۔ تمھاری نامیسر توجہ کی قسم، تم خود نہیں جانتے کہ جو کچھ کہتے رہے ہو، اس کا مطلب کیا تھا اور جو کچھ سنتے رہے ہو اس کا منشا کیا ہے؟ تمھارے خوش حافظہ معلموں اور تیز کلام اساتذہ نے تم سے اس قدر جھوٹ بولا ہے کہ اگر تم جان لو تو یقیناً تمھیں نطق و کلام سے نفرت ہو جائے۔ کبھی وہ باتیں بھی سننا چاہو جو گراں گزریں کیا معلوم کہ راستی اسی لہجے کا رس ہو جو تمھیں کڑوا لگتا ہے۔

عالمی ڈائجسٹ' جولائی 1970

(یہی انشائیہ سسپنس' اکتوبر 2006 میں بھی شائع ہوا)

دماغ ماؤف ہیں

یہ ان بیماروں کی بستی ہے جو یہ نہ جان سکیں کہ ان کا ہرج مرج کیا ہے؟ ایک سرسامی کیفیت ہے جس میں بولنے والے صرف بڑبڑا رہے ہیں۔ یہ وہ گونگے ہیں جو اَب بولنے پر آئے ہیں تو نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ بولیں تو کیا بولیں۔ سو انھوں نے زبان سے وہ سب کچھ اُگلنا شروع کر دیا ہے جو حلق، نرخرے اور ہونٹوں کی سکت میں ہے۔ یہ کتنے دُکھ کی بات ہے کہ لوگوں نے اپنے دُکھوں کو لاعلاج بنا رکھا ہے۔ تمام عمر ٹیڑھے راستے پر چلتے رہے اور جب سیدھے راستے پر پڑنے لگے تو یہی بھول گئے کہ جانا کہاں تھا؟ ہَت تمھاری کی، تم نے جب بھی کی، آزار شعاری اور بدہنجاری کی۔

یہ کیسی اُفتاد ہے کہ اُونچے اُٹھے تو نیچے چھلانگ لگانے کے لیے۔ زمانے سے مہلت پائی تو اپنے ہی خلاف سازش اور آپس ہی میں دراندازی کے لیے۔ یہ کیسی کُشائش ہے جس سے دم گُھٹا جا رہا ہے اور یہ کیسی کشود ہے جس نے گرہوں پر گرہیں ڈال دی ہیں۔

جو کچھ بھی سوچا گیا ہے، وہ بُری طرح سوچا گیا ہے۔ جو ہو رہا ہے، وہ بہت بُرا ہو رہا ہے۔ سَر دھروں نے اپنے چھوٹوں کی چارہ جوئی کے ٹالنے پر ایکا کر لیا ہے۔ اب تو شاید یہ بھی نہیں سوچا جا رہا کہ سوچنا کیا تھا۔

ثروت مندوں کو مژدہ ہو کہ حاجت مندوں نے بھنگ پی رکھی ہے اور اب انھیں کسی چیز کی حاجت نہیں رہی۔ محتاجی نے قابلِ رشک استغنا سیکھ لیا ہے۔ منعموں کو نوید دی جائے کہ فاقہ کشی نے روزہ رکھ لیا ہے۔ دراصل بھوکوں کو بہکا دیا گیا تھا۔ اب انھوں نے سر جھکا کر سوچ بچار کیا تو معلوم ہوا کہ بھوک لگ ہی نہیں رہی تھی۔ یہ روایت ہی غلط تھی کہ لوگ محرومی

میں مبتلا ہیں کہ خود محروموں نے اس کی تردید کر دی ہے۔

کیا ان بستیوں نے اس لیے آسمان سر پر اُٹھایا تھا کہ اوندھے منہ زمین پر آ رہیں۔ جس بندوبست کے خلاف بڑی چنچناہٹ تھی، اب کس طرح سہارا جا رہا ہے۔ کیا اب یہ سوچنے کی فرصت باقی رہی کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس سے کس کا بھلا ہو گا؟ دیاروں کے مدبّروں اور شہروں کے شہرت مداروں پر وَجد و حال کی کیفیت طاری ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہ کون کس کے حق میں بول رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو کس سے شکایت کرنا چاہیے۔

یہ تمیز مشکل ہے کہ اس گھپ اندھیرے میں کس کا گریبان کس کے ہاتھ میں ہے۔ دماغ ماؤف ہیں، اس لیے کہ اصل غایت کو بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ بُھلا دیا گیا ہے۔ ان جھنجلاہٹوں کی سرنوشت کیا ہو گی جن میں رعایت دی گئی ہے تو غصب کرنے والوں کو۔ اس پُرخاش اور پیکار کا انجام کیا ہو گا جس میں پناہ دی گئی ہے تو غبن کرنے والوں کو۔

عالمی ڈائجسٹ، اپریل 1971

(یہی انشائیہ سسپنس، نومبر 2000 میں بھی شائع ہوا)

خیرِ شامل

زمین پر انسان کا مقسوم کیا ہے؟ آخرکار موت؟ پر کیا اس سے پہلے ایک ایسی زندگی جس کو انسان نے خود ہی اپنے لیے ایک بے حاصل ابتلا اور ایک رسوا کن مشقت بنا لیا ہو۔ کیا صرف ایک ایسی ورزش، جس سے جوڑ جوڑ دُکھنے لگے۔ فقط ایک ایسی آزمائش جو حُلیہ بگاڑ ڈالے؟ موت سے پہلے کتنی موتیں اور ہلاکت سے پہلے کتنی ہلاکتیں ہیں جنھیں انسان نے بڑی کدّ و کاوش کے بعد اپنے لیے خلق و ابداع کیا ہے۔

مسابقت کا ایک ناپیدا کنار میدان ہے جس میں انسانوں کا ایک ناشدنی ہجوم بُری طرح دوڑ رہا ہے اور بُری طرح ہانپ رہا ہے۔ یہ نہ مانیں پر اُن کے پیروں میں چھالے پڑ گئے ہیں اور انتڑیاں گلے میں آ گئی ہیں۔ پر اُن میں سے کوئی بھی اپنے اوسان میں نہیں ہے۔ دَغل و دروغ کے اس طول و عرض میں جو ذرا قرینے سے چلے گا وہ کچلا جائے گا۔

دوڑتے رہو اس دوڑ میں سب سے آگے نکل جاؤ، پر کیا اپنے آپ سے بھی آگے نکل سکو گے؟ تم اندھے نہ ہوتے تو دیکھ سکتے کہ اس دوڑ میں تم پیچھے کی طرف کس قدر دُور جا پہنچے ہو۔ دانش مند موجود ہیں اور دانش مفقود۔ کوئی سمجھے تو کیا سمجھے اور کوئی سمجھائے تو کیا سمجھائے۔ مسابقت، حق ناشناسی، سفلگی، بے حیائی، بے غیرتی، ہتکِ حرمت اور کمینگی کے اس پُرغبار اور پُرغوغا میدان میں شنوائی کے کان بہرے اور بینائی کی آنکھیں اندھی ہو گئی ہیں۔ اس عالم میں ہر متنفس یہ گمان کر رہا ہے کہ میرے سوا کوئی دوسرا موجود ہی نہیں ہے اور اپنی جگہ دُرست ہی گمان کر رہا ہے۔

ہاں! یہ ایک ایسی تجارت گاہ ہے جہاں زید کو اپنی منفعت کے لیے بہ ہر قیمت عمرو کو ضرر پہنچانا ہے، خواہ یہ ضرر اپنے نفس میں پورے معاشرے یا پورے جامۂ انسانیہ ہی کا ضرر کیوں نہ ہو۔ یہاں کا ہر اثبات باقی سب کی نفی پر قائم ہے۔ پس اگر یہاں کوئی یہ چاہتا ہے کہ دوسرا اس کے راستے سے ہٹ جائے تو کیا غلط چاہتا ہے؟ اُسے اس کے سوا اور چاہنا بھی کیا چاہیے؟ اگر ایک شخص دوسرے شخص کے لیے ہر وقت بداندیشگی اور دُوں پیشگی میں مصروف ہے تو ہم اور تم اس پر اپنا دل جلا کر اس کا کیا بگاڑ لیں گے؟ ہاں! یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ ان تمام باتوں کی علّت کیا ہے۔

تاریخ کی جس کال کوٹھری میں تم محصور ہو، وہاں ہر طرف کالک اُڑ رہی ہے، تمھارے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنا منہ چھپائے رہو۔ پر ہے یہی کہ ایسے میں رُوسیاہی سے بچنا بہت مشکل ہے۔ ہاں ایک فرسودہ سی بات ہے جو شنیدنی ہے اور وہ یہ کہ چہرہ سیاہ ہو تو ہو مگر دل سیاہ نہ ہو۔ پر یہ ایک خیرِ شخصی ہے کہ مثلاً تم رُوسیاہی سے بچ جاؤ یا تمھارا دل سیاہ نہ ہو اور جس شَر کا ابھی مذکور تھا اس کا مداوا خیرِ شخصی میں نہیں، خیرِ شامل میں ہے۔ پس سوچا جائے کہ خیرِ شامل کا حصول کس طرح ممکن ہے؟

عالمی ڈائجسٹ، جون 19ء

(یہی انشائیہ سسپنس، اکتوبر 2000 میں "خیرِ کامل" کے عنوان سے شائع ہوا)

انسان کا شیطان

ایسا ہے کہ جرم ہمارے معاشرے میں ایک امرِ عادی بنتا جا رہا ہے۔ اغوا نے ایک خوش مذاقی اور قتل نے ایک خوش فعلی کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور جو لوگ اس کی استطاعت نہیں رکھتے وہ سُن کر محظوظ ہوتے ہیں۔ جہاں خود پسندی اور خود پنداری کے سوا ہر چیز باطل ٹھیرے' وہاں یہ نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ جہاں زبردستی سب سے بڑی فضیلت قرار پائے' وہاں ایسے تماشے نہ ہوں تو کیسے نہ ہوں۔

خود پروری' خود پنداری اور زبردستی کے بہت سے مسلک اور بہت سے مشرب ہیں اور ان میں سے ہر مسلک اور ہر مشرب ہمارے معاشرے میں فروغ پا رہا ہے۔ جسم روندے جاتے ہیں' رُوحیں کچلی جاتی ہیں' عزتِ نفس کو لُوٹا جاتا ہے' اور ان تمام باتوں کو اس طرح قبول کیا جاتا ہے کہ جیسے یہ سب کچھ معمول کے عین مطابق ہو۔ یہی نہیں کہ اب بُرائی کے خلاف احتجاج نہیں ہوتا بل کہ بُرائی اب ایک کاروبار بن گئی ہے اور اس کاروبار کے فروغ کے لیے ہمیں بُرائی سے لطف اندوز ہونے کی ترغیب دی جاتی ہے۔

انسان کے اندر جو شیطان چھپا ہوا تھا' اب وہ ارتکاب اور تجاوز کے راستے دکھاتا ہوا اس کے آگے آگے چل رہا ہے۔ خیرہ سری اور خیرہ چشمی نے جو قبولِ عام حاصل کیا ہے' وہ ہم بھی دیکھ رہے ہیں اور تم بھی دیکھ رہے ہو۔ اور یہ اس لیے ہے کہ ہم نے عمر ہا عمر سے اپنے معاشرے کو ظلم کے لیے سازگار اور عدل کے لیے ناسازگار پایا ہے۔ کیا ہم نہیں دیکھتے کہ جو زندگی میں حدود سے تجاوز کرتا ہے وہ فائدے میں رہتا ہے اور جو حدود میں رہتے ہیں وہ مارے جاتے ہیں۔

جوزندگی ہم گزار رہے ہیں، دراصل اس کی نہاد اور بنیاد ہی میں خرابی پائی جاتی ہے۔ یہ وہ خرابی ہے جسے اس خرابی کا کاروبار کرنے والے اور اس سے منفعت اندوز ہونے والے عینِ فطرت ثابت کرتے آئے ہیں۔ اسی ''عینِ فطرت'' امر نے زندگی کی فطرت کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے' اس لیے ہر چیز اپنی ضد اور ہر شکل اپنا عکس ہو کر رہ گئی ہے۔ چناں چہ جو صحیح ہے وہ غلط قرار پایا ہے اور جو غلط ہے وہ صحیح۔

یہ صورت اپنے حال پر رہے گی یہاں تک کہ اس خرابی کا دفیعہ نہ کیا جائے اور انسان کے اس شیطان کی گردن نہ ماردی جائے جو اسے ظلم اور ضلالت کی وادیوں میں بھٹکا تا پھر رہا ہے۔

عالمی ڈائجسٹ' جولائی 1971

نقل

ایک انگریزی فلم کے دوران پاکستان کی ایک آراستہ و پیراستہ بیٹی یہ جاننے کے لیے بے تاب تھی کہ پاکستان اور انگلستان کے درمیان کھیل کا جو مقابلہ ہو رہا ہے اس کا انجام کیا ہوا۔ اُسی نزدیکی میں ایک شخص نے جو ٹرانزسٹر سے کان لگائے کھیل کی رُوئیداد سُن رہا تھا، بتایا کہ پاکستان ہار گیا۔ اور پھر اُن بُردمند اور ارجمند ہستیوں کے دلوں میں ۱۸۵۷ء کا دُکھ تازہ ہو گیا۔ مغرب کے مقابلے میں مشرق کی بے حرمتی کا داغ پھر جَل اُٹھا۔

ہم جس بود و ماند میں قائم ہیں، اس میں انگلستان سے ہارنا تو ہارنا، جیتنا بھی ہارنا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بُوزنے نے ایک انسان سے یہ شرط بدی کہ جو فلاں انسان کی ہو بہو نقل اُتار دے، وہ اس پیڑ کے سارے پھلوں کا حق دار ہو گا۔ بُوزنہ اس نقل میں جیت گیا اور خوش خوش اپنے باپ کے پاس گیا۔ باپ نے کہا: اے میرے بیٹے! بُوزنے کا انسان کی نقل اُتارنے میں، انسان سے جیت جانا کیا تیرے خیال میں جیتنا ہوا؟

تمھارا ہر کام اور ہر کھیل مغربی ہے۔ پس تم ہارے تو کیا اور جیتے تو کیا؟ بل کہ دُکھ تو یہ ہے کہ تم ان کی نقل اُتارنے میں کبھی کبھی جیت بھی جاتے ہو۔ اے قوم! تیری مسخرگی دیکھنے کے قابل ہے۔ تیرا قومی احساس اب صرف کھیلوں کے میدان میں بیدار ہوتا ہے۔

ہم دانش وروں کے اُس فطانت نصاب اور حکمت مآب گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، جنھوں نے جراثیم کے ''قومی شعور'' پر خطبات دینے کی اہم ذمّے داری قبول کر رکھی ہے۔ جو حشرات کے ''تہذیبی تشخصات'' کے باب میں دادِ تحقیق دیا کرتے ہیں۔ جراثیم کا قومی شعور، حشرات الارض کے تہذیبی تشخصات...... ایک کیڑا میز پر جھکا ہوا مشرق کے عظیم ادبی ورثے

پر انگریزی میں مضمون لکھ رہا ہے۔ ایک مکوڑا' دیوانِ غالب ہاتھ میں لیے ہوئے' چاچا کی دُھن میں بحرِ ہزج کی سرپرستی کر رہا ہے۔

تم کیا اور تمھارا احساس کیا۔ تمھاری حیثیت کیا ہے۔ جب نہیں ہو تو کیوں کان کھائے جاتے ہو۔ ذرا اپنے آپ کو چُھو کر تو دیکھو۔ دیکھا تم نے۔ یہ کچھ اور ہے۔ اپنے سراپا پر نظر ڈالو۔ یہ کسی اور کی شکل ہے۔ تم جو چکھتے ہو اس کی شیرینی اور ترشی پر تمھارا کوئی حق نہیں۔ تمھارے کان دوسروں کے لیے سُنتے ہیں۔ تمھارا شامّہ دوسروں کے لیے سُونگھتا ہے۔ تمھارا لمس غلام' تمھاری بصارت غلام' تمھارا مذاق غلام' تمھاری سماعت غلام' تمھارا مشام غلام...... تمھیں وقت نے وہ مار ماری ہے کہ تمھارا حُلیہ بگڑ گیا ہے۔ تمھارا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ تمھارے ہونے کی اب محض ایک ہی دلیل رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ تم جگہ گھیرتے ہو۔ مشرق قائم و دائم ہے کہ چشمِ بد دُور...... مشرق میں طول' عرض اور عمق پایا جاتا ہے' خدا اس حجم کو قائم و دائم رکھے۔

عالمی ڈائجسٹ' اگست 1971

(یہی انشائیہ سسپنس' فروری 2006 میں "مشرق" کے عنوان سے شائع ہوا)

اِبتلا

جہاں تم ہو وہاں انسانیت گندی اور گھناؤنی بیماریوں میں پڑی سڑ رہی ہے، افلاس اس کی پٹی سے لگا بیٹھا ہے اور اس کا لہو چوس رہا ہے اور محرومی اس پر جھکی ہوئی اس کے پھوڑوں سے رِستی ہوئی پیپ چاٹ رہی ہے اور اس کے تیماردار ہیں کہ اپنے سانس روکے ہوئے دُور کھڑے ہیں اور اگر کوئی پاس سے گزرتا بھی ہے تو اپنی ناک پر ہاتھ رکھ کر۔ اطراف وجہات میں سمّیتِ سرایت کر چکی ہے ایسے میں کسی احتیاط سے بھلا کیا ہوگا؟ تم بدروزگاری میں مقیم ہو اور بیماری میں متوطن۔ جہاں فضا کو عارضہ لاحق ہو اور ہوا علیل ہو گئی ہو وہاں کس کی خیریتِ مزاج دریافت کی جائے گی۔ مہلکے میں سانس روکا تو کیا اور سانس لیا تو کیا؟

یہ بیماریاں نسلوں سے پالی جاتی رہی ہیں اور یہ پھوڑے زمانوں سے پک رہے ہیں۔ جنھوں نے اس کیفیت کا رونا رویا انھیں ہمیشہ عافیت دشمن کہا گیا اور کہا گیا کہ یہ تو مقسوم ہے اور مقسوم سے کس نے سرتابی کی ہے اور یہ بھی کہ صحت کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پہلو میں بیماری بھی پائی جاتی ہو اور ایسے بھی جالینوس ہیں جنھیں جو نسخے بہت زیادہ عزیز ہیں وہ صرف انھیں کو استعمال کرانا چاہتے ہیں، خواہ بیماری کی نوعیت کچھ بھی ہو۔

بے لاگ تشخیص، بے باک تجویز اور بے لوث علاج کے بغیر بیمار کی صحت اور اپنی عافیت کی اُمید باندھنا ہوس ناکی ہے۔ قریب ہے کہ یہ ہوس ناکی خود تمھیں اس حال تک پہنچا دے کہ دنیا تمھاری عیادت کرے، یہاں تک کہ تعزیت فرض ہو جائے۔ مگر تم ہو کہ اصل علاج کو طرح طرح سے ٹالنا چاہتے ہو اس لیے کہ اس علاج میں بیمار سے زیادہ تیمارداروں

کو پرہیز کرنا پڑے گا۔ پس وہ کچھ ایسے نسخے استعمال کرانے پر زور دیتے ہیں جن میں بیمار کو پانی کے ساتھ سفوف پھانکنے اور تیمارداروں کو معجونیں اور مربّے چاٹنے کی ہدایت کی گئی ہو۔ وہ مرض تشخیص کیا گیا ہے جس کے علاج سے بیمار کو شفا کے بجائے تیمارداروں کی تنومندی میں اضافہ ہو۔

پر کیفیتِ حال کچھ ایسی ہے کہ اگر اب بھی بیماری کا صحیح صحیح علاج نہ ہوا تو پھر سب ہلاکت میں پڑیں گے اور یہ دامن دراز ابتلا سب کو چاٹ جائے گا۔

عالمی ڈائجسٹ، ستمبر 1971

(یہی انشائیہ سسپنس، جولائی 2006 میں بھی شائع ہوا)

ٹھٹول

اس قوم کے ساتھ ایک ٹھٹول کیا جاتا رہا اور کیسا ٹھٹول' ایسا کہ آخر یہ ایک ٹھٹول ہی بن کر رہ گئی۔ کہنے کی باتیں بہت سی ہیں پر' فرازنشیں ساعتوں کی سطوت و سلطنت نے ہمیشہ وہی کچھ سُننا چاہا جو اسے خوش آتا ہو۔ سچ کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں پر یہاں سب سے زیادہ مقبول تعریف یہی رہی ہے کہ سچ وہی ہے جو ہم سُننا چاہتے ہوں سو' جب معاملت یہی ٹھیری تو پھر اس کی پوری پوری قیمت بھی ادا کرو۔ جو گانٹھ کے پورے خواہشوں اور خودمُرادیوں کے بازار میں مول ٹھیرانے نکلے تھے' وہ مول توڑتے تو کہاں تک؟ کوئی مول تو لگانا ہی تھا کچھ تو گانٹھ سے جانا ہی تھا۔ اپنی گانٹھ سے یا دوسروں کی گانٹھ سے۔ سو' اِس سودے میں جو کچھ گیا وہ قوم کی گانٹھ سے گیا۔

ماضی میں کیا ہوا؟ کیا نہیں ہوا۔ حالات خود بخود خراب نہیں ہوئے' انھیں پوری دل جمعی اور تن دہی کے ساتھ خراب کیا گیا۔ اور یہ سلسلہ حالات کے عقب میں دُور تک پہنچتا ہے۔ ملک کو آزاد ہوئے ابھی برس ہی کے گزرے تھے کہ بد باطنوں کے ہاتھوں اس قوم کے بُرے دن آ گئے۔ غیروں کے وظیفہ خوار لُقّوں اور خطاب یافتہ لُقندروں نے' سفلگی' سفلہ پروری اور سیاست گری کے چکلے میں اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ چوروں' سینہ زوروں' دھاندل بازوں اور دھاڑیوں کی وہ دھاڑ اپنے اڈّوں سے باہر جھپٹ پڑی جو بیرونی لٹیروں کا باردانہ ڈھویا کرتی تھی اور اس کے ساتھ ہی خباثتوں اور خیانتوں کے وہ خنگرے خطیب بھی ڈکارتے اور ڈگ بھرتے ہوئے آن موجود ہوئے جو اس ملک کے میلاد سے پہلے اس کی بدخواہی اور بدگوئی میں نام پیدا کر چکے تھے۔ اور پھر ایسا ہوا کہ جو لوگ

تاریخ کی عدالتِ عالیہ کے کٹہرے میں کھڑے کیے جاتے وہ فیصلہ صادر کرتے ہوئے دکھائی دیے اور جن کی مشکیں کسی جانا چاہیے تھیں' اُن کی سلامی اُتاری گئی۔ پھر کیا ہوا؟ پھر یہ ہوا کہ اُن سب نے مِل کر اُس چھیل چھبیلی چھنال کی دلاّلی کا پیشہ اختیار کیا جس کا نام بَٹ ماری اور سرمایہ داری ہے۔

جمہور کی آنکھوں میں دُھول جھونکی گئی اور عجیب عجیب حیلوں اور بہانوں سے ملک کو خاص طبقوں اور طائفوں کی جاگیر بنا دیا گیا۔ جنھوں نے آزادی کی جنگ جیتی تھی اُنھیں شکستیں نصیب ہوئیں اور جنھوں نے آزادی کی راہ میں روڑے اٹکائے تھے وہ بست وکشاد کے منصبوں پر فائز ہوئے۔ جمہور کی کسی بھی بات کو نہ سُننا حکمت عملی اور اپنی ہر ایک ہٹ دھرمی کو منوانا تدبر قرار پایا۔ اس کیفیت نے عوام کے ایک حصّے کو مایوس اور دوسرے کو ماؤف کر کے رکھ دیا اور پھر کس حد تک!

ایسا تھا' سو وہ کچھ ہوا جو ہوا۔ اب کیا سوچا ہے؟ وہ کیا تھا جو ہونا چاہیے تھے اور نہیں ہوا' اور وہ کیا ہے جو ہونا چاہیے اور نہیں ہو پا رہا......؟

عالمی ڈائجسٹ' اکتوبر 1971

خسارہ

راستی، راستائی اور راستینی تلاش کرنے والوں کے لیے یہ ایک پُر آشوب زمانہ ہے۔ دلوں میں تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ دلیلوں پر درہمی کی اُفتاد پڑی ہے اور دانش پر دیوانگی کے دورے پڑ رہے ہیں۔ نیکی اور بدی اس طرح کبھی خلط ملط نہ ہوئی تھیں۔ اِدھر یا اُدھر، جدھر بھی دیکھو ایک ہی سا حال ہے۔ تیرہ درونی نے اپنی دستاویز درست کی ہے اور کجی، کج رائی اور کج روی کا دستور جاری کیا گیا ہے۔ جو سمجھانے والے تھے، وہ اپنے افادات کی مجلسوں میں بُرائی سمجھا رہے ہیں۔ بُرائی سوچی جا رہی ہے اور بُرا چاہا جا رہا ہے۔ خیال اور مقال کی فضا اس قدر زہرناک کبھی نہ ہوئی تھی۔ انسانی رشتے اتنے کم زور کبھی نہ پڑے تھے۔

ایک اور فتنہ برپا ہوا ہے، وہ ادھوری سچائیوں کا فتنہ ہے۔ اس نے انسانیت کی صورت بگاڑ کر رکھ دی ہے۔ ایک آنکھ، ایک کان، ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ کی انسانیت زندگی کے حُسنِ تناسب کا نادر نمونہ ٹھہری ہے۔ یہی وہ انسانیت ہے جس کے باعث اس دور میں ہماری تاریخ کے سب سے بدترین واقعات ظہور میں آئے ہیں۔ گمان گزرتا ہے کہ یہ انسانوں کی نہیں، نسناسوں کی دنیا ہے اور ہم سب نسناس ہیں، جسے دیکھو وہ غیر انسانی لہجے میں بولتا ہوا سُنائی دیتا ہے۔

سماعتوں پر شیطانی شطحیات نے قبضہ جما لیا ہے۔ یہاں جو بھی کان دھر کر سُن رہا ہے، وہ کانوں کے گناہوں کا مرتکب ہو رہا ہے۔ سو چاہیے کہ ایسے میں نیک سماعتیں اعتزال اختیار کریں۔ اپنی نیتوں کی نیکی پر سختی سے قائم رہو اور اس کی ہر حال میں حفاظت کرو کہ تمھارے پاس یہی ایک متاع باقی رہ گئی ہے اور یہی تمھاری سب سے قیمتی متاع بھی ہے۔

نفرتوں کی گرم بازاری اور محبتوں کی اس قحط سالی میں دُکھی انسانیت کے دُکھ اور بھی بڑھ گئے ہیں۔ اس بیمار کے تیمارداروں اور غم گساروں کی تعداد آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ اچھائی اور برائی میں ایک عجیب معاملت ہوئی ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے اپنے ناموں کا آپس میں تبادلہ کرلیا ہے۔ اب ہر چیز اپنی ضد نظر آتی ہے۔ علم، جہل پر ریجھ گیا تھا اور جہل، علم کے خطاب پر بُری طرح لوٹ پوٹ تھا۔ سو دونوں ہی نے ایثار سے کام لیا۔

انسان کو اس دور میں وہ وہ منفعتیں حاصل ہوئی ہیں جن پر ہر دور کا انسان رشک کرے۔ پر اس کا خسارہ بھی اسی قدر شدید ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کے اس انبوہ میں خود انسان ناپید ہو گیا ہے۔ جس مزاج اور جس قماش کی دنیا میں ہم رہتے ہیں، اس کا حال تو یہی ہے اور یہی ہونا بھی تھا۔ کوئلے کی کمائی کالک کے سوا اور کیا ہے؟ اندرائن کے پیڑ سے کیا کبھی انگور کے خوشے بھی توڑے گئے ہیں؟

عالمی ڈائجسٹ، نومبر 1971

(یہی انشائیہ سسپنس، اگست 2001 میں "بڑا خسارہ" کے عنوان سے شائع ہوا)

اُمید

یہ ملک اپنی زندگی کے سب سے زیادہ نازک اور سنگین دور سے گزر رہا ہے۔ جو حالات پیش آ چکے ہیں وہ کبھی پیش نہ آئے تھے۔ حادثے اپنے جبڑے کھولے کھڑے ہیں، ایسے کہ اُن کی کچلیاں تک دکھائی دے رہی ہیں۔ ایسے میں لازم ہے کہ ہم عصبانیت اور جذباتیت میں مبتلا نہ ہوں اور ہوش مندی اور حکمت سے کام لیں۔ جو لوگ، لوگوں کی رائے اور رویّت پر اثر انداز ہوتے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ متانت اور معقولیت کی تلقین کریں اور حالات کا صحیح ادراک پیدا کرنے کا فرض انجام دیں۔

افراد کو اپنے منافع، جماعتوں کو اپنی اغراض اور خاص طور پر رعایت یافتہ طبقوں کو اپنے مفادات سے بلند ہو کر معاملات پر سوچنے اور فیصلہ کرنے کی سعی کرنا چاہیے۔ مقبول باتوں سے زیادہ معقول باتیں کرنے کی عادت ڈالنا چاہیے۔ صورتِ حال ہم سے اب کچھ زیادہ ہی حقیقت پسندی کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اگر ہم نے اس مطالبے کو پورا نہ کیا تو بُری طرح زک اُٹھائیں گے۔

واقعات نے ہمیں اتنے سبق دے دیے ہیں کہ اُن کے بعد ہم میں سے ہر شخص اپنی جگہ اب ایک فاضلِ کامل ہو گیا ہے۔ دنیا کے کسی گروہ کی علمی پیاس وقت نے اس طرح نہ بجھائی ہوگی جس طرح ہماری۔ ہم نے حوادث کی درس گاہ میں جو اتنا کچھ کسب کیا ہے، اب اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

پُر فساد نیتوں اور فتنہ انگیز نعروں نے ہمیں فضیحتوں اور ہلاکتوں کے سوا اور کیا دیا؟ سوچنے کی صلاحیت باقی ہے تو سوچو، سمجھنے کی سکت رہی ہے تو سمجھو۔ تمھاری سرگزشت دنیا کی

سب سے زیادہ عبرت ناک سرگزشتوں میں سے ایک ہے اور سب سے زیادہ عجیب واقعہ یہ ہے کہ یہ سرگزشت تم نے تاریخ کے صفحات پر اپنے ہی خون اور اپنی ہی خون چکاں اُنگلیوں سے رقم کی ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ ہمیں اپنے معاملات کی سنگینی کا ابھی پوری طرح اندازہ بھی نہیں ہے' ہوتا تو بعض اُمور میں ہمارا رویّہ ذرا مختلف ہوتا۔ بہ ہر حال اس موقع پر یہ امر اطمینان کا سبب ہے کہ صدرِ مملکت نے عوامی نمایندوں کو جلد ہی اقتدار منتقل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ سب سے زیادہ مناسب بات یہی ہے کہ اب فوج ملک داری کی ذمّے داری سے سبک دوش ہو جائے۔ خوش بخت ہیں وہ لوگ جو ٹھوکریں کھا کر آخر سنبھل جاتے ہیں' خوش نصیب ہیں وہ گروہ جو بھٹکتے بھٹکتے آخر راہ پر آ جاتے ہیں۔ اُمید انسانوں کی سب سے بڑی پونجی ہے۔ یہ بے مایگی کا آسرا اور بے نوائی کا سہارا ہے۔ سو ہم نے بھی اسی کا دامن تھاما ہے۔ اس بات کی اُمید کہ ٹھوکریں کھانے والے آخر سنبھل جائیں گے اور بھٹکنے والے آخر راہ پر آ جائیں گے۔

عالمی ڈائجسٹ' دسمبر 1971

آخری مہلت

وقت نے ہمارے باب میں اپنا فیصلہ صادر کر دیا' ہم نے شکست کھائی اور پھر کیسی شکست۔ ایسی شکست تو دشمنوں کو بھی نصیب نہ ہو۔ ہمارے سر جھک گئے' جھکا دیے گئے' جھکوا دیے گئے' ہمارے پرچم گر گئے' گرا دیے گئے' گروا دیے' تمھیں تمھارے رہ نماؤں نے' گم راہ حکم رانوں نے' رُوسیاہ اور دولت مندوں نے تباہ کیا۔ تمھاری بستیوں میں نیکی اور بدی کی تمیز اُٹھ گئی تھی۔ عدل و ظلم کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہ رہا تھا۔ تمھارے سوداگروں' منصب داروں اور حکم رانوں نے مشرقی بنگال کو اپنی حرص و ہوس کی چراگاہ اور اپنی چیرہ دستیوں کی آزمایش گاہ بنایا اور وہاں کے لوگوں کے احتجاج پر کان نہ دھرے' ان کی جھونجلیں بڑھتی گئیں اور جھنجھلاہٹیں آہستہ آہستہ بھڑکتی رہیں۔

ایسے میں انھیں ہر وہ شخص نجات دہندہ ہی نظر آتا' جو اُٹھے اور انھیں جوش دلائے سو ایسا ہی ہوا۔ سرمایہ داروں کا ایک پُرجوش اور علاقہ پرست پروردہ اُن کا پیغمبر بن گیا۔ یہ ہمارے زمانے کا ایک عبرت ناک تمسخر ہے کہ جس مجیب کو تمھارے مدبّروں کے بگاڑ نے بنایا' امریکا نے اُکسایا' اسے روس نے گلے لگایا۔ تمھارے عالی شان لوگوں نے ایسی دھاندلی مچا رکھی تھی کہ اس کے خلاف قاتل بھی احتجاج کرتا تو مسیحا کہلاتا اور یہی ہوا بھی۔

بستیوں میں غصے بوئے گئے تھے' سو انتقام کاٹا گیا۔ کیا یہ سب کچھ اچانک ہوا ہے؟ مگر ہوش کسے تھا' کہنے والوں کی سُنتا کون تھا۔ پاکستان کی بیماریوں کے علاج کی بات' پاکستان کے نظریے کے خلاف سمجھی گئی۔ آسماں پرداز سیاست کے بدباطن مفتیوں نے فتنہ انگیز فتوے دیے۔ اس ملک کے بانیوں کی نسل کے امانت فروش سیاست دانوں نے غابنوں اور

غاصبوں کی دلّالی کی۔ اور یہاں بھی فتنے پھیلائے اور وہاں بھی۔

تمھارے ہوس پیشہ اور فرعون اندیشہ آمروں اور امیروں نے اپنی بدمستی میں اُن بےقصور، مجبور اور محصور لوگوں کے انجام کو بھی نظر میں نہ رکھا جو وہاں آباد ہو گئے تھے، بل کہ انھیں اپنی اشتعال انگیز سیاست میں ملوث کیا۔ اُن سیدھے سادے سکونت گزینوں کو وہ نکتے سکھائے اور ان سے وہ باتیں کہلوائیں جو ماحول اور ناراض مقامیوں کو اور غصّہ دلائیں اور اس طرح اُس فریب خوردہ گروہ کو کہیں کا بھی نہ رکھا۔ سو وہاں جب بھی ظالموں کے خلاف غیظ وغضب بھڑکا تو سب سے پہلے یہ خوں گرفتہ گروہ ہی اس کا نشانہ بنا۔ یہ ایسی بدنام اور بدانجام سیاست تھی کہ اس کے باعث مظلوم تک ظالم کہلائے اور مقتول تک قاتل قرار پائے۔ اسی سیاست کے نتیجے میں آخرکار ہم پر بدکاروں اور لفنگوں نے حکومت کی اور طوائفوں اور ان کے دھگڑوں اور دلّالوں نے ہمارے معاملات طے کیے۔

جب انتخابات کے بعد حکم رانوں کی بدنیتی کے خلاف وہاں احتجاج بھڑکا اور وہاں کے بدباطن خطیبوں نے محروم عوام کو گُم راہ کر کے علاقوں اور لہجوں کے خلاف اور بھی نفرت پھیلائی اور انتقام کی آگ بھڑکائی تو زمین کا یہی بدنصیب گروہ اُس آگ کا ایندھن بنا۔ حالات خراب سے خراب تر ہوئے اور یہی ہمارے حکم رانوں کی خواہش بھی تھی۔ سو وہاں فوج مسلّط کر کے کُشت وخون کا بازار گرم کیا گیا۔ اس وقت یہاں کیا ہوا؟ اعتراف کرنا چاہیے کہ یہاں لوگوں نے خوشی سے بغلیں بجائیں۔ ہم اُن دانش وروں کو جانتے ہیں جن کے چہرے اس قتل وخون ریزی کا حساب لگاتے وقت خوشی سے دمکتے نظر آتے تھے۔ مقتولوں کی تعداد جتنی زیادہ بتائی جاتی تھی، پاکستان کے استحکام پر اُن کا یقین اتنا ہی بڑھتا تھا۔ ایک شخص کہتا تھا کہ فوج نے دو لاکھ آدمی ٹھکانے لگا دیے تو دوسرا بدمزہ ہو کر اس کی تردید کرتا تھا کہ تمھیں کچھ خبر نہیں، دس لاکھ قتل کیے گئے ہیں، اور پھر اطمینانِ نفس اور تہنیت کی کیفیت میں دوسری روایت کو اتفاقِ رائے کے ساتھ صحیح تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ شیطانی خواہشوں کی ہوس ناکیوں اور عیّاشیوں کا دور تھا۔ یہ ذہنوں کو ماؤف اور عقلوں کو مخبوط کر دینے والا زمانہ

تھا۔ یہ ایسا زمانہ تھا جب بُری باتیں ہی نہیں' اچھی باتیں بھی عام طور پر بُری نیت ہی سے کہی جاتی تھیں' جیسے یہ بات کہ اقتدار مجیب الرجمان کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ بات کوئی کسی نیت سے کہتا تھا اور کوئی کسی نیت سے مگر دولت مندوں کے شکست خوردہ دلال یہ بات اسی لیے کہتے تھے کہ وہ فیصلہ بے اثر ہو جائے جو مغربی پاکستان کے عوام نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں کیا تھا۔

پھر ہندوستان' مشرقی بنگال کا حمایتی بنا اور روس ہندوستان کا حمایتی۔ اور تمھارا مشرق بھی ہلاکتوں کی لپیٹ میں آ گیا اور مغرب بھی۔ ہماری سرحدیں ہمارے خون سے لہولہان ہو گئیں اور پھر ہم سے ہتھیار ڈلوا دیے گئے۔ یہ ہتھیار اتنی بڑی فوج نے ڈالے جس کے ذریعے ملک فتح کیے جا سکتے ہیں۔

ہم مشرقی بنگال میں روند ڈالے گئے۔ ہمارے لوگ وہاں ابھی تک مرگ و ہلاکت کے گھیرے میں ہیں۔ ہمارے جو لاکھوں آدمی مار ڈالے گئے' اُن پر آنسو بہانا بھی شاید خلافِ مصلحت ہے۔

ہائے وہ بدنصیب موت جس کی تعزیت بھی نہ کی جا سکی۔ ہائے ہلاکتوں کے حصار میں گھرے ہوئے وہ بدبخت جنھیں تسکین پہنچانا بھی ہمارے بس میں نہیں۔

یہ تھی ہماری سرگزشت اور یہ تھی ہماری سرنوشت جو اس حرام کار اور ہلاکت انگیز سیاست کے قلم سے رقم ہوئی' جسے مذہب کی طرح مقدّس قرار دیا گیا تھا۔

اب تو ہوش میں آ جاؤ' اب تو فتنہ پرور باتیں مت کرو۔ اب تو وہ حرکتیں چھوڑ دو جنھوں نے تمھارے وجود کا حُلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ جو رہ گیا ہے اسی کو بچا لو۔ یہ آخری فرصت ہے۔ یہ آخری مہلت ہے۔ یہ بہترین مہلت ہے۔ اس مہلت کو رائگاں نہ جانے دو۔ اب تو یہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں رہی کہ یہ مہلت بھی رائگاں چلی گئی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ تم زمانے کے معتوب و مغضوب گروہ ہو' ایک معتوب و مغضوب گروہ کو راتوں اور دنوں کے ساتھ نخرے کرنے کا کوئی حق نہیں۔

تم چاہو تو حالات کا رُخ موڑ سکتے ہو اور دیکھو حالات بھی تمھارے لیے سازگار ہو گئے

ہیں۔ اُٹھو اور اس معاشرے کی تعمیر کے لیے کمربستہ ہو جاؤ، جس کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنا ہی تمھارے مقدس رہ نماؤں کا وتیرہ رہا ہے۔ مساوات کا معاشرہ، محنت کشوں کے اقتدارِ اعلیٰ کا معاشرہ۔ رہ زنوں سے ہوشیار رہو، فتنہ انگیز خطیبوں کے بہکاوے میں نہ آؤ۔ ان کے لفظوں کا منتر چل گیا تو پھر تم صفحۂ تاریخ سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جاؤ گے، غلطیوں سے بچو اور غلطی کرنے والے کو سختی سے ٹوکو، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ اپنی راہ کو دشوار نہ بناؤ اور نہ کسی دوسرے کو اس کی اجازت دو، یہاں تک کہ وقت تمھیں یہ مژدہ سنائے کہ لو تم منزل تک پہنچ گئے۔

عالمی ڈائجسٹ، جنوری 1972

دردمندانہ

آج ہم اس گروہ کے خاندان اور خسارے کا حساب لگائے بیٹھے ہیں جس کا وجود ہی بدانجامی، جس کا نام ہی بدنامی اور جس کا سارا کام ہی ناکامی ہے۔ یہ ایک دردمندانہ حساب کتاب ہے سو اُمید ہے کہ اس پُرخلوص سے نظر ڈالی جائے گی اور اس کا غلط مطلب نہیں لیا جائے گا۔ اس گروہ کو سابق مشرقی پاکستان میں بہاری کہا جاتا ہے۔ یہ تاریخ کے وہ جذامی ہیں، جن سے بستیاں بریّت چاہتی ہیں اور قبیلے دامن بچاتے ہیں۔ یہ اسی لیے تھا کہ بُری طرح رَد کیے جائیں، یہ اسی لیے ہیں کہ راندہ قرار پائیں یا روند ڈالے جائیں۔ یہ وہ طرفہ لوگ ہیں جنھوں نے خود ہی اپنی جڑیں اُکھاڑ پھینکیں، اچھا کیا یا بُرا کیا مگر کیا یہی۔ یہ وہ عجوبۂ روزگار ہیں جنھوں نے خود ہی اپنے آپ کو منہ کے بل زمین پر گرا دیا۔ اپنی زمینوں پر ان کے پاؤں نہ ٹکتے تھے اور اپنے آسمانوں کو دیکھ کر ان کے کاندھے دُکھنے لگتے تھے۔ سو اس کی سزا یہی ہے کہ انھیں زمین میں کہیں بھی پناہ نصیب نہ ہو۔ انھیں اپنے گھروں سے بیر تھا، اس کی جزا یہ ہے کہ آج ان کا کوئی گھر نہیں۔

یہ آزاری جہاں بھی جائیں گے، وہاں اپنے ہی خلاف سازشیں کریں گے۔ یہ ہمیشہ اپنی گھات میں رہے اور جہاں بھی داؤ پڑا دہیں اپنے اُوپر کاری وار لگایا۔ ان کے منہ کو اپنا خون لگ گیا ہے۔ انھیں اپنا وجود ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ ان کی سرگزشت تماشا ساز تلخ کامیوں اور مضحکہ خیز تیرہ بختیوں کی سرگزشت ہے یہ سلسلہ شروع سے شروع ہوتا ہے۔ جب برِصغیر کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا تو انھوں نے اپنی آبادیوں کے بجائے اِن آبادیوں کے حق میں ہاتھ اُٹھائے اور وہاں اپنے لیے کوئی گنجایش باقی نہ چھوڑی۔ اس گروہ کے جو

لوگ وہاں ہیں، وہ اب بھی یہیں کی باتیں کرتے ہیں اور جو یہاں آ گئے ہیں، وہ زمین کی حقیقتوں کے بجائے آسمانی سیاست پر عقیدہ رکھتے ہیں۔

ہاں یہ فریب خوردہ گروہ ہیں۔ انھوں نے پاکستان کی خاطر ہمیشہ دھوکا کھایا اور گزشتہ ۲۴ سال میں عام طور پر انھیں نعروں کی حمایت کی جو بدنیتی کے ساتھ اور فریب کاری کی غرض سے لگائے جاتے رہے۔ انھوں نے اپنی نافہمی کے باعث اُن جماعتوں کا ساتھ دے کر اپنا منہ کالا کرایا، جو سیاست کے بازار میں کوئلوں کا کاروبار کرتی تھیں۔ وہ ان خطیبوں کے بہکائے میں آتے رہے، جن کا پیشہ سرمایہ داری نظام کے لفنگوں اور لٹیروں کی دلّالی تھا۔ ان کے ذہنوں کو پاکستان کے اصل مسئلوں سے بے خبر رکھ کر پاکستان کے نظریے کے ذریعے ماؤف کیا گیا۔ یہ لوگ اپنی ساری کشتیاں جلا کر یہاں آئے تھے اس لیے پاکستان کے وجود اور اس کی بقا کے باب میں زیادہ سے زیادہ یقین کسب کرنا چاہتے تھے، یہ یقین ان کو آسمانی سیاست کے پیشواؤں نے زمین کے بجائے آسمان سے فراہم کیا اور زمین کی سچائیوں کو مسترد کر دیا۔ اس طرح وہ ایک زمین دشمن سیاست کے حمایتی قرار پائے اور یہاں کے ہر علاقے میں بدنامیاں کمائیں، اس حد تک کہ اگر کوئی ان کے کسی حق کی بات کرے تو اس کی نیک نامی بھی خطرے میں پڑ جائے۔

مشرقی بنگال میں اُنہیں حرام کار حکم رانوں کی مجرمانہ، غاصبانہ اور قاتلانہ حکمت عملی لے ڈوبی اور اُنھیں پاکستان کے ان ''محافظوں'' ''مجاہدوں'' اور ''غازیوں'' کے باعث زک اُٹھانا پڑی۔ غرض پاکستان کی سیاست کو ایک فدیہ چاہیے تھا، سو یہ اس کا فدیہ قرار پائے۔

یہ ہے اس گروہ کی سرنوشت، جو نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا، حادثے ان کا نصاب ہیں اور تباہیاں ان کا نصیب۔ اگر کسی کی زندگی پر بیک وقت رویا اور ہنسا جا سکتا ہے تو وہ اس گروہ کی زندگی ہے۔

جب مشرقی بنگال میں فوج نے ہلاکتوں کا بازار گرم کیا تو ہم اس وقت بھی انسانیت کے اس بہیمانہ قتل پر کراہ اُٹھے تھے، ہم چیخنا چاہتے تھے مگر اُس فضا میں کراہنا بھی کچھ آسان نہ تھا۔ اس لیے کہ اُس وقت یہاں اس قتل و خون کی داد دی جا رہی تھی۔ اب یہ خانماں برباد

گروہ وہاں موت کے حصار میں گھرا ہوا ہے تو کیا ہمیں گڑھنا بھی نہیں چاہیے۔

مظلوم انسانیت کے دردمندو! انسانیت جہاں بھی مظلوم ہو تمھاری دردمندی کی مستحق ہے۔ ذرا سوچو' ان بدبختوں کا واقعہ کچھ کم عبرت ناک نہیں ہے جن کی بربادی پر اظہارِ افسوس کرنے سے بھی لوگ جھجکتے ہیں۔ ان میں سے جو ہلاک ہو گئے ان کی موت کو آنسو بھی نصیب نہ ہو سکے اور جو موت کی دھمکیوں سے نڈھال ہیں ان کی سسکیاں سُننے والا بھی کوئی نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ انھیں یہاں نہ لایا جائے' وہیں رہنے دیا جائے' یا پھر وہ ہندوستان چلے جائیں۔ ہمیں یہ کہنا ہے کہ وہ پاکستان آئے تھے۔ انھوں نے پاکستان کو چُنا تھا اور مشرقی بنگال اب پاکستان نہیں ہے۔ ایسی صورت میں پاکستان کے شہریوں کو کہاں جانا چاہیے۔ اور اگر انھیں ہندوستان ہی جانا چاہیے تو پھر ٹھیک ہے انھیں ہندوستان ہی جانا چاہیے۔ پر اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ باقی ماندہ پاکستان اپنا نام بدل لے اور پھر یہ کہ جو لوگ یہاں سے ہندوستان گئے تھے اُنہیں یہاں بلایا جائے۔ برِصغیر میں آبادی کے تبادلے کا یہ دوسرا ہنگامہ تاریخ کو یقیناً نصیحتوں اور عبرتوں کی ایک یادگار تقریب سے بہرہ مند کرے گا۔ ہم کہتے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ مذاق نہ کیا جائے' حکومت کا فرض ہے کہ وہ انھیں یہاں لائے۔ انھیں یہاں لاؤ' انھیں بچاؤ۔

عالمی ڈائجسٹ' مارچ 1972

حتمی

ہم دیکھ رہے ہیں کہ انسانوں نے انسانیت کی طرف سے کس طرح آنکھیں پھیر لی ہیں، محبت ہماری بستیوں میں مفقود ہوگئی ہے، ہر طرف نفرت کا دور دورہ ہے، نفرت کے جو منظر ہم نے اپنے دور میں دیکھے ہیں اُنھوں نے انسانیت کی نگاہیں نیچی کردی ہیں۔ ہمیں اپنی بستیوں کی پیش گاہوں پر بدی، بداندیشی اور بدکوشی کی منحوس تمثیلوں کے سوا اور کیا نظر آیا۔ سیاست نے کیا کیا؟ فقط سازشیں کیں، اس کا ماحصل یہ ہے کہ زندگی حرام ہو کر رہ گئی ہے۔ غرض مسندِ علم نے کیا فرض انجام دیا؟ جہالت کے حوصلے بڑھائے، اس کا حاصل یہ ہے کہ لوگ بدی کے نئے نئے گُر سیکھ گئے ہیں، مذہب نے کیا معجزہ دکھایا؟ اس کی تفصیل کے لیے ایک طومار چاہیے، یہ سب کچھ دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ اگر آدمی کا وجود کوئی تجربہ ہے تو یہ ایک بہت ہی بُرا تجربہ ہے۔

اس ملک کی اندھی سیاست اب بھی نچلی نہیں بیٹھی، یہ سیاست انسانی مسرتوں کے خلاف سازش کرنے کی خوگر ہے، اس کا کام نفرتیں پھیلانا اور اپنا کاروبار چلانا ہے۔ ہمیں اس سیاست کے خلاف جنگ کرنی ہے اور اس کے خداوندوں کو رُسوا کرنا ہے، یہ غریبوں کی جنگ ہے جو غاصبوں کے خلاف ہوگی، یہ مظلوموں کی جنگ ہے جو ظالموں سے کی جائے گی، اگرچہ یہ جنگ جاری ہے، پر اسے فیصلہ کن طور سے شروع ہونا ہے، یہی وہ جنگ ہوگی جو انسانیت کو فیروزمندی کی بشارت دے گی، اس جنت میں سب غریب اور سب مظلوم ایک طرف ہوں گے اور سارے غاصب اور سارے ظالم ایک طرف، ہاں اس جنگ میں غاصبوں اور ظالموں کی موت ہے، سو وہ غریبوں اور مظلوموں میں تفرقے ڈالتے ہیں اور

آیندہ اُن کی صفوں میں اور بھی انتشار پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

سُن لو! وہ ایسی باتیں کر رہے ہیں جو غریبوں اور مظلوموں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے نفرت دلائیں۔ سندھی اور غیر سندھی کا جھگڑا آخر کیوں کھڑا کیا گیا ہے' اس لیے کہ سندھی اور غیر سندھی غاصب' سندھی اور غیر سندھی غریبوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر اپنا حساب درست رکھنا چاہتے ہیں۔ یہی ان کی سیاست ہے اور یہی ان کی حکمت۔

سب سے زیادہ دُکھ کی بات یہ ہے کہ ہماری جدید درس گاہیں ان فتنہ انگیزیوں کا مرکز ہیں اور ہمارے طلبہ اور تعلیم یافتہ لوگ ان تعصبات کے سب سے پُرجوش وکیل۔ اگر یہ لوگ فریب کار نہیں ہیں تو یقیناً فریب خوردہ ہیں۔ یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ اس ملک میں جتنی نفرتیں پھیلائی ہیں وہ پڑھے لکھے لوگوں ہی نے پھیلائی ہیں۔ یہاں پڑھا لکھا ہونا اور تعصّبی ہونا دونوں کا ایک ہی مطلب ہے۔ علم نے جہل کو جس والہانہ انداز سے اپنے سینے سے لگا رکھا ہے وہ ہمارے دور کا ایک طرفہ ماجرا ہے۔ اس کی وجہ اس نظام میں تلاش کی جائے جہاں ہر شے جنسِ تجارت بن گئی ہے' چاہے وہ علم ہو یا فن۔ وہ نظام جس میں ایک کا نقصان دوسرے کا نفع ہے اور ایک کا زوال دوسرے کا کمال۔

تم ناخواندہ لوگوں سے بات کرو' اگر اُنہیں بہکا نہ دیا گیا ہو تو پھر تم دیکھو گے کہ ان میں نہ زبان کا تعصب ہے اور نہ علاقے کا۔ اگر انھیں کسی پر غصہ آئے گا یا وہ کسی سے نفرت کریں گے تو اس کے حق میں کوئی فلسفہ نہیں گھڑیں گے۔ ان کی نفرت اس شخص کی ذات سے آگے نہیں بڑھے گی جس سے اُنہیں اذیت پہنچی ہو۔ مگر یہ پڑھے لکھے لوگ اپنی نفرت اور غصّے کو ایک نعرہ اور نظریہ بنا کر پیش کریں گے۔ یہ لوگ مفسدانہ کلیے بنائیں گے اور گروہوں کے درمیان فتنے پھیلائیں گے۔ ہمیں ان لوگوں کی زبان سے اس قسم کے مقولے سُننے کو ملیں گے کہ ہر سندھی تعصّبی ہوتا ہے۔ ہر پنجابی سندھیوں سے دشمنی رکھتا ہے' ہر اُردو بولنے والا دوسرے لوگوں کے خلاف سازشیں کرتا ہے' یہ بے رحمانہ کلیے صرف چند مثالوں کو سامنے رکھ کر بڑی شتابی اور نہایت بے شرمی کے ساتھ لاکھوں اور کروڑوں انسانوں پر تھوپ دیے جاتے ہیں۔ جہاں تک خود اِس ''تعصب'' اس ''دشمنی'' اور اس ''سازش'' کا تعلق ہے تو یہ

اُس معاشرے کی دین ہیں جس میں ایک آدمی دوسرے آدمی کا حق مار کر ہی اپنی بیوی سے سرخ رُو ہوتا ہے' یہ نکتہ سمجھ لیا جائے گا تو نگاہوں کے سامنے سے ساری دُھند چھٹ جائے گی۔ آج کل ان حکیمانہ کلیوں اور دانش مندانہ مقولوں کی سماعتوں کے بازاروں میں بڑی مانگ ہے۔ لوگ یہ کلیے اور مقولے تحفے کے طور پر ایک دوسرے کی سماعت کو پیش کرتے ہیں۔

سمجھا جائے کہ یہ معاشرہ تاریخ کے جس دور سے گزر رہا ہے وہاں غرض مند طبقے اسی قسم کے شوشے اُٹھایا کرتے ہیں۔ اسی طرح کے اشغلے چھوڑا کرتے ہیں۔ ورنہ زبانوں اور علاقوں کے درمیان بھلا کیا جھگڑا ہے۔ آخر اس کے کیا معنی ہیں کہ تم فلاں آدمی سے اس لیے نفرت کرنے لگو کہ وہ ایک خاص زبان بولتا ہے یا ایک خاص علاقے میں رہتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ہر گروہ کو ہر گروہ کا دشمن ہونا چاہیے۔

ذرا یہ تو سوچا جائے کہ آخر زبان ہے کیا چیز؟ کیا وہ کوئی کعبہ ہے' کلیسا ہے مندر ہے یا کیا وہ کوئی خدا ہے؟ زبان ان اصوات یا ان تحریری علامات کا مجموعہ ہے جو معانی پر دلالت کرتی ہیں۔ اگر ہم کسی زبان سے نفرت کرتے ہیں تو شاید اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوگا کہ ہم اُس زبان کی اصوات یا علامات سے نفرت کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اصوات یا علامات سے بھلا کیا نفرت' کہ اصوات تو بس لہریں ہیں اور علامات صرف نشان۔ کسی زبان سے نفرت کرنے کا مطلب غالباً یہ ہوگا کہ ہم ان معانی یا خیالات سے نفرت کرتے ہیں جن کی وہ زبان حامل ہے۔ اب فرض کیا کہ ہم سندھی زبان سے نفرت کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ سندھی زبان میں جو معانی یا خیالات معرضِ اظہار میں لائے گئے ہیں۔ ہمیں ان سے نفرت ہے۔

سو اب لگے ہاتھوں ہمیں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ آخر وہ کون سے معانی یا خیالات ہیں جو سندھی میں ظاہر کیے گئے ہیں اور ہماری نفرت کا سبب بنے ہیں۔ اور کیا وہ ایسے معانی یا خیالات ہیں، جن کا اظہار پنجابی' اُردو' پشتو یا کسی دوسری زبان کی ساخت کسی طرح بھی قبول نہیں کرے گی؟ تو ظاہر ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ سندھی ایک زبان ہے اور اس میں یہ مفہوم بھی ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ "خدا ہے" اور نہ یہ بھی کہ "خدا نہیں ہے" پھر زبانوں سے نفرت کیسی؟

اب رہا علاقہ، تو اگر کوئی آدمی کسی علاقے کی بنیاد پر کسی آدمی سے نفرت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسے مخصوص حدودِ اربعہ، میدانوں، دریاؤں اور پہاڑوں سے نفرت ہے۔ گویا وہ کسی خاص جغرافیے سے نفرت کرتا ہے۔ تو عزیزو! بھلا جغرافیے سے نفرت کرنے کا بھلا کیا محل ہے؟ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ سرد ترین علاقوں میں رہنے والے طبعی اسباب کے پیشِ نظر گرم ترین علاقوں کو ناپسند کریں۔ لیکن ان علاقوں کے باشندوں سے نفرت کرنے کی آخر کیا تک ہے؟

علاقوں کی بنیاد پر نفرت کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ دنیا کا نقشہ اُٹھایا اور اپنے ملک کے سوا ہر ملک پر نفرت کا نشان لگا دیا۔ پھر یہ کیا کہ اپنے صوبے کو چھوڑ کر باقی ہر صوبے پر کشتنی اور سوختنی لکھ دیا۔ پھر اپنا ضلع چھوڑ کر تمام اضلاع کو گردن زدنی قرار دے دیا۔ پھر مزید حسنِ انتخاب کا ثبوت دیا اور اپنے شہر کے سوا تمام شہروں کو ناشدنی ٹھہرا دیا اور نقشہ لپیٹ دیا۔ اس کے بعد پھر یہی فیصلہ قرینِ قیاس نظر آئے گا کہ اپنے گھر کے سوا کوئی گھر بھی زمین پر نظر نہ آئے۔

آخر یہ کیا مذاق ہے! کیا تم لوگ پاگل ہوگئے ہو۔ پاگلو! ہوش میں آؤ۔ نفرت ضرور کرو مگر ظالم سے، عداوت ضرور رکھو مگر غاصب سے، دنیا کے تمام غاصب اور ظالم ایک ہی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ نہ سندھی ہیں نہ پنجابی نہ پٹھان اور نہ بلوچ نہ مقامی اور نہ غیر مقامی۔ وہ تو بس ظالم اور غاصب ہیں خواہ وہ یہاں ہوں یا وہاں۔ یہ سب کے سب ایک ہی کنبے اور ایک ہی کُنم کے لوگ ہیں۔ عالمی اور عالم آشکارا لوگ ہیں۔ ہاں غاصبوں اور ظالموں سے نفرت کرو کہ ان سے نفرت کرنا نیکی ہے۔ تمام غریب اور مظلوم ایک صف میں آجائیں کہ انھیں اس سرزمین پر غاصبوں اور ظالموں کے خلاف ایک حتمی جنگ کرنی ہے۔

عالمی ڈائجسٹ، اپریل 1972

(یہی انشائیہ سسپنس، اگست 1990 میں "بے معنی" کے عنوان سے شائع ہوا)

رُجحان

آج ہم حکومتوں کے سب سے زیادہ محبوب رجحان کے بارے میں گفت گو کریں گے۔ یہ مطلقیت یا مطلق العنانی کا رجحان ہے۔ اکثر حکمراں بل کہ تمام حکمراں اس کو مملکت کے تمام عقدوں کا حل سمجھتے رہے ہیں۔ بہت سے دانش مندوں نے بھی حکومت اور ریاست کے باب میں بحث کرتے ہوئے اس کی تائید کی ہے۔ پر حقیقت یہی ہے کہ یہی وہ رجحان تھا جس نے تاریخ کو ایک قصاب خانہ بنا دیا۔

صحیح بات شاید یہی ہے کہ انسانی فطرت اپنی آزاد وضع میں حکومت کے تسلط کو تسلیم کرنے سے ہمیشہ انکار کرتی رہی ہے اور اس نے حکومت کو ہمیشہ ایک ظالمانہ اور غاصبانہ بندوبست گردانا ہے۔ ہے بھی یہی کہ حکومت اپنے جوہر میں ایک جبر ہے اور انسانی تاریخ اس جبر سے چھٹکارا پانے کی پے در پے کوششوں کا رزم نامہ ہے۔ تاریخ کی جھنجھلائی ہوئی دست و پا بریدہ جرأتیں، سُولی پر چڑھ جانے والی سینہ خیز صداقتیں اور بھری ہوئی لہولہان بغاوتیں، ہم پر یہی رمز منکشف کرتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان واقعہ طلب عزیمتوں کے ہیجان کا اصل رمز سینوں ہی میں رہا ہو اور زبانوں پر یہی نعرے سنائی دیتے ہوں کہ فلاں ظالم اور فلاں غاصب کا تختہ اُلٹ دو مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ سارا ہیجان ظالموں اور غاصبوں کے اس سلسلے کے خلاف برپا ہوتا رہا ہے جس کا جامع اسم حکومت ہے۔

حکومت کا وہ خاص عملیہ کیا ہے جس کے باعث ہمیشہ ذہنوں میں بغاوتیں بھڑکتی رہی ہیں۔ وہ ایک مسلّم تسلّط کی سرپرستی میں ایک برگزیدہ اقلیت کی طرف سے اکثریت کے حقوق کو غصب کرنے کا دستور ہے جس کے ساتھ قانون اور اخلاق کا پورا نظام ہوتا ہے۔ پھر

اپنے اس کردار کے ساتھ حکومت اپنی روح اور عمل میں ایک جبر و قہر بھی ہے۔ اس لیے اسے کبھی حقیقی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ محض مجبوراً برداشت کیا گیا ہے۔ انقلابی رہ نما بپھرے ہوئے ہجوموں سے خطاب کرتے ہوئے یا قید خانوں کی سلاخوں کے پیچھے تلخ ہنسی ہنستے ہوئے ہمیں کتنے عجیب، عظیم اور قابلِ تعظیم محسوس ہوتے ہیں لیکن جب یہی لوگ اقتدار کی مسند پر دکھائی دیتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خوابوں کی فضا سے ناگہاں زمیں پر گھسیٹ لیے گئے ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ انسانی فطرت حکومت سے کبھی اُنس پیدا نہیں کر سکی اور واقعی حکومتوں کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ انسانیت زمین پر آج تک پابہ زنجیر ہے۔ دنیا کی حساس اور آزادی پسند ذہانتوں نے ہمیشہ ایک ایسے دور کے خواب دیکھے ہیں جب حکومت موجود نہ ہوگی اور ایک لاحکومت اور لاریاست معاشرہ وجود میں آئے گا۔ حکومتوں کے سرفروش حریفوں اور جگر دار مقتولوں کو تاریخ نے عام طور پر شہیدوں کے نام سے یاد کیا ہے۔

حکومت زیادہ سے زیادہ اقتدار اور زیادہ سے زیادہ تسلط کو اپنی طاقت خیال کرتی ہے۔ یہ محض خوش فہمی ہے۔ سب سے زیادہ با اقتدار حکومت سب سے زیادہ کمزور ہوتی ہے۔ اس کے خلاف بغاوت کرنا خود اسی کے محکوم معاشرے میں سب سے بڑی فضیلت کا درجہ رکھتا ہے۔ چاہے اس کے خلاف کوئی ایک شخص بھی بغاوت نہ کرے لیکن درحقیقت ہر شخص اس کا باغی ہوتا ہے۔

اگر کسی حکومت کو حکومت ہونے کے باوجود اچھا کہا جانا ممکن ہے تو اچھی حکومت وہ ہے جسے معاشرہ اپنے احساسِ آزادی کا ضامن اور وکیل سمجھتا ہو اور جس کے افراد کسی فریب خوردگی کے بغیر فرائض میں حقوق کی لذت پاتے ہوں۔ ورنہ ہے یہی کہ عوام حکومتوں کو ہمیشہ اپنی اُمنگوں کا حریف محسوس کرتے ہیں۔ اس احساس کو دلوں سے یکسر مٹا دینا شاید ہی کسی حکومت کے بس میں ہو۔ ہاں اس احساس کو کم کر دینا ممکن ہے اور یہ معجزہ ایک مثالی حکومت ہی سے ظہور میں آسکتا ہے ویسے اپنے جوہر میں حکومت ایک شر ہے، بُری حکومت ہی نہیں بہت اچھی حکومت بھی۔ اس حیثیت سے کہ وہ حکومت ہے ایک شر ہے۔

اب یہ ایک مجبوری ہے کہ تاریخ کے موجودہ مرحلے میں یہ شر ناگزیر ہے۔

یہ دوراز کار باتیں اس لیے ذہن میں آئیں کہ ان دنوں ہمارے یہاں بنیادی باتیں زیرِ بحث آتی رہتی ہیں۔ پاکستان جن تجربات سے گزرا ہے ان کے پیشِ نظر اب ایسی کوئی حکومت کامیاب نہیں ہوسکتی جو کسی فرد یا اس فرد کے وسیلے سے کسی طبقے یا گروہ کی خواہشِ اقتدار کو پورا کرنے کا ذریعہ ہو۔ یہ دنیا کے مظلوم ترین اور محروم ترین لوگوں کی بستی ہے، اس بستی کے ساتھ کسی بھی نوع کی خود مطلبی تباہ کن ثابت ہوگی۔ یہاں کسی کو کسی پر اعتبار نہیں رہا اس لیے کہ یہ ان بد بخت انسانوں کی بستی ہے جنھیں بار بار دھوکا دیا گیا ہے۔

لوگوں نے اُمیدوں کا دامن پکڑا مگر اسے کھینچ لیا گیا، یہی ہوتا رہا۔ لوگوں کی اُمیدوں اور اُمنگوں کو اتنی مرتبہ رَد کیا گیا ہے کہ اب ہر اُمید اور ہر اُمنگ ایک اذیت ناک مشقّت بن گئی ہے۔ بے اعتباری، بے اعتمادی اور بے یقینی کی وہ اُفتاد پڑی ہے کہ دل نڈھال ہوکر رہ گیا ہے۔ جو مُنجی بھی آگے بڑھا اس نے دھوکا دیا جو مسیحا بھی آیا اس نے ہلاکتوں کے نسخے تجویز کیے۔ بڑھ بڑھ کر بولنے والے بدباطن نکلے۔ جن کی باتیں سُنی گئیں انھوں نے تباہیوں کا راستہ بھانے کے سوا اور کچھ نہ کیا۔ یہاں کے سربرآوردہ لوگ یک سر بے مغز نکلے، یہاں کے دانش مندوں نے صرف بے دانشی کا تماشا دکھایا۔

اب یہاں کے کاتبانِ تقدیر کو یہ بات ہر وقت ذہن میں رکھنی چاہیے کہ لوگ عجیب بددلی میں مبتلا ہیں۔ ان کا اعتماد تباہ ہو چکا ہے۔ وہ مستقبل کے بارے میں خوف زدہ ہیں۔ اس عذاب ناک کیفیت کے ذمّے دار وہ حاکم اور آمر ہیں جنھوں نے عوام کو محض تماشائیوں کی حد میں رکھا اور آخر اس ملک ہی کو تماشا بنا کے رکھ دیا۔ موجودہ حکومت کے سربراہ بانیِ پاکستان کے بعد اس ملک کے سب سے زیادہ مقبول رہ نما رہے ہیں۔ انھیں ایک تسلّط پسند سربراہ کے بجائے ایک دردمند رہ نما کی روش اپنانی چاہیے وہی روش جس کے باعث انھیں ایک محبوب ترین رہ نما کی حیثیت حاصل ہوئی تھی۔ ''فوجی حکومت'' ان کی اس حیثیت کو حسرت ناک نقصان پہنچا رہی ہے۔ ایک مقبول ترین رہ نما کو سب سے زیادہ زیاں اس وقت پہنچتا ہے جب وہ حاکم ہوکر لوگوں کے سامنے آئے اور پھر اس حاکم کی سب

سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ آمر ہونا قبول کرے۔

ان سیاہ نصیب بستیوں کی ویران آنکھوں نے جو درخشاں خواب دیکھے تھے وہ دُھندلاتے جارہے ہیں۔ لوگ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ایک بار پھر محض تماشائی بن کر رہ گئے ہیں۔ سیاہ اور دبیز پردوں کے تماشائی۔ لوگوں نے بڑی اُمیدوں اور اُمنگوں کے ساتھ یہ دور شروع کیا تھا۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان اُمیدوں اور اُمنگوں کو نیا اعتماد نصیب ہو۔ وہ اپنی ان اُمیدوں اور اُمنگوں سے کسی قیمت پر دست بردار ہونا نہیں چاہتے۔ اگر وہ ان سے دست بردار ہونے پر مجبور ہوئے تو وہ دن اس ملک کے وجود کا آخری دن ہوگا۔

عالمی ڈائجسٹ، مئی 1972

سندھی۔ اُردو

سندھی کے انسان دوست شاعر اور ادیبو! دیکھو سندھ میں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ نفرتوں نے ہجوم کیا ہے اور محبتیں برابر پیچھے ہٹ رہی ہیں۔ زبان کا فتنہ رسوا کُن حادثوں کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ ہمارا اور تمھارا رشتہ انسانیت سے ہے۔ آؤ اور ان فتنہ پردازوں کو سمجھاؤ' آؤ ہم انسانیت کے حق میں ایکا کرلیں۔ ساتھیو! ہم صرف علاقوں' صوبوں اور ملکوں کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں۔ ہمارے قلم کی جنبش سرحدوں کی پابند نہیں۔ ہم تو ساری انسانی برادری کے سامنے جواب دہ ہیں۔ سندھی بولنے والے ہوں یا اُردو بولنے والے ہمیں تو ہر گروہ کے حق میں آواز بلند کرنی چاہیے۔

تم دیکھ رہے ہو کہ اُردو اور سندھی کا قضیہ روز بہ روز شدت اختیار کرتا جارہا ہے۔ سندھ کا دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا ہے۔ اور اب تو اس پر ایک جنون سا طاری ہوتا جارہا ہے' ہمیں جاننا چاہیے کہ اس کا ذمّے دار آخر کون ہے؟ یہ حرکت ان مفسدوں کی ہے جو محنت کشوں اور تیرہ نصیبوں کو صحیح راستے کے بجائے غلط راستوں میں سرگرداں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ظالم اور مظلوم کی تمیز ختم ہوتی جارہی ہے۔ ایک قاتل سندھی بولتا ہے تو وہ بے قصور ہے' اگر ایک ظالم اُردو بولتا ہے تو وہ نیک ہے۔ تم دیکھو گے کہ اگر یہی حالت رہی تو درمیان کی تمام نیکیاں غارت ہو جائیں گی۔ عزیزو! اُسی اصل پر زور دو جس کی رُو سے زمین پر صرف دو قومیں آباد ہیں۔ ایک ظالموں کی ہے اور دوسری مظلوموں کی۔ ظالم قوم کے بعض لوگ سندھی بولتے ہیں اور بعض اُردو' اسی طرح مظلوم قوم کے بہت سے لوگوں کی زبان اُردو ہے اور بہت سے لوگوں کی زبان سندھی۔

ہمیں مختلف زبانیں بولنے والے گروہوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہیے۔ پس ہونا یہی چاہیے کہ سندھ میں دو سرکاری زبانیں ہوں۔ سندھی اور اُردو۔ آپس میں اتنی

بے اعتمادی پھیل گئی ہے کہ اگر چہ صوتی اقتضا یہ تھا کہ ''سندھی اور اُردو'' کے بجائے ہر جگہ ''اُردو اور سندھی'' لکھا جاتا اس لیے کہ ''اور اُردو'' میں تنافر پایا جاتا ہے۔ مگر میں نے ہر جگہ ''سندھی اور اُردو'' لکھا ہے کہ سندھی دوستوں کو ''اُردو اور سندھی'' میں کہیں کسی کو ترجیح دینے کی نیت کا گمان نہ گزرے۔ یہ بے اعتمادی ہمارے احساسِ تناسب اور احساسِ جمال کو تباہ و برباد کر ڈالے گی۔ بہ ہر حال حق انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ سندھ ہو یا بلوچستان، سرحد ہو یا پنجاب ہر جگہ لسانی گروہوں کے ساتھ انصاف کیا جائے، انصاف کس طرح ہو اس کا طریقہ ہم سب کو مل کر سوچنا چاہیے۔

سوچنے کی بات تو کچھ اور ہے مگر سوچنا کچھ اور پڑ رہا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر سندھ کی سرکاری زبان صرف سندھی قرار پائے یا صرف اُردو یا دونوں تو کیا اس علاقے کے سارے دُکھ درد دُور ہو جائیں گے! سرحد، بلوچستان اور پنجاب میں اُردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے۔ بتاؤ کیا وہاں اُردو بولنے کی بدحالی دُور ہو گئی۔ کیا سندھ کے عوام اس لیے تباہ حالی کا شکار ہیں کہ سندھ کی سرکاری زبان سندھی نہیں ہے۔ یہ بزرگ جن کا نام جی ایم سیّد ہے، کیسی شیر خوارانہ غائیں غائیں کر رہے ہیں، یہ پانچ ہزار سال پرانے سندھ کو یاد کرتے ہیں۔ کیا ان باتوں سے سندھ کے فاقہ کشوں کا پیٹ بھر جائے گا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بعض ایسے لوگ بھی جو اپنے آپ کو انقلابی کہتے ہیں، ایسی ہی باتیں کر رہے ہیں۔ دوستو! اگر پانچ ہزار سال پرانے سندھ کی صورتِ حال بے مثال تھی اور اگر سندھ جنت کا ایک قطعہ ہے تو پھر انقلاب لانے کی کیا ضرورت ہے، جنت میں انقلاب آنے کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ جہنم بن جائے۔ کیا عاقل اور بالغ لوگوں کو پانچ ہزار سال پرانے سندھ یا پانچ ہزار سال پرانے ہند کے قصیدے پڑھنے زیب دیتے ہیں؟ کیا اب تاریخ کے اس دور کو سراہا جائے گا، جس میں چند انسانوں کی بقا کے لیے باقی سارے انسان جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ ہمیں راجاؤں، شہنشاہوں، نوابوں اور جاگیرداروں کے سندھ و ہند کی بزرگیاں بیان کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ انسانیت کی حرمت کے ترجمانو! ہم میں سے بعض کو انسانوں کی مسلسل بے حرمتی کا دور کیسے بھا گیا؟

اس عہد کی باتیں کرو کہ یہی وہ عہد ہے جس میں انسانی حقوق کے لیے ایک فتح مندانہ

جنگ لڑی جا رہی ہے۔ ماضی کے یہ بے مایہ تذکرے صرف فتنہ و فساد میں اضافہ کریں گے اور ہمارا اور تمھارا کام بہت زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ اُردو بولنے والے قدیم ہندوستان کا راگ الاپیں گے اور میں تمھیں بتا دوں کہ دریائے سندھ کے جواب میں گنگا اور جمنا اور راوی اور چناب کی دلیلیں بس اب پیش ہی کی جانے والی ہیں اور دو طرفہ گم راہی کا یہ تموّج سلامت روی کے تمام راستے بند کر دے گا۔ علاقوں کے ساتھ سب سے بڑی بھلائی یہ ہے کہ ان علاقوں کے محروم عوام کے حق کی بات کی جائے۔ اس طرح کسی ایک علاقے کی بھلائی سارے ہی علاقوں کی بھلائی کا نمونہ بنے گی۔

یہاں مجھے زمانوں اور زمینوں کے برگزیدہ اور برومند نوجوان اور نئی شاعری کی زخم خوردہ، کج کلہی کے نشان عبیداللہ علیم کا یہ مقولہ یاد آ رہا ہے کہ کوئی رائے اور مسلک رکھنے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اسے پوری قوّت کے ساتھ پیش کر دیا جائے۔ چاہے وہ اپنوں کو گراں گزرے یا غیروں کو۔ سو میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر اپنا مسلک بیان کر دوں۔ میں کسی عقیدے کا پیرو نہیں ہوں، صرف تہذیبی طور پر مسلمان ہوں۔ میں انسانوں کے درمیان ظالم اور مظلوم کے سوا کسی تفریق کو نہیں مانتا۔ میرے نزدیک کوئی علاقہ مقدّس نہیں ہے۔ میں نہ سرزمینِ سندھ کی خوشامد کرنے کے لیے تیار ہوں اور نہ سرزمینِ پنجاب کی۔ میں تو صرف شریف انسانیت کی چاپلوسی کرنے والا ہوں خواہ وہ مشرق میں آباد ہو یا مغرب میں، پاکستان میں یا ہندوستان میں۔ میں ایک اشتراکی ہوں اور زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ میں ایک اشتمالی ہوں۔ مجھ ایسے لوگوں کی بات سُنو اور اسے سمجھو۔ ان جھوٹے دعوے داروں کی باتوں میں نہ آؤ، جو اپنے آپ کو انقلابی کہتے ہیں اور مزدوروں پر گولیاں چلانے والی حکومت کی دلاّلی کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی باتوں پر بھی کان نہ دھرو جو عوام اور عوام میں فرق کرتے ہیں۔ اس گروہ میں اُردو بولنے والے وہ نام نہاد انقلابی بھی شامل ہیں جن کے خیال میں اُردو بولنے والے عوام پر عوام کی اصطلاح صادق نہیں آتی۔ بے مغز اور سبک سر لوگ اُردو کے حق میں کچھ کہتے ہوئے شرماتے ہیں۔ انھیں ہر شام اپنے احمق پروہتوں کے سامنے اپنی دن بھر کی منافقانہ نیکیوں کا حساب دینا پڑتا ہے۔ یہ لوگوں سے آنکھیں ملاتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ صرف

ان کے گھروں کی چھپکلیاں اور مکڑیاں ہی یہ بات جانتی ہیں کہ ان کا نظریہ کیا ہے۔

افسوس! ہمیں اور تمھیں کن لوگوں کے کام آنا تھا اور کن لوگوں کے کام آ رہے ہیں۔ ساتھیو! یقین کرو کہ علاقوں اور زبانوں کو تقدس دے کر کسانوں، مزدوروں اور دوسرے محنت کشوں اور محروم ہم وطنوں کے ساتھ غداری کی جارہی ہے اور اس راستے کو مسدود کیا جا رہا ہے جس پر آگے بڑھ کر ہم اپنے عوام کے لیے خوش خبری لے کر آتے۔ ہاں انھیں پوری بے حیائی کے ساتھ دھوکا دیا جا رہا ہے۔

نفرت نے ہمارے دماغوں کو ماؤف کر دیا ہے، یہاں صرف ایک ہی رشتہ استوار کیا گیا ہے اور وہ نفرت کا رشتہ ہے۔ ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے نفرت، ایک علاقے کو دوسرے علاقے سے نفرت۔ نفرت کرنا ہماری عادت بن گیا ہے۔ یہی وہ نفرت ہے کہ ہمارے لوگ بنگالیوں کے قتلِ عام کا ذکر سُنتے تھے اور ان کے چہرے خوشی سے چمکنے لگتے تھے، یہی وہ نفرت ہے جو یہ نعرے لگواتی ہے کہ ہم غیر بنگالیوں کو مغربی پاکستان میں نہیں آنے دیں گے۔ یہی وہ نفرت ہے جو بنگلا دیش کو تسلیم کرنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہونے دیتی اور یہی وہ نفرت ہے جو آدابِ گفتار کے یک سر برخلاف ہندوستانی حکومت پر ہندوستانی کہہ کر کوئی گرفت کرنے کے بجائے ہندو کہہ کر مذہب کے نام پر گالیاں دلواتی ہے۔ یہی وہ نفرت ہے جس کے جنون میں لوگ ان تمام لوگوں کی زبانیں گدّی سے کھینچ لینا چاہتے ہیں جو اُن کی زبان نہیں بولتے۔ اگر یہی کیفیت طاری رہی تو میں تمھیں مہیب حادثوں کی بشارت دیتا ہوں۔ افسوس کہ وہ دن دُور نہیں جب سادہ لوح عوام بھی فتنہ پردازوں کے بہکائے میں آ کر اس سفّاک آگ کی لپیٹ میں آ جائیں گے۔

سندھی زبان میں اپنے شعور کی نیکیاں لکھنے والے ساتھیو! تم پر ایک ذمّے داری آ پڑی ہے۔ اس ذمّہ داری سے صرف تم ہی عہدہ برآ ہو سکتے ہو۔ لوگوں کو سمجھاؤ کہ زبان کے مسئلے کا ایک ہی حل ہے، سندھ کی دو سرکاری زبانیں اور اگر یہ مسئلہ اس طرح طے نہ ہوا تو حالات شاید قابو سے باہر ہو جائیں گے اور ہماری بدبختی یہ ہو گی کہ ہم خون کے گھونٹ پئیں گے اور کچھ نہ کر سکیں گے۔

عالمی ڈائجسٹ، جولائی 1972

افسوس

افسوس کہ وہی ہوا جو کہا گیا تھا۔ کہا گیا تھا کہ میں تمھیں مہیب حادثوں کی بشارت دیتا ہوں۔ حادثے برپا ہوئے اور پھر کس بُری طرح' حیف کہ نفرتیں جیت گئیں اور محبتیں ہار گئیں۔ میں نے تو یہاں محبتوں کو ہارتے ہی دیکھا ہے' میں اپنے گرد و پیش مایوسیاں پھیلی ہوئی دیکھتا ہوں۔ یہ کیسی بدنصیبی ہے کہ اُمیدیں ابھی پروان بھی نہیں چڑھنے پاتیں کہ دَم توڑ دیتی ہیں۔ سینوں میں ناسور پڑ گئے ہیں' دل خون ہو گئے ہیں۔ دردمندو! دردمندی کی باتیں کرو' دل رکھنے والو! دلوں کو ہاتھوں میں لو۔ حال یہ ہے کہ زندگی بُری طرح نڈھال ہے۔

سندھی زبان کے قابلِ احترام ادیبو! اب بہت کچھ ہو چکا' ہم بھی لہولہان ہیں اور تم بھی۔ ہم نے پہلے بھی کہا تھا اور اب پھر کہتے ہیں کہ ہماری اور تمھاری ذمّے داریاں بہت زیادہ ہیں' آؤ ہم اور تم مِل کر محبتوں کی خاطر نفرتوں سے جنگ کریں۔ دوستو! ہمارا فرض ہے کہ ہم عوام کے ہر گروہ کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھیں۔ کسی گروہ کو کسی گروہ پر ترجیح نہ دو۔ جس کا بھی حق چھینا جا رہا ہو اُس کی طرف سے فریاد بلند کرو۔ قلم کی سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ حق فیصلے رقم کرے چاہے وہ صاحبِ قلم ہی کے خلاف جاتے ہوں۔ ہم نے عوام کے ایک گروہ کے حق کی دردمندانہ تائید کی اور اس طرح اپنی ذمّے داری بھی پوری کی اور تمھاری بھی۔ جب عوام کے دوسرے گروہ کے کسی حق پر آنچ آئے گی تو دیکھنا کہ ہماری زبان کیسے شعلے اُگلے گی۔ عزیزو! ان بےضمیروں کے فریب میں کبھی نہ آنا جو فیصلہ کُن مقامات پر خاموش رہ کر سب سے بنائے رکھنا چاہتے ہیں' یہ وہ ہوس کار ہیں جنھیں نیکی کے بجائے نیک نامی پسند ہے۔ اے نیکی سے محروم نیک نامی! تیرا ستیاناس جائے۔ میں بھی

ایسے لوگوں پر لعنت بھیجتا ہوں' تم بھی ایسے لوگوں پر لعنت بھیجو' ہاں! تمھاری طرف ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں پر' ہماری طرف بہت زیادہ ہیں۔ اور دیکھو اپنی معاملت ان لوگوں سے رکھو جو لگی لپٹی نہیں رکھتے' جب وقت آئے گا تو یہ تمھارے حق میں بھی اسی طرح آواز بلند کریں گے' ان ہوس کاروں کا کیا ہے' انھیں تو سب کو خوش رکھنا ہے۔

آؤ! ہم اور تم مِل کر دلوں کے زخموں پر مرہم رکھیں' کیا ہمارا اپنی روحوں سے یہ عہد نہیں ہوا ہے کہ ہر دُکھے ہوئے دل کو اپنا دل سمجھیں گے۔ انسان سے محبت کریں گے خواہ وہ کسی بھی زبان میں کلام کرتا ہو۔ ہمارے رشتے زبانوں اور زمینوں کے زندانی نہیں ہیں۔ اور نہ ہمارے جذبے سرحدوں کے اسیر ہو سکتے ہیں اور پھر ہم تو ایک بستی میں رہتے ہیں اور ہاں میں تمھیں یہ حقیقت کیوں نہ بتا دوں کہ میں جس گھر میں رہتا ہوں' اس میں ایک سندھی خاندان ہمارے ساتھ رہتا ہے' بالکل ایک خاندان کی طرح۔ اب تم ہی بتاؤ' کیا دلوں کی یہ دُوریاں ہمیں اور تمھیں زیب دیتی ہیں؟ مجھے دل کی مٹھاس کے ساتھ کڑوی باتیں کہنے کا حق دو۔ تم نے میری ایک بے لاگ رائے کو بُری طرح یاد رکھا اور میری روشنائی کی باقی تمام روشنیوں کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ کیا میں نے تمھارے درد و داغ کو اپنے سینے میں نہیں سہا۔ کیا میں تمھارے آنسو نہیں رویا۔ کیا میں نے تمھاری آہیں نہیں کھینچیں؟ جو پندرہ سولہ سال سے ان صفحوں کو سیاہ کر رہا ہوں' تو کیا سیاہیاں بیچ رہا ہوں' جھک مار رہا ہوں؟ کیا میں نے پنجاب' سندھ' سرحد اور بلوچستان کے عوام کے درمیان کبھی کوئی فرق کیا ہے۔

غصّہ تھوک کر میری بات سُنو! میں زبان کے مسئلے میں اس رائے پر پھر اصرار کروں گا' جس کا اظہار کئی بار کر چکا ہوں اور وہ رائے یہ ہے کہ ایک چھوٹے سے چھوٹے لسانی گروہ کو بھی وہی حق ملنا چاہیے جو کسی بڑے سے بڑے لسانی گروہ کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اس بات کا عمل میں آنا خواہ فوراً ممکن نہ ہو' مگر ہمارا نصب العین یہی ہونا چاہیے۔ ہر لسانی گروہ کا یہ حق ہے کہ معاشرے میں ایک کامیاب اور آبرومند زندگی گزارنے کے لیے وہ کسی بھی زبان کی محتاجی سے بے نیاز ہو۔ مثال کے طور پر اگر اس کا تعلق بلوچی گروہ سے ہے تو اس کو یہ سہولت لازمی طور پر حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اپنی تعلیمی اور معاشی زندگی گزارنے کے لیے بلوچی کے

سوا کوئی بھی دوسری زبان سیکھنے پر مجبور نہ ہو۔ یہی حق پشتو والوں کا ہے۔ یہی بروہی والوں کا اور یہی ہندکو والوں کا۔ اب رہی سندھی تو اسے تو یہ حق اسی وقت مل جانا چاہیے تھا جب ہم نے انگریز سامراج سے چھٹکارا پایا تھا۔ مگر اس بنیادی حق سے نہ سندھی بہرہ اندوز ہو سکے اور نہ اُردو والے۔ یہ وہ محرومی ہے جو انگریز سامراج کا عطیہ ہے۔ ہمیں تمام جھگڑے چھوڑ کر اس تعلیمی مسئلے کو فوراً حل کرنا چاہیے' دیکھا جائے تو اصل مسئلہ سیاسی نہیں ہے' تعلیمی ہے اور اس کے ساتھ معاشی۔

اس کے ساتھ ہی آج ہی سے وہ فضا پیدا کی جائے کہ جو سندھی نہیں جانتے وہ شوق اور ولولے سے سندھی سیکھنا شروع کر دیں اور جو اُردو نہیں جانتے وہ اُردو۔ ہم میں سے کسی کو بارہ سال تک سندھی یا اُردو سیکھنے پر مجبور نہ ہونے کی رعایت سے لطف لینے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ میرا ایک نیم سندھی اور نیم ہندی دوست محمد حسین قریشی کہتا ہے کہ سکھایا جا سکے تو محبت کرنا سکھا دو۔ محبت' اظہارِ محبت کی زبان خود سکھا دے گی۔

ایک بات سُنی تو بہت دُکھ ہوا' جن لوگوں نے حکومتِ سندھ کے رویّے کی مخالفت کی۔ ان کے بارے میں یہ رائے قائم کی گئی کہ وہ درحقیقت سندھ کے مخالف ہیں۔ کیا یہ ایسی بات نہیں ہے جسے سُن کر آدمی اپنا منہ نوچ لے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ ایوب خان کی آمریت کے مخالف تھے' وہ دراصل صوبہ سرحد کے مخالف تھے' جو لوگ نوکر شاہی کو لعنت ملامت کرتے تھے' وہ بنیادی طور پر پنجاب کو لعنت ملامت کرتے تھے' چوں کہ نوکر شاہی میں پنجاب کے لوگ زیادہ ہیں۔ جو لوگ سرمایہ داری کے دشمن ہیں وہ دراصل گجراتیوں اور مارواڑیوں کے دشمن ہیں' اس لیے کہ سرمایہ داروں کی اکثریت ان برادریوں سے تعلق رکھتی ہے' یعنی بے تدبیر حاکموں اور عوام دشمن سرمایہ داریوں کے تمام مخالفین تعصب میں مبتلا ہیں۔ ہم سب کے سب تو بڑے کمین نکلے' ہم سب کے سب تو بہت ہی خبیث ہیں۔ تو ثابت یہ ہوا کہ ہم سندھ کے مخالف ہیں' اس لیے کہ ہم نے جس حکومت کے بعض اقدامات کی مخالفت کی' اس کے سربراہ سندھی ہیں۔ مزدوروں پر گولیاں چلنے کے بعد جب میں نے شہید چوک پر جا کر نظم پڑھی تو وہ اس لیے کہ میں سادہ لوح مزدوروں کو سندھ کے

خلاف بھڑکانا چاہتا تھا۔ اب کہیں جا کر معلوم ہوا کہ میرے اندر کیسا بد باطن آدمی چھپا ہوا تھا۔

ساتھیو! کیا تمھیں نہیں معلوم کہ ہم کئی برس سے اس جماعت کی کس کس طرح حمایت کرتے رہے، جس کے بانی اور قائد "سندھی" تھے اور اس کی خاطر ہم نے کیسی کیسی دشمنیاں مول نہیں لیں۔ اور پھر اس جماعت کی حکومت پاکستان کی وہ پہلی حکومت تھی جسے میں نے خوش آمدید کہا۔ کیا اس ملک کے لاکھوں عوام اس بات کے گواہ نہیں کہ میں نے کس والہانہ انداز میں اس دور کے قصیدے پڑھے جو نئی حکومت کے ساتھ شروع اور طلوع ہو رہا تھا۔ ورنہ کسی حکومت کی تائید اور میں...... کہ میں تو سرے سے حکومت کے ادارے ہی کو ناانصافی کا ادارہ سمجھتا ہوں، اس قصیدہ خوانی پر ان لوگوں کے طعنے بھی سُنے جو آج حکومت کے ثنا خواں ہیں۔ شاید کچھ لوگ مجھے حکومت کا وظیفہ خوار بھی سمجھے ہوں کہ آج تک میں نے کسی حکومت کی حمایت نہیں کی تھی پھر اس حکومت کی حمایت اور مدح خوانی کیسی؟ پھر اچانک میں نے اس حکومت کے خلاف ایک نظم لکھ دی۔ یقیناً میں تعصب کا شکار ہو گیا۔

میں تمھیں بتاؤں ذاتی طور پر یہ حکومت ہمارے حق میں بہت سازگار تھی۔ یہ پاکستان کی وہ پہلی حکومت ہے، جس کے وزیر اور مشیر ہمارے ملاقاتی اور ہمارے قدرداں ہیں۔ ورنہ ایوب اور یحییٰ کی حکومتیں تو ہمارے لیے یک سر اجنبی تھیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ محترم بزرگ میر رسول بخش تالپور اور جوانِ عزیز عبدالحفیظ پیرزادہ ہمیں اور ہم ان دونوں کو کتنے عزیز تھے اور کتنے عزیز ہیں۔

ہمیں اس بات کی کتنی خوشی تھی کہ اس حکومت کا وزیرِ اطلاعات ایک شاعر ہے۔ مگر ہم نے پوری دل جمعی کے ساتھ حکومت سے اختلاف کیا، میں نے اختلافِ رائے کے مرحلے میں اپنے بڑے بھائیوں تک کو کبھی کوئی رعایت نہیں دی اور لہجے کی پوری شدّت کے ساتھ اختلاف کا اظہار کیا۔ اختلاف کی صورت میں حکومت سے اختلاف کرنا ایک ایسی ذمّے داری ہے جو ہم پر عوام کی طرف سے عائد ہوتی ہے۔ یہ بھی کتنے افسوس کی بات ہے کہ مجھے آج تحریر و اظہار کی زندگی میں پہلی بار یہ ثابت کرنا پڑ رہا ہے کہ حکومت سے اختلاف کرنا کسی بد نیتی پر مبنی نہیں ہے۔

اور میں تمھیں ایک بات اور بتاؤں۔ تم یہ سمجھ رہے ہو کہ زبان کے مسئلے میں اُردو کے تمام شاعر اور ادیب ہم خیال اور ہم زبان ہیں۔ سندھی کے موقّر روزنامے "ہلالِ پاکستان" کے مدیر اور سندھی کے منفرد افسانہ نگار جناب سراج الحق میمن کے ایک مضمون سے یہی اندازہ ہوا۔ عزیزو! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ کراچی کے چند ہی شاعر اور ادیب ایسے ہیں جنھوں نے اُردو کے حق کی حمایت کی یا ان میں سے بعض نے ایک تخلیقی تاثر کے طور پر اپنا احساس رقم کیا' ان میں سے کچھ لوگ بائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ دائیں بازو سے۔ اور وہ یہ ہیں: رئیس امروہوی' شوکت صدیقی' انعام درانی' نصر اللہ خان' سحر انصاری' محسن بھوپالی' اطہر نفیس' محمد علی صدیقی' انور خلیل' خان آصف' نصیر ترابی' جون ایلیا اور ہاں' ماہر القادری۔ دو ایک اور ہوں گے اس شہر کے باقی تمام شاعروں اور ادیبوں نے اس باب میں یا تو عظیم الشان سکوت' اقبال مند زمانہ سازی اور نیک نام بے ضمیری سے کام لیا یا اُردو کی مخالفت کی اور لہجے کے پورے زہریلے پن کے ساتھ مخالفت کی۔ ہمارے وجود میں وہ نزاع واقع ہوئی کہ ایک ہاتھ نے جوڑا اور دوسرے نے توڑا۔ اور تو اور میرا دست و بازو عبید اللہ علیم اُردو کی بدخواہی اور بیخ کنی میں مستعد رہا۔ ایک سگریٹ کو نصف نصف پینے والے اور ایک روٹی میں سے نصف نصف کھانے والے اور ایک رکابی میں لقمہ تر کرنے والے ایک دوسرے کی سماعت میں زہر اُگلتے دکھائی دیے۔ علیم کی زبان کی شیطانی تیزی اُردو کے سینے پر خنجر زنی کرتی رہی اور میں بار بار جھپٹا کہ اس کی آنکھیں نکال لوں اور اس کی زبان کاٹ کر پھینک دوں اور پھر میں اسے گالیاں دیتا ہوا شہر میں نکل گیا اور چلّایا کہ لوگو! اب وہ لمحہ آ گیا ہے کہ میری طرف سے تمھیں علیم کا خون معاف ہے۔ میں اس کا کوئی خوں بہا طلب نہیں کروں گا۔ میرے یار' اُردو کے نکیلے افسانہ نگار ذکاء الرحمٰن نے تشخیص فرمائی کہ جون ایلیا کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ سیاست داں ہو گیا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ہم اس سے دس پندرہ دن کے لیے ملنا جلنا چھوڑ دیں' دماغ درست ہو جائے گا۔

یہ تاریخی امتیاز اب تک مغرب کی تہذیب کو حاصل رہا ہے کہ اس نے ایسے کتنے ہی حقیقت پژوہ اہلِ قلم پیدا کیے جو اپنے ہی خلاف فیصلے دینے کی عظیم الشان اہلیت رکھتے

ہیں۔ اس نے گبن پیدا کیا جس نے مسیحیت پر شدید حملے کیے، اشپنگلر پیدا کیا جس نے زوالِ مغرب کی خبر سُنائی۔ میں اُردو والوں کو مژدہ سُناتا ہوں کہ ان کے یہاں بھی اب گبن اور اشپنگلر پیدا ہو گئے ہیں، ایک دو نہیں غول کے غول۔ سندھی حلقے کے بارے میں میرے سندھی دوست تم بتاؤ گے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ عظیم سندھی شاعر اور ادیب بھی سندھی کی حمایت میں ہم زبان نہ ہوں گے۔ ان میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو اُردو کے حق کی حمایت کرتے ہوں گے، مجھے یہی اُمید ہے اور یہ مہذّب اُمید میری بہت بڑی متاع ہے۔

مجھے ایک اور گزارش بھی کرنا ہے۔ روزنامہ ''ہلالِ پاکستان'' میں تلہار کے جناب ش۔م کی ایک تحریر شائع ہوئی ہے، وہ ایک قابلِ قدر تحریر ہے جو دردمندی کے ساتھ لکھی گئی ہے، مگر اس تحریر میں میرے گزشتہ اداریے کے ساتھ بڑی ناانصافی کی گئی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ میں نے سندھی ادیبوں کو شیر خوار قرار دیا ہے۔ میں ایسی بے ہودہ بات ہرگز نہیں لکھ سکتا۔ اس اداریے میں شروع سے آخر تک میرا طرزِ خطاب یہ رہا ہے کہ ''سندھی کے انسانیت دوست شاعرو اور ادیبو! دیکھو سندھ میں کیا ہو رہا ہے۔ نفرتوں نے ہجوم کیا ہے اور محبتیں برابر پیچھے ہٹ رہی ہیں۔ سندھی زبان میں اپنے شعور کی نیکیاں لکھنے والے ساتھیو! تم پر ایک ذمّے داری آ پڑی ہے''۔

میرے بھائیو! سُنو، اگر میرے خیال میں تم میں سے کسی سے کوئی غلطی سرزد ہوگی تو میں ضرور ٹوکوں گا، میں یہ بات کسی طرح فرض نہیں کر سکتا کہ ہم تمھیں ٹوکنے کا کوئی حق نہیں رکھتے اور ہمیں تمھارے کسی قول و فعل سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔

عالمی ڈائجسٹ، اگست 1972

حساب

خوشی کی بات ہے کہ اب سندھ پُرسکون ہے۔ کاش اس سکون کو محبت اور یک دلی کا سرور نصیب ہو۔ ہم نے دیکھ لیا ہوگا کہ دشمنی اور دل شکنی میں پچھتاووں کے سوا اور کچھ نہیں رکھا۔ بہت سی باتوں پر غصے آتے ہیں پر ہونا یہ چاہیے کہ غصہ آیا' غصہ کر لیا اور پھر غصہ تھوک دیا۔ ذرا سوچو تو سہی کہ زندگی کے لیے اور عذاب ہی کیا کم ہیں جو آپس کی دشمنی کا عذاب بھی مول لیا جائے۔

انسان اس زمین پر کتنے دن جیتا ہے' کتنے دن؟ بستیوں میں ایسی ہڑ بونگ مچی ہے کہ انسانوں کو نہ سوچنے کی مہلت ہے اور نہ سمجھنے کی اور جنھیں سوچنے والا سمجھا جاتا ہے وہ بھی کہاں سوچتے ہیں اور شاید ان کا کوئی قصور بھی نہیں ہے۔ انسان کے بدن کا وزن کرو' اس کے پورے بدن کے مقابلے میں دماغ کا وزن ہی کیا۔ اے بھائی انسان! تیری ایک ران کا وزن بھی تیرے دماغ کے وزن سے زیادہ ہے۔ یہ زندگی' انسان کی زندگی' جس کی زمین پر اتنی دھوم ہے' آخر کتنے دن کی ہے؟ میں نے مان لیا کہ انسان اسّی برس کی عمر پاتا ہے۔ چلو دس برس اور بڑھا لو۔ یہ نوّے برس ہوئے۔ میری طرف سے دس برس اور بھی سہی۔ لو' سو ہو گئے۔ اس میں شروع کے کم سے کم بیس ایسے ہیں جن میں کچھ زمانہ تو انسان بے شعوری کی حالت میں گزارتا ہے اور کچھ زمانہ آنے والی زندگی کی تیاری میں۔ یوں اسّی برس بچے۔ میں نے یہ بھی مان لیا کہ کہیں اسّی برس میں جا کر بڑھاپے کی عمر شروع ہوتی ہے۔ گویا اسّی برس سے لے کر سو برس تک کا دور بڑھاپے اور معذوری کا دور ہے۔ اس لیے بیس برس یہ کم کرو۔ بچے ساٹھ۔ ان ساٹھ برس میں سے تیس سال راتوں کے نکال دو'

بچے تیس سال اب صورتِ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا خوش نصیب آدمی نہیں ہے جو یہ تیس برس کے تیس برس صحت اور تندرستی کے ساتھ بسر کرتا ہو اور کبھی بیمار نہ پڑتا ہو اور نہ ایسا ہوتا ہے کہ یہ ساری کی ساری مدت فراغت اور آرام سے بسر ہوتی ہے۔ ایسے کہ نہ کوئی فکر ہے اور نہ مصروفیت۔ نہ کوئی کام نہ کاج۔ پھر یہ بھی سوچو کہ اس دوران میں کتنی ہی محرومیاں انسان کے ساتھ لگی رہتی ہیں، کیسے کیسے غم اسے سہنے پڑتے ہیں۔

یہ جو کچھ حساب میں نے پیش کیا ہے یہ ایک بہت ہی خوش وقت اور خوش بخت زندگی کا حساب ہے ورنہ تم جانتے ہو کہ زندگی کتنی آفت رسیدہ ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ ہمیں زندگی میں حد سے حد تیس برس ملتے ہیں اور ان کا حال بھی ہمیں معلوم ہے۔ میں تیس برس کی اس مدت کے کھوکھلے پن، ویرانی اور عذاب ناکی کو کہاں بیان کر پایا ہوں۔ خالص اور بے میل زندگی کے تیس برس بھلا کس انسان کے حصے میں آتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ اس مدت میں ایسے کتنے برس ہوں گے جنھیں تم زندگی کے سکھ سبھاؤ کے برس گنو گے۔ آؤ ایک سرسری سا اندازہ لگالیں کیا ہم ان تیس برس کے دوران بھی اپنے ہر دن کا آدھا حصہ زندگی گزارنے کی لذت اُٹھانے کے بجائے زندگی گزارنے کا سامان فراہم کرنے میں بسر نہیں کرتے؟ مژدہ ہو کہ تیس میں سے بھی پندرہ نکل گئے۔ یہ پندرہ برس ہم کس طرح گزارتے ہیں؟ سازشوں میں، بدخواہیوں میں، نقصان رسانیوں میں، ہٹ دھرمیوں میں، دھاندلیوں میں، دھینگا مشتیوں میں، نفرتوں میں۔ یہ پنجابی ہے، وہ سندھی ہے، وہ مہاجر ہے، وہ پٹھان ہے، وہ بلوچ ہے، وہ ہندو ہے، وہ مسلمان ہے۔ کیا انسانوں کو اسی طرح اپنا وقت برباد کرنا چاہیے۔ اب ان باتوں کے خلاف آواز اُٹھاؤ اور سب کے حق کی بات کرو تو لوگوں کے طعنے سُنو۔ عجیب بات ہے کہ ہم نے سندھی کے ساتھ اُردو کے حق کی بات کی تو سندھی کے اہلِ قلم نے اسے سنجیدگی کے ساتھ پڑھا اور ہماری نیت کو سمجھا مگر خود اُردو ہی کے بعض لکھنے والے اس موقع پر بھی اپنے دل کی بھڑاس نکالنا نہ بھولے اور انھوں نے ہمیں بُرے لفظوں سے یاد کرنا ضروری سمجھا۔ ہمارے خیال میں یہ ایسا مسئلہ نہیں تھا جس میں ذاتی دشمنیاں یاد رکھی جاتیں۔ کتنا اچھا ہوتا اگر وہ اس کے بجائے سندھی کے حق کی بات کرتے اور اس طرح ایک نیکی کا

اظہار ہو جاتا۔ چناں چہ شہر کے بعض شاعر جو کبھی سال میں ایک آدھ مصرع کہہ لیتے ہیں ہمارے خلاف زہر اُگلتے ہوئے پائے گئے۔ رئیس امروہوی اور سیّد محمد تقی کے لیے نہ جانے کیا کچھ کہا گیا۔ صرف اس لیے کہ انھوں نے اقتدار کی پروانہ کرتے ہوئے اُردو کی حمایت میں ایک بے لاگ رائے کا بے محابا اظہار کیا تھا۔ قیاس یہ کہتا تھا کہ اس بے لاگ رائے کے اظہار پر سندھی ادیب برہم ہوں گے مگر انھوں نے بلند نظری کا ثبوت دیا اور اظہارِ رائے کی حرمت کو عزیز رکھا۔ یہ دراصل تربیت کی بات ہے۔ سندھی ادیبوں کی تربیت اقتدار پرستی کی فضا میں نہیں ہوئی۔ اُردو کے بہت سے ادیبوں نے آنکھیں ہی حاکموں کی چاپلوسی کے ماحول میں کھولی ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سندھی کے ادیبوں نے ایوب خان کی دلالی نہیں کی۔ سرکاری تخلیق کار اُردو ہی میں پائے جاتے ہیں۔ مجھ سے اُردو کے حق گو شاعر سحر انصاری اور بے لوث ادیب محمد علی نے کہا کہ ایوب خان کے عہد سے ہمارے ہاں ادیبوں کا ایک ایسا گروہ فروغ پا رہا ہے جو روشن خیالی کی مبہم اصطلاح کے نام پر اپنا ضمیر بیچتا ہے اور یہ زمانہ اس کے لیے سب سے زیادہ سازگار ہے۔ مشکل یہ ہے کہ یہ لوگ کوئی نظریہ نہیں رکھتے۔ انھیں تو ہر صورت میں اقتدار کا ساتھ دینا ہے۔ اگر تم ایسی فضا میں اپنے نفس کا سچ بولنا چاہو گے تو دُکھ کماؤ گے۔ عبیداللہ علیم جو میرا نفسِ امارہ بھی ہے، نفسِ لوّامہ بھی اور نفسِ مطمئنہ بھی، یہاں میں اس کی ایک تحریر نقل کر رہا ہوں۔ اس نے زبان کے مسئلے میں کُھل کر میری مخالفت کی تھی اور ذکاء الرحمٰن جیسے زہریلے ناگ کو اپنی کلائی میں لپیٹے پھرتا تھا کہ میں برابر میں آؤں اور مجھے اس سے ڈسوائے اور گیتوں کے گُرو اسد محمد خان کو اس مشکل میں ڈال رکھا تھا کہ وہ اس ناگ کو دودھ پلائے یا میرے لیے تریاق ڈھونڈھ کر لائے۔ علیم لکھتا ہے:

''اے یار جانی جس دنیا میں تُو اور میں زندہ ہیں وہاں ایسی نازک، حسّاس اور باریک باتیں نہیں سمجھی جاتیں۔ سیاست کی گفت گو کرنے کا شوق اگر ہو ہی گیا ہے تو یہ کام دو اور دو چار کے انداز میں کیا کر اور اس میں اپنی کشادہ ظرف، شاعرانہ ذات نہ ڈالا کر، لوگ غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تُو نے میرے بارے میں جو کچھ لکھا محبت سے لکھا۔ اپنے نظریے کی سچائی کے ساتھ لکھا اور جو کچھ میں نے کہا یا کیا اپنے لہو اور ضمیر کی صداقت کے ساتھ کیا، میں

بھی سچا تم بھی سچے۔ عظیم دوستی کی روایت میں یہ سب کچھ درست، مگر یار اپنا مافی الضمیر لوگوں تک کیسے منتقل کیا جائے۔ حکمت و دانش کی باتیں سمجھنے اور سمجھانے کا کون سا طریقہ ایجاد کیا جائے۔ کج فہم اور نادان لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم دونوں بچھڑ گئے۔ ایک دوسرے سے خفا ہو گئے۔ ہائے انھیں کون سمجھائے کہ تہذیب یافتہ روحیں اتفاق و اختلاف میں محبتوں کے راستوں میں یکساں سفر کرتی ہیں اور اختلاف کو بھی محبت ہی سمجھتی ہیں اور انسان کا جائز حق مانتی ہیں مگر یار! اے یار جانی اب سیاست کے کنویں سے باہر آ کر اپنے پیچیدہ نفس کے کچھ دائرے بنا۔ شاعری تیرا شدت سے انتظار کر رہی ہے۔ اسد محمد خان اور ذکاء الرحمٰن تیری گریہ انگیز اور سمندروں جیسی گفت گو اور شاعری سُننے کا انتظار کر رہے ہیں''۔

انسان بھی کتنا حقیر ہے کہ باتیں تو آسمان کی کرتا ہے اور تان اپنی ذات پر توڑتا ہے۔ میں کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ اس آنی جانی زندگی کو بھی ہم نفرتوں ہی میں بسر کر دیتے ہیں اور بات کرنے لگا اپنی۔ لوگو! میں تم سے پھر کہتا ہوں کہ نفرتوں سے باز آؤ۔ فرد کی فرد سے دشمنی، گروہوں کی گروہوں سے دشمنی، علاقوں کی علاقوں سے دشمنی، ملکوں کی ملکوں سے دشمنی۔ اب ذرا پاکستان اور ہندوستان ہی کے قضیے پر غور کرو۔ یہ قضیہ صرف نفرتوں کے جنون نے پروان چڑھایا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے سیاست داں کچھ بھی کہیں، مدبّر کچھ بھی بکتے رہیں۔ پاکستان کے لیے ہندوستان اور ہندوستان کے لیے پاکستان سے زیادہ قریب اور کوئی بھی ملک نہیں ہو سکتا۔ دوسرے ملکوں سے ہمارا یہ تعلق ہے کہ وہاں ہمارے سفیر رہتے ہیں مگر ہندوستان میں میری بہن رہتی ہے اور پھر یہ کہ رِگ وید[1] اور اقبال کی بانگِ درا سے بڑھ کر پاکستان کا سفیر اور کون ہو سکتا ہے اور پاکستان میں ہندوستان کی طرف سے دیوانِ غالب سے بڑھ کر سفارت کے فرائض کون انجام دے سکتا ہے۔ برِّصغیر کی تقسیم کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یہ بھی چین سے بیٹھیں اور وہ بھی۔ اب اگر تقسیم کے بعد بھی چین نہیں تو پھر اس سے فائدہ کیا ہوا۔ کیا صرف یہ کہ پہلے فسادات ہوا کرتے تھے اور اب جنگیں ہوتی ہیں، پہلے بوتلیں پھینک کر ماری جاتی تھیں۔ اب بم برسائے جاتے ہیں اور پہلے لاٹھیاں چلتی تھیں

---

[1]۔۔۔۔۔رگ وید پنجاب کی سرزمین میں مرتب ہوئی تھی۔

اب توپیں چلتی ہیں۔ برِصغیر ہند و پاک کی آزادی اور دو ریاستوں کے قیام کی غرض کیا یہی تھی۔

لوگ جانتے ہیں کہ جنگ ہوئی تو ہم نے پورے جذبے کے ساتھ ترانے لکھے اس لیے کہ ہم جس گروہ میں رہتے ہیں اس کی ساعتوں کے ہم پر کچھ حقوق ہیں' وہ ایک کم تعداد گروہ ہے' وہ جب بھی کسی مشکل میں مبتلا ہوگا تو ہم اپنی حیثیت کے مناسب اس کا ساتھ دیں گے لیکن ہلاکتیں ہی کیوں نازل ہوں جو ہمیں چیخنا پڑے۔ ہندوستان اور پاکستان کی بھلائی کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے دہلی اور لاہور کا ملاپ' ہم کب تک رُوٹھے رہیں گے۔ مسعود سعد سلمان لاہوری' امیر خسرو' سورداس' تلسی' عبدالرحیم خانخاناں' میرابائی' کبیر' میر' غالب' اقبال' جوش' حفیظ' فیض اور رگھوپتی سہائے فراق کی عظیم الشان تہذیب! تیرے لوگ کب ہوش میں آئیں گے۔ ہوش میں آؤ! تم لوگ قوموں کے درمیان کب تک اپنا مذاق اُڑاتے رہو گے۔

اور اگر ہندوستان اور پاکستان بھی دو بھائیوں کی طرح نہیں رہ سکتے تو پھر اس پورے کرۂ ارض ہی کو ایک ہلاکت خیز جنگ کا میدان بن جانا چاہیے۔ ایک ایسی جنگ جس کے بعد زمین کے کناروں سے چلّا کر یہ کہنے والا بھی کوئی نہ رہے کہ انسانی نسل ختم ہوگئی اور سارا حساب بے باق ہوگیا۔

عالمی ڈائجسٹ' اکتوبر 1972

لکھت

میں اس وقت جو کچھ بھی لکھنا چاہتا ہوں اگر وہ نہ لکھوں تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟ کوئی بھی فرق نہیں پڑے گا، لکھنے میں بھی وہی ہے جو نہ لکھنے میں ہے۔ تو پھر سب لکھنے والے یہ ابت جانتے ہوں گے کہ لکھنے میں کچھ بھی نہیں دھرا۔ اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے اس کا آخر کیا نتیجہ نکلا؟ وہ سب کچھ جو سوچا جاتا ہے اور وہ سب کچھ جو چاہا جاتا ہے آخر اس کا حاصل کیا ہے؟ اگر میں نے کوئی ایسی بات لکھی جو پسند کی جائے تو اس سے فائدہ اور اگر میں نے کوئی مطلب اس طرز سے بیان کیا جس کی داد دی جائے تو اس کا حصول؟

اور پھر یہ کہ ہم جب سفید سوچتے ہیں تو سیاہ دیکھنے میں آتا ہے، جب دھنک کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں تو دھول ہاتھ آتی ہے۔ اُجالے لکھو اور اندھیرے پڑھو تو آخر اُجالے لکھو ہی کیوں؟ اچھائی کہو اور برائی سُنو تو آخر اچھائی کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہاں، یہ سچ ہے کہ انسانوں کا حق چھینا جا رہا ہے اور ہر طرف ایک دھاندلی مچی ہے۔ تم اس پر چیخ اُٹھتے ہو۔ میں پوچھتا ہوں کہ تمھارے چیخنے سے ہوگا کیا؟ چیخے وہ جس کے سینے میں دَم ہو اور پھر یہ کہ تم اپنی جان ہلکان کر کے آخر کر بھی کیا لو گے؟ تمھارے بس میں بھلا ہے کیا؟ میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہ آئی کہ قلم گھسنے والے اپنے آپ کو لوح و قلم کا مالک کیوں سمجھتے ہیں؟ تمھاری مانتا کون ہے، تمھیں گردانتا کون ہے؟

جن کے بس میں کچھ بھی نہیں ہے، انھیں بولنے کا اختیار بھی کیوں ہے اور یہ بھی میں نے ایک ہی کہی۔ میں، جسے بولنا کہتا ہوں، وہ بھی کوئی بولنے میں بولنا ہے۔ بولنا تو یہ ہے کہ شنوائیاں بھی کہہ اُٹھیں کہ ہاں کوئی بولنے والا بولا اور بستیاں پکار اُٹھیں کہ ہاں ہم نے سُنا

اور ہم نے مانا اور فاصلے دُور سے آواز دیں کہ ٹھہرو! تمھاری مسافت ہم خود طے کریں گے اور دروازے خود چل کر آئیں کہ آؤ ہمارے اندر داخل ہو جاؤ اور اپنی آواز کو ہمارے چوراہوں میں ایستادہ کر دو کہ لوگ اس کے چاروں طرف جمع ہو کر زندگی کی گرمی کسب کریں۔ پر ایسا بولنا خوش وقتی اور خوش باشی کا بولنا نہیں ہے۔ یہ اس سچ کا بولنا ہے جو بولتا ہے تو پھر کوئی نہیں بولتا۔

ہم سب جھوٹ بولتے ہیں اور اگر کوئی سچ بولتا بھی ہے تو سچ بولنے کی طرح کہاں سچ بولتا ہے۔ ہاں، میں نے ان لوگوں کو دیکھا ہے جو سچ بولنے کے دعوے دار ہیں، وہ اس طرح بات کرتے ہیں جیسے کوئی ان کہی کہنے والے ہوں اور بات یہ ہوتی ہے کہ انھیں کچھ کہنا بھی نہیں ہوتا۔ یہ سچ نہیں بولتے، سچ بولنے کی دھمکی دیتے ہیں اس لیے کہ ان کا منہ سونے اور چاندی سے بھر دیا جائے اور ہوتا بھی یہی ہے۔ اگر تم ان میں سے کسی کو دیکھو تو کہو گے کہ یہ کوئی انسان ہے یا دنبہ۔ جو سچ کا دُکھ سہتے ہیں اور جو اس دُکھ کا بوجھ سہارتے ہیں، ان کے بدن پر دنبوں کی طرح چربی نہیں چڑھتی۔

فاقہ کشوں کی بستی میں تمھیں جو آدمی فربہ دکھائی دے اس کے سلام کا بھی جواب نہ دینا کہ اس کا وجود پوری بستی کے حق میں ایک بدترین بداخلاقی ہے۔ یہاں جو آدمی فربہ ہے، اس نے ضرور کسی اکہرے بدن والے کا حق مارا ہے اور جو اکہرے بدن والا ہے اس نے ضرور کسی لاغر کا پیٹ کاٹا ہے اور جو لاغر ہے اس نے کسی ناتواں کے آگے سے روٹی اُٹھا کر نگل لی ہے اور جو ناتواں ہے اس نے کسی بیمار کے ہاتھ سے لقمہ چھینا ہے اور جو بیمار ہے وہ ضرور کسی کفن چور کی خیرات پر زندہ ہے۔

اے بھائی! سچ تو یہ ہے کہ ہم سب کی زندگی دھاندلی اور دھوکے کا دھندا ہے۔ جو لوگ غریبوں اور محنت کشوں کا نام لے کر اپنے گرد مجمع لگاتے ہیں، ان کی باتوں میں نہ آنا اور نہ ہمارے لکھے پر جانا کہ ہم سب جھوٹے ہیں۔ جن کا حق چھینا گیا ہے ان کو بس اپنے ہی اُوپر بھروسا کرنا ہے۔ ہم نے اپنی دانست میں جتنے سچ بولے، وہ سب جھوٹ تھے۔ سوائے دھوکا کھانے والو! اے خون کے گھونٹ پینے والو! تم سب اپنے ہی اُوپر بھروسا

کرواوران کی طرف سے چوکنے رہو جواپنے آپ کوتمھارا چودھری سمجھتے ہیں۔اپنا سچ خود بولو! پھر دیکھنا کہ یہ جھوٹ بولنے اور بکواس کرنے والے بھی تمھارے دباؤ میں آکر سچ بولنے لگیں گے۔رہا ہمارا بولنا تو ہمارا بولنا نہ بولنا برابر ہے۔ہم تو وہ لوگ ہیں کہ ایک بار بولیں تو دس بار اس کی داد چاہیں، رہی ہماری لکھت تو ہماری لکھت میں تو بس لبھانا ہی لبھانا ہے۔

عالمی ڈائجسٹ،نومبر1972

(یہی انشائیہ سسپنس،نومبر2001میں"لکھا گیا"کے عنوان سے شائع ہوا)

زمان

لوایک سال اور ختم ہونے کو آیا۔ گزرنے والا سال ہم نے تباہیوں کے بعد بڑی اُمیدوں کے ساتھ شروع کیا تھا۔ ان اُمیدوں نے ہمیں ہماری محرومیاں بھلا دی تھیں۔ پر ہماری اُمیدوں کا مقسوم نا اُمیدی ہی تھا' سو وہی ہوا جو ہوا' انسان اس وقت جھنجھلا اُٹھتا ہے جب بار بار وعدے کیے جائیں مگر پورے نہ کیے جائیں' مگر جھونجل کس پر اُتاری جائے؟ سب سے آسان طریقہ یہی ہے کہ اپنے ہی اُوپر جھونجل اُتاری جائے۔ ہم نفرتی ہیں' ہم لعنتی ہیں' ہنسا جائے کہ ہم زمین اور زمان کا ریش خند ہیں۔ خود بھی ہنسو اور دوسروں کو بھی ہنساؤ' اور چاہے کچھ بھی ہو زندگی کو چبلے پن کے ساتھ گزارو کہ یہی سب سے اچھا گزارہ ہے۔ گھر میں آگ لگ رہی ہو تو سوچو کہ آتش بازی چھوٹ رہی ہے کہ اس طور گزران کرنا ہی سب سے اچھی گزران ہے۔

میں ہر سال کے آغاز پر لوگوں کو بہتری کے مژدے دیتا رہا ہوں' پر اب میرے قلم کی جیب میں کسی کے لیے کوئی مژدہ نہیں ہے۔ کیا ہم لوگ اس کام پر مامور کیے گئے ہیں کہ اپنے گرد ایک ہجوم لگائیں اور چلاّ چلاّ کر کہیں کہ لوگو! تمھیں مژدہ ہو کہ آنے والے دن بہت اچھے ہوں گے۔ میں کوئی اس بات کی کمائی نہیں کھاتا جو چلاّ چلاّ کر اپنا حلق خشک کروں اور سینہ دُکھاؤں۔ میں اس کام کے لیے نہ بھیجا گیا ہوں اور نہ بلایا گیا ہوں۔ ہمیں اب اس سے کوئی غرض نہیں کہ آنے والے دن اچھے ہوں گے یا بُرے' غرض ہو تو سب کو ہو نہیں تو کسی ایک ہی گروہ کو کیوں ہو؟

بس یہ ہے کہ جب سال گزرنے پر آتا ہے تو نہ چاہنے پر بھی وقت اور حالات کا احساس کچھ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ سو ایک سال اور گزر گیا' زمان کی ایک اور آن ازل میں

حل ہوگئی۔ ہم ایک اور سال کی گزر میں کہیں گُم ہو گئے' اب ہم ایک اور ہم ہیں۔ اور یوں بھی ہے کہ ہم زمان میں ہیں اور زمان ہی ہماری پوشش ہے۔ ہم زمان ہی دیکھتے ہیں اور زمان ہی چُھوتے ہیں' چکھتے ہیں اور زمان ہی سُونگھتے ہیں اور زمان ہی سُنتے ہیں اور زمان ہی سوچتے ہیں' ہم زمان ہی کماتے ہیں اور زمان ہی کھوتے ہیں' ہاں ہم زمان میں ہیں اور خود زمان ہیں۔ اور زمان دہر میں ہے اور دہر' سرمد میں۔ اور سرمد ایک ایسا حال ہے جو نہ وجود ہے اور نہ عدم اور وجود بھی ہے اور عدم بھی۔ زنہار اس بات پر عجب نہ کیا جائے کہ زمان کی منطق ضد کی منطق ہے۔ یہاں ہونے میں نہ ہونا ہے اور نہ ہونے میں ہونا۔ اگر یہ کوئی ایسی بات ہے جسے خرافات سمجھا جائے تو یہ لکھنے والے کی خوش بختی ہوگی کہ وہی باتیں دھیان سے سُنی جاتی ہیں جو خرافات ہوں۔

مجھے کہنے دو کہ زمان ایک عجیب رمز ہے۔ سمجھو! کہ یہ مسئلہ' مسئلوں کا مسئلہ ہے' یہ وہ مسئلہ ہے جس پر صدیوں کی خانقاہوں میں دلیلوں سے دلیلیں گتھم گتھا رہی ہیں اور جنتوں نے جنتوں سے ماتھے ٹکرائے ہیں۔ اس بارے میں میری دُور دراز کی یادوں میں سے ایک یاد وہ ہے جس میں موسمِ گرما کی ایک شام کو اپنے گھر کے نچلے صحن میں ایک چھوٹے سے پیڑ پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور اُوپر کے صحن میں میرے اس وقت کے اُلجھے بالوں والے لااُبالی اور لااَدری بھائی سیّد محمد تقی' شہر کے ایک شوریدہ سر فلسفی نوجوان سے کہہ رہے تھے کہ شیخ الرئیس[1] کا نظریہ تو یہ ہونا ہی چاہیے کہ زمان' حرکت کی مقدار کا نام ہے کہ وہ ارسطاطالیس کی مکتب کے پُر جوش شاگرد ٹھہرے۔ مجھے یہ بات اس لیے یاد رہی کہ ہمارے گھر والوں کو اس قسم کی باتیں کرنے کا خاص شوق تھا' جن سے نہ صحت درست رہتی ہے اور نہ گھر کے دلدّر ہی دُور ہوتے ہیں۔ سو میں نے زمان کی تعریف سب سے پہلے اپنے فلسفی بھائی سے سُنی۔ انھوں نے شیخ بوعلی سینا اور فارابی سے اس نوع کے نکتے سیکھے اور ان دونوں نے کندی سے اور کندی نے ارسطاطالیس سے اور اس طرح اَسناد کا یہ سلسلہ مصر اور بابل کے دراز ریش کاہنوں تک پہنچتا ہے۔

---

[1]...... بوعلی سینا

یہ زمانہ یہ زمان آخر یہ کیا ہے' سمجھا تو جائے کہ آخر یہ کیا ہے۔ چاہے آخر میں کچھ بھی نہ سمجھ میں آئے۔ اس مسئلے میں فلسفیوں کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ زمان کوئی وجود ہی نہیں رکھتا۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ ایک موہوم امر ہے۔ اسی سے لگّا کھاتی ہوئی ایک رائے میں زمان کے ساتھ رعایت برتی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ زمان ایک وہمی وجود رکھتا ہے۔ کچھ سوچنے والوں نے کہا ہے کہ زمان' مطلق حرکت کا نام ہے۔ حکیموں کا ایک مانا ہوا گروہ' جس کا سرخیل ارسطاطالیس ہے' کہتا ہے کہ ''زمان حرکت کی مقدار کا نام ہے'' عربی فلسفیوں کی اکثریت کا نظریہ بھی یہی ہے' یہ لوگ اسے ناقرار پذیر وجود رکھنے والا موجود قرار دیتے ہیں۔ زمان کی ایک اور تعریف میں ایک خاص سلیقہ برتا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ زمان' متغیّر کی متغیّر سے باہمی نسبت کا اعتبار ہے۔ کتاب المعتبر کے مصنف بغدادی[۱] کا مقولہ یہ ہے کہ زمان وجود کی مقدار ہے۔ ایک مسلک یہ ہے کہ زمان ایک کے بعد ایک آن کے گزرنے کا نام ہے۔ اس مسلک کے حامیوں کا کہنا یہ ہے کہ زمان 'آن' کی حرکت سے وجود میں آتا ہے۔ جس طرح نقطے کی حرکت سے خط' صورت پذیر ہوتا ہے۔ بابا افضل کا قول یہ ہے کہ زمان تغیّرات کی مدّت ہے۔ بعض فلسفی اس طرف گئے ہیں کہ زمان ایک واجب الوجود ذات اور ایک ازلی جوہر ہے۔ اگر ان میں سے کسی رائے کو پسند کرنا ضروری ہو تو ایک قاری کی حیثیت سے میں اس رائے کو پسند کروں گا۔ ذرا سوچو کہ یہ کتنا مضبوط موقف ہے۔ ابنِ رُشد کا نظریہ یہ ہے کہ ہر موجود ایک مدّت یا امتداد رکھتا ہے اور اسی امتداد سے اس موجود کا اندازہ اور قیاس قائم کیا جاتا ہے' پس یہی امتداد زمان ہے۔ چناں چہ وہ کہتا ہے: ''کل حادث له امتداد یقدره' هو الذی یسمیٰ الزمان ''۔ میرے خیال میں زمان کے بارے میں اس قدر قابلِ فہم نظریہ قائم کرنا جسے ایک بقّال' ایک سرکاری افسر اور ایک حاکم تک سمجھ لے۔ ابنِ رشد کی شان سے فروتر ہے۔ کیا اس قول میں دعوے کو دلیل کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا[۲] سبزواری کا موقف یہ ہے کہ زمان قطعی حرکات کی مقدار ہے۔

۱..... ابوالبرکات بغدادی ۲..... مصادرہ علی المطلوب' جو ایک منطقی مغالطہ ہے۔

صدرالدین شیرازی نے اس موضوع پر معرکے کی بحث کی ہے۔ شیرازی کی تقریر یہ ہے کہ نقطہ مسافت کا مبدء اور فاعل ہے اور درمیانی حرکت[1] یعنی نقطہ بہ نقطہ یا تدریجی وجود ہے' قطعی حرکت اور اس کی ہیئتیں اور مقداریں وجود میں آتی ہیں اور یہ تمام مقداریں اپنی کُلی حیثیت میں زمان ہیں۔ یہ امر ظاہر ہے کہ مسافتوں میں جو حرکتیں ظہور پاتی ہیں' وہ تیزی اور دُوری کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں اور حال یہ ہے کہ وہ اپنے آغاز اور مسافت قطع کرنے کے عمل میں ایک جیسی حیثیت رکھتی ہیں۔ اب جیسے دو موجود ایک معیّن مبدے سے ایک ساتھ حرکت اور مسافت قطع کرنا شروع کرتے ہیں۔ پر اِن میں سے ایک موجود زیادہ مسافت قطع کرتا ہے اور ایک کم۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دونوں مبدے سے ایک ہی ساتھ حرکت کرنا شروع کرتے ہیں اور ایک ہی ساتھ منتہا تک پہنچتے ہیں' یعنی دونوں برابر رہتے ہیں۔ مسافت قطع کرنے میں یہ اختلاف اور یہ اتفاق ظاہر کرتا ہے کہ عالم میں مقدار کا ہونا ایک خاص وجود رکھتا ہے اور مسافت کے قطع کرنے میں کبھی ایسی اور کبھی ویسی حرکتوں کے واقع ہونے کا امکان اسی کا مظہر ہے اور یہ مقدار جسموں اور ان کی نہایتوں کی مقداروں سے ایک جُداگانہ چیز ہے۔ اس لیے کہ جسم قرار پذیر وجود رکھتے ہیں۔ سو وہ ناقرار پذیر امر جس کا علم ہم نے مسافت قطع کرنے کے مظہر سے حاصل کیا ہے' ضروری ہے کہ وہ اس ناقرار پذیر وجود کے امر کی مقدار ہو جو کہ حرکت ہے اور خود وہ امر زمان ہے۔

زمان کے بعد دہر کا مسئلہ آتا ہے اور سُنو کہ یہ مسئلہ فلسفیوں کے لیے بہت خطرناک لغزش گاہ ہے۔ زمان اور دہر کا فرق یوں سمجھو کہ دہر وہ حقیقت ہے جس سے حرکتوں کے ذریعے زمان کی پیمایش ہوتی ہے اور خود دہر پیمایش میں نہ آنے والا زمان ہے' جس میں نہ آغاز ہے اور نہ انجام نہ اوّل نہ آخر۔ اس باب میں میر باقر داماد کا نظریہ زبردست بحثیں بھڑکانے والا نظریہ ہے اور وہ فلسفے کی خانقاہوں میں بے حد غوغا انگیز ٹھہرا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تین ہونے[2] ایسے ہیں' جن کا عقل ادراک کرتی ہے' اور وہ یہ ہیں: (۱) زمانے میں ہونا'

۱...... حرکتِ توسطیہ

۲...... اکوان' کون کی جمع

یعنی کوئی چیز کب اور کب تک ہونے کے حال میں رہی۔ اس چیز کی ایک ابتدا ہوتی ہے اور ایک انتہا اور ظاہر ہے کہ ابتدا اور انتہا ایک دوسرے کی غیر ہیں۔ یہ ایک حال کا گزرنا اور دوسرے حال کا شروع ہونا ہے (۲) دوسرا 'ہونا' جس کا عقل ادراک کرتی ہے' زمانے کے ساتھ ہونا ہے اور یہ 'ہونا' دہر ہے جو زمانے کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ ایک ثابت امر یعنی دہر کی' ایک متغیر امر یعنی زمان کی طرف نسبت ہے (۳) تیسرا 'ہونا' ثابت کا ثابت کے ساتھ ہونا ہے۔ یہ سرمد ہے اور سرمد' دہر کو گھیرے ہوئے ہے۔ چناں چہ میر باقر نے کہا کہ ''دریت انّ الدهر وجود امتداد الزمان كله ومحاط بالسرمد''۔

میرا جہل یہ کہتا ہے کہ زمان ایک مسلسل حال ہے اور حال ایک ناقرار پذیر آن۔ ہے یوں کہ زمان کے مفہوم کو ہماری روزمرّہ کے کاموں میں بولی جانے والی زبان نے بُری طرح خراب کیا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کل میرے لیے بہت اچھی تھی تو اصل میں ہمیں کہنا یہ چاہیے کہ آج جو اَب نہ ہونے کے حال میں ہے' میرے لیے بہت اچھی ہے' یا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کل بہت پُر رونق ہوگی۔ تو حقیقت میں کہنا یہ چاہیے کہ آج جو ابھی نہ ہونے میں ہے' بہت پُر رونق ہے۔

جانا جائے کہ ہندو فلسفے میں زمان کا تصور بہت عظیم ہے۔ ویسے فلسفہ نہ ہندو ہوتا ہے نہ مسلمان۔ اس گفت گو کے ذیل میں زمان کے باب میں چینی فلسفے کا تصور پیش کرنا بہت مناسب ہوگا۔ چینی فلسفیوں کا نظریہ یہ ہے کہ 'کال' یعنی زمان بے شمار ذرّوں کا حامل ہے۔ پر یہ ذرّے آپس میں کبھی نہیں ملتے' ہاں! نئی حالتوں کے ظاہر ہونے یا تغیر پیدا ہونے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ کال' چیزوں کی کیفیت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا مگر اس بات میں مدد دیتا ہے کہ چیزوں کی نئی کیفیت کے تغیر کا عمل ظہور میں آئے۔ کال' لمحوں' گھنٹوں اور دنوں کے طور پر تصور میں لایا جاتا ہے اور سمے کہلاتا ہے۔ وہ بہت سی شکلیں رکھتا ہے' وہ صرف اپنے سے جُداگانہ چیزوں ہی کے تغیر میں کارفرما نہیں ہوتا بل کہ خود اپنے تغیرات کو لمحے اور گھنٹے کہلانا روا رکھتا ہے۔ سمے کی اکائی وہ مدّت ہے جو ایک سالمے کے لیے

درکار ہوتی ہے کہ خفی حرکت سے مکان[۱] کی اکائی کو طے کرے۔ زمان کا یہ تصور آن کے نظریے سے کتنا مشابہ ہے۔ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ زمان ایک کے بعد دوسری آن کے آنے کا نام ہے اور دو آنیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ کال کے بعد 'دھرم' کا ذکر سُنو' دھرم میں نہ مزہ ہے نہ بُو نہ رنگ' وہ پانچ حسوں سے محسوس کی جانے والی چیزوں سے یک سر معرّیٰ ہے۔ دھرم 'لوکا کاش' یعنی عالم سے پیوستگی رکھتا ہے اور اس کے ہر حصّے کو گھیرے ہوئے ہے۔ 'دھرم' آتما[۲] یا دھاتو[۳] تو کو حرکت میں نہیں لاسکتا۔ پر وہ حرکت کرنا چاہیں تو اس بارے میں وہ دھرم سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ دھرم قریب قریب عربی فلسفے کا دہر ہے۔

دھرم کے بعد میں ادھرم کا ذکر کیوں نہ کروں۔ جس طرح کوئی جوہر دھرم کے بغیر حرکت نہیں کرسکتا' اس طرح کوئی جوہر ادھرم کے بغیر ساکن حالت میں نہیں رہ سکتا۔ اس کے بعد چوتھا مسئلہ 'آ کاش' کا مسئلہ ہے۔ یہ وہ لطیف وجود ہے جو عالمِ اعلیٰ کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ محض خلا نہیں ہے بل کہ حقیقی وجود ہے اور دوسرے جوہروں کے اختلاط میں مدد دیتا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے وہ اپنی اثر پذیری کی وجہ سے 'آ کارشاستی کایہ' کہلاتا ہے۔ ذرا دیکھو کہ 'ادھرم' اور 'آ کاش' دونوں 'سرمدؔ' کے تصور سے کتنے نزدیک ہیں۔

یہاں میں مغربی فلسفے کے اس سلسلے سے بھی ضرور سروکار رکھتا جو بیکن اور پھر برونو اور دیکارتے سے لے کر رسل اور ونگنسٹائن تک آتا ہے' مگر میرے گمان میں اس پورے دور نے زمان پر اتنی دقیق بحثیں نہیں کیں جتنی ان سے پہلے ہو چکی ہیں۔ ہاں زمان کے بارے میں آئن سٹائن نے جو تصور پیش کیا ہے وہ شہرۂ آفاق ہے یعنی زمان عالم کا چوتھا بُعد ہے۔ میں ایک حقیر طالب علم کئی برس سے یہ سوچتا رہا ہوں کہ عالم سہ بعدی یا چار بعدی نہیں' یک بعدی ہے۔ اس لیے کہ عالم زمانے کا مظروف ہے اور زمانہ ایک یک بُعدی وجود ہے' پس عالم یک بعدی وجود ہے۔

۱۔۔۔۔۔Space

۲۔۔۔۔۔روح

۳۔۔۔۔۔مادّہ

پر اب میں اس سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ یہ کون ہے جو یہ بکواس کر رہا ہے۔ نوع انسانی کا ایک فرد ایک گلگلا کیڑا ایک گھناؤنا جرثومہ جس کے وجود کی اتنی بساط بھی نہیں ہے کہ اس پر گھِن بھی کھائی جا سکے۔ اور بھلا اس کی عمر کیا ہوگی؟ یہی کوئی دس لاکھ سال اور یہ جرثومہ اپنی زمین پر کائنات کے بارے میں بڑ ہانک رہا ہے۔ اور بھلا اس کی زمین کتنے سال کی ہے۔ یہی کوئی دو ارب سال کی۔ اس کی حیثیت کیا ہے۔ سورج کے گھٹیا گودام کا ایک حقیر ریزہ اور خود اس سورج کی اوقات کیا ہے؟ ایک معمولی سے سحابیے کا ایک جُھنگا۔ اس سحابیے سے کتنے ہی بڑے بڑے سحابیے خلا میں یوں ہی پڑے پھرتے ہیں۔ بے شمار سحابیے جو خلا کی ہیبت ناکی میں کپکپا رہے ہیں اور پاگلوں کی طرح دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ ہم ایک سورج پر اکڑتے ہیں، کم سے کم ایسے پینتیس، چالیس ارب سورجوں کی تصویریں تو اُتاری جا سکتی ہیں جو ہمارے اس سورج سے کئی گنا بڑے ہیں اور ایسے کتنے ہی ستارے ہیں جن کے سامنے ہمارا یہ سورج ایک ٹمٹماتے دیے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اب اپنے اس سورج کی تعریف بھی سُن لو۔ یہ اپنے سیاروں کو جلو میں لیے ہوئے ایک دقیقے میں دو سو میل کی رفتار سے اس بیکراں فضا میں رینگ رہا ہے۔ اس کی گردش کا دائرہ اتنا ہے کہ اس کا ایک چکّر پورا کرنے میں پچیس کروڑ برس لگتے ہیں اور سورج اب تک لاکھوں چکّر پورے کر چکا ہے۔

تو یہ ہے ہمارا سورج، ہمارا ٹمٹماتا دیا اور یہ ہے ہماری زمین، یہ ہیں ہم اور یہ ہو تم۔ خود کو چُھو کر تو دیکھو کہ ہم ہیں بھی یا نہیں۔ مگر پہلے تو ہماری کہکشاں اپنے آپ کو چُھو کر دیکھے، پھر ہمارا سورج اور پھر ہماری زمین کہ وہ اس کائنات کے کسی نقطے پر ہیں بھی یا نہیں۔ خیر اس حقیر ریزے یعنی زمین کے اُوپر گلبلانے والے جرثوموں کو نیا سال مبارک ہو۔

عالمی ڈائجسٹ، جنوری 1973

چھٹا دن

زندگی گزارنا سب سے زیادہ آسان اور سب سے زیادہ دشوار کام ہے۔ یوں سوچو تو زندگی گزارنے کا کیا ہے۔ کسی طرح بھی گزار لی۔ سویرے سویرے اُٹھے' ناشتا کیا اور کاروبار میں لگ گئے۔ دفتر یا دکان پر اپنا وقت' اس بردباری اور بھاری بھر کم پن سے گزارا کہ اگر کوئی ٹھالی آدمی دیکھے تو اس پر بہت رعب پڑے۔ اس ساری بُردباری اور بھاری بھر کم پن کا حاصل کیا ہے' پیسے بٹورنا' پیسے بٹورنے کا مطلب کیا ہے؟ اپنے چاروں طرف ایسا کاٹھ کباڑ جمع کرنا جسے اپنا قیمتی سروسامان کہا جا سکے اور اس کے علاوہ یہ کہ دو وقت کی روٹی کے بجائے کئی نسلوں کے لیے روٹیوں کا انبار لگا جانا۔ اس انبار کی قسمت کیا ہے' فضلہ بننا۔ پھر جب دن بھر کے کاروبار سے تھک گئے تو رات کو سو گئے' چلو ایک دن پورا ہو گیا۔ وائے ہو اس دن پر! آخر یہ کیا اور کیسا دن ہے۔ میں اپنے گرد و پیش کے بے سروپا ہیولوں کو اسی طرح زندگی گزارتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ذرا دیکھو تو یہ انسان بھی کیا چیز ہے' میرا تو اسے چمکارنے کو جی چاہتا ہے' ذرا دیکھو تو سہی کیسا سدھا ہوا ہے۔ افلاطون کے ستم ظریف شاگرد ارسطو نے انسان کی جو تعریف کی تھی' اس میں اچھا خاصا مسخرہ پن شامل تھا۔ اس نے کہا تھا کہ انسان بولنے والا جان دار ہے۔ سو ہم چرتے اور چیخ چیخ کرتے ہیں۔

ہاں تو یہ زندگی کتنی آسان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بہت اچھی بھی ہو۔ پر ہمارے نزدیک اگر زندگی یہی ہے تو پھر زندگی ہو چکی۔ یہ زندگی اچھی ہے یا بُری۔ تو سچ بات یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو اب ان تمام پیمانوں سے محروم پاتا ہوں' جن سے کسی چیز کی اچھائی یا بُرائی جانچی جا سکے۔ میں اس بارے میں ایک ایسے جہل میں مبتلا ہوں جس میں ہر لمحہ جاں کنی کا عذاب

سہنا پڑتا ہے۔ اس معاملے میں یونان کے سوفسطائیوں کی روش شاید بہت درست تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر ایک آدمی کو سردی لگ رہی ہے تو سردی کا موسم ہے اور اگر ایک آدمی کو گرمی لگ رہی ہے تو گرمی کا موسم۔ یہ سب کچھ آدمی کے اپنے احساس پر منحصر ہے۔ پھر یہ کہ وہ سردی کو گرمی اور گرمی کو سردی ثابت کرنے میں بھی طاق اور شہرۂ آفاق تھے۔ میں نے ان لوگوں کو ہمیشہ بڑی دل چسپی اور گرم جوشی کے ساتھ یاد کیا ہے۔ مجھے بھی اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرا ''میں'' ہی ہر چیز کو جانچنے کا پیمانہ ہے۔ سو جب میں دوسروں کے لیے کوئی بات کہنا چاہتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ آخر کیا کہوں۔ ایک ہی سانس میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے اور وہ بھی۔

ہرقلیطاس جو یونان کا ایک شعلہ بجاں فلسفی گزرا ہے اور جو فلسفی سے زیادہ میرے خیال میں شاعر تھا، کہا کرتا تھا کہ یہ کائنات ہر لحہ بدلتی رہتی ہے اور کوئی چیز بھی دوسرے لمحے اپنے پہلے لمحے کی حالت پر باقی نہیں رہتی۔ سو جب ایسا ہے تو پھر تم نہ کسی چیز کے بارے میں کچھ جان سکتے ہو اور نہ کچھ کہہ سکتے ہو۔ اسی لیے ہرقلیطاس کے ہونہار پیرو کسی بھی چیز کے بارے میں کچھ کہنے سے بچتے تھے، حد یہ ہے کہ وہ بولنے سے بھی پرہیز کرتے تھے اور بس اشاروں سے اپنا مطلب سمجھاتے تھے۔ یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہے۔ میں کسی چیز کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے بڑی جھجک محسوس کرتا ہوں۔ یہ ایک دوسری بات ہے کہ میں اپنی بکواس سے کسی وقت بھی باز نہیں آتا۔ اور میں نے ایک کلیہ بھی بنا رکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو جتنا بھی کم گو ہوتا ہے، اتنا ہی وہ کم انسان ہوتا ہے۔ اور کم گوئی میرے اور میرے دوستوں کے نزدیک بے وقوفی اور بداخلاقی کی بھی پہچان ہے۔ معتزلہ کے نام آور فلسفی نظام سے کسی نے سوال کیا تھا کہ سکوت اور کلام میں بہتر کون ہے؟ نظام نے کہا کہ اس سوال کے لیے بھی تمھیں کلام کی ضرورت پیش آئی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس نے کوئی ایسا ہی جواب دیا تھا۔

میں کیا کہہ رہا تھا، کیا کہنا چاہتا تھا اور کیا کہنے لگا اور وہ بھی شاید یہ ثابت کرنے کے لیے کہ مجھے فلسفیوں کے دو چار مقولے یاد ہیں۔ بھلا بتاؤ کہ اس کے سوا میں نے آخر اور کیا ثابت کرنے کی کوشش کی۔

سچ بات تو یہ ہے کہ ہم بہت بولتے ہیں اور اس میں زیادہ حصہ ایسا ہوتا ہے جسے کسی

ہچکچاہٹ کے بغیر بکواس کہا جائے۔ میں اپنے بارے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ میرا بولنا' بڑ ہانکنے اور بکواس کرنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں اور میرا لکھنا بس حرفوں کا ایک اُلجھیڑا ہے۔ پر میں کچھ کہنا چاہتا ہوں اور اس کے سوا مجھ ایسا آدمی چاہے گا بھی کیا۔ ہاں تو ہو سکتا ہے کہ ہم جو زندگی گزار رہے ہیں وہ بہت اچھی زندگی ہو اور یہ انبوہ جو میرے گردو پیش زندگی گزارنے میں جتا ہوا ہے' ہو سکتا ہے کہ یہ زمین کے اُن چنے ہوئے لوگوں میں سے ہو جن کی پیروی کی جانا چاہیے' پر میں بدبخت یہ گمان کرتا ہوں کہ میں اور ہمارے سارے لوگ جو زندگی گزار رہے ہیں وہ ایک بہت گھٹل اور گھٹیا زندگی ہے۔ یہ غول جسے قوم کہتے ہوئے کلیجا منہ کو آتا ہے بس ایک غول ہے' جس میں بس نفرت اور نفرین کے دہرے دہرے حصّے بانٹے جانے چاہئیں۔ یہ ہیں پر جانے کیوں ہیں۔ اے بھائیو! سچ مچ سوچو تو سہی کہ تم آخر ہو تو کیوں ہو؟ مجھے تو یہاں کی ہر بات بے کار اور ہر بول باطل لگتا ہے۔ ہم نے گزشتہ سال کو ایک سڑی ہوئی لاش کی طرح دفن کیا ہے جب کہ حال یہ تھا کہ اسے ایک نئی زندگی کا پیش خیمہ سمجھا گیا تھا۔

میں تم سے ایک بات تو پوچھ کر ہی رہوں گا' تم آخر جا کدھر رہے ہو؟ تم چاہتے کیا ہو اور جو کچھ چاہتے ہو اُس کے لیے تم نے اب تک کیا کیا ہے؟ اور جو کچھ تم نہیں چاہتے تو آخر کیوں نہیں چاہتے۔ آخر اس میں وہ کیا بات ہے جس کے کارن تم اسے چاہنے سے بچتے ہو۔ پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ بھی ہے وہ آخر کیا ہے اور کیوں ہے' جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ کیوں ہوتا رہا ہے۔

میں اپنے لوگوں کی زندگی کے کسی ایسے دن اور ایسے پل کو نہیں جانتا' جو اگر نہ گزارا جاتا تو زندگی میں بڑی کمی رہ جاتی۔ اور یہاں مجھے کوئی ایسا آدمی دکھائی نہیں دیتا جو اگر پیدا نہ ہوا ہوتا تو پیدا ہو جانے والے بڑے گھاٹے میں رہتے۔ مجھے اب ایک سکون ضرور نصیب ہے اور وہ یہ ہے کہ یہاں سب بونے ہیں اور میں ان میں سے ایک ہوں' سو مجھے اپنی اوقات معلوم رہنا چاہیے۔ ہماری بود و ماند ان بونوں کی بود و ماند ہے' جو بخار کے بحران میں پڑے بہک رہے ہوں۔ یہاں مجھے جزیرۂ کوس کے باشندے بقراط طبیب کے شفاخانے کا

وہ روزنامچہ یاد آیا جس میں کسی وبائی بخار کے مریض کی رُوداد لکھی گئی ہے، اور وہ یہ ہے:

پہلا دن۔ فِلِس گس ......کو تیز بخار چڑھ گیا، وہ پسینے پسینے ہو گیا اور اس کی ساری رات بستر پر تڑپتے ہوئے گزری۔

دوسرا دن۔ آج بخار تیز ہو گیا۔ اجابت کے لیے پچکاری لگائی گئی، خوب اجابت ہوئی اور رات آرام سے گزری۔

تیسرا دن۔ صبح سے دوپہر تک وہ بحال رہا، پر شام ہوتے ہوتے پھر بخار تیز ہو گیا...... زبان خشک ہو گئی، آج پیشاب کا رنگ سیاہ تھا۔ رات بڑی تکلیف کے ساتھ گزری اور اس کی آنکھ ایک پل کے لیے بھی نہ جھپکی۔ اسے اپنی سُدھ بُدھ بھی نہ رہی۔

چوتھا دن۔ بخار میں زیادتی ہو گئی۔

پانچواں دن۔ رات بڑی بے آرامی سے گزری، وہ کبھی کبھی اُونگھ بھی جاتا تھا، وہ بحرانی کیفیت میں بہکتا رہا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے...... پیشاب کا رنگ سیاہ تھا۔ سویرے کے وقت وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُونگھتا رہا۔ زبان بند ہو گئی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگے اور جسم کے کنارے نیلے پڑ گئے۔

یہ بقراط کے شفاخانے یا طبّی مدرسے کے اس مریض کی پانچ دن کی کیفیت نہیں ہے۔ یہ تمھارے پچیس سال کی رُوداد ہے۔ اس کے بعد اس نوشتے میں چھٹے دن کی کیفیت لکھی گئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اُس بیمار کے چھٹے دن کی کیفیت اور قسمت سے بچنے کی کوشش کرو۔ تم نے اپنے آپ کو جو بیماریاں لگائی ہیں، ان سے چھٹکارا ڈھونڈو، نہ یہ کہ انھیں اور پالتے رہو۔ جو ہے سو وہ تو ہے، تم چاہے کتنا بھی انکار کرو، جو ہے سو وہ تو ہے۔ اور سُنو! جو نہیں ہے اُس کے ہونے پر دلیلیں مت لاؤ، تم سچائیوں کو مانتے ہوئے جھجکتے ہو، جھجکتے کیا ہو جھنجھلاتے ہو۔ تم نے کیا کچھ نہیں جھٹلایا، اور اب کیا کچھ نہیں جھٹلا رہے۔

جنھیں تم سے جُدا ہونا تھا وہ جُدا ہو گئے اور سُنو! ہمیشہ کے لیے۔ ہاں یاد رکھو! ہمیشہ کے لیے، سو اچھا یہی ہے کہ تم یہ مان لو کہ وہ ہیں اور تم سے جُدا ہیں۔ سمجھے میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ میں مشرقی بنگال کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔ وہ تمھارے وجود کا زائد گوشت جو

کٹ کر جُدا ہو گیا۔ اور پھر میرا اشارہ ان ساری باتوں کی طرف ہے جن کو جھٹلاتے تم نے اپنی حالت خراب کر لی ہے۔ سچ مچ تم عجیب لوگ ہو۔ تم وہ لوگ ہو جو اپنی بیماریوں سے جھوٹ بولتے ہیں جو اپنی غیر حالت کو دھوکا دیتے ہیں اور جو خود اپنے وجود سے کتراتے اور کنیاتے ہیں۔ ایک اژدحام ہے جس سے بڑھ کر اس کا دشمن اور کوئی نہیں۔ ہاں! میں ایک ایسے اژدحام میں گھرا ہوا ہوں جو اپنا سب سے بڑا بیری ہے۔ تم تو وہ جان دار ہو جو خود اپنا ٹینٹوا چبا جائے اور تم وقت کا ایک مسخرہ پن ہو۔

تم میں سے کوئی آدمی اس بات پر فخر نہیں کر سکتا کہ وہ تم میں سے ہے۔ تم میں سے ہونا ایک ایسی بات ہے جس کو تمھارے پردیسی اپنے پاس پڑوس والوں سے چھپاتے ہیں۔ پر میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ میں جھڑکنے اور جھڑکیاں دینے والا کون؟ سب اپنی اپنی زندگی گزار رہے ہیں، مجھے بھی اپنی زندگی گزارنا چاہیے۔ پر میری جھونجل آج اس لیے کچھ اور بھی بڑھ گئی ہے کہ جن لوگوں کو روزانہ ایک دوسرے کو پُرسا دینا چاہیے وہ آج عید منا رہے ہیں اور جو خود دنبے دکھائی دیتے ہیں وہ دنبے ذبح کر رہے ہیں۔ پھر سوچتا ہوں کہ مجھے کیا میں اپنا قلم کیوں گھِسوں اور میں اپنی روشنائی کی روشنی ان اندھوں کے بیچ کیوں رائگاں جانے دوں۔

ہاں تو میں بقراط کے شفاخانے کے ایک مریض کے چھٹے دن کی رُوداد بتانا بھول گیا۔ اور وہ یہ ہے:

چھٹا دن۔ آج دوپہر کے وقت مریض مر گیا وہ اپنی سانسوں کو بحال کرنے کی کوشش کرتا رہا، پھر اس کی سانسیں لمبی ہوتی چلی گئیں اور پھر وہ وقفے وقفے سے آنے لگیں۔ اس کی تلّی پر ورم آ گیا تھا۔ سارے وقت اسے ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے آتے رہے...... غرض، فِلِس کِس مر گیا۔

میں کہتا ہوں کہ اب بھی وقت باقی ہے۔ فِلِس کِس کے چھٹے دن کی قسمت سے، بچو، بچو اس قسمت سے جس کا گمان بھی دل کو خون کر دیتا ہے۔ تم اب تک اُونگھ رہے ہو اور اُونگھتے کو سوجاتے کیا دیر۔

عالمی ڈائجسٹ، فروری 1973

بے ضمیر

ہمارے نام کچھ خط آئے ہیں جن میں اُردو کے ان ادیبوں کی سخت شکایت کی گئی ہے جو اپنے آپ کو مظلوم انسانوں کا غم گسار اور ستم رسیدہ انسانیت کا دردمند کہتے نہیں تھکتے۔ لکھا گیا ہے کہ مظلوم انسانوں کے یہ غم گسار اور ستم رسیدہ انسانیت کے یہ دردمند نہ اپنے پہلو میں دل رکھتے ہیں اور نہ دل میں انسانیت کا درد۔ بے حسی ان کی دستاویز ہے اور بے ضمیری ان کا دستور۔ یہ لوگ انسانیت کے نام کی دہائی دیتے ہیں اور انسانوں کی طرف سے آنکھیں پھیرے ہوئے ہیں، جہاں سینے کی گہرائیوں سے چلاّ اُٹھنا چاہیے وہاں یہ بڑبولے خاموش رہتے ہیں۔ بنگلا دیش کے پاکستانی جاں کنی کی زندگی گزار رہے ہیں، نہ ان کا کوئی پرسانِ حال ہے اور نہ فریادرس مگر پاکستان کے اُردو ادیب ان کے بارے میں نہ کچھ کہتے ہیں اور نہ لکھتے ہیں۔ کیا یہ انسانیت کا مسئلہ نہیں ہے؟ کیا اُن بدبختوں کی رُوداد بدبخت زندگی کی الم ناک ترین رُوداد نہیں ہے؟

شکایت کرنے والوں کی شکایت اپنی جگہ درست ہے مگر وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ہم ادیبوں کا پیشہ ہر دل عزیزی کی دولت اکٹھی کرنے اور ہر طرف سے نیک نامی کمانے کا پیشہ ہے؟ اگر ہم کسی گروہ یا کسی علاقے کا خیال کیے بغیر سچ بات کہنے لگیں تو پھر ہمارے پاس رہے گا کیا اس لیے ہمیں سوچنا پڑتا ہے کہ ہم کس معاملے میں زبان کھولیں اور کس معاملے میں خاموش رہیں۔ ہم تو صرف وہی باتیں کہتے ہیں جنھیں سُن کر سب خوش ہوں۔ ہم نے ایک نکتہ گرہ میں باندھ لیا ہے اور وہ یہ ہے کہ یا تو وہ بات کہو جو سب کو اچھی لگے یا گلیوں میں بات کرو اور عام بات کہو۔ مثال کے طور پر اس طرح کے نعرے ہمارے لیے ہر حال میں مفید ثابت ہوتے ہیں کہ تمام انسانوں کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے۔ یا ظلم کے خلاف ہم سب کو مل کر جنگ کرنا

چاہیے' ان بے ضرر نعروں کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہمارے نامۂ اعمال میں نیکیاں بھی لکھی جاتی رہیں اور ہمیں کوئی گھاٹا بھی نہ ہو۔ جہاں تک پاکستان سے باہر کے کسی مظلوم انسانی گروہ کا تعلق ہے تو اس کی حمایت میں ہمیں کسی گھاٹے کا خطرہ نہیں ہے' سو ہم ان کے بارے میں پورے اطمینانِ نفس کے ساتھ لکھتے رہے ہیں مگر پاکستان کے کسی ایسے مظلوم گروہ کی حمایت میں لکھنا ہماری پیشہ وارانہ مصلحت کے خلاف ہے جس کی حمایت سے پاکستان کے کسی دوسرے گروہ کے ناخوش ہونے کا خدشہ ہو۔ ہمارا پیشہ ورانہ فرض انسانوں کے دُکھ میں آنسو بہانا نہیں ہے بل کہ آنسو بہا کر داد حاصل کرنا بھی ہے۔ ہم صرف وہی موضوعات ٹھیکے پر لیتے ہیں جن سے کچھ منفعت ہو اور ساتھ ہی ساتھ ساکھ بھی بڑھے۔ کوئی شک نہیں کہ بنگلا دیش کے تیرہ نصیب بہاریوں کی سرنوشت بڑی دردناک سرنوشت ہے مگر اس کے بارے میں اگر ہم نے کچھ کہا تو ہمارے بہت سے قدرداں شاید اس بات کو پسند نہ کریں اور پھر یہ کہ اس کا بھی امکان ہے کہ ملک کے کسی گوشے سے ہم پر رجعت پسندی کا الزام لگ جائے۔ ہمیں رجعت پسندی قبول ہے مگر رجعت پسندی کا الزام کسی حال میں قبول نہیں۔

ہم میں سے کتنے لوگوں نے ایوب خاں کی آمریت کے گُن گائے تھے' مگر کس سلیقے سے۔ سرمایہ داری کی دلاّلی بھی کی تھی مگر چین کی دوستی کا دم بھرنا نہیں بھولے تھے۔ آج بھی ہماری وہی سیاست ہے۔ ذکر مظلوم بہاریوں کا تھا۔ بات یہ ہے کہ وہ صرف مظلوم ہیں اور کسی گروہ کا صرف مظلوم ہونا اس ملک کے انسان دوست ادیب کے نزدیک کافی نہیں۔ ان مظلوموں کو کچھ اور شرطیں بھی پوری کرنا چاہیے تھیں۔ ان کا تذکرہ کر کے ادیبوں کو ملک گیر مقبولیت کا پروانہ ملتا۔ ان کے حق میں لکھنے والے 'انقلابی فن کار کہلاتے' مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔ اصل چیز مظلوموں کی مظلومی نہیں ہے بل کہ ہماری مقبولیت اور نیک نامی ہے۔ ایک بات ذہن میں رکھی جائے کہ شہرت اور نیک نامی کی ہوس ہمارے ادبی وجود کی ماں اور نفس کا فریب اس ادبی وجود کا باپ ہے' یہاں اگر ہمیں ایک کہاوت یاد دلائی جائے تو ہم اس کا بُرا نہیں مانیں گے اور وہ کہاوت یہ ہے کہ ماں ایلی باپ تیلی بیٹا شاخِ زعفران۔

بزرگ نسل کے ایک ترقی پسند دانش ور جناب منظور احمد نے بھی ہمارے نام ایک

دردناک مراسلہ لکھا ہے۔ جس میں ہم ادیبوں اور شاعروں کی شرم ناک بے حسی پر ماتم کیا گیا ہے۔ ہم اس مراسلے کو یہاں شائع کر رہے ہیں۔ اور اپنی دانست میں بہت بڑا احسان فرما رہے ہیں' پڑھنے والو! اسے پڑھو اور تم بھی ہماری بے حسی پر ماتم کرو' مگر ہاں' ہماری پیشہ ورانہ مصلحتوں کو بھی ذہن میں رکھنا۔ وہ مراسلہ یہ ہے:

برادرم' السلام علیکم!

بنگلا دیش کے وزیر اعظم شیخ مجیب الرحمٰن کا یہ بیان آپ نے اخبارات میں پڑھ لیا ہوگا کہ بنگلا دیش کی لسانی اور نسلی اقلیت کے تین لاکھ ان افراد کو پاکستان' اپنے خطۂ ارض میں رہنے والے بنگالی شہریوں کے تبادلے میں قبول کر لے جو پاکستان جانا چاہتے ہیں اور اگر ان پاکستانی شہریوں' وحدت پسندوں اور دو قومی نظریے کے اجیروں کے لیے پاکستان اپنی سرزمین تنگ پاتا ہے تو عالمی برادری ان احمقوں' محروم الارض سوختہ بختوں اور خود اپنے بدترین دشمنوں کو کسی غیر آباد جزیرے میں آباد کر دے۔

مجیب کے اس بیان کے جواب میں ہمارے نئے پاکستان کی انتظامیہ کا روّیہ بھی آپ کے سامنے ہے کہ وہ اپنے پاکستانی شہریوں کے لیے انسانی حقوق کے چارٹر کا حوالہ دے رہے ہیں اور عالمی اداروں سے اپیل کر رہے ہیں کہ مجیب کے اس بیان کا نوٹس لے۔ لیکن یہ کہنا انھیں منظور نہیں کہ بنگلا دیش کے وہ غیر بنگالی مسلمان جو تحریکِ پاکستان کی حمایت کے باعث ترکِ وطن پر مجبور ہوئے تھے یقیناً ہمارے شہری ہیں اور ہمارے نئے پاکستان کے دروازے ان کے لیے آغوشِ مادر کی طرح کھلے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس ٹرسٹ کے بعض خواجہ سرا تو حکومت کے ترجمانی کو جائز ثابت کرنے میں اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ وہ بنگلا دیش کی اس پاکستان دوست بل کہ پاکستانی آبادی کو بنگلا دیش کی ذمّے داری قرار دیتے ہیں۔

بھارت کے ہندو نے بھارت کے مسلمان سے پاکستان کے مطالبے کی حمایت کے جرم کا اتنا بھیانک انتقام نہیں لیا' جتنا الم ناک اور تباہ کن انتقام پاکستان کی جدوجہد میں شرکت کا' پاکستانی مسلمانوں نے ہندی مسلمانوں سے لیا ہے' مشرقی بنگال ہو' یا مغربی پاکستان کے صوبے' یہ تمام مسلم اکثریت کے صوبے ہیں اور اس مشرقی اور مغربی خطے نے اپنے اپنے رنگ

میں بھارت کے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں۔ مشرقی بازو دھکے دے رہا ہے' مغربی بازو اس کے پاکستان میں داخل ہونے میں رکاوٹ بن رہا ہے' ایک بازو پشت کی جانب سے دھکیل رہا ہے' دوسرا سینے پر ضربیں لگا رہا ہے' ایسی حالت میں کیا اہلِ قلم پاکستان کے ان مظلوموں کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ کیا آپ سب کا قلم جلاد کا ضمیر بن گیا ہے۔ عالمی ڈائجسٹ نے گاہے گاہے بنگلا دیش کی غیر بنگالی پاکستانی شہری آبادی کے مسائل پر لکھا ہے' شاید اب بھی آپ اس پر لکھنا پسند کریں۔ آپ اگر نئے پاکستان کی انسان دوست اور اُصول پرست انتظامیہ کو اس پر آمادہ نہیں کر سکتے کہ بنگلا دیش کے اَجل گرفتہ اُردو والے یہاں آ جائیں تو حکومت کو اس پر رضامند کر دیں کہ جو اُردو والے اپنے بنگلا دیش کے رفیقوں کے ساتھ غیر آباد جزیرے میں جانا چاہیں حکومت انھیں ممکنہ سہولت فراہم کر دے۔

جو آج ہو رہا ہے اگر یہ درست اور اُصولی ہے تو مسلم لیگ کی غیر منقسم ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی' سیاست نہ تھی' خرکاری تھی۔ قیادت نہ تھی دھوکا تھی' رہ نمائی نہ تھی رہ زنی تھی۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ بنگلا دیش میں غیر بنگالی شہری آبادی پر یہ زہرہ گداز مظالم صرف اس لیے ہوئے ہیں کہ یہ آبادی پاکستان کی یک جہتی کی خواہش مند تھی اور اس مقصد کے لیے اس انسانی آبادی نے اپنی جان کے نذرانے پیش کیے تھے۔ کیا نئے پاکستان کے عوام کو یہ بھی بتانا پڑے گا کہ مجیب الرحمٰن ان تین لاکھ افراد کو پاکستان منتقل کرنے پر اس لیے بہ ضد ہے کہ ان تین لاکھ افراد نے عالمی ریڈکراس کی رائے شماری میں اپنی وطنیت پاکستانی ظاہر کی ہے۔ کیا بنگلا دیش کے پاکستانیوں سے ان کی قومیت ہم بہ جبر چھین لینا چاہتے ہیں؟ آخر کیوں؟ کس جرم کی پاداش میں؟

سارے نئے پاکستان کی آبادی ان مظلوموں کے بارے میں خاموش ہے' کیا آپ بھی خاموش رہیں گے' آپ نہیں جانتے تاریخ کی گود میں آپ کے لیے کیا حادثہ پرورش پا رہا ہے' کیا آپ کو اپنے ضمیر کے سامنے جواب دہ نہیں ہونا۔ کیا ہم یقین کر لیں کہ ''غیرت'' نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے؟

ہم نے یہ مراسلہ پڑھا اور آنسو پی لیے۔ اس مراسلے کو پڑھ کر اس بات کا اندازہ

لگانے میں کافی سہولت ہوئی کہ ہم بے حیائی اور بے غیرتی کے کس مرتبے پر فائز ہیں۔ عزیزو! بات یہ ہے کہ لکھنا ایک کاروبار ہے اور کاروبار کے کچھ راز بھی ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ لکھنے کی باتیں ہرگز نہ لکھی جائیں، لکھی جائیں تو آگا پیچھا دیکھ کر لکھی جائیں۔ ہم سب جو ہنر دکھا رہے ہیں، وہ یہی ہے۔ ہمارا ہنر حق پروری کا ہنر نہیں ہے، حق پوشی کا ہنر ہے، ہم قلم فروش ہیں اور اس قلم فروشی پر ہمیں کوئی ندامت بھی نہیں ہے۔ ہم سے آخر یہ اُمید کیوں رکھی جاتی ہے کہ ہم مظلوم انسانیت کے دُکھوں کو اپنا دُکھ سمجھیں گے۔ انسانیت کراہتی رہے، سسکتی رہے، ہمیں کیا۔ جناب منظور احمد ترقی پسندوں کی جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں وہ انسانیت کے ہر دُکھ درد کو اپنا دُکھ درد سمجھتی تھی، اس نسل کی نوجوانی اور جوانی کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ یہ لوگ انسانی معاملوں میں سیاست دانوں کی طرح جچے تُلے بیانات دینے کے عادی نہیں تھے۔ مگر یہ نسل سن رسیدہ ہوتے ہی ہوشیار ہو گئی اور اس نے یہ نکتہ سمجھ لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو سب ہی کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ہماری نسل اسی ہوشیاری اور نکتہ فہمی کے سائے میں پروان چڑھی ہے اور ہم پوری فرماں برداری کے ساتھ اپنے بزرگوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ بنگلا دیش کے بہاری موت سے زیادہ تلخ زندگی گزار رہے ہیں اور کسی کو ان کی پروا نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس گروہ سے زیادہ بد بخت اور کون ہوگا جس کی تباہی پر لوگ افسوس کرتے ہوئے بھی جھینپتے ہیں۔ جی ہاں وہ پاکستانی ہیں اور پاکستان کے دروازے ان کے لیے ہر وقت کُھلے رہنے چاہییں اور ہم اس سے بھی بے خبر نہیں کہ بنگلا دیش میں نئے انتخابات ہو چکے ہیں اور وہاں کی اکثریت نے یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ ہمارا پاکستان سے کوئی تعلق نہیں۔ مجیب الرحمٰن پھر اکثریت کے منتخب نمایندے بن کر سامنے آئے ہیں۔ ایسی صورت میں وہاں جو لوگ پاکستانی ہونے کی سزائیں سہہ رہے ہیں ان کے بارے میں پاکستان کا رویّہ کیا ہونا چاہیے، یہ بھی ہم سمجھتے ہیں ہم سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہیں مگر جب ہم یہ کہیں گے کہ ہمارے دل پتھر ہیں تو پھر آپ سے کیا اُمید رکھیں گے؟

عالمی ڈائجسٹ، اپریل 1973

کم سے کم

آئین بن گیا۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ لوگ پہلے کے مقابلے میں اب کسی قدر مطمئن دکھائی دیتے ہیں۔

یہ بڑی بدنصیبی تھی کہ ہم پچیس سال تک آئین سے محروم رہے۔ یہاں ایک عجیب صورتِ حال رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ جو باتیں ہونی ہی چاہیے تھیں وہ بھی نہیں ہوئیں۔ آئین کوئی ایسی اَن مول چیز نہیں تھا جس سے ہم اتنے دن تک تہی دست رہتے اور اب اس کے بن جانے کو اتنی بڑی بات سمجھتے۔ مگر کیا ہو کہ ہمیں آئین سے اس بُری طرح ترسایا گیا کہ اب وہ ہمیں ایک ان مول چیز لگتا ہے۔

خیر جو کام پچیس سال پہلے ہو جانا چاہیے تھا وہ اب سہی۔ آئین ہی کیا ایسی بہت سی باتیں ہیں جو اَب سے پچیس سال پہلے ہو جانی چاہیے تھیں اور ابھی تک نہیں ہوئیں۔ ایسی صورت میں آئین کا بن جانا بہت غنیمت ہے۔ لوگوں نے مایوس کن حالات میں آئین کو ایک اچھی علامت سمجھنا چاہا ہے اور یہ بات پوری طرح سمجھ میں آتی ہے۔ یہ بھی کچھ کم نہیں کہ آئین بنا تو سہی۔ لوگوں کو یہ اُمید ہوئی ہے کہ شاید اب حالات کچھ بہتر ہوں۔ بے اعتباری کے عالم میں کچھ اعتبار پیدا ہو، بے یقینی میں یقین کی کوئی صورت دکھائی دے۔ یہ اُمید بھی بہت بڑا سہارا ہے۔ اس کیفیت کو برقرار رکھنا اور لوگوں کے دل میں جو اُمید اُبھری ہے اس کی آب یاری کرنا اور یہ جو ایک اعتماد سا پیدا ہوا ہے اسے باقی رکھنا حکومت کا کام ہے۔

لوگ بہتر صورتِ حال کو بڑے جذبے اور جوش سے قبول کرتے ہیں۔ ان کے اس جذبے اور جوش کی قدر کی جائے اور اب وہ حالات پیدا نہ ہونے دیے جائیں جن سے

بے یقینی و بے اعتباری، بے دلی اور بیزاری پیدا ہوتی ہے۔ ہم سوچتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اب ساری ذمّے داری حکمراں طبقے کی ہے۔ اس طبقے کو اپنے ذہن میں جمہوری آداب کا شعور پیدا کرنا ہوگا۔ ہمارے یہاں جمہوریت کی روایت ناپید رہی ہے اور اس کے ذمّے دار یہاں کے عوام ہرگز نہیں ہیں بل کہ وہ لوگ ہیں جو پندرہ سولہ برس تک اقتدار میں رہے۔ عوام نے ہر مرحلے پر جمہوریت کی حمایت کی اور یہ عوام ہی تھے جنھوں نے وہ حالات پیدا کیے کہ آئین بن سکا۔ خوشی کی بات ہے کہ حکومت نے عوام کی قوّت کو بڑی حد تک مان لیا ہے۔ اب یہی ہے کہ آیندہ جمہوریت کے باب میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ ایک حقیقت کو ہمیشہ کے لیے مان لینا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ کوئی فرد یا کوئی طبقہ معصوم نہیں ہوتا۔ لوگ غلطیاں کرتے ہیں اور دل کھول کر غلطیاں کرتے ہیں اور خاص طور پر با اقتدار ہونے کی صورت میں تو غلطیاں کرنے کی پوری چھوٹ مل جاتی ہے۔ ایسی صورت میں حزبِ اختلاف کی باری آتی ہے اور وہ اپنا فرض انجام دیتا ہے۔ حزبِ اختلاف کو ایک طرح سے حزبِ اقتدار کا محسن سمجھنا چاہیے۔

آئین سازی کے دوران ہم نے حزبِ اختلاف کی قدر و قیمت کو پوری طرح سمجھ لیا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ حزبِ اختلاف، حزبِ اقتدار کے لیے روشنی کا ایک مینارہ ثابت ہوا ہے جس پر حزبِ اقتدار کو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی حزبِ اقتدار نے حزبِ اختلاف کی تاریخی حیثیت کو مان کر اپنے لیے ایک قابلِ لحاظ مقام پیدا کر لیا ہے۔ اس آئین کو صحیح معنی میں ایک اعلیٰ جمہوری آئین بننے کے لیے ابھی اصلاح اور ترمیم کے کئی مرحلے طے کرنے ہیں۔ ویسے موجودہ صورت میں بھی ہم اس آئین کو ایک بہتر آئین کا ابتدائی خاکہ سمجھ سکتے ہیں۔

بس اب جتنی جلد ممکن ہو آئین کو نافذ ہو جانا چاہیے ورنہ دیر کرنے سے کسی بھی ایسی صورت کے پیدا ہونے کا امکان ہے جو حالات کو خراب کر دے۔ پچھلے تجربوں نے لوگوں کو شکّی بنا دیا ہے اور ان میں سخت بے اعتباری پیدا کر دی ہے۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ آئین کو کسی تاخیر کے بغیر نافذ کر دیا جائے تا کہ بے اعتباری کی دُھند چھٹ جائے۔

آ ئین بننے یا آ ئین نافذ ہونے کی منزل اصل مسئلوں کے پیشِ نظر ایک ابتدائی منزل ہے۔ظاہر ہے کہ اصل منزل تو کچھ اور ہے جو ابھی بہت دُور ہے پھر بھی ہم کم سے کم اس منزل سے تو گزر جائیں۔سو اس میں تو اب کوئی دیر نہیں ہونی چاہیے۔

اس مرحلے میں ہم عوام، حزبِ اختلاف اور حکومت تینوں کو مبارک باد دیتے ہیں کہ اس ملک میں آ ئین کی آئینہ بندی تو ہوئی۔یہ کم سے کم بات ہے۔پر یہ بھی ہماری بے مائگی کے پیشِ نظر بہت غنیمت ہے۔

عالمی ڈائجسٹ، مئی 1973

رمز

شیخ سعدیؔ اور خواجہ حافظؔ کے وطن ایران سے ہمارا کیا تعلق ہے۔ اس بات کو پاکستان کا ایک عام آدمی بھی جانتا ہے۔ پاکستان کے لوگ ایران اور ایرانیوں سے جتنی محبت کرتے ہیں ایرانیوں کو شاید اس کا اندازہ بھی نہ ہو۔ یہ محبت سیاسی مفادات اور سفارتی بیانات سے بلند ہے۔ یہ تو صدیوں کا اثاثہ ہے، نسلوں کا معاملہ ہے۔ گزشتہ دنوں جب صدرِ پاکستان ایران گئے تھے تو اس تعلق کو از سرِ نو استوار کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران سے پاکستان کی دوستی کسی بھی ثبوت اور دلیل سے بالاتر ہے۔

اس دوستی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم اپنے کسی اور ہمسائے اور خاص طور پر ہندوستان سے دشمنی رکھنا چاہتے ہیں۔ نہ ایسا ہے اور نہ ایسا ہونا چاہئے۔ ہمیں میرؔ و غالبؔ کے وطن سے جو نسبت ہے اس کا اندازہ لگانا ہم میں سے کسی کے لیے مشکل نہیں۔ اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بدترین دشمن ثابت ہوئے ہیں اور یہ ایک دردناک حقیقت ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر برِ صغیر کو شرم آنی چاہیے۔ ان دونوں ملکوں کے درمیان نفرت اور عداوت کی جو کیفیت پائی جاتی ہے وہ ہمارے خیال میں غیر فطری ہے اور غیر فطری روش اور ورزش قوموں کو کبھی راس نہیں آتی۔ ہم نے دیکھا کہ ہندوستان اور پاکستان کو اس نفرت نے تباہ حالی کے سوا اور کچھ بھی نہیں دیا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پاکستان کا سب سے زیادہ گہرا دوست ہندوستان ہوتا اور ہندوستان کا سب سے زیادہ گہرا دوست پاکستان۔ مگر ہے یوں کہ ہم ایک دوسرے کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ اور دشمنی کا یہ بحران ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ نہ سیاست داں اس

بحران کو ختم کر سکے اور نہ حکمراں۔ پھر آخر وہ کون لوگ ہوں گے جو پاکستان اور ہندوستان کو نفرت کے اس عذاب سے نجات دلائیں گے؟

ہم سمجھتے ہیں کہ پیشہ ورانہ سیاست تو اس مسئلے کو حل کر نہیں سکتی اگر اس مسئلے کو حل کرنا ہے تو پھر انسانی شعور اور تہذیبی دانش کا سہارا لینا پڑے گا۔ سوچنا پڑے گا کہ اس دشمنی نے تاریخ اور تہذیب کے کتنے اعتبارات کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ان دونوں ملکوں کا معاملہ اپنی جگہ ایک عجیب معاملہ ہے۔ یہ دونوں ملک ایک دوسرے سے اس قدر مربوط ہیں کہ ان کے درمیان کسی گہری کیفیت کے سوا اور کوئی کیفیت پائی بھی نہیں جا سکتی۔ یہ دونوں یا تو ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو سکتے ہیں یا جگری دوست۔ درمیان کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ یہ ایک ایسی صورت ہے جس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ اس میں تاریخ کا ایک گہرا رمز پوشیدہ ہے اسے سمجھنا چاہیے۔ اگر ہندوستان اور پاکستان نے اس رمز کو سمجھ لیا تو پھر وہ دوستی ہی کے حق میں فیصلہ کریں گے مگر مشکل یہ ہے کہ سیاست کے بے روح ذہن اور خشک دماغ کے لیے اس رمز کو سمجھ لینا شاید ممکن نہ ہو۔

دوستی اور آشتی کے لیے باتوں سے زیادہ عمل کی ضرورت ہے، شملہ معاہدہ اس عمل ہی کا ایک ظہور تھا۔ اس سے بڑی اُمیدیں وابستہ کی گئی تھیں جو پوری نہ ہو سکیں۔ افسوس یہ ہے کہ اس معاہدے کو سازگار ماحول نہ مل سکا۔ اگر ہندوستان نے جنگی قیدیوں کو واپس کر دیا ہوتا تو سازگار ماحول پیدا ہو جاتا۔ ہندوستان کا کہنا یہ تھا کہ جنگی قیدیوں کی واپسی بنگلا دیش کی رضامندی کے بغیر ممکن نہیں مگر قاعدے کی بات یہ ہے کہ انھیں جنگ کے بعد فوراً چھوڑ دیا جاتا۔ اب پاکستان کی طرف آیئے۔ ہندوستان اور بنگلا دیش نے جنگی قیدیوں کی واپسی کے لیے پاکستان کو ایک پیش کش کی اگر چہ یہ پیش کش مشروط تھی مگر مشروط ہونے کے باوجود صورتِ حال کے پیشِ نظر پاکستان کے سنجیدہ طبقے نے اسے فراخ دلانہ پیش کش قرار دیا۔ وہ پیش کش قبول کر لینی چاہیے تھی مگر پاکستان نے یہ جواب دیا کہ جنگی قیدیوں کی واپسی کے لیے کوئی شرط لگانا اُصول کے خلاف ہے۔

جو کچھ بھی ہمارے سامنے ہے۔ سکّہ بند سیاست کی رُو سے شاید یہ سب کچھ ٹھیک ہو مگر

ہمارا خیال یہ ہے کہ برِصغیر کے مسئلوں کو خالص سیاسی انداز سے حل کرنا ممکن نہ ہوگا۔ سیاست کا کام سُلجھانا نہیں ہے اُلجھانا ہے۔ ان مسئلوں کو حل کرنے کے لیے تاریخ کی زندہ حقیقتوں کو سامنے رکھنا چاہیے۔ یہ وہ زندہ حقیقتیں ہیں جو پاکستان اور ہندوستان کے چپے چپے پر تحریر ہیں۔

ہم ایران اور پاکستان کی باہمی دوستی کے بارے میں لکھ آئے ہیں۔ پاکستان میں صدیوں کی اس زندہ حقیقت کا سب کو احساس ہے اور اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ شیراز اور لاہور کے درمیان کیا تعلق ہے۔ یہ سب ہی جانتے ہیں مگر لاہور اور دلّی کا کیا رشتہ ہے یہ بھی کسی کو نہیں بھولنا چاہیے۔

عالمی ڈائجسٹ، جون 1973

خون کی گواہی

جو اپنے ہونے کی گواہی دیتا ہے، دیکھا گیا ہے کہ وہ دوسروں کے نہ ہونے پر بھی حجت لاتا ہے اور جو اپنے آپ کو سچا کہتا ہے، وہ دوسروں کو جھٹلاتا بھی ہے اور جس نے یہ کہا کہ میں حق پر ہوں، اس نے گویا یہ بھی کہا کہ دوسرے باطل پر ہیں۔ پر جس نے اپنے ہونے کی گواہی دینے کے ساتھ دوسروں کے ہونے کی بھی گواہی دی، اسی نے حکمت کا پوری طرح پاس کیا اور جس نے اپنے آپ کو سچا کہا اور وہ سچا تھا بھی اور اس نے دوسروں کے سچ کو بھی سچ جانا، اسی نے پوری سچائی کے ساتھ سچ کا ساتھ دیا اور جس نے اپنے حق پر ہونے کا اظہار کیا اور وہ حق پر تھا بھی اور اس نے دوسروں کے حق کو بھی مانا، حقیقت میں اسی نے حق کو پہچاننے کی طرح پہچانا۔

سو اب میں کہتا ہوں کہ ہونے کی سب سے پکّی گواہی وہ ہے جو خون نے دی ہے۔ ہاں خون کی گواہی سب سے پکّی اور سچّی گواہی ہے اور ہم اس مہینے اپنے اس خون کی پہلی برسی منا رہے ہیں، جس نے عجب قرینے سے اپنے ہونے کی گواہی دی تھی۔ اور یہ گواہی سچ کے ساتھ تھی، سوچ کے ساتھ تھی اور سمجھ کے ساتھ تھی۔ کہا گیا تھا کہ بھائیو! تم ہو اور پہلے تمھارا حق ہے اور ہم بھی ہیں اور ہمارا بھی ایک حق ہے۔ کیا اپنے خون میں نہانے والے کبھی ایسی سُوجھ بُوجھ کی باتیں کہتے ہوئے بھی سُنے گئے ہیں، کم اور بہت ہی کم۔

اپنے مسلک اور اپنے عقیدے کی خاطر بے شمار لوگوں نے اپنا خون بہایا ہے اور ان کا کہنا یہ تھا کہ حق بس ہمارے ساتھ ہے اور ہمارے سوا جو بھی حق کا دعویٰ کرتا ہے، وہ جھوٹا ہے۔ یہ تھے ان کے طور اور یہ تھے ان کے تیور اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے جان دے دی اور اپنے نزدیک سب سے اچھا معاملہ کیا۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس کا انھیں اجر ملنا تھا یا یوں کہہ لو کہ یہ ایک ایسی معاملت تھی جس کی بہت بڑی اُجرت ملنا تھی۔ یا ان کے نام روشن حرفوں میں لکھے جانے تھے۔ یا پھر انھیں جاں کنی کے وقت اس یقین کی خوشی نصیب تھی کہ

جس طرف وہ تھے، حق بس اسی طرف تھا اور اس کے ورے سب کچھ باطل تھا۔

پر میں جس خون کا فریق ہوں، اس کا دعویٰ یہ نہیں تھا کہ حق بس وہیں تک ہے جہاں تک میرے چھینٹے اُڑ کر گئے ہیں۔ ذرا سوچو تو سہی، بھلا ایسی ہوش مندی اور حق پسندی کے ساتھ یہاں کب کب جان دی گئی ہے۔ کیا یہ حیرانی کی بات نہیں ہے کہ اپنی اپنی بستیوں اور اپنے اپنے محلّوں کے غریبوں اور بے نام و نمود لوگوں نے جو لوگوں کے درمیان عام لوگ تھے، دانش مندوں اور حکیموں کی طرح جان دی اور اپنے پیچھے اپنے نام تک نہیں چھوڑے۔

وہ لوگ ہم میں سے وہ پہلے لوگ تھے جنھوں نے عقیدے کی پیچ میں نہیں بل کہ معقولیت کی خاطر جان دی ورنہ عقیدے کے نام پر جان دینے والوں کی دنیا میں کوئی کمی نہیں ہے۔ یہودی ہوں یا عیسائی، ہندو ہوں یا مسلمان اور پھر ان سب کے جُد اجُد افرقے، سب ہی اپنے عقیدے کی خاطر جان دینے میں ایک دوسرے سے آگے دکھائی دیں گے۔ سو جانا گیا کہ مذہب کی خاطر جان دے دینا کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے اور نہ اس میں کسی خاص مذہب یا فرقے کو کوئی خصوصیت حاصل ہے۔ ہاں ایسے لوگ کم ہی ہوئے ہیں جو معقولیت کی خاطر اپنے خون میں نہا گئے ہیں اور ہمارے گزشتہ سال کے وہ لوگ ایسے ہی لوگ تھے اور ہمارے درمیان وہ لوگ سچ مچ انوکھے تھے، اس لیے کہ ہمارے لوگوں کی تربیت یہ نہیں رہی کہ وہ عقیدے کے سوا کسی اور چیز کے لیے اُنگلی بھی کٹائیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ تمھارا حق سر آنکھوں پر۔ ہم اسے جانتے اور مانتے ہیں، پر ہمارا بھی کوئی حق ہے۔

جن لوگوں نے اس عدالت، اس حکمت اور اس آگہی کے ساتھ جان دی ہو، ان کے لیے میں آخر کیا کہوں۔ انھیں یاد کر کے میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ ان کے خون نے ہمیں ہماری پہچان دی ہے۔ ایسی پہچان کہ اب ہم میں سے کوئی بھی وقت کے ہجوم میں گُم نہیں ہوگا۔

میرے لوگو! بھلا تمھارے نام کیا تھے، تمھارے کچھ بھی نام ہوں، تمھاری گم نامی کے حضور ہمارے سر عقیدت سے جُھکے ہوئے ہیں اور ہماری آنکھیں بھیگی ہوئی ہیں کہ تمھارے خون نے ہم سب کے ہونے پر گواہی دی تھی۔

عالمی ڈائجسٹ، جولائی 1973

جائزہ

لو اب چھبیس سال ہو گئے جب ہندوستان آزاد ہوا تھا اور پاکستان وجود میں آیا تھا۔ اس مدت میں کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ یہ سرگزشت غم انگیز بھی ہے اور شرم ناک بھی۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ چھبیس سال کا یہ سفر پورا کرنے کے بعد صورتِ حال کا جائزہ لے لیا جائے۔ پاکستان جیسا کچھ بھی رہ گیا ہے بہ ہر حال ابھی تک ایک حقیقت ہے۔ پر ہوا یہ ہے کہ اب لوگ ایک دوسرے سے یہ پوچھتے ہیں کہ یہ ملک رہے گا بھی یا نہیں۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو عام ہوتی جا رہی ہے ہم نے جو روش اختیار کی تھی کیا اس کا یہی نتیجہ نہیں نکلنا تھا؟ یہاں ہر گروہ دوسرے گروہ سے بیزار ہے۔ ہر علاقہ دوسرے علاقے سے نفرت کرتا ہے بیزاری اور نفرت یہی لے دے کر تمھاری کمائی ہے۔ بیزاری اور نفرت کا اتنا ذخیرہ تو کبھی اور کہیں اکٹھا نہیں ہوا۔

کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں ہے کہ جس جماعت نے پاکستان بنایا ہے اس کی بنیاد ہی نفرت اور بیزاری پر تھی۔ بعض لوگ کہتے بھی رہے ہیں، لکھتے بھی رہے ہیں کہ پاکستان کی بقا کے لیے ہندوستان دشمنی ضروری ہے اور یہ کہ پاکستانی قومیت کی اصل بنیاد ہندوستان دشمنی ہے اور جو لوگ ہندوستان دوستی کی بات کرتے ہیں وہ ملک اور قوم کے دشمن ہیں۔ پوچھنا یہ ہے کہ جس قوم کی بنیاد نفرت اور دشمنی پر رکھی جائے اس کے اعصاب بھلا کب تک اس کا ساتھ دے سکتے ہیں بہ ہر حال ہوا یہ ہے کہ ہم اپنے آپ سے بھی نفرت کرنے لگے ہیں۔

اپنی سرگزشت پر غور کرتے وقت ہمیں ایک اور بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے برسوں تحریک چلی تھی اس کے پیچھے ہندوؤں

اور مسلمانوں کی بے مثال قربانیاں ہیں' قید خانے ہیں۔ آزادی پسندوں کے بپھرے ہوئے ہجوم اور لہولہان جلوس ہیں، جان پر کھیل جانے کے مرحلے ہیں۔ پاکستان کے پس منظر میں سیّد احمد خان کی قانون پسند اور سرکار پرست نسل ہے، خود سیّد احمد خان ہیں جن کی صحت اور فراغت پر رشک آتا ہے۔ لکھا ہے کہ وہ بہت کم بیمار پڑتے تھے۔ ہاں تو سیّد احمد خاں کی نسل کو آزادی، آزاد نگہی اور آزاد اندیشی کی کوئی تربیت نہیں دی گئی تھی۔ وہ اعلیٰ مقاصد سے محروم تھی۔ اُسے قربانی کا کوئی سبق نہیں دیا گیا تھا۔ اس نسل کا دوسرا نام مسلم لیگ ہے۔

مسلم لیگ کو داد تو بہت دی گئی ہے پر اس سے حساب بھی نہیں لیا گیا۔ لوگ آزادی کے لیے جانیں دے رہے تھے اور لیگ اس انتظار میں تھی کہ ہندوستان آزاد ہو اور وہ اپنا حصہ بانٹ لے۔ پاکستان کو جو مملکتِ خداداد کہا جاتا ہے تو کچھ غلط نہیں کہا جاتا۔ یہ ملک سچ مچ خدا ہی کی دین ہے اس میں بندوں کے عمل کا کوئی دخل نہیں کیوں کہ جن مسلمانوں نے آزادی کے لیے اپنا خون بہایا، جن کے خاندان تباہ ہو گئے وہ لیگ کے مسلمان نہیں تھے۔ لیگ تو جاگیرداروں' خان بہادروں' سرکاری افسروں اور تاجروں کی جماعت تھی۔ اس کا ایک خاص مزاج تھا۔ یہی مزاج پاکستان کو ورثے میں ملا۔ اب یہی دیکھ لو کہ پاکستان میں جو لوگ برسرِ اقتدار رہے ان میں دو تین بے غرض لوگوں کو چھوڑ کر باقی کون تھے وہی انگریزوں کے جوتے چاٹنے والے قوم کے غدّار۔ سرکار کے منشی یا بندوقچی فقط ایک محمد علی جناح' ایک لیاقت علی خاں اور ایک خواجہ ناظم الدین سے صورتِ حال میں کیا فرق پڑتا ہے اور جب یہ لوگ نہ رہے تو پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ مسلم لیگ جس طبقے کو پروان چڑھانا چاہتی تھی وہی طبقہ پھلا پھولا اور ملک تباہ ہوتا رہا۔

پاکستان بن جانے کے بعد ضرورت اس بات کی تھی کہ معاملوں پر نظرِ ثانی کی جاتی۔ حقیقت کو سمجھا جاتا اور پاکستان کے وجود کو اس زندہ اور حسّاس معنویت سے ہم آہنگ کیا جاتا جس کے بغیر یہ پوری تحریک خوش حال لوگوں کے چونچلوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے بجائے اس ملک کو عوام کا ملک بنایا جاتا۔ یہ نکتہ چینی کسی کو ناگوار نہیں گزرنی چاہیے۔ تنگ مزاجی سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہمیں

حقیقتوں کا بے رحمی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے کہ اس میں ہمارے لیے رحمت ہے۔ ہمیں یہ جاننے کی پوری بے باکی کے ساتھ کوشش کرنی چاہیے کہ مسلم لیگ کی تحریک میں وہ بنیادی خامیاں اور خرابیاں کیا تھیں جن کی وجہ سے یہ ملک اس حال کو پہنچا۔ ایک کام یہ بھی ہونا چاہیے کہ مسلم لیگ کی تحریک اور اس کی شخصیتوں کا تہذیبی مطالعہ کیا جائے اور اس سوال کا جواب دیا جائے کہ لیگ جس تہذیب کی حفاظت کرنے کی مدعی تھی اس تہذیب کے اصل نمائندے کانگریس کے ساتھ کیوں تھے اور یہ کیا بات تھی کہ اقبال، حسرت اور ظفر علی خاں کے سوا مسلمان فکر اور وجدان کا کوئی بڑا نمائندہ مسلم لیگ کے ساتھ نہیں تھا۔ اگر ہم اپنی شاعری، اپنی انشا، اپنے افسانے اور اپنے فن کی داد لینا چاہیں تو ہمیں اپنے کون بزرگ یاد آئیں گے، وہ جو لیگ میں تھے یا وہ جو کانگریس میں تھے؟ یہ بھی ایک سوچنے کی بات ہے۔

عالمی ڈائجسٹ، اگست 1973

آئین

یہاں نہ تو بولنے ہی میں کچھ بھلائی ہے اور نہ سُننے میں۔ بولو تو سُنتا کون ہے اور سُنو تو سُننے کے لیے ہے بھی کیا؟ سو بولنے والا بھلا کیا پہنچانا چاہے گا اور سُننے والا کیا پانا چاہے گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہر اچھی اور بُری بات سے کان بند ہی رکھے جائیں اس لیے کہ جو بات اچھی ہے وہ جھوٹ ہوگی اور جو بُری ہے وہ نئی نہ ہوگی۔ ذرا دیکھو تو سہی' زندگی کا حال کتنا عجیب ہو گیا ہے۔ کیا یہی وہ زندگی ہے جس کے لیے اتنا اودھم مچایا گیا ہے اور جس کے کارن اتنا جھنجھٹ پھیلایا گیا ہے۔

ایک زندگی تو وہ ہے جو خوشی کے ساتھ گزرتی ہے۔ یہ بہت ہی کم لوگوں کی زندگی ہے اور ایک وہ ہے جو خوشی کی اُمید میں بسر ہوتی ہے۔ اس کے لوگ بھی زیادہ نہیں ہیں اور ایک وہ ہے جو اُمید کی کم سے کم پونجی کے لیے بھی ترستی ہے اور ہمارا سامنا اسی زندگی سے ہے۔ کیسی نہوت ہے کہ انسان اپنی پرچھائیوں کو ٹٹولتا ہے اور اپنے ناخنوں سے اپنا سینہ کُھرچتا ہے۔ پھر تماشا یہ ہے کہ اس حالت کو بڑے چاؤ کے ساتھ اپنایا گیا ہے اور اس نحوست کو بڑے چونچلوں کے ساتھ اپنی بستیوں میں بسایا گیا ہے۔ عجب حال ہے۔ ایسے حال میں جو اُمید دلائے گا وہ دلوں کو اور آزار پہنچائے گا۔ یہاں بڑی بے حسی کے ساتھ لوگوں کو اُمید دلائی جاتی ہے اور اس طرح ان پر نا اُمیدی کا ایک اور بوجھ ڈال دیا جاتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی خوش خبری دینے والا کوئی خوش خبری دینا چاہتا ہے تو بھلا کس لیے؟ اب تک کیا ہوا ہے جو اَب کچھ ہوگا اور پھر خوش خبری کس کے لیے۔

وہ کیا پائیں گے جن کا پانا ہی کھونا ہے اور وہ کیا ہیں جن کا ہونا ہی نہ ہونا ہے۔ زمین کے بیچ اور اس کے کناروں میں تمھارے لیے کیا ہے۔ زمین کے بیچ رُسوا ہونا ہے اور اس کے کناروں میں پسپا ہونا۔ کیا اچھا ہے اور کیا بُرا۔ یہ بات نہ کہنے والا جانتا ہے اور نہ سُننے

والا۔ ہاں جس بات میں بہت زیادہ بُرائی نہیں ہے اسے یہاں کے لیے شاید اچھا جانا جائے۔ پر ہے کچھ ایسا کہ جو کچھ بھی ہے وہ بہت ہی بُرا ہے۔

میں ہانکے پکارے کہتا ہوں کہ بُری طرح ہانکا جارہا ہے۔ یہ کیسی ہانکا ہانکی ہے۔ ہاں یہ ہانکنے والے ہلاکت میں ڈالنے والے ہیں۔ کہاں سے لائے جاتے ہو اور کہاں لے جائے جاتے ہو؟ جہاں سے لائے گئے ہو بُری طرح لائے گئے ہو اور جہاں لے جائے جاتے ہو بُری طرح لے جائے جاتے ہو۔ کیوں نہ کہا جائے کہ ہر اس بات کو جھٹلا دو جو تم سے کہی جاتی ہے اور ہر اس فیصلے کو پلٹا دو جو تم پر تھوپا جاتا ہے۔ جن کی سُنی جاتی ہے وہ جھوٹے ہیں اور جن کی مانی جاتی ہے وہ جھانسیے اور جھپ جھالیے۔ کیا اتنے لفظ کبھی بولے گئے تھے جتنے اب ایک سانس میں بول دیے جاتے ہیں اور کیا اتنے دعوے کبھی باندھے گئے تھے جتنے اب ایک ایک بات میں باندھے جاتے ہیں؟ سیاست نے ایک زبان گھڑلی ہے اور اب یہی زبان چاروں کھونٹ سُنائی دیتی ہے۔ یہ کھوٹ اور کپٹ اور جھوٹ کی زبان ہے اور اس زمانے کی سب سے بڑی گھڑنت یہی ہے۔ اس زبان کو جھوٹ سمجھ کر ہی سُنا بھی جاتا ہے۔ پر مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے حوالے بھی دیے جاتے ہیں۔ بڑی بیزاری ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ جب سے انسان نے روانی کے ساتھ بولنا سیکھا ہے تب سے لے کر اب تک جھوٹ ہی بولا گیا ہے اور اگر کبھی کبھار سچ بولا بھی گیا ہے تو ادھورا۔

اب یاد آیا کہ اس بار مجھے آئین کے بارے میں لکھنا تھا جو دو چار دن بعد آنے والا ہے اور اُمید بندھانے والا ہے۔ ایک اُمید اور سہی۔ پر اتنا کچھ دیکھ لینے کے بعد میں ابھی کوئی اُمید نہیں دلاؤں گا۔ نہ ہو کہ پھر ہونٹ کاٹنے پڑیں اور آنے جانے والوں میں اپنے غصے بانٹنے پڑیں۔ ہاں اُمید رکھنے والوں میں ایک میں بھی ہوں ویسے یہاں اُمید رکھنا کچھ ایسا ہے جیسے کسی اناڑی کا جوا کھیلنا۔ پر زندگی میں اُمید کا جوا تو کھیلنا ہی پڑتا ہے۔ جو سانس لے رہا ہے وہ کوئی اُمید رکھتا ہے۔ ہاں یہ ہے کہ جہاں اُمیدوں کا خون ہوتا رہا ہو وہاں اُمید رکھنا بڑی کٹھنائی ہے۔ میں آئین کے بارے میں کچھ نہ لکھ پایا' دیر سے خیال آیا سو اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس لکھت کا نام آئین ٹھہرایا۔

عالمی ڈائجسٹ' ستمبر 1973

سمجھوتا

آخر پاکستان اور ہندوستان میں سمجھوتا ہو گیا۔ ہمارے کانوں نے ایسی نیکیاں نہیں کیں جو اتنی اچھی خبر سُنتے۔ یہ بڑی بات ہے کہ ہم اتنی اچھی خبر سُن سکے۔ دونوں ملکوں نے اپنے اُوپر احسان کیا کہ سمجھوتا کر لیا۔ اس سمجھوتے سے کسی نے کچھ کھویا نہیں ہے پایا ہے۔ اب جو کیا جانا چاہیے وہ یہ ہے کہ جو کچھ ٹوٹ گیا ہے اسے جوڑا جائے اور جو چیزیں توڑنے والی ہیں انھیں چھوڑا جائے۔ سوچو تو سہی' کیا یہ بھی کوئی ہونے میں ہونا ہے کہ ہوں اور نہ ہونے کے لیے زمین اور آسمان ایک کر دیں۔ وحشیوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکراتے رہنے میں آخر کون سی بھلائی ہے۔ اتنی بار ٹکرا کر دیکھ لیا' بھلا کیا پایا۔ ایک دوسرے کے ہاتھ توڑنے کی کوشش میں کیا ہاتھ آیا؟ میں پاکستان اور ہندوستان کے بارے میں سوچتا ہوں اور اپنے سر کے بال نوچتا ہوں۔ میں ان کے ناموں میں ایک دوسرے کے لیے بدنامی کے سوا کچھ بھی نہیں پاتا۔ وہ لوگ کہاں ہیں جو انھیں سمجھانے کی طرح سمجھاتے اور جو منوانے کی بات ہے اسے منوانے کی طرح منواتے۔ ابھی وقت ہے تم اپنا رشتہ جانو اور اپنے آپ کو پہچانو۔ ابھی وہ نسل زندہ ہے جو ایک دوسرے کو جھڑک سکتی ہے اور پہچان کے چھاج میں ایک دوسرے کو پھٹک سکتی ہے۔ یہ نسل ختم ہو گئی تو پھر دلّی کو لاہور کا حال پیکنگ سے معلوم ہوا کرے گا اور لاہور کو دلّی کی باتیں ماسکو کے لوگ بتایا کریں گے۔

ان آوازوں کا گلا گھونٹ دو جو دشمنی بھڑکاتی ہوں اور ان باتوں کا منہ بند کر دو جو ایک کو دوسرے سے لڑاتی ہوں۔ وہ لوگ جنونی اور خونی ہیں جو تمھیں ان کے خلاف اور انھیں

تمھارے خلاف غصہ دلاتے ہیں اور رشتوں کی مٹھاس کو کڑواہٹ پلاتے ہیں۔ دُکھ کی بات ہے کہ اب تک انھیں کی بات سُنی گئی جن کی بات نہ سُننے میں بھلائی تھی اور انھیں کے فیصلے مانے گئے جن کے فیصلوں کو ٹھکرانے میں سچ تک رسائی تھی۔ میں دنیا کے سارے ملکوں کو آبادی اور شادابی کی دعائیں دیتا ہوں پر مجھ سے یہ کیسے چاہا جا سکتا ہے کہ میں دنیا کے کسی ملک کو ہندوستان سے زیادہ محبوب جانوں اور تم، ہندوستان والو تم کسی اور ملک کو پاکستان سے زیادہ عزیز مانو۔ پر ہوا کیا؟ ہوا یہ کہ ہم نے تمھارے شہروں کی ویرانی چاہی اور تم نے ہمارے شہروں کی۔ ہم دونوں نے ان باتوں میں جی لگایا جو تفرقہ ڈالنے والی تھیں اور ان ارادوں کا حوصلہ بڑھایا جو دوسرے کی تباہی کے ارمان نکالنے والے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم نے اپنے موسموں کا مزاج اور اپنی ہواؤں کا مسلک اور اپنے پانیوں کا مشرب بدلے بغیر ایک دوسرے کے لیے تباہیاں کس طرح سوچیں اور ایک دوسرے کی بربادی کس طرح چاہی۔ ہمارے موسموں، ہماری ہواؤں اور ہمارے پانیوں نے ہم سے کیا اُمید رکھی تھی۔ کیا یہ کہ ہم ایک دوسرے کے حق میں زہر گھولیں؟

میں اس سیاست سے انکار کرتا ہوں جو مجھے میرے ماں باپ کی قبروں سے نفرت کرنا سکھاتی ہے اور تم میں سے بہت سوں کو ان کے باپ دادا کے شمشانوں کے نشان مٹانے پر اُکساتی ہے۔ اُن دوستیوں کے بندھنوں نے میرے بازوؤں پر نیل ڈال دیے ہیں جو تمھاری دشمنی میں پروان چڑھیں۔ تم بھی یہی کہو کہ ہم نے تم سے رشتے توڑ کر جو رشتے جوڑے ہیں انھوں نے ہمارا دل توڑ دیا ہے یہاں اور وہاں۔ جس سیاست کو اپنایا گیا وہ تاریخ کو خوار اور تہذیب کو خراب کرنے والی سیاست تھی۔ جس حکمتِ عملی کو اپنا چکلا چلانے کی کھلی چھوٹ دی گئی وہ تاریخ کے ضمیر اور تہذیب کی روح کو رُسوا کرنے والی حکمتِ عملی تھی۔ اس نے اِدھر والوں کا بھی منہ کالا کیا اور اُدھر والوں کا بھی۔ کیا اب یہ ہو سکتا ہے کہ تاریخ کے ضمیر اور تہذیب کی روح کو اس حکمتِ عملی کی گند سے بچایا جائے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے لوگوں کو سچ مچ ہوش آ گیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دونوں اس بھید کو سمجھ گئے

ہیں جس کو نہ سمجھ کر اب تک جو کچھ سمجھا گیا وہ دھوکا تھا اور جو کچھ کیا گیا وہ دھاندلی۔ چھبیس سال ہو گئے ہیں نہ ہندوستان چین سے ہے اور نہ پاکستان۔ نہ اِدھر والے سکھی ہیں اور نہ اُدھر والے۔ کیا آزادی کا یہی پھل ملنا تھا۔ جھگڑالو پن چھوڑ دو اور ایک دوسرے کے دُکھ درد کو سمجھو اور یک دلی کے راستے پر چلنے کی کوشش کرو۔ پاس آؤ کہ اسی میں پانا ہے دُور نہ جاؤ کہ اس میں کھونا ہے اور برباد ہو جانا ہے۔ اور ہم تو بس خواہشیں رکھنے والے ہیں اور زندگی کا جو مزہ بھی چکھایا جائے اسے چکھنے والے ہیں۔

عالمی ڈائجسٹ' اکتوبر 1973

نسب نامہ

ابراہیمؑ کے دو بیٹے ہوئے‘ ایک اسماعیلؑ اور ایک اسحاقؑ اور ان دونوں میں کوئی لڑائی نہ تھی۔ اور اسماعیلؑ کے ہاں بنایوت‘ قیدار‘ ادبئیل اور مبسام‘ مشماع‘ دومہ‘ مسا‘ حدد اور تیما‘ یطور‘ نافیس اور قدمہ پیدا ہوئے جو اسماعیلیوں کی پہلی نسل کے لوگ تھے اور ان کی اولاد عرب کہلائی اور اسحاقؑ کے ہاں عیسو اور یعقوبؑ پیدا ہوئے اور یعقوبؑ ہی کو اسرائیل کہتے ہیں۔ یعقوبؑ کے بیٹے یہودا اور یوسفؑ اور ان کے بھائی پہلی پیڑھی کے اسرائیلی تھے اور اِن میں اور اُن میں کوئی لڑائی نہ تھی۔ اور پھر جب ایسا ہوا کہ یوسفؑ کے بھائیوں نے یوسفؑ کو سوداگروں کے ایک قافلے کے ہاتھوں بیچ دیا تو وہ لوگ یوسفؑ کو مصر لے گئے۔ وہاں جو کچھ ہوا وہ جانا جاتا ہے۔ اور ایسا ہوا کہ مصر میں یوسف کو بڑی عزت ملی اور پھر اسرائیل کا گھرانا مصر ہی میں آ رہا اور وہاں خوب پھلا پھولا اور جب عربوں نے یہ سُنا کہ ان کے دادا کا گھرانا مصر میں پھل پُھول رہا ہے تو ان میں سے بھی بہت سے‘ مصر میں آ کر رہنے لگے اور یہ دونوں مل کر بہت ہو گئے اور یہ سب کے سب وہاں بہت اچھے تھے۔ اس وقت بھی ان میں کوئی لڑائی نہ تھی۔ پھر مصر میں ہکسوس بادشاہوں کی حکومت ہوئی۔ اس وقت بھی اسرائیلیوں کی عزت اور دولت بڑھوتری پر رہی اس لیے کہ ہکسوس عرب تھے اور انھیں کی نسل سے تھے اس پر مصری ان سے جلنے لگے اور اسرائیلیوں پر ان کا غصہ بہت ہوا۔ آخر مصریوں نے ہکسوس کو مصر سے نکال دیا اور خود حکومت کرنے لگے‘ اب اسرائیلیوں اور ان کے ساتھ عربوں کا وہاں رہنا دشوار ہو گیا۔ اس وقت موسیٰؑ اسرائیلی گھرانے کے سب سے نام ور بیٹے تھے۔ موسیٰؑ نے دیکھا کہ میرے لوگ بڑی سختیاں جھیل رہے ہیں‘ سو انھوں نے اپنے لوگوں

کو سمیٹا اور انھیں مصریوں سے چھٹکارا دلا کر عرب کی سرزمین کی طرف لے چلے۔ کہتے ہیں کہ عربوں کو بھی وہاں سے ہجرت کرنا پڑی کہ مصری ان دونوں ہی سے نفرت کرتے تھے۔

اور جب بخت نصر کا غضب عرب کے سر پر بھڑکا تو یرمیاہ نبی اور برخیا نبی جو اسرائیلی تھے، وہاں گئے اور اسماعیلؑ کے گھرانے کے ایک لڑکے معد بن عدنان کو اس فتنے سے بچا کر اپنے ساتھ حرّان لے گئے۔ یہ لڑکا ان دونوں کے سائے میں بڑا ہوا اور ان کی کتابیں پڑھ کر دانش کی اُونچائی پر کھڑا ہوا۔ یہ معد بن عدنان، رسولِ عربی کے دادا تھے اور پھر ان میں بُری طرح ٹھن گئی۔

آج معد بن عدنان اور یرمیاہ بن خلقیاہ کے لوگوں کے بیچ پھر خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ اتنا خون تو ان کے بیچ کبھی نہ بہا تھا۔ آسمان کڑک رہے ہیں اور زمینیں چیخ رہی ہیں۔ کون ہے جو بستیوں میں جا کر گریہ کرے اور گریبان پھاڑ کر چلّائے کہ اب کے اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کے بدن بُری طرح خون میں لت پَت ہوئے ہیں۔ لاشیں گرائی جاتی ہیں اور لاشیں اُٹھائی جاتی ہیں۔ کیا تمھارے نسب نامے خون سے لکھے گئے تھے اور کیا تمھارے تعویذ اس لیے اُتارے گئے تھے کہ تم ایک دوسرے کا گلا کاٹو۔ کیا ہاجرہ اور سارہ[1] نے اپنی کوکھ سے ایک دوسرے کے قاتلوں کو جنم دیا تھا۔

پر یہ فتنہ اُٹھایا کس نے ہے۔ یہ فتنہ عربوں نے اُٹھایا ہوتا تو ہم انھیں بُری طرح ٹوکتے، اسرائیل ہٹ دھرمی پر ہے۔ اسرائیل نے دھاندلی سے کام لیا ہے۔ عرب اور کیا کہتے ہیں، وہ تو بس یہ کہتے ہیں کہ ہماری زمینیں چھوڑ دو پھر کوئی لڑائی نہیں۔ یہ تماشا ہی تو ہے کہ جو تھوڑے ہیں وہ چھیننے والے ہیں اور جو بہت ہیں وہ چھنوانے والے ہیں۔ میں جس شہر میں بیٹھا ہوں، اس ایک شہر کی آبادی بھی اسرائیل سے زیادہ ہے۔ ایک طرف انتیس لاکھ اسرائیلی ہیں جن کی زمین تنگ ہے اور دوسری طرف کروڑوں عرب ہیں جو کئی ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جب کوئی سوچنے والا سوچتا ہے تو اسے دُکھ بھی ہوتا ہے اور جھونجل بھی چڑھتی ہے۔ اتنا چھوٹا گروہ اور ایسا جھگڑالو۔ جو یہ سُن کر شاید بہت خوش ہوتا ہے کہ عربوں

---

[1]...... یہاں ابراہیمؑ کی تیسری بیوی قطورہ کی اولاد کا ذکر نہیں کیا گیا۔ جون ایلیا

کے اتنے بڑے جھمگٹ اسے اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہیں اور دنیا سے اس بات کی داد لے رہے ہیں کہ اب کے عرب اسرائیلیوں کے مقابلے میں جم کر لڑ رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اسرائیل نے عربوں کا حق نہ چھینا ہوتا اور وہ اسی طرح عرب کی کئی قوموں کے مقابلے میں اکیلے لڑ رہے ہوتے جیسے اب لڑ رہے ہیں اور لڑائی کو اتنے ہی دن گزر گئے ہوتے جتنے دن اب گزر چکے ہیں اور چاہے وہ کھلم کھلا ہار ہی رہے ہوتے تب بھی دنیا یک بارگی یہ پکار اُٹھتی کہ لو وادیٔ سینا میں ایک اور معجزہ دکھایا گیا۔ پھر اب کیا ہوگا۔ اب یہ ہوگا کہ اگر تم پورے عرب کو فتح کر لو تب بھی تمھیں بُرے نام سے پکارا جائے گا اور اگر ہار جاؤ تو پھر بُری طرح دھتکارا جائے گا۔

عالمی ڈائجسٹ، نومبر 1973

پورا سچ

میں کیا کہتا ہوں، میں تو کچھ بھی نہیں کہتا اور کہہ سکنے والا کہہ بھی کیا سکتا ہے۔ کہیں تو وہ جو کچھ بھی نہ کہہ سکتے ہوں اور بولیں تو وہ جو کچھ بھی نہ بول سکتے ہوں۔ ہاں کہنا انھیں کو ساجتا ہے جو کہنا چاہیں تو کپکپانے لگیں اور بولنا چاہیں تو بولا جائیں۔ میں اگر کچھ کہوں گا تو بس اپنے ہی آپ سے کہوں گا اور اگر کچھ سُنوں گا تو بس اپنا ہی کہا سُنوں گا۔ اپنی زبان اور اپنے کان، ہاں اپنے کان اور اپنی زبان باقی گمان۔ میری کہن کی کسی کے کانوں پر بھلا کیا دادرَسی ہے اور جب ایسا ہے تو پھر کسی اور کی کہن کا میرے کانوں پر بھلا کیا دعویٰ۔ سوٗمیں کسی سے کیا کہوں اور کسی کی کیا سُنوں۔

بولنے والے نے کوئی ایسا بول نہیں بولا جو اُس کے سوا کسی اور نے سمجھا ہو اور سُننے والے نے کوئی ایسی بات نہیں سُنی جو کہنے والے نے اپنے سوا کسی اور کو سُنانا چاہی ہو۔ مین تو اب تک یہی جان پایا اور میری سمجھ میں تو بس یہی آیا۔ کہنے والے کہتے نہیں تھکتے اور سُننے والے سُنتے نہیں تھکتے۔ پرٗ ہے یوں کہ نہ کوئی کچھ کہہ رہا ہے اور نہ کوئی کچھ سُن رہا ہے۔ یہاں کہن اور کان میں کوئی جان پہچان نہیں ہے۔ ہاں کہن اور کانوں کے بیچ ایک خلا ہے، سو جو کچھ کہا گیا، وہ کہا ہی کب گیا اور جو کچھ سُنا گیا، وہ سُنا ہی کب گیا؟ ایک خارش زدہ کتیا کی گردن کی کھال اور اس کھال سے چمٹی ہوئی چیچڑیوں میں شاید کہنے اور سُننے کا کوئی رشتہ پایا جاتا ہو، کان کا میل کان سے شاید کوئی بات کہتا ہو اور اسے سمجھا جاتا ہو۔ پرٗ دو انسانوں میں ایسا کوئی رشتہ نہیں پایا جاتا۔ کوئی شنوائی کسی آواز کی پُرسانِ حال نہیں ہے۔ میں صبح ہوتے ہی لفظوں کو اپنی جھولی اور جیبوں میں بھر کر نکلتا ہوں اور انھیں خالی کر کے رات گئے گھر پلٹتا

ہوں' پر دوسرے دن ایسا ہوتا ہے کہ جیسے نہ کچھ کہا گیا تھا اور نہ سُنا گیا تھا۔ یہی ان سب لوگوں کی بپتا ہے جن کے ساتھ میں شنوائی' شنوائی بھٹکتا ہوں اور جن کی آوازیں میرے ساتھ نارسائی' نارسائی بھٹکتی ہیں۔ پھر ہماری کھسیان پت روہانسی ہو کر ایک دوسرے سے کہتی ہے کہ ہم بھی تو جھوٹ سے بھری ہوئی جیبیں اور جھوٹ سے بھری ہوئی جھولیاں لے کر نکلے تھے۔ پھر ہم روتے ہیں اور پھر ہم ہنستے ہیں اور پھر صبح تک کے لیے جُدا ہو جاتے ہیں۔

سو میں کہتا ہوں کہ مت بول اور چُپ رہ۔ سُنا! میں نے کیا کہا' مت بول اور چُپ رہ۔ لفظوں کو دانتوں سے چبا کر تھوک ڈال اور آوازوں کو ہونٹوں سے نوچ کر پھینک دے۔ لفظوں کو دانتوں سے چبا کر تھوک ڈالوں اور آوازوں کو ہونٹوں سے نوچ کر پھینک دوں' نہ بولوں اور چُپ رہوں؟ میں چُپ ہو جاؤں گا تو میری سانسیں سڑ نہ جائیں گی۔ یہ تو بڑا ہی جان لیوا ہونا ہوا' یہ تو نہ ہونا ہوا۔

سو' اگر چُپ نہ رہ سکتا ہو تو پھر جھوٹ بول یا آدھا سچ بول پر چاہے کچھ بھی ہو' پورا سچ کبھی مت بولنا اور پھر پورا سچ بولنے والا بھلا تُو کون؟ پورا سچ بولے تو پھر کوئی پتھر ہی بولے' پورا سچ بولیں تو جڑی بوٹیاں' پودے اور پیڑ ہی بولیں' پورا سچ بولے تو خشکی' پانی یا ہوا کا کوئی جانور ہی بولے کہ اگر پورا سچ بولنے کی سکت ہوگی تو پتھروں میں ہوگی' پیڑ پودوں میں ہوگی اور جانوروں میں ہوگی۔ یہ سیدھے ڈیل والا دوٹنگا جان دار کون ہوتا ہے کہ پورا سچ بول سکے یا اس کا لالچ بھی کر سکے اور پھر یہ بھی چاہے کہ اس کے گھٹنوں کی چپنی چٹخ نہ جائے اور اس کی پنڈلیوں کی ہڈیاں تڑخ نہ جائیں اور اس کے مونڈھے رہ نہ جائیں۔ اگر کوئی گھنے بالوں والا پورا سچ بولے گا تو اُس کے بال چھدرے ہو جائیں گے اور اگر کوئی چھدرے بالوں والا پورا سچ بولے گا تو کھڑ گنجا ہو جائے گا اور اگر کوئی کھڑ گنجا پورا سچ بولے گا تو اس کے سر کی کھال اُدھڑ جائے گی۔ جس کی نگاہیں عقاب کی نگاہوں سے بھی زیادہ تیز ہیں اگر وہ پورا سچ بول اُٹھے تو چُندھا ہو جائے اور اگر چُندھا پورا سچ بول دے تو اندھا ہو جائے۔

میں گمان کرتا ہوں کہ انسان کی بناوٹ ہی میں' کوئی ایسا فتور ہے کہ اگر وہ پورا سچ بولنا بھی چاہے تو نہ بول سکے۔ ہاں میری بناوٹ ہی میں کوئی فتور ہے۔ ستّر کان بہتّر جھول۔

چھپکلیوں، چمگادڑوں اور چھچھوندروں نے کہنا پسند کیا ہوتا تو ہم سُنتے کہ ہم ہیں بھی کیوں؟ اب ایک کہاوت سُن اور وہ کہاوت یہ ہے کہ سچ بولنا آدھی لڑائی مول لینا ہے۔ پر سچ تو یہ ہے کہ سچ بولنا پوری لڑائی مول لینا ہے۔ جھوٹ پر جھوٹ ناتا اٹوٹ۔ آ میں تجھ سے سوچ کا سچا بیوہار کروں، سو میں کہتا ہوں کہ جھوٹ کے ساتھ آ اور جھوٹ کے ساتھ جا اور ایک اور کہاوت سُن کہ سچا جائے روتا آئے اور جھوٹا جائے ہنستا آئے اور بڑے بوڑھوں نے کہا ہے کہ جھوٹے کے آگے سچا رو مرتا ہے۔ سچے مر گئے اور جھوٹوں کو تپ بھی نہ آئی اور یہ جھوٹے ہی تو ہیں جو سچوں کی میراث دابے بیٹھے ہیں۔

میں اس بستی میں ایک گھر کھوج مٹے کو جانتا ہوں، اس نے سوگند کھائی ہے کہ جب کوئی جھوٹی آواز سُنے گا تو اس کا پیچھے کرے گا، یہاں تک کہ اُن ہونٹوں کو نہ جا لے جن سے اُس آواز کا حمل گرا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ میں ان سارے ہونٹوں کو بکھان کے رہوں گا جو اپنے جھوٹے لفظوں کو شنوائی کی منڈی میں بھیجتے ہیں اور سُود بٹے کا پورا پورا حساب اپنے پاس رکھتے ہیں۔ ان کے ہونٹوں نے شنوائی کی بستیوں میں گھناؤنی بیماریاں پھیلائی ہیں اور ان کی شنوائی نے سڑے ہوئے ہونٹوں کو چاٹ چاٹ کر اپنے اندر آیندہ کے لیے گندی وباؤں کے کتھے بھر لیے ہیں۔ اور میں یہ بھی کیوں نہ کہہ دوں کہ سچ سکرات ہے اور پورا سچ موت اور ایک بکواسی مجھ سے کہتا ہے کہ بس بکواس بند کر اور وہ بکواسی میں ہوں۔

عالمی ڈائجسٹ، دسمبر 1973

وقت

ٹھٹھرے ہوئے پھیلاؤ[1] میں شام بہہ رہی ہے اور میں اپنے اکیلے پن میں اپنے ہونے اور نہ ہونے کا نشہ پیے بیٹھا ہوں اور میری پلکوں کے بوجھل پن کے سامنے اور اس کے اُوپر میرے سگریٹ کا دھواں منڈلا رہا ہے اور اس دھوئیں سے لے کر دُور پار کی کہکشانوں کے غبار تک جو کچھ بھی ہے وہ دیکھی اور ان دیکھی دھند میں ہے اور دھند پھیلتے ہوئے پاگل پھیلاؤ میں ہے اور یہ پھیلاؤ ہر "ہے" کی نہیں میں ہے اور ہر "ہے" کی یہ نہیں ہے اور نہیں، دونوں کی نہیں نے ان جان اپنے اکیلے پن میں ہے اور اب میں واپس چلوں اور کہوں کہ پھیلتا ہوا پھیلاؤ جب اس کے لیے کہا جائے کہ وہ ہے تو اس کا ہونا ایک پل میں ہے، ایک پل جسے یہ پھیلاؤ اور جو اس پھیلاؤ کو پہنے ہوئے ہے اور یہ دو، تین نہیں ہیں، ایک ہی بات ہے اور یہ نہ کہہ کہ ہے۔ ہاں یوں کہہ کہ بس ہو جانے یا ہوتے رہنے کا ایک حال ہے، اور میں جو ہوں میں آن یا پل کو اُچکنا چاہ رہا ہوں۔ میں اپنے ہونٹوں سے وقت کے کش لے رہا ہوں اور لمحوں کا دھواں چھوڑ رہا ہوں اور جو ہے وہ یہ ہے کہ آن یا پل نہ میرے کسی "ہے" کی پکڑ میں ہے اور نہ میرے کسی نہیں کی پکڑ میں۔ ایک آن اور دوسری آن میں ہونے اور نہ ہونے کا بیر ہے۔ اچھا تو یہ ہے، تو میں وقت کے بارے میں بکواس کر رہا ہوں۔ ہاں میں نے ایک آن میں، ایک آن کے "ہمیشہ" میں اپنی عمر کا ایک اور برس کھو دیا ہے۔ پر میں نے پایا کیا ہے۔ کیا میں ایک آن کو بھی پا سکا ہوں۔ میں نے کچھ کھوٹے اور کھو کھلے لفظ سیکھ لیے ہیں اور وقت کو لفظوں میں پانے چلا ہوں۔ لفظ تو لفظ، لفظ کی کسی ایک اکائی میں بھی

---

[1] ..... میں مکان (SPACE) کو اس گفت گو میں پھیلاؤ کہنا چاہوں گا۔

وقت کو نہیں پایا جا سکتا۔ قلم گھسیٹارہ اور گھسٹتارہ، کیا پالے گا۔ ایک پل کو بھی نہیں پا سکتا۔ اچھالے ''قلم'' ہی کو لے۔ قلم ایک لفظ ہے اور قلم کو ''ق ل م'' کی صورت میں سمجھ اور اب ان تینوں حرفوں کو اپنی زبان سے ادا کر۔ پہلے تیری زبان پر ''ق'' آیا۔ پھر ''قل'' اور پھر ''قلم''۔ سو جس آن تُو نے ''ق'' کہا تو وہ حال تھی اور ''ل'' اس وقت مستقبل میں تھا یا مستقبل تھا اور جس آن ''ل'' کہا تو ''ق'' ماضی تھا اور ''ل'' حال تھا اور ''م'' مستقبل میں تھا یا مستقبل تھا اور جب قلم کہا تو ''م'' حال تھی اور ''ل'' اور ''ق'' دونوں ماضی تھے ماضی میں تھے اور جب تُو نے قلم کہہ دیا تو یہ سب ماضی تھے تو جون ایلیا یہ قلم جو تیری زبان پر ہے اور جو تیرے ہاتھ میں ہے یہ ہے کہاں، ماضی میں یا مستقبل میں یا حال میں تو حال کہاں ہے۔ تُو نے ایک ''قلم'' کا لفظ تین زمانوں میں بولا ہے۔ ایک قاف کا زمانہ تھا ایک لام کا اور ایک میم کا اور جب تُو نے ''ق'' کہہ کر ''ل'' کہا تو ان دو زمانوں میں وہ دُوری تھی جسے ازل اور ابد کہتے ہیں۔ کیا اب تُو اس آن کو پکڑ سکتا ہے جب تُو نے ''ق'' کہا تھا یا ''ل'' کہا تھا یا ''م'' کہا تھا۔ اب وہ آن ازل ہے اور لفظ تو لفظ' آواز کا سارا وجود ایک پورا حرف بھی ایک حال میں نہیں بول سکتا اور ذرّوں اور ستاروں اور کہکشانوں کا سارا سکوت بھی اسے ایک حال میں نہیں سوچ سکتا۔ ایک آن' ایک آن اور ایک ہی آن اور ایک ''ہے'' اور ایک ہی ''اب'' اور ہاں ایک ہی ''اب'' جو ہمیشگی میں ہے اور ہمیشگی ہے۔ کیا میں اس آن اس ''ہے'' اور اس ''اب'' کو پا سکتا ہوں اور بتا سکتا ہوں کہ لو میرا ''ہے'' یہ ہے اور میری ''اب'' یہ ہے اور سارا ہونا اپنے پائے جانے میں اسی ایک ''ہے'' اور اسی ایک ''اب'' سے ہے اور اسی میں ہے اور اسی تک ہے۔ اس ''ہے'' اور اس ''اب'' کو اگر روشنی کی رفتار کی بیٹی لپک لینا چاہے تو اس چاہنے ہی میں اس کی کمر جھک جائے اور اس کی پلکیں سفید ہو جائیں۔ لو اب میں یہ سوچنا بھگتوں کہ یہ آن' یہ پل' یہ ہے اور یہ اب بھلا ہے کیا۔ کیا یہ سب کچھ زبان کا پھوہڑ پن ہے۔ وقت ہے تو کیا ہے اور نہیں ہے تو کیا نہیں ہے اور ہے اور نہیں بھی تو وقت ہی نہیں ہے۔ وقت کے دو نام ہیں اور بابل کی راتوں کے آسمان کو ٹکٹکی باندھ کر تکنے والی گھمبیر آنکھوں اور اُلجھی ہوئی سفید داڑھیوں

والے کاہنوں اور ہیکلوں والوں[۱] نے وقت کو کچھ اور نام بھی دیے پر میں کہتا ہوں کہ اس کے بس دو ہی نام ہیں، ہونا اور نہ ہونا اور ہونے کا بہلاوا نہ ہونے کے ڈراوے سے بہت کم ہے۔ ہاں وقت انسان کے لیے سب سے بڑا ڈراوا ہے۔ مصر والوں نے وقت سے ڈر کر چاہا کہ وہ ٹھہرا جائے۔ سو انھوں نے چٹانوں سے تکونے منارے بنائے اور زندگی کی لاشوں کو مومیا لگا کر پتھریلے ٹھہراؤ کی پناہ میں دے دیا۔ اور یونانیوں نے سوچا کہ وقت تھم جائے سو ان کے بت تراشوں نے وقت کو چھینیوں سے چھیل کر اپنے بڑوں کے بت تراشے اور ان کی آنکھوں کے حلقوں کو کھوکھلا رکھا کہ ڈلوں میں چمک ہوتی ہے اور چمک میں مچک اور مچک میں پلکوں کی جھپک اور پلکوں کی جھپک میں پل بیتنے کی کھٹک اور میں نے کہا ہے کہ وقت انسان کے لیے سب سے بڑا ڈراوا ہے۔ وقت میری ماں اور میرے باپ کے سانسوں کا اُکھڑنا ہے اور میرے گھر کا اُجڑنا ہے اور میرا اکیلا پن ہے اور پھر میری جلاوطنی ہے اور یہاں کے ان زہریلے ہونٹوں کی جنبش ہے جن سے کچھ کم زہریلے پن کی بھیک مانگنے کے لیے مجھے اپنا سارا سینہ خالی کر دینا پڑا۔ بہت سوں نے وقت کے ڈراوے میں آ کر کہا کہ وہ خدا ہے اور کتنے ہی سوچنے والوں کو یہ سوچ کر چین پڑا کہ وہ پایا ہی نہیں جاتا۔ میں نے اب تک وقت کے بارے میں اس بکواسی کی بڑ سُنائی جو کچھ بھی نہ جاننے کا سُو دکھاتا ہے اور وہ میں ہوں۔ سو اب جاننے والوں کی باتیں سُنو اور سب سے پہلے یونان کے اس آدمی کی بات پر سر دھنو جو اگر فلسفی نہ ہوتا تو بردہ فروش ہوتا یا درباری اور وہ سرکاری درباری تھا بھی۔ اس کا نام ارسطو ہے، جو بڑا کائیاں آدمی تھا۔ اتنا کائیاں کہ اس نے اپنے آپ کو دنیا کا ایک سب سے بڑا ذہین آدمی ہی نہیں کہلوایا فلسفی تک منوا لیا۔ ہاں تو اس نے وقت کو پہلے[۲] اور پیچھے[۳] کی طرف حرکت کا شمار کہا ہے اور جس طرح گنتی کے لیے کوئی گننے والا چاہیے اسی طور وقت کے لیے بھی ایک گننے والا ہے اور وہ نفس ہے۔

وقت کے لیے یہ ایک ایسی بات کہی گئی تھی جو فلسفے کی منڈی میں موتیوں کے مول بکی۔ افلاطون کے ماننے والوں[۴] میں سے ایک فلسفی افلوطین نے وقت کو مدت ٹھہرایا۔ نفس کی

۱۔۔۔۔۔اصحاب الهیاکل ۲۔۔۔۔۔قبل ۳۔۔۔۔۔بعد ۴۔۔۔۔۔نوفلاطونی

حیات کی مدت اور بتایا کہ وہ اپنی ذات سے گنتی کے نیچے نہیں آتا' اسی گروہ کے ایک اور فلسفی پروکلس نے یوں سوچا کہ وقت حرکت سے جُدا ہے اور نفس سے بھی اور یہ کہ حرکت اور نفس کا ہونا اسی کے رشتے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک ایسی ہی بات آگے چل کر حسدائی قرستس نے بھی سوچی۔ یہ کہ وقت حرکت سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتا اور یہ کہ ہمیشگی کے جوہر[1] بھی وقت ہی کے روزنامچے میں ٹکے ہوئے ہیں۔ حسدائی قرستس عبرانی تھا اس کے نام کے ساتھ مجھے وہ فلسفی یاد آ گئے جو عربی میں سوچتے تھے اور عربی کے عین سے علّاف کا خیال آ رہا ہے۔ معتزلیوں کا فلسفی ابوہذیل علاف' اس نے وقت کو ان سب سے چھوٹے ذرّوں کی حرکت بتایا ہے جن میں کسی ذرّے کو اور جزوں میں نہ بانٹا جا سکتا ہو[2] اور یہ کہ وقت نہ تھا اور پھر ہوا[3] معتزلیوں کی دیکھا دیکھی اشعریوں نے بھی اس بارے میں اپنی رائے دی ہے جو یہ ہے کہ جس طرح یہ پھیلاؤ جُدا جُدا ذرّوں[4] کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح وقت بھی جُدا جُدا ذرّوں یا پلوں کا مجموعہ ہے جو پہلے اور پیچھے ہونے میں آتی ہیں اور یہ کہ وقت ایک پل سے دوسری پل کی طرف چھلانگ لگاتا ہے۔ یہ لوگ وقت کو ذرّوں اور نقطوں میں پاتے ہیں۔ اشعریوں سے نمٹ کر اب مجھے پھر کھرے فلسفیوں کے بیچ پہنچنا چاہیے۔ گم نام فلسفی ایران شہری نے یہ سمجھا ہے کہ وقت اور مدت اور دہر تینوں ایک ہیں اور وقت ایک گزرنے اور نہ ٹھہرنے والا جوہر ہے۔ ایران شہری کے نام کے ساتھ ابوبکر زکریا رازی کا نام کیسے یاد نہ آئے گا۔ مسلمان دنیا نے ایسے کم فلسفی پیدا کیے ہیں۔ رازی کے سب سے زیادہ گستاخ اور سب سے زیادہ ذہین نکتہ چیں ناصر خسرو سے روایت ہے کہ زکریا رازی کے خیال میں دانش مند آدمی وہ ہے جو وقت کے بارے میں ان عام آدمیوں کی سمجھ پر بھروسا کرے جن کے سادہ اور صاف ذہن بحث اور تکرار کی اُلجھنوں میں پڑ کر خراب نہ ہو گئے ہوں۔ سو میں نے ایسے ہی لوگوں سے پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ اگر آسمان اور اس کی گردشیں نہ رہیں تو ایک چیز پھر بھی رہے گی جو ہم پر ہمیشہ جاری رہتی ہے اور وہ وقت ہے۔

---

[1]......جواہرازلیہ [2]......اجزائے لایتجزیٰ [3]......یعنی وقت حادث ہے [4]......اجزائے منفصلہ

رازی کہتا ہے کہ وقت ایک گزرنے والا جوہر ہے اور وہ ہمیشہ سے ہے۔ خود ناصر خسرو کے خیال میں جو اسماعیلی فلسفی تھا اور فارسی کا سب سے بڑا فلسفی شاعر' وقت جسم کی گزرنے والی حالتوں یا جسم کی حالتوں کے گزرنے کا نام ہے۔ اسماعیلی فلسفیوں سے جنھوں نے شاید سب سے زیادہ سیکھا ہے' اُن میں سے ایک شیخ شہاب الدین سہروردی بھی ہیں۔ اُن کی سوچ میں وقت ایک نہ ٹھہرنے والی چیز کا پیمانہ ہے اور یہ چیز حرکت ہے پر یہاں اُس کو یوں اعتبار میں لاؤ کہ وہ عقل میں ہوتے ہوئے پہلے اور پیچھے کے طور پر پایا جائے۔ لو شاعری کا نشیلی آنکھوں والا نوجوان شیطان آ گیا' آ رے یہ خون کا سجیلا بیٹا علیم' یہ وہ ہے' جس نے خدا سے اُن حرفوں کو بولنے کی مہلت اُچک لی ہے جو اس کے اپنے ایمان میں زندہ ہوں اور وہ اس مہلت میں اپنے ہونٹوں کو شعلوں کے سانس پہنانے کی مشقت میں مگن ہے اور یہ اسد محمد خاں ہے' اُردو کا تلسی داس' جو لمحے لمحے کی سکرات میں زندہ گیتوں کے سُر بوجھتا ہے اور یہ وقت کا بیری ذکاء الرحمٰن ہے' پنجاب کی رُتوں کی کہانیاں لکھنے والا' یہ ایسا جنجالی اور جھگڑالو ہے کہ اگر تین ہزار سال پہلے کے پنجاب میں ہوتا تو رگ وید کے لیکھکوں کے منہ آتا اور یہ میرے بھائی احمد الطاف ہیں جو اگلے زمانوں میں ہوتے تو رشی اور گیانی کہلاتے تو میرا اکیلا پن اُجڑ گیا' تم سب چپ چاپ بیٹھ جاؤ اور میرا بڑبولا پن بھگتو اور سُنو کہ پرانے ہندوستان میں وقت کو کس طور سمجھا گیا' تو پہلے میں البیرونی کا بتایا ہوا سناؤں۔

البیرونی نے وقت کے بارے میں ہندوستانیوں کی سوچ کے بہت سے پہلو سمجھائے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہاں کی ایک کتاب سنگھٹ میں لکھا ہے کہ پرانی کتابوں میں کچھ لوگوں نے جس کو سب سے پہلا ہونا کہا ہے' وہ وقت ہے' جو ہے اور جو تھا اور جو رہے گا۔ پھر البیرونی یہ بتاتا ہے کہ ہندوؤں میں ایک مدت ہے جو برہما کا دن ہے اور پھر اس کی رات ہے جو دن کے برابر ہے۔ اس پھیلاؤ میں جو کچھ بھی ہے وہ برہما کے دن سے ہے۔ اس دن کے ہوتے زمین پر وہ سب کچھ ہے جو ہے اور اسی دن میں ستارے گردش کرتے ہیں اور آسمان گھومتے رہتے ہیں پر برہما کی رات میں سب کچھ بکھر جاتا ہے' سب کچھ ٹھہر جاتا ہے۔ تو ایک مدت برہما کے جاگنے کی ہے اور ایک سونے کی اور آنے والے دن میں پھر ایک نیا

ہوناہونے میں آتا ہے۔ برہما کی عمر بہتر ہزار کلپ ہے اور ایک کلپ......۴۳۵۴۵۶ برس کا ہوتا ہے اور اگر تم یہ جاننا چاہو کہ برہما سے پہلے کتنے برہما ہو چکے ہیں تو یہ اُسی وقت جان سکتے ہو جب تم نے گنگا کی ریت کے سارے ذرّوں کو گن لیا ہو۔ اور پس سدھانده میں لکھا ہے کہ برہما کی ساری عمر پُرش کا ایک دن ہے اور وہ چیز جس سے تم وقت کا خیال پا سکو تو وہ ''پراردھ کلپکا'' کا برس ہے، جو[1]......................۸۶۴ برس کے برابر ہے اور یوں بھی سمجھو کہ اگر برہما کی عمر بہتر ہزار کلپ ہے تو نارائن کی عمر......۱۵۵۵۲اکلپ ہوگی اور رُور کی عمر[2]..........۵۳۴۷۷۱۲۰ کلپ ہوگی اور ایشر کی عمر[3]..................۵۵۷۲۵۶۲۷۸۰۱۶ کلپ ہو گی اور سداشو کی عمر[4]......................۱۷۳۳۲۸۹۹۲۷۱۴۰۹۶۶۴ کلپ ہو گی اور شکتِ کی عمر[5]...................... ۱۰۷۸۲۴۴۹۹۷۸۷۵۸۵۲۳۷۸۱۱۲اکلپ ہو گی؛ اُسے توتی کہتے ہیں۔ اس قاعدے کو سامنے رکھ کر توتی سے دن ترکیب دیا جائے تو یہ دن[6]......................۳۷۲۶۴۱۴۷۱۲۶۵۸۹۴۵۸۱۸۷۵۵۰۷۲ کلپ کے برابر ہوگا اور یہ شو کا ایک دن اور ایک رات ہے۔ اور شو ہمیشہ سے ہے۔ جون ایلیا کا خیال ہے کہ گنتی کی باریوں[7] میں ہندوستانیوں یا ہندوؤں کو کوئی نہیں ہرا سکتا۔ انھوں نے وقت کی ہمیشگی کو گنتی میں سمجھا اور سمجھایا ہے، ہاں اُن کو چھوڑ کر اخوان الصفا کے ہاں گنتی کی باریاں سب سے زیادہ ہیں۔ البیرونی نے تو اور بہت کچھ بھی لکھا ہے، پر اب آگے چلو۔ رگ وید میں ہے کہ پُرش اپنے چوتھائی بھاگ سے سارے سنسار پر چھایا ہوا ہے اور اُس کے جو تین بھاگ، بچے وہ سنسار کے پرے ہیں اور پرش ماضی بھی ہے اور حال بھی ہے اور مستقبل بھی ہے اور بس وہی ہے جو ہے اور کچھ نہیں ہے اور وہ برہما ہے۔ سوچنے والوں نے اُس کے لیے بہت کچھ کہنا چاہا، پر تھک کر ''نیتی، نیتی'' ہی کہہ پائے، وہ یہ نہیں ہے، وہ یہ نہیں ہے، تو کیا وہ وقت ہے، کیا وہ دہر ہے، کیا وہ سرمد ہے۔ ''اہم، برہم'' میں برہما ہوں میں ہی پیدا کرنے والا ہوں اور میں ہی سچ ہوں۔ ہندوستان میں سوچنے کے دو ڈھنگ رہے ہیں، ایک ناستک اور

۱......۲۴صفر ۲......۱۱صفر ۳......۱۶صفر ۴......۲۲صفر ۵......۲۸صفر ۶......۲۱صفر ۷......مراتب عدد

ایک آستک بُدھ، چارواک اور جین ناستک ہیں اور میں ان کی بات پہلے بھی کر چکا ہوں۔ اب آستک کی سُنو۔ آستک ہی میں یوگ سانکھیہ، نیائے اور ویشیشک کے نام آتے ہیں۔ یوگ کی سوچ پر جناب رئیس امروہوی کچھ لکھیں تو کتنا اچھا ہو! نیائے اور ویشیشک ایسے دو ہیں جو ایک ہو گئے ہیں۔ اُن کی سوچ وقت کو ایک ایسا جوہر مانتی ہے جو خود ہے اور چیزوں کے بدلتے رہنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو ماضی اور حال اور مستقبل میں ڈھالتا رہتا ہے اور مستقبل کا کوئی سرا نہیں ہے۔ پر، سانکھیہ کسی ایسے وقت کو نہیں مانتا جس کو ہونا سچ مچ کا ہونا ہو۔ ہاں کال[1] کی وہ ایک اکائی جس میں ایک سالمہ اس پھیلاؤ کی ایک اکائی سے گزرتا ہے، وقت ہے۔ یوگ واسشٹھ میں آیا ہے کہ ہم جس کو ہونا کہتے ہیں اُس میں سب سے پہلا ہونا: کاش ہے اور اسی باری میں اہمتا[2] اور کال پیدا ہوتے ہیں پر ان کا ہونا کوئی ہونا نہیں ہے۔ مجھے یاد آیا کہ ان دنوں سیّد محمد تقی نے وقت کے بارے میں جو سوچ اپنی کتاب میں لکھی وہ شاید یہ ہے کہ وقت کا ہونا کسی قضیے میں نہیں پایا جاتا یا شاید کوئی ایسی بات کہی ہے کہ وقت سوچ کے کسی ڈھانچے میں نہیں آتا۔ مجھے بس ہلکا سا خیال ہے کہ شاید کوئی ایسی ہی بات کہی گئی ہے۔ نہ جانے یہ بحث کس طور بچھائی گئی ہے اور اس کی سلوٹیں کس طرح نکالی گئی ہیں۔ اب میں نئے مغرب کی سوچ کے سوانے کی طرف چلتا ہوں۔ جانا جائے کہ یونان کی دانش کے بکھر جانے اور اسکندریہ، رہا، نصیبین اور قنسرین کی کاوش کے بسر جانے اور بغداد، قاہرہ، قرطبہ اور بخارا کی آموزش کے ٹھہر جانے پر مغرب نے وقت پر کیا سوچا۔ تو اب میں کسی ایسے نام سے بات کا سرا پکڑوں جو مجھے اچھا لگتا ہو، ہاں یعقوب بوہمے، ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ وہ وقت کو شاید کسی ایسے چشمے کا اُبال جانتا ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، وہ اسے شاید ایک ایسی الٰہی صفت مانتا ہے جس کا نہ آغاز ہے نہ درمیان اور نہ انجام۔ پرنکولس کوزانوس کا گمان یہ ہے کہ پھیلاؤ اور حرکت میں جو کچھ بھی ہے وہ نسبت[3] سے ہے اور اسے نسبت سے جُدا کر کے نہ دیکھو۔ وقت بھی ایک ایسی چیز ہے جس کا ہونا نسبت ہے۔ کوپرنیکس نے بھی حرکت کو اسی طور سمجھنا چاہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہو

---

[1]......وقت [2]......انائیت [3]......اضافیت

سکتا ہے کہ دیکھنے والا حرکت کر رہا ہو اور ہوسکتا ہے کہ دیکھا جانے والا حرکت کر رہا ہوں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں ہی حرکت کر رہے ہوں۔ اس کے نزدیک بھی نسبت کے سوا وقت کا ہونا کوئی چیز نہیں۔

برونو کی سوچ یہ ہے کہ ہم وقت کے کسی بنے بنائے پیمانے کو نہیں جان سکتے اور یہ خواہش کوئی اچھی خواہش نہیں ہے کہ حرکت کرنے والی اور حرکت نہ کرنے والی چیزوں کے درمیان کوئی ایسا فرق پایا جا سکے جس کو ہم پوری طرح جان سکیں۔ حرکت کا وجود کسی نسبت کے ساتھ ہی سمجھا جا سکتا ہے سو وقت کا وجود بھی نسبت پر ہے۔ اگر حرکت کو وقت کا پیمانہ ٹھہرایا جائے تو جتنے جُداگانہ ستارے ہیں، اتنے ہی جُداگانہ وقت بھی ہوں گے۔ اس لیے کہ ایک ستارے پر سے حرکت کو دیکھو تو وہ کچھ اور ہوگی اور دوسرے ستارے پر سے دیکھو تو کچھ اور۔ پر ہابس نے وقت کو نفس کے اعتبار میں سوچا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ دو چھوٹے چھوٹے جزوں سے مل کر ہونے میں آیا ہے۔ نیوٹن یہ بتاتا ہے کہ وقت اپنی ذات سے ہمواری کے ساتھ بہتا ہے اور اُس کا بہاو کسی باہر کی چیز کے اعتبار سے نہیں ہے اور جس وقت کو ہم دنوں کے شمار میں جانتے ہیں وہ اُس وقت کا جو حقیقت میں پایا جاتا ہے بس ایک ناپ ہے، ایک باہر کا ناپ اور نیوٹن جسے حقیقت میں وقت کہتا ہے، وہ کانٹ کے نزدیک چیزوں کو سمجھنے کی ایک صورت ہے۔ جب میں اپنی سوچ کو ساری صفتوں سے برہنہ کر لیتا ہوں تب بھی پھیلاؤ اور لگاتارپن[1] اپنی جگہ رہتے ہیں۔ وقت، پھیلاؤ کے مانند ہمارے ہر تجربے کے لیے پہلی شرط ہے اور ہر تجربے کو ان دونوں کے سانچے میں ڈھلنا پڑتا ہے اور یہ کہ وقت ہمارے اپنے اندر کے تجربے کی حالت میں ہمارے سارے جاننے اور سمجھنے کی صورت ہے۔ اب آئن اسٹائن سے کچھ جانا جائے، وہ کہتا ہے کہ وقت نسبت کے اعتبار سے آزاد اور جُدا ہو کر کوئی وجود نہیں رکھتا۔ ہر دیکھنے والے[2] کا اپنا ایک وقت ہوتا ہے جو کسی دوسرے دیکھنے والے سے جُداگانہ ہوتا ہے اور یہ کہ پھیلاؤ اور وقت ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہیں۔ کائنات کو ان دو جُدا جُدا چیزوں کے طور پر نہ دیکھو جنھیں پھیلاؤ اور وقت کہتے ہیں۔ یہ کائنات مقاموں ہی کا مجموعہ

---

[1]۔۔۔۔۔تواتر [2]۔۔۔۔۔ناظر (OBSERVER)

نہیں ہے، واقعوں کا سلسلہ بھی ہے اور کسی واقعے کے بارے میں یہ کہنا پوری بات کہنا نہیں ہے کہ وہ کہاں ہوا۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتانا ہوگا کہ وہ کب ہوا۔ مقام[1] کے لیے تین گنتیاں (لمبائی، چوڑائی اور گہرائی) چاہییں اور واقعے کو اعتبار میں لانے کے لیے تین گنتیاں تو، وہ اور "کب" کی ایک گنتی اور چاہیے۔ یہ چار گنتیاں ہوئیں۔ اس لیے یہ کائنات جو واقعوں کی کائنات ہے، چوہری[2] ہے۔ کائنات تیہری ہو یا چوہری، اس زمین پر، اس ذرّے پر ہاں کسی ریزے کے اَن گنت ریزوں میں سے اس ایک ریزے پر رینگنے اور رولا مچانے والا یہ انسان کچھ بھی سوچا کرے اور چاہے کہکشانوں کو چھلّوں کے مانند اپنی چھنگلیا میں پہن لے تب بھی کیا، ادبو نگے! سُن تب بھی کیا، یہاں تب بھی کیا، یہاں ہم پانچ انسان وقت کی ایک پل میں اندھا دھند گھسٹتے ہوئے ہانپ رہے ہیں، یہاں سے لے کر کہکشانوں کے پچھواڑے تک جو کچھ ہے وہ ہانپ رہا ہے۔ ہم مر رہے ہیں اور ہم جی رہے ہیں۔ ہم تیس برس سے لے کر ۴۱-۴۲ برس تک کی عمر کے پانچ انسان۔ اگر یہ پل ہماری بائیں طرف ایک صفر لگا دے تب؟ او! بتیس برس کے کڑیل جوان علیم بول، تب؟ بس ایک صفر اور ۳۲۰ برس، اور پھر تیرے اس سجل اور سجیلے اور سڈول بدن اور تیری ان خماری آنکھوں کا سفوف بھی نہ ملے گا، کیوں اسد، کیوں ذکا، کیوں عظیم انسان احمد الطاف، ارے یہ سب چلے گئے، پر جون ایلیا کب؟ شاید ابھی ابھی؟ ہاں ازلوں کے ازل میں۔ اور میں پل کا نشہ پیے اپنے اکیلے پن میں بیٹھا رہ گیا ہوں اور ٹھٹھرے ہوئے پھیلاؤ میں رات بہہ رہی ہے۔

عالمی ڈائجسٹ، جنوری 1974

---

[1] ..... پھیلاؤ، مکان (SPACE) [2] ۔ چار بعدی

کمائی

ہم اپنے حسابوں جنتری میں جیتے ہیں' سو یہ نیا برس ہے' نیا رَس اور جَس ہے اور جینے کی نئی ہوس ہے۔ اور ہاں یہ بھی سُنتے چلو کہ یہ عالمی کے سولھویں برس کا پہلا مہینا ہے۔ نئے برس کے اس پہلے مہینے میں جس کا آج بارھواں دن ہے' مجھے نہ جانے کیوں یہ خیال آرہا ہے کہ پرانی دوستیاں کہیں پرانی نہ پڑ جائیں اور اٹوٹ رشتے کہیں ٹوٹ نہ جائیں۔ دوستیاں اور رشتے اُن حالتوں میں سے ہیں جنھیں ہم نے اور تم نے اپنے آپ جنم دیا ہے۔ اس لیے ہمیں اور تمھیں ان کو پورے دل سے چاہنا چاہیے۔ پچھلے کتنے ہی برسوں میں تم نے بھی کچھ رشتے پائے ہیں اور کچھ دوستیاں کمائی ہیں اور میں نے بھی۔ تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم کسی بھکی ہوئی پل کے بہکاوے میں آکر انھیں گنوا بیٹھیں۔ ویسے اگر سوچو تو یہاں نہ کوئی رشتہ ہے اور نہ کوئی دوستی پر ہمیں جی جان کے ساتھ جاننا یہی چاہیے اور ماننا یہی چاہیے کہ یہ دونوں ہیں۔ ہاں ہم میں سے بہت سوں نے اپنے آپ کو اکیلا ہی پایا ہوگا۔ میں اپنے ہی بارے میں کیوں نہ بتادوں کہ پہلے میں نے جانا تھا کہ میں اکیلا نہیں ہوں اور تم میں سے بہت سوں نے بھی یہی جانا ہوگا۔ پھر مجھے سوچنا پڑا کہ میں کہیں اکیلا تو نہ رہ جاؤں گا اور ایسا سوچنے میں بڑا ہی دُکھ اُٹھانا پڑا تھا اور پھر جب میں نے یہ دیکھا کہ میں تو اکیلا رہ گیا ہوں تو میں اپنے اندر نڈھال ہو کر گر پڑا تھا۔ اور پھر میں نے سمجھ لیا کہ میں تو سدا ہی سے اکیلا تھا۔ سب ہی اکیلے ہیں۔ پھر ایسا سوچنے' ایسا دیکھنے اور ایسا سمجھنے میں انسان کے لیے کھونا ہی کھونا ہے' پانا کچھ بھی نہیں یا پھر وہ خدا ہو جائے۔ سو جینے کے لیے کچھ چیزیں مان لو کہ اُن کے مان لینے ہی میں دل کا تھوڑا بہت سُکھ ہے' نہیں تو پھر دُکھ ہی دُکھ ہے۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ سوچو تو نہ یہاں کوئی رشتہ ہے اور نہ کوئی دوستی اور ہم سب ایک انبوہ اور ازدحام کے بیچ اپنے اکیلے پن

میں گُوھ رہے ہیں۔ ہم ہی کیا خود یہ کائنات' اندھے اور اندھیرے خلا میں اکیلی ہے اور کتنی اکیلی ہے۔ پر ایک بات پر دھیان دو کہ ایک ایسی چیز جو نہ ہو پر دکھائی دے کہ وہ ہے' کیا اسے سراہنا نہیں چاہیے اور جی جان سے چاہنا نہیں چاہیے کہ بے چاری نہ ہوتے ہوئے بھی دکھائی دیتی ہے اور یہ چیز رشتہ ہے' دوستی ہے۔ اگر تم اپنے برسوں کے کسی رشتے اور دوستی کے منہ سے کبھی کوئی کڑوا بول سُنو تو اسے اس بات کی ذرا بھی چھوٹ نہ دو کہ وہ اَن گنت میٹھے بولوں کے سر چڑھ کر بولے اور انھیں جھٹلا دے۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ جن ہونٹوں نے تمھارے کانوں میں سدا مٹھاس گھولی ہے اگر ان سے کبھی ایک کڑواہٹ ٹپک پڑے تو پھر تمھیں سب کچھ کڑوا ہی کڑوا لگنے لگے۔ کیا چنچناہٹ اور چڑ چڑاہٹ کی ایک پل چاہت کی پوری زندگی کی رسمساہٹ سے بڑھ کر ہے؟ جو لوگ سماج کے بارے میں ٹکسالی سُوجھ بُوجھ رکھتے ہیں اور سارے رشتوں کو تاریخ کے پورے چوکھٹے میں دیکھتے ہیں' وہ میری یہ بے سر پیر کی باتیں سُن کر کہیں گے کہ ہم جس ڈھانچے میں رہتے ہیں' جب تک وہ نہ بدلے گا تب تک نہ دوستیاں نباہنے سے کچھ ہوگا اور نہ ان کی چتائیں دہانے سے۔ یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے پر یہ کہنے کا مطلب یہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ جو سماج کے اس ڈھانچے میں رہ کر کسی رشتے کو توڑ رہا ہے اسے بُرا نہ کہو کہ اس ڈھانچے میں تو ایسا ہی ہوگا اور جو کسی رشتے کو جوڑے ہوئے ہے' اسے اچھا نہ کہو کہ یہ ایک اکارت سی بات ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس بے ڈھنگے اور بُرے ڈھانچے میں رہتے ہوئے بھی کچھ دوستیاں اور دوست داریاں بچائی جا سکتی ہیں اور کچھ بھلائیاں رچائی جا سکتی ہیں۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ زندگی کی سموچی بھلائیاں اس ڈھانچے میں نہیں سما سکتیں اور میں اُنھی لوگوں میں ہوں جو بھلائی کے سموچے پن کو ترستے ہیں اور ایسے ہی ساتھیوں کا ساتھی ہوں جو چیزوں کو اسی کسوٹی پر کستے ہیں۔ پر اس کے ساتھ ہی میں ایک گھامڑ آدمی بھی تو ہوں۔ یہ تو پکّی بات ہے کہ سموچی بھلائی کی آنے والی ''کل'' مجھ گھامڑ آدمی کی سب سے بڑی چاہت ہے' پر بہت بُرائی اور بہت تھوڑی بھلائی کی یہ ''آج'' میرا اَلہنا اور اِس ''آج'' کا تھوڑا سا سُکھ میرا لالچ ہے۔ ہے یوں کہ میں اور تم آج بھی تھوڑا بہت سُکھ چاہتے ہیں اور ابھی میں نے یہ کہا ہی تھا کہ میں آج بھی تھوڑا بہت سُکھ

چاہتا ہوں تو میرا گھامڑ پن آپے سے باہر ہو گیا ہے اور اس نے یہ موٹی موٹی کتابیں میرے منہ پر کھینچ ماری ہیں اور میرا گریبان کھینچتے ہوئے مجھ سے کہہ رہا ہے کہ او جھوٹے 'لپاٹی' جاہل جانگلوئسن! ''جیب جنے ایک بار، ماں جنے بار بار۔ کیا یہ کہنے سے تیری جیبا گھس جائے گی کہ میں تو آج ہی سارا سکھ سمیٹ لینا چاہتا ہوں' آج ہی نہیں' اسی پل؟ کل بھلا کس نے دیکھی ہے اور دوسری پل کا کیا بھروسا''۔ پرتم اس منہ پھٹ گھامڑ پن کی بات پر کان نہ دھرو۔ اچھا یہ اُپدیشک اب جو اُپدیش مجھے دے رہا ہے' وہ یہ ہے کہ تُو زمین کے تین ساڑھے تین ارب جنوں سے تو اتنا پیار کرتا ہے اور پیار کرنا سکھاتا ہے پر جو لوگ تیرے آس پاس رہتے ہیں ان کی جان کو آیا ہوا ہے۔ اور دیکھو یہ اپدیش سُن کر مجھے اور تمھیں اپنے کتنے ہی لوگ یاد آ گئے ہیں۔ نہ جانے تمھیں کون کون یاد آ رہا ہوگا' میں اپنی رُوداد سُناؤں۔ اس گھڑی اس شہر کی دوستیوں کے سولہ برس میری پشت پر ہیں۔ میرے پڑھنے والو! جب میں اس شہر میں آیا تھا تو میرے پاس ایک بکسا تھا' جس میں کتابیں تھیں' میری شاعری کی بیاضیں تھیں' ایک گھونگریالے بالوں والی لڑکی کی ایک لٹ تھی اور ایک شیشی تھی جس میں میرے گھر کے آنگن کی مٹی تھی اور دو جوڑے کپڑے تھے اور ایک بستر اتھا اور ایک دو جوڑے کپڑے میری اکلوتی بہن خیزران نجفی نے میرے سدھارتے وقت اپنے پاس رکھ لیے تھے کہ جب میں بہت یاد آیا کروں تو وہ اُنہیں سونگھ لیا کرے۔ اور یہاں میرے تین بڑے بھائی رہتے تھے' اُن میں سے رئیس امروہوی اور سیّد محمد تقی نے میرے پردیسی پن کی دھجیوں کو سیا اور میری گم نامی کو اُن کے نام کی سفارش نے بہت کچھ دیا۔ اور میرا تیسرا بھائی محمد عباس جسے زمانے نے کوئی سہارا نہیں دیا تھا' میرا سب سے بڑا سہارا بنا اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ مجھے اب بھی پال رہا ہے۔ اگر مجھ سے کسی بڑے انسان کا نام پوچھا جائے جسے میں نے پاس سے دیکھا ہو' کسی بڑے آدمی کا نام نہیں' تو میں سب سے پہلے اپنے اس بھائی کا نام لوں گا۔ یہ وہ دن تھے جب اس شہر میں میرے بس چار ہی یار تھے۔ ایک میرا بھانجا ثمن (ممتاز سعید) جس کی دانش اور نو خیز ہمہ دانی نے میری بُدبُدھا کو سکھایا اور میری دانستا کلکل کو سدھایا اور جب بھی میں رویا تو اس یار بھانجے نے اپنے ماموں کے آنسوؤں کو سکھایا۔ دوسرا انقی اختر جس کے چھا جانے

والے لہجے کی ہر بات بڑھ چڑھ کے ہوتی تھی' اس نے مجھے آگے بڑھایا۔ تیسرا رسیلی آنکھوں والا سبط اختر' اُس زمانے کا نمودار افسانہ نگار نوجوان' جو میری ہی طرح جھینپو تھا پر اس جھینپو پن ہی میں میری طرز ارتجی بھتیجی دردانہ ہاشمی سے عشق لڑا کر شادی تک کر بھاگا اور یہی ہُنر شمن نے بھی دکھایا اور میری بھتیجی شایستہ سے بیاہ رچایا اور پھر ایک چوتھا نوجوان آ کر میرے سینے سے لگ گیا جس کی نوجوانی آدھی آدھی رات تک چراغ کے سامنے کتاب کھولے ہوئے اس کی مدھم لَو سے اپنے چشمے کا نمبر پوچھا کرتی تھی اور اس کی کتابیں وہ مہکتے ہوئے ''پھول پنکھڑی'' پرچے' چھپائے رکھتی تھیں جو مخروطی اُنگلیوں والے حنائی ہاتھوں سے یہاں میرے نام لکھے جانے لگے تھے۔ پھر اُس زمانے کے طرح دار شاعر اور عشوہ کار نوجوان حسن عابد سے میری دوستی ہوئی' وہ سر بہ سر اودھ کی طناز شوریدہ سری تھا۔ پھر ذہانت کی بے قرار نوجوانی راحت سعید اس جسم و جاں کے حلقے میں آیا' وہ مجھ سے بھی کچھ زیادہ ہی خبیث نکلا' کیسے پاگل اور فالتو نوجوان تھے' جو رات بھر ایک ساتھ جاگ کر آنکھوں سے خوابوں اور اندھیروں سے روشنیوں کا حساب لیا کرتے تھے اور دنوں کی سنگینی سے ٹکرا جانا چاہتے تھے۔ کتنے کام کا تھا وہ فالتو پن بھی۔ پر اب ان میں سے کچھ بقراط اور بزرجمہر بہت کام کے آدمی ہو گئے ہیں' اب دوستی کے فالتو پن کے لیے ان کے پاس ایک لمحہ بھی نہیں ہے۔ پھر مجھے ذہین ترین آنکھوں والا ایک نوخیز سخن ور دکھائی دیا' جس کی ہر بات اِک مقام سے تھی۔ یہ انور خلیل تھا جو اپنے لباس سے زیادہ اپنی تہذیب کا خیال رکھتا تھا۔ اسی یار جانی نے مجھے اس بلائے جاں سے ملوایا تھا جس کا نام علیم ہے۔ اے خدا! انور خلیل کو اس کی سزا بھی دینا اور جزا بھی۔ اس بلائے جاں کے بارے میں بھلا کیا کہوں کہ یہ میرا زرہ بکتر بھی ہے اور ہتھیار بھی۔ اور ایک دن ایک شخصِ پُر آشوب شفیع عقیل سے ملنے کی نوبت پہنچی۔ مجھے اس شہر میں شہرت یافتہ نوجوان لکھنے والوں کے بیچ اُس کے سوا ایسا کوئی نفر نہ ملا تھا جس نے شاہ نامہ تو شاہ نامہ' آمد نامہ بھی پڑھا ہو۔ یہ ان میں سے تھا جن کی ہمت افزائی نے مجھ گُم نام کی غزلوں کو لاکھوں پڑھنے والوں تک پہنچایا اور اسی نے مجھے بانکی غزلوں کے سرو قامت شاعر اطہر نفیس سے ملایا۔ ہمیں ایک دوسرے سے ایک ہی شکایت رہی کہ ہم برسوں ایک

دوسرے سے نہیں ملتے پھر اسد محمد خاں کے سدا رسیلے سبھاؤ کی آواز سنی تو یوں لگا جیسے دوستی نے کانوں میں امرت گھول دیا ہو۔ اور یہاں میں اس شرمیلے نورس شاعر کو کیسے یاد نہ کروں جس کی اور میری دوستی نے بد بخت حالات کی زبان سے دشمنی کا نام پاکر بھی، کبھی ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کے ادب اور احترام کا دامن نہیں چھوڑا۔ یہ سحر انصاری تھا' اب کیا بتاؤں کہ ایک اور لڑکا بھی تھا۔ بہت شان دار اُداس اور عجب بُردبار۔ میں نے اسے اپنے گھر یا دفتر میں بیٹھا دیکھا اور پھر کچھ دن گزر جانے کے بعد سے لے کر بارہ سال تک ہم رات دن ایک ہی ساتھ دیکھے گئے۔ یہ شکیل جمال تھا' کہانیاں لکھتا تھا اور لکھ کر رکھ لیتا تھا۔ اور ایک دن میں نے اس سے کہا تھا' آج سے تم شکیل جمال نہیں' شکیل عادل زادہ ہو' شکیل جمال کہانیاں لکھتا تھا اور شکیل عادل زادہ اب ہمارے لیے ایک کہانی بن کر رہ گیا ہے۔ اور جب بہت دن گزر گئے تو مجھے عجب کچھ ملا جو دنیا میں بس میرے ہی لیے تھا۔ میرا وجود جاڑے سے کانپ رہا تھا اور وہ ایک آگ تھی' نہیں وہ ایک آواز تھی جس کی گرم جوشی پہلے سُنائی دی اور پھر دکھائی دی' وہ زاہدہ حنا تھی۔ اُس حنا نے مجھے خون تھکوایا' پر خون تھوکنے اور خون تھکوانے کی وہ فصلِ رنگ نہ آتی تو میری زندگی خزاں ہی رہتی۔ اور اب سے کچھ برس پہلے ایک جوان سے میرا سامنا ہوا' جس کی نشیلی آنکھیں تو محبوبوں کی سی تھیں اور نگاہیں عاشقوں کی سی۔ یاد آیا کہ اس نے تو کبھی میرے ساتھ علی گڑھ اور مظفر نگر میں مشاعرے پڑھے تھے۔ وہ عالم تاب تشنہ تھا جو یہاں بس ایک افسر ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا ''او سماج کے کماؤ پوت! پھر سے کچھ نکما پن کما'' اور میری اس چوٹ نے اسے پھر سے ایک بانکا شاعر بنا کر چھوڑا۔ اور اب وہ دوستی اور شاعری کو پوری وارفتگی کے ساتھ کمال کے رنگ دے رہا ہے۔ آخر میں کمینوں کا کمینہ ذکاء الرحمٰن مجھ سے ٹکرایا' جو کاش پہلے ہی ٹکرا گیا ہوتا۔ یہ دوستی کے لیے زخم بھی ہے اور مرہم بھی۔ اب میں بس دو نام اور لوں گا' قمر رضی اور طہیر نفسی۔ یہ ان میں سے ہیں جن سے مجھے کبھی ایک بار بھی یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی کہ تم میرے لیے کیا ہو اور کیا کچھ ہو۔ پر ان دونوں کی دوستی تو میری ہندوستان کی پونجی ہے۔ اور یہ تھی میرے یہاں کے سولہ برس تک کی کمائی جس میں سے اس وقت سراپا دل اور سراپا

دماغ احمد الطاف میرے پاس موجود بھی ہیں، اور جو میرے اعتماد کی جیب میں دوستی اور دوست داری کی نقدی ہیں...... لوگو! میری طرح تم نے بھی دوستی کی کمائی میں سے بہت کچھ گنوادیا ہوگا، پر دیکھو جو کچھ رہ گیا ہے، کہیں وہ بھی نہ گنوا بیٹھنا۔ ہم لوگوں میں بڑے جھگڑے ہوئے ہیں، ہم نے ایک دوسرے کی غیبتیں کی ہیں اور مجھے تو ایک دوست سے دوسرے دوست کی غیبت کرنے میں بڑا مزہ آتا ہے اور کبھی کبھی تو ایسا ہوا ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کا نام تک اپنے دل کے صفحے پر سے چھیل کر پھینک دیا ہے اور لڑ کر ہمیشہ کے لیے جُدا ہو گئے ہیں اور پھر جو دیکھا تو لوٹے چلے آ رہے ہیں۔ اور آتے ہی ایک دوسرے کو لپٹا لیا ہے۔ دوستی زندگی کے اکیلے پن کی بیزاری میں ایک انوکھا نشہ ہے۔ اس نشے میں رنگ بھی ہے اور رنگ میں بھنگ بھی۔ اس نشے میں رہو بھی اور اسے سہو بھی۔ تو میرے پڑھنے والو! جو لوگ رشتوں اور دوستیوں میں زندہ رہنا چاہتے ہیں، وہ چاہے کبھی کبھی ایک دوسرے کو اپنے لفظوں کی کاٹ سے خون میں نہلا دیں اور اپنے ہونٹوں کی کڑواہٹ سے ایک دوسرے کو زہر پلا دیں پر کسی ایک کٹھور لمحے کی اس کاٹ، اس کڑواہٹ کو بس ایک بے بات کی بات جانیں کہ دوستی تو سو بات کی ایک بات ہے۔ بتاؤ کیا دل شکنی کے ایک لمحے میں اتنا بوتا ہے کہ وہ دل داری کی ایک پوری زندگی کو چکنا چور کر ڈالے، پھر یہ دیکھ کر دل خون ہو جاتا ہے کہ ہے کچھ ایسا ہی۔ پر کوئی مجھے بتاؤ کہ ایسا کیوں ہے۔ ایسا کیوں ہونے دیا جاتا ہے؟ یہاں یوں ہی ایک بات سُنانے کو جی چاہ رہا ہے۔ ایک بار میرے دادا نے، اپنے دوستوں اور دوستی کا دعویٰ کرنے والوں سے کہا تھا کہ میرا دوست وہ ہے جو میرے دوست کا دوست اور میرے دشمن کا دشمن ہو۔ اور وہ میرا دشمن ہے جو میرے دوست کا دشمن اور میرے دشمن کا دوست ہو۔ میرے ان دادا کا نام علیؓ ابنِ ابی طالب تھا۔ ہاں دوستی کی سچّی کسوٹی یہی ہے۔ پر افسوس کہ اگر ہر دوست کو اس کسوٹی پر کسا جائے تو پھر چار پانچ کے سوا دائیں بائیں دشمن ہی دشمن دکھائی دیں گے۔ سو بھائی یہاں تو اس آدمی پر بھی دوست ہونے کا گمان کرو جو تمھارے سامنے خنجر تانے کھڑا ہوا اور اس نے وہ خنجر ابھی تمھارے سینے میں گھونپ نہ دیا ہو۔

عالمی ڈائجسٹ، فروری 1974

کارنامہ

پچھلے مہینے میں نے بتانا چاہا تھا کہ زندگی کے اکیلے پن میں دوستی کتنا بڑا سہارا اور دوست کتنا بڑا آسرا ہیں اور میں نے اپنے کچھ دوستوں کے نام بھی گنائے تھے، پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ان میں سے ایک کا نام بھی چھپنے سے رہ گیا اور اس کے بارے میں کچھ سطریں بھی نہ چھپ سکیں۔ میں نے لکھا تھا ''پھر ایک چوتھا نوجوان میرے سینے سے آ کر لگ گیا جس کی نوجوانی آدھی آدھی رات تک چراغ کے سامنے کتاب کھولے اس کی لَو سے اپنے چشمے کے نمبر پوچھا کرتی تھی اور اس کی کتابیں وہ مہکتے ہوئے ''پھول پنکھڑی پرچے'' چھپائے رکھتی تھیں، جو مخروطی اُنگلیوں والے حنائی ہاتھوں سے یہاں میرے نام لکھے جانے لگے تھے''۔ میں نے اس سے آگے جو لکھا تھا وہ نہ جانے کیسے غائب ہو گیا۔ بہت سے پڑھنے والے یہ سمجھے کہ میں نے اُس نوجوان کا نام جان کر چھپایا ہے کہ کہیں کوئی کھوجی اس کا پتا پوچھتا ہوا اُن پھول پنکھڑی پرچوں کے رنگ اور خوش بُو کے بھیدوں کو نہ پالے۔ تو بھائیو! ایسا نہیں ہے؛ اپنے بھیدوں کو فن کی زبان دینا ہی تو ہم لکھنے والوں کا فن ہے۔ میں ایک چھوٹا موٹا شاعر ہوں اور حسینوں کو چاہنا اور خود چاہا جانا یا چاہے جانے کی ہوس رکھنا میرا روزگار اور میرا روزینہ ہے، اور جو بڑے شاعر یا ادیب ہوتے ہیں، ان کے تو حسینوں پر بڑے حق ہیں کہ ان کی ایک نگاہ حُسن کو حُسن کے سو رنگ دیتی ہے۔ تو بھلا میں اپنے کسی رازدار کا نام کیوں چھپاتا۔ سو جو کچھ چھپنے سے رہ گیا تھا، وہ یہ تھا ''وہ محمد علی تھا، میرا یار بھائی جس نے فن کے کئی شعبوں پر لکھنا شروع کر دیا تھا اور جو اب اُردو اور انگریزی کا ایک صاحبِ علم ادیب ہے۔ وہ اپنی مرنجاں مرنج طبیعت میں گلاب جامن ہے جو نہ منہ کو بے مزہ کرتی ہے اور نہ دانتوں کو کھٹا اور میں اپنی روز روز کی شکر رنجی میں جامن ہوں۔ جس کی مٹھاس میں بھی کھٹاس ہوتی

ہے اور جو کبھی کبھی تو دانت کھٹے کر دیتی ہے۔ اس پر بھی یہ گلاب جامن اور یہ جامن دونوں سولہ برس سے ایک ہیں۔ میری اپنی ہی کھٹاس نے جانے کتنی ہی بار اسے مجھ سے بے مزہ کرنا چاہا ہوگا پر وہ بے مزہ نہ ہوسکا بھلا کوئی اور تو اسے مجھ سے کیا بے مزہ کر سکتا"۔ تو بھائیو! وہ محمد علی صدیقی تھا۔

محمد اور علی اور صدیقی سے میرا خیال کہیں سے کہیں جا پہنچا ہے اور تاریخ کے کئی نام میرے دھیان میں آ رہے ہیں۔ عبدالمطلب، ہاشم، عبد مناف اور قُصی جن کے لیے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ انھیں کو قریش[1] کہہ کر پکارا گیا اور ایک شاعر نے ان کے لیے یہ شعر کہا:

قُصیٌّ ابو کم من یسمّیٰ مجمعًا

بہٖ جمع اللّٰہ القبائل من فھر

"تمھارا باپ قُصی جسے "جمع کرنے والا" کہہ کر پکارا گیا، اُسی کے ہاتھوں خدا نے فہر کے قبیلوں کو جمع کیا تھا"۔

کچھ لوگوں نے بتایا ہے کہ قُصی کے ایک دادا فہر کو قریش کہا گیا۔ مسلمانوں کی خلافت اور امامت کا شجرہ فہر تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک خون اور ایک خاندان میں مل جاتا ہے۔ فہر کے نام کے ساتھ مجھے مالک کا نام یاد آیا۔ اور پھر ان کے باپ نضر کا۔ کچھ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ قریش، نضر کا لقب تھا اور سُنو کہ "قریش" نے کسی اور کا بُرا چاہنے کے لیے اپنے قبیلوں کو اکٹھا نہیں کیا تھا، بس ان سب کی بھلائی چاہی تھی جو بکھرے ہوئے تھے اور انھیں سمیٹا تھا۔ وہ جوڑنے والے تھے، توڑنے والے نہ تھے۔ ان ناموں کے ساتھ بھلا حجاز کا نام کیسے یاد نہ آئے گا اور اس کے ساتھ ہی میرا دھیان حجاز کی چودہ سو برس پہلے کی تاریخ کے سب سے پہلے اور پھر اُن کے پیچھے آنے والے اور پھر ان پیچھے آنے والوں کے پیچھے آنے والے اُمتیوں کی طرف چلا گیا ہے۔ اُن میں عرب والے بھی ہیں اور عرب سے باہر والے بھی، جو ملکوں ملکوں پھیلے ہوئے ہیں اور بہت سے ملکوں کے مالک ہیں۔ اور وہ جن ملکوں کے مالک ہیں، ان دنوں اُن ملکوں کے سربراہ اور نمایندے پاکستان آنے والے اور لاہور میں سر جوڑ کر

---

[1] قریش: اِدھر اُدھر سے اکٹھا کر کے باہم ملانے والے کو کہتے ہیں اور ایک قسم کی بڑی مچھلی کو بھی جو ساری مچھلیوں پر غلبہ رکھتی ہے، شارک مچھلی۔

بیٹھنے والے ہیں۔ دیکھو پھر بات پر بات چلی۔ پاکستان نے ان سب کو اپنی سرزمین میں اس طرح اکٹھا کرنا اور آپس میں ملانا چاہا ہے، جس طرح ''قریش'' نے قبیلوں کو اکٹھا کیا تھا۔ جو بات ہمیں اور تمھیں بہت اچھی لگنی چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ یہ لوگ وقت کی کسی بُرائی کو بڑھاوا دینے اور کسی بھلائی کی بڑھوار مارنے کے لیے جمع نہیں ہو رہے ہیں۔ انھیں تو آپس میں بیٹھ کر مصلحت ٹھہرانی ہے اور اپنی بھلائی کا راستہ پکڑنا ہے، کسی کے بُرے بھلے میں نہیں پڑنا ہے۔ ہے یوں کہ دنیا سے ان کے معاملے چکے نہیں ہیں اور انھیں اپنے چلتے ان معاملوں کو چُکانا ہے اور جو گتھیاں پڑی ہوئی ہیں، انھیں سُلجھانا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ وہ ان معاملوں کو کس ڈھب سے چُکاتے ہیں اور ان گتھیوں کو کس ڈھنگ سے سُلجھاتے ہیں۔

اگر یہ لوگ ایشیا اور افریقہ میں بسنے والے انسانوں کے ایک بہت بڑے گروہ کی کچھ اُلجھنوں، اُلجھیڑوں اور اُلجھاووں کو دُور کر سکیں تو اس سے پورے ایشیا اور افریقہ ہی کی سیاست کو بہت سے بکھیڑوں سے چھٹکارا نہیں ملے گا، دنیا کی جھنجٹیا اور جھمیلیا سیاست بھی بہت سے جھنجٹوں اور جھمیلوں سے فرصت پائے گی اور یہ ایک بہت اچھی بات ہوگی، کہنا چاہیے کہ یہ سب ہی کے لیے ایک بہت اچھی بات ہوگی۔

جس چیز کو دنیا نے سیاست ٹھہرایا ہے نہ تو میں اسے سمجھنے کی سکت رکھتا ہوں اور نہ سمجھنا چاہتا ہوں۔ پر ایک بات سُنو! میں ہوں یا تم یا انسانوں کے چھوٹے بڑے گروہ اور قومیں۔ جینا ہے تو بھلمنساہٹ کے ساتھ اپنا بھلا چاہا جائے اور کم سے کم دوسروں کا بُرا نہ چاہا جائے۔ اور پاکستان اسی طور سوچ رہا ہے اور جو لوگ آ رہے ہیں وہ بھی اسی طور سوچتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ایسا ہے کہ بانٹنے والوں نے دنیا کو جتھوں میں بانٹ دیا ہے اور ان میں سے ہر جتھے کا کوئی ایک سرغنہ ہے۔ اس سے کیا ہوا ہے۔ یہ ہوا ہے کہ سرغنہ ملکوں کو چھوڑ کر جتنے بھی ملک ہیں ان کی آزادی اور سلامتی سے کسی وقت بھی ٹھٹولیاں کی جا سکتی ہیں خود ایک ہی جتھے کے کسی ملک اور اس کے سرغنہ ملک کے بیچ اگر کوئی بات آ پڑے تو کوئی دہائی نہیں اور کوئی شنوائی نہیں، اس لیے کہ ٹھیٹرے ٹھیٹرے بدلائی نہیں۔ ہمارے زمانے کی ساری سیاست

چودھریوں کی چودھرات ہو کر رہ گئی ہے۔ اگر سوچو تو چھوٹی اور کم زور قومیں کسی زمانے میں بھی اتنی بے بس نہیں رہیں جتنی آج ہیں اور یہ زور بل اور زور ازوری کی سیاست کے ہاتھوں انسانیت کا بے بس ہونا ہے۔ اب یہ نہیں چاہا جاتا کہ اگر ہماری بات ٹھیک ہے تو اسے ٹھیک مانو، نہیں' اب تو یہ جتلایا جاتا ہے کہ اگر ہماری نہ مانو گے تو ہم تمھیں ٹھیک کر دیں گے۔ مکھیا ملکوں کے یہ لچھن انھیں کچھ سجتے نہیں ہیں۔ ان کے زور بل کو سارے انسانوں کا زور بل ہونا چاہیے۔ پر اَب تو کبھی کبھی یہ جی چاہتا ہے کہ انسانوں میں کوئی زور بل ہونا ہی نہیں چاہیے کہ یہ چیز انسانیت کو راس نہیں آئی۔ ہم برسوں سے کیا دیکھتے چلے آ رہے ہیں؟ کم زور قوموں سے پالتو تیتروں اور بٹیروں کی طرح مزہ لیا جا رہا ہے۔ اِس کو اُس سے بھڑا دیا' اُس کو اِس سے لڑوا دیا۔ آسمانوں میں جھنڈے گاڑنے والی طاقت وروں نے زمین پر وہ کرتوت دکھائے ہیں کہ انسان زمین میں گڑ جائے۔

سو کم زور قوموں کو اب سوچنا پڑ رہا ہے۔ ان میں اتنی سکت تو ہونا ہی چاہیے کہ وہ اپنے بل بوتے پر جی سکیں اور ان سے کھلونوں کی طرح نہ کھیلا جا سکے۔ اگر ایسا ہو سکے تو کتنا اچھا ہو۔ سو ایشیا اور افریقہ کے جن ملکوں کے درمیان کئی رشتے پائے جاتے ہیں' اس زمانے میں اُن کا ایک دوسرے سے اپنے دُکھ درد کہنے سُننے کے لیے مل بیٹھنے کی تیاری کرنا وقت کی ایک خبر نہیں' ایک خوش خبری ہے۔ ایشیا اور فریقہ کے جو ملک اس بیٹھک سے باہر رہیں گے انھیں بھی یہی چاہنا چاہیے کہ ان کے بہت سے ہم وطنوں کی یہ آپس کی سوچ بچار سُوارت ہو اور مغرب میں سیاست کے جو بھلے مانس لوگ رہتے ہیں ان سے بھی یہی اُمید رکھی جائے گی کہ وہ اس کا اکارت جانا نہ چاہیں۔ اور میں یہاں ایک اور بات بھی کہہ دوں' میرا اندازہ یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے بیچ جو اُلجھنیں پائی جاتی ہیں وہ اس کے نتیجے میں سُلجھ جائیں گی اور جو دُوریاں ہیں' وہ دُور ہو جائیں گی۔ اس لیے کہ یہ سب ہی ملک اپنے اپنے طور پر ان دونوں کے درمیان دوستی چاہتے ہیں' دشمنی نہیں۔

اس مل بیٹھنے کا جو سب سے اچھا پہلو ہے وہ یہ ہے کہ اس کے بل پر یا اس کے بہانے کوئی ایک ملک دوسرے ملکوں کو اپنے ساتھ ملا کر نہ مکھیا بننے کے خواب دیکھ رہا ہے اور نہ بہت

سے گروہوں کا سرگروہ اور سرغنہ بن کر دنیا کی ایک اور بڑی طاقت بننے کی ہوس رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو اس زمانے کی ڈنگئی' دھاندل باز اور دھین دھوکڑ سیاست کے مزاج سے کوئی لگا نہیں کھاتی۔ اور اس بات کو پوری طرح سراہا جانا چاہیے۔ پاکستان اس بارے میں جو یادر کھی جانے والی کوششیں کر رہا ہے وہ اُسے اپنے پرائے سب کے سامنے سرخ رُو کردیں گی۔ آج یہ پاکستان کا ایک کام ہے جو اگر پورا ہو گیا تو کل یہ ایک کارنامہ ہوگا اور اپنے جذبے میں یہ کام اپنی جگہ خود بھی ایک کارنامہ ہے۔ مسلمان ملکوں کے سربراہوں اور نمایندوں کے ایک جگہ جمع ہونے اور سر جوڑ کر بیٹھنے سے دنیا کے اشراف نے جو اُمیدیں رکھی ہیں اگر اُن میں سے آدھی بھی پوری ہو گئیں تو یہ بڑی خوشی کی بات ہوگی۔ تاریخ کے کچھ دُکھ ہیں جو اپنے دُکھ دُور کرنا چاہتے ہیں' کون ہے جسے یہ بات سُن کر کچھ نہ کچھ سُکھ نہ ملے گا۔

عالمی ڈائجسٹ' مارچ 1974

سفرانہ

کبھی کبھی کسی گردوپیش میں سادے ورق لکھنے والے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں اوران کی پیاس بجھائے نہیں بجھتی۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ شام ہوئی اور سادے ورق پھیل گئے کہ ہمیں اپنے جگر کا وہ خون پلاؤ جسے شاعری کہتے ہیں اور ساری ساری رات اپنا جی جلاؤ۔ ایک نہ دو پورے پانچ مہینے تک بلا ناغہ یہی ہوتا رہا۔ میاں، میں تو پیلا پڑ گیا۔ سوچا کہ اس گردوپیش سے بھاگ کر کہیں چلا جاؤں۔ ایک دن سُنا کہ میں پنجاب جانے والی ہوں۔ میں یوں ہی بول پڑا کہ جانے والے بہت اچھے ہوتے ہیں، ساتھ خیریت کے جاؤ اور ساتھ خیریت کے آؤ۔ اور پھر سادے ورقوں کی پیاس بجھانے میں لگ گیا۔ پھر ایک دن سُنا کہ میں جارہی ہوں۔ یہ زاہدہ حنا تھیں جو پنجاب سدھار رہی تھیں۔ اچانک مجھے ہوش آیا اور میں نے اپنے آپ سے کہا، اس موقع کو غنیمت جان اور تُو بھی لگ چل۔ شاید جگہ بدلنے سے یہ سلسلہ ٹوٹے اور تُو کچھ دن کے لیے اس جنجال سے چھوٹے۔ سو میں نے اپنے آپ کو اِدھر اُدھر سے سمیٹ کر اپنے کھانچے میں ڈالا اور اپنے نڈھال پن کو اپنے ڈھانچے پر سنبھالا اور کچھ کتابیں ہاتھ میں لے کر پنجاب کی طرف چل نکلا۔ راستے میں اُس کتاب کو نمٹایا جو میں نے سیّد قاسم محمود سے پڑھنے کو منگوائی تھی۔ اس کتاب کو سید قاسم محمود ہی نے اُردو میں ڈھالا ہے۔ ''قدیم تہذیب اور جدید انسان۔'' یہ تھا اس کتاب کا نام۔ کتاب میں امریکا کے کچھ قبیلوں کی زندگی کو پڑھا گیا ہے۔ ہر قبیلے کی اپنی نیکی ہے اور اپنی بدی۔ ان میں سے کوئی بھی اِس اُلجھن میں نہیں پڑتا کہ جو چیز اس کے تئیں اچھی ہے اُسے دوسرے بھی اچھا سمجھیں اور جسے وہ بُرا جانتے ہیں اور اُسے دوسرے بھی بُرا جانیں۔ اُن میں سے کسی کو اپنی نیکیاں پھیلانے کی بیماری نہیں ہے۔ تم جانو میں ایک باؤلا

بھڑ نگ' میں تو بچل گیا اور اپنے آپ سے کہنے لگا۔ کیوں جی! یہ جو تمھارے کتابوں اور کارخانوں کے شہر ہیں ان میں رہنے والوں کے رنگ ڈھنگ تو کچھ اور ہیں۔ شائستگی کی پوشاک پہن لینے والوں میں سے جس گروہ کو بھی روٹیاں لگ گئی ہیں ان کے طور تیور تو کچھ عجیب ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ عرفان اور گیان کے پہاڑوں پر سے اُتر کر بستیوں کی طرف آرہے ہوں اور یہ خوش خبری سُنا رہے ہوں کہ ہم نے سچائی کو جالیا اور ہم نے پالیا۔ سو جو بھی ہمیں پہچانے گا اور ہمارا کہا مانے گا اس کے سارے دلدّر دُور ہو جائیں گے۔ ایک زمانے سے یہی کچھ دیکھنے میں آرہا ہے۔ کس کس کو نہیں پہچانا گیا اور کس کس کا کہا نہیں مانا گیا۔ پر ہوا کیا؟ یہ کہ انسان اپنی پہچان اور اپنا مان بھی کھو بیٹھا اور وہ گروہوں میں بٹ کر جُدا جُدا ناموں سے پکارا گیا اور جو اُسے انسان کہہ کر پکارنا چاہتے تھے انھیں دھتکارا گیا۔ میں اس پر اپنے آپ سے بولا کہ ایسا تو ہونا تھا اور سُن! ایک بات اور بھی سوچ، وہ یہ کہ یہ بے روک زمین جو ساری کی ساری انسانوں کے تلووں کے نیچے بچھی تھی کیسے اور کیوں کر اور تاریخ کی کس اٹ سٹ سے اٹک اور تھٹک کے سوانوں اور سرحدوں میں بٹ کر رہ گئی۔ یہ سُنا تو میں اِدھر اُدھر کے لوگوں کو دیکھ کر اپنے اندر چیخنے لگا کہ او دوٹانگوں پر چلنے والو! تم سے بڑھ کر تو وہ بجّو مجھے بھاتے ہیں جو تمھارے سوانوں کے آر پار اپنے بھٹ بناتے ہیں اور تم سے زیادہ تو چیلیں میری چہیتی ہیں جو تمھارے سروں پر بیٹ کرتی ہوئی تمھاری کھینچی ہوئی سرحدیں پار کر جاتی ہیں۔ میں چیخ ہی رہا تھا کہ میری کھوپڑی میں سے کسی نے غنغنا کر مجھے ڈپٹا کہ او بجّبک! سارے انسانوں کے سگے! اب چُپ بھی ہوگا یا بکے ہی چلا جائے گا۔ بہت اچھی باتیں کہیں، واہ وا۔ پر ایک بات تو بتا، اگر تیرے چاہے سے پورب والے اپنی باڑھ ہٹادیں اور اپنے سوانے مٹادیں تو کیا پچھم والے بھی ایسا ہی کریں گے اور اگر اُتر والے اپنی سرحدیں لپیٹ کر اپنی جیب میں ڈال لیں تو کیا دکن والے بھی ان کا ساتھ دیں گے؟ اگر نہیں تو بکواس بند کر۔ بڑا آیا تاریخ کے کان اینٹھنے اور جغرافیے کے کان نکالنے والا۔ میں نے یہ سُنا اور اپنی کھوپڑی اُتار کر اُسے کھولا اور دیکھا تو اس میں ایک غنغنا بالشتیا اپنے ہاتھ میں جریب لیے اکڑوں بیٹھا ہے۔ میں نے پوچھا' میاں تُو کون ہے؟ وہ اپنی آنکھوں کے ڈھیلے گھماتے

ہوئے بولا۔ میں تاریخ کے محکمۂ بندوبست کا کارندہ ہوں۔ میں نے اس کے کانوں میں قو کر کے سُنی اَن سُنی کر دی اور اپنی کھوپڑی کو اس کی جگہ پر دے مارا اور سر کھجاتے ہوئے جی ہی جی میں کہنے لگا کہ ہونا تو وہی چاہیے جو میرا جی کہتا ہے۔ اب میرے ٹھینگے سے کہ کوئی بات ہونی ہے یا اَن ہونی۔

پنجاب کو کئی برس سے میں دیکھ رہا ہوں۔ یہاں کی زمین کیسی ہریالی پہنے ہوئے ہے۔ یہ ہریالی اس زمین کے ان تھک بیٹوں کے پسینے کا ہنر ہے۔ میں سوچتا ہوں اور ہنستا ہوں کہ پنجاب کے اس ہنر مند پسینے کو بھی گالیاں دی جاتی رہی ہیں۔ گالیاں ہی دینی ہیں تو اُن حرام خوروں کو دی جائیں جو دوسروں کی کمائی کھاتے ہیں۔ ہاں تو سندھ کی سرزمین کو ہم اپنے پسینے کی بُنی ہوئی ہریالی پہنائیں تو کیسا لگے؟ اب ہم ہیں، لاہور ہے اور مرزا مرتضیٰ بیگ کا پیار بھرا گھرانا۔ یہ انجینئر ہیں اور سچے شاعروں کی طرح سوچتے ہیں۔ ان کے خیال میں سب سے بڑا رشتہ اس پہچان کا رشتہ ہے جو انسان اور انسان کے بیچ پائی جاتی ہے جو اس پہچان کا پاس کرے گا وہی بخشا جائے گا۔ ایسے لوگوں سے مل کر خیال آتا ہے کہ کتنے ہی پڑھے لکھے ہیں جنھیں لکھنا چاہیے اور لکھتے نہیں اور کتنے ہی لکھنے والے ہیں جنھیں پڑھنا چاہیے اور پڑھتے نہیں پر علم بگھارتے ہیں۔ علم بگھارنے پر ایک بات یاد آئی۔ کیا تم یقین کرو گے کہ ایک شورہ پشت لکھنے والے کو دیکھا جو اپنے علم کے باوجود جہالت بگھارتا ہے۔ اس کی ایک انوکھی خواہش یہ ہے کہ مجھے یک سر جاہل سمجھا جائے جب کہ کتابوں کے سوا اس نے زندگی میں کچھ نہیں سمیٹا۔ یہ مَلامتیہ فرقے کا قلندر شفیع عقیل ہے جو پنجابی ہونے کے باوجود کھانا کم اور گالیاں زیادہ کھاتا ہے۔ اس کا نعرہ ہے کہ ہر عالم پیدائشی جاہل ہے۔ میں کیا کہہ رہا تھا؟ ہاں میں مرزا مرتضیٰ بیگ کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ ان کی باتیں سُن کر مجھے پھر بلبلا اُٹھا ہے کہ یہاں جس سے ملوں اس سے انسان کے رشتے پر بات کروں اور اُسی سے لگا کھاتی ہوئی باتیں چھیڑوں۔ میں سیّد قاسم محمود سے ملتا ہوں۔ یہ جوان دانش کے جس گھاٹ پر پہنچا وہاں سے اپنی پیاس بجھائے بن نہ ٹلا اور بینش کے جس باٹ پر گیا اُس پر دُور تک چلا۔ یہ نمکین سیّد اس بات پر بہت بدمزہ ہے کہ ہمارے زیادہ تر ادیب اور شاعر سچ کے

اشتہاری اور جھوٹ کے بیوپاری ہیں اور یہ ہمارا سب سے بڑا گھاٹا ہے۔ اس جوان کی بدمزگی پر میرا جی بہت خوش ہوا ہے اور میں ترنگ میں آ کر کراچی کی یادگار عبدالعزیز خالد کی طرف چل نکلا ہوں۔ بھلا میں ان لوگوں کی باتیں کیوں نہ کروں جنھوں نے مجھ سے بڑی اچھی اور سچّی باتیں کیں۔ میں ان کے نام کیوں نہ لوں جو اپنے اپنے طور سے دانش، دل اور زندگی کی دل بری کے نام لیوا ہیں۔ سُومیاں لکھنے والے ان لوگوں کے نام لینے میں کنجوسی نہ برتا کرو جو حُسن اور حکمت اور حلاوت کو بڑھاوا دینے والے ہوں چاہے ان کے ناموں کا دُور دُور شہرہ ہو چاہے وہ گم نام ہوں اس لیے کہ ایسے لوگوں کے ناموں سے خود حکمت اور حُسن اور حلاوت کو بڑھاوا ملتا ہے۔ بھلا میں مظفر کاظمی کا نام کیوں نہ لوں جو لاہور کا ایک نوجوان لکھنے والا ہے اور چاہتا ہے کہ سچ کا سامنا کیا جائے اور دردمند بزرگوں کی سی باتیں کرتا ہے۔ اور میں جواں سال شاعر اور ادیب نسیم سحر کا نام کیسے یاد نہ کروں جو مجھے پنڈی میں ملے گا اور کہے گا کہ انسان دوستی لکھنے والوں کی سب سے بڑی پونجی ہے۔ عبدالعزیز خالد میرے سامنے ہیں۔ چہرے کی وہی سولہ برس پہلی مسکراہٹ چاندنی۔ سچ مچ ہیرا آدمی ہے اور اس شخص کے شاعر کی پوچھو تو ان تھک اور اکنگ شاعر۔ کچھ ایسا ہے کہ اپنا جادہ، اپنی جادہ فرسائیاں اور اپنی آبلہ پائیاں کتابوں کی چھت کے نیچے اور کتابوں کی دیواروں کے بیچ میرے اس بھائی کی تنہائی ایک ایسی پیش گاہ ہے جس میں وہ معنی کے شاُردوں کو چمکار چمکار کے اور واُردوں کو بڑے چاؤ کے ساتھ لفظوں کی نشستوں پر بٹھانے میں لگا ہوا ہے۔ میں بیٹھا ہوں اور ان کے حرف' محبت اور تہذیب اور جمال میں سانس لے رہے ہیں۔ عبدالعزیز خالد نے ایک بات کہی ہے جو میرے لفظوں میں کچھ یوں ہے کہ اگر کسی جُھلسے ہوئے پیڑ کے برابر کھڑے ہو کر انسان اور تہذیب کے لیے بھلائی کے ساتھ سوچا جائے تو وہ پیڑ ہرا ہو جائے۔

اب مجھے یوسف بھٹی مل گیا ہے جو یہاں مسعود منور کہلاتا ہے۔ یہ میرا کوچک ابدال ہے اور شاعری میں مجذوب کے مرتبے کو پہنچا ہے۔ میں اور وہ ایک ہی سے خیالوں کے خراب کیے ہوئے ہیں پر وہ مجھ سے زیادہ بے قابو ہے اور میرا پنجابی نمونہ ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لی ہیں اور اس کا بازو تھام کے چل پڑا ہوں۔ راستے دیکھتے دیکھتے تھک گیا تھا

لواب ذرا اپنی آنکھوں میں ستالوں۔ چلتے چلتے کہیں ٹھہرتے ہیں۔ میں آنکھیں کھولتا ہوں تو یاروں کا یار آغا سہیل افسانہ نگار سامنے ہے۔ آغا کے چہرے کی جلد کا دوسرا نام مسکراہٹ ہے۔ پوچھتا ہے محمد علی صدیقی کس حال میں ہے؟ وہی رات رات بھر پڑھنے کا ادبار اور دن میں لکھنے آزار۔ آغا سہیل کے ہونٹوں کا کہنا ہے کہ ہم دھیمے پن کے ساتھ سچ بولنا چاہتے تھے سو کہانیاں کہنے لگے ہیں۔ اس کا دُکھ یہ ہے کہ زندگی میں ان پر چھائیوں کا ٹھکانا کہیں نہیں جو زمین کے ہر حصے کو اپنے سینے سے لگا لینا چاہتی ہوں۔ اچھا آغا میں پھر آؤں گا اور پھر میں اور یوسف ایک اور گھر پر آواز دینے کے لیے چل پڑتے ہیں۔ یوسف' یوسف گھر آ گیا؟ نہیں آیا' بالے! ذرا آہستہ لے چل۔ یوسف ٹھہرا ہے اور کسی دروازے پر دستک دی ہے۔ کوئی بچہ پوچھ رہا ہے۔ کون ہے؟ یوسف کہتا ہے کہہ دو فقیر آئے ہیں۔ اب جو آنکھیں کھولتا ہوں تو شہرِ ذات کے شاعر منیر نیازی کے چہرے پر نگاہ پڑتی ہے۔ میں نے منیر نیازی کو پہلے سے زیادہ خوب صورت' پہلے سے زیادہ تنہا پایا ہے۔ اس شاعر کی خوب صورتی کچھ اور بھی کٹیلی اور ہٹیلی ہوگئی ہے۔ انھیں دیکھتے ہی عبیداللہ علیم کا خیال آ گیا ہے۔ سو اس کی باتیں کی جاتی ہیں اس کے رخساروں کی رنگت کو نگاہوں میں رچایا جاتا ہے اور اس کی آنکھوں کی یاد منائی جاتی ہے۔ منیر نیازی شہر میں سرگرداں خوابوں اور خیالوں کا اکیلا شاعر جو اپنے اکیلے پن میں اپنے چاروں طرف پھیلتا چلا گیا ہے، وجود کے پھیلاؤ کو خوب صورت اور بد صورت کی پیکار گاہ جانتا ہے۔ انھیں ایک ایسا آدمی جانا جائے جو خوب صورتی کو بد صورتی کے نرغے میں گھرا ہوا پاتا ہو اور اُسے اس نرغے سے نکال لانے کے لیے سخت اور درشت بن کر سامنے آتا ہو۔ منیر نیازی کہتے ہیں کہ اگر تہذیب خوب صورتی کا نام ہے تو زمین میں پھیلی ہوئی ساری تہذیبیں میری اپنی ہیں۔ میں ان ناموں سے بھلا کیا کام لینا چاہتا تھا؟ جن میں سے کوئی اپنی سوچ میں دائیں طرف کھڑا ہے اور کوئی بائیں طرف۔ میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ انسان میں ایک بات ایسی بھی ہے جس کی بڑائی سوچ میں تو سما سکتی ہے پر سوچ کی سمتوں میں نہیں۔

عالمی ڈائجسٹ' مئی 1974

کشکول

میرا تو یہی جی چاہتا ہے کہ اپنے سینے کے اندر جا بیٹھوں اور وہاں سے کبھی باہر نہ نکلوں۔ اپنے سینے کے باہر کا تو خود میں بھی کبھی اپنے آپ کو راس نہیں آیا۔ بھلا میرے سوا کوئی اور مجھے کیا راس آئے گا۔ میرے ہونٹوں کی تنہائی بے دلی اور بیزاری کا دھواں اُڑا رہی ہے اور میرا تیسرا پہر نہ کچھ پا رہا ہے اور نہ کچھ گنوا رہا ہے اور سب سے بڑی آزمائش بھی یہی ہے کہ ایک آدمی نہ پانے کے احوال میں ہو اور نہ کھونے کے حال میں اور جو پانے کے احوال میں نہ ہو وہ کھونے کے حال میں ہوگا بھی کیوں کر۔ اس وقت کرنا کیا چاہیے؟ کرنا کیا چاہیے۔ کچھ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ گلی کی کسی الّھڑ خوش بُو کے پیچھے چل نکلو۔ کیا چل نکلیں یار۔ بہت چلے پر اپنی کچھ چلی ہی نہیں۔ بہت آوازیں دیں کہ اے نیک بخت ٹھہری رہ یا آہستہ چل کہ میرے تو پیر رہ گئے۔ پر کوئی خوش بُو کہیں ٹھہری ہے' بس یہ ہے کہ جو خوش بُو ہے وہ جاتے جاتے ایک خیال دے جاتی ہے۔ میری جیبوں اور میری درازوں میں خیال بھرے ہوئے ہیں۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالتا ہوں اور خیال نکالتا ہوں' درازیں کھولتا ہوں اور کسی خیال کو ہاتھ پر تولتا ہوں۔ پر یہ میں نے کب کی بات کہی۔ یہ اب کی بات تو نہیں ہے۔ ہاں میں کسی خیال میں کھو گیا تھا۔ یہ کبھی پہلے کی بات ہے۔ اب تو میرے پاس کوئی بھی خیال نہیں ہے اور یوں بھی جو خیال تھا اس کے ساتھ ایک ملال تھا۔ جہاں بھی کوئی خیال ہے وہاں اس کے ساتھ ایک ملال ہے۔ جن گھروں میں ہم رہتے ہیں اور جن گلیوں سے ہم گزرتے ہیں اور جن بازاروں میں ہم دن بھر اپنے تلوے گھستے رہتے ہیں ان میں رہ کر اپنے آپ کو

خیالوں اور خوابوں کا روگ لگانا اپنا دل دُکھانا ہے۔ ایک آدمی جنگل بیابان میں بھوکا پیاسا بھٹک رہا تھا۔ وہ بھٹکتے بھٹکتے ہلکان ہو گیا اور غش کھا کر گر پڑا اور سُنو کہ اس کی جیبوں میں سکّے بھرے ہوئے تھے۔ تُو نے اپنے دل اور اپنے دماغ میں جو کچھ بھر رکھا ہے وہ مایا کی بستیوں میں کس کام آئے گا اور تو اس کے بدلے کیا پائے گا۔ خیالوں کے دل میں خلش ہی خلش ہے اور خوابوں کے سینے پر خراشیں ہی خراشیں۔

خیال یا خواب کا مطلب یہ ہے کہ آدمی میں ایک اور آدمی، ایک حال میں ایک اور حال یا ایک دنیا میں ایک اور دنیا۔ یہاں ایک آدمی کے لیے اس کا اپنا ایک ہی کیا کم ہے۔ جو وہ اپنے ایک اور کو بھی جھیلے اور وہ اپنے ایک ہی حال میں کچھ کم نڈھال نہیں جو دوسرے حال سے بھی اپنے کو بے حال کرے۔ کیا میں اپنی ایک دنیا میں ہونے کے طور ہوں جو اس میں ایک اور دنیا کا جھنجھٹ بھی پھیلاؤں اور اپنے کو اور بھی بے طور کروں۔ جو یہاں خیال کی زندگی کرنا چاہتا ہے وہ اس دائیں بائیں، اس آگے پیچھے اور اس اُوپر نیچے کے سوا ایسے ہی اور چھ میں ڈھول ہو کر بکھرنا چاہتا ہے۔

پَر خیالوں سے بچھڑ کر بھی ہوں میں خیالوں ہی کا آدمی۔ بگولوں کی پُڑیاں باندھتا ہوں اور بُلبلے جیبوں میں ڈال کر انھیں باندھتا ہوں۔ یہ لمحوں سے مخول کرنا ہوا، پر لمحوں سے مخول کیے بِن دن کو رات کرنا کس سے آیا ہے۔ میں تمھیں ایک بات بتاؤں وہ بھی جو بے کار بیٹھا وقت گنوا رہا ہے اور وہ بھی جو ایک کے بعد دوسرا کام نمٹا رہا ہے۔ دونوں ہی لمحوں سے مخول کر رہے ہیں۔ اب یہ ہے کہ کس نے کس طور سے مخول کی۔ میں اس مخول کے لیے زندگی سے کچھ خیال اور کچھ خواب چاہتا ہوں اور میرے ایسے بہت سے لوگ ہیں جو خیالوں اور خوابوں کے لیے ترستے ہیں اور میں تو ان کے لیے بُری طرح ترس رہا ہوں۔ ہاں خیالوں اور خوابوں میں بڑے دُکھ ہیں پھر بھی ہے یہی کہ ان دُکھوں ہی میں ہم ایسوں کے لیے سُکھ ہے اور ہوا یہ ہے کہ یہ سُکھ ہم سے چھن گیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ خیالوں کی روزی زندگی کی سب سے اچھی روزی ہے اور خوابوں کا وظیفہ سب سے اچھا وظیفہ۔ تمھارے

لیے نہ ہو ہمارے لیے تو ہے۔ پر میں دیکھتا یہ ہوں کہ میرے دائیں بائیں نہ تو کوئی خوابوں میں مست ہے اور نہ کوئی خیالوں میں مگن۔ یہ کیسی نہوت ہے۔ ابھی تو میں بیٹھا ہوں۔ رات تک بیٹھا ہوں' شاید شام تک کوئی آئے اور مجھ درویش کے لیے کوئی خیال لائے یا پھر کسی، خواب کی آس بندھائے۔ پر وہ لوگ ادھر آتے ہی کب ہیں جو ایسے تحفے دے سکتے ہوں۔ شاید ایسا کوئی آنے والا آج شام ادھر نکلے یا پھر کل شام۔ میرا کام تو بس یہ ہے کہ میں اپنے تکیے پر بیٹھا ہوا آنے والوں کا راستہ دیکھتا رہوں یا پھر چراغ جلے گھر سے کشکول لے کر نکلوں اور رات گئے تک بستی میں گھوم کر دروازوں اور دریچوں پر صدا لگاؤں کہ فقیر کا سوال' بس ایک خواب' بس ایک خیال' اللہ ہی دے گا' مولا ہی دے گا۔

عالمی ڈائجسٹ' جون 1974

سنّاٹے کی سیٹیاں

میں ڈھول پر لکھا گیا اور اندھیاؤ میں پڑھا گیا اور پڑھنے والا ڈھند کے سوا بھلا اور کون تھا، اور میں کچھ اس طور لکھت میں آیا جیسے لکھنے والے نے مجھے اپنے بائیں پیر کے انگوٹھے سے لکھا ہو اور انگوٹھا کپکپا رہا ہو۔ سو میں بڑی بُری لکھت ہوں۔ تُو اپنی کہہ چکا؟ ہاں کہہ چکا، پر تُو کون بگولا ہے؟ میں بھی کوئی ہوں، کیا اب میں اپنی کہوں؟ اگر تُو بھی کوئی ہے تو پھر تُو بھی اپنی کہہ ڈال۔ میں بھی ڈھول پر لکھا گیا اور اندھیاؤ میں پڑھا گیا اور پڑھنے والا ڈھند کے سوا بھلا اور کون تھا، اور میں بھی کچھ اس طور لکھت میں آیا جیسے لکھنے والے نے مجھے اپنے بائیں پیر کے انگوٹھے سے لکھا ہو اور انگوٹھا کپکپا رہا ہو۔ سو میں بھی بُری لکھت ہوں۔ ڈھول پر لکھے جانے والو! تم دونوں بڑے جنجالی ہو۔ ہاں یہ ڈھول پر لکھے جانے والے تو بڑے ہی جنجالی ہیں۔ تم نے اپنی پلکوں کے پرے کسی کو نہ جانا اور اپنی آنکھوں کی پتلیوں کے درے کسی کو نہ پہچانا۔

تو ہم دو میں تیسرا کون، بھلا کون بگولا ہے تُو اور یہ دوسرا بھی کون ہے؟ میں تم میں تیسرا کوئی نہیں ہوں، اور میں بھی ڈھول پر لکھا گیا اور دوسرا بھی کوئی نہیں ہے، بس یہ ہے کہ تیرے کان بج رہے ہیں۔ اچھا تو میرے کان بج رہے ہیں، میں بھی تو کہوں کہ یہ ڈھول پر لکھا جانے والا دوسرا اور تیسرا بھلا کون، تو پھر تو بس پہلا ہی رہا؟

ہاں ڈھول کا گھر بسا رہے اور ڈھند کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں، بس پہلا ہی رہا، ڈھول اور ڈھند کا اکلوتا بس پہلا ہی رہا، بس پہلا ہی پھلے پھولے......اور بس پہلا ہی اپنے ہونے اور نہ ہونے کے گھمنڈ میں رہے اور وہی اس کا ڈنڈ سہے، گھمنڈی، بڑا آیا کہیں کا۔ اوڈھول

کے دھاندھیلے کیوں دھاندل مچاتا ہے؟

میں نے سُنا اور گنا۔ ہاں میں گھمنڈی ہوں' ہاں میں دُھول اور دُھند کا دھاندھلیا ہوں' پر ہونے کی اس بستی میں مجھے اپنے ہونے کا نہیں' اپنے نہ ہونے کا گھمنڈ ہے اور اس میں بڑی کھنڈت اور بڑا پاکھنڈ ہے۔ مجھے تو اپنا آپا پھاندنا ہی سدھا گیا۔ اور مجھے تو اپنے ہونے سے بیر باندھنا اور اپنے نہ ہونے کی بپتا ناندھنا ہی سکھایا گیا۔ سو میں جس پل اپنے آپ کو اپنے ہونے کا دھیان لڑانے میں پاتا ہوں تو اپنے نہ ہونے کے گھمنڈ پر آتا ہوں۔ اور ایک پل دوسری پل کی پیٹھ پر لکھی گئی اور پل ہی میں پڑھی گئی اور اس کا پڑھنے والا بھی پل کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

میں سُننے والوں میں سے ہوتا تو اس پل اپنی ایک بات سُنتا اور اس بات کے بھیتر سے ایک بھید چنتا' اور بھیدوں کا وہ بھید یہ ہے کہ میرے نہ ہونے کا گھمنڈ بھی پلوں میں بکھرا ہوا ہے' ہونا تو ہونا یہاں نہ ہونے کے دھیان کو بھی بکھیرا ہی گیا ہے سمیٹا نہیں گیا۔ اگر میرا کوئی نام ہے تو اُسے شنوائی کی اس بستی میں پلک جھپکنے تلک بھی نہ ٹھہرایا گیا اور اسی کا اُلاہنا کیا دینا' میں تو وہ ہوں جسے اس کے نام کے بڑوں سے بھی ترسایا گیا۔ سو میں اپنے دوسرے اور تیسرے کے بیچ کب تھا اور ان میں سے کب ہوں؟ اس بستی میں تو میری اپنی ایک پلک بھی میری دوسری پلک سے ان جان رہی۔ میرا اپنے ساتھ بڑا رگڑا ہے کہ ناموں سے میرا بڑا جھگڑا ہے۔ میں نے جب بھی ایک کے پیچھے ایک' دو ناموں کو سُنا ہے تو اپنے کانوں کو بُری طرح دُھنا ہے۔ اور پھر یوں ہوا ہے کہ میں اپنے بھیتر اتنا ہنسا ہوں' اتنا ہنسا ہوں کہ روہانسا ہو گیا ہوں۔ جہاں بھی دو نام ہیں وہاں بڑا بکھیڑا ہے' بڑا اُلجھیڑا ہے۔ سُننے والوں میں سے کوئی سُننے والا جب بھی کوئی ایک نام سُنے تو سمجھ لے کہ یہ کسی دوسرے نام کی سُناؤنی ہے اور اس کی اُٹھاؤنی ہے۔ ہاں جب بھی کوئی کسی کے نام کا بوجھ اپنے ہونٹوں پر اُٹھاتا ہے تو کسی دوسرے کے نام کو چِتا میں بٹھاتا ہے۔ اور پھر یوں بھی ہے کہ جہاں بھی دو نام ہیں وہاں کوئی ایک رشتہ بھی ہے اور جو بھی نام ہے وہ دوسرے نام کی دوسراہٹ ہے۔ یہ کون ہے' جس نے یہ بات سُنتے ہی دانت نکال دیے ہیں۔ میں یا کوئی اور؟ کسی نے بھی دانت نہیں نکالے ہیں'

سُننے والا تو بس تیری ہی ٹھی ٹھی سُن رہا ہے اور بھُن رہا ہے۔ اور اؤ الارا سی ستیاناسی! اگر یوں ہی ہنسنا ہے تو اپنی پسلیوں کی اوٹ میں دھمک۔ اپنے باہر کیوں فیل لاتا ہے؟

سُننے والے نے تیری ٹھی ٹھی سُنی اور اپنی سمجھ کی روئی دُھنی۔ ہاں او گھُنے گنی! جو کچھ میرے آگے ہے اس میں کوئی رشتہ نہیں ہے ہاں یہاں کوئی بھی رشتہ نہیں ہے بینائیاں اور شنوائیاں اور دُہائیاں رشتوں کی بھیک مانگتی ہیں۔ پر میں تو ایسے نہ ہونے میں ہوں جس کا کوئی نام تک نہیں ہے سو جو مجھ سے رشتہ جتلاتا ہے وہ مجھے دکھ پہنچاتا ہے۔ رشتہ جتلانے والے! پہلے مجھے ہونے میں لا اور پھر میرے ہونے کا کوئی نام رکھ اور پھر یہ نام میرے اُن گئے دنوں کے 'میں' کو بھی یاد کرا جن میں یہاں میرا کوئی نام ہے نہ تھا وہ یوں کہ اگر ایسا نہ ہوا تو میں اپنے اَن جان دو میں بٹ جاؤں گا اور اپنے آدھے سے کٹ جاؤں گا اور تُو پورا ٹھہرا اور ایک آدھے سے ایک پورے کا بھلا کیا رشتہ؟ پر وہ کوئی بھی نہ ہوگا جو مجھے ہونے میں لائے گا اور مجھے میرا کوئی نام رٹائے گا اور پھر میرا یہ نام میرے گئے دنوں کو یاد کرائے گا۔ ایسا کوئی اس پھیلاؤ کے کناروں سے شاید کبھی نہ آئے گا۔ سو اس کے سوا جو بھی مجھ سے رشتہ جتلائے گا وہ میرے ہونے کو میرے اَن ہونے پن سے بھی چھڑائے گا۔ اگر ایک کا نام لینا ہے تو اس کے ساتھ کسی دوسرے کا نام نہ لیا جائے۔ اور اگر دو نام ایک ہی ساتھ لینے ہیں تو جان لو کہ اس میں طعنے مہنے ہیں۔ ایک کے پیچھے دوسرا نام لینا ہی ٹھہرا تو ٹھیک ہے۔ یہاں سب کو ایک نام کے ساتھ دوسرا نام لینے کی لت پڑ گئی ہے۔ ہاں ایک کے پیچھے دوسرا نام لو کہ چاروں کھونٹ جو کچھ بھی ہے وہ ناموں ہی کا اٹالا ہے اور اس اٹالے کے ساتھ بڑا اگڑ بڑ جھالا ہے۔ ناموں کا یہ اٹالا گڑ بڑ جھالے کا ایک گودام ہے۔ ہاں ناموں کا یہ اٹالا' گڑ بڑ جھالے کا ایک گودام ہے اور میرے سوا جو ایک گھنا گنی ہے وہ سُنے اور گُنے کہ میرا نام اس گودام میں نہ تو رکھوایا گیا نہ یہاں لایا گیا۔ میں اگر یہاں ہوں بھی تو اپنے ہونے کے نہیں پن میں ہوں۔ اور وہ یوں کہ یہاں ہونا اپنے میں نہ ہونا ہے۔ اور یہی ہونے کا سب سے بڑا ہونا ہے۔ اور وہ یوں کہ میرے نام نے یہاں جب بھی دوسرے ناموں کے بیچ اپنے آپ کو پہچاننا چاہا تو اسے دُھتکارا گیا اور اس نے جب بھی یہاں کی شنوائی میں جانا چاہا تو اسے پھٹکارا گیا۔

سومیں نے اپنے آپ سے کہا تُو سارے نام لینے والوں سے کہہ دے کہ نام لینے والو! ایک کے پیچھے دوسرا نام لینے والو! مجھے اپنے ہونٹوں کے باہر ہی ٹالو کہ میرا نام تمھارے ناموں کی بستی میں پردیسی ہے اور پردیسی کے پاپ اور پُن کو بھلا کون جانے اور اس کی بات کون مانے۔ اور میری اس پکار پر کان نہ دھرو کہ میں بھی شاید ایک نام ہوں اور مجھے بھی اپنے ناموں کے پڑوس میں بسا لو!

پر میں ہوں کون؟ ٹھیک ہے یہ جاننا چاہیے کہ وہ کون ہے جو یہ کہہ رہا ہے کہ میں کون ہوں اور اس کا نام کیا ہے؟ میں بھی تو سُنوں کہ میرا نام کیا ہے؟ اگر میرا کوئی نام ہوتا تو وہی میری بستی اور میرا گھر ہوتا اور میں اس میں رستا بستا۔ پر میرا تو کوئی بھی نام نہیں ہے۔ اور مجھ میں جو بھی ہے اور جتنے بھی ہیں ان کے نام ہی نہیں ہیں۔ شاید وہ کبھی اپنے ناموں سے پکارے گئے ہوں پر اب تو میرے اندر وہ سب کے سب سناٹوں کی سیٹیاں ہیں اور کتنے ہی بھیتر والوں کا باہر والا میں ڈھول کا بھکاری اور دُھند کا اُدھاری ہوں۔

اے وہ، اے وہ! جس کا کوئی نام نہیں ہے۔ چل ہٹ دم لے اور سُن کہ اب سے پہلے یہاں سے دُور کسی بستی میں شام کے ہنگام دھونسا پٹا کرتا تھا اور تُو اپنی ساری کھل گل اور اپنا سب کھیل کھلّڑ چھوڑ کر اسے سُنا کرتا تھا۔ اور آج بھی شام ہو رہی ہے، سو تُو اُداس ہو جا! اور اس بستی سے نکل اور کسی ڈھنڈار میں چل اور وہاں جا کر چُپکا پڑ رہ! بھلا تُو کب تک ناموں کے دروازوں پر دستکیں دیتا رہے گا جب کہ تیرا اپنا کوئی نام نہیں ہے۔ تُو بھلا کیوں کوئی نام اپنی زبان پر لاتا ہے۔ کسی کا نام زبان پر لانا دوسراہٹ کا لالچ کمانا ہے اور تُو یہاں دوسراہٹ کا لالچ کیوں کمائے اور یہ ہوگا بھی کیسے کہ نام ہی سے نام کی دوسراہٹ ہوتی ہے۔ اور پھر ڈھول اور اندھیاؤ اور دُھند اور نہ ہونے کے گھمنڈ اور اس گھمنڈ کے ڈنڈ میں بھلا کیسی دوسراہٹ اور کہاں کی دوسراہٹ؟

عالمی ڈائجسٹ، جولائی 1974

سراپ

سُن لیا جون ایلیا! شام نے پھر میرے کان کھانے شروع کر دیے۔ اس کرموں جلی نے اپنا پٹارا کھول دیا۔ میں آج بھی نہ کہیں جانے کا رہا نہ آنے کا۔ میری ہر شام بڑی چیَل ہے اور اتنی بکواسی' اتنی بکواسی کہ بس پوچھومت۔ اس بستی کے کسی ڈھانچ اور ڈھچر نے میری شام سے زیادہ چیَل اور بکواسی شام کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ اُو چیَل' اُو بکواسی! آج تجھے کیا بکنا ہے؟ اور میری شنوائی کو آج کون سی کڑواہٹ چکھنا ہے؟ نہ جانے تجھے کیا کہنا ہے اور مجھے کیا سہنا ہے؟ مجھے ایسے حال میں بھلا کیا سہنا ہے جب میں نہ کچھ سُننے کا جگرا رکھتا ہوں اور نہ کچھ سوچنے کا۔

ہاں یہ اچھا ہے' ہاں یہ بہت ہی اچھا ہے کہ انسان سوچنے کا جگرا ہی نہیں رکھتا۔ انسان سے کہہ دیا جائے گا کہ وہ اپنی بزرگیاں گائے اور کنگریاں لے کر گائے کہ میں جو انسان ہوں اور میں جو دو ٹانگوں پر چلنے والا سیدھی ہاڑ والا جانور ہوں اور میں جس پر سوچنے کی بہتان بندھی ہے' وہ میں' ہاں وہی میں' یہ جتلا دوں کہ میں کوئی اپنا بیری نہیں ہوں جو سوچ کے جنجال میں پڑوں۔ انسان نہ اپنا بیری ہے اور نہ باؤلا' جو سوچ کے اُلجھتوں میں پھنسے۔ اور اگر اس بات کا اُلٹ ہوتا اور وہ سوچ کے جنجال میں پڑتا تو پھر زمین پر جو کچھ پایا جاتا وہ کچھ ڈھانچے ہوتے اور ان ڈھانچوں کے بیچ اگر کوئی بتانے اور جتانے والا اپنے پیروں پر کھڑا ہوتا تو وہ ہواؤں کو بتاتا اور جتاتا کہ یہ اس نسل کے ڈھانچے ہیں جس نے اپنے آپ سے اپنے آپ کو انسان کہلوایا تھا اور پھر اس نے یہ سوچ سوچنے کا لالچ کیا تھا کہ میں سوچوں' سو وہ نسل یہ سوچتے ہی فنا ہو گئی تھی۔

سچ ہے' سوچ موت ہے۔ اور اگر وہ کسی حساب سے زندگی ٹھہرتی ہے تو پھر وہ ایک ایسی زندگی ہے جسے انسان کی نسل نے نہ کبھی گزارا اور نہ کبھی گزارے۔ اور اب میری سُنو اور

اگر نہ سُننا چاہو تو مت سُنو۔ میں کوئی شنوائیوں سے بھیک مانگنے والا نہیں ہوں۔ مجھے بھلا کیا پڑی ہے کہ میں کسی سے کہوں کہ اَو میاں! میری سُنتا جا اور کچھ انمول ریزے چُنتا جا۔ میں تو اپنے ہی اندر بولتے بولتے اتنا تھک گیا ہوں کہ مجھے اپنے سینے کو سُکھ پہنچانے کے لیے موت سے بھی زیادہ کوئی لگاتار خاموشی چاہیے' سو جب میں نے یہ کہا کہ اب میری سُنو تو وہ میں نے اپنے ہی آپ سے کہا' اور یہ کہہ کر میں نے اپنے آپ سے یہ کہنا چاہا کہ اے وہ' جو میرے نام سے بُلایا اور بُھلایا جاتا ہے' تو سوچ دوچ کے بکھّرے میں نہ آئیو اور اپنا سروکار سب دیکھنے اور بولنے اور سُننے ہی سے رکھیو کہ بس یہی کچھ تیرے بس میں ہے اور میں کہتا ہوں کہ دیکھنا آنکھوں کی زندگی ہے اور جس نے کم دیکھا وہ آنکھوں میں کم زندہ رہا اور بولنا ہونٹوں کی زندگی ہے اور جو کم بولا وہ ہونٹوں پر کم زندہ رہا۔ اور سُننا کانوں کی زندگی ہے' اور جس نے کم سُنا وہ کانوں میں کم زندہ رہا۔ اور جو دیکھنے کے طور دیکھ نہیں رہا وہ آنکھوں کا مردہ ہے اور جو بولنے کے طور بول نہیں رہا' وہ ہونٹوں کا مردہ ہے اور جو سُننے کے طور سُن نہیں رہا' وہ کانوں کا مردہ ہے۔ ہاں میں نے اپنا حساب دیکھنے اور بولنے اور سُننے ہی سے رکھا ہے۔ پر یہاں تو یہ حساب رکھنا بڑا ہی کٹھن ہے اور وہ یوں کہ گولائی کی ساری بستیاں' آنکھوں اور کانوں کے مُردوں سے بھری ہوئی ہیں اور کچھ اس طور کہ جدھر بھی منہ اُٹھاؤ' اُدھر کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ اب رہی ہونٹوں کی زندگی یا وہ جو ہونٹوں کے زندہ ٹھہرائے جائیں۔ سو' جو ہونٹوں کے زندہ ٹھہرے ہیں' وہ بھی بھلا کیا زندہ ہیں۔ میری شنوائی نے تو یہ پایا ہے کہ جو بولنے والے ہیں' وہ بھی کیا خاک بولنے والے ہیں۔ جو بولنے والے گردانے گئے' جب وہ بول چکے تو بکواس کرنے والے مانے گئے۔ سو ایسا بولنا ہونٹوں کی ندگی ہے کہ ہونٹوں کی بیماری؟ یا پھر ایسا ہوگا کہ ہونٹوں کی بیماری ہی ہونٹوں کی زندگی ہے۔

اگر دیکھا بھی جا رہا ہے تو دیکھنے کے طور نہیں دیکھا جا رہا۔ اور بولنے کی بپتا تو میں نے سُنا ہی دی۔ سو اب رہا سُننا۔ تو اگر سُنا بھی جا رہا ہے تو سُننے کے طور نہیں سُنا جا رہا۔ کوئی بُرا مانے یا بھلا۔ میں اس نسل کے زمانے کو آنکھوں اور ہونٹوں اور کانوں کی دھاندلی کا زمانہ ٹھہراؤں گا۔ دیکھا جا رہا ہوتا تو کیا وہی کچھ دیکھنا چاہا جاتا جو دکھائی دے رہا ہے۔ اور اگر بولا جا رہا ہوتا تو

کیا وہی کچھ بولنا چاہا جاتا جو بولا جا رہا ہے۔ اور اگر سُنا جا رہا ہوتا تو کیا وہی کچھ سُننا چاہا جاتا جو سُنائی دے رہا ہے؟

سب کے سب موت دیکھنے والے اور موت بولنے اور موت سُننے والے ہیں۔ میں نے تو یہ جانا ہے کہ نہ کوئی زندگی دیکھنا چاہتا ہے نہ زندگی بولنا چاہتا ہے اور نہ زندگی سُننا چاہتا ہے۔ زندگی کے بازار میں بھربھنڈ ہے اور موت کی منڈی میں بھیڑ بھاڑ۔ جب میں یہ کہہ اُٹھوں کہ یہ زمانہ تو بہت ہی بُرا اور بینڈا زمانہ ہے تو کوئی میری زبان نہ پکڑے۔ اور وہ ہے کون جو کسی میرے ایسے بھیچک کی زبان پکڑنے کا بوتا رکھتا ہو۔ روشنیوں اور روشنائیوں کے زمانے! تُو نے گھوراندھیروں کی جیسی دلاّلی کی ہے' وہ تُو ہی کر سکتا تھا۔ یہ کام بس تیرے ہی بس کا تھا کہ چاروں کھونٹ اور اُوپر نیچے گھوراندھیروں کا کھوج لگائے' انھیں پَر چائے اور ان کی کمائی کھائے۔

جون ایلیا! اُونگھنے کی نہیں ٹھہری۔ اب آدمی اتنا بھی گُٹھل نہ ہو کہ کہنے کی بات کہہ رہا ہو پر' اس بات کے سُننے سے اس کی جان نکلی جا رہی ہو۔ کچھ بھی ہو' میں اپنی بات پوری کر کے رہوں گا۔ ہاں تو حال یہ ہے کہ انسان کو اپنا آپا تک نہیں دکھائی دے رہا۔ میں کوئی بھاٹ نہیں ہوں' سیّد جون ایلیا! جو تمھارے زمانے کی اندھا دھند بھٹئی کروں۔ میرا بس چلے تو میں نگاہوں کے بدن سے اِن اندھی روشنیوں کا سارا میل چھاٹ دوں اور اس میل کی بتّیوں کو دھوپ میں سکھا کر ان میں آگ لگا دوں۔ میل کا بیل نہ بنایا جائے۔ تمھارا سارا اَنگڑ کھنگڑ تاریخ کے میلے کچیلے بدن کا ایک میل خورا ہے۔

کیا کچھ کہوں اور کیا کچھ سہوں۔ پوچھو مت کہ میرے اندر کتنے غصّے بھرے ہوئے ہیں۔ میرا ہر لمحہ غصیلا ہے۔ اور تُو جانتا ہے کہ ایسا کوئی دن نہ تھا جب میں غصّے کے مارے بے حال نہ تھا۔ مجھے تو غصّے ہی پلائے گئے' غصّے ہی چکائے گئے' غصّے ہی کھلائے گئے اور غصّے ہی پہنائے گئے۔

اے نسل' اے عذابوں کی ماری' دُکھیاری نسل! کیا تُو نے اپنا دکھڑا سُنا؟ جس نے تیری بات ڈھب سے کہی' وہ بڑا ہی کڈھب اور کڈھنگ ہے اور وہ یوں کہ تیری گزران سے زیادہ کڈھب اور کڈھنگ گزران بھلا کس نسل کے بہرے بخرے میں آئی ہوگی۔ سو تیری بات

تو وہی اُگلے اور نگلے جو بڑا ہی اَڑنگ بڑنگ ہو اور اَڑنگ بڑنگ بکتا ہو۔ اور میں تجھے بتاؤں کہ اڑنگ بڑنگ بکنے والے بڑے ہی ٹوٹے پھوٹے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے سچ کے جھوٹ میں کھوتے ہیں اور اپنے جھوٹ کے سچ میں روتے ہیں۔ وہ ڈھنگ کی باتیں کریں تو کیسے کہ وہ تو زندگی کے بے ڈھنگے پن میں پالے گئے ہیں اور اس بے ڈھنگے پن کا بھکتان ہی اُن کا بیوہار ہے' اور وہی اُن کا روزگار۔ سُن! میں ایسی کوئی بات نہیں کہہ سکتا جس کو سُننے والا کانوں کا سُکھ پائے اور اس بات کو دُہرانے کی خوشی منائے۔ اے نسل! اے سرابوں اور عذابوں کی ہاری ماری نسل! میں تیرے بارے میں دُکھی ہوں۔ اور وہ یوں کہ میں اپنے بارے میں بہت ہی دُکھی ہوں۔ دن ہیں جو رائگاں جاتے ہیں۔ راتیں ہیں جن کی کروٹیں رائگانی میں تِلملاتی ہیں۔ ہم کون ہیں۔ ہم کیوں ہیں۔ ہم کہاں ہیں؟ کیا میں اُس دیمک سے زیادہ ٹھکانے سے ہوں جو میرے سَر کے اُوپر اس کڑی میں لگی ہوئی ہے۔ چھت کی اس کڑی کا یہ کوڑھ ایک ایسی بناوٹ ہے جس کا لالچ کرنے کی بھی مجھ میں سکت نہیں ہے۔ کڑی کے اس کوڑھ کو دیکھ اور اپنی کھال کُھرچ۔ پر اپنی کھال کُھرچنے سے بھی کیا ہوگا۔ اور وہ یوں کہ تُو اپنی کھال میں لپیٹا ہی کب گیا ہے۔ تُو اپنی کھال تک میں ناپید ہے۔ ہاں میری کھال سے باہر کوئی نہیں' جو مجھے پکارے۔ میں اپنی کھال کے باہر سے کبھی نہیں پکارا گیا۔ میں دیکھے جانے کا بس ایک دکھاوا ہوں' بولے جانے کا بس ایک بہکاوا ہوں اور سُنے جانے کا بس ایک سراب ہوں۔ دِکھاووں' بہکاووں اور سرابوں کی ہر گلی اور ہر راستہ گھٹنوں کے جوڑوں کی دُکھن تک جاتا ہے اور یہ میری پوری نسل اپنے گھٹنوں کے جوڑوں کی دُکھن میں زندہ رکھی گئی ہے۔ اِس کا آپ ایک سراب ہے۔

جی بہلانے کے لیے زمین پر جو کھیل کھیلے جا رہے ہیں وہ بڑے ہی بھونڈے ہیں اور نگاہوں کو جو کرتب دکھائے جا رہے ہیں وہ بڑے بے ڈھنگے' ساری باتیں ایسی ہیں کہ ہنستے ہنستے پھیپھڑے دُکھا لیے جائیں' پر ہنسنے کی سکت کس میں ہے۔ ہر ٹولی کے بیچ زندگی پر اور زندگی کی اُمنگوں پر پھبتیاں کَسی جا رہی ہیں۔ جس جتھے کو دیکھو اسے خوش نمائی سے بیر ہے۔ سب کچھ سیکھ لیا گیا پر زندگی گزارنا نہ سیکھا گیا۔ کوئی پوچھنے والا بستیوں بستیوں پھرے اور

پوچھے کہ لوگو بھلا تم کس ہوس میں ہو؟ کیا وہ زندگی کی ہوس ہے؟ اگر وہ زندگی کی ہوس ہے تو اس سے پناہ مانگنا چاہیے کہ اس نے زندگی کو بُری طرح نڈھال اور بے حال کر ڈالا ہے۔ زندگی کی ورزش گاہوں میں زندگی کی توانائی کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ جو رشتے زندگی کے رگ پٹھوں کو مضبوط کرتے ہیں اُنھیں کمزور کر ڈالا گیا ہے۔

یہ زمانہ اب تک کے زمانوں کا سب سے لاڈلا زمانہ ہے۔ زمانوں کے اس لاڈلے زمانے میں زندگی سُکھی زیادہ ہے یا دُکھی؟ میں تو کہتا ہوں کہ یہ زمانہ تو وہ زمانہ ہے جس میں انسان نے سُکھوں سے بیر رکھنا سیکھا ہے۔ سُکھوں کا ایسا بیری زمانہ تو شاید کبھی نہ گزرا ہوگا۔ جس نے اپنے لوگوں کے لیے کیا کیا جتن کر کے خوف اور ہراس کمایا ہے۔ جسے انسانوں کا ایک دوسرے کے نزدیک آنا کہا جاتا ہے میں اسے اور بھی دُور جانا جانتا ہوں۔ آج تو ایک انسان اپنے سے بھی اتنی دُوری پر کھڑا ہے کہ اگر اس میں قدم مارے تو بیچ ہی میں ہانپتے ہانپتے ہلاک ہو جائے۔ میں اپنی طرف دوڑ لگانا چاہتا ہوں پر میرے اور میرے بیچ اتنی دُوری ہے کہ ہمت نہیں۔ نہ جانے یہ دُوری کہاں سے آئی ہے اور کس نے بچھائی ہے۔ ہاں! یہ بوکھلائی ہوئی نسل اپنے آپ سے بُری طرح بچھڑی ہے۔ تجھ سے تیری جدائی کی موت کتنی دراز ہو چکی ہے۔ سو تجھ سے تیرا ملنا بھلا کب ہوگا اور کس طور ہوگا۔ پر میں سوچتا ہوں کہ یہ جدائی کس نے ڈالی ہے۔ وہ کون سی سازش تھی جس نے مجھے مجھ سے اور تجھے تجھ سے جُدا کر دیا۔ ہم اپنے آپ کو ترس گئے ہیں۔ اے بھائی! میں تو اپنے آپ کو بُری طرح ترس گیا ہوں۔ سو میں نے اپنے حال سے یہ سمجھا ہے کہ شاید تیرا بھی یہی حال ہوگا۔ جو میرا دُکھ ہے وہی شاید تیرا بھی دُکھ ہو کہ جو ایک ہی زمانے کے زندانی ہوتے ہیں وہ ایک سی سزائیں سہتے ہیں۔ کیا تجھے تیرا جرم بتا دیا گیا ہے؟ مجھے تو میرا جرم بتا دیا گیا ہے۔ میرا جرم یہ ہے کہ میں نے زندگی کی ہوس میں زندگی سے ناتا توڑا اور زندگی کے نام پر اس دھوکے سے رشتہ جوڑا جو سیدھی سچی زندگی کا بیری تھا۔

عالمی ڈائجسٹ، اگست 1974

زٹل

میں بھی جانتا ہوں اور تم بھی جانتے ہو کہ لکھنے لکھانے میں کچھ نہیں دھرا۔ بس یہ ہے کہ لکھنا ایک رِیت ہے اور یہ رِیت ہر اُس وبالی کو پوری کرنا ہے جس کے ہاتھ میں قلم ہو اور ہاتھ کے نیچے سادہ ورق' ورنہ لکھنے والوں نے اپنی کون سی بات منوائی ہے اور روشنائی نے کون سی جوت جگائی ہے۔ لکھنے والا لکھ کر بس یہی جتانا چاہتا ہے کہ میری خواہشیں انسانوں کے بارے میں بہت نیک ہیں۔ اور میں ان کے لیے بڑی اچھی باتیں سوچتا ہوں اور ان کا بھلا چاہتا ہوں اور میں بہت ہی اچھا اور سچا انسان ہوں۔ میں نے بھی یہی ٹھان رکھی ہے کہ اپنے آپ کو ایک اچھا اور سچا انسان منواؤں' سو میں جو باتیں کہہ کر اپنے حسابوں نیک نامی کمانا چاہتا ہوں' وہ باتیں کہتا ہوں۔

پاکستان اور ہندوستان اس مہینے اپنے وجود اور اپنی آزادی کی سال گرہ منا رہے ہیں۔ آزادی کی اس دولت کے لیے اِدھر اور اُدھر کی کئی نسلوں نے یادگار قربانیاں دی تھیں اور سامراج کو للکارا تھا۔ اس لڑائی میں دشمن کے سامنے سب ایک تھے۔ بیچ میں ایک جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا اور اسے اس طور پر چکایا گیا کہ تم اُدھر خوش' ہم اِدھر خوش۔ اور جانا گیا کہ اب چین پڑ جائے گا۔ پر' ستائیس برس گواہ ہیں کہ چین تو کیا پڑتا اور بے چینی بڑھ گئی۔ جو نفرتیں بھڑک اُٹھی تھیں وہ آج تک نہیں بجھیں اور سارے رشتے ان نفرتوں میں جھونک دیے گئے اور اس کو بڑی چابک دستی کی سیاست گردانا گیا۔ میں کہتا ہوں کہ ان نفرتوں نے زندگی کو بُری طرح بُجھا ڈالا ہے' لوگ اپنے اندر بکھر کے رہ گئے ہیں' یہاں سے وہاں تک پوری سرزمین بے دلی اور بیزاری کا ایک صحرا ہے اور یہ سب کچھ سیاست کا کیا دھرا ہے۔ سیاست

نے نفرتیں نگلی ہیں اور نفرتیں اُگلی ہیں۔ یہ بات زمین پر بسنے والے سارے انسانوں کے سوچنے کی بات ہے کہ وہ سیاست کو آخر کتنی چھوٹ دیں گے۔ دنیا کے یہ سیاست داں، تاریخ کے یہ فالتو بھنڈ یلے بھلا کب تک انسانوں کا وقت خراب کرتے رہیں گے؟ تم دیکھ رہے ہو کہ ان کی حرافہ سیاست نے دنیا میں کیسا اُودھم مچا رکھا ہے۔ اس اُچھال چھکّا سیاست نے فساد کی پیٹھ اور فتنہ پردازی کے پیٹ سے جنم لیا ہے اور اس کا پیشہ بس یہی ہے کہ انسانیت کے منہ پر گند لتھیڑے، نفرت کی گند۔ انسانوں نے اتنا وقت اپنے آپ کو بھی نہیں دیا ہے جتنا سیاست کو دے رکھا ہے۔ سیاست داں انسان، انسان کی سب سے گھٹیا قسم کا نام ہے۔ اور میں یہ سوچ سوچ کر اُداس ہوتا ہوں کہ تاریخ میں شریف انسانوں پر ان سب سے زیادہ ذلیل انسانوں ہی کا جادو چلتا رہا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان تک ہی بات کو سمیٹ لیا جائے۔ یہاں کیا ہوا۔ یہاں یہ ہوا کہ ستائیس برس تک سیاست کے سارے ہونڈوں نے ایک کو دوسرے سے نفرت کرنا سکھائی۔ میں ہندوستان میں ساڑھے چھ سو برس رہا ہوں، پر اس سیاست کا یہ ہنر دیکھو کہ میں نے جو زندگی کے کچھ برس یہاں گزارے ہیں تو اس سیاست نے مجھ سے یہ حق چھین لیا ہے کہ میں اپنی بہن سے مل سکوں۔ اگر میں اپنے ماں باپ کی قبروں کے سینے سے لگنے کے لیے سرحد پار کرنے لگوں تو اِدھر والے مجھے دھر لیں گے اور اگر سرحد پار کرلوں تو اُدھر والے پکڑ لیں گے۔ یہ تاریخ کے بم پولیس میں کُلبلاتے ہوئے کیچوے، دلوں کی دھڑکنوں کے بیچ کُلبلانے والے کون ہوتے ہیں؟ میں اپنی سوچوں میں جنھیں میں نے اپنی سچائیاں جانا ہے۔ سر ٹکراتے ٹکراتے لہولہان ہو گیا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دو کا مطلب بس دو دشمن ہی کیوں ہے، دو دوست کیوں نہیں۔ کیا ہندوستان اور پاکستان کی دوئی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کا سر پھاڑیں اور ایک دوسرے کی لہلہاتی ہوئی کھیتیوں کے رنگ اُجاڑیں اور ایسے رشتوں سے بھی انکاری ہو جائیں جن سے انکار کر کے انسان اپنے آپ کے باہر ہی اکیلا نہیں رہ جاتا، اپنے اندر بھی اکیلا ہو جاتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ہندوستان میں کیا کہا اور کیا لکھا جاتا ہے، ہاں میں یہ جانتا ہوں کہ یہاں پچھلے برسوں میں بہت سے لوگوں نے جس بات کو منوانے کی بہت خواہش

رکھی ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے بیچ کوئی رشتہ نہیں پایا جاتا۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ میں ایسی باتیں سُن کر رو بھی سکوں۔ ہنسنا تو بڑا کٹھن کام ہے۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اگر دنیا میں دو ریاستوں کے بیچ کوئی رشتہ پایا جاتا ہے تو سب سے گہرا رشتہ پاکستان اور ہندوستان کے بیچ پایا جاتا ہے۔ اگر ہندوستان کی سیاست مانے تو ہندوستان کے دوستوں کی فہرست میں سب سے پہلا نام پاکستان کا ہونا چاہیے تھا اور اگر پاکستان کی سیاست یہ بات سہہ سکے تو پاکستان کے دوستوں کی فہرست میں پہلا نام ہندوستان کا ہونا چاہیے تھا۔ میں اپنی رائے پر کوئی بھروسا نہیں رکھتا پر میں اپنی خواہشوں پر پورا بھروسا رکھتا ہوں اور میری خواہش یہ ہے کہ اے کاش پاکستان اور ہندوستان اپنے رشتوں کو پہچان سکتے اور اپنی ہواؤں، اپنے دریاؤں، اپنے پہاڑوں اور اپنے میدانوں کے بھیدوں کو جان سکتے۔ اور میری رائے یہ ہے کہ اگر انھیں اپنے دُکھ کم کرنے ہیں تو انھیں چاہیے کہ وہ ان رشتوں کو پہچانیں اور ان بھیدوں کو جانیں۔ میں تمھاری بھلائی چاہتا ہوں۔ بھلائی چاہنے والی زبان کڑوی بھی ہوسکتی ہے اور اگر تم مجھ سے کہلوانا چاہو تو میں یہ بھی کہہ دوں کہ کھوٹی بھی۔ پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ میں دونوں ملکوں کے پَھلنے پُھولنے کا لالچ رکھتا ہوں۔ اور ان کے پَھلنے پُھولنے کو محبت میں پاتا ہوں۔ نفرت میں نہیں۔ اگر تم میری بات نہیں سمجھتے تو مت سمجھو میں تم دونوں کی طرف سے محبت کرتا رہوں گا۔ تم آپس میں نفرت کرتے رہو اور میری بات کو ژٹل سمجھتے رہو کہ اس بات کو برسوں سے ژٹل ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔

عالمی ڈائجسٹ، ستمبر 1974

پیڑ

کتنا گھنا اور کیسا ہرا بھرا پیڑ ہے۔ دن کے تیسرے پہر بھی ایسا لہلہاتا ہے جیسے دن کا تیسرا پہر نہ ہو سویرا ہو۔ کھڑکی میں سے اس کے سرسراتے ہوئے پتوں کی ہوا آ رہی ہے اور میرے سر، میری گردن، میرے کاندھوں اور میری بانہوں سے اپنی ٹھنڈک چھوا رہی ہے اور مجھے میرے دھیان کی چھاؤں میں لے جا رہی ہے۔ میں نے بھی اپنے گھر کے نیچے کے آنگن میں ایک پودا لگایا تھا اور جب میں وہاں سے چلا ہوں تو وہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ میں نے اسے سلام کیا تھا اور اس نے مجھے دعائیں دی تھیں، دنوں کی دھوپ میں لپکتے اور لہلہاتے رہنے اور مُرجھا نہ جانے کی دعائیں۔ میرا پیڑوں سے بڑا گہرا رشتہ ہے اور یہ بہت ہی پرانا رشتہ ہے۔ مجھ سے ایک بار کہا گیا تھا کہ دیکھ فلاں پیڑ کے پاس بھی نہ پھٹکیو۔ پر ہوا یہ کہ میں نے سُنی ان سُنی کر دی اور میں اس پیڑ کے پاس گیا اور پھر بڑی کڑیاں جھیلیں۔ جی چاہتا ہے کہ میں بھی ایک پیڑ ہوتا جس کی جڑیں زمین کی گہرائی میں دُور دُور تک اور شاخیں اُونچائی میں چاروں طرف پھیلی ہوتیں۔ پیڑ کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ پیڑ زمین کی سربلندی ہیں اور سُنو کہ وہ پیڑ بھی اچھے ہوتے ہیں جن کے پھل چاہے کسیلے، کھٹے اور کڑوے ہی کیوں نہ ہوں اور کٹیلے پیڑ بھی اچھے ہوتے ہیں۔ کیکر مجھے انسانوں سے زیادہ بھلا لگتا ہے۔ اور ستم دیکھو کہ اس پھیلاؤ کے آخری سرے پر ایک پیڑ ہی کھڑا ہے چاہے وہ کانٹوں بھرا ہے اور وہ بیری کا پیڑ ہے۔ سو میں تو ایک پیڑ ہوتا۔ سو میں جو ایک پیڑ ہوتا تو مجھ میں کچھ اٹکل بھی ہوتی اور پھر ایسا ہوتا کہ رائے بیل، چنبیلی اور مدن بان ایسی کنواریاں میرے گدّے میں جھولا ڈالتیں اور جھولتیں اور پینگیں لیتیں اور میری ٹہنیاں ان کی پیٹھ سے لگتیں اور ان کی بانہیں، ان کے گال

اور ان کے لہراتے بال میرے پتوں سے چھوتے جاتے اور میرے پتے پھول بنتے جاتے۔ خوب صورتی میری ماں بھی ہے اور میری محبوبہ بھی۔ ماں خوب صورتی نے مجھے جنم دیا اور محبوبہ خوب صورتی کی لگن نے مجھے اس پر اُکسایا کہ تُو پیڑ بن جا۔

میں زندگی کے پتھریلے بن میں پیڑوں کی سرسبزی اور ان کی شادابی کا رکھوالا رہا ہوں۔ اب سے کوئی چودہ سو برس پہلے میرا روزگار ہی یہی تھا کہ میں بیلچہ کاندھے پر رکھے ایک باغ میں جاتا تھا اور وہ ایک یہودی کا باغ تھا اور میں بیلچے سے باغ کی سخت زمین کو پیڑوں اور پودوں کے لیے نرم کرتا تھا اور پھر پانی بھر بھر کر لاتا تھا اور انھیں سینچتا تھا۔ اور اس وقت میں خود بھی ایک ایسا پیڑ تھا جس کی جڑیں زمین میں تھیں اور ٹہنیاں آسمان میں۔ اور وہ ایک چھتنار پیڑ تھا جو تم میں سے وقت کی دھوپ کے ان گنت جُھلسے ہوئے مسافروں کو چھاؤں کی روزی دیتا تھا' اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ تم میں سے کتنے ہی ناشکرے مسافر اس کی شاخوں کو کاٹ ڈالتے تھے یا ان کے پتوں کو نوچ ڈالتے تھے۔ میں انھیں پہچانتا تھا پھر بھی انھیں چھاؤں دیتا تھا۔ اب میں پیڑ نہیں رہا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ ایک پیڑ ہو جاؤں پر اب کے میں ایک ایسا پیڑ ہونا چاہتا ہوں جو اپنی پہچان کو برتتا بھی ہو اور جسے ہوا دینی چاہیے اسے ہوا دے اور جسے ہوا نہیں دینی چاہیے اسے دھتا بتا دے۔

سو میں ایک پیڑ ہوتا۔ اور جب میں کھڑے کھڑے اپنے ہی آپ کو کچھ اُولو اُولو اُولو لگنے لگتا تو اِدھر اُدھر ایک آدھ چکر لگا آیا کرتا۔ اور ایک اور بات بھی ہوتی۔ پر وہ ایک اور بات آخر کیا ہوتی؟ ہاں وہ یہ بات ہوتی کہ میں گش پر گش لگانے والا ایک بکواسی پیڑ ہوتا اور اپنے برابر والے پیڑوں کا بول بول کر دماغ چاٹ جاتا۔ مجھے شہد چاٹنے سے کسی کا دماغ چاٹنا زیادہ پسند ہے۔

اور ایسا ہوا کہ جب میں کھڑے کھڑے اپنے ہی آپ کو کچھ اُولو اُولو لگنے لگا تو زمین کی گہرائی میں اپنی جڑیں گھسیٹتے ہوئے پنجاب کی طرف چل نکلا۔ پیڑ رے پیڑ! تُو ایک جھوٹ بول گیا۔ بھلا تیری جڑیں گہرائی میں کہاں پھیلی ہوئی ہیں' جنھیں تو گھسیٹتے ہوئے پنجاب جا نکلا۔ ہاں میں جھوٹ بول گیا اور وہ اس لیے کہ مجھے گہرائی میں اپنی جڑوں کے دُور دُور تک

پھیلے ہوئے ہونے کی عادت رہی ہے' تو میں اپنی عادت بول گیا اور یہ بات بھول گیا کہ اب تو میں ایک ایسا پیڑ ہوں جسے مزدوروں نے اُٹھا کر زمین پر سیدھا کیا ہوا اور اس کے گڈوں میں رسّوں کے پھندے ڈال کر ان کے سروں کو چار طرف گڑی ہوئی میخوں میں لپیٹ کر ان کی گرہیں لگا دی ہوں اور اس طرح اسے کھڑا کیا ہو اور مزدور بھی ایسے ہوں جنھوں نے ایک کے بجائے چار دَھر والیے ہوں۔ اور پھر مجھے یہ عادت پڑ گئی ہو کہ بے سہارے بھی کھڑا رہ سکوں۔ سو میں بے رسّوں کے زمین پر کھڑا رہنے لگا۔ ہاں! تو پھر میں پنجاب کی طرف جا نکلا اور لاہور کے ایک چندن پیڑ افتخار جالب تک اپنی آواز کا ایک جھونکا بھیجا کہ چندن پیڑ رے چندن پیڑ! میں آیا ہوں' تم اچھے تو ہو؟ اور پھر اُدھر سے آواز کا ایک جھونکا آیا اور پھر ہم دونوں پیڑ رات میں سویرے تک ایک دوسرے کی سرسراہٹ سُنتے رہے۔ چندن پیڑ کا نام آیا تو مجھے ایک کہانی یاد آئی' جو مجھے میری اماں نرجس نے سُنائی تھی۔

''ایک بادشاہ تھا' اس کے کئی بیٹے اور بیٹیاں تھیں' سب سے چھوٹے بیٹے کا نام شہزادہ گل فام گلگوں قبا تھا اور سب سے چھوٹی بیٹی کا نام شہزادی زرنگار زریں پوش' وہ اتنی خوب صورت تھی کہ ہنستی تو پھول جھڑتے اور روتی تو موتی۔ ایران و توران اور چین و ماچین میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا''۔ چین و ماچین کا نام آیا تو مجھے ایک خیال نے ستایا کہ میرے لیے چین کا راستہ تو کُھلا ہے اور اس شہر کا دروازہ بند ہے' جس کے ایک محلے کی ایک گلی کے ایک گھر' اس کے آنگن میں مجھے یہ کہانی سُنائی گئی تھی۔ ''جونی! کیا نندیا آ گئی؟ نہیں تو' پھر کیا ہوا؟'' پھر یہ ہوا کہ شہزادہ گل فام اپنی بہن شہزادی زرنگار پر سو جان سے عاشق ہو گیا اور ملکہ سے کہا کہ میں تو زرنگار سے بیاہ کروں گا۔ ملکہ نے کہا: دماغ چل گیا ہے' کہیں بہنوں سے بھی بھائیوں کا بیاہ ہوتا ہے' شہزادہ بولا' اگر زرنگار سے میرا بیاہ نہ ہوا تو میں جنگلوں' بیابانوں میں نکل جاؤں گا یا سنکھیا کھا کے سو رہوں گا۔ سارے محل میں ایک کھلبلی پڑ گئی' تُو چل میں چل' پھر سب نے سمجھایا' پر شہزادہ نہ مانا' جب کسی کا بس نہ چلا تو بادشاہ اور ملکہ نے ہامی بھر لی اور بیاہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ بیاہ کے دن۔ ''جونی! کیا نندیا آ گئی؟ نہیں تو' پھر کیا ہوا؟'' ہاں تو بیاہ کے دن انّا' شہزادی کے پاس گئی اور کہا' غسل کے لیے پانی تیار ہے۔ شہزادی نے کہا' تم چلو

ہم ابھی آتے ہیں۔ انا کے جاتے ہی شہزادی اُٹھی اور چندن پیڑ پر چڑھ گئی' جو صحن میں کھڑا تھا۔ انا پھر آئی تو شہزادی کو وہاں نہ پایا۔ شہزادی کی سہیلیوں اور کنیزوں نے بتایا کہ شہزادی چندن پیڑ پر بیٹھی ہے۔ پھر سب پیڑ کے نیچے گئیں اور شہزادی سے اُتر آنے کو کہا' پر وہ نہ اُتری۔ آخر شہزادی کی منجھلی بہن آئی اور اس نے کہا' اُتر آؤ! اُتر آؤ بہن ہماری! پانی ٹھنڈا ہو رہا۔ زرنگار بولی' پہلے تو آپ تھیں بہن ہماری' اب ہو گئیں آپ نند ہماری' چندن پیڑ تُو بڑھ کیوں نہ جا' اور چندن پیڑ بڑھ گیا۔ منجھلی بہن آنسو پونچھتی ہوئی واپس گئی تو منجھلی بہن آئی۔ اسے بھی زرنگار نے یہی جواب دیا' پھر بڑی بہن آئی' اس نے بھی یہی جواب سُنا۔ پھر زرنگار کا ایک بھائی آیا جو شہزادہ گل فام سے بڑا تھا۔ اس نے کہا' اُتر آؤ! اُتر آؤ بہن ہماری! پانی ٹھنڈا ہو رہا۔ زرنگار نے کہا' پہلے تو آپ تھے بھائی ہمارے' اب ہو گئے آپ جیٹھ ہمارے' چندن پیڑ تُو بڑھ کیوں نہ جا' چندن پیڑ جو شہزادی کے کہنے پر ہر بار اُونچا ہو جاتا تھا اور کچھ اُونچا ہو گیا۔ پھر اور بھائی آئے اور زرنگار کا جواب پا کر سر جھکائے ہوئے چلے گئے۔ پھر بادشاہ سلامت سر جھکائے ہوئے آئے۔ پیڑ کے نیچے جا کر سر اُٹھایا اور آواز دی' اُتر آؤ! اُتر آؤ بیٹی ہماری! پانی ٹھنڈا ہو رہا' زرنگار نے درد بھری آواز میں جواب دیا' پہلے تو آپ تھے بابا حضرت ہمارے' اب ہو گئے آپ سسر ہمارے' چندن پیڑ تُو بڑھ کیوں نہ جا۔ چندن پیڑ اور اُونچا ہو گیا۔ کیا اس دادی آمنہ والے نیم سے بھی اُونچا؟ "ہاں! اس سے بھی اُونچا" خیر جب بادشاہ سلامت اپنی کمر پکڑے ہوئے واپس ہوئے تو کچھ دیر بعد کنیزیں ملکہ کو سنبھالتے ہوئے لائیں اور پیڑ کے نیچے تک لے گئیں' ملکہ نے کراہتے ہوئے پکارا' اُتر آ! اُتر آ' بیٹی ہماری! پانی ٹھنڈا ہو رہا۔ زرنگار نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا' پہلے تو آپ تھیں اماں حضرت ہماری' اب ہو گئیں آپ ساس ہماری' چندن پیڑ تُو بڑھ کیوں نہ جا۔ اور چندن پیڑ اور اُونچا ہو گیا"۔ اماں! تو کیا چندن پیڑ اتنا اُونچا ہو گیا' اتنا اُونچا ہو گیا' جتنا اُونچا وہ بادل کا ٹکڑا ہے' وہ۔ "ہاں! اب تو پیڑ بادلوں سے باتیں کر رہا تھا تو ملکہ کے جانے کے بعد خود شہزادہ گل فام آیا۔ اب سارے کے سارے وہیں آن کھڑے ہوئے تھے۔ وہ دولھا بنا ہوا تھا' پر ابھی سہرا نہیں بندھا تھا۔ شہزادے نے آواز دی' اُتر آؤ! اُتر آؤ بہن

ہماری! پانی ٹھنڈا ہو رہا۔ زرنگار نے کہا اور اس کی کہن کو ہوا نے نیچے پہنچایا کہ پہلے تو تم تھے بھائی ہمارے اب ہو گئے تم شوہر ہمارے چندن پیڑ تو پھٹ کیوں نہ جا۔" جونی! ہاں ہاں اماں! پھر کیا ہوا؟" پھر چندن پیڑ پھٹ گیا اور شہزادی زرنگار اس میں سما گئی۔ ہر طرف ایک کہرام مچ گیا اور سب عورتیں چندن پیڑ کے بیچ میں بیٹھ کر بین کرنے لگیں"۔

تو یہ تھی چندن پیڑ کی کہانی۔ اور ابھی سنا گیا ہے کہ میں نے جس سرزمین میں یہ کہانی سنی تھی اس کا راستہ اب شاید کھل جائے گا اور یہ غبار چھایا ہوا ہے وہ دھل جائے گا۔

پھر میں نے ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں والے ایک وجود کو اپنی سرسراہٹ کا پیام بھیجا۔ عبدالعزیز خالد مجھے انجیر کا پیڑ لگے کہ جنت کے پیڑوں میں سے ایک پیڑ ہے۔ بڑا انجیر کا ایک ایسا پیڑ جس میں کئی قسم کے میٹھے پھل آتے ہوں یعنی آم بھی انجیر میں آم۔ اور پھر ہم دونوں نے شاخ در شاخ ہو کر وہ باتیں کیں جو موسیٰ نے حورب کی جھاڑی کی آگ میں سے سنی تھیں۔ پھر میری پھننگوں پر...... میرے جس بھائی نے سایہ ڈالا وہ وزیر آغا تھا۔ یہ برگد کے پیڑ کا سایہ تھا اور میں اس سائے کے بھید میں کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ برگد کا پیڑ ایک پوری تاریخ بھی ہوتا ہے اور ایک پورا جغرافیہ بھی۔ یہ کیسی ہوا آئی دھلے دھلے سے ہریالے پتوں کی ہوا جیسے پیپل کا پیڑ میرے سامنے ہو۔ ہاں پیپل کا پیڑ منیر نیازی۔ میاں اس پیڑ پر تو کچھ اثر ہے کہ جو بدروح بھی اس کے نیچے سے گزری وہ اس میں اُلٹی ٹنگ گئی۔ آگے چلو! یہ جو صلاح الدین محمود ہیں انھیں سرو نہ ہوں تو کیا ہوں پر اُن کے لہجے کی مٹھاس سے گمان گزرتا ہے کہ کسی دن اس سرو میں شریفے نہ آنے لگیں۔ اب میں اپنے تھانولے پر جس کے برابر کھڑا ہوں وہ ہمارا یار آغا سہیل ہے جو مجھے کھجور کا پیڑ لگتا ہے۔ اس کی جڑیں زمین کے اندر ایک دو بالشت تک ہی تو گئی ہیں۔ دھت تیرے کی۔ سنا! اس کا پھل تو منہ میں فوراً گھل جاتا ہے پر گٹھلی بڑی سخت جاں ہے کہ آپ یاری تک نہیں چاہتی اور نہ جانے کب سے کہاں کہاں بکھرتی اور برگ و بار لاتی چلی آ رہی ہے۔ لو وہ دکھائی دے گیا جیسے کیلا ہو اور اکیلا کھڑا ہو کون؟ اظہر جاوید ارے باؤلے تو اکیلا نہیں ہے۔ تیرے دکھائی دیتے ہی یہ دوسرا کون دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں رنگ کی ایک پچکاری ہے اور اس میں ہرا رنگ بھرا

ہے۔اس نے وہ پچکاری مجھ پر چلائی ہے اور میں ہرا دکھائی دینے لگا ہوں۔ یہ عطاء الحق قاسمی ہے اور پیڑ یہ زیتون کا ہے کہ اس کا روغن کھانے میں بھی کام آتا ہے اور لگانے میں بھی۔ یا اخی یا اخی سیّد قاسم محمود! ہاں ہم گناہ گار ہم فی النار مگر ایسی بھی بے ادائی کیا۔ تمھاری سہی قامتی کو دیکھ کر تو شجرِ طوبیٰ کا نام لبوں پر آتا ہے۔ میر صاحب! ہمیں بھی اس کے سائے میں بیٹھنے دو گے یا نہیں؟ میر صاحب چلے گئے۔ اور یہ انور سجاد جو ہے میاں افتخار جالب! بہی کا پیڑ ہے بہی کا کہ مربا جس کا مقوی دماغ ہوتا ہے اور بہی دانے کو نہ بھول جائیو کہ وہ دوا میں کام آتا ہے اور سُنو کہ سیّد سجاد باقر رضوی کو دیکھا تو یاد آیا کہ یار ہمارا تو کوئی گھر ہی نہیں ہے۔ سو ایک گھر بنانا چاہیے جس کے دروازے مہاگنی کی لکڑی کے ہوں کہ مضبوطی میں اپنا جواب نہیں رکھتی پر ہوتی بہت مہنگی ہے۔ لو! گھر بنانے کا منصوبہ پھر دھرا رہ گیا۔ سیّد انتظار حسین پر نگاہ پڑی تو دل میں کاہی ڈنڈا کھیلنے کا شوق پایا سوانھیں پلکھن ٹھہرایا منیر نیازی پیپل اور سیّد انتظار حسین پلکھن۔ اور یہ جو ہیں اس وقت تم جن کے سامنے ہو ان کا کوئی نام نہ رکھ دینا۔ یہ تم سے بہت بڑے ہیں برادرِ محترم جناب احمد ندیم قاسمی ہیں یہ سُن لیا بڑوں کے نام نہیں رکھا کرتے۔ پر اور کوئی بڑوں کے نام جو رکھے ہیں؟ بس ہم نے کہہ دیا انھیں کوئی پیڑ نہ گردانا باغ و بہار جاننا۔ لاہور میں قسم قسم کے پیڑوں کا ایک باغ دیکھا جس میں کتنے ہی قلمی پیڑ اپنے سائے پھیلائے ہوئے تھے۔ مسعود منور جو میری اپنی قلم ہے اور ذوالفقار احمد تابش سلیم اختر خالد احمد سرمد صہبائی یوسف کامران کشور ناہید رشید انور حفیظ صدیقی حسن نثار مظفر کاظمی اور ہاں میاں! حضرت ظہیر کاشمیری...... جیسے کسی پہاڑی پیڑ کی شاخ پر کوئی عقاب آن بیٹھا ہو۔ اس باغ کی چھاؤں نے میرے کان میں کہا کہ دھوپ کتنی بھی تیز کیوں نہ ہو اپنی لہک اور لہلہاہٹ نہ ہار جائیو۔ تو کیا پیڑوں کے بھی کان ہوتے ہیں؟ ہاں! پیڑوں ہی کے تو کان ہوتے ہیں کہ پیڑ چوبائی ہواؤں کی بات سُنتے ہیں اور انسان اپنی بات بھی نہیں سُن پاتا۔ میں تو انسانوں میں پیڑوں کو تلاش کرتا ہو۔ اور وہ سب کے سب انسان مجھے پیڑ لگتے ہیں جو میری سائیں سائیں سُنتے ہیں اور جن کی سرسراہٹ میں سُنتا اور سمجھتا ہوں۔ سو ہم سب پیڑ ہیں کسی کی جڑیں زمین میں زیادہ گہری ہیں اور کسی کی جڑیں

زمین میں اپنا پنجہ گاڑنا چاہتی ہیں۔ اور میں...... ایک اور میں، یہ کہتا ہوں کہ تاریخ میں اپنی تخم ریزی کرو، تاریخ میں اپنا پنجہ گاڑو! تاریخ؟ ہاں! تاریخ...... اچھا، تاریخ...... سمندر کے کنارے کی ایک سطح پر ایک کائی۔ پر، سمندر کے اُوپر کائی جمنے کہاں پاتی ہے۔ کائی سے پیڑ تک میں اور پیڑ سے کائی تک میں، اور میں اور سمندر اور زمین ویران اور سنسان تھی اور خداوند خدا کی روح پانیوں پر تیر رہی تھی۔ "و کانت الارض خربةً وخالیةً وروح اللّٰه یرّف علیٰ وجه المیاه" پانی اور سمندر؟ ہاں پانی اور سمندر، اچھا سمندر۔ ہرا سمندر گوبھی چندر، بول میری مچھلی کتنا پانی؟ ریزوں کے ایک ریزے کی تین تہائی گیلاہٹ، ہے نا۔ اور سورج اور کہکشاں اور پھر کہکشائیں اور پھر کہکشاؤں کی ایک دوسرے سے دُوری اور گریز۔ بھلا کس کی جڑیں زمین میں بہت نیچے تک ہیں اور کس کی اُپرالو۔ پر میں آخر کہنا کیا چاہتا ہوں۔ زاہدہ حنا اور محمد علی میں جو چاہتا ہوں کہ میں ایک پیڑ ہوتا اور پھر میں نے یہ گردانا کہ جیسے میں ایک پیڑ ہوں تو میں آخر کہنا کیا چاہتا ہوں؟ اور اگر میں ایک پیڑ ہوں تو اپنے ہی پتے کیوں نہیں گنتا اور اپنی ہی سائیں سائیں کیوں نہیں سنتا، دوسروں کے کان کیوں کھاتا ہوں؟

عالمی ڈائجسٹ، اکتوبر 1974

شام کی آوازوں کے ساتھ

لے بھائی اب اپنے ٹھیے پے آن بیٹھ' شام ہوگئی۔ ٹھیے پے آن بیٹھ۔ کون؟ تُو اور کون۔ میں' اچھا میں۔ تو میں اپنے ٹھیے پے آن بیٹھوں' شام ہوگئی۔ اُداس شاموں میں سے ایک اور شام۔ بڑی اُداسی ہے' ہے تو' پر اُداسی کب نہ تھی۔ اور اُداسی میں کچھ اور بھی ہے۔ کیا ہے؟ یاد ہے اور یاد میں خیال ہے اور خیال میں موسم ہے۔ کہاں کا موسم؟ کہیں کا بھی موسم۔ ''ہاں'' کا بھی موسم ''نہیں'' کا بھی موسم۔ یہ تو ہے' یہی تو ہے۔ اور موسم میں آنگن ہیں' بَن ہیں' جلسے ہیں اور جنگل ہیں اور ان میں خوش بو ہے اور خوش بو میں پھر ایک آنگن ہے اور آنگن میں کھیل ہے۔ میرا ہِتّھو کون؟ میں پر میں خود بھی تو ایک کھیل ہوں جیسے چادر چھپّول۔ اور میں ایک کھیلنے والا بھی تو ہوں۔ کیوں نہیں ہوں۔ اچھا تو پھر بتا کہ چادر میں کون ہے؟ جون ہے۔ میں چادر میں چھپوں اور سانس تک نہ لوں' پھر بھی پہچان لیا جاؤں...... وہ تو...... لعنت ہے اس پہچان پر۔ کبھی تو مجھے نہ پہچانا جائے۔ تجھے نہ پہچانا جائے اور ہم ہی نہ پہچانیں؟ ہاں اور کیا اور وہ یوں کہ یہاں مجھے کون پہچانتا ہے۔ ہم تو پہچانتے ہیں۔ ہم تو پہچانتے ہیں؟ کون ''ہم'' کون ہو تم؟ ہم تیری گلی کی چیخ پکار' ہم تیرے گھر کی گونج۔ میرا گھر؟ وہ تو ڈھے گیا۔ ہم تیرے آنگن کی دُھوم۔ میرا آنگن؟ وہ تو اب ایک کھنڈر ہے۔ ہاں یہ تو ہے۔ پھر تم کون ہو؟ ہم تیرا پچھتاوا۔ تُو ہمارا پچھتاوا۔ اور پھر ہم سب بکھر گئے۔ بکھر گئے؟ ہاں بھائی پچھتاوے تک بکھر گئے۔ ہم بکھر گئے۔ ہم اور ہم' ہم سب ایک دوسرے کا پچھتاوا ہیں۔ وقت میں وہ کیا ہے جو کسی کا اور کبھی کا پچھتاوا نہیں۔ آوازو! آوازو! تم کہاں ہو؟ ہم وہیں ہیں۔ تو یہ ہے۔ پر میں یہ جانوں کہ تم یہیں ہو۔ اور یہ تو کہو کہ تم سب کی سب ہو تو؟ ہاں ہم

سب کی سب ہیں تو۔ پر ہم میں سے بہت سی آوازیں مر چکی ہیں۔ ایسا ہے! ایک بات پوچھوں؟ پوچھ! کیا ایسی بھی آوازیں ہوتی ہیں جنھیں اپنی ہی بستیوں میں مرنے کا سکھ نصیب ہو جاتا ہے اور وہ بے وطنی کے قبرستانوں میں نہیں بھٹکتی پھرتیں۔ ہاں ہاں کیوں نہیں ہوتیں۔ تو پھر ایسی آوازیں مجھ ایسے کو کیوں آواز دے رہی ہیں۔ کیا ترسانے کے لیے کیا ستانے کے لیے۔ پگلے' تلاؤ کے پگلے! کہیں مرے ہوؤں سے بھی لڑتے ہیں۔ کہیں موت سے بھی جھگڑتے ہیں؟ بُری بات۔ اچھا تو میں پگلا ہوں۔ ذرا مجھ سے بحث تو کرو! تجھ سے بحث کریں' کیا تُو نے ابھی تک بحثا بحثی کی عادت نہیں چھوڑی؟ چھوڑنے کی بات کرتی ہو' میں نے تو کچھ بھی نہیں چھوڑا اور میں اپنے پیچھے بھی کچھ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ تو کچھ اور ہی بات ہوگئی۔ یہ تُو نے ایک نیا جھگڑا نکالا۔ خیر میں کوئی نیا جھگڑا نہیں نکالتا۔ ہاں تو میں مرے ہوؤں سے لڑ رہا تھا' موت سے جھگڑ رہا تھا۔ ہم بہت اُداس آوازیں ہیں۔ ہم سے لڑ نہیں' ہم سے جھگڑ نہیں۔ بھلا ہم سے کیا بحث' ہم سے کیا تکرار' نہیں نہیں' میں تم سے بحث نہیں کر رہا اور بھلا میں بحث کروں گا' میں جو ہر بحث ہار چکا ہوں۔ میں تو بس باتیں کروں گا۔ مجھے اپنے آپ سے باتیں کیے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا ہے۔ اتنا زمانہ کہ میری کنپٹیاں سفید ہو گئی ہیں۔ نہیں یوں سمجھو کہ میرے سر کے سارے بال سفید ہو گئے ہیں۔ میری نگاہ کی پلکیں تک سفید ہو گئی ہیں۔ میری اُنگل کی کمر تک جھک گئی ہے۔ اب میں تم سے باتیں کروں اور اپنے لہجے کے سینے میں اپنے اُلجھے ہوئے سانس بھروں۔ سورج ڈوب چکا ہے۔ اس وقت آنگن بھرا ہوتا تھا۔ کرسیوں اور مونڈھوں کے آگے حقّے تازہ کر کے رکھ دیے جاتے تھے اور روزہ افطار ہوتے ہی ہم گلی میں شور مچاتے نکل جاتے تھے۔ روزے والو! روزہ افطار ہو گیا۔ اب تو گلی میں پنکھے والے فقیر اور نقارے والے فقیر آ گئے ہوں گے۔ اللہ والے! دم سے دیدار' دھم۔ میرے دل میں دیدار کی آگ بھڑک رہی ہے۔ میری آنکھوں میں دیدار کی قیامت پیاس ہے۔ سو میں رمضان کی بات لے بیٹھا۔ ٹھیک تو ہے یہ رمضان ہی کا تو مہینا ہے تو پھر تو ٹھیک ہے۔ رمضان کا مہینا ہے' رمضان جو "رمض" سے ہے۔ "رمض" گرمی کی سوزش' غصّے کی حرارت' عربوں کا تیسرا مہینا اور پھر مسلمانوں کا نواں مہینا۔ انھوں نے یعنی

ہم نے عربوں نے اپنے ہر مہینے کا نام موسم کے حساب سے رکھا تھا اور رمضان کا مہینا اس موسم میں پڑتا تھا جب آسمان سے آگ برس رہی ہوتی تھی۔ سو اس مہینے کا نام رمضان رکھا گیا۔ یہ نام مسلمانوں نے نہیں رکھا۔ ذرا سُنتا برابر سے ایک آواز آ رہی ہے۔ جناب نورالامین کی موت پر سارے ملک نے دلی رنج کا اظہار کیا۔ مرحوم نے پاکستان کی خاطر بنگلا دیش کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا اور جلاوطنی کی زندگی قبول کی۔ یہ تو ہے۔ مگر میں تو ہر وطن میں بے وطن ہوں۔ ہوں کہ نہیں۔ ہم زندہ اور مردہ آوازیں تجھے یاد دلاتی ہیں کہ تُو نے بحث نہ چھیڑنے اور بس باتیں کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ باتیں کر اور ایسی باتیں نہ کر جن سے بحث بھڑک اُٹھتی ہے۔ میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔ پھر بھی اگر بحث بھڑکتی ہے تو بھڑک اُٹھے۔ مجھے کیا پروا۔ تجھے نہیں، ہمیں تو ہے۔ ہمیں تو آخر تیری پروا ہے۔ میری کوئی پروا نہ کی جائے کہ مجھے خود اپنی کوئی پروا نہیں۔ اور تمھاری بھی تو میں نے کوئی پروا نہیں کی۔ کی ہوتی تو کیا میں تمھیں اندھوں کی طرح دیکھ رہا ہوتا اور بہروں کی طرح تمھاری سُن رہا ہوتا۔ زندہ اور مردہ آوازو! جواب دو۔ تم جواب دو۔ تم جو نہ تو نگاہوں کے کناروں تک کہیں دکھائی دیتی ہو اور نہ شنوائی کے گزاروں تک کہیں سُنائی دیتی ہو۔ مگر ہم نے تو چاہا ہی یہی تھا کہ بس تُو دکھائی دے اور بس تُو سُنائی دے، ہم نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو کہ میں شہر میں سب سے اُلجھتا پھروں۔ میں جو ایک بحث کرنے والا ہوں جب کہ ہر بحث ہار چکا ہوں، میں جو مروڑی اور مرنڈی دلیلوں کے کانوں میں چنگاریاں بھرنے والا ہوں، میں جو حجت اور تکرار کے تیکھے تیوروں پر تو تکار کے ساتھ تہمتیں دھرنے والا ہوں۔ وہ میں، بس تمھاری خاطر باتیں کرنے پر راضی ہوں۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تُو ہماری خاطر باتیں کرنے پر راضی ہے۔ مگر کیا سچ مچ؟ نہیں میں نے ایک سچّی بات جھوٹ کہی۔ میں تمھاری خاطر نہیں اپنی خاطر بحث چھوڑ کر اب باتیں کرنے لگا ہوں۔ میں بحث کرنے والا نہیں رہا ہوں۔ بھلا وہ کیا بحث کرے گا جو شنوائیوں کی خوشامد کرنے والا ایک باتونی بن کر رہ گیا ہو اور جس کو بھی اپنے سامنے پاتا ہو اس کی سی کہتا ہو اور یہی اس کی کرامت ہو اور یہی اس کی کمائی۔ تو یہ ہے تُو؟ ہاں یہ ہوں میں۔ پر ہاں میری اس ''میں'' اور میری اس ''تو'' میں

بہت سے ہم اور بہت سے تم گراہ رہے ہیں۔ خبردار ایسی بات نہ کر۔ ہماری مصلحت مان اور اپنے ساتھ اپنے ایسوں کو نہ سان۔ تیرا بھگتان بس تیرا بھگتان۔ اور تُو بھی اپنا بھگتان کیوں بھگتے۔ میں اپنا بھگتان نہیں بھگتوں گا تو پھر اور کون بھگتے گا؟ تیرا بھگتان اور کون بھگتے گا؟ ہم ساری زندہ اور مردہ آوازیں تجھ سے پوچھتی ہیں کہ اب تک تیرا بھگتان بھلا کس نے بھگتا؟

زندہ اور مردہ آوازو' اُداسیو اور یادو اور خیالو! میرا بھگتان بھلا کس نے بھگتا' بتاؤ نا؟ پگلا' ہم سے ہی پوچھتا ہے کہ میرا بھگتان بھلا کس نے بھگتا' پگلا' تلاؤ کا بگلا۔

عالمی ڈائجسٹ' نومبر 1974

ایک نام

یہ گویائی کی شام ہے اور شنوائی کی جگہ یہاں سے وہاں تک خالی پڑی ہے۔ سو میں خاموش ہی رہوں، خاموشی سینے کا آرام ہے اور نہ اس میں کوئی تہمت ہے اور نہ الزام۔ پر مجھے سینے کا آرام چاہیے کب! اور تہمت اور الزام سے میں نے بھلا کب چھٹکارا چاہا ہے؟ خاموشی میرے بس کا روگ نہیں، اس سے تو میری جان نکلتی ہے۔ نکلتی ہے تو نکلا کرے۔ بھلا کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں شنوائیوں کو گلیوں اور بازاروں سے پکڑ کر تو لانے سے رہا۔ اچھا! تو پھر یہ کیا جائے کہ میں اُٹھوں اور سامنے جا کر بیٹھ جاؤں۔ وہاں سے اُٹھ کر اُدھر جا بیٹھوں اور پھر اُدھر اور اس طور اپنے جسم کے نشان اِدھر اُدھر بٹھا کر اپنی جگہ آ جاؤں اور ساتھ ہی یہ بھی کروں کہ دُور دُور کی شنوائیوں کو اپنے دھیان میں لاؤں اور اس طرح دھیان میں لاؤں کہ انھیں اپنے سامنے پاؤں۔ یہ تو بہت اچھی سوجھی۔ شام کو مجھے بہت اچھی ہی سوجھتی ہے۔

ساری جگہ شنوائیوں سے بھر گئی ہے، سو اب میں گویائی میں آیا چاہوں۔ ہاں تو میں نے تمھیں اس لیے یاد کیا ہے کہ تم میری اُوٹ پٹانگ باتیں سُنو اور جو چُننے کا نکتہ ہو اُسے چُنو۔ بات یہ ہے کہ میرا ہونا میرے ہونٹ ہلانے کے سوا بھلا اور کیا ہے۔ سو میں نے کان ہلائے ہیں، ہونٹ نہیں ہلائے۔ جیسا کہ تم نے جان لیا ہوگا: مجھے اپنے ہلتے ہوئے ہونٹوں کے سوا کسی کے ہلتے ہوئے ہونٹ نہیں بھاتے۔ اس میں ایک نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر میرے آگے دوسرے بھی اپنے ہونٹ ہلانے پر آ جائیں تو مجھے اپنے ہونٹوں کا سارا ہنر ہیچر میچر لگنے لگے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ جو اپنی کہے اور دوسرے کی نہ سُنے، اُسے بھلا مانس جانو۔ وہ ایک ایسا آدمی ہے جسے اپنے بارے میں کوئی دھوکا نہیں اور وہ یہ بات جانتا ہے اور

مانتا ہے کہ اگر دوسرے بولے تو پھر اس کے ہونٹوں کی جیب میں ہکلاہٹ کے سوا اور کچھ نہ بچے گا۔ سو میں ہی بولوں گا اور کسی اور کو نہ بولنے دوں گا کہ میں ایک بھلا مانس ہوں اور مجھے اپنے بارے میں کوئی دھوکا نہیں ہے۔ میں کبھی اپنے بہکاوے میں نہیں آیا۔

پر ہے یوں کہ سب کچھ، سچ مچ سب کچھ بہلاوا اور بہکاوا ہے۔ جس نے کہا کہ میں کبھی اپنے بہکاوے میں نہیں آیا۔ اس نے اپنے آپ کو بڑا ہی بُرا بہکانا بہکایا اور جس نے اپنے نزدیک اپنے بارے میں کوئی دھوکا نہیں کھایا' اس نے بہت بھیانک دھوکا کھایا۔ میں اور تم' ہم سب دھوکے میں آئے ہوئے اور بہکائے ہوئے ہیں۔ ہمیں گویائیوں نے بھی بہکایا ہے اور شنوائیوں نے بھی۔ جو کہا جاتا ہے وہ بھی اور جو سُنا جاتا ہے' وہ بھی سب بہکاوا ہے۔ میں ان سارے بہکاووں کے لیے اپنے سینے میں نفرتیں بھرے ہوئے ہوں اور چاہتا ہوں کہ ان نفرتوں کو بُری طرح اُنڈیلوں۔ بہکاووں نے زمینوں اور آسمانوں میں چھاؤنی چھالی ہے۔ تم بھی سچ اور سچائیوں کے آس پڑوس سے بہت دُور ہو اور میں بھی وہاں سے دُھتکارا ہوا ہوں۔ ایسے میں بھلا میں کیا کروں اور تم بھی کیا کرو۔ ہمارے بس میں جو کچھ بھی ہے وہ شاید یہ ہے کہ ہم اپنے کسی ایسے سچ اور اپنی کچھ ایسی سچائیوں کے گمان میں گُم ہو جائیں جن پر ہمیں سچ اور سچائی کا گمان گزرتا ہو۔ بس مان لیا جائے کہ ایک سچ ہے' کچھ سچائیاں ہیں جو ہمارے اور تمھارے گمان کے گھروں میں رہتی آئی ہیں' جن کے گمانوں میں ہم اور تم اپنے گھر بساتے چلے آ رہے ہیں۔ سو اگر وہ سچ کچھ ہے اور اگر وہ سچائیاں کچھ ہیں تو ان کا ایک ہی نام ہے اور وہ زندگی ہے' اس نام کو سکیڑ لو' سکیڑ لیا؟ اب میں اسے بکھیرتا ہوں۔ جو کچھ بکھیرا گیا۔ اس میں ہمارے لیے سب سے کام کی چیز انسان ہے۔ اس نام پر نہ تیہا دکھاؤ اور نہ تکرار کرو۔ تم اور ہم وجود کے اس ڈراؤنے پھیلاؤ میں اس کے سوا اپنے لیے بھلا اور کیا سمیٹیں گے۔ زمین کے بیٹے بھلا اور کس نام پر اینٹھیں گے۔ پر یہ بھی سُن لو کہ زمین کی تو ایسی کی تیسی۔ میں تمھاری اس زمین کو گھوڑے کی مکھیوں کے پروں سے لسی اور لتھڑی ہوئی گند سے بھی زیادہ گھٹیا اور گھناؤنا جانتا ہوں کہ اس پر یہ اینڈا بینڈا جان دار انسان کُلبلاتا ہے۔ پر سوچنے کی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ اگر ہم اس اینڈے بینڈے سے نباہ نہ کریں تو پھر کیا

کریں۔ تم اس چار دیواری کے بیچ رہنے والے کیڑے مکوڑوں سے پوچھ لو' مچھر وں سے قسم دلا کر معلوم کرلو۔ میں انسان کے بارے میں کبھی جانب دار نہیں رہا۔ مجھے تو اس کی بُناوٹ اور بَناوٹ ہی سے بیر ہے۔ پھر بھی' ہمیں اسی کے ساتھ زندگی تیر کرنا ہے۔ جب ایسا ہے' تب ایسا ہو کہ ہم اس بُناوٹ اور بَناوٹ کے سوا۔ انسان کے سوا انسان میں اور کچھ نہ ڈھونڈیں اور انسان کا انسان ہی سے رشتہ جوڑیں۔ جو بھی جو کچھ ہے وہ اپنے لیے ہے۔ پر ایک دوسرے کے لیے تو وہ بس ایک انسان ہے۔ سب سے پیچھے بیٹھی ہوئی شنوائیو! میں جانوں کہ تم مصر کے اخناتون اور بابل کے حمورابی کی کسی پہلی پشت سے ہو۔ بھلا تم کیا جانو کہ یہودی کسے کہتے ہیں؟ بدھ مت کے ماننے والے کون ہوتے ہیں؟ ہندو کس چیز کا نام ہے؟ عیسائی کس کام آتا ہے؟ مسلمان کی کیا حیثیت اور اہمیت ہے؟ ہم تم سے زیادہ جانتے ہیں اور تم سے زیادہ ایک دوسرے کی جان کو آتے ہیں۔ ہمارے جاننے میں کتنے جنجال ہیں' بس پوچھو مت۔

عالمی ڈائجسٹ' دسمبر 1974

(یہی انشائیہ سسپنس' جون 2001 میں ''جنجال'' کے عنوان سے شائع ہوا)

سفید کنپٹیوں کی سال گرہ

ذرا سُنتا! آنگن میں جتنے پاؤں بھی اِدھر سے اُدھر اُٹھ رہے ہیں' کیا وہ اس وقت میرے حجرے کی طرف اُٹھ سکتے ہیں۔ کیوں میں کوئی ٹکےچل بات تو نہیں کہہ رہا؟ بھلے مانسو! ٹے آواز دے رہا ہوں۔ میں۔ افسوس! پاؤں بھی کھوپڑی کی آواز نہیں پہچانتے۔ ہاں چلے آؤ' دراز بند نہیں ہیں' بھڑے ہوئے ہیں' تم اپنے اپنے ہونٹوں کے کش اور اپنے اپنے دھوؤں کے مرغولوں کے ساتھ اور ان کا ایندھن جیبوں میں ڈال کے اور اپنے قلم جیبوں سے نکال کے بس یہاں آن بیٹھو۔

میرے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا' اس کے برابر والی اُنگلی اور اس کے برابر والی اُنگلی' ان تینوں پر بہت بُری بیتی ہے۔ میرے قلم نے ان کی کھال اُدھیڑ کے رکھ دی ہے۔ اتنی سطریں کھینچی ہیں کہ میری یہ اُنگلیاں سقوں کی سی اُنگلیاں لگتی ہیں۔ سُنتے ہو؟ بات یہ ہے کہ سینے سے صفحوں تک کا لگاتار سفر کرتے کرتے میرے حرفوں کے سانس پُھول گئے ہیں اور ان کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا ہے۔ سو اَب یوں ہو کہ اپنے حرفوں کو اپنے سینے سے ہونٹوں تک تو میں لاؤں اور انھیں صفحے تک تم پہنچاؤ۔ میری یہ تینوں اُنگلیاں قلم کی کوئی چاکر نہیں ہیں کہ اس کی خدمت گزاری کرتے کرتے شل ہو جائیں۔ بھلا کب تک اور بھلا کیوں؟ مگر میں نے تمھیں بلا کر یہ کڑواہٹ بھلا کس خوشی میں پلانی شروع کر دی؟ غصہ اپنے اُوپر آتا ہے اور اتارتا ہوں' دوسروں پر۔ مگر تم دل بُرا نہ کرو۔ تم جانو مجھے بیٹھے بٹھائے آزار سہنے اور آزار پہنچانے کی لت پڑ گئی ہے۔ سچ سچ' میں نے تو اپنے آپ کو ہمیشہ اسی حال میں پایا کہ چاہے نچنت بیٹھا ہوں' چین سے ہوں پر چنچنا رہا ہوں۔ سو میری اس چنچناہٹ کو ایک چھل جانا

جائے اور تم میں سے جو جو بھی چاہے وہ میرے لفظوں کو روشنائی پہنائے اور صفحے کی نشستوں پر بٹھائے۔

تو ایسا ہے کہ ان دنوں مجھے میرے باہر نے بہت آرام پہنچایا۔ جیسی ہونی ویسی کہنی۔ سچی بات ہے کہ اس بستی نے کچھ ایسے جھنجٹوں سے جھگڑا چکا لیا ہے، جنھوں نے اس بستی کے باشندوں کو ان کی بود و باش کو ان کی اپنی تلاش اور اپنی نئی تراش خراش کی خواہش کو بڑے کھڑاگ میں ڈال رکھا تھا۔ جھلاّہٹ، جھنجلاہٹ، جھگڑا۔ ان جنجالوں سے کسی گروہ نے اور اس کے گہوارے اس کی باش گاہ اور اس باش گاہ کے گرداگرد نے گھٹن اور گھاٹے کے سوا بھلا اور کیا پایا؟ میں سمجھ رہا ہوں کہ تم سمجھ رہے ہو اور ساتھ ہی تم یہ بھی سمجھ رہے ہو کہ میں اپنی بات اپنے آپ کو پوری طرح سمجھا نہیں پا رہا اور تمھارا یہ سمجھنا ایک اچھی سمجھ کا سمجھنا ہے۔ ہاں مجھے اپنی بات اپنے آپ کو اس طور سمجھانی چاہیے کہ سمجھ میں آ جائے۔

پاکستان اور ہندوستان کے بیچ جھگڑوں اور لڑائیوں کا ایک جھمگٹ رہا ہے، جنھوں نے ان دونوں کو بُری طرح اُلجھائے رکھا۔ بڑے اُلجھاوے تھے! بڑے اُلجھٹے تھے سو اُن میں سے کچھ ڈھائی پونے تین برس پہلے سُلجھائے جانے شروع کیے گئے۔ پھر کچھ اور اُلجھنیں سُلجھیں۔ کچھ بکھیڑے اس کے بعد دُور ہوئے اور کچھ اُلجھیڑوں سے پچھلے دو ایک مہینوں میں چھٹکارا ملا اور میں نے جو ابھی یہ کہا تھا کہ ان دنوں مجھے میرے باہر نے بہت آرام پہنچایا تو شاید میں یہی کچھ کہنا چاہتا تھا اور اب میں یہ کہتا ہوں کہ ان دنوں مجھے اپنے اندر سے بہت آرام پہنچا۔ وہ یوں کہ پاکستان کے لیے ہندوستان اور ہندوستان کے لیے پاکستان کے جو دروازے بند تھے وہ کم سے کم اب بند نہیں رہے ہیں اور یہ آرام یہ گمان کر کے ملا کہ جو دروازے ایک دوسرے کے لیے بند نہ رہے ہوں ایک دن ان کے بھڑے ہوئے کواڑ بھی کُھل جائیں گے۔ پاکستان اور ہندوستان، ہندوستان اور پاکستان۔ بے دَر اور بے دروازہ دیواریں۔ یہ ایک ٹھٹول نہیں تو اور کیا ہے۔ اور اب میرے دل کی بات پوچھتے ہو؟ میں تو ساری زمین کے پورب اور پچھم اور اُتر اور دَکھن کو ایک گھر کی چار دیواری دیکھنا چاہتا ہوں۔ سارے انسانوں کا ایک گھر۔ زمین کے اس کنارے سے اس کنارے تک انسان کی ہموار

اور خوش حال زندگی کا ایک گھر ایک گھرانا۔ اور دیکھو سارے انسانوں کی ہموار زندگی کی حسرت کو کبھی نہ بھولنا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اس حسرت کے پورا ہونے کے لیے ابھی بہت سے سورجوں کو ڈوبنا ہے۔ بہت سے سورجوں کو نکلنا ہے اور بہت سی نسلوں کے سر سفید ہونے ہیں تو سارے انسانوں کی ہموار اور خوش حال زندگی کے ایک گھر اور ایک گھرانے کی خوش خبری سُنانا تو آج میرے بس میں نہیں ہے۔ میرے بس میں تو آج رات گہری ہوئے تک بس یہی ہے کہ میں اپنے اس خواب کے بارے میں اپنی شاعری کا ایک خیالیہ تمھیں سُناؤں۔ ویسا ہی خیالیہ جیسا میں نے کل کچھ سُننے والوں کو سُنایا تھا۔ پر ایک بات ہے، وہ یہ کہ سُنتا تو داد ہی دے کر نہ رہ جانا، دعا بھی دینا اور وہ دعا یہ ہو کہ اے باؤلے شاعر! تجھے نئے برس کے پہلے مہینے میں امروہہ دیکھنا نصیب ہو اور ہاں یہ تو بتا دوں! میں جوامروہے میں پیدا ہوا تھا کل ۱۴ ادیں دسمبر کو کراچی میں اپنی سفید کنپٹیوں کی سال گرہ مناؤں گا۔

عالمی ڈائجسٹ، جنوری 1975

تہذیب-۱

غلطی میری ہے کہ شہر میں رہتا ہوں اور جنگل کی طرف نہیں نکل جاتا۔ کیسا وقت غارت ہوا ہے۔ میری تنہائی تو کوئی دُور نہیں کرتا پر اس کا دماغ چاٹنے سب آجاتے ہیں۔ میں قلم کا مزدور اپنی مزدوری بھی نہیں کر پاتا۔ یہ سب کے سب اپنے اپنے کاموں سے نمٹ کے آتے ہیں اور مجھے میرا کام نہیں کرنے دیتے۔ پر لکھنا کوئی کام ہی کب ہے۔ کام تو رشوت خوری ہے، کام تو اسمگلر کرتے ہیں، کمشنر کرتے ہیں، وزیر کرتے ہیں، بینکوں کے افسر کرتے ہیں۔ ہم لکھنے والے کم بخت کام تھوڑا ہی کرتے ہیں، حرام خوری کرتے ہیں، یہ جو ابھی میرے کان کھا کے گیا ہے، جو کوئی افسر یا کاروباری تھا۔ اگر میں کسی دن صبح کے دس بجے اس کے دفتر میں پہنچ جاؤں تو اس کی پیشانی پر ایک لفظ اُبھر آئے اور وہ لفظ قربانی ہو اور پھر یہ شخص اپنے تیوروں سے مجھے گواہ بنائے کہ دیکھو میں ادب کا کتنا بڑا قدر دان ہوں کہ ادب کی خاطر اپنی اتنی قیمتی مصروفیت میں تمھیں برداشت کر رہا ہوں اور اس بات پر کون شک کر سکتا ہے کہ یہ اس کی بہت بڑی قربانی ہوگی اور ایسی قربانی اس شہر میں گِنے چُنے لوگ ہی دے سکتے ہیں ورنہ تو ہم ایسوں کو باہر ہی سے ٹرخا دیا جاتا ہے۔ کوئی بھی اُلّو کا پٹھا ایک لکھنے والے کو ایک گھمبیر مسکراہٹ کے ساتھ چلتا کر سکتا ہے کہ وہ بہت ہی مصروف اور اہم آدمی ہوتا ہے۔ کاروبار اور اقتدار کے شہروں کی چاق چوبند الکساہٹیں اور ارجمند لجاہٹیں ہم میں سے جس کو چاہیں عزت دیں اور جس کو چاہیں ذلت دیں۔

او الکساہٹو، لجاہٹو! تمھاری تو ایسی کی تیسی۔ تاریخ کے چِکلوں کے جنو! تم نے کیا سمجھ رکھا ہے۔ تمھاری اتنی ہمت کہ ہمارے پاس آؤ اور ہمیں اپنا منہ دکھاؤ۔ کیا میں کوئی سرکاری

ادیب اور درباری شاعر ہوں۔ پھر تم میں سے کوئی بھلا میرے پاس کیوں آتا ہے۔ سرکاری ادیبوں اور درباری شاعروں کے پاس ہی جایا کرے' انھیں مداریوں کے گھٹیا نخروں سے جی بہلایا کرے۔ او ہو جون ایلیا' بڑے تیہا دکھا رہے ہو۔ جب وہ افسر یا کاروباری یہاں بیٹھا تھا اس وقت تو میری جان تمھارے ہونٹوں سے شہد ٹپک رہا تھا اور اب وہ کسی چھکلے کے چہ بچے کی کلبلاتی ہوئی گند ہو گیا۔ میری جان! بے ضمیری کی بھی حد ہوتی ہے۔ خیر چھوڑو' تم جو سوچ رہے تھے اور جو کچھ لکھنا چاہتے تھے وہ سوچو اور لکھو اب تو وہ دفان ہو گیا۔

جانے میں کیا سوچ رہا تھا۔ کیا لکھنا چاہتا تھا۔ ہاں میں انسانوں کے جیتے جاگتے رشتوں میں سانس لے رہا تھا اور اپنے آپ سے انھیں کی باتیں کر رہا تھا اور پھر مجھے یہ خیال آیا تھا کہ اب تک ان رشتوں کو کئی دوسرے طریقوں سے توڑنے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں اور اب ''تہذیب'' کے نام پر ان کے خلاف اُکسایا جا رہا ہے۔ آج جب کوئی گروہ اپنی تہذیب کا نام لیتا ہے تو اس کی نیت یہی ہوتی ہے کہ دوسرے کو تپائے اور اس کا مذاق اُڑائے۔ تہذیب کے لفظ کو ایک زہریلا طنز بنا دیا گیا ہے۔ ان دنوں یہاں تہذیب کا بہت چرچا ہے جس نے ایک فتنہ انگیز مناظرے کی سی فضا پیدا کر دی ہے۔ پہلے تو پاکستان کی تہذیب کا نام لے کر آس پڑوس کی تاریخ' جغرافیے' موسم' مزاج' زبان' مذہب اور ماحول کے سارے رشتوں کو جھٹلایا جاتا ہے اور تہذیب کی جو پونجی سب نے مل کر اکٹھی کی ہے اسے برے نیگ لگایا جاتا ہے اور پھر یہ ہوتا ہے کہ پاکستان کے ایک علاقے کا دوسرے علاقے سے جو بھی رشتہ ہے ان میں باہمی وابستگی کی جو بھی صورت پائی جاتی ہے اسے چھوڑ کر سارا زور اس رشتے پر دیا جاتا ہے جو پاکستان کے لوگوں کی اکثریت کے درمیان ہی نہیں پایا جاتا' پاکستان اور افغانستان' پاکستان اور بنگلا دیش کے لوگوں کے درمیان بھی پایا جاتا ہے۔ مانی ہوئی بات ہے کہ یہ ایک ملانے والا رشتہ ہے مگر یہ تمھیں کو نہیں عرب و عجم اور مشرق اور مغرب کے بہت سے لوگوں کو بھی ایک دوسرے سے کہیں نہ کہیں پہنچ کر آپس میں ملانے والا رشتہ ہے اور یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ یہاں بھی یہ رشتہ ایک کو دوسرے سے نزدیک ہی لاتا ہے مگر اس رشتے کے ساتھ یہاں رہ کر اور بہت سے رشتے بھی ڈھونڈنے پڑیں گے کہ ان کے بغیر

یہ رشتہ بھی کام نہیں آسکتا۔ ہوتا یہ ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر سارا زور اسی رشتے پر دیا جاتا ہے یا پھر ایسا ہوتا ہے کہ پاکستان کے ایک علاقے کو ایک سیارے کا اور دوسرے کسی علاقے کو کسی دوسرے سیارے کا ٹکڑا سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے اور ان کے درمیان کوئی رشتہ بھی تسلیم نہیں کیا جاتا۔ میں پوچھتا ہوں کہ پاکستان بننے سے پہلے کیا یہ علاقے برطانیہ' امریکا' روس یا چین میں پائے جاتے تھے' کیا یہ ہندوستان کا حصّہ نہیں تھے! اگر ہندوستان ہی کا حصّہ تھے اور ان میں وہی رشتہ پایا جاتا تھا جو کسی ایک ملک کے علاقوں کے درمیان پایا جاتا ہے تو وہ رشتہ پاکستان بننے کے بعد کس طرح ٹوٹ گیا۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں کے علاقوں کی اپنی اپنی کوئی پہچان نہیں ہے۔ اگر ان کی کوئی پہچان نہ ہوتی تو پھر وہ پائے ہی کیوں کر جاتے۔ پنجاب ایک پہچان کا نام ہے۔ سندھ ایک پہچان کا نام ہے۔ سرحد اور بلوچستان کی اپنی اپنی پہچان ہے۔ اسی لیے انھیں جُدا جُدا ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ پر کیا اس پہچان کو ایک دوسرے کے لیے پھبتی بن جانا چاہیے اور ہوا یہی ہے ایک نے اپنی پہچان کو دوسرے کے لیے پھبتی بنا دیا ہے اور تہذیب کا نام لے کر ایک دوسرے کے خلاف علم اور تحقیق کے لہجے میں دل کی بھڑاس نکالی جا رہی ہے۔ میں کہتا ہوں علاقوں کے ساتھ ان علاقوں کی ہم آہنگی اور اس کے ساتھ جنوبی' مشرقی ایشیا کے بجائے برِصغیر کے رشتے کو سامنے رکھنا چاہیے کہ اسی وقت کوئی سمجھ میں آنے والی گفت گو ہو سکتی ہے۔

عالمی ڈائجسٹ' فروری 1975

تہذیب-۲

بات ادھوری رہ گئی۔ میں تہذیب کے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا اور آگے چل کر یہ کہنا چاہتا تھا کہ تاریخ وقت کی پیداوار ہے اور تہذیب' تاریخ کی پیداوار۔ یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ ''زمان'' وجود کی حرکت ہے (یا اس حرکت کی مقدار) اور تاریخ شعور کی حرکت (یا اس حرکت کی مقدار) اور تہذیب' تاریخ کی حرکت (یا اس حرکت کی مقدار) کا ماحصل' جانا جائے کہ تاریخ' پیچ وخم کا ایک سفر ہے اور نشیب وفراز کی ایک مسافت پیمائی۔ تاریخ میں کبھی تو تاریکیوں سے تاریکیوں' کبھی تاریکیوں سے روشنیوں' کبھی روشنیوں سے روشنیوں' اور کبھی روشنیوں سے تاریکیوں کے مرحلوں سے گزرا جاتا ہے۔ یہ کتنی ہی پیش آہنگیوں اور واماندگیوں اور کتنی ہی رسائیوں اور نارسائیوں کی سرگزشت ہے۔ جب تاریخ کا یہ حال ہے تو پھر تہذیب کا مسئلہ کتنا پیچ در پیچ ہوگا۔ کون ہے جو اسے سادہ حالت کہہ سکے۔ یہ بات انسان کی مشترک تہذیب ہی کے سلسلے میں درست نہیں ہے۔ سوچا جائے تو جُدا جُدا گروہوں کی جُدا جُدا تہذیبوں کے بارے میں بھی درست ہے اور کئی حقیقتوں کے اعتبار سے کچھ زیادہ ہی درست ہے اس لیے کہ انسان کی مشترک تہذیب ایک طرح سے عمومی اور تجریدی وجود رکھتی ہے اور کسی گروہ یا سماج کی تہذیب ایک تخصیصی اور ترکیبی معنویت۔ وہ تخصیصوں کی تخصیص اور ترکیبوں کی ترکیب ہوتی ہے۔ سو اگر تم اپنی تہذیب کو سمجھنا چاہو تو اسے کوئی ایسا مظہر اور مضمر نہیں پاؤ گے جسے بے ساختہ جذبوں کے جوش میں سادگی اور سادہ لوحی کے ساتھ سمجھا جا سکے۔ میں جانتا ہوں کہ لوگوں کے دلوں میں اپنی تہذیب کا احساس بڑے بے ساختہ جذبے پیدا کرتا ہے۔ پر یہ بے ساختہ جذبے بڑے پیچیدہ ہوتے ہیں۔

ایک تو جذبے ہوتے ہی پیچیدہ ہیں مگر بے ساختہ جذبے اور بھی پیچیدہ ہوتے ہیں۔ وہ یوں کہ وہ بے ساختہ ہوتے ہیں۔

کسی خاص گروہ کی تہذیب یا کسی خاص تہذیب کی بات کرنے سے پہلے مناسب یہ ہے کہ خود تہذیب اور اس کے آغاز پر کچھ باتیں کر لی جائیں تو اس کے آغاز کو "پتھر کے پرانے دور" کے آخری دنوں سے نسبت دی جا سکتی ہے۔ میں یہاں میجد الینی دور کی طرف اشارہ کروں گا۔ یہ اَن جانی تاریخ سے پہلے کے دور کی محنت کوشیوں اور ہنر کاریوں کا زمانہ تھا۔ مسیح سے کوئی ساڑھے دس ہزار برس پہلے کی بات ہے کہ میجد الینی انسان غاروں کی دیواروں پر نقاشی کرتے اور ہڈیوں پر نقش و نگار بناتے ہوئے پایا جاتا ہے۔ وہ حُسن اور جمال کو مقدار کی زیادتی میں پیش کرتا ہے۔ عورتوں کی تصویریں بناتے ہوئے وہ چھاتیوں، کولہوں اور رانوں کو ہم کم طلب لوگوں کے حساب سے کہیں زیادہ بڑے حجم میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس طرح تہذیب اپنی روح یعنی جمال کے ساتھ آج سے کوئی بارہ ہزار برس پہلے وجود میں آ چکی تھی۔ پھر پتھر کا نیا دور آیا جس میں انسان نے تاریخ کی پہلی سب سے بڑی ایجاد کی۔ پہیے کی ایجاد۔ سفر اور نقل و حمل کے بہت سے ذریعوں کو برتنے کے بعد اس آلے یعنی پہیے کا خیال ان کے ذہن میں شاید سورج اور پورے چاند نے پیدا کیا ہوگا۔ جنھیں وہ ایک دن اور ایک رات میں مشرق سے مغرب تک پہنچ جاتے ہوئے دیکھتے تھے۔ سورج اور چاند سے پہیے کی یہ نسبت شاید درست ہو اور شاید اسی نسبت کے سبب پہیا چکر کی شکل میں بہت سی تہذیبوں کے لیے تعظیم اور تقدیس کا حق دار بنا ہو۔ سلسلہ چلتا رہا اور پھر اب سے کوئی چھ ہزار برس یا اس سے کچھ پہلے تہذیب کا ایک حیران کن اور خیال انگیز دور آیا۔ یہ بابل اور مصر کی تہذیبوں کا دور تھا اور اس کے کچھ ہی زمانے کے بعد یعنی اب سے کوئی چار یا پانچ ہزار برس پہلے وادیٔ سندھ، پنجاب اور بلوچستان کی تہذیبوں نے اپنی درخشانی دکھائی۔ سندھ میں موئن جودڑو، جھودرو، چھوکر علی مراد، آمری۔ پنجاب میں ہڑپا، روپڑ اور بلوچستان میں نال اور کلی کے مقاموں پر یہ تہذیبیں زمین کے طبقوں سے کھود کر نکالی گئیں۔ ان میں موئن جودڑو اور ہڑپا کے نام سب سے نمایاں ہیں۔ زمانے کے خاک انداز اور خاک باز حادثوں کی

زور ازوری تو دیکھو کہ انھوں نے ان تہذیبوں کے وجود کو اس کی کفش کے تلے سے لے کر کلاہ تک مٹی سے ڈھک دیا تھا۔ کاش وہ نوشتے پڑھے جا سکتے جن میں ان دونوں تہذیبوں کے روشن دنوں کی سربلند کارمندیاں اور ان کی سحر آگیں راتوں کی کہانیاں مرقوم ہیں۔ ہماری صدی نے ان کے کھنڈر تو دریافت کر لیے ہیں مگر پچھلے ساڑھے چار یا پانچ ہزار برس کی کسی حکایت، روایت اور تاریخ نے نہ ان کے دیوی دیوتاؤں، پروہتوں، پجاریوں، داوروں اور دادخواہوں کے نام بتائے ہیں اور نہ ان کے نیک ناموں کی نیکیاں اور بدناموں کی بدنامیاں کسی کو سُنائی ہیں۔ نہ تو ہم ان کی کامرانیاں، کارستانیاں اور ناکامیاں جانتے ہیں اور نہ کلفتیں۔ افسوس ان کی کراہوں کا کوئی بھی نوحہ بعد میں آنے والی قرنوں اور قوموں کے کانوں تک نہیں پہنچا، نہیں جانا گیا کہ ان کے حکم رانوں کی حشمتیں، ان کے حکیموں کی حکمتیں اور حیرتیں، ان کے باشندوں کے حوصلے، ان کی حسرتیں، ان کے ظالموں کی سفّاکی اور ان کے مظلوموں کی سینہ چاکی، یہ سب کچھ کن حالتوں، حوالوں اور زندگی کی کن حقیقتوں سے وابستہ تھا۔ حد تو یہ ہے کہ ہم یہ تک نہیں جانتے کہ ان بستیوں کے نام کیا تھے۔ وہ ارجمند بستیاں جو بابل اور مصر کے ہم پلّہ تھیں۔ یہ کتنی حیرت ناک بات ہے کہ سرزمینِ ہندو پاک میں آریوں کی آمد کے آخری زمانے سے لے کر انگریزوں کے آنے تک اس پورے دور میں کسی نے بھی ان دونوں تہذیبوں اور ان کے کھنڈروں کا نام تک نہیں سُنا تھا۔ سندھ کے راجا داہر اور پنجاب کے رنجیت سنگھ اپنی اپنی سرزمین کی ان مدفون بستیوں اور ان کی تہذیبوں کے وجود کا کوئی علم نہیں رکھتے تھے۔ اصل میں یہ تاریخ کی غارت گری کا وہ مذاق ہے جو صدہا سال تک جاری رہا۔ اسی لیے یہ دونوں تہذیبیں اگرچہ آج کی تہذیب کی اسی طرح بزرگ ہیں جس طرح بابل اور مصر کی تہذیبیں مگر بابل اور مصر کی تہذیبوں کی طرح اپنے بعد کی مشرقی اور مغربی یا مشترک انسانی تہذیب کی مورث نہیں ہیں۔ کس واسطے کہ انھوں نے اپنے پچاس برس پہلے کے دریافت شدہ کھنڈروں کے سوا اپنا کوئی سلسلہ نہیں چھوڑا اگر یہ ہے کہ کھنڈر دیکھنے والے کو حیران اور اس کے اندازے کو بُرمایہ کرتے ہیں۔ یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ شیو دیوتا اور لنگ پوجا کا تصور ہڑپا کی تہذیب سے ہندومت تک پہنچا ہو مگر کسی

تہذیب کی وہی شخصیت کسی دوسری تہذیب پر اثرانداز ہوتی ہے جو تاریخی، نیم تاریخی یا افسانوی روایتوں، ناموں، کرداروں، مہموں، کشمکشوں، کامرانیوں یا المیوں کی پوری یا ادھوری رُوداد کی صورت میں زندہ ہو اور خیال انگیز عظمت، حیرت، حزن یا عبرت کے احساس اور جذبے کے ساتھ اس سے کوئی اثر لیا جا سکتا ہو مگر ان تہذیبوں اور ان کے بعد کے ہندوستانی اور پاکستانی سماجوں کی معنویت میں ایسی کوئی رشتے داری نہیں پائی جاتی۔ پچھلے تین ساڑھے تین ہزار برس کے دوران ہندوستان اور پاکستان کی راتوں میں موئن جودڑو اور ہڑپا کی کون سی کہانیاں سُنا کر بچوں کو سُلایا گیا ہے اور دنوں میں یہاں کے لڑکوں کو ان تہذیبوں کے حوصلہ مندوں کی حوصلہ مندیوں اور ان کے حکیموں کی حکمتوں کی کون سی مثالیں دے کر سبق سکھایا گیا ہے اور قدیم تہذیبوں کی تاریخ اور ان کے مادّی مظہروں کے موثر ورثوں کے علاوہ ماضی اور حال کے درمیان حکایتوں اور ہدایتوں کا یہ تعلق بھی گہرے رشتوں کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی بات قرآن نے اس طرح بتائی ہے کہ اگلوں کے قصّے پچھلوں کے لیے عبرت ہوتے ہیں۔

ان دنوں تہذیب پر بہت بات چیت ہوئی جسے سُن کر اور دیکھ کر کچھ ٹکسالی ذہن رکھنے والے جنجالی میرے حجرے میں یہ کہتے ہوئے پکڑے گئے کہ فلاں اور فلاں نے گفت گو تو اچھی کی مگر واحسرتا! کہ تہذیب کی تعریف نہ ہو سکی۔ میرے بھائی! اگر تہذیب کی تعریف ہو بھی جاتی تو بھلا تجھے کیا ملتا اور تیرے بھرے بجرے میں کیا آتا۔ تم کسی چیز کا کوئی بھی نام رکھ دو اس سے کچھ نہیں بنتا، کچھ نہیں بگڑتا۔ جس حالت یا حقیقت کو تہذیب کہا جاتا ہے اسے تم اسلام آباد بھی کہہ سکتے ہو اور چلغوزہ بھی۔ اگر آج اس حجرے میں یہ ٹھان لی جائے کہ جب تک ہم یہاں بیٹھے ہیں تہذیب کو چلغوزہ اور چلغوزے کو تہذیب کہیں گے تو اس سے ''چلغوزے'' پر مغز کھپانے اور ''تہذیب'' کو چھیل کر کھانے کے شغل میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ ناموں اور لفظوں پر مت جایا کرو۔ خیر تو بات ''تہذیب'' کی ہو رہی ہے۔ اس لفظ کی رُوداد یہ ہے کہ پہلے یہ ایک شریف لفظ تھا۔ پھر اصطلاح بنا اور اب بُری طرح محض ایک لفظ، ایک فتنہ انگیز لفظ بن کر سامنے آیا ہے کہ نہ تو یہ وہ جانا پہچانا لفظ ہی رہا ہے جو تھا

اور نہ یہ اصطلاح وہ سمجھی بوجھی اصطلاح ہی رہ گئی ہے جو تھی۔ یوں بھی یہ اصطلاح ایک ایسے مفہوم سے وابستہ کی گئی ہے جس کی تشریح کبھی بھی آسان نہیں رہی پھر یہ کہ چیزیں اپنی تشریح اور تعریف میں پائی بھی نہیں جاتیں۔ اگر میری یہ بات غلط ہے تب بھی یہ تو مانو گے کہ چیز اپنی تعریف اور تشریح سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ میاں سُنو! کہاں ایک چیز اور کہاں اس کا محض نام۔ لفظ ''کرسی'' پر آپ بیٹھ نہیں سکتے اور لفظ ''میز'' پر اپنی کہنیاں نہیں ٹکا سکتے۔ کیوں کیسی کہی؟ مگر میں جانتا ہوں کہ میری اس بکواس کا کوئی فائدہ نہیں اور مجھ سے تم مردم آزار لوگ یہی اُمید لگائے بیٹھے ہو کہ میں تہذیب کی تعریف کروں اور پھر تم میری ٹانگ لو۔ تمھارا ستیاناس جائے! اچھا تو پھر میں تہذیب کو اس کی کچھ بُری بھلی تعریف کر کے خراب کرتا ہوں۔ شاید ایسا ہے کہ انسان کا اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانا' ان کی پرداخت کرنا اور انھیں کام میں لانا تہذیب کہلاتا ہے۔ یونانی یا عربی فلسفے نے تہذیب کے مفہوم کو بڑی حد تک ''حکمت'' کی اصطلاح میں محفوظ کیا تھا اور حکمت کے جن عناصر' مظاہر اور اقدار کی تعیین کی تھی ان میں سے ایک جز کو تہذیب کے لفظ سے تعبیر کیا تھا۔ انھوں نے حکمت کی دو قسمیں کی ہیں۔ حکمتِ عملی اور حکمتِ نظری۔ حکمتِ عملی کی تین قسمیں ہیں۔ تہذیبِ اخلاق' تدبیرِ منزل اور سیاستِ مدن' حکمتِ نظری میں طبعیات' ریاضیات اور مابعدالطبعیات کے تمام شعبے آتے ہیں۔ یوں تو حکمت ایک مدرسی اور جامد اصطلاح ہے اور اس حقیقت کی تاریخی اور حرکی معنویت کو ظاہر نہیں کرتی جس کو ہم آج تہذیب کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ ان تمام مادّی' ذہنی' فنی' وجدانی' ذوقی اور اخلاقی مظہروں اور قدروں کا اسم ہے جن کا مجموعہ تہذیب کہلاتا ہے۔ ویدوں اور ان کے ضمیموں اور تفسیروں میں تہذیب کی معنویت کو طرح طرح کی تعبیروں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اتھروید کے ''اپ وید'' یا ''اپ انگ'' ایوروید میں فعلیت کے تین ماخذ بتائے گئے ہیں۔ ''پران ایشنا'' (وجود کے تحفظ کی خواہش) ''دھن ایشنا'' (اشیائے آسایش کی خواہش) ''پرلوک ایشنا'' (سعادتِ آخرت کی خواہش) اس تعبیر میں ایک طرح سے وہ سب کچھ آ گیا ہے جو تہذیب اور اس کے مادّی اور ذہنی مظاہر کا سرچشمہ ہے۔ اب میں تہذیب کے مسئلے کو مزید تعریف

کے ذریعے اور اُلجھاتا ہوں۔ سوعرض کرتا ہوں کہ لوگوں کی پیداوارِ محنت' صلاحیت اور اس کا حاصل۔ ان کا ذوق' انتخاب اور سلیقہ' ان کے خیالوں' خوابوں' نظریوں اور عقیدوں کا سرمایہ اور ان کے وہ معیار جن کی بنیاد پر وہ اپنے نیک و بد میں تمیز کرتے ہیں اور چیزوں کو نیک و بد ٹھہراتے ہیں۔ یہ سب کچھ اور اس کے سوا اور بہت کچھ مل کر ان کی تہذیب کو صورت بخشتا ہے۔ اب رہی گروہ یا سماج کی تہذیب تو وہ ان ساری چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہے جو لوگوں کی جسمانی' ذہنی اور فنی کارگزاریوں کی پیداوار ہوں۔ یہ کارگزاریاں اور ان کے مظہر کتنی ہی تاریخوں اور کتنے ہی جغرافیوں کے نشیب و فراز اور سرد و گرم میں کتنی ہی حیثیتیں اور حالتیں اختیار کرتے ہیں اور نہ جانے کتنے ہی گروہوں کے ماضی اور حال اور کتنے ہی سماجوں کے ماحول اور کتنے ہی سیاسی' روحانی اور اخلاقی نظاموں کی بالادستی کے عمل اور اس کے ردِّعمل سے ان کو خاص سمتیں اور صورتیں ملتی ہیں اور کتنے ہی رویّے' حالات اور گرد و پیش کے اثرات انھیں ایک جُداگانہ رنگ دے دیتے ہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ میرے پاس جگہ کم ہے سو میں بات کو مختصر کر کے اس مناظرے تک آتا ہوں جو ہمارے جناب فیض احمد فیض نے تہذیب پر کرایا تھا اور عجب کچھ فرمایا تھا جسے سُن کر جھینپ بھی چڑھی اور جھونجل بھی۔ جناب فیض صاحب قبلہ! آپ ایک شاعر ہیں اور تہذیب کے آدمی مگر اب تہذیب کے کوتوال بن گئے ہیں۔ ویسے ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک عجب کوتوال ہو گزرا ہے جس نے غالب کو جیل میں ڈلوا دیا تھا۔ اس وقت شاعر کا جیل میں جانا سزا ہی بھگتنا نہیں تھا' رُسوا ہونا بھی تھا مگر اس دور میں جب کوئی شاعر زنداں میں قیام فرما ہوتا ہے تو وہ نوجوانوں اور طالب علموں کو اور بھی گھمبیر دکھائی دینے لگتا ہے۔ چھوڑیے ان باتوں کو اور جناب ایک شعر سُنیے مگر یہ شعر سرحد کے اس پار کے میرے شہر امروہے کے حضرت مصحفی کا شعر ہے۔ فرماتے ہیں:

یہ دشنام کس طرح آئی تمھیں
یہ تہذیب کس نے سکھائی تمھیں؟

کیوں؟ کیسا شعر ہے! یہ اس شاعر کا تبرک ہے جس نے آپ کو "دستِ صبا" کی ترکیب عطا کی۔ خود وہ اور اس کے زمانے کے شاعر اس ترکیب کو دیوانِ عرفی اور اس کے

علاوہ دوسرے فارسی شاعروں کی مرحمت مانتے تھے اور سُننے والے اُسے جانتے تھے مگر جنابِ عالی! آپ اور آپ کا مُجرد میں۔ ہم دونوں کے لیے مطلع بہت صاف ہے کہ ہمیں فارسی شاعری کی ورق گردانی کرنے والوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا نہیں تو وہ ہماری جان کو آجاتے اور سچ پوچھیے تو اُردو جاننے والے بھی ہمیں کہاں نصیب ہوتے ہیں اور ایک بات کان میں کہنے کی ہے کہ خود میں اور آپ بھی جاننے کی طرح اُردو کہاں جانتے ہیں اور ایک اور بات ہے جو کہنے کی نہیں ہے سو وہ بات میں اپنے دل میں کہہ لوں کہ میں نے اُردو نہ جاننے کے سلسلے میں آپ کے ساتھ اپنے آپ کو خاک ساری کے سبب نتھی کیا ہے کہ یہ تہذیب کا معاملہ ہے۔ چلیے ''دستِ صبا'' کو چھوڑیں کہ تہذیب کا ورثہ اسی طرح ایک سے دوسرے تک پہنچتا ہے۔ زمین پر کوئی وارث کسی ایسے ورثے کا مالک نہیں ہوا جس نے اسے خود پیدا کیا ہو۔ کسی سماج کی تہذیب اس کے اپنے زمانہ حال کی ایجاد نہیں ہوا کرتی۔

یہاں جناب فیض کی وہ ساری کاری گری اور ساری دانش وری یاد آ گئی جس نے تہذیب کے مسئلے کو معرکہ بنا دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان کے علاقوں اور ان کی تہذیب کا تاریخ کے کسی دور میں ہندوستان سے کوئی رشتہ نہیں رہا۔ نہ مسلمانوں کے دور سے پہلے آریوں، ہندومت اور بدھ مت کی تہذیب اور ریاستوں کے عہد میں اور نہ مسلمانوں کی آمد کے بعد۔ اس وعظ کے دوران انھوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ یہ علاقے (پاکستان) ویدوں کے دور سے لے کر برِصغیر میں قرآنی پیغام کے آنے تک ہمیشہ ہندوستان سے لڑتے رہے ہیں اور یہ کہ ان دونوں کی کشمکش اور آویزش تاریخ کی ایک حقیقت ہے اور ان دونوں کی تہذیبوں میں تضاد پایا جاتا ہے۔ چلیے چھٹی ہوئی۔ ان کی نکتہ آفرینی کی رُو سے مغربی پنجاب اور مشرقی پنجاب میں وہی نسبت ہے جو ہنزہ اور ہند چینی میں۔

اب میں تہذیب کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے پہلے اس زمانے کا ذکر کرتا ہوں جب یہاں آریہ آئے اور انھوں نے ہندو پاک کی سرزمین کو آریہ ورت کا نام دیا۔ یہاں آنے اور آتے رہنے کے دوران انھوں نے یہاں کے پرانے باشندوں پر غلبہ پایا اور پھر وہ سب سے پہلے پنجاب میں آباد ہوئے اور یہیں سب سے پہلے انھوں نے کئی ریاستوں کی بنیاد

ڈالی۔ یہاں سے ان کے کچھ گروہ سندھ میں اور کچھ گنگا کے طاس میں جا کر بس گئے اور ہندوستان کے دوسرے خطوں میں پھیلتے چلے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کے پنجاب میں بلوچستان کو چھوڑ کر سندھ اور سرحد بھی شامل تھے اور اس دور کے بعد بھی وقفوں وقفوں سے یہی صورت رہی اور پھر وہ دور آیا جب پنجاب اپنی تلخیص بن گیا اور ''مغربی'' اور ''مشرقی'' ہونے کے بعد تو اب یہ بے چارہ اپنی اس تلخیص کا بھی ایک خلاصہ ہے۔ ہاں تو پرانے دنوں کی بات ہے کہ عظیم حکمراں اجات سترو کا پاٹلی پتر (پٹنہ) سارے ہندوستان کی راج دھانی بنا اور پھر موریا خاندان کا چندر گپت اُبھرا اور اس نے شمالی ہند کی ساری ریاستوں کو ایک ریاست بنا دیا۔ سرحد اور پنجاب اُسے اپنا سرغنہ مانتے تھے اور اس نے پنجاب کی طاقت سے اپنی حکومت کے دائرے اور پنجاب کو اس کے انتظامی وجود میں افغانستان تک پھیلا دیا۔ اس دور کا ایک سرسری سا تاریخی جائزہ لینا اس لیے ضروری ہے کہ جناب فیض اس دور کے بھی پنجاب، سندھ اور سرحد کا اس دور کے تھر پارکر اور واہگہ پار کے علاقوں سے کوئی تہذیبی رشتہ نہیں مانتے۔ ان کے ارشاد کی رُو سے وید[1]، براہمن، آرن یک سوتر، مہابھارت، رامائن، کرشن جی، رام چندر جی، مہاویر جی، مہاتما گوتم بدھ، چندر گپت موریا، اشوک اور کالی داس سے ان ہندوؤں، جینیوں اور بدھ متیوں کا کوئی تعلق نہیں تھا جو پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان میں رہتے تھے۔ جناب فیض اس وقت یہاں آپ کے چار نیاز مند بیٹھے ہیں۔ میں، سیّد حسن عابد، محمد علی صدیقی اور سیّد راحت سعید۔ ہمیں نسابوں نے بتایا ہے کہ ہم قریش کی نسل سے ہیں اور ''نسل'' جیسا ڈھکوسلہ ہے وہ آپ بھی جانتے ہیں، ہم بھی۔ مگر آپ تو بہ ہر حال آریہ یا سیتھی نسل کے ہوں گے۔ آپ کو اپنا ماضی تو محسوس کرنا چاہیے۔

عالمی ڈائجسٹ، مارچ 1975

---

[1] ویدوں کا سلسلہ پنجاب میں شروع ہوا تھا جو آریہ ورت کا دل تھا۔

تہذیب-۳

تاریخ کے شہروں میں ایسی کوئی تہذیب کبھی نہیں پائی گئی جو گزشتہ یا ہم عصر تہذیبوں سے کوئی سلسلہ اور سروکار نہ رکھتی ہو اور جغرافیے کی حدود میں قلعہ بند ہو۔ تہذیب نہ مکانی طور پر قلعہ بند ہوتی ہے اور نہ زمانی طور پر۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آج کی کوئی تہذیب مصر اور بابل کی تہذیبوں سے کوئی واسطہ اور کوئی وابستگی نہیں رکھتی۔ یہی نہیں بل کہ وابستگی کا یہ سلسلہ اس سے بھی آگے تک جاتا ہے اور تاریخ سے پہلے کے دور تک پہنچتا ہے۔ تہذیب کی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ تاریخ کے دور سے پہلے ہی رونما ہوا تھا۔ میرا اشارہ پہیّے کی ایجاد کی طرف ہے۔ اس پہیّے ہی نے تاریخ سے پہلے کی انسانیت کو مصر و بابل کی منزل تک پہنچایا۔ تہذیب کی تاریخ کا دوسرا اہم واقعہ تاریخ کے دور میں ظہور پذیر ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب زمین پر شہری زندگی کا آغاز ہوا۔ یہ واقعہ تحریر کی ایجاد کا واقعہ ہے۔ انسان کی سب سے بڑی ایجادیں یہی دو ہیں۔ گروہی تہذیبیں ہوں یا انسان کی مشترک تہذیب، ان ایجادوں کے بغیر کم سے کم اس نوعیت کی تہذیبوں کا وجود وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ کوئی بھی تہذیب، تہذیب کے گزشتہ سلسلوں سے بے نیاز نہیں ہوسکتی۔ تہذیب، تاریخ کے حضور سب سے زیادہ دست نگر نیازمندی کا نام ہے۔ میں ایسی تہذیب کا تصور بھی نہیں کرسکتا جس کے گرد وپیش بے نیازی کا حصار کھنچا ہوا ہو اور وہ اس کے اندر بیٹھی ہوئی جوئیں مار رہی ہو۔ مگر سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں ان سامنے کی باتوں میں کیوں وقت گنوار ہا ہوں پر سوچتا ہوں کہ اگر میں وقت نہ گنواؤں تو وقت مجھے گنوائے گا۔ اچھا تو پھر بکے جاؤ جو بک رہے ہو۔ تو یہ

وہ باتیں ہیں جو کھلو باؤلی بھی جانتی ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتی ہے کہ ہر تہذیب، دوسری تہذیب سے الگ اپنا ایک وجود اور اپنی ایک نمود رکھتی ہے اور میں تو یہ بھی کہوں گا کہ ہر شخص کی اپنی ایک تہذیب ہوتی ہے۔ وہ یوں کہ ہر شخص کا اپنا ایک زمان اور مکان اور تاریخ اور جغرافیے کا اپنا ایک احساس اور تجربہ ہوتا ہے۔ جی ہاں میں شخصی زمان اور مکان اور ذاتی تاریخ اور جغرافیے کا قائل ہوں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ ہر شخص کا اپنا ایک نظامِ شمسی، اپنے سحابیے اور اپنی ایک کائنات ہوتی ہے، جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہوتا۔ اس طرح ہر گروہ کی تہذیب کو شخصی تہذیبوں کا ایک انبوہ سمجھنا چاہیے۔ یہ انبوہ کسی دوسرے گروہ کی تہذیبوں کے انبوہ سے اپنی ذات میں منفرد اور ممتاز ہوتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ کسی بھی گروہ کی تہذیب کا وجود اپنے وجود میں اپنے وجود کے سوا بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ اچھا ہے کہ میں اس بات کو سمجھنے کے لیے تہذیب کے بارے میں ایک اور بات بھی کہتا چلوں اور وہ یہ کہ تہذیب، جمع ترکیب اور تکثیر کا مظہر ہوتی ہے وہ پورے ماضی کے ماحصل ترکیبی معنویت اور حال میں اکتساب کے عمل اور اپنی توسیع کے عملیے سے عبارت ہے۔ مگر نظریہ یا مذہب اپنے جوہر میں تہذیب کی اس کیفیت کے برعکس کیفیت رکھتا ہے وہ اپنے ماسوا کا انکار یا اس کی تنسیخ کرتا ہے اور عملِ تفریق، عملِ تحلیل اور عملِ توحید سے عبارت ہوتا ہے۔ توحیدی مذہب ہی نہیں کثرت پسند مذہب بھی عملِ تفریق، عملِ تحلیل اور مآل کار توحید کا رجحان رکھتے ہیں اور وحدت پسند ہوتے ہیں۔ کثرت پسند مذہب بھلا کس طرح وحدت پسند ہو سکتے ہیں؟ تو میرے گمان میں صورتِ حال یہ ہے کہ کثرت پسند مذہبوں کے دیوی دیوتاؤں کی کثرت، حقیقت میں متعدد وحدتوں کا نظام ہوتی ہے۔ سمیری، اکادی، بابلی، ویدی اور ایرانی مذہب جن میں فطرت کے ہر مظہر کو کسی ایک دیوتا یا دیوی سے منسوب کیا گیا ہے سب کے سب اپنی اُفتاد میں وحدت پسندی ہی کا میلان رکھتے تھے۔ ان کے دیوی دیوتا چاہے تعداد میں بیسیوں ہی کیوں نہ ہوں پھر بھی بے شماری اور بے حسابی کی اس کائنات کو گنتے ہوئے دیوی دیوتاؤں کے ذریعے سمجھنے

اور بر۔تنے کا عمل ایک ایسا عمل تھا جو کائنات کو کم سے کم قوانین کے تحت لانے کے رجحان کو ظاہر کرتا ہے اور کم سے کم قوانین کے ذریعے کائنات کی توجیہ کرنا تقلیل اور پھر توحید کے داعیے کے سوا اور کیا ہے۔ اب مثال کے طور پر یہی دیکھو کہ کائنات میں حُسن و جمال کے کتنے ہی منظر اور مظہر پائے جاتے ہیں مگر اکادیوں اور بابلیوں نے جمال کو اس کے سارے منظروں اور مظہروں کے ساتھ ایک ہی دیوی عشتار سے نسبت دی تھی۔ کثرت پسند مذہبوں کا یہ ایک ایسا رجحان ہے جس میں وحدانیت کی واضح تلاش ملتی ہے چاہے اس وحدانیت سے پوری کائنات کے بجائے اس کی کسی ایک حقیقت یا حالت کو وابستہ کیا گیا ہو۔ وہ یوں کہ عشتار کی مثال اور ایسی دوسری مثالوں میں کائنات کی جس حقیقت یا حالت کو کسی ایک دیوی یا دیوتا سے نسبت دی گئی ہے وہ جزئی نہیں بل کہ کُلّی مفہوم کی حامل ہوتی ہے یعنی یہ کہ مثلاً جمال سے کائنات کا ہر جمال مراد ہے اور تمام مظاہرِ جمال کی توجیہ ایک دیوی عشتار کی جمال آفرینی کے ذریعے کی گئی ہے۔ یہی نہیں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہر کثرت پسند مذہب میں دیوتاؤں اور دیویوں کے ہجوم کے باوجود کسی ایک دیوتا یا دیوی کو سب سے برتر مانا گیا ہے۔ مصری اپنے دیوتاؤں میں رع کو اس کی شیُون کے ساتھ سب سے بڑا دیوتا مانتے تھے۔ سمیریوں میں بھی ہم یہی پاتے ہیں کہ ان کے درمیان کہیں تو زمین کی دیوی انی نی کو برتری حاصل تھی کہیں سیرابی اور آب یاری کے دیوتا ننگرسو کو اور کہیں روئیدگی کے دیوتا تموز کو۔ بابلیوں میں انو دیوتا گویا خدایانِ خدا تھا۔ ویدی مذہب اپنے دیوی دیوتاؤں کے انبوہ کے باوصف نمایاں طور پر ایک پرجاپتی یا وشوا کرما کو خدائے بزرگ مانتا ہے۔ زرتشت سے پہلے ایرانی مذہب میں ویوا' مترا، ارت، آذروان' اترا گنی اور کتنے ہی دیوی دیوتاؤں کے ہوتے ہوئے اہورا ہی خداوند توانا تھا۔ کان کھجانے اور کندھے اُچکانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں بھی سمجھ رہا ہوں کہ میری باتیں ٹھکانے کی نہیں ہیں اور یہ کہ میں بے تکان بکواس کیے جا رہا ہوں مگر میں نے یہ وعدہ کب کیا تھا کہ میں تہذیب پر ایک مربوط اور مدلّل تقریر کروں گا جسے سُن کر تہذیب کے مومنین محظوظ ہوں گے اور میرے حجرے سے ماجور و مثاب

ہو کر اُٹھیں گے۔ ہاں تو میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ تہذیب ریاضی کے حساب سے جمع، طبعیات کے لحاظ سے ترکیب اور مابعد الطبعیات کے اعتبار سے اُصولِ کثیرہ یا تکثیر کا معاملہ ہے۔ پس تہذیب کے سلسلے میں جغرافیے کی حد بندی سے کام لینا تہذیب کی حقیقت کو نظر انداز کرنا ہے۔ بھلا کون عاقل و بالغ انسان ہوگا جو یہ کہنے کی جسارت کرے گا کہ تہذیب جماعت دہم کی منظور شدہ تاریخ کی کتاب اور اس میں چھپے ہوئے حدودِ مملکت کے نقشوں کا مسئلہ ہے جسے نقشوں کی لکیروں نے پوری طرح حل کر دیا ہے۔ مگر جو کچھ ہے اور جو کچھ ہمیں سہنا پڑ رہا ہے وہ یہی ہے کہ اب عاقل و بالغ بل کہ عاقل ترین اور بالغ ترین لوگ ایسا کہنے کی جسارت ہی نہیں کر رہے بل کہ اپنی جسارت کو جرأتِ حق گوئی کا عنفوانِ شباب سمجھ رہے ہیں۔ میرے بزرگو! بچوں کی طرح کوئلا ہاتھ میں لے کر تہذیب پر لکیریں نہ کھینچو۔

ہاں تو یارو! کیا تم بتاؤ گے کہ میں نے رات ہوئے تک تہذیب کے بارے میں کیا بڑ ہانکی تھی جو ادھوری رہ گئی تھی۔ اے تہذیب کے مومنِ آلِ فرعون تُو نے ٹھیک کہا۔ میں جناب فیض احمد فیض کے فتوے سے اُلجھ رہا تھا۔ یاد آیا کہ برِّ صغیر میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے کی بات ہو رہی تھی اور ہم چندر گپت اور اشوکِ اعظم کے عہد تک آ گئے تھے۔ اشوکِ اعظم پر یاد آیا کہ اب یہاں کے تہذیب نویس اکبرِ اعظم کو بھی اورنگ زیب کے نام کے پردے میں گالیاں دیتے ہیں۔ یعنی ابوالفضل کو، فیضی کو، عرفی کو۔ عزیزو! یہ صاحبانِ دل کا مجمع ہے۔ حضرات ذرا سُنیے ابھی تو بہت رویئے گا۔ اَجرُکم علی اللہ۔ اب تہذیب گالیاں کھانے اور کھسیانے کے لیے رہ گئی ہے۔ میں تو کہوں کہ ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ اگر تہذیب گالیاں نہیں کھائے گی تو کیا بدتہذیبی یہ اعزاز پائے گی! کیا گالی کو گالی دی جائے گی! میں پھر اپنی بات سے بھٹک گیا۔ ہاں تو اشوکِ اعظم۔ تو یہ دیکھا جائے کہ اشوکِ اعظم کے دور سے لے کر آنے والی صدیوں تک یعنی یونانیوں، سیتھیوں اور ان میں سے کشانوں کے دور میں یہ علاقہ پتھروں کے سینے پر کس تہذیب کے نقش کندہ کر رہا تھا اور گندھارا ہنر کے ہنرمندوں کی سنگ خراشیوں اور مجسمہ تراشیوں کے عقب میں وہ کون سا خیال تھا جو نشاطِ تخلیق

کے احساس کی کفالت کر رہا تھا۔ کیا بدھ مت کے پیرو (اور میری اس بات کو مان لو کہ مہاتما گوتم بدھ ماسکو یا پیکنگ کے باشندے نہیں تھے۔ میں ثبوت تو پیش نہیں کر سکتا مگر مرا جی چاہتا ہے کہ میری یہ بات مان لی جائے' ہندوستان کے تھے) تو جناب کیا بدھ مت کے پیرو کنشک کا پشاور پاٹلی پتر ہی کی وراثت کا امین نہیں تھا۔؟

جون ایلیا! تم یونانیوں اور سیتھیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ اسی ذکر سے اپنی یاوہ گوئی کا سِرا ملاؤ۔ ٹھیک ہے۔ یونانی اور سیتھی۔ یونانی جنھوں نے ہندوستان کے دانش مندوں کی دانش کے سامنے اپنے آپ کو بودم اور بونگا سمجھا تھا۔ میں کنشک کی بات کرنے لگا تھا اب پیچھے ہٹتا ہوں اور تاریخ رَٹتا ہوں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یونانی نژاد تہذیب کی اَثریت بھی یہاں کے فن میں اپنی کچھ کیفیتیں منتقل کر رہی تھی اور پھر سیتھی آئے اور سندھ اور پنجاب کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھے اور انھوں نے جمنا کے کناروں پر اپنا پسینا خشک کیا۔ انھیں میں سے کشان خاندان کا بیٹا کنشک ترکستان، باختریہ، افغانستان اور پنجاب سے دوآبۂ گنگ وجمن تک قوموں اور قبیلوں کی حیثیتوں، حالتوں، حیرتوں، حلاوتوں' حسرتوں اور حوصلوں کا حوالہ بنا۔ کشان حکومت پر بدھ مت کی حکمت حکم رانی کرتی تھی۔ سوچو تو سہی پانچویں صدی عیسوی تک اس علاقے میں بدھ مت کی خانقاہوں کے حکیموں اور حکمت طلبوں کے درمیان سکھانے اور سیکھنے کے کتنے رشتے، روایتوں اور رویّوں کی میراث قرار پائے ہوں گے۔ بدھ مت کے بھکشوؤں نے یہاں کی کتنی ہی بستیوں کے دروازوں پر دوپہروں اور شاموں کو دھیمے پن سے صدا لگا کر کتنی ہی عقیدت مند ساعتوں کو نیکی اور نکوکاری کا حق ادا کرنے کے احساس سے مالا مال کیا ہوگا اور ان بھکشوؤں کو بھیک دینے والوں نے تونگری اور گداگری کے کیا کیا معنی سمجھے ہوں گے اور زبانِ حال کی اس معنویت نے فنّیات اور فکریات کو معنی آفرینی اور خیال آگینی کے کتنے خزینوں سے پُر مایہ کیا ہوگا۔ اور یہ صدی، پانچویں صدی عیسوی کالی داس کی صدی تھی۔ ساتویں صدی عیسوی میں چینی سیّاح ہوئین سینگ نے یہاں، ان علاقوں میں ہندو مت کو پوری ترنگ کے ساتھ پروان چڑھتے ہوئے دیکھا۔ سندھ، بلوچستان، سرحد اور پنجاب میں پاشوپتی مندر اور مہیش ور کے مندر تلقین اور تہذیب کا

سرچشمہ تھے۔ بدھ مت کے نقش مدھم پڑ رہے تھے اور اب ہندوستان میں یہاں سے وہاں تک ہندومت کا رنگ نکھر رہا تھا۔ یہ بان اور بھرتری ہری کا زمانہ تھا۔ سنسکرت زبان اپنا شان دار عہد گزار رہی تھی۔ آنے والی صدی میں سندھ پر عربوں کا قبضہ ہونے والا تھا اور پھر سرزمینِ سندھ میں عربی زبان کی ایسی شاعری ہونے والی تھی جسے عرب ذوقِ انتخاب اپنے دیوان حماسہ میں بیش قیمت سرمائے کی حیثیت سے محفوظ کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اب یہ بتایا جائے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے کے دور میں یہاں وہ کون سا مذہب پایا جاتا تھا جو ہندوستانی نہیں تھا۔ وہ کون سی تہذیب پائی جاتی تھی جو ہندوستانی نہیں تھی۔ زندگی اور ذہن کے وہ حوالے ہمارے علم میں لائے جائیں جن سے اس علاقے کی ایک جداگانہ تہذیب کا سراغ لگتا ہو، سرحد پار کی تہذیب سے جداگانہ تہذیب کا سراغ۔ (جاری ہے)

عالمی ڈائجسٹ، اپریل 1975

تہذیب-۴

کچھ ایسا ہے کہ میں اب تک ہندوپاک کی تہذیب کے بارے میں کوئی ڈھنگ کی بات کرنے کے بجائے تاریخ کا سبق دہرانے میں لگا رہا ہوں اور وہ بھی ٹھکانے سے نہیں۔ یہ وہ کام ہے جو نویں دسویں جماعت کے طالب علم کیا کرتے ہیں کہ تاریخ کی کتاب کھولی اور کسی دور کے حکم رانوں کے ناموں اور سنوں کو رَٹنے بیٹھ گئے۔ پر میں بھی کیا کروں کہ یہاں کچھ لوگوں نے تہذیب کو ملک کی سیاسی حدود کا ایک وجود ٹھہرا دیا ہے۔ سو میں نے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ پایا کہ ہندوپاک کی تاریخ کے ورق اُلٹوں اور دیکھوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہمیشہ سے دوئی اور جداگانگی کیوں کر پائی جاتی تھی اور یہاں کی تہذیب وہاں کی تہذیب سے اپنی اصل اور اساس میں کسی طور جُدا تھی جیسا کہ ان دنوں کچھ بڑے ہی دیدہ دریل کہ جہاں دیدہ بزرگوں کی زبانوں سے سُنا جاتا رہا ہے اور ان کے تیوروں سے پڑھا جاتا رہا ہے۔ تاریخ کے ورق اُلٹنے یوں بھی ضروری ہیں کہ تہذیب تاریخ ہی کا تو مظہر ہے۔

تو اب میں اپنا اگلا سبق شروع کروں۔ میں نے بّرِصغیر کی ساتویں صدی عیسوی تک تاریخ کے کچھ ناموں اور تہذیب کے کچھ ''نامیوں'' کے بارے میں بات چیت کی تھی۔ ساتویں صدی میں ہرش وردھن کا نام تاریخ کی محراب پر جگمگایا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اسے ہندوپاک کا دوسرا اشوکِ اعظم کہوں۔ اس کے ساتھ ہی ہرش کا نام مجھے مامون رشید کی یاد دلاتا ہے۔ مامون رشیدِ اعظم کی یاد۔ ایک دن بغداد کے قصر کی ایک علمی صحبت میں کیا ہوا۔ معتزلہ کا ایک عظیم الشان مفکر نظام جو نظریہ طفرہ (Quantum Theory) کا

بانی ہے۔ مامون سے کہنے لگا کہ ''یا امیر المومنین میں نے ارسطو کی مابعد الطبعیات کا رَد لکھا ہے'' اور یہ مامون ہی تھا جس کے علمی تبحّر کا لہجہ نظام ایسے نابغے سے یہ کہہ سکتا تھا کہ نظام! تم ارسطو کو سمجھ بھی سکے ہو؟ ہرش وردھن تاریخ ہی کا تاج دار نہیں تھا' تہذیب کی لطافتوں اور اس کے رشتوں کی معنویتوں کا بھی صورت نگار تھا۔ اس وقت تک کی دنیا کا سب سے بڑا دارالعلوم نالندا (بہار) میں اس دور تک دانش و بینش کی تہذیب تاب روشنی پھیلا رہا تھا۔ اس دارالعلوم میں بدھ مت کی حکمت ہی نہیں دوسرے مذہبوں کے علم بھی پڑھائے جاتے تھے اور ہندوستان کے دُور دراز گوشوں سے لے کر قندھار' لمغان اور چین کے علاقوں تک کے دس ہزار حکمت طلب نوجوان اور جوان اس سرچشمۂ روشنی و روشنائی سے سیراب ہوتے تھے۔ نام ور ادیب' شاعر اور رنگ پرور مصور' ہرش وردھن کا دھیان بدھ مت اور ہندومت دونوں دھرموں میں گیان تلاش کرتا تھا۔ اس کے دور کا نالندا پورے برِّصغیر کے تہذیبی شعور کا مظہر اور مصدر تھا۔ اس کی سلطنت کا دائرہ بہار' اُتر پردیش' مالوے اور پنجاب تک پھیلا ہوا تھا مگر اس دور میں بدھ مت اور ہندومت کی ہم آہنگ تہذیب کے اعلامیے وہاں سے لے کر یہاں اوائنا' پشاور' پنجاب' سندھ' مکران' بلوچستان اور قندھار تک' احساسِ تخیل' ادراک اور عمل کو زندگی کے معیاروں اور مثالیوں کا روزگار فراہم کرتے تھے۔ اس دامن دراز اور صد طور وطراز تہذیب کی صورت گری میں کتنے ہی زمانوں کی ماجرا کاریوں کے موقلموں کی جنبشیں اور کتنی ہی تہذیبوں کے رنگوں کی جمال آفرینیاں کارفرما تھیں۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا ہندوستان کی حد تک وہ تہذیب ہندوستان گیر نہیں تھی؟ ہاں یہ بات دوسری ہے کہ اس تہذیب کا رنگ ہندوستان کے کسی علاقے میں بہت گہرا تھا اور کسی علاقے میں بہت ہلکا اور کہیں کم گہرا اور کہیں کم ہلکا۔ اس کی اپنی مقامی نسبتیں اور مناسبتیں ہوں گی مگر ان سب کا سلسلۂ نسب ''ہندوستانی تہذیب'' ہی تک پہنچے گا۔ مثال کے طور پر جنوبی ہند کے دراوڑی گروہوں میں اس تہذیب کا رنگ بہت ہلکا ہوگا۔ سندھ میں ہلکا ہوگا مگر اتنا ہلکا نہیں کہ ہم اسے اس کی معنوی اور جوہری کلیت میں یک سر غیر ہند آریائی ٹھہرا دیں۔ یہ بھی درست ہے کہ ان علاقوں میں اس ہندوستان

گیر تہذیب کے کچھ خاص عناصر ان علاقوں کی اپنی عمرانیت اور جغرافیت کی ترکیب سے کچھ دوسرے عناصر کی نسبت کم یا زیادہ ہم آہنگ ہوں گے۔ سو اس صورتِ حال کی مجموعیت کے سبب ان علاقوں میں یہ تہذیب اپنے کچھ مناسب حال عناصر اور مظاہر کے ساتھ جانی اور پہچانی جائے گی۔ کوئی درست مثال تو نہیں مگر میں یہاں ایک مثال پیش کرتا ہوں اور وہ یہ کہ جب رومی، یونانی تہذیب کی فکری وراثت کے وارث بنے تو روم میں یونانیوں کی تمام فکر اور تمام فلسفہ غالب حیثیت میں ان کی فکری تہذیب کے صرف ایک مظہر ''رواقیت'' میں ظہور پذیر ہوا یا روم کی مشرقی شہنشاہی بازنطین یا مصر و اسکندریہ کی تہذیب کے فکری ادارے اپنی جوہریت یا ہیولانیت میں یونان اور روم سے کیا دوئی رکھتے تھے؟ یہاں میں نے کئی سرزمینوں کا نام لیا ہے جن کی تہذیبوں کو میں تہذیب کے زندہ اور سرگرم مفہوم میں ایک تہذیب کہنے کا گمان کرنے کی بھی جسارت نہیں کر سکتا۔ پر یہ تو مان ہی لینا چاہیے کہ یہ تہذیبیں کتنے ہی اعتبارات سے کمی اور بیشی کے ساتھ ایک خاص فکری تہذیب کی وحدت سے ارتباط رکھتی تھیں۔ ویسے یہ مثالیں بڑی حد تک دُور از کار ہیں اس لیے کہ ان میں تہذیب کی کلیت کے بجائے فکری تہذیب کی بات کی گئی ہے مگر ایک حد تک دُور از کار نہیں ہیں۔ سو اگر انھیں ایک حد تک دُور از کار نہ جانا جائے تو میں سوال کروں گا کہ جب یونان، روم، شام، مصر اور اسکندریہ کی مختلف سرزمینیں تہذیب کے ذہنی اور فکری عناصر میں یونان کی فکری تہذیب کے دائرے میں آتی ہیں تو پھر سرزمینِ ہند میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہند آریائی تہذیب کے وجود کو کس دلیل سے سرزمینِ ہند ہی کے ان علاقوں سے خارج ثابت کیا جا سکتا ہے جو اب پاکستان میں ہیں اور یہ بتایا جائے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے کے ہندوستان کی ہند آریائی تہذیب تاریخ کے چند موسم گزار لینے کے بعد بھلا ہندوستان کے کس علاقے میں نافذ نہیں تھی۔ ہاں یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ نفوذ کے درجے ہوتے ہیں جس سرزمین کو آریہ ورت کہتے ہیں وہ اس تہذیب کے دائرے کا مرکز تھی اور اس مرکز سے دُور کے علاقے اس کا محیط۔

ہاں تو اب میں اپنی بات کو آگے بڑھاؤں۔ ہرش وردھن کے بعد ساتویں صدی

عیسوی کا ہندوستان راجپوتوں کی کردار گاہ بنتا جا رہا تھا مگر سندھ کی صورت کچھ اور تھی۔ یہاں برہمنوں کی حکومت تھی جو ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کے ہاتھوں ختم ہوگئی۔ یہاں سے میں راجپوتوں کا ذکر آیندہ کے لیے چھوڑ کر برہمن ریاست سندھ کا ذکر کروں گا جسے تاریخ نے عرب مسلمانوں کے حق میں دست بردار کرا دیا تھا۔ کلام کا یہ سلسلہ اس بحث کو ذرا آسان کر دے گا جو پاکستانی تہذیب کے سلسلے میں چھڑی ہوئی ہے۔ اس طرح سندھ میں عربوں کی حکومت کے دور کے حوالے سے بات صحیح سمت میں بڑھ سکے گی۔ یوں تو عرب ہندوستان میں سب سے پہلے مالا بار اور جنوبی ساحلوں پر وارد ہوئے اور وہاں اپنی بستیاں بسائیں۔ یہ اسلام سے پہلے کی بات ہے مگر مسلمان عربوں کے دور کا آغاز محمد بن قاسم کی فتح کے ساتھ سندھ میں ہوا۔ موئن جودڑو کے تہذیب آفریں اور خیال آگیں دور کے بعد یہ دوسرا دور تھا جب سندھ کا علاقہ ایک نمودار اور خود اختیار تہذیب کا مرکز بنا ورنہ آریوں کے زمانے سے سندھ میں عرب مسلمانوں کے آغازِ حکومت تک پنجاب، وادیٔ گنگ وجمن، بہار، پھر کشانوں کا پشاور، وسطِ ہند، دکن اور ہندوستان کے دوسرے علاقے تہذیب کے صورت گر تھے اور سندھ اس تہذیب کا صورت نما تو تھا صورت گر نہیں تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز سے کم وبیش دسویں صدی تک سندھ ایک خود مرکز تہذیب کا دائرہ طراز بنا۔ مگر اس مرحلے پر مجھے سندھ کے بارے میں کچھ اور بھی جاننے کی خواہش رکھنا چاہیے، چاہے اس طرح میری بات آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہی کیوں نہ چلی جائے۔ سو یہ بات اس وقت سے چلتی ہے جب شمالی مغربی درّوں سے آریوں کے یہاں آنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ ایک زمانے تک یہاں کے باشندوں سے لڑتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور پنجاب پر قابض ہوگئے۔ انھی مرحلوں میں انھوں نے اس سرزمین کا نام 'سندھو' رکھا یعنی دریا۔ دریائے کابل سے پنجاب کے دریاؤں تک کی ہوائیں کھا کر ان کے ذہن میں یہ نام آیا ہوگا۔ پھر یہی سندھو، سندھ ہو گیا۔ گویا سب سے پہلے سرحد سے لے کر پنجاب تک کا علاقہ سندھ کہلایا اور پھر سندھ کے علاقے کو بھی سندھ کہا گیا۔ یہاں تک کہ جب آریہ پنجاب سے بھی کچھ آگے بڑھ

گئے تو یہاں سے لے کر پنجاب پار تک کے پورے علاقے کو انھوں نے سندھ ہی کہا مگر گنگا کی وادی میں پہنچ کر انھوں نے اس سرزمین کا نام آریہ ورت رکھا۔ ایرانیوں نے سندھ کو ''ہند'' کہا۔ یونانیوں نے ''اِنڈ'' اور رومیوں نے ''انڈیا'' نہیں معلوم کہ آریوں سے پہلے سندھ کے علاقے کا نام کیا تھا؟

خیر تو محمد بن قاسم کی فوج کے گھوڑوں کی کاٹھیوں سے اُتر کر عرب تہذیب، سندھ کی سرزمین پر مصروف خرام ہوئی اور یہاں کی آب وہوا سے اس نے ایک رنگ نکالا یہ ہندعربی رنگ تھا۔ مجھے یہاں سندھ عربی رنگ کہنا چاہیے تھا مگر خود سندھی نژاد عربی شاعرا سے ہندوستان کا ایک علاقہ ہونے کی بنا پر ہند ہی کہتے تھے۔ یہاں میں سندھ کے عظیم الشان فرزند ابوضلع سندھی کا نام لوں گا جس کی شاعری سندھ کے نامور عربی شاعر ابوعطا سندھی ہی کی طرح تہذیب کے رنگ وآہنگ کا سرمایۂ ناز ہے۔ ابوضلع سندھی کے چند شعر جو اس نے اپنے وطن کی شان میں کہے ہیں۔

لقد انکرا صحابی و ماذلک بالامثل   اذا ما مدح الهند وسهم الهند فی المقتل

(جب ہند اور اس کے تیروں کی میدانِ قتال میں ستائش کی گئی تو میرے ساتھیوں نے اس کو جھٹلایا اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے)

لعمری انها ارض اذا لقطر ینزل   بصیر الدر والیاقوت والدرملن یعطل

(میری جان کی سوگند یہ تو وہ سرزمین ہے کہ جب یہاں مینہ برستا ہے تو وہ محروم لوگوں کے لیے دُرّ ویاقوت اور ونود بن جاتا ہے)

فمنها المسک والکافور والعنبر والمندل   واصناف من الطیب یستعمل من یتفل

(جن لوگوں سے بدبو آتی ہے یہاں ان کے لیے مشک، کافور، عنبر، خوش بُو دار لکڑیاں اور طرح طرح کی خوش بوئیں ہیں تا کہ وہ انھیں استعمال کریں)

سندھ کے عربی شاعر نے اس شعر میں یہ کہہ کر کہ ''جن سے بدبو آتی ہے''۔ شاید عربوں پر چوٹ کی ہو مگر اے عربی کے باکمال سندھی شاعر تم نے تو یہ سُنا ہوگا کہ ہم سیّدوں کے پسینے سے گلاب کی خوشبو آیا کرتی تھی جو ہمارے ہی ہم قبیلہ حریفوں میں، ہمارے بااقتدار

ہم قبیلہ حریفوں میں، ہمارے وجود کے خلاف مخبری کر کے ہمارے خوش بُو وجود کو شاہی جلاّ دوں کی تلواروں سے خوناخون کرا دیتی تھی۔ سو ہم نے دعا مانگی کہ خدایا ہمارے بدنوں کو اس خوں انجام خوش بُو سے نجات دے کہ ہم بھی تیری زمین پر پھل پھول سکیں۔ پر اَب تو ایک دوسرا ہی ماجرا ہے اور وہ یہ کہ اب "ہمارے وجود" کے بدن کا خوش بُو سے محروم ہونا ہی زمانے میں ہمارے وجود کے خلاف مخبری کر رہا ہے۔ اب ہماری کوئی خوش بُو نہیں۔ اب ہمارا کوئی وجود نہیں۔ جون ایلیا، بات کرو بکواس بند کرو، اچھا بکواس بند۔ اب میں کوشش کرتا ہوں کہ ٹھکانے کی بات کروں۔

عالمی ڈائجسٹ، مئی 1975

تہذیب-۵

ہاں تو دوستو! تم نے ابو ضلع سندھی کا بد بو اور خوش بوؤں والا شعر سُنا اور پھر اس شعر کی وہ فتنہ انگیز تشریح بھی سُنی جو محض اس حقیر کے دماغ کی پیداوار ہے۔ اس تشریح کی داد چاہتا ہوں۔ کہو کیسی رہی۔ میں نے ایک صاف اور شفاف شعر میں کیسی کدورت پیدا کی۔ اسے کہتے ہیں بے بات کی بات بنانا۔ اب اگر اس شعر کی اس خواہ مخواہ کی تشریح کو کوئی بوجھ بجھکڑ سُن بھاگے تو ایک نیا ہی موضوع اس کے ہاتھ آئے جو کچھ یوں ہو کہ ''دوسری صدی ہجری (یا تیسری صدی ہجری) میں عربوں اور مسلمان سندھیوں کے درمیان سماجی اور تہذیبی کشمکش''۔ دیکھو کیسے مزے کی بحث چھڑی۔ پھر اس کے جواب میں مضمون لکھے جائیں جن میں اسلام سے بھی بہت پہلے عربوں اور سندھیوں کے درمیان مثالی تعلقات کی نشان دہی کی جائے تا ایں کہ یہ ثابت کیا جائے کہ ''قدیم سندھی اور بابلی جو عرب تھے ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور بابل اور موئن جودڑو کی تہذیبیں اپنی اصل میں دو نہیں ایک ہی تھیں جو دو سرزمینوں میں برگ و بار لائیں۔ اس طرح سندھ میں عربوں کی آمد کا مطلب یہ تھا کہ صدیوں کے دو بچھڑے ہوئے بھائی ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے''۔ اور پھر ''باور کیا جاتا ہے'' یا ''بابل اور موئن جودڑو کے آثار دیکھ کر یقین کرنا پڑتا ہے''۔ نیز اسی قسم کے دوسرے جملوں کے ساتھ اور بھی کئی دعوے کیے جائیں۔ ان دعوؤں کی دلیلیں میں اپنی آج کی بات پوری کر کے سوچوں گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک صاحب لسانیات کی دلیلیں اپنی جیبوں میں ڈال کر آگے آئیں اور خالص تحقیق کی بنیاد پر ارشاد فرمائیں کہ قدیم سندھیوں کا بابل کے سامیوں (عربوں) سے نہیں بل کہ سمیریوں سے نسلی رشتہ تھا جو بابل کی تہذیب

کے بانی تھے۔ گویا سندھ اور بابل کا رشتہ بابل میں سامیوں کی آمد سے بھی پہلے کی بات ہے۔ اس سلسلے میں یہ ہونہار محقق ایک ایسی لسانی دلیل دے گا کہ سُننے والا چاروں خانے چت گرے۔ وہ کہے گا کہ لفظ ''سومرا'' درحقیقت ''سمیری'' کی بدلی ہوئی شکل ہے اور اب اس امر میں کسی شک اور شبہے کی گنجایش باقی نہیں رہی کہ سومرا بابل کے سمیریوں کی یادگار تھے۔ پھر یہ بقراط اپنے قلم کی کھڑ پینچ سے اپنے نیازمندوں کے دماغوں میں ایک سوالیہ نشان بنائے اور یہ سوال اُٹھائے کہ ''اب تاریخ کو جس اہم سوال کا جواب دینا ہے وہ یہ ہے کہ بابل میں سمیریوں کے زوال کے بعد سے سندھ میں مسلمانوں کے دور سے پہلے تک جو ساڑھے تین یا چار ہزار سال کا وقفہ ہے اس میں ''سومرا لوگ کہاں گم رہے'' ان کی اس طویل گمشدگی پر خود یہ محقق بھی بہت اُداس ہو اور ہمیں بھی بہت اُداس کرے۔

بات ابوضلع سندھی کے شعر کی من مانی تشریح سے چلی تھی اور پہنچی کہاں۔ تو بھائیو! کہنا یہ ہے کہ شعر کی اس تشریح کو سُن کر کوئی بھائی ''سنجیدگی'' پر نہ اُتر آئے۔ تمھارے سر کی قسم اس شعر کا دُور دُور تک وہ مطلب نہیں ہے جو میں نے بیان کیا ہے۔ میں نے سوچا کہ ذرا لطف ہی لیا جائے اور ساتھ ہی یہ نکتہ بھی واضح کیا جائے کہ ایک بدنیت آدمی تاریخ اور تہذیب کے ساتھ کیسی من مانی کر سکتا ہے۔ بہ ہر حال میں نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا۔ میں تہذیب کے حوالے سے سندھ کے بارے میں گفت گو کر رہا تھا اور مسلمانوں کا دور زیرِ بحث تھا۔ یہ دور موئن جودڑو کے حیران کن دور کے بعد سندھ کا درخشاں ترین دور تھا۔ اس دور کے سندھ نے دنیائے اسلام میں اپنے مذہبی ادبی اور علمی انعامات کی داد و دہش کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سندھی اور سندھی نژاد ذہن مذہبی علوم و معارف کے مسند نشین تھے۔ علمائے مذہب اور فقہا میں جو سب سے بڑے نام ہو سکتے ہیں ان میں دو نام سندھ کے خون کی دین تھے اور ذرا سُنو تو نام بھی کیسے۔ امام اوزاعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ۔ اس سرزمین کے شاعروں کی عربی شاعری نے خود نک چڑھے عربوں سے خراجِ تحسین وصول کیا۔

• یہ دوسری صدی ہجری کا نصف اوّل ہے۔ عرب مسلمانوں کی آمد کے بعد سندھ میں ابھی ایک نسل بوڑھی ہوئی ہے اور دو نسلیں جوان، اس دوران میں سندھیوں اور عربوں کے

اختلاط و امتزاج سے تاریخ کا وہ مظہر وجود میں آ رہا ہے جسے ہندعربامی (ہندعرب اسلامی) تہذیب کہا جائے۔ یہ عرب اسلامی تہذیب جو ہندی (سندھی) تہذیب سے مخلط ہوکر ایک نئی تہذیب کا ترکیبی عنصر بنی ہے اپنے مرکزی علاقوں سے بازنطینی اور خاص طور پر ایرانی تہذیب کے اثرات قبول کرتی ہوئی سندھ پہنچی ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے اس لیے کہ وہ اپنے مرکزوں سے پورا سروکار رکھتی ہے۔ جن میں سے بعض میں تہذیبی انفعال بہ تدریج شدید ہوتا جا رہا ہے۔ انفعالیت کا سب سے زیادہ گہرا رشتہ ایران سے قائم ہے۔ اس طرح وہاں جو تہذیب وجود میں آ رہی ہے۔ اسے عربانی (عرب ایرانی) یا اسلانی (اسلامی ایرانی) کہہ سکتے ہیں۔ اس پس منظر میں عربوں کی وساطت سے سندھ میں جو تہذیب صورت پذیر ہو رہی ہے اسے ہندعربانی یا ہنداسلامی تہذیب کہا جا سکتا ہے۔ اس فعل و انفعال میں جوہری حیثیت ہندی یا عربی عنصر کو حاصل ہے۔ اس اعتبار سے اس ابتدائی دور میں سندھ کی تہذیب ایک خاص تشخص کی حامل دکھائی دیتی ہے۔ یہ خلیفہ منصور عباسی کا دور ہے۔ اب ذرا اس تختِ جمشید' اس شہر اصطخر کا تصور کرو۔ جہاں عربی بولی جا رہی ہو۔ وہ تختِ جمشید وہ اصطخر بغداد ہے اور اب چشمِ تصور سے یہ منظر دیکھو کہ سنسکرت کا ایک عالم' ایک پنڈت سندھ سے روانہ ہوکر بغداد میں وارد ہوتا ہے اور دربارِ خلافت میں باریاب ہوکر وہاں کے عالموں کو اپنی شخصیت اور اپنی علمی وراثت سے متاثر کر ڈالتا ہے۔ سنسکرت کی شہرہ آفاق کتاب سدھانت اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اس میں کیا ہے اور اس کے تیور یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو یونانیوں ہی سے نہیں ہم سے بھی کچھ سیکھنا چاہیے۔ سنسکرت کا یہ سندھی پنڈت بغداد میں ہندوستانی تہذیب کا نمائندہ ہے۔ خلیفہ سوچتا ہے کاش یہ کتاب عربی میں ہوتی۔ سو مشہور ریاضی داں ابراہیم فزاری کو اس کی ہم نشینی پر مامور کیا جاتا ہے تا کہ اس کتاب کا عربی ترجمہ کرنے میں آسانی ہو۔ یہی وہ صدی ہے جس میں ہندوستانی ریاضی کا صفر سندھ سے بغداد پہنچا اور وہاں سے ساری دنیا میں۔ ابھی دوسری صدی ہجری ختم نہیں ہونے پائی کہ ہم سندھ کے یگانہ علما اور اطبا' منکہ' صالح بن بہلہ اور گنگا کو بغداد کے صاحبانِ حکمت کی صفِ اوّل میں پاتے ہیں۔ بغداد میں ہندو طبیب منکہ کا مطب بھی ہے اور وہ بیت الحکمت

میں بھی کام کرتا ہے اور بیت الحکمت بغداد کی تہذیب کا مرکز ہے۔ یہ سمجھنا ہے کہ سندھ کے یہ عالم اور دانش مند وہاں کس علم اور دانش کی نمایندگی کر رہے تھے' وہ کس تہذیب کے سفیر تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کا ایک ہی جواب ہے یعنی ہندوستانی۔ اس علم و دانش' اس طب اور اس تہذیب کی زبان کیا تھی؟ ظاہر ہے کہ وہ یہاں کی علمی زبان سنسکرت تھی۔ اس لیے میں نے اس عہد میں صورت پذیر ہونے والی تہذیب کو ہند عربانی کہا ہے۔ اس کے سوا بھلا میں اور کیا کہوں؟ یہاں یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہاں کی مقامی زبانوں کو نہ علمی زبان سنسکرت ہی کوئی زک پہنچا سکی تھی اور نہ سرکاری زبان عربی۔ ان زبانوں میں ایک تو ریختہ قسم کی زبان تھی جو کئی زبانوں سے مل کر بنی تھی۔ ایک ملگاری تھی' ایک سین دب (سندھی) تھی۔ یہ زبانیں بولی ہی نہیں لکھی بھی جاتی تھیں اور سندھی ان میں سب سے زیادہ مضبوط زبان تھی۔ ہندی زبانوں میں سب سے پہلے اسی زبان میں اسلامی تعلیمات اور قرآن کی تفسیر کو ایک ہندو راجا کی فرمائش پر معرضِ تحریر میں لایا گیا مگران میں مکرانی اور فارسی کا رواج تھا۔

میں سندھ کا اب تک کئی بار نام لے چکا ہوں۔ یہاں یہ جاننا مناسب ہوگا کہ سندھ سے آخر ہماری مراد کیا ہے۔ کیا سندھ سے وہی علاقہ مراد ہے جسے آج سندھ کہا جاتا ہے۔ تاریخ اس کا یہ جواب دیتی ہے کہ مختلف ادوار میں سندھ کی حدود بدلتی رہی ہیں بل کہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ مسلمان عہد میں اس کا دائرہ گھٹتا چلا گیا ہے۔ صورت یہ ہے کہ کلاسیکی سندھ' ایک وسیع ترین اقلیم تھا۔ جس وقت محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا ہے اس وقت تک دریائے ہلمند تک افغانستان' سارا شمالی مغربی صوبہ پنجاب (یاد رہے کہ اس میں مشرقی پنجاب بھی شامل ہے)۔ پورا بلوچستان' آج کا سندھ' کچھ اور جودھپور کی سرحد تک کا علاقہ سندھ کہلاتا تھا۔ ہم جب سندھ کے سلسلے میں کوئی گفت گو کرتے ہیں تو صرف آج کا سندھ ہمارے سامنے ہوتا ہے جہاں تک موجودہ زمانے کے سیاسی اور انتظامی معاملات کا تعلق ہے وہاں تک تو یہ مفہوم کام دیتا ہے لیکن جب کوئی تاریخی اور تہذیبی مسئلہ زیر بحث ہو تو پھر ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہیے' اس لیے کہ ایسی صورت میں سندھ کے اثر کو مدنظر رکھ کے دائرہ تاریخی اعتبار سے تہذیبی منظر کا جائزہ لینے میں ہمارے لیے رکاوٹ ہے مگر ہے سے

دیکھا کہ موجودہ سندھ تو سندھ کی ایک باقی ماندہ یادگار ہے۔ راجا داہر پورے سندھ کا راجا نہیں تھا اور نہ محمد بن قاسم نے پورے سندھ کو فتح کیا تھا۔ سندھ تو پورے پاکستان سے بھی ایک بڑی اقلیم کا نام تھا۔ اب اگر آپ اسے رقبے کے حساب سے یہاں کے سب سے بڑے علاقے کے نام سے یاد کرنا چاہتے ہیں تو بلوچستان کہہ لیں اور اگر سب سے بڑی آبادی والے علاقے کے نام سے موسوم کرنا چاہتے ہیں تو پنجاب کہہ لیں مگر ہے یہی کہ اس کو علاقے کے اعتبار سے سندھ کہتے تھے اور ہندوستان کا ایک علاقہ ہونے کے لحاظ سے ہند' چناں چہ بلاذری نے محمد بن قاسم کی وفات کے تذکرے میں لکھا ہے کہ "تبکی اهل الهند علی محمد وصوروه بالکیرج" ۔یعنی اہلِ ہند محمد بن قاسم پر روئے اور انھوں نے مقامِ کیرج میں اس کی مورتی بنائی"۔ دوسری صدی ہجری کے اختتام تک سندھ کی حدیں گھٹ گئی تھیں۔ اس وقت اس کے تین حصّے تھے۔ پہلے حصّے میں ملتان تھا جس کی جنوبی حد روہڑی سے اور مشرقی حد پنجاب سے ملتی تھی۔ دوسرا حصّہ شمال میں روہڑی سے شروع ہو کر جنوب میں برہمن آباد تک' مغرب میں دریائے سندھ تک اور مشرق میں جیسلمیر تک پہنچتا تھا۔ تیسرا حصّہ برہمن آباد سے سمندر کے ساحل تک' مشرق میں راجپوتانے اور کچھ کے صحرا تک پھیلا ہوا تھا۔ پھر جنوب میں دیبل سے لے کر شمال میں جیکب آباد اور مغرب میں مکران تک اس کی حدود تھیں۔ چوتھی صدی ہجری میں سندھ کو چھ قسموں کی اقلیم کہا گیا جو یہ ہیں مکران' توران' سندھ' وے ہند (قندھار) کنوج اور ملتان' یہ ہے تاریخی سندھ جسے ہم اپنے زمانے کے انتظامی سندھ میں محدود کر کے دیکھتے ہیں۔ نتیجے میں اس تہذیب کی وسعت اور جامعیت ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے جو چھ علاقوں کے سندھ اور پاکستان گیر بل کہ اس سے بھی زیادہ طویل وعریض سندھ میں پھیلی ہوئی تھی۔ سندھ پہلی صدی ہجری کے بعد آنے والے زمانوں میں مختصر سے مختصر تر ہوتا چلا گیا مگر یہاں کا تہذیبی جائزہ لینے کے دوران اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی کہ آج کے سندھ کی کیا حدود ہیں۔ تہذیبی جائزے کے سلسلے میں تو ہمیں پورے تاریخی پس منظر کو سامنے رکھنا ہوگا اس لیے کہ تاریخی پس منظر کے بغیر تہذیب کا سراغ لگانا اسے خلا میں ٹٹولنا ہے۔ تاریخ نے

جس سندھ سے ہمارا تعارف کرایا ہے۔ وہ سندھ ہندوستان گیر مذاہب' معارف اور مآثر کی پیش گاہ تھا۔ اس کے شہر اس کے قصبے اور اس کے دیہات ہندوستان کی تہذیبی روحیت کی نمایندگی کرتے تھے۔ یہاں کے حقائق کی زمین اور یہاں کے اوہام کا آسمان دونوں ہندی تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان علاقوں کا اپنا کوئی مزاج نہیں تھا۔ ہر علاقے کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ ہندوستان کے ہر علاقے کا اپنا ایک مزاج تھا اور جسے ہندوستانی تہذیب' ہندوستانی روحیت یا ہندیت کہا جائے وہ ان مزاجوں کے امتزاج ہی سے عبارت تھی۔

عالمی ڈائجسٹ' جون 1975

تہذیب-٦

ہم پاکستانی تہذیب پر گفت گو کرتے ہوئے اس دور تک آ گئے تھے جب اس وقت کے وسیع تر سندھ پر بنوعباس کے والیوں کی حکومت تھی اور اس کے ساتھ ہی یہاں ہندو ریاستیں بھی موجود تھیں۔ بنوعباس کے والیوں کے بعد ہباریوں کا زمانہ آیا۔ یہ قریشی عرب تھے اور بنوعباس کے اطاعت گزار۔ ہباریوں کے بعد ملتان اور منصورے (موجودہ سندھ) کے علاقوں میں خودمختار اسماعیلی برسرِ اقتدار آئے۔ اسماعیلیوں کا ظاہری دور جتنا مختصر تھا ان کا باطنی دور اس سرزمین میں اتنا ہی دیرپا اور موثر رہا۔ تین سو برس کا یہ عربی عہد ایک نمودار اور یادگار عہد تھا۔ آخر گیارھویں صدی عیسوی کی پہلی چوتھائی میں ہندی عربیت کے اس زرّیں دور کو عجمی حملہ آور محمود غزنوی کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے روند ڈالا۔ توجہ نہیں کی گئی، کی جاتی تو یمین الدولہ حضرت سلطان محمود غزنوی کو اس کارنامے پر عجمی مسلمانوں یا نومسلموں کی طرف سے ایک خطاب دیا جاتا۔ وہ خطاب کیا ہوتا؟ ہندوستان میں عربوں کو برباد اور عربیت کو تباہ کرنے والا سلطان۔ واقعی یہ ایک عجمی کا ایک کارنامہ ہی تھا کہ اس نے عربوں ہی کے مذہب کا نام لے کر انھیں کو خاک و خون میں ملا دیا اور اسماعیلیوں کو ملاحدہ کے نام سے تہس نہس کر کے عربیت کو ایسی زک پہنچائی کہ پھر وہ یہاں کبھی نہ پنپ سکی۔ آنے والی صدیوں میں بس یہ ہوا کہ فلاں حسنی الحسینی کو قاضی القضاۃ بنا دیا گیا اور فلاں صدیقی یا فارانی کو مفتی اور مفتی صاحب اور قاضی صاحب اسی میں مگن رہے کہ سلطان نے ہمیں دعوت دی تھی اور ہم نے جانے سے انکار کر دیا اور اس طرح کعب و کلاب کی غیرت کو آسودہ کیا۔ جو عرب خون اپنے "عملی" ہونے کی وجہ سے مفتی اور قاضی ہونے پر

قانع نہ ہوسکتا تھا۔ اس کا جی بھی بادشاہی سے زیادہ بادشاہ گری میں لگتا تھا۔ یہ عرب بھی تھے عجب قوم۔ تم یہ بات تو مانو گے کہ انھوں نے محمد بن قاسم کے ساتھ اس سرزمین مین آ کر مقامیوں کے ساتھ بڑا اچھا وقت گزارا مگر خود اپنے حق میں ان کا روزگار اور ہنجار یہ تھا کہ ایک دوسرے کی جان کو آ گئے تھے اور غریب الوطنی میں بھی نزاریوں اور قحطانیوں کے قبائلی بغض اور کینے کا قرضہ چکانے سے باز نہیں آتے تھے۔ مولانا! آپ تہذیب کے بارے میں گفت گو کر رہے تھے۔ مجلس نہیں پڑھ رہے تھے۔ پہلے تو آپ نے عربوں کے فضائل بیان کیے، ہم محظوظ ہوئے۔ اس کے بعد اب آپ نے مصائب بیان کر کے ہمیں ماجور و مثاب کرنا شروع کر دیا۔ حد ہوتی ہے۔ ہاں بات ذرا بے تکی ہو گئی۔ اب ذرا پیچھے لوٹنا پڑے گا تو جس وقت محمود غزنوی، ملتان اور منصورے پر حملہ آور ہوا اس وقت اسماعیلی ان علاقوں میں عربیت اور عربی تہذیب کی نمایندگی کر رہے تھے۔ محمود نے ان کو بے کلاہ اور تباہ کر دیا مگر اس کے باوجود تاریخ کی یہ سرگرم روح وقت کے بہت سے قالبوں میں زندہ رہی۔ اسماعیلی مسلمانوں کا سب سے زیادہ روشن خیال گروہ تھے۔ اتنے روشن خیال کہ ان پر ملاحدہ کی پھبتی کسی گئی۔ وہ یہاں عرب مسلمانوں کی سب سے زیادہ بے باک اور درّاک ذہانت کے نمایندے تھے۔ صورت یہ تھی کہ اس وقت اس سرزمین میں ایک طرف تو بدھ مت کی حکمت اپنے استدلال میں مصروف تھی اور دوسری طرف ہندومت کی دانش اور ہندومت نے بدھ مت کو زچ کر رکھا تھا۔ اس منظر اور اس پس منظر میں صرف اسماعیلی باطنیت ہی اس امر کی اہل تھی کہ وہ مسلمان مکاتبِ فکر کی جانب سے اپنے طریقِ تاویل اور اپنے طرزِ تفکر کے ساتھ سلسلۂ کلام شروع کرے کہ وہ اپنے دور میں دنیا کے فکریاتی ورثے کی سب سے بڑی وارث تھی۔ اس کا چھوڑا ہوا ورثہ آج بھی مسلم تاریخ کا سب سے زیادہ خیال انگیز حکمیاتی سرمایہ ہے۔ سو باطنیت نے یہاں اپنا سلسلۂ کلام شروع کیا۔ جو لوگ سندھی اور ملتانی ادب اور شاعری کے ذریعے ان علاقوں کی روحیت، روّیت اور مزاج کا گہرا تاریخی مطالعہ کرتے ہیں وہ بتا سکتے ہیں کہ اس روحیت میں جو انسان دوستانہ رجحان پایا جاتا ہے اس روّیت میں جو آزادمشربی ہے اور اس مزاج میں سادگی کے ساتھ جو ایک سرّیت مضمر ہے وہ اپنے جوہر میں

اس باطنیت ہی کا عطیہ ہے جو ظاہری طور پر شکست کھا کر بھی باطنی طور پر ایک زمانے تک یہاں کی ذہنی زندگی میں کارفرما رہی۔

تین سو برس کے اس ہند عربی دور نے ملتان اور منصورے کے علاقے میں جس تہذیب کی صورت گری کی وہ ہند عربی تہذیب تھی یا پھر اسے ہندو مسلم تہذیب کہہ لیا جائے۔ اقلیم سندھ یعنی ملتان، منصورے، مکران، توران وغیرہ کو چھوڑ کر اس وقت پورا ہندوستان راجپوتوں کا ہندوستان تھا۔ پنجاب اور سرحد میں بھی راجپوت ریاستیں قائم تھیں۔ ان راجپوتوں کو غزنوی، غوری اور ان کے جانشینوں کی شکل میں جن مسلمانوں سے مقابلہ کرنا پڑا وہ بھی نسل کے راجپوت تھے۔ راجپوتوں کی شکست کے بعد سرحد اور پنجاب میں ایک تاریخ ساز اختلاط شروع ہوا۔ اس اختلاط نے اس عظیم الشان تہذیب کو نمود بخشی جو ہند ایرانی تہذیب کہلاتی ہے۔ ہند ایرانی اس لیے کہ یہ آنے والے مسلمان زبان اور تہذیب کے اعتبار سے ایرانی تھے۔ اس تہذیب نے پورے برِ صغیر پر اپنا اثر چھوڑا۔ غزنویوں اور غوریوں کے اس دور میں ملتان اور منصورے کی جگہ لاہور اپنی عہد آفریں حیثیت کے ساتھ اُبھرا کہ اس تہذیب نے لاہور کی مرکزیت میں اپنا اساسی تشخص حاصل کیا تھا۔ برِ صغیر میں تہذیب کے عمل کا ایک درخشاں ترین دور تو وہ تھا جو موئن جودڑو اور ہڑپا وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس دور میں بلوچستان موجودہ سندھ اور پنجاب کے علاقے مرکزی حیثیت رکھتے تھے اس کے بعد تہذیب کے تین سب سے بڑے عمل ظہور میں آئے ہیں۔ پہلا عمل اس وقت ظہور میں آیا جب ہندوستان میں آریہ آئے تھے۔ وہ عمل بھی سرحد اور پنجاب ہی میں شروع ہوا تھا۔ دوسرا عمل بھی یہیں ظہور میں آیا اور یہ غزنویوں اور غوریوں کا دور تھا۔ یہ دونوں تہذیبی دور دراصل تہذیب کے پنجابی دور تھے۔ تیسرا عمل برِ صغیر میں انگریزوں کی آمد کے بعد معرضِ ظہور میں آیا۔

عربوں کے وُرود کے بعد جو تہذیب وجود میں آئی تھی وہ اپنی وسعت اور اثریت کے اعتبار سے محدود تھی اس کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ عربوں کے اقتدار کی حدود ایک خاص علاقے سے آگے نہیں بڑھیں بل کہ ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ عرب سامی تہذیب کے لوگ

تھے جو ہند آریائی تہذیب کے لیے بہت اجنبی تھی۔ میں عربیت کی مظلومی پر گریہ اور ظالم عجمیوں پر لعن طعن کر چکا ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ ملتان اور سندھ میں ہندیوں اور عربوں کے درمیان جو تہذیبی معاملت ہوئی تھی وہ ہندیت کی خالص عربیت سے معاملت نہیں تھی اس لیے کہ بنواُمیّہ کے والیوں کے بعد سندھ اور ملتان میں جو عرب حکمراں ہوئے وہ تہذیبی اعتبار سے خالص عرب نہیں تھے کہ بنوعباس کے دور میں عربیت بڑی حد تک عجمیت بن چکی تھی۔ ہاں یہ درست ہے کہ اس کا عربی تشخّص اپنی جگہ موجود تھا اور عربی زبان اس کا سب سے بڑا مظہر تھی۔ اس عربی تشخّص کے ساتھ جب اقلیمِ سندھ میں ہندی تشخّص کا اختلاط ہوا تو ایک ایسی تہذیب وجود میں آئی جو ہندایرانی تہذیب سے ایک جُداگانہ شخصیت کی مالک تھی اسی لیے میں نے اسے ہندعربانی (ہندی عربی ایرانی) یا ہنداسلانی (ہندی اسلامی ایرانی) تہذیب کہا ہے مگر گیارھویں صدی عیسوی کے بعد آہستہ آہستہ یہ تہذیب ہندایرانی تہذیب کے زیرِ اثر آتی گئی اور چودھویں صدی عیسوی سے یہ عمل تیز ہو گیا اس لیے کہ اب ہندعربانی تہذیب کا علاقہ دہلی کے زیرِ اثر آ گیا تھا اور اس پر ہندایرانی رنگ چڑھ گیا تھا ''پاکستانی تہذیب'' یا پاکستانی علاقوں کی تہذیبوں کا مطالعہ کرنے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ہم چند دائرے فرض کریں۔ ان دائروں میں پہلا اور سب سے بڑا دائرہ ہندی تہذیب کا دائرہ ہوگا جسے ہندی تصورِ کائنات، ہندی نظامِ حیات، ہندی اخلاقیات اور ہندی اوہام کا دائرہ کہنا چاہیے۔ یہ دائرہ پوری ہندی تہذیب کے حقائقِ اولیٰ کا محل ہے۔ پھر ایک چھوٹا دائرہ آتا ہے۔ یہ ہندو مسلم، ہنداسلامی یا ہندایرانی تہذیب کا دائرہ ہے۔ اس دائرے کے بعد جو دائرہ بنتا ہے اس میں ہنداسلامی یا ہندایرانی تہذیب پاکستان کے علاقوں کی مشترک تہذیب کا اعتبار حاصل کرتی ہے اور آخر میں چوتھا دائرہ ہے جو چند حصّوں میں منقسم ہے اور اس کے ہر حصّے میں کسی ایک علاقے کی تہذیب اپنے تشخّص کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

میرے خیال میں تو صورتِ مسئلہ یہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ صورتِ مسئلہ یہ نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ''پاکستانی تہذیب'' یا پاکستان کے علاقوں کی تہذیب کا مطالعہ دراصل ان چار دائروں کا مطالعہ ہے۔ اگر یہ مطالعہ درست ہے تو پھر ہمیں اس کے نتائج کو بھی ماننا ہوگا۔ اس

کے بعد یہ کہنا کتنا عجیب ہے کہ پاکستانی تہذیب قبلِ اسلام کے ہندوستان اور مسلم ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ کہا گیا ہے کہ چوں کہ خوش حال خاں خٹک اور دُلاّ بھٹی نے مغلوں سے جنگ کی تھی لہٰذا پاکستان کا دلّی' آگرے اور لکھنوٴ کی تہذیب سے کوئی سروکار نہیں۔ جنگ تو بہار کے نام ور پٹھان' شیر شاہ سوری نے بھی مغلوں سے کی تھی اور شاید خوش حال خاں خٹک کی جنگ سے زیادہ سخت جنگ' تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ شیر شاہ اور ہمایوں دو مختلف تہذیبوں کے فرد تھے۔ خود شاہ جہاں کے بیٹوں کی بھی آپس میں خوں ریز جنگ ہوئی تھی۔ اب کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ قلعے کے جس محل میں داراشکوہ رہتا تھا وہاں کی تہذیب کچھ اور تھی اور جس محل میں اورنگ زیب کا قیام تھا وہاں کی تہذیب کچھ اور' کیا ہم تہذیب کے موضوع پر گفت گو کر کے ایک دوسرے سے صرف مذاق کرنا چاہتے ہیں۔

عالمی ڈائجسٹ' جولائی 1975

رُوداد

میرا گمان یہ ہے کہ زندگی میں خود کوئی معنی نہیں ہوتے بل کہ پیدا کیے جاتے ہیں۔ انسان کی ساری ہنر مندی، سارے خواب اور خیال اور ساری دانش، یہ سب کچھ زندگی میں معنی ہی کی تلاش ہے۔ سوچا جائے تو موجود ہونا بہت بڑی اذیت اور بہت بڑا عذاب ہے۔

موجود ہونا کیا ہے؟ دَم بہ دَم گزرنا، گزرتے رہنا اور گزر جانا۔ کیا یہ احساس ایک اذیت اور عذاب نہیں ہے کہ ہم گزر رہے ہیں اور ہم گزر جائیں گے۔ یہ کیسی حسرت ناک رائگانی ہے۔ اس رائگانی کی اذیت اور عذاب کی تلخی کو کم کرنے کے لیے انسان نے اپنے وجود میں ایک نئی جہت تلاش کی، اپنے وجود میں اور اپنے وجود سے باہر۔ یہ معنی کی جہت ہے۔ مہمل میں مفہوم کی دریافت۔ اگر تمام انسان ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے ہوں اور ان کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے ہوں مگر ان کے وجود میں معنی اور مفہوم ناپید ہوں تو دہشت سے ان کے سینے پھٹ جائیں۔ سو معنی اور مفہوم کی تلاش ہی میں نجات ہے۔ جو لوگ تمھارے لیے ہدایتیں، حکمتیں اور زندگی کے حوالے لے کر آئے، وہ معنی اور مفہوم ہی کی بشارتیں دینے والے تھے۔ معنی اور مفہوم کیا؟ صرف معنی ہی کہو۔ معنی ہی وقت کے عذاب کو کم کرتے ہیں ورنہ وقت تو انسان کو پاگل کر دے کہ وقت سب سے بڑا آشوب اور سب سے بڑی آشوب ناکی ہے۔ فرد کی زندگی یا گروہوں اور قوموں کی زندگی، معنی کا یہ نکتہ دونوں ہی کے بارے میں درست ہے۔ یہ تو ایک بات ہوئی، دوسری بات یہ ہے کہ معنی کو زندگی کی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے کہ اس کے بغیر زندگی ندامت اور ملامت کے سوا کچھ بھی نہیں کما سکتی۔

بہتر یہ ہے کہ میں اس گفت گو کو پاکستان کی نسبت سے آگے بڑھاؤں کہ اب یہ ملک اپنی پچاسویں سال گرہ منا رہا ہے۔ اب سے پچاس برس پہلے کا زمانہ، پاکستان کی زندگی کا پہلا برس، آج سے کہیں زیادہ دشوار اور ناسازگار تھا مگر اس وقت پاکستان کے لوگوں کی زندگی بامعنی تھی۔ وہ معنی کیا تھے؟ ایک مقصد کا احساس اور ایک مثالیے کا شعور، جس نے دلوں میں ایک ترنگ پیدا کر دی تھی۔ حیرت ہے کہ اُس وقت کوئی واضح منصوبہ سامنے نہ تھا۔ پھر بھی وہ دور جاں فزا سرگرمیوں اور سرشاریوں کا دور تھا۔ اس لیے کہ زندگی بامعنی تھی۔ اسی لیے شروع کے ایک دو برس انتشار اور خلفشار کے باوجود قرینے سے گزر گئے۔ تم چاہو تو تین چار برس کہہ لو۔

پھر یہ ہوا کہ معنی کا خلا پیدا ہوا۔ وہ یوں کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد مسلم لیگ کا کام تمام ہو چکا تھا۔ وہ یوں کہ پاکستان ہی مسلم لیگ کا مقصود تھا۔ اس کے بعد کیا ہونا ہے؟ شاید اس کے بارے میں سوچنے کی مہلت نہ پائی جا سکی ہوگی۔ نہ کوئی منصوبہ تھا اور نہ کوئی منشور۔ اس صورتِ حال میں پاکستان کی سیاست نے جو وتیرہ اختیار کیا، وہ سخت حسرت ناک اور انتہائی مضحکہ خیز تھا۔ مختلف معاملوں کے جو معنی دریافت کیے گئے، دریافت نہیں بل کہ معیّن کیے گئے، ان کا زندگی اور زمانے کی حقیقتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ حکمراں اور سیاست داں ایسے تیماردار تھے جو بیمار کو نسخے تو پڑھ کر سُنائیں مگر دوا نہ پلائیں۔

آنے والے زمانے میں پاکستان جن مشکلوں اور مہلکوں سے دوچار ہوا، ان کی پیش گوئی بڑی آسانی سے کی جا سکتی تھی اور یہ پیش گوئی بار بار کی بھی گئی ہوگی۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شروع کا زمانہ سخت دشوار اور ناسازگار ہونے کے باوجود ایک خاص اعتبار سے ایک بہت درخشاں زمانہ تھا۔ اس سرزمین میں ایک دوسرے کے لیے عام طور پر دردمندی، غم گساری، محبت اور ایثار کے جذبے موج زن تھے۔ یہاں کے پرانے رہنے والوں نے، آنے والوں کا بے حد دل انگیز اور بے مثال استقبال کیا تھا۔ اس سلسلے میں سرزمینِ سندھ نے اخوت اور برادر نوازی کا جو نمونہ پیش کیا، تاریخ میں اس کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ لاکھوں انسانوں کا استقبال کر کے انھیں اپنے دلوں اور اپنے دیاروں میں جگہ دینا

داستانوں اور افسانوں کی بات لگتی ہے۔ ایسے بے مثال انسانی جذبوں اور دلوں کے اتنے گہرے رشتوں کی فضا میں انسانی سیاست اور شریفانہ ملک داری کے ذریعے ایک بے مثال معاشرے کی صورت گری کرنا بہت آسان تھا، مگر بد نصیبی سے سیاست بھی غیر انسانی تھی اور حکومتیں بھی غیر شریفانہ۔ نتیجہ کیا ہوا کہ آنے والوں اور آنے والوں کا گرم جوشانہ استقبال کرنے والوں کے درمیان آہستہ آہستہ نفرت جگہ پانے لگی۔ بہ ہر حال یہ ایک لمبی کہانی ہے، جسے سُنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

توقع کے بالکل برخلاف پچھلے دنوں مرحوم مسلم لیگ نے ایک نیا جنم لیا ہے جو بلاشبہ بہت اُمید انگیز ہے۔ صرف کسی ایک صوبے کے لیے نہیں بل کہ پورے ملک کے لیے۔ میں یہاں اپنی اس نااہلی بل کہ اپنے جرم کا اعتراف کرلوں کہ میں کبھی مسلم لیگی نہیں رہا۔ مگر اب بڑی اُمیدی اور دل بستگی کے ساتھ مسلم لیگ کی حکومت کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

میں پیشہ ورانہ سیاست کے شعور سے یک سر محروم ہوں، لیکن ایک شاعر ہونے کی حیثیت سے خواہ مخواہ دخل در معقولات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے عاجزانہ طور پر جو عرض کرنا ہے، وہ یہ ہے کہ مسلم لیگ کو اپنے دوسرے جنم میں اپنے پہلے جنم کی ایک بنیادی خصوصیت کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہیے اور وہ خصوصیت کیا ہے؟ وہ خصوصیت قائداعظم کی روشن خیالی ہے، جس کا کسی آمریت کے پس منظر سے دُور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔

عالمی ڈائجسٹ، اگست 1975

(یہی انشائیہ سسپنس، اپریل 1997 میں ''روشن خیالی'' کے عنوان سے شائع ہوا)

دولخت

ہم شام سے سائنس کی فیروزمندیوں کا اندازہ لگا رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں۔ بات اس مصنوعی سیارے سے چلی تھی جو مریخ کی طرف پرواز کر رہا ہے۔ ہم نے اس بیچ میں سائنس کو کتنی ہی داد اور کتنی ہی دعائیں دیں۔ یوں بھی ہم لوگ سائنس کو بس دعائیں ہی دے سکتے ہیں یا پھر بددعائیں زیادہ دی جاتی ہیں، ویسے ہمارے یہاں سائنس کو بددعائیں زیادہ دی جاتی ہیں۔

بڑی بات ہے، ہم لوگ جو یہاں بیٹھے ہیں سائنس کے دعا گو ہیں۔ پر ابھی چند لمحوں پہلے میرے دماغ میں جہالت بھڑک اُٹھی ہے۔ وہ کھانستا ہوا نوجوان جو ابھی یہاں آیا تھا اور ہم عیاشوں اور بدمعاشوں کی محفل کا مزہ کر کرا کر کے چلا گیا ہے اس کے حوالے سے ہم سائنس کی آسماں نشیں کامرانیوں کو کس طرح دیکھیں گے۔ اس کے معاملوں اور مسئلوں سے فضا نورد سائنس کی بے سروکاری آخر ہمیں ذہن کی کس حالت سے دوچار کرتی ہے۔ میں تو ذہن کی ایک دماغ سوز حالت سے دوچار ہوں اور ایسے کتنے ہی نوجوان اور ان کے مسئلے انسان اور اس کے مسئلے یہ وہ مسئلے ہیں جن سے سائنس کے اس عہد کے انسان کو کب کا فارغ ہو جانا چاہیے تھا۔

سوچنے کی بات ہے کہ سائنس آخر کس لیے ہے اور کس کے لیے ہے۔ ایثار کا آخر یہ کون سا جذبہ ہے کہ انسان سائنس کو خود اپنے کام میں لانے سے جھجک رہا ہے۔ سائنس انسان کی معجز نمائی کا دوسرا نام ہے پر یہ کتنے دُکھ کی بات ہے کہ یہ معجز نمائی خود انسان اور اس کے مسئلوں کے دائرے سے باہر ظہور میں آ رہی ہے جو انسان آج فضاؤں میں سربلندیاں

حاصل کر رہا ہے اس زمین پر کتنا سر بلند اور سرفراز ہونا چاہیے تھا۔ زمین پر اس کی شکستیں اور ندامتیں کم و بیش وہی ہیں جو آج سے صدیوں پہلے تھیں۔ اس پر دیوانگی کے وہی دورے پڑتے ہیں جو قرنوں پہلے پڑا کرتے تھے۔ کیا علم اور آگہی کی اس روشنی میں انسان کو اتنا ہی سیاہ کار اور اتنا ہی تیرہ دروں ہونا چاہیے تھا جتنا وہ ہے۔ ارجمند سائنس کے اس بدبخت خداوند نے اپنے آپ کو ذرا بھی نہیں بدلا۔

سوچا جائے کہ فطرت کے اس کماؤ پوت نے کیا پایا اور کیا کمایا۔ میرے خیال میں یہاں ان ایجادوں کی فہرست پڑھ کر سُنانا ہرگز مناسب نہ ہوگا جو معجز نما سائنس کی دین ہیں۔ وہ حیران کن فہرست اپنی جگہ ہے اور انسانوں کا حرمان اور خسران اپنی جگہ بل کہ اس فہرست کے پیشِ نظر جب اس حرمان اور خسران کا اندازہ لگایا جاتا ہے تو اس احساسِ زیاں کی عذاب ناکی ہڈیاں پگھلا دیتی ہے۔ کیا انسان نے ایجادوں کی شکل میں جو کچھ پایا ہے وہ سب کچھ وہی کچھ ہے جس کی سائنس سے اُمید رکھی جاتی ہے؟ ہاں سائنس کے ذریعے انسانوں نے بہت کچھ کمایا ہے، انسانیت نے شاید کچھ بھی نہیں پایا ہے۔

سائنس کے کارنامے دل میں بڑی جولانی پیدا کرتے ہیں پر وہ جی بھی بہت جلاتے ہیں کہ ان کارناموں کے ہوتے ہوئے بھی انسان اسی قدر ہیچ، پوچ اور لچر ہے جتنا کبھی پہلے تھا۔ سیّاروں کے مداروں میں دنگ کر دینے والی مہارت دکھانے والی سائنس کا آفریدگار زمین پر ایک مضحکہ اور ایک مذاق بنا ہوا ہے۔ انسانوں کے جو غول بھوک اور بیماری سے نڈھال ہیں، جو قبیلے سیاست کی بےحس شاہ اندازیوں کے پاتال ہیں، جو بےمقدور قومیں قہرمان قوّتوں کی دہشت سے بےحال ہیں ان کے لیے اس خبر میں بھلا کون سی خوش خبری ہے کہ آج خلائی سائنس کے فلاں طائفے نے فلاں سیارے کے مدار میں فلاں کرتب دکھایا اور کل فلاں طائفہ فلاں سیارے کے مدار میں فلاں کمال دکھائے گا۔

جون ایلیا! فلاں کی یہ تکرار کچھ جچی نہیں۔ نہ جچے میں کیا کروں؟ مگر میرے بھائی، بیان کا ایسا بولا دینے والا بھونڈا پن! یہاں میں بیان کے بھونڈے پن کو دیکھوں یا انسان کی اس ذہنیت کو جو اس سے بھی زیادہ بھونڈی ہے۔ اتنی بھونڈی کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی سلسلۂ

خیال میں کبھی یہ نتیجہ نکالے کہ جہالت کی خاک ساری کا دوسرا نام علم ہے تو اس کی بات کو جھٹلانا بہت مشکل ہوگا۔ ایک طرف سائنس کے معجزے ہیں اور دوسری طرف اس حیوانیت کے مقابل انسان کی شرم ناک عاجزی۔ انسانوں کے باہمی رویّوں پر آج بھی انسان کے حیوان ہی کا فرمان چلتا ہے۔ انسان اپنے حیوان کا ایک فرودست ہے اور کچھ بھی نہیں۔

پُرآشوب تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ یہ ہے کہ انسان نے اپنے آپ سے بُری طرح شکست کھائی ہے یا پھر یوں کہہ لو کہ تاریخ کا سب سے زیادہ ناخوش گوار حادثہ خود انسان ہے۔ تم نے اپنے علم، اپنے تجربے، اپنے ہنر اور اپنی مہارت کو آسمانوں میں تو سیاروں کی تسخیر کے لیے مامور کر رکھا ہے اور زمین پر انسانیت کی تخریب اور تباہ کاری کی ورزش میں لگا دیا ہے۔ کیا زمین پر یہی کام سائنس کے سپرد کیا جانا چاہیے تھا کہ وہ جنگ اور جنون کے حوصلے بڑھائے اور جب چاہے اور جہاں چاہے زندگی اور شائستگی کی بستیوں کو روند کر بے نشان کر ڈالے؟

سائنس کے بارے میں گفت گو کرتے ہوئے گفتار کی یہ تلخی اور زہرناکی ہم میں سے کسی کو بھی زیب نہیں دیتی، پر یارو! یہ غصہ سائنس پر نہیں ہے، اس سیاست پر ہے جو سقراط کے ہاتھوں آگہی کو زہر دلوا دے اور مسیح کے ہاتھوں نیکی کو سولی پر چڑھوا دے۔ اس سیاست نے عام طور پر زمین پر سائنس سے یہی کام لیا ہے اور ہے یوں کہ انسانی شعور کے بغیر سائنس انسانوں کو کوئی بھی مژدہ نہیں سُنا سکے گی۔ سارا رونا انسان کے حیوانی رویّوں کا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سائنس کے دور میں انسان کی دانست تو بڑھی ہے پر دانش کم ہوئی ہے۔

عالمی ڈائجسٹ، ستمبر 1975

(یہی انشائیہ سسپنس، نومبر 2008 میں "بازیافت" کے عنوان سے شائع ہوا)

یاوہ گوئی

بس اب تھک بھی جاؤ، تم بھی، تم بھی، اور تم دونوں بھی اور میں بھی۔ آخر کب تک؟ بحث، بحث، بحث، حد ہے۔ دعووں نے دعووں کے کان کھا لیے اور دلیلیں دلیلوں کا دماغ چاٹ گئیں۔ حاصل کیا ہوا، کیا کوئی کسی کے نقطۂ نظر کا قائل ہوا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ انسان بحث کرنے اور بحث کے ذریعے کسی نتیجے تک پہنچنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔ بس خاموش۔ نہیں، اب کسی کی نہیں سُنی جائے گی۔ میں جو عرض کر رہا ہوں، بس، بہت ہو چکی۔ آخر تم ایسی کون سی بات کہنا چاہتے ہو جو سب کو گونگا کر دے اور یہاں تو جو بھی ہے وہ دوسروں کی بات کے حق میں بہرا ہے۔ بھائی ہماری بھی مان لو۔ تمھاری بات اگر سُنی بھی گئی تو جھٹلانے کے لیے سُنی جائے گی۔ میں باتیں کرنے سے نہیں روک رہا۔ باتیں کرنے کے لیے ضرور باتیں کرو مگر یہ گمان نہ کرو کہ تمھارے بولنے سے حق کا کلمہ بلند ہوگا۔ سو اپنی بات منوانے کے لیے باتیں نہ کرو۔ بھلا کس نے کس کی مانی ہے۔ ہم نے بھی ان بحثوں اور ان بدبحثیوں میں کیسی کیسی پر خیال شامیں غارت کر ڈالی ہیں۔ یہ شام بھی کیسی پُر ملال اور کیسی پُر خیال شام تھی۔ پَر ہم اس کے وجود سے کتنے بے سروکار رہے۔ واویلا کہ ہم صرف لفظوں کے عہدی ہو کر رہ گئے ہیں۔ نہ شہر کے گلی کوچوں میں وہ یاوہ گردیاں ہیں اور نہ وہ قلندریاں۔ ہمارا کام تو بس یہ رہ گیا ہے کہ ایک دوسرے سے اپنا سچ اور اپنی سچائیاں منواتے رہیں۔ میں نے تم سب کی سُنی اور اب مجھ پر بولنے کا دورہ پڑا ہے۔ سو اَب میری سُنو مگر میں بحث نہیں کروں گا کہ بحث کی مفلسی کے پاس نہ میرے لیے کچھ ہے اور نہ تمھارے لیے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم پر بحث کا دورہ کیوں پڑتا ہے۔ ہے یوں کہ ہم میں سے

جو بھی ہے وہ اپنے مسلک کے حق میں گویا سورج سے زیادہ روشن دلیلیں رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ انسانیت کی بھلائی کے لیے ان روشن دلیلوں کی فیض رسانی کو عام کرے۔ وہ یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتا ہے کہ لوگ دیکھتی آنکھوں اتنے اندھے کیوں کر ہو سکتے ہیں کہ حقیقت اور صداقت کا سورج چمک رہا ہے اور وہ تارے گننا چاہتے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے مسلک کے ہوتے ہوئے کوئی بھی انسان کسی دوسرے مسلک پر کیوں چل رہا ہے۔ لوگ صاف اور صریح حقیقتوں سے آخر کس طرح آنکھیں پھیرے ہوئے ہیں؟ واقعی یہ ایک ایسی ہی بات ہے جس پر ہم میں سے ہر ایک پیچ و تاب کھائے اور اس کے سر میں درد ہو جائے۔ ہم میں سے ہر فرد کو یہ چاہیے کہ وہ اپنے ساتھ بھی انصاف کرے اور دوسروں کے ساتھ بھی۔ ہم میں سے ہر شخص کا یہ خیال ہمارے اپنے اپنے احساس کی حد تک یک سر درست ہے کہ جو لوگ ہمارے ہم خیال نہیں ہیں ان کی عقلیں ماری گئی ہیں۔ ہر فرد اور ہر گروہ کا اپنا ایک یقین اور اس یقین کے ساتھ اپنا ایک آسمان اور اپنی ایک زمین ہے۔ اپنا ایک عالمِ انفس و آفاق ہے اور پھر اپنا ایک نظامِ خیر و شر ہے۔ تم میں سے ہر ایک اپنی ہی جنت میں جائے گا اور اپنے ہی جہنم میں جلے گا۔ کسی کو بھی دوسرے کی جنت میں نہیں جانا اور کسی کو بھی دوسرے کے جہنم میں نہیں جلنا۔ بس تمھارا اپنا کوئی مسلک ہونا چاہیے پھر تم دیکھو گے کہ زمین کا ہر ذرّہ آسمان کا ہر ستارہ اور کائنات کا ہر سحابیہ اسی کے مطابق حرکت کر رہا ہے۔ ہر یقین کے ساتھ اس کا اپنا ایک عالمِ وجود و عدم ہوتا ہے۔ سو ہر گروہ کا اپنا ایک عالمِ وجود و عدم ہے جو دوسرے گروہ کے عالمِ وجود و عدم سے یک سر مختلف ہے۔

ہم اپنی صداقت منوانے کے لیے ایک دوسرے کی حقیر اور فقیر شنوائیوں پر اپنے سینے کے قیمتی سانس آخر کیوں ضائع کرتے ہیں جب کہ ہم تو وہ ہیں کہ ہم میں ہر ایک ایک جُدا کائنات کا جاگیردار ہے اور ہمارے گمان کے خلاف اس کائنات کا ایک ذرّہ بھی جنبش نہیں کر سکتا۔ سوائے اپنی اپنی صداقتوں کے وکیلو! تم جو دوسرے تمام لوگوں کی بے عقلی اور گُم راہی پر ماتم کر رہے ہو اور حقانیت کی محبت میں ظلمانیت کے خلاف غیظ و غضب سے بھرے ہوئے ہو۔ یہ جان کر سکون حاصل کرو کہ تمھارا ہی نہیں تمھاری طرح دوسروں کا بھی

یہی حال ہے اور ان کا دماغ بھی یہ سوچ سوچ کر پھٹا جا رہا ہے کہ وہ جس حق اور صداقت کے نام لیوا ہیں اس کی عالم تاب تجلّیاں آخر اوروں کو کیوں نہیں دکھائی دیتیں۔ وہ سوچتے ہیں اور ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ حق یہ ہے کہ یہ بات سمجھ میں آنا بھی نہیں چاہیے۔ اگر ایک گروہِ یقیں دوسرے گروہِ یقیں کی دردناک محرومی، نافہمی اور کج رائی پر خون کے گھونٹ پی رہا ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ حق بہ جانب ہے اور خون کے گھونٹ پینا اس کا حق ہے۔ دوسروں کو حق کا دشمن اور عقل کا اندھا جاننا اور ان سے نفرت کرنا، انھیں گردن زدنی گردانا اس کا فرض ہے۔ اپنے اپنے دین اور اپنی اپنی دانش کے نُور کی تابندہ نشانیوں کے وارثو! میں تم میں سے ہر ایک کی حیرت زدگی اور برافروختگی کو پوری طرح محسوس کرتا ہوں۔ یہ کتنے دُکھ کی بات ہے کہ ہر گروہ کائنات اور ماورائے کائنات کی روشن ترین صداقتوں کے ساتھ تنہا ہے اور اس کے سوا باقی تمام انسان ضلالت اور غوایت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں اور یہ ایک ایسی بات ہے جس پر ہر گروہ کا دل خون ہونا چاہیے اور اس کی آنکھوں میں خون اُتر آنا چاہیے۔ پر اِس بات سے تشفّی حاصل کی جائے کہ ہم جو ایک دوسرے کے برعکس مسلک پر چلنے والے ہیں اور ایک دوسرے کے یقین کے برخلاف یقین رکھتے ہیں جب اپنے اپنے گھروں کو جائیں گے تو وہ یقین جوں کا توں ہوگا جسے ہم اپنے اپنے گھروں سے لے کر چلے تھے اور دن بھر کی مخالف دانشوں اور دلیلوں نے اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑا ہوگا اور بھلا وہ یقین ہی کیا جسے دانش کی فاحشہ اور دلیل کی حرافہ ورغلا سکے۔ ایسا ہوتا ہے پر ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ لوگ اپنے یقین کو چھوڑ کر دوسروں کے یقین کو اپنا لیں اور جب کبھی ایسا ہوا ہے تو اس لیے نہیں کہ دانش اور دلیل نے اس کی دعوت دی تھی۔ اس کا سبب دانش اور دلیل میں نہیں تاریخ اور ماحول کی اس حالت اور اس حال میں تلاش کرنا چاہیے جس میں اس قسم کا واقعہ رونما ہوا ہو۔

عالمی ڈائجسٹ، اکتوبر 1975

حقیقتِ حال

ہر آدمی کو وہ رائے رکھنے دو جو رائے وہ رکھنا چاہتا ہے اور یہی حق گروہوں کو بھی دو۔ لوگوں کو وہ بات ضرور کہنے دو جو وہ کہنا چاہتے ہیں۔ جو بس اپنی ہی کہنا چاہتا ہے اور دوسروں کی ایک نہیں سُننا چاہتا اسے مان لینا چاہیے کہ وہ کہنے کی کوئی ایک بات بھی نہیں کہنا چاہتا یا پھر یوں کہہ لو کہ وہ بہت ہی بھونڈی بُرائیاں بولنے کی خواہش میں مبتلا ہے۔ میں تو یہ گمان کرتا ہوں کہ دنیا میں ایسا کوئی آدمی نہیں پایا جاتا جو دوسروں سے زیادہ بولنے کا حق رکھتا ہو۔ تمھارے ہونٹوں سے چاہے دنیا کی عجیب وغریب حکمتیں ہی کیوں نہ ٹپکتی ہوں اور دوسرے کی زبان پر بکواس کے سوا اور کچھ بھی نہ ہو پڑ ہے یوں کہ بولنے کے حق میں دونوں برابر ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ بہت سے دانش مند میری اس بات کو ایک بَڑ سے زیادہ کچھ نہ جانیں پر میں یہی کہے جاؤں گا کہ بڑی بڑی باتیں کرنے والو! مجھے بھی بَڑ ہانکنے کا حق دو۔ آخر یہ کب اور کیسے طے ہوا کہ تم بولتے رہو گے اور میں چپکا بیٹھا سُنتا رہوں گا؟۔

وجود کی فضا کا روشنی اور آواز سے جو رشتہ ہے، وہ کتنے گہرے رشتوں کا ایک رشتہ ہے۔ یہ وجود اور وجود کا رشتہ ہے۔ پر ہم نے یہ دیکھا کہ انسانوں میں سے بہت سے انسانوں میں اس رشتے کو توڑنے کی ایک بھیانک ہوس پائی جاتی ہے۔ روشنی اور آواز وجود کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جتنا دیکھ سکو دیکھ لو، جتنا بول سکو، بول لو۔ جتنا سُن سکو، سُن لو۔ سماج سے میرا جھگڑا اور کیا ہے؟ شاید یہی تو ہے کہ یہ سماج ایک ایسے گٹھ جوڑ کا نام ہے جس میں اُوپر کے گٹھ جوڑیوں کے سوا باقی سارے لوگ بے جان چیز سمجھے جاتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہے اور سمجھ میں آتا بھی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ جو لوگ سب کچھ

کہنے اور سب کچھ کرنے کا اختیار حاصل کر لیتے ہیں انھیں انسانوں سے بیر کیوں ہو جاتا ہے۔ میں سمجھنا یہ چاہتا ہوں کہ وہ اپنے وجود سے باہر کی فضا کو اپنے حق میں ناسازگار کیوں بنالینا چاہتے ہیں؟ وہ یہ کیوں پسند کرتے ہیں کہ انھیں ناپسند کیا جائے؟ ہے یوں کہ میں اور تم سوالوں کے آدمی ہیں اور جوابوں سے ہماری جھولی خالی ہے۔ سو میں اپنے آپ سے سوال پر سوال تو کر سکتا ہوں پر اپنے آپ کو جواب دینے کا مقدور نہیں رکھتا اسی لیے اپنی ذات کے گرد و پیش میں میرے لیے حیرتوں اور حسرتوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ سو یہ ہوں میں اور یہ ہے میرا حال اور یہ شخص جو میں ہوں، اس کا ایک انبوہ ہے جو میرے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ مجھ سے بستیاں بسی ہوئی ہیں اور میں ان بستیوں میں ویران ہوں۔ سو اب میں پھر ایک سوال کروں گا اور وہ یہ کہ جب میری ذات کی ساری بستیاں ویران ہیں تو پھر یہ آبادیاں آخر کن پر چھائیوں کی آبادیاں ہیں؟ بتاؤں......؟ ہاں بتاؤ، بھائی بات یہ ہے کہ یہاں ان لوگوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں ہے جن کا ہونا ان کے سوا باقی تمام انسانوں کا نہ ہونا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی بات منوانے اور اپنا حکم چلانے کا حق رکھتے ہیں۔ پہلے تو یہ حق ان کو میراث میں ملتا تھا یا زور اور زبردستی سے حاصل کیا جاتا تھا۔ کہیں کہیں یہ صورت اب بھی پائی جاتی ہے مگر اب جو عام صورت پیدا ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ حق لوگوں کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ اُن عام لوگوں کی طرف سے جو یہ عجیب و غریب حق دینے کے بعد خود کسی حق کے حق دار نہیں رہتے۔ دنیا میں چاہے اور کہیں ایسا ہوتا ہو نہ ہوتا ہو مگر یہاں تو ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ بول رہے ہو تو بولنے بھی دو نہیں تو لوگ بولا جائیں گے۔ گویائی کا شوق ایک نیکی ہے پر اس نیکی کے ساتھ اگر شنوائی کی بدشوقی پائی جائے تو پھر یہ نیکی بدترین بدی بن جاتی ہے۔ اگر گویائی انسان کی صفت ہے تو شنوائی خدا کی صفت مگر کچھ لوگ ہیں جو شنوائی کی صفت سے یک سر بے بہرہ پائے گئے، اس حد تک کہ اس صفت کو انھوں نے گویا عجیب جانا۔ جن کی گویائی پر بناؤ اور بگاڑ کا دار و مدار ہو ان کو تو سراپا شنوائی ہونا چاہیے۔ ان کی شنوائی تو ان کے پورے سماج کی شنوائی ہوتی ہے۔ انھیں تو وہ باتیں بھی سُن سکنی چاہییں

جو کبھی بھی نہ گئی ہوں۔اب اگر ایسے لوگ ناشنوائی کو اپناروگ بنالیں تو پھر جان لینا چاہیے کہ سماج میں کوئی بھی کسی کی نہیں سُن رہا۔

کیا ایسا نہیں ہے کہ جیسے کوئی بھی کسی کی نہ سُن رہا ہو اور ایسا یوں ہے کہ جنھیں سب کی سُنتا چاہیے وہ کسی کی نہیں سُنتے۔سُنو اور سمجھو کہ جہاں شنوائی نہیں وہاں دانش اور دانائی نہیں۔ جتنا سُنو گے اتنا ہی سیکھو گے سو اپنی شنوائی سے سیکھو اور اپنی گویائی سے سکھاؤ۔ یہ بات کہ حقیقتِ حال کیا ہے، جاننے کی بات ہے یا نہ جاننے کی۔میرے خیال میں یہ جاننے کی بات ہے۔تو اگر یہ جاننے کی بات ہے اور یہ بات جاننا ہے تو اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ انے گنے لوگوں کی زبانوں پر بھروسا کیا جائے۔خواہش یہ رکھی جائے اور کوشش یہ کی جائے کہ تمھاری شنوائی تک زیادہ سے زیادہ لوگوں کی گویائی کا فیض پہنچے۔یہ جُدا جُدا امزاجوں اور جُدا جُدا مسلکوں کی گویائیاں ہوں۔یہ نہیں کہ کسی ایک ہی مزاج ایک ہی مشرب اور ایک ہی مسلک کی گویائی پر قناعت کر لی جائے۔اب ذرا سوچو تو سہی کہ وہ لوگ حقیقتِ حال سے کس قدر بے گانہ ہوں گے اور دانش و دانائی سے کس درجہ بیزار جو زبان بندی کو روا رکھیں۔یہ کتنا بڑا خسارہ ہے اور اس سے بھی بڑا خسارہ یہ ہے کہ اس خسارے کی خواہش رکھی جائے اور یہاں میں یہ بھی کہہ دوں کہ زبان بندی زبانوں کو بڑے غضب ناک لہجے سکھاتی ہے۔یہی ہے اور یہی ہوا بھی ہے۔

عالمی ڈائجسٹ،نومبر 1975

رائگاں

کیوں یہ میری پیٹھ سے لگا کیا سوچ رہا ہے؟ سامنے آ کے بیٹھ...... کہ جی ہی بہلے۔ جانے کیا ہو گیا ہے کہ جی نہیں لگ رہا۔ ہاں بھائی بڑی وحشت ہے، بڑی بیزاری ہے۔ ہم اپنے آپ میں بُری طرح آن پھنسے ہیں۔ یہ اپنے آپ میں محبوس ہونے اور اپنے آپ سے تنگ آ جانے کا آزار بڑا ہی جان لیوا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ اپنی ہڈیاں پسلیاں ایک کر دوں، اپنا ٹینٹوا چبا جاؤں۔ اپنی ذات کے حبس میں سانس لینا تو ایسا ہے جیسے جاں کنی میں زندہ رہنا اور آزاری آخر تُو کس سوچ میں ہے۔ تُو بھی تو کچھ بول! یہی کہ اس طرح آخر کیسے گزرے گی؟ یہی تو میں بھی سوچتا ہوں، چاہے ہمارے اندر جنت کی ہوائیں ہی کیوں نہ چل رہی ہوتیں اور ہمارے وجود میں جنت کے چشمے ہی کیوں نہ بہہ رہے ہوتے پھر بھی اپنی ذات کی قید دوزخ سے کم نہ ہوتی جب کہ ہمارا اندرون تو خود سب سے بڑا دوزخ ہے۔ آخر وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ذات میں بند رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے باہر سے بھلا کیا سروکار اور یہ بڑے جانے ہوئے اور مانے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ ان سے زیادہ یہ بات جاننے والے کم ہی ہوں گے کہ نفس کی سب سے اچھی حالت کون سی ہے اور سب سے بُری حالت کون سی ہے؟ یہ تُو کیا بُڑ بڑانے لگا اور یہ تُو نے کن بکواسیوں کی بات شروع کر دی جو اپنی ذات میں بند رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھلا ہمیں اپنے باہر سے کیا سروکار۔ بدذات۔ یہ اپنے اندر ہوتے ہی کب ہیں جو باہر نکلیں۔ کھو کھلے۔ تُو ان بے حسوں اور بے حیاؤں کی باتیں کر کے میرا جی نہ جلایا کر۔ خبردار جو اب ان بدروحوں کا نام لیا۔ یہ زندگی کے گورستانوں میں منڈلاتے پھرتے ہیں کہ بدی کی کوئی لاش کھود کے نکالیں اور اسے اپنے

اُدپر منڈھ کر بستیوں میں آئیں اور روگ پھیلائیں۔ یہ تُو نے اچھی کہی کہ یہ لوگ اپنی ذات میں رہتے ہیں۔ کیا تُو نہیں جانتا کہ بدذاتی بےذات ہوتی ہے۔ ہاں یہ ہے کہ باہر سے بھاگتے ہیں اور لاشوں میں اپنے لیے ٹھکانے ڈھونڈتے ہیں۔ ذات میں رہنا بھی کوئی مذاق تو نہیں ہے۔ کیا یہ کوئی آسایش ہے؟ اس سے کڑی آزمایش اور کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنی پسلیوں میں پھنسا سسک رہا ہو۔ اگر انسانوں میں سے کچھ انسان اس آزمایش میں پڑ گئے ہوں تو کیا انھیں اس پر خوش ہونا چاہیے؟ جب تُو یہ کہتا ہے کہ میں اپنی پسلیوں میں پھنسا ہوا ہوں یا اپنی اوجھڑی میں گٹھری بنا پڑا ہوں تو کیا اپنے آپ کو یا کسی اور کو کوئی خوش خبری سُناتا ہے؟ کیا بہت دَم گُھٹ رہا ہے؟ ہاں، سچ مچ جان پر بنی ہوئی ہے۔ بس یہی میرا بھی حال ہے۔ یہ کیسا ہونا ہے، یہ تو بہت ہی عذاب ناک ہونا ہے۔ نہ ہونے کا آرام شاید بہت بڑا آرام ہوتا ہوگا۔ ہاں شاید...... اتنا نشہ کہ ہوش ہی نہ رہے۔ خون کے گھونٹ پی اور جی۔ نہیں بھائی، نہیں۔ اب زبان اور محاورے کی چاشنی کچھ مزہ نہیں دیتی۔ میں تو کہتا ہوں کہ بول ہی مت، بس چپکا ہی رہ۔ ہاں تُو نے ٹھیک کہا۔ اب تو اپنی کوئی بات بھی اچھی نہیں لگتی۔ جب اپنا آپ ہی بُرا لگنے لگے تو پھر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ بھلا تُو اپنے آپ کو کیسا لگتا ہے؟ میں اپنی صورت تک سے بیزار ہوں۔ میں اپنے اس گمان تک سے اُکتا چکا ہوں کہ میں ہوں۔ جو نہ ہونے کی طرح ہے وہ آخر ہے بھی کیوں۔ تُو نے میرا جی خوش کر دیا۔ اگر جاں کنی، جان کنی کا جی خوش کر سکتی ہو، دَم سازی اور غم گساری اسے کہتے ہیں۔ بس یہی کچھ میرا بھی عالم ہے۔ بُرے مارے گئے، ہاں بُرے مارے گئے۔

باہر کی ہوا اب کیسی ہوگی؟ ویسی ہی ہوگی جیسی تھی۔ جیسی چھوڑ کر ہم اپنے اندر بھاگ آئے تھے۔ بھاگ آئے تھے یا کھدیڑے گئے تھے۔ ہاں یوں کہہ لے، ہوا بھی یہی تھا۔ پر ایک بات اور ہے اور وہ یہ ہے کہ باہر کی ہوا کا کیا کہنا۔ ہاں بھئی! باہر کی ہوا کا بھلا کیا کہنا۔ باہر کی فضا کا بھلا کیا کہنا۔ اندر تو رائگانی ہی رائگانی ہے۔ ندامت ہی ندامت ہے۔ ہم جو تھے، ہم میں سے بھلا کون کون رائگاں گیا ہوگا۔ جنھیں رائگاں نہ جانا چاہیے تھا، وہی بُری طرح رائگاں گئے ہوں گے اور انھیں کو اپنے رائگاں جانے کا دُکھ بھی ہوگا۔ کیسے کیسے لوگ

رائگاں گئے۔رائگانی کے ان شہروں میں کیسی کیسی اُمنگیں پچھتاووں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ ایک بات ہے۔کیا بات؟ باہر کی ہوا تھی بھی کچھ ایسی کہ ایسا نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا؟ باہر کی گھٹن بھی اندر کی گھٹن سے کچھ کم تو نہ تھی اور یہ کہ فضا میں قہر تھا اور ہوا میں زہر۔ہوا کا وہ زہر اور فضا کا وہ قہر ضمیر کی ہلاکت اور ذہن کی ہزیمت تھا۔ہم نے حکمت کو ہوس ناکی بنتے دیکھا اور دلیل کو دلاّلی۔قیادت نے قزاقی کا پیشہ اختیار کیا اور قانون نے نقب زنی شعار کی۔پھر ہو کیا؟ کیا ہم اپنے اندر اسی طرح کراہتے رہیں؟ میں تو کہتا ہوں کہ اندر کی ہلاکت سے باہر کی ہلاکت ہزار گنا بہتر ہے۔اندر کی زندگی بھی موت ہے اور باہر کی موت بھی زندگی۔کسی بھی طرح اپنے آپ سے باہر نکلا چاہیے، کسی بھی طرح۔

عالمی ڈائجسٹ، دسمبر 1975

(یہی انشائیہ سسپنس، جون 2006 میں ''کسی بھی طرح'' کے عنوان سے شائع ہوا)

جو کہا گیا

ایک دانش مند شہری نے جو کہا' وہ یہ ہے:

میں آزاد بدی کو زر خرید نیکی پر ترجیح دیتا ہوں۔ نہ بِکا ہوا جھوٹ میرے نزدیک بِکے ہوئے سچ سے کہیں زیادہ قابلِ قدر ہے۔ وہ شخص جس نے گردن جھکا کر سوچا اور سوچ کر از خود یہ رائے قائم کی کہ عوام سے نفرت کرنا چاہیے' اس کی بات میرے نزدیک اس قابل ضرور ہے کہ اسے سُن لیا جائے پر جس نے اُجرت لے کر محبت اور اُخوت کی تلقین کی' وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کی بات پر کان دھرا جائے۔ اگر کسی کو تجارت ہی کا شوق ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنا لباس اُتار کر اس کی بولی لگائے' خیالات کی بولی لگانا کسی شریف آدمی کو ہرگز زیب نہیں دیتا۔ اپنی ذاتی رائے رکھنا اور اس کا اظہار کرنا ایک قسم کی شرافت ہے' پر رائے کو بیچ ڈالنا انتہائی ذلالت ہے۔

یہ بات ان لکھنے والوں سے کہی جا رہی ہے جو کاغذوں پر اپنے دل کی تمام سیاہی بکھیرنے پر تلے ہوئے ہیں' پوچھنا یہ ہے کہ کیا یہ لوگ صرف بکاؤ رائے کے مالک ہیں' کیا بکاؤ خیالات کے سوا اُن کے دماغ میں اب اور کوئی خیال باقی نہیں رہا؟ اس قوم کے صحیفہ نگاروں میں ایسے لوگ زیادہ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو کھلے بندوں بیچا اور افسوس کہ بہت ارزاں بیچا۔ صحیفہ نگاروں کے اس طائفے میں بعض ڈیرے دار ادیب بھی شامل ہیں اور شاعر بھی۔

کسی محل کے سامنے کچھ لوگ کھلکھلا کر ہنس رہے تھے اور وہیں ایک بوڑھا برگد کے

نیچے بیٹھا زار و قطار رو رہا تھا۔ کسی نے پوچھا' اے پیر مرد! رونے کا کیا محل ہے؟ اس نے جواب دیا' اے بھائی! کیا میں اس بات پر نہ روؤں کہ یہ ہنسنے والے اُجرت لے کر ہنسنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔

اقتدار اچھا بھی ہو سکتا ہے اور بُرا بھی' پر ایک بات دیکھی گئی ہے کہ عام طور پر اقتدار کی تائید وہی لوگ کرتے ہیں جو بُرے ہوتے ہیں' اقتدار کی سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ اسے اچھے لوگوں میں سے اپنا کوئی وکیل نہیں ملتا۔ ہمیں چاپلوسوں کے اس گروہ سے کوئی شکایت نہیں۔ پر یہ بات ضرور کہنا ہے کہ یہ لوگ اب آئندہ چاہے ہر بزرگی اور برتری کا دعویٰ کریں' مگر ادیب یا شاعر ہونے کا دعویٰ کبھی نہ کریں' کیا ادب اور شاعری اس رویّے کا نام ہے کہ جب تک کوئی اختیار نہ ہو اس وقت تک حق و انصاف کے سب سے بڑے نقیب بنے رہو اور جیسے ہی تھوڑا بہت اختیار حاصل ہو تو حق و انصاف کی جان کو آ جاؤ۔

ذہنوں کی عصمت فروشی ان سب کا پسندیدہ کاروبار ہے۔ حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف دونوں کو جان لینا چاہیے کہ عصمت فروشی کسی کی وفادار نہیں ہوتی۔ اس طائفے پر کبھی اعتبار نہ کیا جائے کہ اس نے تو زندگی میں فقط خود فروشی کے آسن ہی سیکھے ہیں۔

مجلّہ - مشاعرہ 90ء جشنِ جون ایلیا

بند دروازے کے سامنے

وہ زرد رُو اور ژولیدہ مُو نوجوان عزلت کے نیم روشن حجرے سے باہر نکلا اور حلزونی زینے سے اُتر کر ہیکل کے وسیع و عریض صحن میں آیا جہاں کہن سال درخت تھے اور نو روئیدہ سبزہ۔ وہ اجتماع گاہ کی طرف بڑھ رہا تھا جو صحن کے بیچوں بیچ واقع تھی اور مشرقی زمینوں کی ایک نئی شاعرہ فدوی طوفان کی ایک نظم زیرِلب گُنگنا رہا تھا۔ "بند دروازے کے سامنے" یہ اس نظم کا عنوان تھا۔

"میں اپنے کاندھے پر جابر قدر کے اندیشوں اور زمین کے غموں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہوں پس اپنا دروازہ کھول دے، تیرا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے میرے ہاتھ تھک گئے ہیں۔ میں نے تیرے مکانِ وسیع کا قصد کیا ہے تا کہ مجھے سکون کی کچھ پونجی مل جائے کچھ اطمینان۔ پر تیرے مکان کی وسعت اور فراخی میرے اُوپر بند ہے اور سکوت میں ڈوبی ہوئی ہے اے مکان کے مالک"۔

وہ بوڑھے درختوں کی داڑھیوں کے نیچے سے نکلتا ہوا صاف اور روشن رَوِشوں کی طرف جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اجتماع گاہ کی کشادہ اور سنگلاخ سیڑھیوں کے قریب پہنچا۔ یہ مقام پانزدہ آہنگ کہلاتا ہے۔ اب اس کے قدم سیڑھیوں پر تھے۔ کہنا چاہیے کہ اس کا وجود ایک زینہ دار بُرج تھا۔ جس میں داخل ہو کر وہ اُوپر چڑھ رہا تھا اور اُوپر چڑھ کر مارخم میں داخل ہوا۔ مارخم اس راہداری کا نام ہے جو اجتماع گاہ تک پہنچاتی ہے جہاں سماعتیں اس کے انتظار میں تھیں اور آوازیں اس کے لیے بُڑبُڑا رہی تھیں۔ اجتماع گاہ کے پیش طاق میں پہنچ

کراس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے اُلجھے ہوئے بال درست کیے اور مجمع پر نگاہ ڈالی۔ پس اس کی نگاہ مجمع میں نافذ ہوگئی۔ وہ اپنی ذات کو مختلف جہتوں سے فراہم کر کے ایک نقطے پر لا رہا تھا۔ بعض آنکھیں زبانوں سے زیادہ صریح اور فصیح ہوتی ہیں اور اس کی آنکھیں ایسی ہی تھیں، کچھ ایسا تھا کہ تمام مجمع نوجوان کے اپنے وجود میں قائم تھا اس کے ایک ہاتھ پر آواز تھی اور دوسرے پر سماعت۔

میں اپنی آواز اور اپنی سماعت اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔ دراں حالے کہ زیادہ لوگ ایسے ہیں جن کے پاس نہ ان کی اپنی آوازیں ہیں اور نہ اپنی سماعتیں۔ اس نے کہا پھر اس نے جاننا چاہا کہ وہ گفت گو کیا تھی جو اَب تک جاری رہی اور وہ سکوت کیسا تھا جو اَب تک طاری رہا۔ مجمع نے جواب دیا کہ ہم دانش اور اہلِ دانش کے باب میں سوچ رہے تھے کہ خیال و مقال کی اچھی بُری قسمتیں یہیں سے تقسیم ہوتی ہیں اور دلوں میں ساری ہو جانے والے فیصلے یہیں سے صادر ہوتے ہیں۔

''دانش اور اہلِ دانش'' ......نوجوان اپنے اندر مسکرایا۔ ''جب سے میں اس شہر میں آیا ہوں۔ اس وقت سے اب تک دانش اور اہلِ دانش کا ذکر ہزاروں بار سُن چکا ہوں۔ ایسا ہے کہ شے جب گُم ہو جاتی ہے یا آدمی جب مر جاتا ہے تو اس کے نام کی ہست و بود کچھ دن قائم رہتی ہے۔ وہ کچھ دن تک بار بار زبانوں پر آتا ہے۔ جان لینا چاہیے کہ دانش ان بستیوں سے فوت ہو چکی ہے۔ ہاں اس کے مدعی رہ گئے ہیں اور یہ ہر قدم پر ملتے ہیں۔ ان کی تعداد ان بستیوں کی تمام آبادی سے بھی کچھ زیادہ ہی ہوگی۔ ممکن ہے کہ یہاں دانش کے بعض سچے امانت دار بھی ابھی باقی ہوں۔ پر وہ بہت ہی کم ہوں گے اور ان کی زندگی جلاوطنی کی زندگی ہوگی۔ میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ دانش کے مقصوروں میں بے دانشی بیٹھی ہوئی جگالی کر رہی ہے۔ میں تو دانش مندی اور دانش وری کے وسادے پر غرض مندی کو کہنیاں ٹیکے منہ کے بَل پڑا پاتا ہوں۔ اس کا منہ تغاری پر جھکا ہوا ہے اور تغاری میں راتب ہے اس طرح وہ اپنے بدن کی مالش بھی کرا رہی ہے اور تھوربھی رہی ہے۔ اس کی کھال میں روغن کھپایا جا رہا ہے۔ چباتے رہو، چپڑ چپڑ کرتے رہو، چاٹتے رہو، چوستے رہو اور چھانٹتے رہو۔ مبارک ہیں

وہ تن وتوش جوسر سے لے کر پیر تک تھوتھنی بنے ہوئے ہیں۔

میں نے مجمعوں اور محفلوں میں اور بھی بہت کچھ دیکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خوش بسری اور خوش حالی کی پوشاک دھاندلی اور دنایت کے قامت ہی پر بجتی ہے۔ جرم تُو کس قدر جامہ زیب ہے۔ چالا کی تیری چھب کا کیا کہنا۔ بُرے لوگ کتنے اچھے لگتے ہیں۔ مجھے بُرے ہی لوگوں پر رشک آتا ہے اور پھر وہ نوجوان اپنے اندر خوب ہنسا۔ پھر گویا ہوا' تمھارے شاعروں اور بیان کے بہروپیوں کا کیا کہنا۔

شاعری' یعنی مشہور ہونے کی نیک نام شہوت

ادب' یعنی علم سے بیر رکھنے کا باحمیت پیشہ

علم و فضل' یعنی زبان اور قلم سے مادر زاد برہنہ جہالت کی خدمت کرنا اور تخلیق' یعنی کوّے کا کویل کے انڈے سینا۔

جسے دیکھووہ دوسرے کی جگہ جما بیٹھا ہے او! مسخرے اُٹھ اور اپنے تھان پر جا کر کھڑا ہو! ان دانش وروں نے تو سچ مچ ایک لوٹ مار مچا رکھی ہے۔ نامحرم لفظوں کی لوٹ' نیک نامی کی لوٹ' عزت اور شہرت کی لوٹ اور لو وہ ایک عہدے دار' ایک اہل کار اور ایک ضلع دار نے شعر سُنانے شروع کر دیے۔ او بونو! بس چُپ رہو! کیا یہ خیالات اور لفظوں کے یہ مرکبات تمھارے باپ کا مال ہیں! یہ فربہ اور کوتاہ بونا تو آفت کا پر کالا نکلا۔ چوری اور سینہ زوری۔ وہ مصنف کا نام مٹا کر کتاب پر اپنا نام لکھوا رہا ہے۔ شاباش بونے شاباش! پر میرا کہا مان اور ایک کام کر' کتاب کا پہلا ورق پھاڑ ڈال بل کہ شروع اور اخیر کے دو چار ورق اور سہی اور ہاں اے عظیم الشان مصنف درمیان کا بھی خیال رکھیو!

اور پھر یہ گفت گو اس مرحلے پر پہنچی جہاں دل کی بھڑاس نہیں نکالی جاتی۔ بل کہ اقبال مندکجی اور باعظمت کج روی سے برءت چاہی جاتی ہے اور دانش اور دانش وری کو آپ اپنا مقصود اور آپ اپنی غایت جانا جاتا ہے۔ دانش ور نے کہا کہ اگر تمھیں قناعت اختیار کرنے کے موقف میں لایا جائے تو قلم اور قرطاس کی نیکیوں پر قناعت کرو۔ اس نے کہا کہ ہاں قلم اور قرطاس کا تقویٰ اختیار کرو اور جہاں ہو وہیں رہو۔ تم نے ایک چمکتا ہوا

سیاہ دروازہ اپنے اُوپر بند کر رکھا ہے۔ جنھوں نے اس دروازے کو اپنے اُوپر بند کر رکھا ہے ان کے ذہن زُست گار اور روشن ہیں اور رہیں گے جہاں ہو وہیں قائم رہو کہ سب سے اچھا قیام وہی ہے جو سچ اور سوچ کے ساتھ ہو۔ اگر اکیلے تم اس دروازے میں داخل ہو بھی گئے تو سچ اور سوچ دونوں تمھارا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ اس دروازے سے ایک قدم کے اندازے پر اندر کی طرف پہلی سیڑھی ہے اور پھر سیڑھیاں ہی سیڑھیاں ہیں۔ سیڑھی پر قدم رکھتے ہی سیڑھی کی چتکبری بیٹی پہلو سے نکل کر تمھارے سامنے آئے گی۔ اس کے ہاتھ میں صفر ہوں گے وہ اپنے ایک ہاتھ سے تمھاری آنکھوں میں چربی ملے گی۔ اسی طرح ہر سیڑھی پر اس سیڑھی کی بیٹی اپنا وظیفہ ادا کرے گی اور پھر تمھارا بدن مسخ ہو جائے گا۔ اس قلب ماہیت کے بعد تم انسانوں میں نہیں رہو گے۔ تمھارے وجود کو تھلتھلاہٹ کا لباس پہنا دیا جائے گا۔

اس دروازے اور ان سیڑھیوں نے اندر کے لوگوں کو مسخ کر دیا ہے اور باہر کے لوگوں کو ماؤف۔ جو اس دروازے میں داخل ہو جاتا ہے پھر وہ ذہن سے نہیں اپنے تھلتھلاتے ہوئے بدن سے سوچتا ہے۔ پس تم جہاں ہو وہیں قائم رہو کہ سب سے اچھا قیام وہی ہے جو سچ' سوچ اور سمجھ کے ساتھ ہو اور اس تھلتھلاتے ہوئے جھوٹ سے نفرت کرو۔ نفرت کرو سیاہ چمکیلے دروازے کے جھوٹ سے' سیڑھیوں کے جھوٹ سے اور سیڑھیوں کی بیٹیوں کے جھوٹ سے اور تم دیکھو گے کہ جھوٹ منہ کے بَل زمین پر گرے گا۔

مجلّہ۔ مشاعرہ 90ء جشنِ جون ایلیا

آواز

دنیا میں ہمیشہ کچھ ایسے لوگ رہے ہیں جنھوں نے انسانوں کو انسانوں سے بحث اور گفت گو کرنے سے روکنا چاہا' جتنی زبانیں ہیں اتنی ہی باتیں ہیں اور یہ ایک اچھی بات ہے کہ ہر شخص کچھ نہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اب کوئی یہ کیوں کہے کہ سُننے والے بس میری ہی باتیں سُنیں۔ باقی ہر طرف سے کان بند کرلیں۔ دیکھو سماعت کے دروازوں پر قفل نہ لگاؤ اور سُنو! ہونٹوں کی دہلیز پر پہرا نہ بٹھاؤ۔

لوگوں میں ایک خواہش پائی جاتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ چیزوں کے بارے میں حتمی فیصلے صادر کرتے رہیں اور انھیں کوئی نہ ٹوکے۔ یہ بڑی کچی خواہش ہے' پر اس میں بڑی بُرائی ہے۔ یہ ایک سعادت ہے جو بس دیوتاؤں ہی کو نصیب ہوسکتی ہے اور جب بعض انسانوں نے اس کی خواہش کی ہے تو وہ خود بھی ہلاکت میں پڑے ہیں اور دوسروں کو بھی ہلاکت میں ڈالا ہے۔

انسانیت کی سب سے بڑی نیکی دانائی ہے اور دانائی کا سب سے اچھا وظیفہ کلام۔ کلام اپنے عالمِ استراحت میں خیال ہے اور عالمِ بیداری میں آواز' میں کائنات کے بیکراں سکوت اور استغراق میں اپنی آواز کے سوا اور کیا ہوں' ہم وہاں تک ہیں جہاں تک ہماری آواز جاتی ہے اور ہم اپنی آواز کے ماورا معدوم ہیں اور کیا ابدی سکوت میں فنا ہو جانے والے نہیں ہیں۔ پس ہمیں بولنے دو' یہاں تک کہ موت' ہمیں خاموش کردے۔ کہنے والا کہتا ہے کہ مجھے ہر بات کہنے دو' میں جو باتیں نہ کہہ سکا' وہ میرے بدن میں زہر بن کر پھیل گئیں۔

ان لوگوں کوشک اور شبہے کی نظر سے دیکھا جائے گا جو خود تو بولے چلے جاتے ہیں اور دوسروں کو نہیں بولنے دیتے۔ ان کا بولنا ناگوار ہی گزرے گا چاہے وہ ابدی سعادتوں کی بشارت دینے والے ہی کیوں نہ ہوں۔ دیکھو یہ زمین آج تک کسی ایسے گروہ کے تلووں سے مس نہیں ہوئی، جس نے اپنی جھولی میں دنیا کی ساری سچائیوں کو اکٹھا کرلیا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو زمانے کی گردباد میں بھٹکتا، ڈولتا اور بکھرتا ہوا یہ انسان اس قدر محروم اور بدنصیب نہ ٹھہرتا۔ یہ تو زندگی کی بدبختی ہے کہ اس کی سچائیاں مختلف زمانوں، زمینوں، زبانوں اور ذہنوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو ساری صداقتیں محلّے کے اس سن رسیدہ خردہ فروش کے یہاں مل جایا کرتیں جو دن بھر لوگوں سے معاملت کرتا ہے اور رات کو اپنی دکان کے آگے بیٹھ کر اپنے ہم سنوں کو بستیوں کے قصّے اور شہر بھر کی خبریں سُناتا ہے۔

سب کو اجازت دو کہ وہ معرضِ گفتار میں لفظ و بیاں کی جھولیاں خالی کردیں تاکہ ان کی متاع کو دیکھا جائے اور پرکھا جائے اور پھر کہنے والے یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمارے موتیوں کو بھی کوئی مشتری نہ ملا اور دوسروں کے مونگے بھی موتیوں کے مول بک گئے۔ دانش اور بصیرت کی بہت ہی قلیل متاع ہمارے حصّے میں آئی ہے اور اگر اس میں سے بھی کچھ حصّہ بے زبانی اور خاموشی کے کھتّے میں پڑا رہ جائے تو یہ بہت بڑا نقصان ہوگا۔ ہاں! کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بولتے ہیں تو صرف اس لیے کہ ساعتوں میں فساد پھیلائیں، پر یہ نہ بھولو کہ جو بول کر فساد پھیلاتے ہیں اگر وہ خاموش رہیں تو دس گنا فساد پھیلائیں۔ روح کے تمام روزنوں اور روشن دانوں کو کُھلا رہنے دو، اظہار کو صحرا کی ہواؤں اور سمندر کے پانیوں کی طرح آزاد ہونا چاہیے۔ بولنے والے سِکھانے والے ہیں اور چپ رہنے والے چُھپانے والے اور جو تمھارے ڈر سے چُپ ہو گئے ہیں، وہ کبھی نہ کبھی ضرور بولیں گے اور اس باران کی زبانوں پر تمھارے خلاف کوئی بے زنہار حجت ہوگی۔ پس بولنے والوں کو بولنے اور سُننے والوں کو رولنے اور تولنے دو۔

ہمارے یہاں کچھ پابندیاں ہیں جو صدیوں پہلے عائد کی گئی تھیں اور یہ عوام الناس ہیں جو ان پابندیوں کے خلاف آواز بلند کرنے والے کو مجرم گردانتے ہیں حالاں کہ ان

پابندیوں کی بامشقت سزا سہنے والے خود بھی ہیں۔ اسی طرح یہاں کے خواص میں اظہار کی آزادی کے خلاف ایک رجحان پایا جاتا ہے اور کچھ دن پہلے اس کا اظہار بھی ہوا۔ یہ رجحان ظاہر کرتا ہے کہ بعض لوگ حقیقتوں سے ڈرتے ہیں اور ان میں اعتماد کی کمی ہے پر ماننا چاہیے کہ حقیقتوں کا یہ ڈر اور اعتماد کی یہ کمی چند آدمیوں کا مسئلہ ہے اور اسے پوری قوم کے اعصاب پر مسلط نہیں کیا جا سکتا' جو لوگ رائے اور اظہار کی آزادی اور آواز کے خلاف سوچتے ہیں وہ زندگی اور اس کی روح کے ساتھ بدعہدی کرتے ہیں۔

آواز اور فقط آواز۔ کوئی شخص اس دن کا انتظار کر رہا ہے جب وجود آواز میں تحلیل ہو جائے گا' وہ کہتا ہے کاش میرا بدن آواز کی ایک لہر بن جائے۔ اور پھر تو سکوت اور ہاہوت کا تیرۂ و تار سمندر ہے اور پھر تو کچھ بھی نہیں ہے۔

مجلّہ۔ مشاعرہ 90ء جشنِ جون ایلیا

بیان

وہ نوجوان شاہ راہ کے کنارے ایک جنگلے پر جُھکا کھڑا تھا اور شاہ راہ سے گزرنے والے عظیم الشان ہجوم کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے کچھ پہچاننے والوں نے اسے دیکھ کر کہا کہ تم ہم سے کچھ کہو، ہم کچھ سُننا چاہتے ہیں۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا کہ ہاں! بولنا اور سُننا بھی نیکیوں میں سے دو زندہ نیکیاں ہیں۔ پس آؤ یہاں سے ذرا بچ کر کھڑے ہو جائیں اور وہ ہجوم سے بچ کر ایک اُونچائی پر جا بیٹھے، پھر اس نوجوان نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے اُلجھے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

''دیکھو! میں اپنے اور تمھارے لیے یکتا اور یگانہ جھوٹ سے پناہ مانگتا ہوں، میں اس نیکی سے بھی پناہ مانگتا ہوں جس کا کوئی بدل نہ ہو اور اس بدی سے بھی جس کے سوا کوئی بدی موجود نہ ہو۔ لوگوں کے سامنے ایک سے زیادہ چیزیں موجود ہونا چاہییں تاکہ وہ ان میں سے کسی ایک کو چُن سکیں''۔

اگر میں اپنے جھوٹ کے ساتھ خوش ہوں تو پھر تم میرے اُوپر اپنا سچ مسلّط کرنے والے کون ہوتے ہو، کسی کو کیا حق ہے کہ وہ میری طرف سے فیصلے صادر کرے اور میری طرف سے چیزوں کو رَد اور قبول کرنے کا حق حاصل کر لے۔ دیکھو! ہم میں سے جو لوگ انسانوں اور ان کی اُمنگوں کے درمیان دیوار بن کر کھڑے ہوں گے، ان کا حشر ہم میں سب سے زیادہ بُرا ہوگا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ سچ کیا اور جھوٹ کیا ہے۔ کیا چیز ہمیشہ کے لیے اچھی ہے اور کیا چیز ہمیشہ کے لیے بُری۔ اور مجھے ایک بات اور بھی کہنی ہے اور وہ یہ ہے کہ تم نے اپنے لیے جو کچھ پسند کیا ہے۔ اچھا ہے کہ اسے دوسروں کے لیے بھی پسند کرو، پر اپنی پسند کو

دوسروں کے لیے فرمان نہ بناؤ۔ تمھاری پسند کو ایک ایسی کیفیت سے مشابہ ہونا چاہیے جسے خواہش اور خیر اندیشی کہتے ہیں۔ اپنی پسند کو فرمان اور فیصلے کی حد میں نہ لاؤ۔ اگر لوگوں پر فیصلے ہی نافذ کیے جاتے رہے تو وہ نہ تو اپنے آپ سے وفادار رہیں گے اور نہ دوسروں سے اور نہ ان بستیوں سے جن میں وہ رہتے ہیں۔ بتاؤ! مجھے ان بستیوں سے بھلا کیا سروکار جہاں میری کوئی بات نہ مانی جاتی ہو۔ جہاں مجھے دوسروں کا حکم ماننے کے لیے زندگی گزارنا پڑے۔ مجھے ان قاعدوں اور قرینوں سے کیا واسطہ جنھیں میں نے خود اختیار نہیں کیا' بل کہ جو میرے اُوپر عائد کیے گئے ہیں۔ پھر میں یہ بھی پوچھتا ہوں کہ یہ دوسروں پر اپنے فیصلوں کو عائد کرنے والے ہوتے کون ہیں؟ ہم میں سے کوئی بھی آسمان سے نازل نہیں ہوا۔ ہم سب مکان اور زمان سے برابر کی نسبت رکھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ زیادہ نکھرنے اور سنورنے کی کوشش نہ کی جائے' سب اسی زمین کے کیڑے ہیں جو لمحوں میں کُلبلا رہے ہیں اور ساعتوں میں رینگ رہے ہیں۔

انسان ایک تو خود ہی حقیر تھا' پر اِن لوگوں نے اسے اور بھی حقیر بنا دیا جن کا وجود دوسروں کی پستی اور درماندگی اور عاجزی کا تماشا ہے۔ بعض انسانوں نے اپنے آپ کو بڑی گم راہی میں ڈال رکھا ہے۔ وہ سمجھتے ہوں گے کہ یہ کوئی اچھا راستہ ہے' یہ بہت ہی بُرا راستہ ہے۔ اس راستے پر چلنے والوں کو نفرتوں اور مذمتوں کی بدترین مسافت قطع کرنا پڑتی ہے' کیا وہ لوگ اپنے آپ کو پسندیدہ سمجھیں گے جن سے نفرت کی جاتی ہو۔ جنھیں ایک بوجھ کی طرح برداشت کیا جاتا ہو۔ لوگ آخر اس قدر احمق کیوں ہوتے ہیں۔ میں لوگوں کی حماقتوں اور سفاہتوں سے عاجز آ گیا ہوں۔

اگر میں چند چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو انتخاب کرنے میں آزاد نہیں ہوں تو پھر میں موجود ہی نہیں ہوں۔ اور اگر میں آزاد ہوں' مگر میں نے اپنے فیصلے کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے تو گویا میں اپنی ذات سے دست بردار ہو گیا ہوں اور جو اپنی ذات سے دست بردار ہو گیا ہے' اسے اس زندگی میں رونے اور جھینکنے کی کیا ضرورت ہے؟

سُن لو کہ جو اپنی ذات سے دست بردار ہو گیا ہے اس سے زیادہ ناکارہ، نابکار اور ناشُدنی کوئی نہیں۔

الغرض، بولنے والا اپنے آپ کو ایک ایسا شخص فرض کرنا چاہتا ہے جس نے سُننے والوں کو اثباتِ ذات کی تلقین کی اور اس بات کی اُمید رکھی کہ اس کے بیان کی حقیر پونجی کو اچھی طرح جانچا اور پرکھا جائے گا۔

مجلّہ۔مشاعرہ 90ء جشنِ جون ایلیا

وہی جو ہے وہ کہتا ہے

سچ سب سے بڑا جھوٹ ہے' اور انسان بہت سچا ہے کہ اس نے یہ جھوٹ کبھی نہیں بولا' اور داؤد کا بیٹا واعظ کہتا ہے کہ...... "باطل باطل سب باطل' انسان کو اس ساری محنت سے جو وہ دنیا میں کرتا ہے' کیا حاصل ہے؟ ایک پشت جاتی ہے اور دوسری پشت آتی ہے' پر زمین ہمیشہ قائم رہتی ہے؟" پر کوئی ایسی چیز ضرور ہے جس پر ہمیشہ سچ کا گمان گزرا ہے۔ یا پھر کچھ گریزاں امثال ہیں جنھیں ہم سچائیوں کا نام دیتے ہیں۔ یہ اس سچ کی پرچھائیاں ہیں جو انسان کی دست رَس سے ہمیشہ دُور رہا۔ پر میں یہ محسوس کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اس میں قائم ہیں اور وہ ہم میں قائم ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ سچ کا دھیان سب سے بڑا سچ ہے۔ جو سچ کے بغیر بھی ہم میں قائم ہے۔ پس سب کچھ ہم سے ہے اور سب کچھ ہم میں ہے اور ہمارے ماورا استغراق و دوام کی لامحدود ویرانی ہے۔

اور اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ ہم اپنے ہی دریافتہ لمحات کے قیدی ہیں اور ہمیں قید کی یہ مسرّت چار و ناچار پوری کرنا ہے۔ مقدر تھا کہ ہم کچھ مشغلے اختیار کریں۔ سو ہم نے کچھ مشغلے اختیار کر لیے۔ چیزوں کو خوب صورت دیکھنے کی خواہش' ان کو خوب صورت بنانے کا جنون اور پھر اس بدہیئتی سے نفرت کرنا جو ہماری نگاہوں کے حاشیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہی ہماری سعادت ہے اور یہی ہماری نیکوکاری' اس کے سوا ہمارے لیے اور ہے بھی کیا؟

یہ وہ باتیں ہیں جن کے ماننے پر ہم مامور کیے گئے ہیں' اور یہ ایک اچھا مقسوم ہے۔ پر نہ بھولنا کہ اس سعادت میں بڑی مشقت ہے۔ یہ مشقت جس پر اپنے استخوانی پنجے پھیلاتی ہے اس کا بدن سُوکھ جاتا ہے اور ہڈیاں پگھل جاتی ہیں اور پھر وہ ٹوٹ پھوٹ کر اپنے اندر بکھرنے لگتا ہے' میرے اندر بڑی ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے۔ میں اپنے وجود کے ملبے میں دبا ہوا کراہ رہا ہوں۔ اب تو میرا دم گھٹنے لگا ہے۔

زندگی بڑی بدصورت ہے'اس کے رخسار پتھریلے'ہونٹ زہریلے اور ہاتھ پاؤں نیلے ہیں۔ اس کی چھاتیاں سُوکھی اور پیٹ سپاٹ' کھردرا اور سخت ہے۔ اس کی آنکھوں سے مرگ و ہلاکت کے مرگھٹ کی چڑیلیں گھورتی ہیں' یہ وہ زندگی ہے جو ہمارے اور تمھارے حصّے میں آئی ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ زندگی تو بہت خوب صورت ہے۔ وہ اس مہیب اور مکروہ بدہیئتی کے عقب میں شفقت اور معصومیت کے ساتھ اپنا آغوش وا کیے کھڑی ہے۔ پر ایسا ہے کہ وہ تمام انسان جو مستقیم راستہ اختیار کرتے ہیں وہ مہیب بدہیئتی سے ٹکراتے ہیں اور وہ لوگ جو باطل راستے پر چلتے حدود کی دیواریں پھاندتے اور مقدّس حصاروں میں نقب لگاتے ہیں وہی اب تک اس خوب صورت زندگی پر قابض رہے ہیں۔ ہمارے اُوپر یہ اُفتاد پڑی ہے کہ ہم نے سیدھا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس راستے میں ان آسانیوں کا دُور دُور تک کوئی نشان نہیں' جو حق تلفی اور ہٹ دھرمی سے حاصل ہوتی ہیں۔

صحیح اور باطل راستے کے درمیان جو امتیاز موجود ہے اسے ہم سب نے مل کر قائم کیا تھا۔ اس میں سب کی بھلائی تھی اور اگر چاہو تو اس کو تم زمین کی پہلی اور آخری سچائی کہہ سکتے ہو۔ اور اس امتیاز کو سب مانتے ہیں پر کچھ لوگ ایسے ہیں، جو اس پر عمل نہیں کرتے۔ پس ہوتا یہ ہے کہ جو تجاوز کرنے والے ہیں وہ کامیاب نظر آتے ہیں اور جو حدود کی حرمت کو سامنے رکھتے ہیں وہ ناکام۔ میں کہتا ہوں کہ سیدھا اور سچا راستہ اختیار کرو۔ اس راستے میں سب کو مساوی فاصلہ طے کرنا ہوگا اور اس میں لوگ گھائیاں بنا کر ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ شروع میں اس پر سب قائم تھے' پھر ایسا ہوا کہ بعض انسانوں کی شہوتیں بہت بڑھ گئیں اور اس عہد کو بے حیائی کے ساتھ توڑ دیا گیا۔ اور پھر وہ باطل راستوں سے ہجوم کر کے اس معصوم خوبِ صورتی پر جھپٹ پڑے اور دوسروں کے لیے ایک مکروہ اور مہیب رکاوٹ قائم کر دی اور پھر اس مقدّسہ کو اپنی داشتہ بنا لیا جو ہم سب کی ماں ہے اور جس کی مامتا سب کے لیے ہے' مجھے اس بات پر غصہ آتا ہے اور میں کہتا ہوں، کہ تم بھی اس بات پر غصہ کرو! میں اس شرم ناک خیرہ چشمی کو دیکھ کر غیظ و غضب سے بھر گیا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی غیظ و غضب سے بھر جاؤ!

طلبہ

سوچنا کل بھی جرم تھا اور آج بھی جرم ہے۔ محسوس کرنے میں کل بھی ضرر تھا اور آج بھی ضرر ہے۔ پس کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ سوچنے اور محسوس کرنے کا یہ شیوہ اس دنیا کی ساخت کے یک سر خلاف ہے۔ پر کچھ لوگ یہ بات ابھی تک نہیں سمجھ سکے ہیں اور اس کی یہ سزا پائی ہے کہ ان کے وجود میں کرب و اذیت کا ایک جہنم بھڑک رہا ہے جو انھیں کسی طرح چین نہیں لینے دیتا۔ اگر ان کا وجود اپنے سینے میں بھڑکنے والے اس جہنم کو زمین پر اُنڈیل دے تو زمین پگھل جائے اور پہاڑوں پر اُلٹ دے تو پہاڑ جل کر راکھ ہو جائیں۔ یہ وہ گروہ ہے جس نے زمین اور زندگی کی کبریائی سے تمسک کیا ہے اور ان سے تمسک کیا ہے جو زمین اور زندگی کی مشیت اور کبریائی کو پہچاننے والے اور ماننے والے ہیں۔

یہ گروہ چیزوں پر شک کرتا ہے اور واضح ہو کہ شک اس فروتنی اور نیازمندی کو کہتے ہیں جو ذہن نے حکمت اور آگہی کی طلب میں اختیار کی ہو پس شک ذہن کی عبادت ہے اور اس عبادت سے سعادت اندوز ہونے والے بہت ہی کم ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو یقین کی حقیر اور گم راہ کرنے والی لذتوں سے اپنے نفس کو آلودہ نہیں ہونے دیتے کہ یقین ہی وہ بیماری ہے جو عقلوں میں فتور اور دلوں میں فساد پیدا کرتی ہے۔

جو یقین رکھتا ہے وہ زندگی کی آگہی سے محروم ہے اور جو دعویٰ کرتا ہے وہ دریدہ دہن۔ کچھ نوجوان دانش گاہ کی طرف جا رہے ہیں ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جو چیزوں کو جاننے اور سمجھنے کی سچی لگن رکھتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو اپنے گھروں سے یقین کے پٹارے ساتھ لے کر چلے ہیں۔ انھوں نے ہر بات پہلے سے طے کر رکھی ہے کیا ان کے لیے مناسب نہ ہو

گا کہ وہ راستے ہی سے لوٹ آئیں؟ جنھوں نے ذہن کی لوح کو پہلے ہی سے لکھ کر سیاہ کرلیا ہے، کیا وہ دانش گاہ میں سر کھپانے کے لیے جا رہے ہیں۔ جب تم نے چند باتوں کی صحت اور صداقت پر حلف اُٹھالیا ہے تو اب تمھیں علم سے کیا غرض؟ ہم تمھاری خوش بختی کی ابھی سے شہادت دیتے ہیں اور ضمانت دیتے ہیں کہ علم تمھارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔

کچھ بھی ہو، مدرسے اور کلیسا میں فرق تو قائم کرنا ہی پڑے گا۔ دانش گاہوں میں ضد اور اصرار کی کوئی گنجایش نہیں، جو ایسا کرتا ہے کوئی شبہ نہیں کہ وہ علم کے اس مقدس حرم کی اہانت کرتا ہے۔ یہاں طلبہ کی ایک ایسی نسل کو پروان چڑھایا جا رہا ہے جو علم کو جھٹلانے کے لیے علم حاصل کرنے جاتی ہے اور یہی نسل تعلیم کے فقیہوں کی نظر میں سب سے زیادہ محبوب ہے۔ کوئی شک نہیں کہ یہ سب جہل اور جاہلیت کے گر گے ہیں، جنھیں علم کے دشمنوں نے علم کے پیچھے لگا دیا ہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ ان نوجوانوں پر علم کے دروازے بند کر دیے گئے ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی عقل سے کام لیں اور جو چاہتے ہیں کہ علم سے نفس کی تنزیہہ اور احساس کی تطہیر کا کام لیں۔ جنھیں علم نے انسانوں سے محبت کرنا سکھایا ہے، شاید ان سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ سوچنا اور محسوس کرنا چھوڑ دیں۔ اس لیے کہ سوچنے اور محسوس کرنے کے بہت سے رُخ ہیں اور اس طرح وہ سچائیاں سامنے آتی ہیں جنھیں کچھ لوگ چھپانا چاہتے ہیں۔

کسی ایک بات کی صحت پر ضد کرنا چھوڑ دو اور آؤ کہ اختلافِ رائے پر اتفاق کرلیں! تم ایک بات کہتے ہو، ہمیں دوسری بات کہنے دو، درآں حالے کہ اتفاق تو اس سے بھی زیادہ گہری بات پر ہونا چاہیے، اتفاق تو اس بات پر ہونا چاہیے کہ اب تک جو کچھ بھی سوچا گیا وہ یک سر غلط تھا اور اب سب کو نئے سرے سے سوچنا چاہیے، اس طرح ہم ایک طرف تو ماضی کی روشن صداقتوں سے محروم نہ رہیں گے اور دوسری طرف ماضی کے دَغل و دروغ سے محفوظ ہو جائیں گے۔

مگر افسوس تو یہ ہے کہ یہاں اندھے یقین اور اندھا دھند دعوے داری کو بڑی چھوٹ دے دی گئی ہے، یقین کرو کہ انسان جس لمحے کسی بات پر یقین کر لیتا ہے اور اُس پر جم جاتا ہے،

اس لمحے وہ سامنے کی حقیقتوں سے ایک قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے اور یہ پسپائی علم اور تعلیم کی فطرت کے یک سر منافی ہے' نوجوانوں کو جبری یقین سے نجات ملنا چاہیے' انھیں سوچنے اور محسوس کرنے کی آزادی حاصل ہونا چاہیے' صرف وہی نوجوان دانش گاہوں کی سرپرستی اور ہمت افزائی کے مستحق ہیں جنھیں عائد کیے ہوئے فیصلوں سے انکار ہے اور جو صحیح اور غلط کا فیصلہ اپنی عقل سے کرنا چاہتے ہیں اور جو زندگی کو بدلنے اور بہتر بنانے کی آرزو رکھتے ہیں۔ اس دیار کے قاعدے' اوندھے اور اُلٹے ہیں۔ دانش گاہوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ طالب علم آئیں اور علم حاصل کریں۔ وحشیوں کا ذکر نہیں' مہذب انسانوں کی بستیوں میں یہی ہوتا ہے اور یہی ہونا چاہیے' لیکن یہاں طالب علم دانش گاہوں کی طرف دوڑتے ہیں' زندگی کے تھکا دینے والے مصائب برداشت کر کے ہر قیمت پر علم حاصل کرنا چاہتے ہیں' لیکن ہوتا کیا ہے' ہوتا یہ ہے کہ انھیں جھٹ دروازے سے لوٹا دیا جاتا ہے' گویا علم ایک وبا ہے جسے پھیلنے سے روکنا چاہیے' یہ سب کچھ آخر کیا ہے' یہ ایسی باتیں ہیں جن پر غصہ بھی آتا ہے اور حیرت بھی ہوتی ہے' لیکن نہ غصے کا کوئی حاصل ہے اور نہ حیرت کا کوئی نتیجہ' بہتر یہی ہے کہ باتوں کو برداشت کرنے کی عادت ڈال لی جائے اور خاموش رہا جائے اور اس شخص کی نصیحت پر دھیان دیا جائے جس نے کہا تھا کہ ہر بات کو شدت سے محسوس کرنا بیماری کی علامت ہے۔

مجلّہ - مشاعرہ 90ء جشنِ جون ایلیا

وہ آواز یہ تھی

وقت کی دردمند سماعت نے ایک آواز سُنی اور وہ آواز یہ تھی۔

میں نے دوسروں کا بوجھ اُٹھانا چاہا، پر اپنا بوجھ بھی نہ اُٹھا سکا۔ میں نے دوسروں کو سنبھالنا چاہا اور خود گر پڑا۔ یہ اس کی آواز ہے جو اپنے آپ سے مایوس ہو چکا ہے۔ یہ وہ ہے جو اپنی ذات سے عاجز آ چکا ہے۔ تُو رائگاں ہی گیا اور کیسا رائگاں، میں تو آپ اپنا خسارہ ہوں اور کیسا خسارہ۔

میرے وجود کو دیمک لگ گئی ہے۔ یہ دیمک میرے وجود کی دیواروں اور روکاروں کو چاٹ رہی ہے، یہاں اندھیرا ہے اور سیلن ہے۔ کوئی ہے جو اِن دروازوں اور دریچوں کو کھول دے کہ میرے ہاتھ شل ہو چکے ہیں۔ میں نے اس طرح زندگی کے کتنے ہی موسم گزار دیے۔ یہ میری سرشاری، میری شادابی اور میری بہار کے موسم تھے۔ میں ہواؤں اور شعاعوں کو ترس گیا ہوں اور پھر یہ ہوا ہے کہ میں نے پھولی ہوئی اور پھپوندی ہوئی لاشوں کو اپنے ساتھ رکھ چھوڑا ہے۔ میں ان کے نیلے ہونٹوں کو چُوستا رہا ہوں۔ میں نے ان کی زہریلی چھاتیوں میں اپنے دانت گڑو دیے ہیں۔ میں نے ان کی سرد پیشانی کو چُوم کر اپنے ہونٹوں کو ہلاک کر لیا ہے۔

میرے اندر زہر پھیلتا جا رہا ہے۔ کسی نے کہا تھا کہ زہر کا علاج زہر ہے۔ تو پھر کیا ہی اچھا ہوتا جو میرے حلق میں زہر کے قرابے اُنڈیل دیے جاتے۔ میرے وجود کی بستی میں مہلک وباؤں کے جراثیم پَل رہے ہیں۔ مجھے اپنے حلق میں اُنگلیاں ڈال کر قے کر ڈالنا چاہیے۔ مگر مجھے اس کی ہمت نہیں ہوتی۔ میں کیوں نہیں مان لیتا کہ میں نے ہلاکت کے

جراثیم کو اپنی ذات کا ایک حصہ سمجھ لیا ہے' میں کیوں نہیں مان لیتا کہ میں نے اس فساد کو جی لگا کر پالا اور پروان چڑھایا ہے۔ آواز نے سسکتے ہوئے کہا' مجھے یہ کیا ہو گیا ہے۔ میں ضائع ہو رہا ہوں۔ مجھے ضائع نہ ہونے دو اور مجھے باہر نکال لو! ہواؤں میں اور شعاعوں میں' میں نے اب تک اپنا ایک ہی حق استعمال کرنا سیکھا ہے۔ خودکشی کرنے کا حق۔ مجھ سے خودکشی کرنے کا یہ حق چھین لو اور مجھے باہر نکال لو۔ مجھے رائگاں نہ جانے دو' مجھے ضائع نہ ہونے دو۔ مجھے ہلاکت کے اس تاریک مخروط سے باہر نکال لو۔

مجلّہ- مشاعرہ90ء جشنِ جون ایلیا

بادِرات

سُو وہ بات کتنی سچی ہے جو چین کے پوستین پوش حکیم کنفیوشس نے اپنے شاگردوں سے کہی تھی، اس نے کہا تھا "میرے بیٹو، میرے شاگردو! تم شاعری کا مطالعہ کیوں نہیں کرتے؟ شاعری ذہن میں تحریک پیدا کرتی ہے، شاعری سے انسان میں غور و تامل کی عادت پیدا ہوتی ہے، اس سے میل جول بڑھتا ہے، اس سے کوفت اور پریشانی کم ہوتی ہے۔ وہ انسان کو اس کے قریب تر فرائض اور بعید تر واجبات کی تعلیم دیتی ہے۔"

جب حکیم نے اپنے شاگردوں سے یہ بات کہی تو ایسا تھا کہ وہ انھیں کچھ قیمتی نکتے تعلیم کرنا چاہتا تھا اور بتانا چاہتا تھا کہ شاعری کیا ہے اور وہ زندگی سے کس طرح معاملت کرتی ہے اور یہ کہ انسان کے لیے اس میں کیا رمز پوشیدہ ہے۔ شاعری زندہ اور حساس ذہنوں کی وہ سوچ ہے جو حُسن اور نیکی میں اپنا ثبوت اور ظہور چاہتی ہے اور حُسن اور نیکی ہی اس کی غایت ہیں، اچھا ہے کہ ہم لفظوں کے اسراف سے بچنے کے لیے حُسن اور نیکی میں سے کوئی ایک ہی لفظ استعمال کریں۔ سو ہمارے لیے حُسن کہہ دینا کافی ہے جب کہ ہم نیکی کا ارادہ کریں اور ہمارے لیے نیکی کہہ دینا کافی ہے جب کہ ہماری مراد حُسن ہو۔ پس ہم کہتے ہیں کہ شاعری حُسن ہے اور حُسن کی تلاش ہے اور یہ تلاش خود زندگی کی ماہیت میں اور اس کے اخلاق میں شامل ہے۔ جب شاعر شعر کہتا ہے تو دراصل وہ اپنے وجود کو زندگی کے اخلاق میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی اپنے تضاد سے جہاں بھی اپنے آپ کو متمیز کرتی ہے وہاں وہ بجائے خود حُسن ہے اور شاعری زندگی کی اس تمیز کا اظہار ہے۔

یہ سچ ہے کہ ہمارے پاس کوئی ایسا ضابطہ موجود نہیں ہے جسے شاعروں کے سامنے پیش

کیا جائے اوران پر زور ڈالا جائے کہ وہ اس پر عمل کریں، پر ایک ایسا ثابتہ ضرور موجود ہے جس پر ان تمام برگزیدہ نفوس نے عمل کیا ہے جنھیں پوری سچائی کے ساتھ شاعر کہا جاتا ہے اور وہ ثابتہ کچھ اور نہیں، خود شاعری ہے، ہاں شاعری ہی آپ اپنا ثابتہ اور ضابطہ ہے۔ شاعری ہر صورت میں اپنے اطراف کی نیکی کو ظاہر کرنے کا نام ہے، کیا ایسا نہیں ہے؟ تو کیا ایسا ہے کہ شر کو بات کہنے کا ڈھنگ نہ آتا تھا سو اس نے شاعری کے ہونٹوں سے بولنا شروع کر دیا۔ یقیناً ایسا نہیں ہے، شاعری اپنے تئیں ہمیشہ نیکی کی زبان رہی ہے، صحرا کے ایک شاعر سوار بن مضرب نے کہا:

''اگر میری رفیقۂ حیات سلمیٰ سردارانِ قبیلہ سے میرا حال پوچھے تو اگرچہ زمانہ مجھ سے پھر گیا ہے مگر میری قوم کے شرفا اور میرے دشمن دونوں اسے صاف صاف بتا دیں گے کیوں کہ ان سب نے مجھے خوب آزمالیا ہے، وہ سلمیٰ کو بتا دیں گے کہ میں نے لوگوں کے طعن اور بدگوئی کو سخاوت اور شجاعت کے ذریعے اپنے سے دُور کر دیا ہے اور وہ سلمیٰ کو اس امر کی خبر دیں گے کہ میں ہمیشہ جنگ و فساد میں غرق رہتا ہوں۔ اگر میں کسی کو نہ ستاؤں تو اس حال میں ستانے والوں اور لڑنے والوں کا حمایتی بنا رہتا ہوں۔''

اور جب سوار بن مضرب نے یہ بات کہی تو بہ تحقیق اس نے اپنے اطراف کی ایک نیکی ظاہر کی چاہے آج اس نیکی کا نصف ہمیں مسخ شدہ ہی کیوں نہ معلوم ہو۔ ہمارے زمانے میں زیادہ تر شاعروں نے اپنے اطراف کی نیکیوں کو یک سر فراموش کر دیا ہے اور اس طرح وہ اپنا اور اپنی شاعری کا بطلان کر رہے ہیں۔ اب شاعری ایک ایسا پیشہ ہے جس کے ذریعے بڑائی کی حرص کمائی جاتی ہے۔ کیا بڑائی کی حرص کو بڑائی کہا جائے گا؟ یہ لوگ اپنے زمانے اور اپنے لوگوں سے کس قدر بے تعلق ہو گئے ہیں انھیں اپنے سوا کسی دوسرے سے غرض ہی نہیں رہی گویا یہ صرف اپنے آپ کو جانتے ہیں اور اپنے سوا کسی کو نہیں پہچانتے، تو پھر کہا جائے گا کہ تم اپنے آپ کو بھی نہیں جانتے، جس نے انسانوں سے بریّت اختیار کی اس نے زندگی کے بازار میں اپنے آپ کو تنہا چھوڑ دیا اور اس کے نزدیک تمام انسان مر گئے۔ شاعری پہلے بھی زندگی کے لیے تھی اور آج بھی زندگی کے لیے ہے، کیا ہمیں زندگی کے دُکھ درد محسوس

نہیں ہوتے، کیا یہ کرہتی اور سسکتی ہوئی زندگی ان برگزیدہ انسانوں کی توجہ سے اب ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئی ہے جو زندگی اور اس کے حُسن کی زبان تھے۔

یہاں شاعروں میں ایک خاص رجحان فروغ پا رہا ہے، غیر جانب داری، خود اندیشی اور انسان گریزی کا رجحان۔ ٹھیک ہے کہ یہ بات بے سبب نہیں ہے اور یہ سچ ہے کہ حسّاس لوگوں کی اس بے دلی کا ذمے دار دراصل زندگی کا وہ نظام ہے جس میں ہم گھرے ہوئے ہیں لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم زندگی سے بے نیاز ہو کر حُسن سے اپنا ازلی رشتہ توڑ لیں گے اور شاعری کا وہ معیار بنالیں گے جس پر صرف بدصورتی ہی پوری اُتر سکتی ہے۔ وہ دن شاعری کے لیے سب سے زیادہ منحوس دن تھا جب اسے ایک پیشہ قرار دیا گیا اور پیشے میں صرف کارکردگی دیکھی جاتی ہے، دل کا کوب نہیں دیکھا جاتا اور ہم کہتے ہیں کہ شاعری کوئی پیشہ ہرگز نہیں ہے۔

مجلہ۔مشاعرہ 90ء جشنِ جون ایلیا

(یہی انشائیہ سسپنس، اکتوبر 2001 میں ''شاعری'' کے عنوان سے شائع ہوا)

لکیریں

انسانوں کو ایک دوسرے سے محبت کرنے کی تلقین کی جائے کہ محبت ہی میں نجات ہے یہ سب کتنے بے ذوق اور بے روح ہو کر رہ گئے ہیں۔ انھوں نے تو زندگی کو محض ایک کاروبار سمجھ لیا ہے اور دنیا کو محض ایک بازار۔ تاجرو اور سود خوارو! زندگی کی شرافت کا احترام کرو اور بھاؤ تاؤ کرنا چھوڑ دو۔ اب اس سرزمین پر مالِ تجارت اور تاجروں کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ہر آدمی منفعت اندوزی کے مقابلے میں ایک دوسرے کا بے درنگ حریف ہے اور آدمیت ہار اور جیت کے بوجھ میں دبی ہوئی کراہ رہی ہے۔ اس حلیہ بگاڑ دینے والی سازش سے باز آجاؤ، ورنہ تمہارے اعصاب شل اور دماغ ماؤف ہو کر رہ جائیں گے۔ یہ سب کچھ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔ انسان کو اس کی خبیث شہوتوں، حقیر چالوں، ذلیل نفرتوں اور رکیک نخوتوں نے بڑی فضیحت میں ڈال دیا ہے۔

تنگ دل، خود مراد، بے مہر، بتاؤ تمھیں اس بے مہری سے آخر کیا ملے گا۔ انسانیت اپنی بے ساختگی، شوخی اور تپاک سے اب یک سر محروم ہو گئی ہے۔ آدم کی بدنصیب اولاد جس ڈگر پر چل رہی ہے وہ تھکن، تلملاہٹ، تلخی اور تاسف کی ڈگر ہے۔ کتنی اچھی بات ہے جو کہی گئی ہے۔ میں صرف محبت کرنا چاہتا ہوں اور محبت چاہتا ہوں۔ نہ میں کسی کا مقابل اور مدعی قرار دیا جاؤں اور نہ کوئی میرا مقابل اور مدعی قرار دیا جائے۔ جان لو کہ مقابلے اور مسابقت میں بڑے ہی فتنے ہیں اور مان لو کہ اس میں روحوں کے لیے غلیظ بیماریوں کا عذاب پوشیدہ ہے۔

حُسن اور تناسب کو انسان کی سب سے بڑی کم زوری ہونا چاہیے مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے اور گویا ایسا ہے کہ انسان خود بھی بدصورت ہے اور بدصورتی ہی کو پسند کرتا ہے۔ لوگ بُری طرح خراب ہوئے ہیں۔ بُری طرح مسخ کیے گئے ہیں۔ جس نے انھیں خراب کیا ہے اس کا نام بھی جان لو، اس عیار کسبی کا نام دولت ہے۔ اسی نے دلوں سے ان کی محبتیں اور روحوں سے ان کی شرافتیں چھینی ہیں اور زندگی کو ایک گھناؤنا پیشہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

مجلّہ ۔مشاعرہ 90ء جشنِ جون ایلیا

برزخ

ہاں انسان اپنے ہجوم میں کہیں گُم ہوگیا ہے۔ہاں سناٹوں کے اس انبوہ اور تنہائیوں کے اس جلوس میں وہ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہوئے ہیں۔ ہوا یہ ہے کہ دُوریاں اجھٹ آئی ہیں اور دل بُری طرح بکھر گئے ہیں۔زندگی کی گرم بازاری تو دیکھی گئی، پر یہ نہ دیکھا گیا کہ ہم سب گھاٹے کی متاع کے نفع اندوز اور خساروں کے سُود خوار ہیں۔ ہمارے ایک ہاتھ نے دوسرے ہاتھ کو دھوکا دیا، اور ہمارا ایک قدم دوسرے قدم کے خلاف اُٹھا۔ سچ یہ ہے کہ بڑی ہی بے اعتباری ہے، کوئی میری گھات میں تو نہیں بیٹھا۔ اور کیا میں اگلے ہی قدم پر اپنے ہی آپ کو فریب تو نہیں دوں گا۔ میں اپنے اندر بھٹکتے بھٹکتے تھک گیا ہوں۔ میں نے اپنے وجود کی مسافتوں میں بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ بڑے دُکھ جھیلے ہیں۔ میرا جوڑ جوڑ دُکھ رہا ہے۔ میرا بدن لہولہان ہے۔ میں وقت کی پُر ہجوم شاہراہوں کے بیچوں بیچ کھڑا ہانپ رہا ہوں۔ شاید اس لیے کہ میرے حال اور حُلیے کو دیکھ کر سمجھا جائے کہ یہ کوئی بازی گر ہے اور پھر مجھے رات دن کے اس ناٹک میں اپنے حُلیے کی نمایش کا کوئی معاوضہ مل سکے۔ بڑی ہی بے اعتباری ہے۔

جس کی ٹانگیں ٹوٹی ہوئی ہیں وہ اپنی آنکھیں بھی پھوڑ لے کہ یہ بھی ایک ہنر ہے اور اس کی بھی ایک قیمت ہے۔ ہر چیز بیچی جا سکتی ہے۔ زندگی کی اس منڈی میں ہر مال بکاؤ ہے۔ خود فروشی کے بازار تک بہت سے راستے جاتے ہیں۔ بس کسی بھی گلی اور کسی بھی گلیارے سے نکل جاؤ۔ خوشی کی بات ہے کہ ہم سب اپنے ہنر سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ ہنر وہی ہے جس کا کوئی نرخ ہو سب سے بڑی ہنرمندی یہی ہے کہ آدمی ایک جنس بن جائے۔

اور یوں سمجھو کہ نیکی وہی ہے جس کے دام لگ سکیں۔ اور خوبی وہی ہے جو خریدار کو پسند آ جائے۔ اپنے اندر وزن پیدا کرو،اس لیے کہ تمھیں کسی ترازو میں تولا جا سکے اور اپنی ذات کے موتیوں اور مونگوں کو اس طرح بکھیر دو کہ انھیں اس کالے بازار میں آسانی سے ٹٹولا جا سکے۔

بکنے والا اور خریدنے والا دونوں ہی بازار کی جنس ہیں۔ دونوں ہی نے اپنے اندروں کو خرید و فروخت کی بساط پر اُلٹ دیا ہے۔ دونوں ہی مول تول میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ یہاں تو کسی کو نگاہ اُٹھانے کی بھی مہلت نہیں ہے۔ سب بھاؤ تاؤ میں لگے ہوئے ہیں۔ اور میں اپنے اس ہجوم میں کہیں گُم ہو گیا ہوں۔

جو بکنے کے لیے نہیں ہے، وہ آخر کیوں ہے۔ اگر تم نے اپنی ذات کو جنس ٹھہرا کر اس کے دام نہیں لگائے تو اس طرح اپنی قیمت گھٹائی کہ بڑھائی۔ تم اپنے آپ کو کب تک یہ سمجھاتے رہو گے کہ ہمارے ہنر کی قیمت ہی سب سے بڑی قیمت ہے۔ جو بات اب کوئی نہیں مانتا، اس کو تم کب تک مانتے رہو گے؟ تو 'لو سوچو اور سوچتے رہو کہ تمھاری سوچ کی کم سے کم سزا یہی ہے۔

سوچ کے ان وقفوں میں نفس کے لیے بڑی عذاب ناک آزمائشیں ہیں۔ سوچ کا یہ برزخ جہنم سے زیادہ عذاب ناک ہے۔ مگر یہ بھی سوچو کہ تمھیں سُود و زیاں کے اس برزخ تک کون لایا ہے۔ تمھیں اس برزخ میں کس نے کھڑا کیا ہے۔ جہاں تمھاری ذات کا کمال اس میں ہے کہ تم انسان سے ترقی کر کے مالِ تجارت بن جاؤ۔ جہاں تم اپنی صفات کو اپنے نفس کے بجائے نرخ ناموں میں پیش کرو۔

مجلّہ-مشاعرہ 90ء جشنِ جون ایلیا

کاف

انسان کی حکمت کا جوہر اس کے کاسۂ سر میں غیبت کے لاکھوں برس گزارتا رہا۔ اس جوہر کا رمز اس کے شانے سے اس کے بازو میں اور اس کے بازو سے اس کی کلائی میں روح کے مانند دوڑتا تھا اور اس کے انگوٹھے اور انگوٹھے کے برابر کی دو اُنگلیوں کی تثلیث میں قرار پکڑ کر قلم کو جنبش میں لانا اور روشنائی کی رخشندگی اور نگارش کی درخشانی بن کر نوکِ قلم سے قرطاس پر لپکنا اور ظہور میں آنا چاہتا تھا اور یاد رکھا جائے کہ 'الکتاب' میں دَوات، قلم اور اس چیز کی قسم کھائی گئی ہے جو لکھتے ہیں۔

وہ رمز ایسے ظہور میں آنا چاہتا تھا جو ایک ساعت کے بعد دوسری ساعت میں، ایک حالت کے بعد دوسری حالت میں اُیک مدّت کے بعد دوسری مدّت میں اور ایک پشت کے بعد دوسری پشت میں دائم اور قائم رہے۔

ابنِ آدم کی حکمت کے جوہر نے اب تک تکلّم میں اپنا تحکّم اور کلام میں اپنا کمال دکھایا تھا۔ پر ساعت اور حافظے کی سمائی بہت کم تھی، سو اس نے کم سے کم کو اپنایا اور زیادہ سے زیادہ کو گنوایا تھا۔ نامعلوم زمانوں میں نسل ہا نسل کی خوش کلامیوں کے انعامات بے توفیق سماعتوں کی سمتوں میں رائگاں گئے تھے۔

اگر بُھلا دینے والی سماعتیں، خوش کلامیوں کے سب سے زیادہ قیمتی موتیوں کو بھی خرید لینے کی قیمت اپنی جیبوں میں ڈال کر لائی ہوں تو اس سے کیا فائدہ؟ اور اگر پانے والا کھونے کے ہنر کے سوا اور کچھ نہ جانتا ہو تو وہ آسمان کے سارے ستاروں کو بھی اپنی جھولی میں بھر لے تو اس سے کیا حاصل؟

انسان کی حکمت کے جوہر اور اس کے رمز ہی نے نہیں، خداوندِ خدا نے بھی اپنے کلام اور اپنے احکام کے بارے میں حافظے پر بھروسا نہیں کیا اور خداوند نے موسیٰؑ سے فرمایا کہ پہاڑ پر چڑھ کر میرے پاس آ اور وہاں ٹھہر! جب تک کہ میں تجھ کو پتھر کی لوحیں اور شریعت اور احکام دوں جو میں نے ان کی تعلیم کے لیے لکھے ہیں۔

"اور جب خداوند' کوہِ سینا پر موسیٰؑ سے کلام کر کے فارغ ہوا تو اس کو شہادت کی دو لوحیں دیں، پتھر کی وہ لوحیں جو خدا کی اُنگلی سے لکھی گئی تھیں۔"

موسیٰؑ نے پہاڑ سے پلٹ کے کیا دیکھا، دیکھا کہ ساری قوم راستی سے پلٹ گئی ہے اور سیدھے راستے سے ہٹ گئی ہے۔ سو موسیٰؑ کا غصہ اپنی قوم پر بھڑکا۔ "اور موسیٰؑ کا غصہ بھڑکا تو اس نے اپنے ہاتھوں سے دونوں لوحیں پھینک دیں اور ان کو پہاڑ کے نیچے توڑ ڈالا۔"

جب موسیٰؑ کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اُس نے خداوند سے اپنے لوگوں کی سفارش کی اور خداوند نے وہ سفارش سُن لی۔ "پھر خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ اپنے لیے پہلی لوحوں کی طرح دو لوحیں پتھر کی تراشیں تو میں ان پر وہ کلام لکھوں گا جو پہلی لوحوں پر تھا۔ جن کو تُو نے توڑ دیا۔"

سو انسان کی حکمت کے جوہر کا رمز بھی ہوا اور ہوا کی سمتوں میں رائگاں جانے کے بجائے بقا پانا اور نوکِ قلم سے باہر ٹپکنا اور ظہور کی سطح پر آنا چاہتا تھا اور باہر نگاہوں کی بستیوں میں مٹّی کی لوحوں، پتھر کی سِلوں کے سینوں، ستونوں اور مستطیلوں کی ہمواری پر اس کا انتظار کیا جا رہا تھا۔

پھر یہ ہوا کہ مسیحؑ سے پہلے اور تم کہو کہ مسیحؑ سے بہت پہلے، چوتھے ہزارے میں کسی وقت، سُمیریوں کی سرزمین میں، انسان کی حکمت کے جوہر کو' اس کے رمز کو غیبت سے ظہور میں لایا گیا اور اسے مٹّی کی لوحوں، پتھر کی سِلوں کے سینوں، ستونوں اور مستطیلوں پر تحریر کیا گیا۔ اس طرح حکمت کے جوہر اور اس کے رمز کو گویائی میں آنے کی آزادی کے بعد، نگارش کی قلم رو میں آنے اور ظہور پانے کی آزادی ملی اور یہاں ایک بات کہنا چاہیے' جس کے کہنے

میں ہُنرمندی اور سُننے میں دانش مندی ہے اور وہ بات یہ ہے کہ تحریر کے معنی ہی آزاد کرنا ہیں، خیال کو کاسۂ سر سے آزاد کرنا۔ اور ہے بھی تو یہی کہ اگر حکیموں کی حکمت، داناؤں کی دانائی اور دانش مندوں کی دانش مندی تحریر میں نہ آئے تو وہ ان کے دماغوں میں محبوس ہی تو رہتی ہے۔

سوئمٹی کی لوحیں، پتھر کی سِلوں کے سینے، ستون اور مستطیل، قرنوں اور قوموں کا اور تاریخ کا حافظہ بنے اور اس حافظے نے ہمیں ہزاروں سال پہلے کے شب و روز اور ان کی حکمت، فطانت اور فراست کا وارث بنایا اور یہی نہیں، اس نے ہمارے خوابوں اور خیالوں کو ماضی میں بھی زندہ رکھا۔ اس دور کی حکمت، فطانت اور فراست کی کچھ نشانیاں یہاں میری لکھت میں اور تمھاری پڑھت میں آیا چاہییں، سو وہ یہ ہیں۔

"کپڑے پہنانے والے خدمت گار کے کپڑے ہمیشہ گندے ہوتے ہیں۔"

"دولت مشکل سے نزدیک آتی ہے مگر مفلسی ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتی ہے۔"

"غریب کے پاس طاقت نہیں ہوتی۔"

"میں اصیل نسل کا گھوڑا ہوں،
لیکن مجھے خچر کے ساتھ جوت دیا گیا ہے،
مجھے چھکڑا کھینچنا ہی ہوگا،
اور سرکنڈے اور پودوں کے ٹھنٹھ لے جانے ہی ہوں گے۔"[1]

اور نگارش کی صورت میں حکمت کے جوہر اور اس کے رمز کے ظہور پانے کا یہ پہلا دور تھا مگر یہ ظہور ابھی اپنا اور فروغ اور فراخی چاہتا تھا اور یہ کام وادیِ نیل کے رہنے والوں نے انجام دیا۔ انھوں نے نرسلوں اور دوسرے پیڑوں کے پرتوں سے وہ وہ چیز بنائی جسے پے پی رَس کہتے ہیں۔

مصر کے عاقلوں، ایران کے دانش مندوں، بابل کے کاہنوں اور ستارہ شناسوں اور یروشلم اور یروشلم سے اسیر کر کے بابل لائے جانے والے پیغمبروں اور یونانی روم اور بازنطین کے حکیموں اور فلسفیوں کی حکمتیں پے پی رس پر رقم ہو کر اور بھی پھلیں، پھولیں اور پھیلیں، اور

---

[1]......دنیا کا قدیم ترین ادب از ابنِ حنیف

یہ دور حکمت کی برکتوں کے فروغ اور فراخی کا دوسرا دور تھا۔

اس دور میں ہمیں نگارش کے زمانوں کا سب سے قیمتی سرمایہ نصیب ہوا۔ وہ سرمایہ جو قلم، روشنائی اور قرطاس کا دوامی عطیہ ہے اور انھی زمانوں میں سے ایک زمانے میں بل کہ یوں کیوں نہ کہو کہ مسیح سے پہلے کی چوتھی صدی میں حکمت کے بارے میں جو کچھ رقم کیا گیا ہے اس میں سے کچھ یہ ہے۔

''کیا حکمت ندا نہیں دیتی اور فطانت اپنی آواز بلند نہیں کرتی؟ وہ سرِ راہ اُونچی جگہوں پر اور راستوں کے درمیان کھڑی ہوتی ہے۔ وہ پھاٹکوں کے پاس آواز دیتی ہے۔''

یہ تو وہ ہے جو حکمت کے بارے میں کہا گیا ہے، اس کے بعد کہنے والے نے حکمت کی زبان سے جو کچھ کہلوایا ہے، وہ ایسا کچھ ہے جو حکمت ہی کی زبان سے کہلوایا جانا چاہیے تھا اور اس میں سے کچھ یہ ہے۔ ''اے آدمیو! میں تم کو بُلاتی ہوں اور میری آواز بنی آدم کے لیے ہے۔ اے جاہلو! زیرکی سیکھو اور اے احمقو! عقل کو پہچانو۔ سُنو کیوں کہ میں بڑی باتیں بولتی ہوں اور میری لب کشائی درست باتوں کے لیے ہے، میرا منہ حق بیان کرتا ہے...... میرے منہ کی سب باتیں برحق ہیں...... میری تادیب کو قبول کرو نہ کہ چاندی کو اور علم کو زرِ خالص پر فوقیت دو کیوں کہ حکمت لعلوں سے بہتر ہے اور کوئی بھی نفیس چیز اس سے زیادہ نفیس نہیں اور میں حکمت ہوں اور زیرکی میں سکونت رکھتی ہوں...... میں ازل سے موجود تھی، ابتدا سے، دنیا کے وجود میں آنے سے پہلے۔''

اس کے بعد حکمت کے جوہر اور اس کے رمز کے ظہور کا تیسرا دور شروع ہوا جو اَب تک جاری ہے۔ دوسرے دور میں پے پی رس حکمت کی پیش گاہ بنا تھا۔ اس دور میں حکمت کے لیے پیش گاہ تیار کرنے والے مسیح سے پہلے کے چینی تھے۔ حکمت کی یہ پیش گاہ ایسی ہے جو خاص اور عام سب کے لیے مہیا ہے۔ اس پیش گاہ کے سبب حکمت بازاروں میں دست یاب ہے، وہ ہمارے ہاتھ اور ہماری بغل میں رہتی ہے۔ وہ ہمارے گھروں میں بچی ہوئی ہے۔ یہ پیش گاہ کاغذ ہے۔

کاغذ چینیوں نے تیار کیا اور آٹھویں صدی کے بیچ کی بات ہے کہ چینیوں کا یہ ہنر

عربوں کے ذریعے پہلے عربوں کی قلم رو میں اور پھر ساری دنیا میں حکمت، دانش اور بینش کے فروغ کا وسیلہ بنا۔

مٹی کی لوحوں، پتھر کی سلوں کے سینوں، ستونوں اور مستطیلوں سے لے کر پے پی رس تک اور پے پی رس سے لے کر کاغذ تک انسان کو فطرت پر غالب آنے کے لیے جو توانائی نصیب ہوئی، وہ توانائی سیاروں کے مداروں میں اپنی جبروت کی نشانیوں کے دائرے کھینچ کے سیاروں پر نازل ہو چکی ہے اور اس میں سب سے بڑی کارگزاری کاغذ کی ہے۔

میرے عزیز معراج رسول! اور میرے برادرِ عزیز جمال احسانی! تمھیں یاد ہوگا کہ سماعت اور سخن کی ایک خیال آگیں شام کے ہنگام، ہم تاریخ اور تہذیب کے مرحلوں اور منظروں کا سفر کر رہے تھے کہ اس بیچ میں انسانی ذہن کی مہم جو طبیعت کا ذکر چھڑ گیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ انسانی ذہن کی یہ مہم جو طبیعت اور حکمت و دانش کی ماجرا طلبی کم پر راضی نہیں ہوگی اور وہ کاغذ کے کاف کو کہکشاؤں کے برہنہ سر کاف کی کلاہ بنا دے گی۔ ہاں ہاں، وہ کچھ ظہور میں آئے گا جو ابھی زمین پر اور فضاؤں میں سوچا بھی نہیں گیا۔ کاغذ، کتاب اور کمال، اس تثلیث کے بارے میں تم بھی سوچو اور میں بھی سوچوں۔

سسپنس ڈائجسٹ

لفظ

مِل جُل کے رہنے اور زمانے کے سرد وگرم کو ایک دوسرے کے ساتھ سہنے کی ناچاری نے، خوف کی حالت میں، گھنے پیڑوں سے اُترتے ہوئے، غاروں سے اپنے دائیں بائیں دیکھ کر باہر نکلتے ہوئے، ناسازگار وادیوں اور نامہربان میدانوں میں درندوں اور گزندوں سے جان بچانے کے جاں کاہ روزمرّہ میں زندگی تیر کرتے ہوئے، بادلوں اور بادلوں کے دیوتاؤں کی گرج، چمک اور کڑک سے دہلتے ہوئے انسان کو لفظ ایجاد کرنے پر مجبور کیا۔ پر ایسا کیوں نہ کہا جائے کہ اسے لفظ کے دریافت کرنے پر جو اس کی ذات میں پہلے ہی سے موجود تھا، مامور کیا۔

وجود کی ہیبت ناک تنہائی میں لفظ ادا کرنے اور کبھی آپ ہی آپ بولنے اور بڑبڑانے کا مطلب ہے ایک انسان کا اس گمان کی آسایش میں سانس لینا کہ میں دو ہوں، ایک میں اور ایک میری آواز۔ اور میں اُس ٹیلے، اُس تالاب، اُس جنگل، اُس سوانے اور اُس ٹیکری تک موجود ہوں جہاں تک میری آواز جاتی ہے اور آواز کی اس نزدیکی اور دُوری میں، کوئی شنوائی ضرور ہوگی، کوئی ایک شنوائی یا کئی شنوائیاں، جن کی آواز میری آواز کا ساتھ دے گی۔

وہ بکھرے ہوئے تھے اور لفظ نے انھیں اکٹھا کیا۔ لفظ جو ذہن میں تھا تو ایک خیال تھا، تصور تھا، معنی کے اظہار کی ایک آمادگی تھا، اور جب زبان پر تھا تو ایک لفظ تھا۔

خیال، تصور اور معنی کے اظہار کی آمادگی نے جب ذہن سے باہر کی فضا میں سانس لینا چاہا تو وہ لبوں کی دہلیز پر آبیٹھے اور سناٹے میں انسان کی وہ پہچان سُنی گئی جو لفظ کہلائی اور اسی لفظ نے جب ستانا چاہا تو وہ ذہن کی تنہائی میں ایک خیال، ایک تصور اور ایک معنی کی صورت اور کیفیت میں تحلیل ہو گیا۔

سارے رشتے لفظ سے ہیں، لفظ کے ہیں اور لفظ میں ہیں، جو خیال بھی ہے، تصور بھی اور معنیٰ بھی۔ ہم اور تم اور وہ سب جو ہماری باتیں سُن رہے ہیں، لفظ میں سوچتے ہیں، لفظ کی لذّت میں جیتے ہیں اور لفظ کی اذیّت میں مرتے ہیں۔

اور ہاں ایک زاویہ نشیں دانائی نے ہمیں ایک رمز بتایا جو ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ سو اُس نے اپنی گہری اور گمبھیر کہن کو دُہرایا اور ہمیں سمجھایا کہ ہم لفظوں ہی میں ملتے اور لفظوں ہی میں بچھڑتے ہیں۔ لفظ ہی اپناتے ہیں اور لفظ ہی گنواتے ہیں۔ آخر انسان اور انسان کے درمیان لفظوں کے سوا اور کیا ہے جو انھیں جوڑتا ہے یا انھیں جُدا کرتا ہے۔

معنیٰ نے ذہن کے زاویے میں ایک زمانے تک، تاریخ سے پہلے کے زمانے تک مراقبہ کیا، کبھی سوچ کے ساتھ اور کبھی سوال کے ساتھ اور پھر سوچ اور سوال کی اس حالت میں جو نہ خاموشی کی حالت تھی اور نہ گویائی کی، دانائی پروان چڑھی اور اُس راست قامت دوپایے کی دانش بڑھی جو حیوانِ ناطق کہلاتا ہے اور کبھی کبھی تو خود اپنے ہی آپ سے بولاتا ہے۔

اور یہاں ایک اور بات کہنا چاہیے جو ماننے اور گرہ میں باندھنے کی ہے اور وہ یہ ہے کہ لفظ ہی دانائی بھی ہے اور لفظ ہی دانا بھی، لفظ ہی دانش بھی ہے اور لفظ ہی دانش مند بھی۔ شے ہو یا شخص اور مشہود ہو یا شاہد، جو کچھ بھی ہے اور جو بھی ہے، وہ لفظ ہے، کلمہ ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ وجود اور تمام تر وجود ایک کتاب ہے جس کا نہ اوّل ہمارے اور تمھارے سامنے ہے اور نہ آخر۔ اور خود ہم اور وہ سب کچھ جو ہمارے سوا ہے، وہ لفظ ہے اور لفظ ہی معنیٰ بھی ہے مگر یہاں جو حقیقت جاننے کی ہے وہ یہ ہے کہ لفظ و معنیٰ کا حساب صرف ایک ہی موجود کو دینا ہے اور وہ انسان ہے۔

اب ہم ایک دوسرے کے بہت نزدیک آ کر بات کرتے ہیں۔

''وہ بات کیا ہے، اے کہنے والے! وہ بات کیا ہے؟''

وہ بات بہت ہی قریبی زمانے کی ہے۔ تاریخ کے آغاز سے لے کر اب تک کی بات ہے، یعنی ابھی کی بات ہے، اور وہ یوں کہ تاریخ سے پہلے کے اَن جانے دور میں، انسان نے لاکھوں برس کا جو زمانہ گزارا اس کے مقابلے میں تاریخ کے آغاز سے لے کر اس لکھت کے لکھنے والے

کے قلم کی اُس جنبش تک کا زمانہ، جس میں لفظ "زمانہ" لکھا گیا، چند لمحوں کی بات ہے۔

ہاں، ہاں، ہماری تہذیب، ہماری زبانیں، ہمارے فن اور ہماری فکر، ہمارے فخر، ہمارے تعصبات، ہماری ندامتیں اور ہماری نخوتیں ان سب کا حساب ہی کیا۔ بس چند گہرے سانس لیے اور داستان تمام ہو گئی۔ اس داستان، اس تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ میلادِ مسیح سے چند ہزار سال پہلے، وادیٔ نیل، دوآبۂ دجلہ وفرات اور وادیٔ سندھ میں انسان کی دانش اور ہنر مندی نے شہر بسائے اور یہ دانش اور ہنر مندی، 'لفظ' کی بخشش تھی، اور پھر وہ کچھ جو اَب تک بولا جاتا رہا تھا، لکھا جانے لگا۔

لفظ، خیال، خواب، حقیقت، حکمت، عقل اور جوہرِ عقل کا بدن ہے، اس بدن کا تپاک ہے، اس نے ہزاروں اور لاکھوں سال پہلے بھی ہماری تنہائی دُور کی تھی اور اس کے بعد، اس کے بہت دن بعد، فن تخلیق کرنے والوں، حُسن کو صورت دینے والوں، محنت کے معجزے دکھانے والوں، فصلیں کاٹنے والوں اور ایک ساتھ مل کر خوشی منانے والوں کا ساتھ دیا تھا۔ سو ہمیں آج بھی لفظ سے وہی کام لینا چاہیے جو کام ہم نے اس وقت لیا تھا جب ہم بے رحم فطرت کے مقابل اپنے آپ کو بچانے اور آگے بڑھنے کی ہمت شکن مگر مسلسل جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔

اور اب لفظ کا ایک رمز سُنو اور سر دُھنو!

ل، ف، ظ۔

ل، لانہایت۔

ف، فنا، ہر لحہ فنا۔

ظ، ظہور، ہر آن ظہور۔

سو یہ ہے لفظ، اور یہی وجود ہے اور یہی یونانی حکیم ہرقلیطس کی زبان میں 'لوگوس' ہے، عظیم الشان لوگوس۔

سسپنس ڈائجسٹ' جولائی 1989

بے گانگی

"کیا شام بہت اُداس ہے۔ شام، دَر و بام اور درختوں اور سمتوں کا ابہام؟"

"ہاں شام بہت اُداس ہے۔ شام، دَر و بام اور درختوں اور سمتوں کا ابہام"

"پر ایسا کیوں ہے، ایسا کیوں ہے کہ جب مغرب کا اُفق دہکتا ہے اور دامانِ شفق بھڑکتا ہے جیسے شعلے سے چُنے ہوئے ہوں، جیسے تنور دُھنے ہوئے ہوں اور جب خورشید کا بے کفن جنازہ اُفق میں تازہ تازہ اُترتا ہے تو ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی مِل کے جارہا ہو، جیسے کوئی یاد آرہا ہو، جیسے کوئی جا کے بھول جائے، وعدہ ہو مگر کبھی نہ آئے اور جب دونوں وقت ملتے ہیں تو ہم پر کبھی کبھی ایسی حالت کیوں گزرتی ہے جیسے ہم خود اپنے آپ سے بچھڑ رہے ہوں۔ اپنے آپ سے بچھڑ گئے ہوں؟"

"تم جاننا چاہتے ہو کہ کبھی کبھی ہمیں ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے؟ ایسا یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم دن بھر کی رائگانی کے راستوں سے پلٹ کے جب اپنی تھکن کا اندازہ لگاتے ہیں تو اپنے اندر گھٹتے اور گہناتے چلے جاتے ہیں اور اپنی ذات اور اپنی تھکن کے بیچ ایک بے گانگی پاتے ہیں۔"

"بے گانگی......اور اپنی ذات اور اپنی تھکن کے بیچ!"

"ہاں بے گانگی اور اپنی ذات اور اپنی ہی تھکن کے بیچ۔ اور وہ یوں کہ تمھاری دن بھر کی تھکن جو کچھ کماتی ہے اسے تمھاری ذات شام کو ہیچ اور پوچ پاتی ہے۔ تم صبح کی خوش حالتی اور شام کی خود ملامتی کے بیچ جو کچھ بھی کرتے ہو اس کا اپنے اندر لحہ لحہ تاوان بھرتے ہو۔ تم اس بیچ جو بھی کر کے دکھاتے ہو اس پر پچھتاتے ہو۔ جب تم زبان کھولتے ہو اور بولتے ہو تو اپنے سانسوں کی ترازو میں اپنا گھاٹا تولتے ہو۔ اس لیے کہ تم اپنے منہ میں اپنی زبان نہیں

کسی اور کی زبان پاتے ہو، تم اپنے ہونٹوں سے اپنی آواز نہیں کسی اور کی آواز لگاتے ہو۔"

"ہاں بھائی تم نے سچ کہا اور شام کی اس اُداسی میں اپنی دانست ہی کا دُکھ نہیں میرے دل کا دُکھ بھی سہا۔ کوئی بے گانگی سی بے گانگی ہے۔ تم جو ہو تم اور میں جو ہوں میں۔ ہم اپنی اپنی ذات میں ایک نہیں رہے ہیں۔ ہم میں دراڑیں پڑ گئی ہیں اور ہمارے احساس کی سمتیں اُجڑ گئی ہیں۔ کرنے والے میں اور اس کی کرت میں بے گانگی، زبان کھولنے والے کے منہ میں اور اس کی زبان میں بے گانگی، ہونٹوں میں اور آواز میں بے گانگی! پھر تو میں زبان کھولنے والا اور بولنے والا، ہاں، میں کچھ کر کے دکھانے والا اور اپنی کرت میں پچھتانے والا تو مارا گیا۔ ہاں، میں مارا ہی تو گیا۔"

"میرے بھائی تم ہی نہیں ہم میں سے جو بھی ہے وہ مارا گیا، اس لیے کہ ہم میں سے جو بھی ہے وہ دوسروں کی مرضی پر وارا گیا۔ ہمارے ہاتھ تو ہمارے ہیں پَر اُنگلیاں کسی اور کی ہیں اور وہ یوں کہ ہماری اُنگلیوں نے جب بھی کچھ لکھا تو وہی کچھ لکھا جو اُن سے لکھوایا گیا۔ اپنا ہماری اُنگلیوں میں اور ان کی لکھائی میں بے گانگی ہے۔ ہماری پڑھت میں اور ہماری بینائی میں بے گانگی ہے۔ ہم اس چارسو میں زندہ رکھے گئے ہیں جس میں ہمیں دوسروں کے لیے سانس لینے ہیں۔ سو اے بھائی! اس چارسو کی آرزو کر جس میں تُو اپنے سینے سے خود اپنے سانس لے سکے۔ کیا میں تجھے ایک واقعہ سناؤں؟"

"ہاں میرے بھائی ضرور سُنا۔"

"کل مجھے اسماعیل کتب فروش نے بتایا کہ میرا بھائی الیاس مصوّری کرتا ہے۔ وہ پرسوں کبوتر کی تصویر بنا رہا تھا۔ تصویر بنانے کے بعد اس نے اس کے نیچے بائیں طرف اپنا نام لکھا اور پھر تصویر پر ایک نظر ڈالی۔ اب جو دیکھا تو کیا دیکھا کہ وہ کبوتر کی نہیں بلّی کی تصویر ہے۔"

"ایں! کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ کبوتر کو بلّی چبا گئی، ہنرمند اور ہنر کی بے گانگی ہنر کو کھا گئی۔"

سلامتی

یہ بڑے دُکھ کی بات ہے کہ اب ہمارا ایک دوسرے کے دُکھ سے کوئی واسطہ نہیں رہا ہے، ہاں، اور کیا ہوا ہے۔ یہی تو ہوا ہے کہ جو ہمارا دُکھ ہے، اب وہ تمھارا دُکھ نہیں ہے اور جو تمھارا دُکھ ہے، اب وہ ہمارا دُکھ نہیں ہے۔ سارے رشتے ٹُوٹ گئے ہیں۔ بے حسی اور بے رحمی کے ساتھ توڑ دیے گئے ہیں۔ ہمیں بانٹ دیا گیا ہے اور بُری طرح بانٹ دیا گیا ہے۔ ایک دوسرے کی طرف تپاک سے بڑھنے والے ہاتھوں کو بڑی چابک دستی سے کاٹ دیا گیا ہے۔ یہ وہ بات ہے جس پر میں بھی غصّے سے پیچ وتاب کھاتا ہوں اور تم بھی غصّے سے پیچ وتاب کھاؤ۔

پیشہ ور سیاست دانو! تمھارا ستیاناس جائے۔ ہاں، پیشہ ور سیاست دانوں کا ستیاناس جائے۔ یہ نفاق میں سانس لیتے ہیں اور افتراق میں پھلتے پھولتے ہیں۔ یہ ایک زمانے سے ہاتھ دھوکر ہمارے اور تمھارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

اب تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم ایک دوسرے کی صورت تک نہیں پہچانتے اور ایک دوسرے کا نام تک نہیں جانتے...... اب اگر ہمیں کبھی ایک دوسرے کے نام یاد بھی آتے ہیں تو گالیاں دینے کے لیے۔ چلو گالیاں ہی دو، پر ایک دوسرے کے نام تو یاد رکھو، آخر کوئی تو رشتہ باقی رہے۔

اس شہر میں رہنے والے قبیلوں کے تیور دیکھ کر یہ گمان گزرتا ہے جیسے یہ جُدا جُدا سیاروں میں رہنے والی مخلوق ہوں۔ اُردو بولنے والے مشتری کے باشندے ہوں۔ پنجابی بولنے والے مریخ کے، سندھی بولنے والے عطارد کے اور پشتو بولنے والے زہرہ کے اور پھر کچھ ایسا ہوا جیسے انھیں زبردستی کرۂ ارض کے اس حصّے میں اکٹھا کر دیا گیا۔ اب یہ ایک دوسرے سے عاجز آ گئے ہیں۔ ہاں، ہم ایک دوسرے سے عاجز ہی تو آ گئے ہیں۔

ایسی بیزاری! ایسی دشمنی! ہم ہر لمحہ خوف میں رہتے ہیں۔ ہم وحشت میں سوتے ہیں

اور دہشت میں جاگتے ہیں کہ نہ جانے کب کیا ہو جائے! نہ جانے کن نامعلوم سنگ دلوں کے سر پر خون سوار ہو جائے اور اپنی اپنی پریشانیوں میں اُلجھے ہوئے معصوم راہ گیر خون میں لَت پَت ہو جائیں۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔ میدان صاف ہے، بڑھو اور جو بھی سامنے آئے اُسے خاک و خون میں غلطاں کرنے کی بے ساختہ کارگزاری دکھاؤ۔ نہ مقتول کوئی غیر ہے اور نہ قاتل۔ لاشے گراؤ اور لاشے اُٹھاؤ۔ جشن کے ساتھ سوگ اور سوگ کے ساتھ جشن مناؤ۔ گلیاں گِلے کرتی ہیں اور پھاٹک پھنکارتے ہیں کہ ہم میں سے ہو کر گزرنے والے اب حد سے گزر گئے ہیں۔ جو بھی گھر سے نکلتا ہے، وہ اس طرح نکلتا ہے جس طرح تلوار نیام سے نکلتی ہے۔ دریچے اور دروازے سہمے ہوئے رہتے ہیں کہ یہ جو اُٹھ کر ابھی ابھی چار دیواری سے باہر گئے ہیں، کہیں ان کے لاشے اُٹھا کر نہ لائے جائیں۔ کچھ دن سے خیریت ہے، پَر کیا خبر کل کیا ہو جائے۔ کون نہیں جانتا کہ یہ فضا کن پیشہ ور مجرموں کی پیدا کی ہوئی ہے۔ یہ اُن مجرموں کی پیدا کی ہوئی ہے جنھیں خوں ریز حادثے ہی پناہ دے سکتے ہیں اور جو اِن حادثوں ہی کی گرم بازاری میں اپنا کاروبار چلا سکتے ہیں۔ واویلا! کہ جو بھی گھر سے باہر ہے، وہ سُرخ موت کے منہ میں ہے۔

وہ شہر جو رونقوں کا شہر تھا، اب ویران سا ہو گیا ہے۔ اس کی بستیاں آپس میں ایک دوسرے کو ہلاکت کے دھماکوں اور دہاکوں کی سوغاتیں بھیجتی رہی ہیں۔ بستیوں کی رونق تباہ کی جاتی رہی ہے اور تباہ کرنے والے کسی غنیم کے آدمی نہیں ہیں بل کہ ان بستیوں ہی کے نوخیز فرزند ہیں۔ اپنے اپنے گروہوں کے دل بند اور اپنے اپنے قبیلوں کے ارجمند ہیں۔ اطمینان اور سکون کا سانس لیا جائے کہ بچے بڑے نہیں ہوئے بل کہ وقت کے بھیانک فتنوں کی مسیں بھیگی ہیں۔ سلامتی ہو، سلامتی ہو کہ قوم کے نوجوان ایک دوسرے کو خون میں نہلاتے ہیں اور خود بھی خون میں نہلائے جاتے ہیں۔ تمھاری عمر دراز ہو کہ تمھیں پیدا ہی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تمھارے نام روشن ہوں کہ تمھارے نام ہی نہیں رکھے جانے چاہییں تھے۔ ان بستیوں کو آباد دیکھنا ہے تو دعا کرو کہ بچے پیدا ہوتے ہی بوڑھے ہو جایا کریں کہ ان بستیوں کو اپنے بچوں کی جوانی راس نہیں آئی۔

سسپنس ڈائجسٹ، اکتوبر 1989

محبت

"ابھی کی بات ہے کہ میں آسمان کی نیل گونی میں کھویا ہوا تھا اور میں اور میرا خیال، دونوں شمالِ زمرّدیں کی طرف پرواز کر رہے تھے۔ ہم دُھول اور دھوئیں کی نامہربانی سے بہت اُوپر، بہت اُوپر تیر رہے تھے"۔

"سچ مچ!"

"ہاں ہاں! سچ مچ، کیا میں تجھ سے جھوٹ بولوں گا، اپنے آپ سے۔ اپنے اندر کے یار سے، اپنے اندر کے جوڑی دار سے، حد کر دی تُو نے بھی!"

"اچھا تو پھر ہوا کیا؟ تُو اور تیرا خیال شمالِ زمرّدیں کی طرف پرواز کر رہے تھے، تو پھر؟"

"میں نے ایک آواز کو گنگناتے ہوئے سُنا۔ نہ جانے وہ مغرب کی آواز تھی یا مشرق کی، شمال کی تھی یا جنوب کی، وہ گنگنا رہی تھی"۔

"ہم محبت میں سانس لیتے ہیں تو فضا میں خوشبو پھیل جاتی ہے۔ ہم محبت سے دیکھتے ہیں تو پیڑوں کے پیلے پتے ہرے ہو جاتے ہیں اور اپنی چونچ سے اپنے بال و پر کو کھجاتے ہوئے پرندے دھوپ جلی منڈیروں سے اُڑتے ہیں اور گھنے پیڑوں کی ٹہنیوں پر جُھول کر اور جُھوم کر چہچہانے لگتے ہیں"۔

"وہ آواز گنگنا رہی تھی۔ محبت موسم بدل دیتی ہے۔ لُو چل رہی ہو تو کیا ہوتا ہے؟ یہ ہوتا ہے کہ احساس اور خیال کی جھلسی ہوئی سمتوں میں، بھیگی ہوئی ہوا بہنے لگتی ہے"۔

"پر کیا ایسا ہوتا بھی ہے؟"

"تو اور کیا! ایسا ہی تو ہوتا ہے اور اُسی کو بُھلا دیا گیا ہے"۔

"کیسے؟"

''محبت کو' محبت کو یک سر بُھلا دیا گیا ہے' کیا نہیں بُھلا دیا گیا ہے؟ دلوں میں کھوٹ ہے اور کیسی! کینے ہیں اور کتنے! میں کہتا ہوں کہ اگر ایسا ہی رہا تو سب کے سب یارا کھ ہو جائیں گے یا دھواں۔ میں' ہاں میں کہتا ہوں کہ تم سب راکھ ہو جاؤ گے یا دھواں۔ تم نیچے کا بھی گھاٹا ٹھہرو گے اور اُوپر کا بھی''۔

''تم کتنے بُرے بولنے والے اور کتنے بُرے سُننے والے ہو۔ تم زہر بولتے ہو اور زہر سُنتے ہو۔ تم سے تو زبان بھی پناہ مانگتی ہے اور کان بھی۔ تمھاری زبان دل داری سے اور تمھارے کان غم گساری سے محروم ہیں۔ تم تو اب بس وہی کچھ کہتے ہو جو کہنے کے لیے ہے ہی نہیں۔ سواَب تم بس وہی کچھ سُنتے ہو جو سُننے کے لیے ہے ہی نہیں۔ وائے ہو تم پر کہ تمھاری صبحیں اور دوپہریں بداندیشی کی ہوس میں جوتے چٹخاتی ہیں' تمھاری شامیں بے حسی کو آنکھ مارتی ہیں اور تمھاری راتیں بدانجامی کا پہلو گرم کرتی ہیں''۔

''پر' ایسا آخر کب تک ہوتا رہے گا؟ ایسا آخر کب تک ہوتا رہے گا' تم آخر کب تک دلوں کی ویرانی اور خیالوں کی گراں جانی میں دن گزارتے رہو گے؟ کیا اس طرح دن گزار کے تمھاری اُلجھنیں دُور ہو جائیں گی' کیا اس طرح زندگی بسر کر کے تمھیں سکون ملتا ہے؟ کیا تم چین سے ہو؟ ہاں' یہ سوال تو مجھے خوب سوجھا' اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ' کیا تم سچ مچ چین سے ہو؟''

''جھوٹ بولنے کی نہیں ٹھیری اور پھر اس کا کوئی حاصل بھی نہیں ہے۔ جھوٹ بول کر اور پھر خود اپنے آپ سے جھوٹ بول کر نہ اپنے حلق سے لقمے اُتارے جا سکتے ہیں' نہ اُچھو لگے بغیر پانی کے گھونٹ لیے جا سکتے ہیں اور نہ گہری نیند سویا جا سکتا ہے۔ سُنو جھینپو مت! میں تمھارے اندر سے بول رہا ہوں۔ مجھ سے جھینپو مت' میں' تم ہوں' میں تم سب کے اندر کا تم ہوں۔ تم چین سے نہیں ہو' میں چین سے نہیں ہوں' ہم چین سے نہیں ہیں''۔

سسپنس ڈائجسٹ' نومبر 1989

(یہی انشائیہ سسپنس' جولائی 2001 میں ''راکھ یا دھواں'' کے عنوان سے شائع ہوا)

اعتماد

میں کوئی اور رائے رکھتا ہوں اور تم کوئی اور رائے رکھتے ہو۔ میں کسی اور جماعت کے ساتھ ہوں اور تم کسی اور جماعت کے ساتھ ہو۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے کبھی بُرا سمجھا گیا ہو یا بُرا سمجھا جانا چاہیے، یہ تو سچ کو تلاش کرنے کا ایک طور ہے، میں سچ کو دائیں طرف تلاش کرتا ہوں اور تم سچ کو بائیں طرف تلاش کرتے ہو، پر یہاں کا جو طور ہے، جو طور رہا ہے، وہ عجب کچھ ہے۔

یہاں ایک دوسرے سے جُدا رائے رکھنے کا مطلب ہے ایک دوسرے کا دشمن ہونا۔ ایک دوسرے پر کسی بھی معاملے میں اعتماد نہ کرنا۔ کیا عقل و ہوش کی سلامتی اور سیاست کے یہی معنی ہیں۔ ایک جماعت کسی بھی معاملے میں دوسری جماعت پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو ملک کا دشمن اور قوم کا غدّار خیال کرتے ہیں۔ ان دو لفظوں کے سوا اپنے حریف کے لیے ہمارے پاس اور کوئی لفظ نہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ ہم میں سے ہر گروہ یہ گمان رکھتا ہے کہ اس کائنات کی ساری سچائیاں اور اچھائیاں اس کی جیبوں میں جمع ہو گئی ہیں۔ وہ اس زمین کا سب سے منتخب، محبوب اور برگزیدہ گروہ ہے۔ اور تاریخ نے آج تک کا جو سفر طے کیا ہے، اس کی غرض اور غایت ہی یہ تھی کہ اس منتخب، محبوب اور برگزیدہ گروہ کو اس دور کے حوالے کر سکے اور بس۔

تم کون ہو اور ہم کون ہیں؟ اور ہمارے گمان، ہمارے خیال اور ہماری رائے کی بھلا حقیقت ہی کیا ہے۔ تمھارے ذہن کے کشکول میں آخر وہ کون سی دلیل اور وہ کون سی حجت ہے جس کے توڑ کے لیے ہمارے ذہن کے کشکول میں کوئی دلیل اور کوئی حجت موجود نہ ہو

اور ہمارے ذہن کے کشکول میں آخر وہ کون سی دلیل اور وہ کون سی حجت ہے جس کے توڑ کے لیے تمھارے ذہن کے کشکول میں کوئی دلیل اور کوئی حجت موجود نہ ہو۔

کیا ہمارے باطن سے یا تمھارے باطن سے الہام کا کوئی رشتہ پایا جاتا ہے؟ ہم میں سے آخر وہ کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ ہم نے جب بھی سانس لیا تو سچ میں سانس لیا۔ ہم نے جب بھی سوچا تو سچ میں سوچا۔ سچ کے ساتھ سوچا، سچ کے لیے سوچا اور اوّل سے آخر تک سچ ہی سوچا؟

سوچو اور یہ سوچنے کی نیک عادت ڈالو کہ دوسرے جو کچھ سوچ رہے ہیں، وہ بھی سچ ہو سکتا ہے، نہ تم آسمان سے اُترے ہو اور نہ تمھارے حریف۔ تمھیں وجود میں لانے کے لیے زمین اور آسمان نے اتنی ہی مشقت اُٹھائی ہے جتنی مشقت، تمھارے حریفوں کو وجود میں لانے کے لیے اُٹھائی ہے۔

ایسا کیوں ہے کہ تم کسی بھی رائے اور کسی بھی خیال کے بارے میں اپنے سوا کسی دوسرے پر اعتماد کرنے کی کوئی بھی اہلیت نہیں رکھتے؟ ایسا کیوں ہے کہ سچ اور سچائی کو تم نے بس اپنی ہی دستاویز کا ایک گوشوارہ سمجھ رکھا ہے؟ اور میرا یہی سوال تمھارے حریف سے بھی ہے۔

ایک ہی حق تو ہے جو تم بھی مانگتے ہو اور تمھارا حریف بھی مانگتا ہے۔ اور وہ حق ہے رائے رکھنے اور اسے ظاہر کرنے کا۔ تم وہ رائے رکھو جو تمھیں درست معلوم ہوتی ہو اور دوسروں کو وہ رائے رکھنے کی آسانی فراہم کرو جو انھیں درست معلوم ہوتی ہو۔

اور تم دونوں اس معاملے میں ایک دوسرے پر اعتماد کرو کہ جو کچھ دوسرا کہہ رہا ہے وہ اس کی رائے ہے، ریاکاری نہیں اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ تمھاری رائے ہے، رُوباہی نہیں۔

اگر یہ اعتماد باقی نہ رکھا گیا اور اس بارے میں بھی بے اعتمادی کو کام میں لایا گیا تو بولو اور بتاؤ کہ پھر اس بات کا فیصلہ روئے زمین پر آخر کون کرے گا کہ جو تمھارا خیال ہے، وہ تو خیال ہے اور جو دوسرے کا خیال ہے وہ نیت کی خرابی اور خلل ہے۔ ایک دوسرے کے بارے میں اعتماد کو کام میں لاؤ اور پھر اپنے اپنے دعوے اور اپنی اپنی دلیلوں کی بساط بچھاؤ۔

بحث ہونا چاہیے اور جاری رہنا چاہیے۔ شکوہ کس بات کا ہے؟ شکوہ ہی اس بات کا

ہے کہ یہاں بحث نہیں ہوتی۔ ہم لوگ ابھی تک بحث کے خوگر نہیں ہوئے ہیں۔ ہم تو بدگوئی اور بدبحثی کی عادت میں مبتلا ہیں۔

بحث، ذہن کی دانش مندانہ اور دانش جویانہ حالت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور ہم ذہن کی دانش مندانہ اور دانش جویانہ حالت سے محروم ہیں، ہم جب تک ذہن کی اس حالت سے محروم رہیں گے، اس وقت تک ہمارے اور سچائی کی خواہش کے درمیان کوئی رشتہ قائم نہیں ہوسکتا۔

آؤ ایک دوسرے پر اعتماد کر کے اپنے اور سچائی کی خواہش کے درمیان وہ رشتہ قائم کریں جو شائستگی کی پہچان ہے اور بحث شروع کریں، وہ بحث جو سچائی تک پہنچاتی ہے۔

سسپنس ڈائجسٹ، دسمبر 1989

نیا سال

ہم بیسویں صدی کے نویں دہے کا آخری سال شروع کر رہے ہیں۔ اس سال میں ہمیں نوے سال کا حساب بے باق کرنا ہے اور پاکستان کی تاریخ کے حساب سے بیالیس سال کا حساب دینا ہے۔

نئے سال اور پرانے سال کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ زمانے میں نہ لمحے ہیں' نہ ساعتیں' نہ دن ہیں' نہ ہفتے' نہ مہینے ہیں اور نہ سال۔ زمانہ ایک لمحہ بھی ہے اور لمحے کا ہزارواں حصّہ بھی۔ زمانہ ازل بھی ہے اور ابد بھی۔ زمانہ ہی وہ سب کچھ ہے جو ہے۔

زمانہ وجود اور عدم کا ایک سمندر ہے۔ ایک بے کنار اور بے کراں سمندر' جس میں ہم بہہ رہے ہیں' ڈوب رہے ہیں اور اُبھر رہے ہیں۔ پھر بھی ہمارا جسم ہے کہ نہیں بھیگتا۔ ہمارے کپڑے ہیں کہ خشک رہتے ہیں۔

زمانہ ہمارے دائیں بھی ہے اور بائیں بھی۔ زمانہ ہمارے سامنے بھی ہے اور پیچھے بھی۔ زمانہ ہمارے اُوپر بھی ہے اور ہمارے نیچے بھی۔ زمانہ ہمارے اندر بھی ہے اور ہمارے باہر بھی۔ ہمارا بدن اور ہماری روح زمانے کے سوا اور کیا ہیں۔ وہ جو مل رہے ہیں اور وہ جو بچھڑ گئے ہیں۔ وہ کون ہیں' وہ کون تھے؟ میں اور تم جو ایک دوسرے میں سانس لے رہے ہیں۔ میں اور تم جو ایک دوسرے کا سُکھ بھی ہیں اور دُکھ بھی' آخر ہم کون ہیں؟ وہ جو ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں' وہ جو ایک دوسرے کے بغیر ایک پل بھی نہیں گزار سکتے تھے' وہ جو ایک دوسرے کی جدائی میں مر جاتے تھے اور رسائی میں جی اُٹھتے تھے' وہ کون تھے؟ کون تھے وہ' کیا وہ زمانے کے سوا کچھ اور تھے؟

زمانہ ہی تو ہے جو ہمیں مارتا ہے اور ہمیں جلاتا ہے۔ زمانہ ہی تو ہے جو ہمارے ساتھ رہتا ہے اور ہمارا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ زمانہ ہی تو ہے جو گزرتا ہے تو کبھی لوٹ کر نہیں آتا اور زمانہ ہی تو ہے جو کبھی نہیں گزرتا۔ ہاں، زمانہ کبھی نہیں گزرتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ستارے ہیں اور ہیں۔ کہکشاں ہے اور ہے۔ پہاڑ ہیں اور ہیں اور سمندر ہے اور ہے۔ کیا تم کائنات کو بدلتے ہوئے دیکھتے ہو؟ کیا سورج کبھی نکلتا ہے اور کبھی نہیں نکلتا؟ کیا چاند کبھی ڈوبتا ہے اور کبھی نہیں ڈوبتا؟ یہی تو زمانہ ہے جو ہے اور سب کچھ ہے۔ یہی تو زمانہ ہے جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔

جب تم سب کچھ کہنا چاہو اور بس ایک ہی لفظ کہہ سکو تو کہہ دو، زمانہ۔ اور جب تم کچھ بھی نہ کہنا چاہو اور سب کچھ کہہ سکو تو بس ایک لفظ کہہ دو، زمانہ۔ ہماری اور تمھاری ساری زباں دانی اور نکتہ سامانی، اس ایک لفظ کے سوا اور کیا کہہ سکتی ہے۔

ہم جو لمحہ بھی گزار رہے ہیں، وہ آخری لمحہ ہے۔ زندگی اور آرزومندی کا آخری لمحہ۔ اور یوں تو لمحوں کا حساب اور شمار کبھی ختم نہیں ہوگا۔ ہم گزرتے رہیں گے اور گزر جائیں گے اور لمحہ پھر بھی باقی رہے گا۔

کیا تم مجھے ایک بات بتاؤ گے، تمھارے ہونے اور نہ ہونے کی سب سے بڑی حقیقت کیا ہے؟ سوچو اور سوچ کر جواب دو کہ ہمارے ہونے اور نہ ہونے کی سب سے بڑی حقیقت کیا ہے؟ اور وہ حقیقت کیا ہے جو نہ ہمارے ہونے سے بدلتی ہے اور نہ ہمارے نہ ہونے سے۔

تمھارے دانش مندانہ سکوت نے میرے سوال کا جواب دے دیا اور اس کے سوا اس سوال کا کوئی اور جواب تھا بھی نہیں۔ ہے بھی نہیں۔ وہ سب سے بڑی حقیقت گزرنا، گزرتے رہنا اور گزر جانا ہے۔ کیا ہمارے دُکھوں میں سب سے بڑا دُکھ یہ نہیں ہے کہ ہم گزر رہے ہیں، گزرتے جا رہے ہیں اور گزر چکے ہیں۔

ہمارے پاس دن، رات، ہفتے، مہینے اور برس نہیں ہوتے۔ ہمارے پاس تو بس ایک لمحہ ہوتا ہے۔ اور یہی ایک لمحہ ہمارے لیے دن، رات، ہفتہ، مہینا اور برس ہوتا ہے۔ ہم زمانے ہی

میں ہوتے ہیں اور زمانے ہی میں نہیں ہوتے۔ ہمارے پاس ایک ہی تو پونجی ہے اور وہ زمانہ ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ درست بات یہ ہے کہ ہمارے پاس ایک ہی تو پونجی ہے اور وہ خود ہم ہیں۔ اس گھڑی' اس لمحے اور اس پل کے ہم۔

اس گھڑی' اس لمحے اور اس پل کے ہم' نیا سال منانے والے ہیں۔ یہ سال اس صدی کی نویں دہائی کا آخری سال ہے۔ یہ صدی ہم نے جی جی کے اور مر مر کے گزاری ہے۔ اور پھر اس صدی کے بیالیس سال جو ہم نے اپنی نئی پہچان اور اپنے ہونے کے نئے دھیان کے ساتھ گزارے ہیں' وہ تو عجب کچھ تھے۔ اندھیروں اور اُجالوں کے چار کھونٹ تھے اور اندھیروں اور اُجالوں کی اُونچائی اور نیچائی تھی' جن کے بیچ ہم ہونے نہ ہونے کا دُکھ رَچا رہے تھے' سُکھ منا رہے تھے۔

وہ دن اور پہلے کے وہ ہم' گزر گئے ہیں۔ اب ہم اپنے ہونے کا نیا پن بسر کرنا چاہتے ہیں۔ نئی خواہشوں' نئے خیالوں اور نئے خوابوں کے ساتھ گزر کرنا چاہتے ہیں۔ اور دیکھو' خواہش کے بعد نئی خواہش' خیال کے بعد نئے خیال اور خواب کے بعد نئے خواب کے ساتھ گزر بسر کرنا ہی زندگی ہے۔

اور اب تو پہلے سے زیادہ اچھا موسم ہے۔ اب تو پہلے سے زیادہ اچھے دن ہیں۔ ہم نے تو بہت بُرے دن گزارے ہیں۔ کیا نہیں گزارے؟ ہم نے تو ان بُرے دنوں میں بھی اپنی اُمیدیں نہیں ہاریں۔ وہ ساری اُمیدیں ہمارے وجود میں مہک رہی ہیں۔ وہ ساری تمنائیں ہماری نمود میں دمک رہی ہیں۔ اب ہمیں نئی اُمیدوں اور نئی تمناؤں کے ساتھ نئے جذبے گنگنانا چاہییں۔ تاکہ جمہوریت زندہ رہے۔ پاکستان تابندہ رہے!

سسپنس ڈائجسٹ' جنوری 1990

ضرورت

ہم صبح سویرے اُٹھتے ہیں' پھر اپنے دفتروں' اپنے کارخانوں اور اپنی روزی کے ٹھکانوں کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ مگر ہم صبح سویرے کیوں اُٹھتے ہیں۔ کیا یہ اُٹھنے کا وقت ہے؟

ہاں! میں نے اپنے آپ سے دُرست سوال کیا۔ یہ اُٹھنے کا وقت نہیں ہے' مگر ہم پھر بھی اُٹھتے ہیں۔ ہم اپنی ضرورت اور احتیاج کی وجہ سے اُٹھتے ہیں۔

یہ ہماری مجبوری بھی ہے اور مختاری بھی کہ ہم جاڑوں میں اپنے گرم بستروں اور گرمیوں میں اپنے سرد بستروں سے اُٹھیں' منہ پر چھپکا ماریں' ناشتا کریں اور اپنی احتیاج کی خاطر گھر سے نکل جائیں۔

اب سے لاکھوں برس پہلے بھی انسان کا یہی معمول رہا ہے۔ یہاں مجھے یوں ہی ارسطو یاد آ رہا ہے۔ ارسطو نے انسان کی یہ تعریف کی تھی کہ انسان ایک ایسا جانور ہے جو دو پیروں پر چلتا ہو اور اس کا قامت سیدھا ہو۔

میرے اور تمھارے خیال میں یہ تعریف انسان کی کوئی غلط تعریف تو نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم دو پیروں پر چلتے ہیں اور ہمارا قامت سیدھا ہے۔ مگر یونان کے ایک حکیم نے اس سیدھی' سادی اور سچی تعریف کو بھی نہیں بخشا اور اس کا مذاق اُڑایا۔ وہ قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک دن ارسطو اپنی مجلس میں بیٹھا ہوا اپنے شاگردوں سے بُود و نبود کے مسئلے پر گفت گو کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک ننگ دھڑنگ آدمی جس کے لمبے اور اُلجھے ہوئے بال اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے' مجلس میں داخل ہوا۔

ارسطو کی آنکھوں نے اور اس کی آنکھوں ہی نے نہیں، پورے وجود نے آنے والے اس عجیب وغریب آدمی کی پذیرائی کی۔ آنے والا تھا بھی ایسا جس کی ارسطو اپنے پورے وجود کے ساتھ پذیرائی کرتا۔

میرے ادیب دوست اور بھائی معراج رسول، اور میرے قبیلے کے صاحب حال شاعر میاں جمال احسانی، وہ تمھارا بہت محبوب اور محترم قلندر تھا۔ تمھارے دل اور دانش کا قلندر۔ اور ہم تینوں کے حرفوں کو پڑھنے والے دوستوں، دانش وروں اور دانش یاروں کا بہت محبوب اور محترم قلندر۔ اور میں اور تم جانتے ہیں کہ اس کا نام دیو جانس کلبی تھا۔

وہ ارسطو کی مجلس میں وارد ہوا اور حال یہ تھا کہ اس کی بغل میں ایک مرغا تھا۔ وہ مجلس میں وارد ہونے کے بعد چند لمحوں کے لیے ٹھہرا اور اس نے دائیں ہاتھ سے مرغے کی دونوں ٹانگیں پکڑیں اور بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور اس کے برابر والی اُنگلی سے اس کی چونچ کو پیچھے کی طرف کھینچا اور اسے زمین پر دو پایہ جان دار کی طرح کھڑا کر دیا اور کہنے لگا...... "یہ ہے ارسطو کا انسان"۔

کوئی شبہ نہیں کہ ارسطو نے انسان کی جو تعریف کی ہے، اس تعریف کی رُو سے دیو جانس کلبی کا مرغا، ان چند لمحوں کے دوران انسان کی تعریف پر پورا اُترتا تھا۔ اور اس بات میں انسانوں کو جھینپنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت اور احتیاج کے معاملے میں مرغا اور انسان دونوں ایک ہیں۔

ہاں! ہم سب انسان، جانور، پیڑ، پودے، پھلواریاں اور جھاڑ جھنکاڑ۔ ہم سب کے سب ضرورت اور احتیاج کے مارے ہوئے ہیں۔ میں، تم، میرے دوست اور دشمن، جانور، پودے، ان کی ٹہنیاں، پتے، پھول اور ان کے کانٹے سب کے سب ضرورت اور احتیاج کے مارے ہوئے ہیں۔

میں اور تم اسی وقت گنگناتے ہیں جب پکا ہوا یا اُبلا ہوا اناج ہمارے معدوں میں پہنچ گیا ہو۔ جانور اسی وقت اپنی اپنی بولیاں بولتے ہیں، جب ان کا پوٹا تر ہو۔ اور پیڑ پودے، پھلواریاں، جھاڑ جھنکاڑ اور گھاس پھوس اسی وقت لہرائیں گے جب ان کی جڑوں تک پانی پہنچ گیا ہو۔

زمین کا سارا کھیل، زندگی کا کھیل ہے۔ اور زندگی کا سارا کھیل، دانے اور پانی کا کھیل ہے۔ میں، تم اور ہم سب اور ہمارے سب سے چوکھے رنگ اور ہمیں سب سے زیادہ پسند آنے والی خوش بوئیں، معدوں اور جڑوں سے زندہ ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو مجھے اپنا ایسا کوئی دانش مند دکھادو، کوئی ولی دکنی، میر، غالب، شاہ لطیف، وارث شاہ، میر انیس، بلھے شاہ اور خوش حال خاں خٹک...... جس نے ہوائیں پھانکی ہوں اور ہوائیں پی ہوں اور انسانوں کی بہترین دانش کو گنگنایا ہو۔

میں جانوروں، پیڑوں، پودوں، پھولوں اور سمندروں میں زندگی کا لہراؤ پانے والی دوسری چیزوں کے نام گنانا چاہتا ہوں، گنا تا ہوں اور نہیں گنا پاتا۔ مگر یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ ہر وہ چیز جس کے بارے میں، میں اور تم یہ کہتے ہیں کہ وہ ہے...... کیا ایسا ہے کہ وہ بس ہوا اور پانی کے نام پر زندہ ہے؟

سارا مسئلہ پیٹ کا ہے اگر پیٹ خالی ہے تو نہ فن کے کوئی معنی ہیں اور نہ فکر کے۔ جس چیز نے انسانوں کی زندگی کو اس کے لیے ایک سزا بنا دیا ہے، وہ ضرورت ہے جو پوری نہیں ہوتی۔ ہم سب کو ایک ایسا ماحول بنانا چاہیے جس میں زندگی ایک سزا محسوس نہ ہو۔

سسپنس ڈائجسٹ، فروری 1990

شمال کا جھوٹ

مجھے شمال کی سرزمین میں رہنے والے ایک گُم نام شاعر کا خیال آ رہا ہے۔ عجیب بات ہے کہ اسے میرے سوا کوئی نہیں جانتا اور ایک اور بات بھی ہے' اور وہ یہ کہ مجھے بھی اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس گُم نام شاعر کا دل نہ ہجوم میں لگتا ہے اور نہ تنہائی میں۔ مجھے ایک زمانے تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آخر ایسا کیوں ہے؟

ایک دن وہ مجھے ''نوبت خانے'' کے چوراہے پر دکھائی دیا۔ اس کے بال لمبے اور اُلجھے ہوئے تھے جو اس کے دوش کو چُھو رہے تھے۔ اس کا لباس بوسیدہ تھا' اور اس کے جوتے کی ایڑیاں گِھسی ہوئی تھیں۔ وہ اس طرف جا رہا تھا جہاں بستی ختم ہوتی تھی۔ میں نے اس کے نزدیک پہنچ کے اُسے سلام کیا۔ اُس نے ایک اُداس اور نراس مسکراہٹ کے ساتھ میرے سلام کا جواب دیا۔

مین کچھ دیر اس کے ساتھ چلنا اور کچھ دیر اُس کی دانش کے طول و عرض میں سانس لینا چاہتا تھا۔ سو' میں نے اُس سے احترام اور التجا کے لہجے میں کہا: ''میں کچھ دیر کے لیے تمھارے سانسوں کی نزدیکی میں اور تمھاری زیرکی کی چارسوئی میں رہنا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے اس عزت اور اس مسرت اور سعادت سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع دو گے؟ یہ میرے دل و دماغ کی بہت عزیز خواہش ہے''۔

اس نے بہت مہربان مگر بہت ویران انداز میں میری طرف دیکھا اور پھر وہ چلتے چلتے ایک گلی کے نکڑ پر رُک گیا اور اس کے ساتھ میں بھی رُک گیا۔ اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''اے تم' جو تم ہو' میرے دوستوں کے دوست اور میرے دوست!

آخر تم میرے سانسوں کی نزدیکی اور میری بے معنی اور عبث زیرکی میں کیوں سانس لینا چاہتے ہو؟ کیا تمھارے سینے میں کوئی آگ ہے جو بھڑک رہی ہے؟ کیا تمھارے دل میں کوئی عذاب ہے جو دہک رہا ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ تمھارے کسی کام آسکوں۔ مگر میں تمھارے کس کام آسکتا ہوں؟''

''میں نہیں جانتا کہ تم میرے کس کام آسکتے ہو اور میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ میں کون ہوں اور تم کون ہو؟''

شمال کی سرزمین میں رہنے والے اس دانش مند شاعر نے مجھے دیکھا اور مجھ سے کہے بغیر یہ کہا: ''اگر ایسا ہے تو آؤ' میرے ساتھ چلو۔ ہم بستی سے گزر کر ''اللہ ہُو کے باڑے'' کی طرف چلیں گے اور وہاں سیّد جی کے چبوترے پہ بیٹھ کے کچھ سانس خرچ کریں گے۔ پر میرے دوست' ایک بات سُن لو اور وہ یہ کہ اس زمانے میں دل کی گہرائی کے ساتھ باتیں کرنے اور سچی شنوائی کے ساتھ باتیں سُننے میں آزار ہی آزار اور ادبار ہی ادبار ہے۔ اور وہ یوں کہ اس بستی میں وہی بات کہنا سب سے بڑا ہنر سمجھا جاتا ہے جو دل کی گہرائی کے ساتھ نہ کہی گئی ہو۔ اور وہی بات سُننا سب سے بڑا ہنر ٹھہرا ہے' جو سچی شنوائی کے ساتھ نہ سُنی گئی ہو''۔

ہم دونوں ''اللہ ہُو کے باڑے'' کی طرف چلے اور وہاں پہنچ کے سیّد کے چبوترے پہ جا بیٹھے۔

مجھ سے اس دانش مند مگر گم نام شاعر نے پوچھا: ''میرے بھائی! اب تم یہ بتاؤ کہ مجھے کیا کہنا چاہیے اور تمھیں کیا سُننا چاہیے؟ کہنے کے بہت سے طریقے ہیں اور سُننے کے بہت سے سلیقے۔ ہم ان میں سے کون سا طریقہ اور کون سا سلیقہ اختیار کریں؟''

میں نے کہا: ''شمال کے سبزہ زاروں کے سب سے دانش منداور دردمند شاعر! میں وہ بات سُننا چاہتا ہوں جو اس نزدیکی اور اس گرداگرد میں تمھیں بار بار اور بہ تکرار کہنا چاہیے اور تمھارے سُننے والوں کو بار بار سُننا چاہیے۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اب ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ...... ہمیں کیا کہنا اور کیا سُننا چاہیے؟ بستیوں میں جو کچھ بھی کہا جا رہا ہے وہ زبانوں اور کانوں کو ویران کر دینے والا جھوٹ ہے''۔

تب اُس نے شاہ بلوط کی گھنیری ٹہنیوں اور گھنے پتوں کے گھنیرے اور گھنے پن میں اپنی نگاہوں کو رَچاتے اور بساتے ہوئے کہا۔ ''میں وہی کچھ کہوں گا جو مجھے کہنا چاہیے تا کہ تم وہی کچھ سُن سکو جو تمھیں سُننا چاہیے۔ سو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا اور تمھیں بھی وہی کچھ سُننا چاہیے جو تم نہیں سُننا چاہتے۔ اور وہ یوں کہ کہن اور سُنن دونوں جھوٹ ہیں اور میں 'کہنے والا' اور تم 'سُننے والے' دونوں جھوٹ کا اُلجھیڑا اور جھوٹ کا بکھیڑا ہیں۔ ہم اور تم چوٹی سے اَیڑی تک شمال کا جھوٹ ہیں۔ آؤ ہم اپنے آپ کو چوٹی سے اَیڑی تک بدل دیں اور پھر کہیں اور سُنیں''۔

سسپنس ڈائجسٹ اپریل 1990

بے دولتی

ہمارا سب سے بڑا ہنر یہی تو ہے کہ ہمارا ہنر اپنے کام نہ آئے اور یہ کہ وہ دوسروں کے پیش و پس، چپ و راست اور پست و بلندی کی صورت گری کرنے، انھیں سنوارنے اور نکھارنے میں اپنا جواب نہ رکھتا ہو۔ تم تھے ہی نہیں، ہم تھے ہی نہیں، تم ہو ہی نہیں، ہم ہیں ہی نہیں۔ ہم اور تم تو بس ایک دکھائی دینے والا دھوکا ہیں، ایک دھوکا جو نہ جانے کیوں ہے؟ میں یہ سوچتے سوچتے ہلکان ہو گیا ہوں کہ وہ جو نہیں ہیں، وہ جو دھوکا ہیں، وہ دکھائی بھی کیوں دیتے ہیں۔

ہمیں شرم آنا چاہیے کہ ہم تم میں سے ہیں اور تمھیں اس پر پچھتانا چاہیے کہ تم ہم میں سے ہو۔ تم اور ہم ایک بیزار کر دینے والا تماشا ہیں جسے دیکھتے دیکھتے پپوٹے دُکھنے لگے ہیں۔

میں، معراج رسول اور جمال احسانی تینوں سرزمینِ عرب کے اس علاقے کو ایک ساتھ دیکھ رہے ہیں جس کو ہماری سرزمین کے ہنرمندوں نے ریگستان کا معجزہ بنا دیا ہے، ہنر کا معجزہ۔ ہماری کارگزاری کا سارا سلیقہ دوسروں کے لیے اس کمال کے ساتھ ظہور میں آیا ہے۔ ہم نے اپنی بستیوں سے دُور ان بستیوں میں آ کر جو عمارتیں بنائی ہیں، وہ سربلند رہنے کے لیے ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے گر پڑنے کے لیے نہیں ہیں اور گزرگاہوں کا جو فرش بچھایا ہے وہ زمین کے سینے پر جڑے رہنے کے لیے ہے، موسم کی اگلی ہی رو میں اُدھڑنے کے لیے نہیں۔ نہیں سمجھا جا سکتا ہے کہ شہر پردازی کی وہ کاوش اور دفترداری کی وہ دانش آخر کس کام کی جو اپنے شہروں اور اپنے دفتروں کے کام نہ آئے۔

تمھارے شہروں کے باہنر، تمھارے ماہر، تمھارے محنت کش، دوسری سرزمینوں کے ناموں کو للچائے ہوئے کانوں سے سُنتے ہیں۔ ایسے کتنے ہیں جو یہاں سے سفر اختیار کرنا نہ

چاہتے ہوں۔ کسی نے کہا تھا اور کراہتے ہوئے کہا تھا:

''میرے لوگ، میرے جفاکش دوسری قوموں کی مزدوری کریں گے۔ ان کی تھکان دوسروں کا آرام بنے گی۔ میرے اہلِ ہنر دوسروں کے غلام ٹھہریں گے۔ میرے اہلِ دانش کی مہارت دوسروں کے اشاروں کی خدمت گار قرار پائے گی۔ ان میں سے ہر گروہ اپنے اپنے کام کے حساب سے خوب خوب کمائے گا اور یہ ذلت، ندامت اور نکبت کی کمائی ہوگی۔ وہ اپنے وجود سے دست بردار ہو جائیں گے، اور پھر تو وہ جو چاہیں، پائیں اور جتنی اشرفیاں چاہیں، اپنی جیبوں میں بھر کر لائیں''۔

پر یہاں ایک اور بات بھی کہنا چاہیے اس لیے کہ وہ حق اور انصاف کی بات ہے اور وہ بات یہ ہے کہ ہم میں سے زیادہ لوگ آخر یہ کیوں نہ چاہیں کہ انھیں دو وقت کی روٹی ملنے کا سہارا تو ہو اور اگر اس سے بھی زیادہ، بہت زیادہ کی اُمید ہو تو آخر وہ اپنے شہروں سے کیوں نہ کوچ کر جائیں۔ میں تو کبھی کبھی یہ کہتا ہوں کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ مہارتوں اور ہنر مندیوں کو اپنی سرحدیں پار کرنے کی خواہش آخر کیوں نہیں رکھنا چاہیے؟ انھوں نے اپنی عمر کا بہترین زمانہ دن رات محنت کر کے گزارا ہے۔ ان میں سے اکثر کو ان کے شہروں سے کیا ملا ہے۔ ان میں سے لاکھوں لوگ ایسے ہیں جو ہر حالت میں یہیں رہنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے لاکھوں ایسے ہیں جو آج کی اُمید نہ سہی تو کل کی اُمید پر زندگی بسر کرنے کی خواہش رکھتے ہیں مگر یہاں تو ابھی تک نہ آج کی اُمید ہے اور نہ کل کی۔ وہ یوں کہ جو ہمارے والی ٹھہرے ہیں وہ بھی فضول ہیں اور جو اُن والیوں کو ہٹا کر ان کی گدی پر بیٹھنا چاہتے ہیں، وہ بھی فضول ہیں۔

جن لوگوں نے اپنے آقاؤں سے لو لگائی ہے اور جنھوں نے ان آقاؤں کے حریفوں سے اُمیدیں رکھی ہیں، وہ سب گھاٹے میں رہے ہیں۔ حکم رانوں اور مدعیوں کا کہا باطل ہی ثابت ہوا ہے، باطل باطل سب باطل۔ اب اگر لوگ بھڑ کر ان دونوں پر ٹوٹ پڑیں تو کیا یہ کوئی جرم ہوگا؟ میں کہتا ہوں کہ یہ حق ہوگا، انصاف ہوگا، عدل ہوگا۔ لوگ وعدوں سے تنگ آگئے ہیں، چاہے یہ وعدے یہ کریں یا وہ۔

اس ملک کے حاکموں اوران کے حریفوں نے اور اُن کی حکمتوں نے یہاں کی جوہر دار ذہانتوں کو دوسری قوموں کا گداگر بنا دیا ہے اور یہ ہنرمند بےقصور ہیں۔ یہ بے چارے ملکوں ملکوں جا کر گداگری کرتے ہیں اور اپنے اپنے کشکولوں کی بھیک اپنے ملک میں بھیج دیتے ہیں۔ وہ اس ملک کی اور کیا خدمت کر سکتے ہیں؟ مگر ان محنت کشوں کی بھیجی ہوئی یہ دولت اس ملک کی بے دولتی ہے، ہاں! اے مجبور بار برداری کی قوم! یہ تیری بے دولتی ہے۔

سسپنس ڈائجسٹ، مئی 1990

قانون

''تم باہر تو جارہے ہو مگر تمھیں کسی نے اغوا کرلیا تو......''

''ہوں...... میں باہر تو جارہا ہوں مگر مجھے کسی نے اغوا کرلیا تو...... مجھے کسی نے اغوا کر لیا تو......''

''مگر تم مجھے خوامخواہ دہلاتے رہتے ہو۔''

''میں خوامخواہ دہلاتا رہتا ہوں...... تمھیں مقدس صحیفوں کی قسم، کیا تم یہ بات دل سے کہہ رہے ہو؟''

''تو پھر تم بھی میرے ساتھ چلو۔''

''میں بھی تمھارے ساتھ چلوں...... مگر ہم دونوں کو اغوا کرلیا گیا تو......؟''

''ہاں یہ تو ہے۔ اگر ہم دونوں کو اغوا کرلیا گیا تو...... تو پھر؟''

''تو پھر یہ کہ باہر تو جانا ہی ہوگا، ہم اندر کب تک رہ سکتے ہیں؟ باہر ہی تو ساری زندگی ہے۔ باہر ہی تو سب کچھ ہے۔ ہمارے نام بھی تو ہمارے باہر ہی ہیں۔ ہماری پہچان بھی تو باہر ہی ہے اور یہ کہ تم بھی تو میرے باہر ہی ہو...... اور میں بھی تو تمھارے باہر ہی ہوں...... اور میرے اور تمھارے سانس بھی تو باہر ہی ہیں۔''

''میرے بھائی آخر ان بستیوں کو ہو کیا گیا ہے؟ وہ کون لوگ ہیں جو نہ جانے کہاں سے یہاں آگئے ہیں؟ معراج رسول، جمال احسانی' انیق' جاوید آدرش، شہزاد اور خالد ادریس اور شاہد ہمایوں! تم نے اسی بستی میں ہوش سنبھالا ہے، تم بتاؤ کہ یہ لوگ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں......؟''

''یہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ باہر سے آئے ہیں؟ کہیں یہ لوگ ہمارے اور تمھارے اندر سے تو نہیں نکل آئے؟''

''ہاں، ایسا ہو تو سکتا ہے کہ یہ لوگ ہم ہی میں سے برآمد ہوئے ہوں...... اور ایک دوسرے کو خود ہی اغوا کر لیتے ہوں۔ مگر پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ہوتا تھا مگر کبھی کبھی ہوتا تھا مگر اب تو یہ روز کا معمول بن گیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا ہے؟ یہ گلیاں، یہ نکڑ، یہ راستے، یہ شاہراہیں اور یہ بستیاں اتنی مہلک اور مہیب کیوں ہو گئی ہیں؟ ہم نے تو ان بستیوں کو بڑے چاؤ سے بسایا تھا، ہم نے تو اپنے مسکنوں کو اُجاڑ کر ان بستیوں کو اپنا مسکن بنایا تھا...... تو پھر یہ بستیاں ہمارے حق میں، ہم میں سے ایک دوسرے کے حق میں اتنی نامہرباں کیوں ہو گئی ہیں؟ میرا نام زید ہے، میں اُردو بولتا ہوں اور میں اس بستی میں غیر محفوظ ہوں۔ میرے ایک دوست کا نام مہتاب منگریو ہے، وہ سندھی بولتا ہے اور وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔ میرے ایک اور دوست کا نام عثمان بلوچ ہے، وہ بلوچی زبان بولتا ہے۔ اُردو بھی جانتا ہے، وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔ میرا اپنا ایک آدمی ہے، اُس کا نام نذیر لغاری ہے، وہ بابا فریدؒ کے شہر کا رہنے والا ہے اور وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے اور میرا ایک یار ہے افتخار جالب، جو پنجابی اور اُردو میں لکھتا ہے۔ اسی بستی میں رہتا ہے اور وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔''

''مگر پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اب ایسا کیوں ہوتا ہے؟ پہلے اگر ایسا ہوتا بھی تھا تو بہت کم ہوتا تھا۔''

''سُننا چاہتے ہو......؟ یہ قانون کی شکست ہے۔ یہ قانون کی بے حرمتی ہے اور یہ قانون کی معزولی ہے۔''

''ہیں...... قانون کو کس نے معزول کیا؟ قانون کی کس نے بے حرمتی کی؟''

''قانون کو کس نے معزول کیا، قانون کی کس نے بے حرمتی کی...... میرے بھائی! کیا تم یہ بات بھی نہیں جانتے؟ یہ بات تو کریم سبزی فروش بھی جانتا ہے اور یہ بات تو خلیفہ مجید کے اکھاڑے کے پٹھے بھی جانتے ہیں...... اور یہ بات تو تنو جیب تراش بھی جانتا ہے۔

کیا میں اس سے آگے بھی کچھ کہوں؟ یہ بات تو وہ لوگ بھی جانتے ہیں جو حکومت کی گدّی پر بیٹھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے قانون بنایا اور اب جو فرق پڑا ہے، وہ یہ ہے کہ عام آدمیوں نے بھی قانون سے کھیلنا شروع کر دیا ہے۔ جب تک قانون بنانے والے قانون کا احترام نہیں کریں گے تو بستیوں اور شہروں کے عام لوگ بھی اس کا احترام نہیں کریں گے۔ حکم رانوں سے کہو کہ وہ عام آدمیوں سے یہ سمجھوتا کریں کہ جو قانون ہم نے بنایا ہے، ہم بھی اس کا احترام کریں گے اور تم بھی اس کا احترام کرو گے اور نہیں......اور اگر نہیں تو نہیں، ہرگز نہیں۔ اگر عام آدمی کو قانون کا پابند بنایا گیا تو پھر خاص آدمیوں کو بھی اس قانون کی پابندی کرنا پڑے گی۔ اگر قانون کی دوطرفہ رعایت نہیں کی گئی اور اس کی حرمت کو برقرار نہیں رکھا گیا تو پھر ان بستیوں میں جنگل کے درندے ہی آ کر آباد ہوں گے۔

سسپنس ڈائجسٹ، نومبر 1990

سلامتی کی راہ

صدیوں پہلے کتاب میں لکھا گیا۔

"بدن کا چراغ آنکھ ہے۔ پس اگر تیری آنکھ درست ہو تو سارا بدن روشن ہوگا اور اگر تیری آنکھ خراب ہو تو تیرا سارا بدن تاریک ہوگا۔ پس اگر وہ روشنی جو تجھ میں ہے، تاریکی ہو تو کیسی بُری ہوگی۔"

چناں چہ اے شخص! اپنے بدن کے چراغ کو کام میں لا اور اپنے گرد و پیش پر نظر کر۔ دیکھ کہ زمانہ نئی بساط بچھاتا ہے اور نئے رنگ دکھاتا ہے اور اب جب کہ دشنام کی آندھیاں گزر چکیں اور چڑھی ہوئی کمانیں اُتر چکیں، اپنی زبان کو اپنے دہن میں سُلا دے اور کدورتوں کو دل سے بھلا دے۔

اور اے شخص! کیا تجھے یاد نہیں کہ لکھنے والے نے کتاب میں صدیوں پہلے لکھا تھا۔

"عیب جوئی نہ کر کہ تیری بھی عیب جوئی نہ کی جائے۔"

کیوں کہ جس طرح تُو عیب جوئی کرتا ہے، اسی طرح تیری بھی عیب جوئی کی جائے گی اور جس پیمانے سے تُو ناپتا ہے، اسی سے تیرے واسطے ناپا جائے گا۔

تُو کیوں اپنے بھائی کی آنکھ کے تنکے کو دیکھتا ہے اور اپنی آنکھ کے شہتیر پر بھی غور نہیں کرتا؟

اور جب تیری ہی آنکھ میں شہتیر ہے تو تُو اپنے بھائی سے کیوں کر کہہ سکتا ہے کہ لا، میں تیری آنکھ سے تنکا نکال دوں؟

اے شخص! آ...... کہ تُو اور میں ایک دوسرے سے بہم ہوں کہ جب ہم بہم ہوں تو "ہم"

کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ہاں وہی "ہم" اپنی کمر کھولیں، اپنی دشمنیوں کو تہ کریں۔ اپنے جھگڑوں کو اندھے کنوئیں میں دھکیلیں اور اپنے قضیوں کو گڑھے میں دفن کریں۔

اے شخص! آ کہ اب ہم اپنے تاکستانوں کی خبر لیں اور اپنی چراگاہوں کو دیکھیں۔ ہم وہ سبیل ڈھونڈیں اور وہ راہ نکالیں کہ ہمارے کھیت فصلوں سے چھلک رہے ہوں اور ہمارے دسترخوان ہر نوع کے تر اور خشک میووں سے مہک رہے ہوں۔ ہماری پوشاک سونے کے تاروں سے کاڑھی جائے اور ہماری عورتیں لعل و گہر کی دمک سے شب چراغ ہوں۔ ہماری گلیوں میں خوش بوؤں کے کنٹرائنڈ ہلے جائیں اور ہمارے محلّوں میں خوشیاں بار پائیں۔

حکمت ہمارے ذہنوں میں جگہ بنائے اور خرد ہمارے فیصلوں کو راہ دکھائے، تاریکیاں ہماری بستیوں سے رخصت ہوں اور روشنیاں ہمارے قریوں کو جگمگائیں۔ ویرانیوں کو موت آئے اور آبادیاں زندگی کو لبھائیں۔ لُوٹنے والوں کے ڈیرے برباد ہوں اور انصاف کرنے والوں کے گھروں میں شادیانے بجیں۔

امن ہمارے سروں پر آسمان بنے اور سلامتی ہمارے پیروں کے نیچے زمین ٹھہرے۔ ہمارے بچے بڑھاپے کی دہلیز کو الانگیں اور ہمارے جوان زندگی کو گھونٹ گھونٹ پئیں۔ ہماری کنواریاں اپنے گھروں کی ہوں اور ہماری بیاہیوں کے سہاگ سلامت رہیں۔

اے شخص! اب جب کہ تہمتوں کی چڑھی ہوئی ندیاں اُتر چکیں اور طنز کے سارے تیر کُند ہو چکے...... آ...... کہ تُو اور میں ایک دوسرے سے بہم ہوں کہ جب تُو اور میں بہم ہوں تو "ہم" کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔

اے شخص! آ کہ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر سلامتی کی راہ پر چلیں اور ہمارے بعد کی نسلیں اور اُن کے بعد اُن کی نسلیں......!

دعاؤں کے جام

برف دھنکی ہوئی روئی کی طرح آسمان سے گرتی ہے اور زمین پر بچھتی ہے، پیڑوں نے سفید قبائیں پہن لی ہیں اور دریاؤں نے برفیلے دوشالے اوڑھ لیے۔ نقطۂ انجماد سے نیچے کی ٹھنڈک ہڈیوں میں تاتاری نیزوں کی طرح اُترتی ہے اور رگوں میں جمتا ہوا لہو، بہتی ہوئی آگ ڈھونڈتا ہے۔

سات سمندر میں پیچھے چھوڑ آیا اور نئی دنیا میرے پیروں کے نیچے ہے۔ میرا وجود ناآشنا فضاؤں میں اُڑان بھرتا ہے اور میرے تلوے اجنبی زمینوں کو چھوتے ہیں۔ یہاں نیویارک اور نیوآرک ہے، مشی گن اور واشنگٹن ہے، میامی اور ملواکی ہے۔ اب برف زاروں سے گزرتے ہوئے میں ان نسلوں کو دیکھتا ہوں جنھوں نے زمین کی طنابیں کھینچ لی ہیں اور جن کے اشارے ستاروں اور سیاروں کا حال بتاتے ہیں، جن کی چھاؤنیاں سارے جہاں میں چھائی ہیں اور جن کے بجرے سمندر سمندر شناوری کرتے ہیں۔

میں جون ایلیا، ایشیائی، انھیں دیکھتا ہوں اور رشک میری سانسوں کو سرد کرتا ہے اور حسد میرا دل وجگر کباب کرتا ہے۔ ایسے میں مجھے اپنا ایبکی مرشد، مرزا قوقان بیگ خاں کا پوتا اور مرزا عبداللہ بیگ خان کا بیٹا، مرزا اسداللہ بیگ خان غالب دہلوی یاد آتا ہے جو خود کو ''مرزبان زادۂ سمرقند'' کہتا تھا اور جس نے شاید انھی سفید فام اور تیز گام آدم زادوں کے بارے میں کہا تھا۔

''بردآدم ازامانت ہرچہ گردوں برنتافت۔''

اس ''ایبک ترک'' نے کہا تھا کہ وہ بارِ امانت جو آسمان سے اُٹھایا نہ گیا، اسے آدم زاد نے اُٹھالیا۔

سفید کھالوں میں پیدا ہونے والے ان دوپایوں کو اور ان کی حشمت وسطوت کو میں دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ واقعی جو ذہانت آسمان سے اُٹھائی نہ گئی، اسے یونان و

رومتہ الکبریٰ کے ان وارثوں نے اُٹھالیا اور سات برِ اعظموں میں پھیلا دیا، سات سمندروں میں اُنڈیل دیا اور سات آسمانوں سے پرے پہنچا دیا۔

اور اب جب کہ بیسویں صدی کی نویں دہائی غروب اور دسویں دہائی طلوع ہو رہی ہے، ان کے جنگل رقصاں ہیں، ان کے شہر تاباں ہیں اور ان کے شہری شاداں وفرحاں ہیں اور میں تیسری دنیا کے ایک قلاّش ملک کا ایک غریب الدیار، میں جون ایلیا جنجالی، خوش بُوؤں اور خوشیوں، خوش جمالوں اور خوش حالوں سے چھلکتے ہوئے ان قریوں اور قصبوں کو دیکھتا ہوں اور اپنے سر پر خاک ڈالتا ہوں اور اپنا گریبان چاک کرتا ہوں کہ اس کے علاوہ بھلا اور کیا میرے بس میں ہے۔ میں وہ کوہِ مقدّس کہاں سے لاؤں، جہاں میں اپنے لوگوں کو خوش بختی کے لیے سوختنی قربانیاں دوں اور اس مذبح کا سراغ کیسے لگاؤں جس پر کیے جانے والے ذبیحے مقبول ہوں۔ میں وہ درگاہ کہاں سے پاؤں جہاں ایشیا کی سربلندی کے لیے منّتیں مانگوں اور اس مزار کو کس دیہہ اور دیہات میں ڈھونڈوں جہاں برِصغیر کی سلامتی کے لیے چڑھاوے چڑھاؤں۔

یارو، غم گسارو! آؤ، تم اور میں ایک دوسرے کی گردنوں میں بانہیں ڈال کر ایک آنکھ سے روئیں اور ایک آنکھ سے ہنسیں۔ ہم روئیں کہ ہم نے صدیاں گنوا دیں اور ہم ہنسیں کہ مستقبل کی مسافتیں ہمارے لیے دیدہ و دل فراشِ راہ کیے ہوئے ہیں۔

جانانِ جاں...... اب جب کہ نئے سال کی ساعتیں ہماری طرف بڑھتی چلی آتی ہیں تو ہم سوچیں کہ ہم کیا سوچیں اور کیا سمجھیں؟ ہم کیا چاہیں اور کیا نہ چاہیں؟ ہم جھوٹ کی دکانیں کھولیں یا زندگی کو سچ کی میزان پر تولیں!

جاناں...... فیصلوں سے فرار بھلا کس نسل کے حصّے میں آیا ہے کہ ہمارے حصّے میں آئے۔ ان فیصلوں کا عذاب گزشتگاں نے سہا تھا اور آیندگان بھی ایسے ہی فیصلوں کے جہنم میں جلیں گے اور یہ درست فیصلوں کی بھٹّی ہی تو ہے جس سے قومیں اور قبیلے کندن بن کر نکلتے ہیں اور جن کا نام وقت کی ٹکسال سے نکلنے والا کھرا سکّہ قرار پاتا ہے۔

آؤ کہ ہم نیک خوابوں اور نیک خواہشوں کو اپنے قبیلے کے نام کریں اور اپنے دیاروں کے لیے دعاؤں کا جام، جُرعہ جُرعہ کر کے پییں۔

سسپنس ڈائجسٹ جنوری 1991

بار بار

میں امریکا میں ہوں اور عجائب کی اس سرزمین کے شہروں میں گھومتے گھومتے تھک گیا ہوں۔ یہاں کی آسماں بوس عمارتوں کو دیکھتے دیکھتے میری گردن دُکھنے لگی ہے۔ ان عمارتوں کو دیکھنے کا آرام دہ طریقہ یہ ہے کہ آدمی سڑک کے کنارے کسی عمارت کے سائے میں لیٹ جائے اور ان عمارتوں کی آسماں بوسی کا نظارہ کرتا رہے۔ سچی بات یہ ہے کہ امریکا اپنے تماشائی کو حواس باختہ کر دیتا ہے۔

نیویارک اور شکاگو کو دیکھ کر مجھے دنیا کا ایک قدیم ترین مشرقی شہر یاد آیا۔ اس شہر کو مُلکوں کی ملکہ اور شہروں کی شہزادی کہا جاتا تھا اور ایسا ہی تھا۔ وہ شہر بھی عجائب کا شہر تھا۔ آسمان کے دو باشندے ہاروت اور ماروت اس شہر کے ایک کنوئیں میں قید تھے۔ اس شہر کا نام بابل تھا۔ اس شہر میں ایک بُرج تھا۔ کہتے ہیں کہ ہفت اقلیم میں اس بُرج سے اُونچی کوئی عمارت نہ تھی۔ وہ بُرج ہفت اقلیم کے سر کی کلاہ تھا۔

یونان کا مشہور مؤرخ ہیروڈوٹس جب بابل پہنچا تو اس شہرہ آفاق بُرج کو دیکھنے گیا۔ وہ اس بُرج کی بلندی کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس کو بابل کے بوڑھے کاہنوں نے بتایا کہ اس بُرج کی سب سے اُوپر کی منزل میں ایک چھپر کھٹ ہے اور اس چھپر کھٹ پر دیوتاؤں کا دیوتا آرام کر رہا ہے۔

مگر امریکا میں ایسے کتنے ہی برج ہیں جن کے سامنے بابل کا بُرج بہت نیچا دکھائی دیتا ہے اور ان بُرجوں کی اُوپر کی منزلوں میں دیوتاؤں کے دیوتا آرام نہیں کر رہے، گناہ گار انسان کام کر رہے ہیں۔

اس سرزمین میں آ کر میرا قد گھٹ گیا ہے۔ میں اپنے آپ کو ایک بونا' ایک بالشتیا دکھائی دیتا ہوں اور ایسا تو ہونا ہی تھا۔ ہمارے شہروں اور شہریوں نے سیکڑوں سال سے اپنا قدوقامت بڑھانے کی کوشش ہی کب کی ہے۔ ہم نے تو بلند ہونے کے بجائے پست ہونے کا ہنر دکھایا ہے۔

بابل کی سرزمین بھی دانش' دانائی اور ہنرمندانہ معجزنمائی کی سرزمین تھی اور امریکا بھی دانش' دانائی اور ہنرمندانہ معجزنمائی کی سرزمین ہے' مگر یہ کہ بابل' امریکا کا بعید ماضی تھا اور امریکا' بابل کا بعید مستقبل ہے۔

بابل کی سرزمین بھی بدی اور بدکاری کی سرزمین تھی۔ وہ بھی تاریخ کے بالاخانے کی مشہورِ زمانہ قحبہ تھی' جس کے نخرے ساری دنیا میں مشہور تھے اور امریکا بھی اس زمانے کی شہرہ آفاق فاحشہ ہے' جس کے چھل فریب نے بڑے بڑے نیک ناموں کو خراب کیا ہے اور ان کی طاقت اور توانائی کو چوس لیا ہے۔

مگر مجھے اس وقت امریکا کے جس پہلو پر زور دینا ہے' وہ اس کی دانش' دانائی اور ہنرمندانہ معجزنمائی ہے۔ یہ دانش' دانائی اور ہنرمندانہ معجزنمائی کیا ہے؟ یہ سائنس اور ٹیکنالوجی ہے اور انھی کی وجہ سے آج یہ سرزمین ملکوں کی ملکہ اور قوموں کی مالکہ بنی ہوئی ہے۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے' جیسے یہ ساری دنیا کا مرکز ہو اور سارے راستے اسی کی طرف آتے ہوں جیسے کسی زمانے میں سارے راستے بابل اور اس کے بعد روم کی طرف جاتے تھے۔

یہاں کے لوگ اس دنیا میں رہنے کا ہنر جانتے ہیں...... انھیں زندگی گزارنے کا وہ فن آتا ہے' جس میں کوئی قوم بھی ان کی برابری نہیں کر سکتی' اس لیے کہ امریکا اپنی ہی زندگی گزارنے کا فن نہیں جانتا۔ دوسری قوموں کی زندگی گزارنے کا حیران کن فن بھی جانتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے لیے دوسروں کی زندگی دوبھر کر رکھی ہے کیوں کہ اس کے پاس سائنس اور ٹیکنالوجی کی طاقت ہے۔

میرے عزیز معراج اور میرے برادرِ عزیز جمال احسانی! میں بار بار ایک بات سوچتا ہوں اور اُداس ہو جاتا ہوں۔ وہ بات یہ ہے کہ ہمارے حکمراں طبقے کے لوگ یہاں آتے ہی

رہتے ہیں۔وہ یہاں آ کر عیش مناتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، مگر انھوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ ہماری سرزمین بھی زندگی کے رنگوں اور اُمنگوں سے سرشار ہو۔ جس دانش نے اس سرزمین کی حوصلہ مندی کو آسمان تک پہنچا دیا ہے، ہماری سرزمین میں بھی اس دانش کو اپنایا جائے۔

مگر ہمارے حکمراں طبقے کے اتالیقوں نے تو دانش کو گمراہی ٹھہرایا ہے اور ہمارے حکمراں طبقے نے ان کے سامنے سر جھکایا ہے اور انھیں ایسا ہی کرنا بھی چاہیے تھا، اس لیے کہ ہماری سرزمین کے بے دانش رہنے ہی میں اس طبقے کی فلاح ہے۔

امریکا، مغرب کا سرغنہ ہے اور مغرب جیت گیا ہے۔ مشرق ہار گیا ہے۔ مشرق کی زبانیں، مغرب کی زبانوں سے، مشرق کی تہذیب، مغرب کی تہذیب سے اور مشرق کا ذہن، مغرب کے ذہن سے ہار گیا ہے۔

کیا ہمیں اس حقیقت کو ہمیشہ کے لیے تسلیم کر لینا چاہیے؟ کیا یہ کوئی سرنوشت ہے جسے بدلا نہیں جا سکتا؟ یہ وہ بات ہے جو میں بار بار سوچتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ بھی یہ بات بار بار سوچیں۔ بار بار......

سسپنس ڈائجسٹ، فروری 1991

زوالِ بغداد

وہ سرزمین ہار گئی جس میں سب سے پہلی بار گیہوں بویا گیا تھا۔ وہ زمین ہار گئی جس میں پہیّا ایجاد ہوا تھا۔ وہ زمین ہار گئی جس نے دنیا کو دانش سکھائی تھی اور پیغمبروں کو پرورش کیا تھا۔ وہ زمین ہار گئی جس نے انسانوں کو اپنی دانش پر فخر کرنا سکھایا تھا۔ وہ زمین ہار گئی جس نے دنیا کو پہلی بار قانون کے ضابطے تعلیم کیے تھے۔ ہاں، حمورابی ہار گیا۔ تو صورتِ حال یہ ہے کہ عراق ہار گیا۔ انسانوں کی بہترین ذہانتوں، کہانتوں اور خطابتوں کی پیش گاہ ہار گئی۔ جون ایلیا تم ہار گئے، تمھارا نسب نامہ ہار گیا۔ تمھارا ماضی اور ماضی کا ماضی ہار گیا۔ بابل ہار گیا، بغداد ہار گیا۔

ایتھنز کے بعد تاریخ نے بغداد سے زیادہ دانش افروز شہر پیدا نہیں کیا۔ اگر تاریخ پڑھتے ہوئے بغداد کو چھوڑ کر آگے بڑھا جائے تو مہذب انسانیت کا ذہن بیسویں صدی سے گزرنے کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔

جب ہلاکو خان نے بغداد کو تباہ کیا تھا تو دنیا کے عظیم ترین شاعر سعدی نے اس تباہی کا مرثیہ کہا تھا:

آسماں را حق بود گر خوں بہ بارد برزمیں
بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنیں
اے محمدؐ گر قیامت سر بروں آری زخاک
سر بروں آرد قیامت درمیانِ خلق بیں

یعنی آسمان کو چاہیے کہ امیر المومنین مستعصم باللہ کی حکومت کے زوال پر خون کے آنسو برسائے۔ اے محمدؐ! اگر آپ قیامت میں خاک سے نمودار ہوں گے تو دیکھیے لوگوں

کے درمیاں قیامت برپا ہوگئی ہے۔

اے میرے ہم نشینِ شام! قیامت برپا ہوگئی ہے۔ بغداد اپنی بدترین سرنوشت سے دوچار ہوا ہے۔ تمھاری تہذیب کی سب سے بڑی علامت لہولہان ہوگئی ہے۔ شہروں کا وہ شہر تباہ و برباد ہوگیا ہے، جس کے چوراہوں پر تاریخ کی سب سے اعلیٰ دانش، سب سے اعلیٰ بینش کلام کیا کرتی تھیں۔ یہ سب کچھ ہوگیا ہے اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ بغداد تباہ و برباد ہوگیا اور کسی سعدی نے کوئی مرثیہ نہیں کہا۔ اس لیے کہ اس زمانے کا بغداد سعدی کے زمانے کا بغداد نہیں تھا۔ اس وقت بغداد کے پیچھے ایک درخشاں تاریخ تھی مگر اس بار بغداد کے پیچھے کوئی تاریخ نہیں تھی۔

سُن لیا جائے اور سمجھ لیا جائے کہ تاریخ کے خلاف کبھی جنگ نہیں کی جاسکتی اور اگر جنگ کی جائے گی تو شرم ناک ترین شکست کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ تم نے تاریخ کے خلاف جنگ کی اور اپنے اندر اور اپنے باہر شکست کھا گئے۔ جو مستقبل کی طرف قدم نہیں اُٹھائے گا وہ ماضی کی طرف بُری طرح دھکیل دیا جائے گا۔ امریکا اور اس کے اتحادیوں کے ساتھ علم تھا، دانش تھی۔ حکمت اور عمل کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ اس لیے ان کی دھاندلی جیت گئی۔ تمھارے ساتھ ایسا کوئی سلسلہ نہیں تھا، اس لیے تمھاری غلط کاری اور غلط کوشی کو تو سزایاب ہونا ہی تھا۔ تم بتاؤ، جواب دو کہ ایسا کیوں نہ ہوتا؟ آخر تم نے تاریخ سے ایسا کون سا معاہدہ کیا ہے کہ تم وقت سے ہٹ کر چلو اور وقت تمھیں راستہ دے دے۔ عراق کی شکست، جمہوریت کے مقابلے میں آمریت کی شکست ہے۔ علم کے مقابلے میں جہالت کی شکست ہے۔

کیا یہاں کبھی یہ سوچا گیا کہ اسلحہ درآمد کرنے والے، اسلحہ برآمد کرنے والوں سے کیسے مقابلہ کرسکتے ہیں اور اگر مقابلہ کر بھی گزریں تو کیسے فتح پاسکتے ہیں؟

کیا ہنر کی نقالی ہنر سے جیت سکتی ہے؟ کیا خریدی ہوئی مہارت حقیقی مہارت کا سامنا کرسکتی ہے؟ حیرت ہے کہ ہم یہ بات کیوں نہیں سوچتے اور یہ نقطہ کیوں نہیں سمجھتے؟ ہمیں اس حقیقت کا احساس کیوں نہیں ہوتا کہ ہم ایک ہزار برس سے تاریخ کے دسترخوان پر حرام خوری کے سوا اور کچھ نہیں کررہے ہے۔

میں اپنے آپ سے اور اپنے گرد و پیش سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ آخر ہم نے سوچا کیا ہے' ہم تاریخ سے آخر کس طرح کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں؟

حقیقتِ حال یہ ہے کہ ہم تاریخ سے کوئی معاملہ کرنا ہی نہیں چاہتے۔ ہم نے تاریخ سے کبھی کوئی سلیقے کا معاملہ نہیں کیا۔ تاریخ قوموں کی کوئی زرخرید لونڈی نہیں ہے کہ اس سے جو کچھ چاہا جائے وہ منوالیا جائے۔

تاریخ کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ یہ زمانہ علم' دانش اور جمہوریت کا زمانہ ہے علم کے سامنے ذلیل ہونا جہالت کا مقدر ہے' جمہوریت کے مقابلے میں شکست کھانا آمریت کا مقسوم ہے اور کوئی قوم اپنے تاریخی مقدر اور مقسوم سے سرتابی نہیں کر سکتی۔ جو قوم علم' دانش اور جمہوریت کے ساتھ زندہ رہنے کا شعور نہیں رکھتی' اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ علم' دانش اور جمہوریت۔ یہی قوموں کے لیے ایک نسخۂ کیمیا ہے' بس!

سسپنس ڈائجسٹ' اپریل 1991

مژدہ

ہم جو کھنکھناتی ہوئی مٹی سے بنائے گئے، ہم جو خاک کے خمیر سے اُٹھائے گئے اور ہم جو خاک میں ہی سُلائے جائیں گے۔ ہم فتنہ وفساد کے زمانے میں زندہ ہیں اور دہشتوں نے ہمارا گھر دیکھ لیا ہے۔ سو ہم پر لازم آیا کہ ہم اپنے اپنے حجروں سے باہر آئیں اور مرنے والوں اور مارنے والوں کو اس الم ناک حقیقت سے آگاہ کریں کہ زندگی مارنے والوں اور مارے جانے والوں دونوں ہی سے سوتیلی ماؤں کا سا سلوک کرتی ہے۔ کسی کو ریشم وکم خواب کے بستر پر سُلاتی ہے اور کسی کو بچھانے کے لیے گدڑی بھی نصیب نہیں ہوتی لیکن موت سب ہی کو ایک نظر سے دیکھتی ہے، سب کو اپنی چھاتی میں سمیٹ لیتی ہے اور سب کو ایک ہی طور خاک میں مِلاتی ہے۔

وہ جو زمین پر بہت اینڈ کر چلتے ہیں، ان کے لیے کسی بھی میدان سے، کسی بھی کھیت یا کھلیان سے ایک مٹھی مٹی اُٹھائی جائے اور پھر دل ودماغ کی آنکھوں کے چراغوں کی روشنی میں اسے دیکھا جائے تو اس میں اب سے لاکھوں برس، ہزاروں اور سیکڑوں برس پہلے گزر جانے والے ہمارے اجداد کے بدن کے ریزے نظر آئیں گے۔ کسی ظالم کے سرِ پُر غرور کا ایک ذرّہ، کسی مظلوم کے چیرے ہوئے جگر کا ایک ریشہ اور کسی مقتول کی کتری جانے والی انگلیوں کی باقیتیں اس مٹھی بھر مٹی میں گھل گئی ہوں گی۔ اس کے کسی ذرّے سے کسی نیک نفس اور برگزیدہ انسان کی خوش بو آ رہی ہوگی اور کسی ذرّے سے ہامان ونمرود کے خبثِ باطن کی سڑاند اُٹھ رہی ہوگی۔

لیکن جون ایلیا، تم جو ایک مٹھی مٹی لیے بیٹھے ہو اور اس میں گزشتگاں کی جھلکیاں دیکھ رہے ہو تو تم ان جھلکیوں کو دیکھ کر کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا سیکھنا اور کیا سکھانا چاہتے ہو؟

میرے بھائی، میرے دوست، میں گویائی سے محروم ہوں اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا اور

میں نے تو ابھی زندگی کے مکتب سے کچھ بھی نہیں سیکھا تو میں تمھیں یا کسی کو بھلا کیا سکھاؤں گا۔ میں یہ مٹھی بھر مٹی اپنے حکم رانوں کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ انھیں اپنے بارے میں اور اپنے ایسے کروڑوں کے بارے میں بتاؤں، ان بستیوں کی گلیاں دکھاؤں جن کے نصیب ہمیشہ تیرہ و تار رہے، جن کے مقدر میں کبھی سکھ کی گھڑیاں نہیں لکھی گئیں۔

میرے بھائی، انھیں بتایا جائے کہ یہاں حکم رانوں نے محض تجربے کیے، زیادہ مطلق العنانی کے، زیادہ فرعونِ بے سامانی کے تجربے۔ ہمارے یہاں عوام کے نام پر آنے والوں نے سب سے پہلے عوام کا ہی ٹینٹوا چبایا۔

اس بستی کے معصوم و مظلوم رہنے والوں کے سینے میں اُمید کے دریا لہراتے ہیں۔ وہ ہر آنے والے کا دامن بہت دردمندی سے، بہت خوش اُمیدی سے تھامتے ہیں اور ہر مرتبہ دُھتکارے جاتے ہیں۔

ایک بار پھر لوگوں کو مژدہ سُنایا جارہا ہے، ایک ایسے بندوبست کی نوید دی جارہی ہے جہاں پسے ہوئے اور کچلے ہوئے لوگوں کو عزت کی روٹی مل سکے گی، جہاں مظلوموں کو انصاف فراہم ہوسکے گا، جہاں رشوت ستانی اور بدعنوانی کا کوئی گزر نہ ہوگا۔

یہ تمام اچھے جملے، یہ سارے خوب صورت خواب، اس سے پہلے بھی یہاں کے لوگوں کو دکھائے گئے ہیں، اس سے پہلے بھی یہی کہا گیا ہے کہ یہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہیں گی اور یہاں رہنے والوں کی عزتِ نفس کا احترام کیا جائے گا۔

یہاں کے لوگوں نے پہلے بھی ان وعدوں پر اعتبار کیا تھا، یہاں کے لوگ ایک بار پھر نئے وعدوں پر اعتبار کرتے ہیں۔ انھوں نے اس مژدے کو اس اُمید کے ساتھ سُنا ہے کہ یہ وعدے، وعدۂ فردا نہیں ہوں گے۔ وہ اس آس میں ہیں کہ انھیں ایک بار پھر نراس نہیں کیا جائے گا۔

مژدہ سُنانے والوں نے بستیوں کو تراشنے کی ذمّے داری اپنے سر لی ہے۔ اس دور میں کارِ فرہادی کا دعویٰ یقیناً ایک بڑا دعویٰ ہے۔ یہ دعویٰ جنھوں نے کیا وہ اس پر پورے اُتریں اور کروڑوں کے سامنے سرخ رُو ہوں کہ یہی سب سے بڑی نیکی ہے۔

سسپنس ڈائجسٹ، مئی 1991ء

دوسوال

ہم دیکھتے ہیں کہ چرندے پرندے درندے گزندے خزندے اور آبی جانور نہ ٹھٹھے لگاتے ہیں نہ ہنستے ہیں اور نہ مسکراتے ہیں۔ بس انسان ہی ایسا جانور ہے جو مسکراتا ہے ہنستا ہے اور ٹھٹھے لگاتا ہے۔

بات شاید یہ ہے کہ دوسرے جانور بے حس نہیں ہیں جو اس نامہربان دنیا میں مسکرائیں ہنسیں اور ٹھٹھے لگائیں۔ اور وہ بُردبار بھی ہیں۔ اور انسان بہت حساس کہلائے جانے کے باوجود بے حس ہے اور عاقل اور باشعور ہونے کے باوجود بُردبار نہیں ہے۔ انسان نے لاکھوں برس میں جو ترقی کی ہے اس کی اصل وجہ اس کا صرف عاقل ہونا ہی نہیں ہے بے حس ہونا بھی ہے۔ وہ کیسی کیسی قدریں انتہائی بے حسی اور بے رحمی کے ساتھ پامال کر دیتا ہے اور ساتھ ہی ان قدروں کے قصیدے بھی پڑھتا ہے۔ وہ کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ کیسے کیسے جرم ظہور میں آتے نہیں دیکھتا اور سب کچھ بھول کر اپنے کاروبار میں لگ جاتا ہے۔ یاد رکھا جائے کہ جانور قدریں پامال نہیں کرتے۔ ان کے ریوڑ ان کے غول اپنے دشمن کے خلاف مہیب منصوبے نہیں بناتے۔ انسان نے اپنے بہت قصیدے کہے ہیں۔ اسے اپنی ہجو بھی سُنتا چاہیے۔

منطق نے اس عالی شان جانور کی چند تعریفیں کی ہیں۔ ان میں سے ایک ''حیوانِ ناطق'' ہے۔ دوسری ''حیوانِ ضاحک'' یعنی ہنسنے والا جان دار اور تیسری ''راست قامت جاندار''۔

میرے خیال میں ان تعریفوں میں سب سے درست تعریف حیوانِ ضاحک

ہے۔اس لیے کہ وہ اس دنیا کو اپنے جرائم اور مظالم کے ذریعے جہنم بنا کر کوئی ندامت محسوس نہیں کرتا' بل کہ اس پر مسکراتا' ہنستا اور ٹھٹھے لگاتا ہے۔ وہ اپنی نوع کے لوگوں کو نیست و نابود کر کے کس قدر فخر محسوس کرتا ہے۔ فتح کے جشن مناتا ہے۔ جانور اپنے حریف جانوروں کو ہلاک کر کے فتح کے جشن نہیں مناتے۔ یہاں انسان کی طرف سے جو بات کہی جائے گی' وہ یہ ہے کہ انسان عقل اور شعور رکھتا ہے اور جانور عقل اور شعور سے محروم ہیں۔ ذرا سوچیے کہ یہ جواب کتنا معقول ہے' یعنی انسان چوں کہ عقل اور شعور رکھتا ہے' اس لیے زمین پر تباہی پھیلاتا ہے۔ اپنی نوع کے افراد کا بڑی مہارت اور ہنر مندی کے ساتھ خون بہاتا ہے۔ قانون بناتا ہے اور خود ہی انھیں توڑ دیتا ہے۔ چوں کہ وہ عاقل ہے' چوں کہ وہ باشعور ہے۔

چشمِ بد دُور انسان اب لاکھوں برس کا ہو گیا ہے۔ اس کی عمر تیس پینتیس لاکھ برس سے کیا کم ہو گی۔ شاید زیادہ ہی ہو۔ اس مدت میں اس نے عجیب عجیب کمالات دکھائے ہیں۔ ہم اس پر چوٹیں کرنے سے باز نہیں آئیں گے' مگر یہ بات ماننا ہی پڑے گی کہ دنیا اس کی عقل اور اس کے علم کے کرشموں کی دنیا ہے۔ توانا ترین جانوروں اور ڈائنوساروں کی دنیا نہیں ہے جن کے سامنے وہ پڑا ہے۔ مگر جاننا یہ ہے کہ آخر یہ عالی شان پڑا چاہتا کیا ہے۔ کیا وہ اپنی عقل اور اپنے علم کا حق ادا کر رہا ہے؟ کیا وہ جتنی عقل رکھتا ہے اس میں اتنی ہی معقولیت بھی پائی جاتی ہے؟ کیا اس نے جتنا علم حاصل کیا ہے اتنا ہی وہ انسانیت سے بھی بہرہ مند ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی ''سمجھ بوجھ'' اور اس کی ہنر مندی نے شمال' جنوب اور مشرق اور مغرب کے رہنے والوں کو ہراس اور ہَول میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس کی عقل اور اس کے علم نے نہ اس کو معقولیت سکھائی اور نہ انسانیت۔ سوچنا یہ ہے کہ اگر عقل معقولیت کا سرچشمہ نہیں ہے تو پھر معقولیت کا سرچشمہ آخر کیا ہے؟ اور اگر علم انسانیت نہیں سکھاتا تو پھر انسانیت آخر کس طرح سیکھی جائے؟

تعبیر کی تلاش

خوشی کے ترانے گائے جائیں، شادیانے بجائے جائیں کہ ہمیں غلامی سے رُست گاری پائے ہوئے اب چوالیس برس پورے ہو رہے ہیں۔ کیوں، کیا ہمیں آزادی کے چوالیس برس گزرنے پر شادیانے نہیں بجانے چاہییں، خوشی کے ترانے نہیں گانے چاہییں؟ آزادی افراد اور اقوام کی زندگی کی آبرومندی، روحوں کی خرسندی، بستیوں کی آئینہ بندی۔

مگر کیا ہم اس تقریبِ سعید پر خوشی منانے کا ادنیٰ سا حق بھی رکھتے ہیں، آزادی ہمارے لیے پانچ حرفوں کے مجموعے سے زیادہ کوئی حیثیت رکھتی ہے حرفوں کا یہ مجموعہ کیا ہمارے اندر کسی خوش آیند اور خوش گوار احساس کو بیدار کرتا ہے؟

اس سوال کا دل شکن جواب یہ ہے کہ نہیں۔ افسوس کہ ہم حرفوں سے کسی کیف آگیں حالت میں نہیں آسکتے۔ لفظوں سے جی نہیں بہلا سکتے۔ ہم لاکھ چراغاں کریں۔ اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ آزادی کا لفظ نہ ہمارے اندر کوئی کیفیت پیدا کرتا ہے اور نہ ہمارے باہر۔ بات یہ ہے کہ دل کیا محسوس کرتے ہیں، گلیاں کیا کہتی ہیں، شاہ راہیں کیا جتاتی ہیں اور چوراہے کیا دُہراتے ہیں۔ ہم نے ان چوالیس برس میں اس کے سوا اور کیا کیا ہے کہ ایک لفظ کو ''آزادی'' کو مہمل بنا دیا ہے۔

وائے ہو ہم پر کہ ہمارے خواب کی تعبیر چکنا چور ہو گئی۔ یہاں پوچھا جانا چاہیے کہ خواب کی تعبیر کس نے چکنا چور کی، عوام کی اُمنگوں کو کس نے نڈھال کیا، ان کے جذبوں کو کس نے پامال کیا؟

اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہے کہ حکم رانوں نے اور سیاست دانوں نے۔ ان

حکم رانوں سے زیادہ ناشدنی اور کون ہوگا جنھوں نے بے تکان جھوٹ بولنے کا تاریخ سے ٹھیکا لیا ہو۔ یاد رکھا جائے اور ہرگز فراموش نہ کیا جائے کہ حکومت کوئی اچھا ادارہ نہیں ہے۔ یہ بات ہمارے بڑوں نے ہمیں بتائی ہے اور ہم نے اسے گرہ میں باندھ لیا ہے۔ حکومت کو تاریخ کے تدریجی سفر میں صرف برداشت کیا جاتا رہا ہے۔ بہترین حکومت بھی ایک بدترین حکومت ہوتی ہے، ایک جابرانہ ادارہ۔ اس جابرانہ ادارے کو پاکستان کے عوام نے اذیت ناکی کے ساتھ برداشت کیا۔

افلاطون نے حکم رانی کو سب سے اہم مرتبہ قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ حکم راں کو حکیموں اور دانش مندوں کے گروہ سے آنا چاہیے۔ اس بھلے آدمی نے فلسفی حکم راں کا خواب دیکھا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ سیاست دانوں کو حکیم اور دانش ور ہونا چاہیے۔

ہم اپنے ماحول اور اپنے معاشرے کے دائرے میں جب ایسی باتوں کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہمیں زہریلی ہنسی آتی ہے۔ سیاست داں اور حکیم، سیاست داں اور دانش مند! مجھے اس وقت بڑی بے کیفی کے ساتھ یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ میں یک سر مہمل اور محض لایعنی باتیں کرنے کی کتنی غیر معمولی اہلیت رکھتا ہوں۔ مگر کیا بھی کیا جائے کہ میں اس احساس انگیز موقع پر، مہمل اور لایعنی، باتیں کرنے سے کسی طرح بھی باز نہیں آ سکتا تھا۔ اگرچہ یہ باتیں مجھے بہت اُداس اور آزردہ کر رہی ہیں۔ بے آرام کر رہی ہیں۔ مگر میرے لوگو! کیا تم سیاست دانوں کا نام سُن کر بے آرام نہیں ہو جاتے، جنھوں نے ہماری اور تمھاری زندگی کے بہترین دور کو بُری طرح ضائع کیا، انھوں نے ہمیں ہمارے اندر بھی ذلیل کیا اور ہمارے باہر بھی۔

یہ کتنی بدبختی کی بات ہے کہ ہمارے سماج کے سب سے اہم لوگ وہ ہیں جنھیں 'سیاست مدار' کہا جاتا ہے۔ وقت کے سب سے زیادہ افسوس ناک لوگوں کو قوم کی اُمیدوں کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ تم 'اس متاعِ عزیز ملک کے سیاست دان' تم...... آخر تم کون ہو، کیوں ہو؟ میں بڑی اذیت کے ساتھ یہ سوچتا ہوں کہ اس ملک کے معصوم اور سادہ دل لوگ تمھارے نام بھی کیوں جانتے ہیں؟

شروع کے چند سال چھوڑ کر ہمارے ملک کی باقی تاریخ میں سیاست مداروں کی بدکوشی اور بدکیشی کے سوا کسی اور خوش گوار حقیقت کے مظاہر تقریباً ناپید رہے ہیں۔ ہماری اس دور کی تاریخ کا مطالعہ ہمیں کم ہی خوش کرتا ہے؛ بل کہ قریب قریب پوری سچائی یہ ہے کہ وہ ہمیں بے حد ناخوش اور بیزار کرتا ہے۔

ہاں میں محسوس کر رہا ہوں کہ ماضی پر گریہ وزاری کرنے کا کوئی حاصل نہیں؛ اب کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ یہی کیا جا سکتا ہے کہ اپنی تقدیر کے فیصلے سیاست کے ستم ظریفانہ بازی گروں پر نہ چھوڑے جائیں اور اپنے خوابوں کی تعبیر خود تلاش کی جائے؛

پاکستان پائندہ باد!

سسپنس ڈائجسٹ، اگست 1991

لبِ مہران

لبِ مہرانِ مہربان اس بار یہ میری تیسری یا چوتھی شام ہے۔ میں نے لبِ مہرانِ مہربان اپنی نوجوانی اور جوانی کی کتنی ہی حسین ترین اور سنگین ترین شامیں گزاری ہیں۔ جذبوں کی سرشاری اور تہ داری اور آرزوؤں کی تشنہ کامی اور شکستہ حالی کے کتنے ہی دور بسر کیے ہیں۔

میں نے کسی بھی دریا کے ساحلوں پر خوابوں اور سرابوں کے اتنے سُکھ نہیں پائے اور اتنے دُکھ نہیں اُٹھائے جتنے سُکھ اور دُکھ مہران کے ساحلوں پر پائے ہیں اور اُٹھائے ہیں۔ جانے کیوں اس بار میں نے یہاں وہ حالت خیزی اور کیفیت انگیزی نہیں پائی جو میرے خیال کو سیراب اور شاداب کیا کرتی تھی اور ہاں میرے ملال کو بھی......ملال کو بھی......؟

ہاں ملال کو بھی۔ خیال ہی نہیں ملال بھی سیرابی اور شادابی چاہتا ہے۔ ہے کچھ یوں کہ احساسِ ذات کی ساری حالتیں رَسَد چاہتی ہیں۔ اندر اور باہر کی رَسَد۔ سو خیال ہو یا ملال؛ دونوں کو اندر اور باہر کی رَسَد چاہیے۔ اس بار لبِ مہران میری نسل کے وہ قلندر اور وہ شوریدہ سر میرے ساتھ نہیں ہیں جو اپنے لبوں پر سندھی اور اُردو شاعری کے سُروں کو آباد کر کے میرے ساتھ رقص کیا کرتے تھے۔ ہم یہاں کتنی دُھومیں مچایا کرتے تھے۔ ہم پر یہاں کیا کیا حالتیں طاری ہوتی تھیں اور کیا کیا عالم گزرتے تھے۔ اپنا ایک شعر یاد آیا:

دکھائیں کیا تمھیں داغوں کی لالہ انگیزی
گزر گئیں وہ بہاریں وہ فصل ہی نہ رہی

میرے امروہے کے ایک بزرگ غلام ہمدانی مصحفی نے کہا ہے۔

یادِ ایامِ بے قراریِ دل
وہ بھی یا رب عجب زمانہ تھا

عجب زمانہ تھا۔ ہم اپنی حالتوں اور اپنے عالموں میں مشتاقی اور مہجوری اور حضوری اور دوری کے کتنے ہی معرکے سَر کیا کرتے تھے۔ سرکشی اور سرشوری کی ایک عجب ماجراپروری تھی، جو ہمیں لحہ لحہ پُر حال رکھتی تھی۔ ہم شوقِ انقلاب میں ہر مزاحم سے جاٹکرایا کرتے تھے۔ کوئی نہیں تھا جو ہمارے شعلہ زن نعروں کو دبا سکتا اور ہمارے ہونٹوں کے انگاروں کو بُجھا سکتا۔ مگر اب ہمارے شعلہ زن نعرے سیاست کی سنگینی نے دبا دیے ہیں۔ ہمارے ہونٹوں کے انگارے راکھ کردیے گئے ہیں اور ہم ہیں کہ ہمیں اپنے زیاں اور اپنے زوال کا کوئی غم نہیں ہے۔

''کوئی غم نہیں ہے، جون ایلیا! یہ کیوں نہیں کہتے کہ کوئی احساس نہیں ہے۔''

ہاں، یاددلانے والے، تُو نے مجھے صحیح بات یاددلائی۔ ہاں، ہمیں اپنے زیاں اور زوال کا کوئی احساس نہیں ہے۔ حسن حمیدی تو زیرِ خاک سوتے ہیں۔ میں کراچی کی طرف رُخ کر کے کہتا ہوں کہ اے شیخِ قبیلہ، اے شیخ ایاز! ہمیں اپنے زیاں اور زوال کا کوئی احساس نہیں ہے۔ کوئی بھی احساس۔ ہم اب وہ نہیں رہے جو تھے۔ ہمیں ایک دوسرے سے کاٹ دیا گیا ہے۔ ہمیں بانٹ دیا گیا ہے۔

مہران بہہ رہا ہے، لبِ مہران کی شام بہہ رہی ہے اور میں اُداس ہوں اور بہت پُراحساس ہوں۔ مجھے سرِ شام ایک شعر بہت یاد آتا ہے، جو میرے افسانہ آفریں بھائی معراج رسول کے شہر میں کہا گیا تھا۔

رُخ پہ گیسو ہوا سے ہلتے ہیں
چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں

کراچی، لاہور، دلّی اور لکھنؤ کے شاعرو! اگر تم شام پر ایسا حالت انگیز شعر کہہ دو تو قبلہ و کعبہ میاں باوا میر تقی میر کی قسم میں شعر کہنا چھوڑ دوں...... کیوں میاں جمالؔ احسانی! میں غلط کہہ رہا ہوں یا صحیح؟

خیال آفریں شام کا مہران بہہ رہا ہے۔ ماضی سے مستقبل کی طرف، اپنے منبع سے اپنی منزل کی طرف اور میں اپنی ایک خاص حالتِ اُنس کے ساتھ اس کی خدمت میں کورنش بجالاتا ہوں اور تاریخ اور وقت میں ایک گہرا سانس لیتا ہوں۔ اور پھر مجھے اچانک یہ احساس ہوا ہے کہ سندھی بولنے والا ایک ذہین اور شایستہ نوجوان مانی سنجرانی جو اُردو میں شعر کہتا ہے، میرے ساتھ ہے اور میں ایک عجیب بات محسوس کر رہا ہوں۔ اور وہ یہ کہ جیسے مہران، گنگا اور جمنا کی وادی میں بہہ رہا ہے۔ یا جیسے گنگا اور جمنا دونوں بہ یک وقت مہران کی وادی میں بہہ رہے ہیں۔

اور اے مانی سنجرانی! تُو لبِ مہران میری ایک خاص بات سُن اور اپنا سر دُھن۔ اور وہ بات یہ ہے کہ مہران کو سنسکرت میں سندھو کہا گیا ہے، یونانی میں سنتھوس اور لاطینی میں سنڈس۔ ہم پاکستانی اور ہندوستانی پنجاب، کشمیر، ہریانے، دِلّی، اُتر پردیش اور بہار سے سندھ کی طرف ہجرت کرنے والے شمالی سرزمینوں سے تعلق رکھتے ہیں اور سندھو ہمارا سب سے عظیم اور قدیم پیش رو ہے جو شمال سے نکل کر یہاں آیا ہے۔ وہ تبت کی برفانی چٹانوں سے نکلا اور اس نے سندھ کی مثلث نما شمالی سرزمین کو اپنی تہذیب پرور گزرگاہ بنایا۔ وہ بھی ہجرت زدہ ہے اور ہم اور تم بھی ہجرت زدہ ہیں۔ مانی! تم سامیوں کی سرزمین سے بلوچستان آئے تھے اور وہاں سے سندھ آ گئے اور میں سامیوں کی سرزمین سے روانہ ہو کر پنجاب کے علاقے میں آیا اور وہاں سے وادیٔ گنگ و جمن کی طرف چلا گیا اور وہاں سے یہاں آ گیا۔ جو جہاں بھی ہے، وہ کہیں اور سے ہجرت کر کے آیا ہے۔ مگر سندھو کی ہجرت ہر لمحہ جاری ہے۔ آؤ ہم سب اس ہجرت کو اپنا رشتہ بنالیں، تاریخ اور زمانوں میں پھلنے پھولنے والا رشتہ۔

سسپنس ڈائجسٹ، اکتوبر 1991

مشرق ہار گیا

یہ خیال و مقال کی ایک منہمک شام ہے اور میرا اور معراج رسول کا ذہن وقت کے اس دل شکن مقولے سے دوچار ہے کہ مشرق ہار گیا' مشرق ہار گیا اور مغرب جیت گیا۔ اب اگر دانش ہے تو مغرب کی ہے، اقدار ہیں تو مغرب کی ہیں، فنون ہیں تو مغرب کے ہیں، تہذیب ہے تو مغرب کی ہے، معیار ہیں تو مغرب کے ہیں اور فیصلہ ہے تو مغرب کا ہے۔ کیا ہم اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں؟ کیا مشرق کا کوئی بڑے سے بڑا وکیل اور کوئی شدید جذباتی مشرق پرست اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے؟ افسوس صد افسوس کہ نہیں۔

تاریخ کے قدیم زمانوں کا ماجرا اس کے برعکس تھا۔ ان زمانوں میں اگر دانش تھی تو مشرق کی تھی، اقدار تھیں تو مشرق کی تھیں، فنون تھے تو مشرق کے تھے، تہذیب تھی تو مشرق کی تھی، معیار تھے تو مشرق کے تھے اور فیصلہ تھا تو مشرق کا تھا۔ سمیریوں کا معاشرہ ہو یا مصریوں کا، وادئ سندھ کا معاشرہ ہو یا (ایران) کے ہخامنشیوں کا۔ یہ معاشرے قدیم تاریخ کے سب سے زیادہ شائستہ اور ترقی یافتہ معاشرے تھے۔

مشرق کی اس برتری کا آخر کیا سبب تھا۔ کیا اس زمانے میں مشرق کے باشندے دوسرے علاقوں کے باشندوں سے زیادہ تنومند تھے؟ کیا ان کے دماغوں کا حجم اوروں کے دماغوں کے حجم سے زیادہ تھا؟ کیا وہ سحر و طلسم کے ماہر تھے؟ کیا ایسا تھا کہ وہ اپنی سرزمین کی آب و ہوا کی وجہ سے دوسروں سے بازی لے گئے تھے؟ آب و ہوا تو مشرق و مغرب کی آج بھی وہی ہے جو آج سے چھ ہزار برس پہلے تھی۔ ان دونوں کے جغرافیائی حالات بھی وہی ہیں جو پہلے تھے پھر مشرق کیوں ہار گیا، آخر کیوں؟

یہاں ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ مشرق نے تمدنی اور تہذیبی برتری کا ایک عہد نہیں گزارا، دو عہد گزارے ہیں۔ ایک وہ عہد جس کا ابھی ذکر کیا گیا اور دوسرا وہ جس میں بغداد، قاہرہ، بخارا اور قرطبہ کے معاشرے وجود میں آئے۔ اس عہد میں بھی جو کچھ تھا، وہ مشرق کا تھا۔

یہاں یہ بات بھی کہی جانا چاہیے کہ مغرب نے بھی تمدّنی اور تہذیبی برتری کے دو عہد گزارے ہیں، پہلا عہد یونان وروم سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا عہد یہ عہد ہے جس نے یہ بات منوائی ہے کہ مشرق ہار گیا۔ ایسا اس لیے ہوا کہ ہم نے وقت سے ٹھٹول کیا اور اس اعلیٰ رمز سے رشتہ توڑ لیا جو قوموں کو عظمت اور فضیلت سے نوازتا ہے۔

وہ دماغ میں چمکتا ہے اور ذہن میں روشنی پھیلاتا ہے
اس کالس طبع کی نابینائی کو بینائی عطا کرتا ہے
وہ ایک ایسی اکسیر ہے جو مٹی کو سونا بنا دیتی ہے
اگر کوئی قوم برتر ہے تو یہ اسی کا فیضان ہے
مصریوں کو ان کے اہرام نے بڑا نہیں بنایا
بابلیوں نے اپنے برج کی وجہ سے بلندی نہیں پائی
ان کی ارجمندی اور بلندی کا راز کچھ اور ہے
جن قوموں نے اس راز کو جاننے کی کوشش نہیں کی
وہ مات کھا گئیں اور گھاٹے میں رہیں
جو بھی انسانیت کی سب سے بڑی فضیلت سے
اپنا منہ موڑے گا اور رشتہ توڑے گا
وہ تاریخ کے چوراہے پر رُسوا ہوگا، بہت رُسوا
اور وقت اُسے بُری طرح دُھتکارتا ہوا گزرے گا

ہم مشرق کی ان قوموں میں سے ہیں جنھوں نے اس اعلیٰ رمز سے بے سروکاری اختیار کی اور پھر کیسی بے سروکاری! سو وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ ہم قوموں کے درمیان ایک

بھونڈا انداق بن کررہ گئے ہیں۔ یہ مقولہ کہ مشرق ہار گیا، صرف ہمارے اور مشرق کے ہم جیسے ملکوں کی نسبت سے درست ہے۔ رہا پورا مشرق تو پورا مشرق نہیں ہارا۔ ظاہر ہے کہ عرب دنیا، ایران، افغانستان، پاکستان اور مشرق کے دوسرے جہالت زدہ ملک ہی مشرق نہیں ہیں۔ سنگاپور، جاپان، تائیوان اور کوریا وغیرہ بھی مشرق ہیں اور وہ ہرگز نہیں ہارے، وہ ترقی میں مغرب کے ہم دوش ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے اس اعلیٰ رمز سے رشتہ جوڑا ہے جسے علم کہتے ہیں۔ آخر میں ایک اور حقیقت بھی قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ علم نہ مشرق سے مخصوص ہے اور نہ مغرب سے۔ وہ تو پوری انسانیت کی میراث ہے، بس اپنانے کی بات ہے۔ جو اسے اپنائے گا وہ اسی کا کہلائے گا۔ مغرب اسے صدیوں سے اپنائے ہوئے ہے اور اس دوران تمام علمی کارنامے مغرب ہی نے انجام دیے ہیں، اس لیے خراجِ تحسین کے طور پر اسے مغرب سے نسبت دینا بے جا نہیں ہے۔ اس حقیقت کو کیسے نظرانداز کیا جائے کہ جدید علوم مغرب کے ذہن کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔

سسپنس ڈائجسٹ، نومبر 1991

نظر آنا

اِس دور کا سب سے نمایاں رجحان یہ ہے کہ جو تم ہو وہ نظر نہ آؤ۔ یہ معاشرے کا دباؤ ہے جو ہمیں اس بے معنی اداکاری پر مجبور کرتا ہے۔ ہم باہر سے بہت ثابت و سالم اور ہشاش بشاش نظر آتے ہیں لیکن اندر سے ریزہ ریزہ اور اذیّت زدہ ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ ہم نے معاشرے کے اس ظالمانہ دباؤ کو کیوں قبول کر رکھا ہے۔

آپ ہرگز خوش حال نہیں ہیں مگر آپ کی یہ مجال نہیں کہ خوش حال نظر نہ آئیں۔ تین مہینے سے آپ نے گھر کا کرایہ ادا نہیں کیا، قرض پر آپ کا مدار ہے لیکن آپ کے خیالات اور نظریات اور ایک خوش حال آدمی کے خیالات اور نظریات میں کوئی فرق نہیں۔ آپ کا سیاسی نقطۂ نظر بالکل وہی ہے جو دولت مند لوگوں کا نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ آپ اتنے محروم آدمی ہیں کہ احساسِ محرومی سے بھی محروم ہیں۔ حقیقتِ حال سے اس درجہ انکار! ذات اور ذہن پر معاشرے کا اتنا دباؤ۔

آپ اور آپ کی بیوی، جنھیں آپ خود اپنی زبان سے بیگم کہتے ہیں۔ جب کہ آپ کا اپنی بیوی کو بیگم کہنا آدابِ گفت گو کے قطعاً خلاف ہے اور ایک غیر مہذبانہ حرکت ہے۔ یہ دوسروں کا فرض ہے کہ وہ آپ کی بیوی کو بیگم کہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے بے حد خوش نظر آ رہے ہیں جب کہ دونوں ایک دوسرے سے بُری طرح تپے ہوئے ہیں۔ آپ دونوں کا بس نہیں چل رہا کہ ایک دوسرے کا منہ نوچ لیں مگر نہ جانے آپ کو دوسروں کا اتنا خیال کیوں ہے کہ مثالی شوہر اور بیوی نظر آنا چاہتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہر حال میں مثالی شوہر اور مثالی بیوی نظر آنا آخر کس نظامِ اخلاق اور

کس نظامِ تہذیب کی رُو سے لازمی اور ضروری ہے جب کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اگر آپ بالکل بجا طور پر اپنی بیگم کی چٹیا کھینچ لیں اور وہ آپ کا گریبان، تو کیا قیامت آجائے گی۔

''مگر لوگ کیا کہیں گے!''

لوگ کیا کہیں گے؟ کچھ بھی نہیں، انھیں کہنے دیجیے۔ حد سے حد یہی تو کہیں گے کہ دونوں نے شادی کی تھی جو ناکام ہوگئی۔ چلیے قصّہ پاک ہوا مگر آپ ہیں کہ معاشرے سے بے تکان جھوٹ بولے چلے جا رہے ہیں۔

جناب آپ کل سے جس بددلی اور بیزاری میں مبتلا ہیں کیا اس کے ہوتے ہوئے آج آپ کو داڑھی بنانا زیب دیتا تھا اور آپ نے داڑھی ہی نہیں بنائی' بال بھی سنوارے ہیں اور خوش بُو بھی لگائی ہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ یہ سب کچھ آپ نے اپنی خاطر اور اپنی بددلی اور بیزاری کو دُور کرنے کے لیے کیا ہو مگر میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے بل کہ آپ نے یہ سب کچھ لوگوں کے لحاظ میں کیا ہے تاکہ وہ آپ کو ایک شایستہ اور نستعلیق آدمی سمجھیں۔ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اگر آپ بددل اور بیزار ہیں اور بددل اور بیزار نظر بھی آرہے ہیں تو اس میں عیب کی کیا بات ہے؟ شاید آپ یہ سمجھتے ہیں کہ معاشرہ آپ کا بددل اور بیزار نظر آنا پسند نہیں کرے گا۔ یقیناً ایسا ہی ہے اور جب ایسا ہی ہے تو اس بے حس اور ناہنجار معاشرے پر لعنت کیوں نہیں بھیجتے جس نے آپ کو ایک اداکار بنا کر رکھ دیا ہے۔

آپ مجھ پر شبہ نہ کریں۔ میں آپ کو بہکانے کی کوشش نہیں کر رہا۔ میں خود پیچ و تاب میں مبتلا ہوں۔ خود میں بھی اسی صورتِ حال سے دوچار ہوں جس سے آپ دوچار ہیں۔ ہوسکتا ہے میری کیفیت آپ سے زیادہ اذیّت ناک ہو اور مجھ میں آپ سے زیادہ دوغلا پن پایا جاتا ہو۔ یہ دوغلا پن ہی تو ہے کہ ہماری کیفیت ہو کچھ اور ہم ظاہر کچھ اور کریں۔

یہ ساری حرکتیں محض اس لیے کی جاتی ہیں کہ آدمی شایستہ اور بُردبار نظر آئے۔ گویا شایستگی اور بُردباری کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ہر لحہ اپنے آپ سے جھوٹ بولے اور ایسا نظر آئے جیسا ہو نہیں۔ اگر شایستگی یہی ہے تو کیا اس کے ایک انتہائی بے ہودہ شے ہونے میں کوئی شبہ کیا جاسکتا ہے۔

میں شاید یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اصل اور بے ساختہ آدمی کی اس معاشرے میں کوئی گنجایش نہیں۔ وہ اپنی اصل حالتوں اور کیفیتوں کے اظہار کے ساتھ اس معاشرے میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ میرے خیال میں پہلے صورتِ حال اتنی شدید نہیں تھی۔ اور شایستگی کے فروغ کے ساتھ ساتھ بے ساختگی کے ساتھ زندگی گزارنے کا امکان بہت کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ معاشرے کی خاطر ہم ویسے نظر آئیں جیسے ہوں نہیں۔ وہی نظر آنا، نظر آنا، نظر آنا۔ لعنت ہے اس نظر آنے پر۔

سسپنس ڈائجسٹ، مارچ 1992

سیلاب

فطرت کے سیلابی غیظ و غضب نے وہ کچھ کیا جو کہا۔ ہم نے دریاؤں کا کیا بگاڑا تھا، ہم نے موجوں کو کب لتاڑا تھا اور ہم نے گردابوں کی کب بُرائی کی تھی۔ سیلاب ہماری بستیوں، ہمارے گھروں اور اُن میں رہنے والوں کو بے نام و نشان کر گیا۔

میں آواز دیتا ہوں کہ اے بستیو! کیا تم کبھی تھیں، میں صدا دیتا ہوں کہ اے گھرو! کیا تم کبھی آباد تھے۔ میں پکارتا ہوں کہ اے تباہ شدہ بستیوں اور آباد گھروں میں رہنے والو! کیا تم کہیں کھو گئے ہو اور لوٹ آؤ گے مگر سناٹوں کی بے حسی نہ بولتی ہے نہ سُنتی ہے اور نہ سُننے دیتی ہے۔

ان کے بچوں نے کتنے گھروندے بنائے ہوں گے، ان کے نوجوانوں نے نہ جانے کتنی آرزوئیں کی ہوں گی اور ان کے بوڑھے مردوں اور عورتوں نے اپنے بچوں کی جوانی سے کتنی اُمیدیں باندھی ہوں گی۔ سب گھروندے سیلاب کی بھینٹ چڑھ گئے، سب آرزوئیں گرداب میں گُم ہو گئیں، سب اُمیدوں کو موجوں نے روند ڈالا۔

ہم تم پر روتے ہیں مگر ہماری آنکھیں بنجر ہیں اور وہ یوں کہ جن کا بیری پانی ہوا اُن کی آنکھوں کا آنسو سے کیا رشتہ۔ سو ہم روتے ہیں اور ہمارا رونا آنسوؤں کو ترستا ہے۔ وہ قومِ عاد نہیں تھے جنھیں ہواؤں کے طوفان نے گرد بنا کر اُڑا دیا تھا۔ وہ قومِ ثمود نہیں تھے جنھیں اُن کی نافرمانی کی سزا دی گئی۔ وہ حضرت لوطؑ کی اُمت نہیں تھے جن پر اُن کی نافرمانیوں کے باعث عذاب نازل کیا گیا۔ وہ شہروں کے شہر بابل کے شہری نہیں تھے جو اپنی عیاشی کی بھینٹ چڑھ گئے۔

ہم انسانی تاریخ کے بارے میں کچھ شُد بُد رکھتے ہیں لیکن ہم فطرت کی تاریخ کے بارے میں کم سے کم کچھ نہیں جانتے۔ فطرت اور انسان کے درمیان شاید پینتیس لاکھ برس سے ایک پُر خاش اور پیکار جاری ہے۔ اگر اس پُر خاش و پیکار کے انجام کا مرثیہ لکھا جائے تو قرن ہا قرن کے صفحے درکار ہوں گی، وہ مرثیہ اگر زمین کی مدور سطح پر رقم کیا جائے تو سطح کی گنجایش ختم ہو جائے گی اور مرثیہ باقی رہے گا۔

غم بہت زیادہ ہیں اور خوشی بہت کم ہے۔ تاریخ کے حسّاس انسانوں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ اُداس رہ کر گزارا ہے۔ زندگی میں خوش رہنے کے لیے بہت زیادہ ہمت بل کہ بہت زیادہ بے حسی چاہیے۔ دانش مندوں کے ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ انسان مختار ہے وہ اپنے اعمال کا جواب دہ ہے۔ دانش مندوں کے دوسرے گروہ نے یہ کہا ہے کہ انسان مجبور ہے۔ اس کے ہاتھ اور اس کے پیر خود جنبش نہیں کرتے بل کہ انھیں کوئی اور جنبش دیتا ہے۔ وہ کون ہے جو انھیں جنبش دیتا ہے؟ وہ کون ہے جس نے تاریخ کے عہد اور تاریخ سے پہلے کے عہد کے تمام انسانوں کو اپنے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا ہے؟ یہ بات معراج رسول نہ تم جانتے ہو اور نہ میں جانتا ہوں۔ ذکر عذاب ناک سیلاب کا ہو رہا ہے اور اس موقع پر جمال احسانی نے میر تقی میر کا یہ شعر پڑھ کر اپنے حسّاس ہونے کا ثبوت دیا ہے یا اپنے شاعرانہ ذوق کی تسکین کی ہے۔ ویسے بلاشبہ یہ شعر بہت برمحل ہے۔

کن نیندوں اب تُو سوتی ہے اے چشمِ گریہ ناک
مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

یہاں تک تو میں نے اپنا دُکھ بیان کیا۔ اب معراج رسول اپنا دُکھ بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "یہ سیلاب تو ہمارے باہر کا سیلاب تھا، اس سے زیادہ مہیب سیلاب تو وہ ہیں جو ہمارے اندر تباہی مچا رہے ہیں، ہمارے اندر کا تموّج کہیں زیادہ تباہ کن ہے، ہمارے اندر کے گرداب کہیں زیادہ سفاک ہیں۔ نفرت کے سیلاب، تعصّب کی طغیانی اور انتقام در انتقام کے گرداب۔ ہمارے اندر کے ان سیلابوں نے سارے بند توڑ دیے ہیں اور اب ہم ہر لمحے ان سیلابوں کے رحم و کرم پر ہیں اور ہم ایک کشتیِ نوحؑ کی آس لگائے اُمید کے سانس لے

رہے ہیں۔ نہ جانے وہ کشتیِ نوحؑ کب آئے گی اور ہمیں بچائے گی۔"

یہ تو میں نے معراج رسول کی بات سُنائی اب میں اپنی بات کہتا ہوں۔ میں بھی معراج رسول کی طرح ایک کشتیِ نوحؑ کے انتظار میں ہوں اور اس کے انتظار میں میری بینائی دُھندلی پڑ گئی ہے۔ میں اپنے اندر طوفان برپا کرنے والے تباہ کن پانیوں کے اُفقوں میں اپنی اُمید کو ڈھونڈ رہا ہوں مگر وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہی۔ پانی زمینوں کو شاداب اور پودوں اور پیڑوں کو سرسبز کرتا ہے، کیا کبھی وہ دن بھی آئے گا جب ہم سب کے اندر کے وجود کا پانی ہماری پُرنفرت زمینوں کو شاداب اور ہمارے اور تمھارے پودوں اور پیڑوں کو سرسبز کرے گا۔ اس سے قطع نظر کہ کیا ہمارا ہے اور کیا تمھارا ہے۔

سسپنس ڈائجسٹ اکتوبر 1992

ایک خط

جانِ برادر! دل کی اُداس اور اُمید پرور دعائیں۔ میں چوتھی نومبر کو صبح کے پانچ بجے کراچی سے روانہ ہو کر ساڑھے چھ بجے دلّی پہنچا۔ وہاں سے اسی دن امروہے روانہ ہو گیا۔ امروہے میں دو تین ہفتے گزارنے کے بعد لکھنؤ چلا گیا اور اب پھر امروہے میں ہوں۔
میں نے قدیم لکھنؤ کے ہر محلّے سے گزرتے ہوئے یہ سمجھا کہ شاید یہ محلّہ معراج رسول کا محلّہ ہو اور اس طرح میں قدیم لکھنؤ کے ہر محلّے کو دعائیں دیتا رہا پھر وہاں سے امروہے آ گیا اور پھر چند روز کے لیے دلّی چلا گیا، اب پھر امروہے میں ہوں۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں مجھے جن مشاعروں میں شرکت کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا وہ ہمارے سندھ کے ہندوستانی رہ نما ایڈوانی صاحب کی کارگزاری کے باعث منعقد نہیں ہو سکے اور اب شاید بہت دن تک منعقد نہ ہو سکیں۔ برِ صغیر کی تاریخ اپنے مقسوم کو پورا کر رہی ہے۔ ہم تاریخ کے مقسوم سے بحث کرنے کی ادنیٰ اہلیت بھی نہیں رکھتے۔ جمعرات کے بعد جمعہ اور جمعے کے بعد ہفتہ آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم ایسے کسی سحر اور کسی اعجاز کی صلاحیت نہیں رکھتے جس کے اثر سے جمعرات کا دوسرا دن جمعے کے بجائے ہفتہ ہو۔

ان دنوں میں اتنا بے حس ہو چکا ہوں کہ اب نہ غم کا غم ہوتا ہے اور نہ خوشی کی خوشی۔ ہاں مجھے وہ تخلیقی شامیں بہت یاد آتی ہیں جن میں ہماری آنکھیں عالمی انسانی معاشرے کے وجود کے بہترین خواب، امن و آشتی، محبت اور دانش مندی کے خواب دیکھنے کی تیاری کرتی تھیں۔ نہ جانے کیا بات ہے کہ ہمارے دل اور ہماری روحوں کے خواب ہماری آنکھوں کے بس کے نہیں رہے ہیں۔

جانِ برادر! کیا ہم عالمی مثالی معاشرے کے خواب دیکھنے سے دست بردار ہو جائیں۔ لیکن اگر ہم ان سے دست بردار ہو گئے تو ہم معراج رسول اور جون ایلیا نہیں رہیں گے۔ کیا ہم معراج رسول اور جون ایلیا نہ رہنا قبول کر سکتے ہیں؟

میں اپنے آپ کو اس سوال کا جواب دینے کی اہلیت سے قابلِ ذکر حد تک محروم محسوس کر رہا ہوں۔ میں دن میں کئی بار اپنے آپ سے یہ معلوم کرتا ہوں کہ معراج رسول، اس وقت حسّاسیت اور شعور کی کس حالت میں ہوں گے۔ اس سوال کے جواب میں میرے اندر سے ایک آواز آتی ہے اور وہ آواز یہ ہے کہ تاریخ شکست و ریخت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ شان دار انسانی مستقبل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس کے راستے میں بڑی رکاوٹیں ہیں اور یہ رکاوٹیں خود تاریخ کی پیدا کردہ ہیں۔ ہمارے بعید ماضی کی تاریخ کی پیدا کردہ ہیں۔ گویا کچھ ایسا ہے کہ تاریخ کو مستقبل کی خاطر خود اپنے آپ سے جنگ کرنا ہے اور یہ جنگ پوری شدّت کے ساتھ شروع ہو چکی ہے اور میں اس کا ایک شاہد ہوں۔

ہم اپنی زندگی کا بہترین زمانہ شریف ترین اور نفیس ترین انسانی معاشرے کا خواب دیکھنے میں بسر کر چکے ہیں اور ہے یوں کہ شاید ہم اپنی زندگی کے باقی دن بھی اسی خواب کو دیکھنے میں، اسی مثالیے کی آرزو اور جُست جو میں بسر کر دیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے خواب ہماری زندگی میں تعبیر سے محروم رہیں اور ہماری آرزوئیں پوری نہ ہوں لیکن ہم اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اس تلخ بات کو تسلیم نہیں کریں گے کہ ہم نے اپنی عمر خوابوں اور خیالوں میں برباد کر دی۔ اس لیے کہ چاہے ہماری عمر برباد ہو گئی ہو مگر ہمارے خواب، ہمارے خیال اور ہمارے مثالیے کبھی برباد نہیں ہوں گے۔ ان خوابوں، ان خیالوں اور ان مثالیوں کو آنے والی نسل اپنی سب سے بیش قیمت ترین میراث کے طور پر قبول کرے گی اور اس میراث کو رائگاں نہیں جانے دے گی۔

کیا ہم بے بنیاد تصور کے روگی ہیں؟ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ اے ۱۹۹۳ء! ہمیں اور تجھے مبارک ہو اور تیرے بعد آنے والے ماہ و سال کو مبارک ہو کہ ایسا نہیں ہے۔ ہم دونوں یقین رکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ کرۂ ارض تباہ ہو جائے گا لیکن

ہماری سائنسی تجربہ گاہوں، ہماری اُمیدوں اور ہماری مستقبل شناسی کی رُو سے ہماری زمین کی تباہی کا وہ دور ابھی آنے والا نہیں ہے۔ ابھی نسلِ انسانی کو ایک طویل ترین زمانہ گزارنا ہے، ظالمیت اور مظلومیت کا طویل ترین زمانہ، ایسا زمانہ جس کے بعد ہم ظالمیت کی شکست اور مظلومیت کی فتح کا فرحت ناک اور جاں پرور منظر دیکھیں گے۔

''کیا آپ وہ منظر دیکھ سکیں گے؟''

''مجھے سوچنے دو، ہمیں سوچنے دو!''

''ہاں آپ سوچیے اور پھر بتایئے کہ کیا آپ وہ منظر دیکھ سکیں گے؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم وہ منظر دیکھ سکیں گے یا نہیں دیکھ سکیں گے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ آنے والے انسانوں کی برادری وہ منظر دیکھے گی اور ضرور دیکھے گی۔

تاریخ اپنی تمام تر تباہ کاری کے باوجود اپنے دل میں انسانوں کے لیے ایک نرم گوشہ رکھتی ہے اور تاریخ ہی نہیں، انسانی دانش، سائنس اور ہمارے جمالیاتی تصورات بہ ہر صورت انسان کے مستقبل...... شان دار مستقبل کا مژدہ سُناتے ہیں اور یہ مژدہ کوئی بے بنیاد مژدہ نہیں ہے۔

ہم اسی مژدے کی آس میں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ اِس لیے نہیں کہ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں یا ہمارے بعد آنے والی نسلیں زندہ رہنا چاہیں گی۔ بل کہ اس لیے کہ اس کائنات کو نہ جانے کب تک قائم رہنا ہے۔ اس کی تباہی کے زمانے کا طے کرنا نہ تو کسی غیب داں کے بس کی بات ہے اور نہ سائنس داں ایسے کسی رجحان کو اپنانے کی استطاعت رکھتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ نوعِ انسانی کو تادیر زندہ رہنا ہے۔ ہم بس یہ چاہتے ہیں کہ نوعِ انسانی سلیقے اور قرینے سے زندہ رہنے کا ہنر سیکھ لے اور یہ ہنر بڑی آسانی سے سیکھا جا سکتا ہے مگر بعض قومیں یہ ہنر نہیں سیکھنا چاہتیں، مگر اُمید ہے کہ وقت پڑنے پر وہ یہ ہنر سیکھ لیں گی اس لیے کہ وہ اس ہنر کو سیکھے بغیر اس کرّۂ ارض پر زندہ نہیں رہ سکتیں، وہی نہیں، اس ہنر کو سیکھے بغیر اس کرّۂ ارض کو بھی نہیں بچایا جا سکتا۔

آخر کچھ قومیں یہ کیوں چاہتی ہیں کہ ان کی دل لگی کی خاطر یہ کرۂ ارض تباہ ہو جائے۔ اُمیدیں تباہ ہو جائیں، آرزوئیں تباہ ہو جائیں، خواب اور خیال تباہ ہو جائیں؟

وہ قومیں انسانوں کے مستقبل سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ وہ عالمی انسانیت کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں رکھتیں۔ اس لیے وہ وہی کچھ چاہتی ہیں جو ان کی لمحاتی زندگی کے لیے سازگار ہو۔

اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ایسی قوموں کے سلسلے میں ہمارا کیا رویہ ہونا چاہیے۔ کیا ہم انسانیت کی بربادی چاہتے ہیں یا آبادی؟ ظاہر ہے کہ ہر باہوش انسان، انسانیت کی آبادی چاہتا ہے اور جب تک باہوش انسان، انسانیت کی آبادی چاہتے ہیں، اس وقت تک انسانیت تباہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن انسانوں کی آبادی چاہنے والوں کو انسانیت کی بربادی چاہنے والوں سے ایک ہوش مندانہ لڑائی لڑنا ہو گی اور ہمیں، ہم لکھنے والوں کو، ہم پڑھنے والوں کو، ہم محبت کرنے والوں کو، ہم خواب دیکھنے والوں کو اس لڑائی میں ہراول دستے کا کردار ادا کرنا ہے۔

سسپنس ڈائجسٹ، مارچ 1993

ایک اور خط

میں شہر بہ شہر بھٹکتا ہوا، ٹھٹھرتا ہوا آج مسیح سے کئی صدی پہلے کے اس شہر میں آٹھہرا ہوں جو میری جائے پیدائش ہے، میری جنم بھومی امروہہ۔ مجھے یہ دولفظ اب بہت خطرناک محسوس ہوتے ہیں۔ ان جنم بھومیوں کے نام پر اُس جرائم پیشگی کا کردار ادا کیا گیا ہے جس پر انسانیت کو شرم آنا چاہیے۔

آج کی صبح میں نے بائیس خواجہ کی چوکھٹ حضرتِ دلّی میں گزاری اور اس وقت میں اپنے مشرق رویہ دیوان خانے کی بالائی منزل کے پُر ملال صحن میں، صحن کی مغربی چھجلی پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے ہوئے ساکت اور صامت کھڑا ہوں۔ شام گہری ہوتی جارہی ہے۔ میرے سامنے اور دائیں طرف سروقد اور شمشاد قامت سرسبزی ہے، گہری گھنیری سرسبزی جو حدِ نگاہ تک لہلہاتی اور پھیلتی چلی گئی ہے۔

چاروں طرف سناٹا ہے، موجود ہونے کا پچھتاوا ہے اور ہراس ہے۔ سناٹا، پچھتاوا اور ہراس۔ ہر لمحہ فضول محسوس ہورہا ہے۔ ہر لمحہ ہی نہیں مجھے تو خود اپنا وجود بھی یک سر فضول محسوس ہورہا ہے، یک سر فضول اور یک سر عبث ''کیا ایسا نہیں ہے؟'' میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں ''ہاں، ایسا ہی ہے'' میں اپنے آپ کو جواب دیتا ہوں۔

بادِشمال کے ایک مہربان، غم گسار مگر نامانوس سے جھونکے نے مجھ سے آکر پوچھا ہے۔

''کیا تم بہت اُداس ہو، کیا تم اس سب کچھ کو بہت غیر غیر پا رہے ہو جو تمھارے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے؟''

''ہاں میں بہت اُداس ہوں، اس قدر اُداس کہ بس۔ ہاں میں اس سب کو بہت غیر

غیر پا رہا ہوں جو میرے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں اور تنہا ہوں۔ میں تنہا ہوں اور سوچ رہا ہوں، بہت اذیّت ناک سوچنا۔ اور ہے یوں کہ سوچنے میں اذیّت ہی اذیّت ہے۔ میں تنہا رہتے اور سوچتے سوچتے تھک چکا ہوں۔ میرے اعصاب شل ہو چکے ہیں۔ میرا دماغ میرا ساتھ نہیں دے رہا۔ یہی نہیں میں خود اپنا ساتھ نہیں دے پا رہا۔"

"گرو جی، آقا جی! آداب" میری پشت کی طرف سے ایک آواز آتی ہے۔ میں مُڑ کر دیکھتا ہوں۔

"جے پال عادل تُو!"

"ہاں گرو جی میں۔"

"تُو اب تک کہاں تھا، کہاں تھا تُو اب تک؟"

"آپ لوگوں سے ملتے ہی کب ہیں۔ آپ تو اپنے شہر کے جنگلوں، درویشوں کے تکیوں، سنیاسیوں کے آشرموں اور تاریخی کھنڈروں میں اپنا وقت بسر کرتے ہیں۔ آپ کے سارے شہر کو آپ سے بے حد گلہ ہے اور وہ یہ کہ آپ امروہے کے لوگوں سے نہیں بل کہ یہاں کے مقامات سے ملنے آئے ہیں"۔

"جے پال، بات یہ ہے کہ اب میرا دل شہر، شہروں اور لوگوں سے کچھ اُچاٹ اُچاٹ سا ہو گیا ہے۔ اب مجھے لوگوں پر بھروسا نہیں رہا۔ اب میں انسانوں سے ڈرنے سا لگا ہوں۔"

"آپ ایسا کیوں سوچ رہے ہیں؟"

"میں سوچنے کی حالت ہی میں نہیں ہوں جے پال، اور تُو بھی سوچنا چھوڑ دے۔ سوچنا گھاٹے کا سودا ہے اور ہاں جے پال، میں کئی ہفتے سے اپنے آپ کو اپنے اوسان میں نہیں پا رہا۔ تُو مجھے ذرا یہ بتا کہ آخر وہ کیسے ہوا جو ہوا اور کیا کچھ ہوا؟"

"گرو جی! وہ کچھ ہوا، وہ کچھ ہوا جس کے بعد میں ایک سانس بھی لینا سب سے بڑا پاپ سمجھتا ہوں اور میں ایک ڈیڑھ مہینے سے لگاتار یہ پاپ کیے جا رہا ہوں۔ بابری مسجد کو

نہیں ڈھایا گیا مجھے ڈھا دیا گیا۔ حضرتِ والا[1] کی قسم مجھے ڈھا دیا گیا، ہمیں ڈھا دیا گیا۔ گنگا جمنی تہذیب کو زہر پلا دیا گیا۔ ملک محمد جائسی، میر انیس، دیا شنکر نسیم، حضرت جوش ملیح آبادی اور حضرت رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کی روحوں کو بلا کی بے حیائی اور بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ کیا آپ مجھے پُرسہ نہیں دیں گے؟"

"ہاں میں تجھے پُرسہ دیتا ہوں اور تُو بھی مجھے پُرسہ دے۔"

"میں بھی آپ کو پُرسہ دیتا ہوں گُرو جی۔ ہماری اور آپ کی زندگی تو ایک پُرسہ ہو کر رہ گئی ہے، تاریخی پُرسہ۔ اور یہی ہمارے نیتاؤں کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ ان نیتاؤں نے ایسا زہر گھولا ہے کہ ہمیں جیتے جی مار ڈالا ہے۔ ان راکھشسوں نے دھارمک کٹر پن اور کٹھور راج نیتی کا وہ کھیل کھیلا ہے، وہ کھیل کھیلا ہے کہ بس کیا کہا جائے۔ عام ہندو جنتا ستیہ میو جیتے (سچ کی جیت) پر وشواس رکھتی ہے اور یہی ہماری سنسکرتی (وراثت) ہے، جسے چھوڑنا آتم ہتیا (خودکشی) کے برابر ہے۔ مگر ہمارے نیتا، جھوٹ کے پجاری نیتا، سچ سے خدا واسطے کا بیر رکھتے ہیں۔ یہ راکھشس ان دنوں یہ کہتے ہوئے سُنے گئے کہ مسلمان باہر سے آئے تھے، انھیں باہر دھکیل دیا جائے۔ ان سے کوئی یہ بھی تو پوچھے کہ کیا آریہ باہر سے نہیں آئے تھے، اندر سے آئے تھے۔ آپ کے اور میرے پُرکھے دونوں باہر سے آئے تھے اور لاکھوں سے زیادہ کی تعداد میں نہیں آئے تھے۔ یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی اکثریت اسی دیس کے پرانے باسیوں کی اولاد ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے جون جی؟"

"ہاں میرے بچے ایسا ہی ہے۔ مگر یہ بتا کہ آخر ہونا کیا ہے؟ میرا گمان ہے کہ اب نفرت، محبت سے کہیں زیادہ طاقت ور ہو گئی ہے، پہلے سے کہیں زیادہ طاقت ور۔"

"گُرو جی! گستاخی معاف، ایسا نہیں ہے۔ ہم سے آپ ہی نے تو کہا تھا کہ محبت نفرت سے کہیں زیادہ توانا ہے، رہی نفرت تو وہ ہمیں کبھی کبھی، ہنگامی حالات میں محبت سے

---

[1]...... حضرتِ والا سے میرے مورثِ اعلیٰ سیّد حسین شرف الدین مراد ہیں۔ ان کا عرس ۱۹ ویں رجب سے شروع ہوتا ہے اور ۲۱ ویں رجب کو قل ہوتا ہے۔ ۱۹ ویں رجب کا سارا انتظام صدیوں سے کائستھ ہندو کیا کرتے تھے نہیں معلوم کہ اب کیا صورت ہے؟

زیادہ توانا محسوس ہوتی ہے اور یہ کہ سماج میں بُرے لوگ کم ہیں اور اچھے لوگ زیادہ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سماج کبھی کا تباہ ہو چکا ہوتا۔"

"میرا کیا ہے۔ میں تو نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا ہوں۔ کاش میرا وہ کہا اب بھی سچ ہو جو میں نے پہلے کبھی کہا تھا۔"

"گُرو جی! آپ نے جو کہا تھا وہ ہمیشہ کا سچ ہے۔ نفرت کے یہ بیوپاری بڑا گھاٹا اُٹھائیں گے۔ یہ راکھشس وقت کے جہنم میں بھسم ہوں گے۔"

"جے پال میرے چیلے! کاش تیرا کہا ہوا سچ ثابت ہو، کاش......!"

سسپنس ڈائجسٹ، اپریل 1993

نجات

بوڑھے قدموں سے چل کر میں بچپن کی طرف گیا۔ انجام کی طرف جاتے ہوئے میں نے آغاز کا رُخ کیا۔ میری تھکی ہوئی پنڈلیاں، میرے ناقص اور ناہنجار وجود کو بستیوں اور بازاروں میں، کوچوں اور کلبۂ احزاں میں گھسیٹتی پھریں۔

میں سودائی اپنی گلیوں میں چلتے چلتے تھک گیا۔ میں غوغائی اپنے جنگلوں میں چیختے چیختے ہار گیا۔

میں نے راحت کو پکارا اور رنج کمایا۔

میں نے آرام کو آواز دی، آلام میرے حصے میں آیا۔

وہ تاریخ میں نے جس میں پہلا سانس لیا، وہ جغرافیہ میں جس میں عرصہ دراز سے رہتا ہوں، انھوں نے مجھے مایوس کیا، مغموم کیا۔

تاریخ اور جغرافیے کے حوالے سے میرے چاروں طرف وحشتوں کا بہاؤ ہے اور خبروں کا اندھیاؤ ہے۔ افسوس کہ تاریخ نے حکمت سے ہاتھ اُٹھایا۔ صد افسوس کہ جغرافیے نے دانائی فراموش کی۔

اچھے دنوں کی نوید دینے والے کہاں ہیں؟ کہاں چلے گئے؟

سب ہی کے دلوں سے خوش اُمیدی کوچ کر گئی کیا؟

کورچشموں اور بدباطنوں کو، احمقوں اور احدیوں کو نوشتۂ دیوار سُنانے والا کوئی نہیں رہا کیا؟

وہ آنکھیں بستیوں سے کوچ کر گئیں کیا جو اس تحریر کو پڑھ سکیں جسے دانائی نے اپنی اُنگلیوں سے لکھا اور جسے حکمت نے اپنے ہاتھ سے نصب کیا؟

لوگو! کیا تمھیں یاد نہیں کہ حکمت زور سے پُکارتی ہے اور دانائی اپنی آواز بلند کرتی ہے ''وہ راہ میں اُونچے مقاموں کی چوٹیوں پر اور رَستوں کے بیچ میں کھڑی ہوتی ہے۔ وہ پھاٹکوں کے نزدیک شہر کے مدخل کے پاس یعنی دروازوں میں داخل ہونے کی جگہ زور سے پُکارتی ہے۔''

وہ کہتی ہے ''اے آدمیو! میں تم کو بُلاتی ہوں اور بنی آدم کے ساتھ میری بات ہے۔ اے نادانو! دانائی کو سیکھو۔ اے جاہلو! فہمید کو پہچانو۔ سُنو! کیوں کہ میں بڑی باتیں بولوں گی اور میرے لب درست باتوں کے لیے کھلیں گے کیوں کہ میرا منہ حق بیان کرتا ہے اور میرے لب شرارت سے نفرت رکھتے ہیں۔ میرے منہ کی سب باتیں صداقت ہیں، ان میں کچھ ترچھا اور ٹیڑھا نہیں۔ وہ سمجھنے والے کے نزدیک سب کی سب درست ہیں اور علم رکھنے والے کے نزدیک راست ہیں۔ میری تادیب کو قبول کرو نہ کہ چاندی کو اور علم کو کندن پر فوقیت دو کیوں کہ حکمت لعلوں سے بہتر ہے اور کوئی دل پسند چیز اس کے برابر نہیں۔

میں حکمت اور مشورت کے ساتھ رہتی ہوں۔ میں علم اور بصیرت رکھتی ہوں۔ ہر غرور اور شیخی اور بدراہی اور ضدی زبان والے منہ سے مجھے نفرت ہے۔ مشورت اور مہارت میرے ساتھ ہیں۔ میں فہمید ہوں، توانائی میری ہے۔ سلاطین میرے ذریعے سے مسلّط ہیں اور حاکم انصاف سے عدالت کرتے ہیں۔ امرا میرے ذریعے امارت کرتے ہیں اور رئیس زمین پر حکم ران ہیں۔

میں ان کو پیار کرتی ہوں جو مجھ کو پیار کرتے ہیں اور جو میری تلاش کرتے ہیں وہ مجھے پالیں گے۔ دولت اور عزت اور پائے داری، سرمایہ اور اقبال مندی میرے پاس ہیں۔ میرا پھل سونے اور کندن سے بہتر اور میرا حاصل نفیس چاندی سے افضل ہے۔ میں صداقت کی راہ میں اور عدل کے رَستوں کے درمیان چلتی ہوں تاکہ ان کو جو مجھے پیار کرتے ہیں، اچھے مال کے وارث بناؤں اور ان کے خزانے بھردوں۔

میں ازل سے نصب کی گئی۔ قدیم سے یعنی اس سے بیش تر کہ زمین بنائی گئی۔ پس اے لوگو! میری سنو، مبارک ہیں وہ جو میری راہوں کو مانتے ہیں۔ تادیب کو سنو اور دانش مند بنو اور اس سے انکار نہ کرو۔ مبارک ہے وہ انسان جو میری سنتا ہے۔"

کہاں گئے وہ مبارک انسان جو حکمت کی مشورت سنیں؟ دانائی کے موتی چنیں! میری تاریخ، میرا جغرافیہ کیا بانجھ ہوئے؟

لوگو! دانائی کیوں نہیں سیکھتے؟ کیوں نہیں فہمید کو پہچانتے؟ کہ تمھاری اور میری اور آنے والوں کی نجات اسی میں ہے۔

سسپنس ڈائجسٹ، جون 1993

دکن سے ایک خط

برادرِ عزیز! دعائیں۔

میں اس وقت روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد دکن کے دفتر میں بیٹھا ہوں اور دنیا کی بدبخت زبان اُردو کے بارے میں گفت گو جاری ہے۔قلی قطب شاہ، غواصی، ولی اور سراج اورنگ آبادی کی سرزمین میں اُردو کے مستقبل کے بارے میں گفت گو جاری ہے۔کیا یہ ایک سنجیدہ صورتِ حال ہے یا ایک غیر سنجیدہ صورتِ حال ہے؟ میں سوچ رہا ہوں۔ ہندوستان میں آزادی کے چند سال بعد سے جو کچھ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اُردو اور مستقبل کا باہمی رشتہ کم زور سے کم زور تر ہوتا چلا گیا ہے۔شمال میں اُردو کی حالت بہت زبوں ہے۔ اس کا کوئی علاقہ متعین نہیں ہے۔ ہریانہ، دلّی اور اُتر پردیش جو اس کے گھر تھے، وہ اس کے گھر نہیں رہے۔

بہار میں اُردو کی صورت کسی حد تک پُر اُمیدانہ ہے۔وہاں کے چند ضلعوں میں اُردو کو ثانوی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔شمال میں صرف بہار ہی کے اُردو والوں نے اُردو کے سلسلے میں حسّاس اور باشعور ہونے کا ثبوت دیا ہے لیکن شمال میں جو کچھ ہوا ہے وہ بہت زیادہ دل شکن ہے اور وہ یہ ہے کہ شمال میں اُردو کو اب صرف مسلمانوں کی زبان سمجھا جاتا ہے۔ بہ ہر حال یہ غنیمت ہے کہ یہ بات واضح انداز میں کہی نہیں جاتی۔ وہاں اب بھی اُردو والے اسے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان قرار دیتے ہیں۔وہاں مشاعرے اب بھی کوی سمیلنوں سے زیادہ مقبول ہے۔ اس میں شمال کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ مشاعرے تو سارے ہندوستان ہی میں بے حد مقبول ہیں۔اب بھی ہندو اور مسلمان لڑکے اور لڑکیاں

اُردو شعروں ہی کے ذریعے اظہارِ محبت کرتے ہیں لیکن یہ شعر دیوناگری میں لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی نئی نسل عربی دعائیں بھی دیوناگری میں لکھ کر یاد کرتی ہے۔ اُردو کا جادوگر شاعر غالب، ہندوستان میں سنسکرت، بنگالی، ہندی، گجراتی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے شاعروں سے کہیں زیادہ مقبول و محبوب ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے کہا تھا کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ ایک وید مقدّس اور دوسری دیوانِ غالب۔ بجنوری نے عجب الہامی جملہ کہا تھا۔ مجھے اعداد و شمار کے ماہرین نے جو بات بتائی وہ یہ ہے کہ سال میں جو کتابیں سب سے زیادہ فروخت ہوتی ہیں، وہ یہی دو کتابیں ہیں۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ بات غالب کے دیوناگری ایڈیشن کے بارے میں کہی جا رہی ہے۔ یہ کتنی خوش کن حقیقت ہے مگر کتنی مضحکہ خیز۔ مضحکہ خیز یوں کہ اب غالب عام طور پر غالب کے نام سے نہیں ''گالب'' کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں اس لیے کہ دیوناگری رسم الخط اور لہجہ غالب کے ''غین'' کو سہارنے کی سکت نہیں رکھتا۔ غزل ''گجل'' ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ ہے اُردو رسم الخط کا المیہ اور اس کی بے رواجی کا دل چسپ نتیجہ۔

ہریانے، دلّی اور اُتر پردیش کے اُردو والے اُردو رسم الخط کے حق میں جتنے بے حس، بل کہ بے ضمیر ثابت ہوئے ہیں، اس پر ان علاقوں کی ہر پختہ دیوار سے سر ٹکرایا جانا چاہیے مگر سر ٹکرانے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ ہے وہ گفت گو جو ہم اُردو کے چوتھے تاریخی گھر حیدرآباد دکن سے شائع ہونے والے روزنامے ''سیاست'' کے دفتر میں بیٹھے ہوئے کر رہے ہیں، ہندوستان کے سب سے بڑے اخبار روزنامہ سیاست کے دفتر میں۔

یہاں کی صورتِ حال یعنی جنوبی ہند کی صورتِ حال شمال کے مقابلے میں نمایاں طور پر مختلف ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا، شمال میں اُردو کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان کہا جاتا ہے جو ایک ناقابلِ تردید نظری صداقت ہے۔ جنوبی ہند میں بھی اُردو کو کسی ایک مذہب کے ماننے والوں سے مخصوص نہیں کیا جاتا۔ یہاں بھی اس کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک زبان کہا جاتا ہے مگر اس موقع پر جو بات قابلِ ذکر ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کے اُردو

والے عملی حقیقت کو زیادہ قابلِ توجہ سمجھتے ہیں۔ یہاں اُردو والوں سے وہ مسلمان مراد ہیں جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے بل کہ تامل، تلگو یا ملیالم ہے۔ ان لوگوں نے اُردو کو اختیاری زبان کے طور پر قبول کرلیا ہے اور وہ اسے اپنی عزیز ترین متاع سمجھتے ہیں۔ چناں چہ یہاں اُردو رسم الخط اور اُردو تعلیم کی بنیاد شمالی ہند کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط ہے۔ اب سے کئی صدی پہلے ہندوستان میں ''دکن'' اُردو کا سب سے بڑا تخلیقی اور تعلیمی مرکز تھا اور اُردو وہاں کی سرکاری زبان تھی۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۴۸ء تک ریاست حیدرآباد کی علمی، تعلیمی اور سرکاری زبان اُردو ہی رہی۔ اب بھی یہاں اسے صرف بول چال کی زبان کی حیثیت نہیں بل کہ قابلِ ذکر حد تک علمی، تعلیمی اور تخلیقی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔

شمال میں اُردو صرف بول چال کی زبان بنتی جا رہی ہے اور ہے یوں کہ اُردو اب بھی سارے ہندوستان کی مشترک بولی ہے۔ بس یہ ہے کہ اسے اُردو کے بجائے ہندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بہ ہر حال جنوب میں اسے باقاعدہ ایک زبان کی حیثیت حاصل ہے اس لیے کہ وہاں کے اُردو والوں نے اپنے احساس، تاثر اور عقلیت کی ایک تاریخی حقیقت کو دریافت کرلیا ہے اور وہ حقیقت ان کے خیال میں یہ ہے کہ یہ سب ہماری مادری زبانیں ہیں اور اُردو ہمارے نفسیاتی، فکری اور اعلیٰ تہذیبی تشخص کی زبان ہے۔

میں نہیں جانتا کہ وہ جس حقیقت تک پہنچے ہیں، تاریخ 'غیر جانب دار تاریخ اس حقیقت سے کتنی مناسبت اور مطابقت رکھتی ہے یا اس کے حق میں کتنی سازگار ہے لیکن جنوب کے یہ ''اُردو والے'' اپنے طور پر جس حقیقت تک پہنچے ہیں وہ یہی ہے۔ جنوب کے ''اُردو والوں'' کی اس دریافت کی نفسیاتی، فکری، تہذیبی، جذباتی اور تعقلی قدر و قیمت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ہمیں جنوب کے اس گروہ کی تاریخ کا گہرا جائزہ لینا پڑے گا۔ جن ماہرین نے اس تاریخ کا گہرا جائزہ لیا ہے، ان کے نزدیک اس گروہ کی یہ دریافت پوری طرح قابلِ فہم ہے اور اس کا محض جذباتیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اُردو زبان پہلے علاء الدین خلجی اور پھر محمد تغلق کے عہد میں دلّی سے دکن گئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہاں اُردو نثر اور شاعری کا ظہور ہوا۔ خاص طور پر دکن شاعری کا پہلا عظیم الشان مرکز قرار پایا پھر اُردو شاعری ولی دکنی کے دیوان کے ذریعے دلّی کے گلی کوچوں میں پھیل گئی اور پھر سارے شمالی ہند اور وسطی ہند وغیرہ میں۔ اور اب اُردو زبان دوبارہ دکن میں اپنی پرانی بنیادوں کو استوار کر رہی ہے۔

سائنس ڈائجسٹ' اگست 1993

حیدر آباد دکن سے دوسرا خط

جانِ عزیز معراج میاں! پیار بے شمار......

میں ابھی حیدر آباد دکن ہی میں ہوں۔ عجب دل دار شہر ہے۔ تقسیم سے پہلے پنجاب، دلّی، ممالک متحدہ آگرہ واودھ (اُتر پردیش) یا ہندوستان کے کسی اور علاقے کا آدمی (خاص طور پر مسلمان) یہاں آجاتا تھا تو پندرہ بیس برس سے پہلے اپنے وطن کا رُخ نہیں کرتا تھا اور اگر اس نے یہاں کہیں بیاہ رچالیا تو پھر اپنے شہر سے ہمیشہ کے لیے گیا۔ ہماری ننھیال کے لوگ بھی یہاں آئے تھے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ ہمارے بڑے ماموں نے یہاں آکر دوسری شادی کرلی اور پھر انھوں نے ہمارے بابا اور دوسرے عزیزوں کو خط لکھے اور مشورہ دیا کہ آپ سب لوگ بھی یہیں چلے آئیں۔ ہماری والدہ کہا کرتی تھیں کہ حیدر آباد کی عورتیں اپنے شوہروں کو کھٹائی پڑا کھانا کِھلا کے کسی اور کا نہیں رہنے دیتیں۔ وہ سارے رشتے بُھول جاتے ہیں۔ اگر میں نے اپنی والدہ کی بات کو دھیان دے کر سُنا ہوتا تو میں بلا ناغہ کھٹائی پڑا کھانا کھاتا اور امروہے کی اس لڑکی کی محبت سے باز آجاتا جس کی یاد مجھے بہت خرابی و خواری کی حالت میں رکھتی تھی۔ معراج میاں! کیا خیال ہے، اب کسی حیدر آبادی خاتون کے ہاتھ کا کھٹائی پڑا کھانا کھالوں؟ مگر اب کیا! یہاں یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ فتنے کا اصل سبب کھٹائی پڑا کھانا ہے یا حیدر آباد کا دراوڑی حُسن۔ بہ ہر حال، میاں اگر میر تقی میر دلّی سے آپ کے سابق وطنِ مالوف لکھنؤ کے بجائے حیدر آباد دکن جاتے تو اُردو میں کربِ ہجرت کی لافانی شاعری شاید معرضِ شہود میں نہ آتی۔ پھر بھلا یہ شعر کون کہتا۔

متاعِ سخن پھیر لے کر چلو
بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

مغرب کی ماہرِ عمرانیات موسیو لیبان نے کسی جگہ کچھ ایسی بات لکھی ہے کہ ہندوستان اپنی جگہ ایک دنیا ہے۔ یہ بات اس نے بھارت کے بارے میں نہیں لکھی بل کہ برِ صغیر کے بارے میں لکھی ہے۔ بہ ہر طور پاکستان اور بنگلا دیش کو منہا کرنے کے بعد بھی بھارت بہت بڑا ملک ہے۔ میں پہلے بھی بھارت کے طول و عرض میں قدم زن رہا ہوں مگر اس بار میں نے اس ملک کو کسی قدر زیادہ توجہ سے دیکھا بھالا ہے۔ بھارت کو ایک قوم قرار دینا شاید بہت صحیح بات نہیں ہے۔ یہ صرف سیاسی بل کہ زیادہ مناسب اندازِ بیان اختیار کیا جائے تو صرف انتظامی اعتبار سے ایک قوم ہے۔

شام ہو رہی ہے اور میں، سردار بھائی (سردار جعفری)، ندا فاضلی اور چند دوسرے شاعر اور ادیب جنوبی ہند اور اُردو زبان و ادب کی نسبت سے گفت گو کر رہے ہیں۔ گویا گزشتہ خط میں جس موضوع پر گفت گو کی گئی تھی اسی موضوع پر اس وقت بھی گفت گو جاری ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور میں اپنے پچھلے خط میں لکھ بھی چکا ہوں کہ آندھرا پردیش اُردو زبان و ادب کا تاریخ پرور مرکز رہا ہے۔ اس کے بارے میں بھلا کیا کہنا۔ اب رہا تامل ناڈو، کرناٹک اور کیرالا تو صورتِ واقعہ یہ ہے کہ ان علاقوں میں اُردو اپنے رسمِ خط میں پوری روانی کے ساتھ لکھی جاتی ہے۔ کرناٹک نے تو گزشتہ پچیس تیس برس میں اُردو ادیبوں اور افسانہ نگاروں کی بہت معتبر جمعیت پیدا کی ہے۔ کرناٹک کے افسانہ نگار عمومی طور پر زبان کو بڑی جمالیاتی سلیقہ مندی کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔ انھوں نے اُردو افسانے کو قابلِ ذکر حد تک پُر مایہ کیا ہے۔ یہاں کی شاعری کا آہنگ بھی قابلِ داد ہے۔

اس موقع پر میں تامل ناڈو کے بارے میں قدرے زیادہ دل جمعی کے ساتھ گفت گو کرنا چاہتا ہوں۔ پرانے زمانے کی بات ہے کہ تامل ناڈو کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ سوچو تو، وہ زمانہ کتنا عجیب زمانہ ہوگا جب تامل ناڈو کی سرکاری زبان فارسی تھی؟ یہ بات ان باتوں میں سے ایک بات ہے، ان تاریخی باتوں میں سے ایک بات جن پر اب یقین نہیں آتا۔ ہمیں تو اب خود اپنے ہونے پر یقین نہیں آتا۔ کیا ہم واقعی ہیں؟ آپ ہوں گے مگر میں تو شاید نہیں ہوں۔ جو اپنی سچی حالتوں کے ساتھ نہیں پایا جاتا، وہ نہیں ہے۔ سو میں نہیں ہوں۔

تامل ناڈو میں عربی اور فارسی دونوں تصنیف اور تالیف کا ذریعہ تھیں اور ان کے ساتھ مقامی زبان میں بھی ذہنی کاوشوں کو پیش کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ عربی زبان وادب سے تامل ناڈو کا گہرا رشتہ رہا ہے۔ اب رہی اُردو، اس دور کے اعتبار سے تو تامل ناڈو میں کسی سرکاری سرپرستی کے بغیر عوام، انجمنیں اور سکّہ بند ادارے اُردو کے سلسلے میں پوری جمعیتِ خاطر کے ساتھ سرگرم ہیں۔

تامل ناڈو کے اضلاع میں تقریباً دو ہزار سے کچھ زیادہ اسکولوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ ان اسکولوں میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے اسکول شامل ہیں۔ ان کے علاوہ شبینہ مدرسے بھی قائم ہیں۔ (اُتر پردیش! ہت تیرے کی) تامل ناڈو میں اُردو کے چار مراکز ہیں۔

۱-شمالی ارکاٹ، ۲-مدراس، ۳-ترچراپلی، ۴-چنگل پیٹھ

ان علاقوں میں کم وبیش چار سو شاعر پوری حالتِ حال کے ساتھ فکرِ سخن میں مست ہیں۔ ان کے علاوہ افسانہ نگار، عالم، نقاد اور محقق اپنے اپنے شعبوں میں کارپردازی کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ بنگلور (مدراس) میں متعدد عربی، فارسی اور اُردو کے مدارس قائم ہیں، جن میں ''سبیل الرشاد'' خاص اہمیت کا حامل ہے۔ شمالی ارکاٹ کے شہر دیلور میں ام المدارس باقیات الصالحات، مدرسہ لطیفیہ حضرت مکان دیلور، جامعہ دارالعلوم (عمر آباد) عربک کالج دیلور۔ جنوبی ارکاٹ میں دارالعلوم مدرستہ العروسیہ کیل کرے اور مدرستہ الموالی کیل کرے میں عربی، فارسی اور اُردو کی تعلیم یونی ورسٹی کی سطح پر ہوتی ہے۔ جہاں سے مولوی، مولوی عالم، مولوی فاضل، منشی، منشی عالم، منشی فاضل اور ادیب، ادیب عالم، ادیب فاضل کے طلبہ سندیں حاصل کرتے ہیں۔ شمالی ہند کے شاعروں میں فارسی داں شاعر تو ملیں گے لیکن عربی داں شاعر شاذ ہی نظر آئیں گے۔ تامل ناڈو میں عربی داں شاعروں کا تناسب خاص طور پر قابلِ ذکر ہے اور وہ عربی زبان وادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

تامل ناڈو میں ہندی سے نفرت کی جاتی ہے۔ یہ ہرگز کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ بہ ہر حال جہاں تک اُردو کا تعلق ہے تو تامل ناڈو کی سرکار کا رویّہ اُردو کے ساتھ نہ ہمدردانہ

ہے، نہ مخالفانہ یعنی وہ اُردو کے حق میں بالکل بے ضرر ہے۔ رہے عوام تو ان کی ایک بہت بڑی تعداد اُردو زبان اور اُردو ادب سے گہرا سروکار رکھتی ہے۔

تامل ناڈو کے مشہور شاعر، ادیب اور عالم جناب کاوش بدری نے مجھے بتایا کہ تامل ناڈو کے کم و بیش بیس لاکھ افراد اُردو رسم الخط استعمال کرتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس بات میں کتنا غلو شامل ہے اور کتنا علو!

میں یہاں ابھی دو تین دن اور رہوں۔ کل جامعۂ عثمانیہ کی زیارت کرنے کا قصد ہے، جامعۂ عثمانیہ دنیائے اُردو کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ، مرحوم ادارہ ہے۔ اب وہ ''جامعۂ عثمانیہ'' نہیں رہا ہے ''عثمانیہ یونی ورسٹی'' ہوگیا ہے۔

سسپنس ڈائجسٹ، ستمبر 1993

مکتوبِ دکن

معراجی (میراجی) شاد رہیں، آباد رہیں۔

میں ابھی دکن ہی میں ہوں، اُردو ادب کی قدیم ترین سرزمین میں۔ میاں مجھے اور آپ کو شاید اپنی بدذوقی کے باعث کم ہی شعر پسند آتے ہیں۔ ہمیں ایک غزل بے طرح پسند ہے، بے طرح۔ یہ قاتل اور کافر غزل اسی سرزمین میں کہی گئی تھی، ارشاد فرمائی گئی تھی، ایجاد فرمائی گئی تھی۔ اس قاتل اور کافر غزل کا قاتل اور کافر مطلع یہ ہے:

خبرِ تحیرِ عشق سُن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تُو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

جانی جاناں! اگر شاعری کا کوئی پارکھ آپ کے شعری ذوق کا امتحان لے یا دوسرے لفظوں میں خود اپنے آپ کو امتحان میں ڈالے اور آپ سے یہ پوچھے کہ اس عہد کی پوری شاعری یعنی تمام غزلیات اور سراجؔ اورنگ آبادی کے اس شعر میں آپ کسے جمالیتی، تخلیقی اور کیفی اعتبار سے زیادہ قیمتی سرمایہ قرار دیں گے؟ یہ ہے میرا سوال۔ اس سوال کا جواب آپ کی طرف سے میں خود دوں گا۔ یہ بتا دوں کہ اب شام ہو گئی ہے اور مجھے آپ کے متروک شہر لکھنؤ کے آفت ناک شاعر نواب مرزا شوقؔ کی مثنوی زہرِ عشق کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

رُخ پہ گیسو ہوا سے ہلتے ہیں
چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں

شام احساس کو عذابِ جاں بنا دیتی ہے۔ شام دن کا ایک عجیب اختتام پذیر جمال ہوتی ہے۔ شام وقت کا سب سے بڑا تحیر ہے اور سب سے بڑا تاثر۔ ہاں میاں وہ شعر رہ

گیا۔ شاعرِ شاعراں حضرت سراؔج اورنگ آبادی کا وہ شعر۔

خبرِ تحیرِ عشق سُن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تُو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

یہ تو ہوا مطلع۔ اب ایک قیامت خیز شعر سُنیں۔

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سُرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

ہمارے اس دور کا کوئی بھی ایسا شاعر نہیں ہے جس نے اس شعر کے ٹخنوں کے برابر کا بھی شعر کہا ہو۔ فلاں؟ ہشت۔ فلاں؟ ہشت۔ فلاں؟ ہشت۔

تو ہے یوں کہ ''خبرِ تحیرِ عشق سُن'' اور میں سُن رہا ہوں اور اپنی ذاتِ ذات کے آتش دان میں جَل بھُن رہا ہوں۔ ''تحیرِ عشق'' کی بات ہے تو معراج میاں ایک بات سُنیں۔ اس سرزمین کی صورتِ حال بھی یہی ہے۔ یہاں کے شہروں، قصبوں، بازاروں، چوراہوں اور گلی کوچوں یعنی اُردو گلی کوچوں پر ابھی تک ایک سہمے ہوئے سے تحیّر کا عالم طاری ہے جسے اب یہاں کے زوال اور انقلاب کے سال ہا سال بعد بہت اندر جا کر ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ عالم کب سے طاری ہے، کب سے؟ ۱۳ویں ستمبر ۱۹۴۸ء سے یعنی سقوطِ حیدر آباد سے۔

احساس اور کیفیت کے گرد و پیش میں نہ ''جنوں'' رہا ہے اور نہ ''پری'' رہی ہے۔ وہ ''جنوں'' خلاق جمالیاتی پرستش کی ایک سرشار اور کرشمہ کار محویت تھی اور وہ ''پری'' اُردو تہذیب کی ہیکل کی معبودہ تھی۔ دونوں پر دُرود، دونوں پر فاتحہ۔ ہم بھی کس شان سے تباہ ہوئے۔ اتنے ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑیں۔ میاں جان! ایک ہزار برس کی تہذیب جاں کنی میں مبتلا ہے اور اس پر آنکھ سے آنسو بھی نہ نکلیں! یہ تو وہ سانحہ ہے جو مسلسل چوالیس پینتالیس برس سے پیش آ رہا ہے۔ یہ وہ سانحہ ہے، وہ سانحہ جس پر اتنا خون رویا جانا چاہیے تھا کہ رونے والوں کے بدن ہلدی کی طرح پیلے پڑ جاتے۔

ایک اُداس شام برس رہی ہے۔ بہت اُداس شاموں میں سے ایک شام۔ جانے شام

نے مجھے اُداس کیا ہے یا میں نے شام کو۔ میں اس وقت احساسِ وجود کے اکیلے پن میں بُری طرح رائگاں جا رہا ہوں۔ میں جو نہ مومن ہوں اور نہ کافر۔ مجھے اس وقت قرآن مجید کی ایک آیت یاد آ رہی ہے جس کا مطلب ہے۔ ''یقیناً انسان گھاٹے میں ہے۔''

نہ جانے انسان گھاٹے کی اس تجارت میں کیوں جھونک دیا گیا ہے؟ انسان جو تجارت کر رہا ہے کیا وہ تجارت ایک کائناتی مسخرگی نہیں ہے؟ نہ جانے اس ظلوم اور جہول انسان نے یہ تجارت کیوں اختیار کی۔ چوہے، چھپکلیاں اور چھچھوندریں، ان سب میں سے ہر نوع کتنی ہوشیار تھی! وہ سراسر گھاٹے کی اس تجارت میں نہیں پھنسی۔ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا بقراط بھی چوہے، چھپکلی اور چھچھوندر سے سے زیادہ چین چان سے نہیں ہے۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے کیفی بھائی (حضرت کیفی اعظمی) شوکت بھابی، شبانہ (شبانہ اعظمی) اور چند دوسرے شاعر، ادیب اور فن کار یہاں سے رخصت ہوئے ہیں اور میں ہوٹل کی نہ جانے کون سی منزل کے نہ جانے کون سے کمرے میں اپنے آپ کو جھیل رہا ہوں۔ دل پر ایک عجیب حالت ہے کہ طاری ہے۔ یہ حالت بڑی اذیّت ناک حالتوں کی ایک حالت ہے اور اب تو یہی میری حالت ہے، ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی۔ معراجِم جانم! آج میں دنیا کی سب سے بڑی اُردو جامعہ، جامعۂ عثمانیہ کی ممی (مومیائیMummy) کی زیارت کرنے گیا تھا۔ صحن میں حاضر ہوتے ہی میری زبان سے انا للہ و انا الیہ راجعون نکلا اور میں اپنے نہ جانے کتنے برس کے سارے آنسو پی گیا، شراب کی طرح پی گیا۔

دنیا کی جو تلخ بات میں نے
پی لی تو شراب ہو گئی ہے

میں نے اس سفر میں آنسو پی جانے کے شان دار ہُنر کا جو قابلِ داد مظاہرہ کیا ہے، مجھے اس کی ابھی تک کوئی داد نہیں ملی۔ پاکستان میں بھی اس ہُنر کی کب داد ملتی ہے۔ جانِ عزیز! جب میں واپس آؤں تو مجھے سب سے پہلے اپنے اسی قابلِ داد ترین ہُنر کی داد ملنا چاہیے۔

اب میں عالمِ خیال میں پھر اُس جگہ جا پہنچا ہوں جو کبھی جامعۂ عثمانیہ یعنی اُردو کی پہلی اور آخری جامعہ تھی اور اب وہ عثمانیہ یونی ورسٹی ہے۔

میرے اور کسی اور کے درمیان کسی کے بھی درمیان، وہ سکھ ہو یا پارسی، مسیحی ہو یا ہندو ناموں کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ بس جذبے اور نیت کا گلہ ہے اور گلہ رشتے کے احساس کے بغیر کبھی نہیں ہوتا۔ اگر دل داری اور دل دہی کا جذبہ پرورشوت دیا جاتا جو میرے گمان میں، بعض گہرے تاریخی اور تہذیبی رشتوں کے پیشِ نظر دیا جانا چاہیے تھا تو جامعہ عثمانیہ میں، میں نے غلط کہا عثمانیہ یونی ورسٹی میں قدرے فراخ دلی کے ساتھ اُردو کے لیے بھی گنجایش پیدا کی جا سکتی تھی۔ بہ ہر حال میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ شاید ایسا ممکن نہیں تھا۔ اب ہمارے حق میں شاید کوئی بات بھی ممکن نہیں ہے۔ گفت گو قدرے دراز ہوگئی اور اس کے باوجود ناتمام رہی۔ بہ ہر حال رات گئے تک میں اسے تمام کروں گا۔

سسپنس ڈائجسٹ' اکتوبر 1993

دکن سے آخری خط

عزیزالقدر معراج میاں! شاد باش وشاد زی۔

میری ہر بات شام سے شروع ہوتی ہے یعنی وقت کی عبثیت اور لایعنیت کے پُرآشوب احساس سے۔ میاں جی آخر ہے کیا؟ اس بدبخت زبان کی قسم جو میرا ذریعۂ کلام ہے، کچھ بھی تو نہیں، میاں جی! کچھ بھی تو نہیں۔ اور یہ جو کچھ میں نے کہا، یہ بھی عبث ہے۔ یہ بھی بے معنی ہے۔

میں حضرت صاحب، حضرت سراج اورنگ آبادی کی سمت سے رخصت ہونے والا ہوں۔ میں ان کا ایک شعر پہلے کسی خط میں لکھ چکا ہوں۔ وہ شعر دوبارہ یاد آرہا ہے۔ کیا سفاک شعر ہے۔

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سُرور کا جَل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

''سمتِ غیب'' پر ایک خیال آیا اور وہ یہ کہ آخر سمتِ ظہور کیا ہے۔ سمتِ شہود کیا ہے، سمتِ حضور کیا ہے۔ مگر میرے اس خیال کے شاید کوئی معنی نہیں ہیں۔ یاد نہیں کہ میرا پچھلا خط کہاں ختم ہوا تھا۔ ہاں یہ یاد ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کا سخن جاری تھا اور ایک حُزن کا عالم طاری تھا، شاید۔ بہ ہر حال اب مجھے جامعۂ عثمانیہ اور اس کے پس منظر کے بارے میں گفت گو کرنا ہے۔ میری گفت گو کا ایک حصّہ روزنامہ سیاست حیدرآباد دکن کے مالک و مدیر برادرِ عزیز زاہد علی خاں اور جگر بھائی (حضرت جگر حیدرآبادی) کے افادات سے مستعار ہے۔

جامعۂ عثمانیہ کے وجود کی بات بیسویں صدی سے نہیں بل کہ اٹھارویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔ اٹھارویں صدی کے ہندوستان کے تعلیمی حلقوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اُردو کو علوم و فنون کی تعلیم کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ اس وقت عربی اور فارسی اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ

تھیں۔ دلّی کالج اسی احساس کا مظہر تھا جو ۱۷۹۲ء میں قائم ہوا۔ شروع میں دلّی کالج کا ذریعۂ تعلیم انگریزی تھا لیکن انیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں اورینٹل کالج کا افتتاح ہوا۔ یہ ہندوستان کا پہلا تعلیمی مرکز تھا جہاں جدید مغربی علوم کی تعلیم اُردو میں دی جاتی تھی۔

اس دلّی کالج ہی میں مرزا غالبؔ کو بلایا گیا تھا تا کہ ایک فارسی معلّم کی حیثیت سے ان کا امتحان لیا جائے۔ یہ امتحان مسٹر ٹامس کو لینا تھا۔ مرزا غالبؔ پالکی میں سوار ہوکر مسٹر ٹامس کے ڈیرے پر پہنچے۔ مسٹر ٹامس کو اطلاع ہوئی۔ انھوں نے فوراً مرزا کو بلایا مگر مرزا اس انتظار میں ٹھہرے رہے کہ رواج کے مطابق مسٹر ٹامس انھیں لینے آئیں گے۔ بہت دیر کے بعد مسٹر ٹامس کو خبر ہوئی کہ مرزا تہذیبی روایت کی مراعات کے سبب نہیں آئے۔ چناں چہ ٹامس صاحب باہر آئے اور مرزا صاحب سے کہا کہ جب آپ ''دربارِ گورنری'' میں تشریف لائیں گے تو حسبِ دستور آپ کا استقبال کیا جائے گا مگر اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں اس لیے اس وقت وہ برتاؤ نہیں کیا جا سکتا۔ مرزا نے کہا کہ میں نے سرکار کی ملازمت کا اس لیے ارادہ کیا تھا کہ عزت میں اضافہ ہو نہ اس لیے کہ جو اعزاز حاصل ہے اس میں بھی کمی آجائے۔ یہ کہا اور سو روپے کی نوکری پر لات مار کر چلے آئے۔ اگر وہ اس طرح نہ چلے آتے تو پروفیسر مرزا غالبؔ کہلاتے۔

دکن میں بھی اُردو ذریعۂ تعلیم کا تصور بہت پہلے سے کارفرما تھا۔ شروع میں اس تصور پر غیر رسمی اور نیم باضابطہ طور پر عمل ہوا۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل کے آخر کی بات ہے کہ ایک تعلیمی ادارہ وجود میں آیا۔ اس ادارے کا نام مدرسۂ فخریہ تھا۔ اس مدرسے میں نظری اور عملی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی اور چوں کہ اُردو میں ان علوم پر کتابیں ناپید تھیں یا تھیں بھی تو بہت کم اس لیے کتابیں لکھوائی جاتی تھیں یا ترجمہ کروایا جاتا تھا۔ چناں چہ فرانسیسی اور انگریزی سے سائنس کی بہت سی اہم کتابوں کے اُردو میں ترجمے ہوئے۔ مدرسۂ فخریہ کے زیرِ اثر اسی طور کے اور بھی تعلیمی ادارے وجود میں آئے۔ ان میں ایک طب کا مدرسہ بھی تھا جو حیدرآباد میں قائم ہوا۔ اس مدرسے میں جدید طب (ڈاکٹری) کی تعلیم اُردو میں دی جاتی تھی۔ اس مدرسے سے ارسطو یار جنگ جیسی شخصیت فارغ التحصیل ہوئی۔

غدر سے ایک سال پہلے کا دور یعنی ۱۸۵۶ء اُردو ذریعۂ تعلیم کی تاریخ کی نسبت سے ایک بہت قابلِ ذکر دور ہے، ایک بہت قابلِ ذکر سال ہے۔ اس سال نواب سالار جنگ نے ایک درس گاہ قائم کی۔ اس کا نام بہت عجیب تھا یعنی مدرسہ دار العلوم۔ بہ ہر حال اُردو کو جدید علوم کے ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کرنے کا رجحان روز افزوں رہا اور بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے شروع میں اس کا تاریخی نتیجہ نکلا۔

یہاں یہ بات بیان کردی جائے کہ ۱۸۸۳ء تک ریاست کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ ۱۸۸۴ء میں اُردو سرکاری زبان قرار دی گئی اور فارسی اور انگریزی اصطلاحوں کو اُردو میں منتقل کیا گیا۔ اس طرح اُردو کے لیے ایک ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے حالات سازگار سے سازگار تر ہوتے گئے۔ اس کے بعد جامعۂ عثمانیہ کے قیام تک کئی مرحلے آئے اور ان کے نتیجے میں اُردو کی تاریخ کا ایک تاریخی دور شروع ہوا۔

۱۹۱۱ء میں نواب عثمان علی خان تخت نشین ہوئے اور آہستہ آہستہ اُردو ذریعۂ تعلیم کا یادگار ترین عہد ظہور پذیر ہوا۔ تعلیمات کے دو ماہر مقرّر کیے گئے، ایک علاّمہ شبلی نعمانی اور دوسرے مسٹر آرتھر ہیو۔ مسٹر آرتھر ہیو ایک اہم ذمّے داری سے عہدہ برآ ہوئے۔ وہ ذمّے داری تھی ایک نظامِ تعلیم مرتب کرنے کی۔ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ابتدائی وثانوی تعلیم کے لیے ایک عرض داشت پیش کی جس میں زور دیا گیا تھا کہ مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم ہونا چاہیے۔

ذریعۂ تعلیم کے سلسلے میں فکر کے دو انداز پائے جاتے تھے۔ ایک یہ کہ مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم ہونا چاہیے اور دوسرا یہ کہ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم ہونا چاہیے۔ جو لوگ مادری زبان کے حق میں تھے ان میں ہندوستانی بھی تھے اور انگریز بھی۔ اسی طرح جو لوگ انگریزی ذریعۂ تعلیم کے حامی تھے ان میں بھی ہندوستانی اور انگریز دونوں ہی شامل تھے۔ یہاں میں مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے والے ایک اہم اور ذمّے دار ترین انگریز یعنی وائسرائے کی رائے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وائسرائے کا کہنا یہ تھا کہ:

"ہماری اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ انگریزی زبان ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ طلبہ ایک غیر زبان کے ذریعے دقیق علوم کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ عام طور پر ان کی انگریزی دانی

بہت معمولی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ نصابی کتابیں رَٹنے پر مجبور ہوتے ہیں اور صفحے کے صفحے نہیں بل کہ کتابیں کی کتابیں رَٹ ڈالتے ہیں جنھیں وہ بہت ہی کم سمجھتے ہیں۔ کچھ دن ہوئے میری ایک معزز ہندوستانی سے اس مسئلے پر گفت گو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے جو مضامین لیے تھے ان میں سے ایک مضمون تاریخ بھی تھا۔ اس زمانے میں میری انگریزی بہت کم زور تھی اس لیے میں نصاب کی کتاب پوری طرح سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اس لیے میں نے تمام کتابیں حفظ کر ڈالیں۔ سوالات میں ایک سوال ایسا تھا جس کے بارے میں معلوم تھا کہ اس کا جواب کتاب کے فلاں صفحے پر ہے لیکن اس امر کا یقین نہ تھا کہ صفحے کا کون سا حصّہ اس کا صحیح جواب ہوگا۔ اس لیے میں نے سارا صفحہ نقل کر ڈالا۔ بات یہ ہے کہ میں سوال کو صحیح طرح سمجھا ہی نہیں تھا۔

میں نے بھی یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کی ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر ہماری مکمل تعلیم کسی غیر زبان کے ذریعے سے ہوتی تو اس کا کیا نتیجہ نکلتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم بددل اور نا اُمید ہو کر پڑھنا ہی چھوڑ دیتے۔"

۱۹۱۸ء میں نظام حیدر آباد نواب عثمان علی خان کا ایک فرمان صادر ہوا جو یہ تھا۔

"مابدولت حکم فرماتے ہیں کہ

۱- حیدر آباد دکن میں ایک جامعہ، جامعۂ عثمانیہ قائم کی جائے۔

۲- جامعۂ عثمانیہ کا مقصد یہ ہے کہ مذہبی، اخلاقی، ادبی، فلسفیانہ، طبعی، تاریخی، طبیّ، قانونی، زراعتی، تجارتی...... اور دیگر علوم وفنون سکھائے اور ان سب میں تحقیقات وترقیات کا انتظام کرے۔

۳- جامعۂ عثمانیہ کی خصوصیت یہ ہوگی کہ تمام علوم کی تعلیم اُردو زبان میں دی جائے گی۔"

اُردو زبان کی تاریخ ایک عظیم الشان تجربے سے گزری اور جامعۂ عثمانیہ وجود میں آئی۔ جامعۂ عثمانیہ کے شعبہ ہائے فنون حسبِ ذیل (۱) انگریزی۔ انگریزی ادب ہر طالب علم کے لیے لازمی تھا۔ (۲) اُردو۔ اُردو ادب کی تعلیم اختیاری تھی (۳) فارسی (۴) سنسکرت (۵) تلنگی، مرہٹی، کنڑی (۶) معاشیات (۷) تاریخ (۸) فلسفہ (۹) دینیات

تمام سنّی طلبہ کے لیے دینیات لازمی تھی۔ شیعہ اور ہندو طلبہ کے لیے اس کے بجائے اخلاقیات کی تعلیم لازمی قرار دی گئی تھی۔ (۱۰) قانون (۱۱) تجارت (۱۲) جغرافیہ (۱۳) سیاسیات (۱۴) تعلیمات۔

جامعہ کے شعبہ ہائے سائنس حسبِ ذیل تھے۔

(۱) ریاضی (۲) طبیعات (۳) کیمیا (۴) حیاتیات (۵) نباتیات (۶) حیوانیات (۷) معدنیات (۸) علاجِ حیوانات (۹) زراعت (۱۰) انجینئری (الف) سول انجینئری (ب) میکانیکل انجینئری (ج) الیکٹریکل انجینئری (۱۱) طب (الف) عضویات (ب) تشریح الابدان (ج) علم الادویہ (د) علمِ تشخیصِ امراض (ہ) طب (د) جراحت (ز) زچگی وامراضِ مستورات (م) امراضِ چشم۔

تو یہ تھی جامعۂ عثمانیہ۔ حقیقتوں کی ایک حقیقت جو انسانوں کا ایک افسانہ بن گئی۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے، ہمارے اُداس ہوتے ہوتے، ہمارے پچھتاتے پچھتاتے۔ بدھ مت کی درس گاہِ اعلیٰ، درس گاہِ نالندا تاریخ کی پلکیں جھپکتے ہوئے برہمنوں کے ہاتھوں ایک کھنڈر بن گئی۔

اے نالندا! میں نے بغداد اور بخارا، قاہرہ اور قرطبہ اور حلب میں تیری یاد کو سلام کیا۔ میں نے ملتان، منصورے، لاہور، دلّی اور لکھنؤ میں تجھے کورنش پیش کی۔ اے نالندا میں پڑھانے والو اور پڑھنے والو! اے مہانو اور گیانیو! تم کس طرح وقت کی دُھول بن گئے۔

تلک الایام نداولھا بین الناس

اور یہ کہ اے جامعۂ عثمانیہ! اور یہ کہ کچھ بھی نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔

جون ایلیا! تجھے گریہ کرنا چاہیے اور اتنا...... اتنا کہ آنکھیں جواب دے جائیں اور پلکیں گر جائیں۔ مگر مجھے کیوں گریہ کرنا چاہیے۔ آخر کیوں؟ میں تاریخ کا کوئی نوکر ہوں۔ میں تہذیب کا کوئی چاکر ہوں۔ لوگو! مجھے بتاؤ کہ آخر میں کیوں گریہ کروں؟ تمھاری پھوہڑ تاریخ کے پھوہڑ فیصلوں کا بھگتان میں کیوں بھگتوں؟ لوگو! آخر کیوں...... آخر کیوں؟

نشیان کے تین سوال

ایک نوجوان ہے نشیان۔ اسے آپ میں سے ہزاروں لوگ جانتے ہوں گے' وہ میرا ہم زاد ہے۔ نشیان لفظ اور معنی میں جیتا ہے اور لفظ اور معنی میں مرتا ہے۔ میں نے یونانی خدّ وخال اور اُلجھے ہوئے بڑے بڑے بالوں والے اس نوجوان کو کبھی خوش نہیں دیکھا۔

''خوش نہیں دیکھا؟ جون ایلیا! یہ تم نے کیا کہا؟ یہ کہو کہ میں نے اسے ہمیشہ طیش کی یا عذاب زدگی کی حالت میں دیکھا''۔

ہاں! مجھے یہی کہنا چاہیے تھا' مجھ سے غلطی ہوئی' خیر! آج کل موصوف میرے پاس آئے ہوئے ہیں۔ جب وہ آتے ہیں تو کچھ ایسا ہوتا ہے جیسے میں اپنے آپ میں آ گیا ہوں۔ جناب نشیان ایک خداداد گھر میں رہتے ہیں' جو اماروہ بستی سے قدرے دُور شمال مغرب میں واقع ہے۔ یہاں گھر کے لفظ کی تشریح نامناسب نہ ہوگی۔ اپنے گردوپیش میں کسی قدر گھر جیسا یہ ایک ہی ''واقعہ'' ہے جو مسلسل پیش آ رہا ہے۔ اس کے چاروں طرف کھنڈر ہیں۔ جناب نشیان کو اپنے اس ''صحرائی محل'' کا گردوپیش بہت پسند ہے۔ آں جناب روزانہ صبح وشام اس گردوپیش میں گھومتے ہیں اور جھومتے ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یہ کھنڈر یونانیوں کے زمانے کی یادگار ہیں۔ میرے اور نشیان کے دراز مُو' انبوہ ریش اور دانش مند بزرگ چچا (دیمقراطیس) نے حافظے میں محفوظ رکھنے کے لیے اکثر فرمایا ہے: ''فرزندو! سُنو کہ اماروہ بستی کے مغرب میں مغیلاں کے پیڑوں کے خاتمے پر پتھروں کا سات ہاتھ کا شکستہ اور کم نمود سا جو اُبھار ہے' وہ سیلوکس یونانی کی قبر ہے''۔

چچا دیمقراطیس نے ہمیں اور بھی بہت سی باتیں بتائی ہیں جو ہم نے لکھ لی ہیں۔ گویا معلومات اور نکات کا ایک بیش بہا خزینہ ہے، جو ہم دونوں کو عطا فرمایا گیا ہے تا کہ ہم ان جواہر پاروں کو رولیں اور تولیں۔ امارودہ بستی کے چرواہے بریر کا بیان ہے کہ چچا گزشتہ طوفان کے زمانے میں اکانوے برس کے ہو چکے تھے۔ خدا چچا کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم اور ان کی عاطفت اور شفقت دائم رکھے۔

''تذکرہ ہو رہا تھا نشیان کا، یہ دُم چھلا کہاں سے آ گیا؟'' میں اپنے آپ سے بولتا ہوں۔

''دُم چھلا، یعنی چچا دیمقراطیس کا تذکرہ! جون ایلیا یہ کیا بے ہودگی ہے۔ چچا دیمقراطیس کا تذکرہ نشیان کے تذکرے کا دُم چھلا ہے! شرم نہیں آئی تمھیں یہ کہتے ہوئے؟ بھاڑ میں جاؤ تم اور تمھارا یونانی خدّ وخال اور اُلجھے ہوئے بالوں والا نشیان''۔

چلو چھوڑو معاف کر دو۔ تمھیں کڑاڑوں سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں۔ سچ مچ میں بہت شرمندہ ہوں۔ چچا کی کیا بات ہے۔ وہ تو سراپا دانش ہیں۔ تو اب نشیان کا ذکر شروع کرتے ہیں، جب وہ میرے پاس آ کر ٹھہرتا ہے تو ہم دونوں ایک ہی بستر پر سوتے ہیں، ایک ہی رکابی میں کھاتے ہیں اور ایک ہی کٹورے میں پیتے ہیں۔ ہم دونوں صبح کو ایک ہی ساتھ گھر سے نکلتے ہیں۔ دن بھر ایک ہی ساتھ رہتے ہیں۔ معاملوں اور مسئلوں سے ایک ہی ساتھ اُلجھتے ہیں، ایک ہی ساتھ جھلاتے ہیں اور پھر شہر اور شہریوں سے تھک کر ایک ہی ساتھ گھر پلٹتے ہیں۔

اس وقت میں اور نشیان ایک بیزار شام بھٹک رہے ہیں۔ نشیان نے آج کچھ شعر کہے ہیں، جن میں سے تین کا مفہوم یہ ہے:

''میرے دل میں شام کا آزار آ ٹھہرا ہے، پر نہ جانے دنیا میں آج کیا ٹھہری؟''

''رات ہم آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے، وہ صرف عرضِ سخن ہی کی مجلس تھی۔ آخر میں یہ بات ٹھہری کہ جو کچھ کہا گیا، وہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے''

''سب کے راستے جُدا جُدا تھے' آخر سب کا ایک ہی راستہ ٹھہرا''۔

میرے ہم زاد نشیان نے تین باتیں کہی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ شام کی اذیت میں مبتلا ہے' پر نہیں جانتا کہ دوسرے بھی اس کی اس اذیت میں اس کے ساتھ ہیں یا نہیں؟ دوسری بات یہ کہی ہے کہ جو بات بھی کہی جا رہی ہے وہ پہلے ہی کہی جا چکی ہے (اور ایسا ہے بھی) تیسری بات جو اس نے کہی ہے' وہ یہ ہے کہ ہم زندگی بھر اپنے اپنے راستے پر چلتے رہتے ہیں' پر ہمیں زندگی کے آخری لمحے میں اس سچائی کا تجربہ ہوتا ہے کہ ہم سب جو الگ الگ سمتوں میں چلے جا رہے تھے' آخرکار ہمیں ایک ہی سمت کا رُخ کرنا تھا۔

میں یہ کہتا ہوں کہ آخر میں سمجھ میں آنے والی یہ بات اگر شروع ہی میں جان لی جائے تو پھر مجھ میں اور اس شخص میں جو میری ہر بات کو غلط جانتا ہے' بھلا کیا جھگڑا باقی رہے گا۔ ہم کس بات کے حق میں دلیل دیں گے اور کس بات کے خلاف دلیل سُنیں گے اور ہاں' اگر ہم سوچنے کی طرح سوچیں تو ہمارے حریف کی دلیل کسی طرح بھی ہماری دلیل سے کم مضبوط نہیں ہے اور ہماری دلیل بھی کسی طرح ہمارے حریف کی دلیل سے کم مضبوط نہیں۔ وہ بھی اس منطق کا ماہر ہے جس کے ہم اور ہم بھی اس منطق کے ماہر ہیں جس کا وہ۔ اے عزیز! بات یہ ہے کہ سارے جھگڑے عقیدوں' مسلکوں اور مشربوں کے سارے جھگڑے' دو دلیلوں کے باہمی جھگڑے ہیں' جو زید اور بکر پیش کرتے ہیں۔ زید' بکر کے یقین کو غلط گردانتا ہے اور بکر' زید کے یقین کو۔ نتیجہ کیا نکلا؟ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں کا یقین دوطرفہ طور پر غلط ہے یا پھر یہ ہے کہ زید کا یقین بھی درست ہے اور بکر کا بھی۔ میرے دوستو! تمھارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ آخر میں میری یہ بات ضرور یاد رکھنا کہ میں عقیدوں' مسلکوں اور مشربوں کے جھگڑے کو ایک ٹھٹول اور مخول گردانتا ہوں۔ زید ہو یا بکر' اُن میں سے کوئی بھی عقل و ہوش کی حالت میں یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ حقیقت اور صداقت کا سارا سرمایہ اسی کی جیب میں ہے۔ اگر تم دونوں ایسی کوئی بات کہتے ہو تو میں تمھیں ''تلقین'' کی عبارت یاد دلاؤں گا جو ایک گروہ میں تدفین کے وقت پڑھی جاتی ہے۔

''اے فلاں ابنِ فلاں! سُن اور سمجھ! جب تیرے پاس دو مقرب فرشتے آئیں......''

اب میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تمھیں تمھارے خدا، تمھارے رسول، تمھارے مسیح، تمھارے بھگوان اور تمھارے اوتاروں کی قسم! بتاؤ کہ کیا تم زندگی بھر سُننے کی طرح سُنتے اور سمجھنے کی طرح سمجھتے ہو؟ کیا تم میں کوئی ایسا شخص ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ میں نے زندگی بھر سُننے کی طرح سُنا اور سمجھنے کی طرح سمجھا۔ بس اے دوستو! آج مجھے تم سے یہی کہنا تھا اور اپنے ہم زاد شیان کی یاد دلانا تھی۔ یہ امر بے مصلحت نہیں ہے اور پھر یہ کہ خود شیان مصلحتوں کی ایک مصلحت ہے۔ وہ آیندہ مقامِ بیان و بلاغ میں قیام کرے گا اور سُننے والوں کے کشکول، دانش سے بھرے گا۔

سسپنس ڈائجسٹ، دسمبر 1993

وقت

یہ سال کے آخری مہینے کی ایک پُراحساس اور معنی طلب شام ہے جو ایک صحرائی مکان، خرابہ نما مکان کی فضا پر طاری اور اس کے گوشے گوشے میں ساری ہے۔ مکان کی پچھلی گہ کی درمیانی الماری کے آگے ایک تخت بچھا ہوا ہے اور اس پر تین گلیم پوش بیٹھے ہوئے حالتِ کلام میں مستغرق ہیں۔ ان میں سے سن رسیدہ، درازمُو اور انبوہِ ریش متنفّس کا نام دیمقراطیس ہے، سراپا دانش دیمقراطیس۔ دوسرے متنفّس کو جون ایلیا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور تیسرا متنفّس یونانی خدّ وخال اور اُلجھے ہوئے بڑے بڑے بالوں والا پُرحال، گفتارمست نشیان ہے، جون ایلیا کا ازلی ہم زاد نشیان۔

آج نشیان کی سال گرہ کا دن ہے، سو آج اس پر وقت کا، زمان کا احساس ایک عجب حالت انگیزی کے ساتھ طاری ہے۔ یوں بھی ان تینوں کو وقت کی گزر کا احساس عجب خیال پرور حالتوں سے دوچار رکھتا ہے۔

''نشیان! سال کا آخری مہینا ہے اور پھر یہ کہ آج تمھاری سال گرہ کا دن ہے اور آج کے دن اور آج کی تاریخ کی مناسبت سے تم حسبِ سابق سیاہ لباس پہنے ہوئے ہو، سو کسی بھی عذر کے بغیر تم وقت کے بارے میں کلام جاری کرو۔ اور ہاں آج میرے حصّے کی سخن گزاری کا فرض بھی تمھیں کو انجام دینا ہے۔ میرے ہم زاد! تمھیں کو''۔ میں نے یعنی جون ایلیا نے نشیان سے کہا۔

''ہاں اے فرزند! آج تو تمھاری ہی شامِ کلام ہے۔ معنی کو ملفوظ کی ترازو میں تولو، اپنی عادت کے موافق کسی بناؤ کے بغیر بولو اور بات کی گرہ کو کھولو!'' عمِ عالی مرتبت

جناب دیمقراطیس نے ایک عجب مان اور فرمان کے انداز میں فرمایا۔

نشیان نے میرے دائیں ہاتھ کو چوما' اپنے دائیں ہاتھ سے عمّو دیمقراطیس کے گھٹنے کو چھوا اور پھر اپنی ہتھیلی کو آنکھوں سے لگایا۔ چند لمحوں تک ایک گفتار آگیں سکوت کی سی کیفیت طاری رہی اور پھر وہ گویا ہوا' اس طرح کہ جیسے وہاں نہ کوئی مخاطِب ہو اور نہ کوئی مخاطَب۔

''ایک حال کا اختتام ہو رہا ہے۔ ایک سال تمام ہو رہا ہے' جب کہ کسی بھی امر کا اختتام نہیں ہو رہا۔ کچھ بھی تو نہیں تمام ہو رہا۔ وجود میں نہ کوئی اختتام ہے اور نہ کوئی تمام۔ نہ آغاز کے طور کا کوئی آغاز ہے اور نہ انجام کے طور کا کوئی انجام۔ ایک ازلی اور ابدی ''ہست'' ہے۔ ایک دائم اور سرمدی ''ہے'' جو ہے''۔ یہ کہہ کر اُس نے ایک خاص انداز سے عمّو کو اور ایک دوسرے انداز سے مجھے دیکھا' پھر اپنی آنکھیں میچ کر کلام کو جاری کیا اور اپنے معنی کی حالت کو گرد و پیش پر طاری کیا۔

''پر ہم اس ازلی اور ابدی ''ہست'' اور اس دائم اور سرمدی ''ہے'' کی طرف کوئی اشارہ نہیں کر سکتے''۔ یہ کہہ کر وہ چند ثانیوں کے لیے تھما اور پھر بیان اور بلاغ کے عالم میں جما۔

''زمان کا معاملہ تین حال سے خالی نہیں ہے۔ یعنی اس کے ساتھ گمان کے تین ہی طور برتے جا سکتے ہیں اور وہ طور ہیں ماضی' حال اور مستقبل۔ ماضی وہ طور ہے جس کی کوئی بُود نہیں ہے۔ مستقبل وہ طور ہے جس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اگر وہ موجود ہو تو حال کہلائے اور رہا حال تو اگر وہ موجود ہو تو اس کی طرف اشارہ کیا جا سکے گا اور اگر اُس کی طرف اشارہ کیا جا سکے گا تو وہ اشارے سے پہلے موجود ہو گا۔ اور جو اشارے سے پہلے موجود ہو' وہ حال نہیں ہو سکتا''۔

''زمان کا احساس نفس کا ایک عجیب پُر طور ایک عجیب بے طور احساس ہے اور اس احساس کے ساتھ نفس کی صرف وہی حالت کوئی کیفیت پرداز معاملت کر سکتی ہے' جس کا سروکار شاعری یا تخیّل کے کسی تاثر آگیں رگ و ریشہ سے ہو۔ بہ ہر حال۔''

''گزشتہ دوڈھائی ہزار برس کے دوران فلسفیوں اور مفکّروں نے زمان کے بارے میں وہ سب کچھ کہا ہے جو پوری معقولیت اور سخت غیر معقولیت کی حالت میں کہا جا سکتا تھا۔ مثلاً''۔ یہ کہہ کر اُس نے عمو دیمقراطیس کو موّدبانہ انداز سے دیکھا۔ جیسے وہ انھیں آموختہ سُنا رہا ہو۔ اور قدرے توقف کے بعد دوبارہ لب کشا ہوا:

۱- مثلاً زمان پیوستہ اور پے در پے آنات (آن کی جمع) کا نام ہے۔

۲- زمان تغیّرات کی مدّت کے ہم مفہوم ہے۔

۳- ہر حادث ایک امتداد رکھتا ہے' جس سے اندازہ قائم کیا جاتا ہے اور وہ امتداد ہی زمان ہے۔

۴- زمان قرار ناپذیر ہیئتوں کا اِسم ہے۔ زمان کی یہ تعریف شیخ بوعلی سینا کی عطا ہے۔ انھوں نے زمان کے بارے میں اس کے سوا کچھ اور بھی فرمایا ہے۔

۵- زمان' مطلق حرکت ہے۔

۶- زمان وجود کا اندازہ یا اُس کی مقدار ہے۔

۷- زمان ایک ازلی' سرمدی اور واجب الوجود جوہر ہے۔

۸- زمان حرکت کی مقدار سے عبارت ہے۔ قدیم فلسفیوں میں زمان کی یہ تعریف سب سے زیادہ معتبر اور مقبول رہی ہے۔

۹- متغیّر سے متغیّر کی باہمی نسبت کا نام زمان ہے۔

۱۰- زمان ایک موہوم شے ہے (یہ بھی کہا گیا ہے کہ زمان کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا)۔

۱۱- نیوٹن نے زمان کے بارے میں ایک عام آدمی کی سی بات کہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زمان خارجی اشیا سے یک سر لاتعلق کے ساتھ بہہ رہا ہے اور اس کی رفتار غیر متبدل ہے۔

۱۲- آئن سٹائن نے زمان کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے' وہ تعریفِ اشیا کی تاریخ میں ایک یادگار واقعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ کائنات چار بُعدی ہے۔ اس کے تین بُعد مکانی ہیں اور چوتھا بعد زمان ہے۔ یہ بات شاید یوں بھی کہی جا سکتی ہے

کہ مکان زمان میں ساری ہے اور زمان مکان میں اور یہ ہے وہ حقیقت جسے ''زماں مکاں'' کہتے ہیں۔ ہر شخص اور ہر شے کا اپنا ذاتی وقت ہے، یعنی مطلق اور کائناتی وقت کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا۔

''اب میں زمان کے بارے میں شاعرانہ انفعال، تخلیقی انفعال کی نسبت سے ایک غیر مربوط سلسلۂ کلام جاری کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ زمان نفس کے اپنے وجود کی کیفیت اور اس کیفیت کے استمرار کے متصل، یک سر غیر منفعل ادراک اور اس ادراک اور غیر نفس یا ماورائے نفس سے اس ادراک کی ایک سیّال اضافت کا وقوعہ ہے، کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری وقوعہ۔ یہ تو ہوئی ایک بات، یہاں مجھے ایک اور بات بھی کہنا ہے اور وہ یہ کہ زمان فکر کا ایک قالب ہے، ایک قالب یا صورت گر (صورت اپنے منطقی مفہوم میں) اس وقت میرے ذہن میں ایک اور بات بھی آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ زمان نفسِ مُدرکہ کے احساسِ استمرار کا ایک جبلی انفعال ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ زمان نفس اور خارجِ نفس کی ایک ایسی نسبت کا اِسم ہے جو مختلف اشیا اور احوال کے وجود کے درمیان ایک ربط، ایک واضح یا مبہم ربط کی کیفیت سازی کرتی ہے۔ اور اس کیفیت سازی کو ایک تخلیقی عمل کا مرتبہ حاصل ہے۔''

''اب مجھے کچھ قرینے کی بات کرنا چاہیے۔ نیا سال شروع ہو رہا ہے اور ہم سال ہا سال کے حرماں نصیب ہر نئے سال سے کچھ جاں پرور اُمیدیں رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یہ جاننے کی خواہش ہے کہ ہمارے صاحبانِ امر وقدر، اس ملک کے کروڑوں انسانوں کے سب سے زیادہ سنگین مسئلوں کے ساتھ کس طرح پیش آئیں گے۔ ہم ہر نئے سال کے آغاز پر کچھ اُمیدوں کی پرورش کرتے ہیں، پر ہوتا یہ ہے کہ ان اُمیدوں کو مختلف قسطوں میں ہلاک کر دیا جاتا ہے''۔ نشیان یہ کہہ کر خاموش ہوا ہی تھا کہ عمو دیمقراطیس نے اس کی پیشانی چومی اور میں نے اسے گلے لگالیا۔

سسپنس ڈائجسٹ جنوری 1994

تاریخ کا شعور

شام ہے اور اُلجھے ہوئے لمبے لمبے بال اور یونانی خدّ و خال رکھنے والا جواں سال دانش ور نشیان مصروفِ کلام ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے رہ نما، دانش سے بیزار اور بے دانشی کے جانب دار ہیں۔ بے حسی ان کا شعار ہے۔ انھیں اپنے لوگوں کے معاملوں اور مسئلوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ان کے دلوں میں کسی بھی قدر کا کوئی احساس نہیں پایا جاتا۔ ان کے نزدیک بس ایک ہی امر کو قدرِ اعلیٰ کا درجہ حاصل ہے اور وہ قدرِ اعلیٰ اقتدار ہے۔ انسان نے گزشتہ پانچ چھ ہزار برس میں دانش کا جو سرمایہ اکٹھا کیا ہے، وہ ان کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ تاریخ کے شریف اور دانش مند لوگوں نے انسان کی فلاح و بہبود کے جو نسخے تجویز کیے ہیں، اُن رہ نماؤں کی نظر میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ ان کے خیال میں سب سے بڑی فضیلت طاقت ہے اور سب سے بڑی دولت حاکمانہ مرتبت۔ اپنے عوام کو پے در پے فریب دینا، ان کا سب سے بڑا ہنر ہے۔ میں گمان کرتا ہوں کہ سیاست اور ریاست کی تاریخ اسی ہنر کی کرشمہ کاریوں کی رُوداد ہے۔ میں تاریخ کو بااقتدار انسان دشمنوں کا سیاہ اعمال نامہ قرار دیتا ہوں۔

بابل، مصر، عیلام، ایران، ہندوستان اور چین کی تاریخ کے صاحبانِ امر و قدر کون تھے، وہ کون تھے جن کے قصیدے پڑھنا زبان و بیان کے سب سے مقدّس فریضے اور سب سے مفید فن کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ انسانوں کے انسان نما قاتل تھے، عالی شان اور پُر جلال قاتل۔

اب تک قوموں اور قرنوں کی جس تاریخ' سرکاری تاریخ کا سلسلہ چلتا رہا وہ شر کی تاریخ تھی۔ رہی خیر کی تاریخ تو اسے بڑی مستعدی اور مہارت کے ساتھ چھپانے کی کوشش کی گئی۔ ہمیں کج کلاہوں کے کارنامے سُنائے جاتے رہے اور حکمت پناہوں کا ذکر کیا بھی گیا تو بس بات ٹالنے کے لیے۔

اب تیغ و تخت کی تاریخ کے جلال کا زمانہ گزر چکا ہے۔ یہ زمانہ قرطاس و قلم کی تاریخ کے اقبال کا زمانہ ہے۔ اس زمانے کے صاحبانِ امر و قدر کو ایک یک سر مختلف فضا میں سانس لینے کی عادت ڈالنا پڑے گی۔ انھیں یہ حقیقت ماننا پڑے گی کہ خواص کا زمانہ ایک بیزار کُن افسانہ بن چکا ہے۔ یہ زمانہ عوام کا زمانہ ہے' خداؤں اور خداوندگاروں کا زمانہ نہیں ہے۔ یہ کہہ کر نشیان نے ایک عربی نظم سُنائی جس کا ترجمہ یہ ہے:

"مجھے پُرتمکنت اور پُرجلال ظالموں کے قصے مت سُناؤ
میں تو اذیت زدہ اور ستم رسیدہ غلاموں
اور ان مشقت اور محرومیوں کی رُوداد سُننا چاہتا ہوں
مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں
کوئی بھی سروکار نہیں کہ اہرام بنوانے والے کون تھے
میں اور میرے ساتھی تو یہ بات جاننے کی خواہش رکھتے ہیں
کہ اہرام بنانے والے معماروں اور مزدوروں پر تیرہ نصیب
مزدوروں پر صبح سے شام تک کیا گزرتی تھی
مجھے آقاؤں کے بیش قیمت اور تاب دار نگینوں سے
کوئی واسطہ نہیں ہے' مجھے ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے
میں تو غلام معماروں اور مزدوروں کے پسینے کی سرگزشت سُننا
چاہتا ہوں۔"

نشیان نظم سُنانے کے بعد چند لمحوں کے لیے رُکا اور پھر یوں گویا ہوا کہ یہ دنیا معاشروں کے چند منتخب لوگوں کے لیے وجود میں نہیں آئی۔ مٹی' پانی' ہوا اور آگ' معاشرے کے خواص

کی ملکیت نہیں ہیں اور یہ ہی فطرت کا فیصلہ ہے۔ جن معاشروں میں خواص اور عوام کی تفریق پائی جاتی ہے وہ معاشرے غیر فطری معاشرے ہیں۔ اور ہم ان ہی بے ہودہ معاشروں میں زندگی گزار رہے ہیں مگر جان لینا چاہیے کہ یہ غیر فطری معاشرے اپنی تباہی کے قریب پہنچ چکے ہیں۔

اس نے کہا کہ تاریخ کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کی جانی چاہیے اور کُھلی آنکھوں کے ساتھ یہ دیکھنا چاہیے کہ تاریخ کا رُخ کدھر ہے۔ ہم دیویوں' دیوتاؤں اور پروہتوں سے ٹھٹول کر سکتے ہیں' لیکن ذوالجلال تاریخ کے ساتھ کوئی ٹھٹول نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے ٹھٹول کرنا جیتے جی مرنا ہے۔ بعض معاشروں میں تاریخ سے ٹھٹول کرنے اور حقیقتوں سے چلبلے پن کے ساتھ پیش آنے کی کچھ زیادہ ہی دھت پائی جاتی تھی مگر قوموں اور قرنوں کے رُوداد نگار ہمیں بتاتے ہیں کہ ان کا حشر کیا ہوا؟

نشیان نے عموّدیمقراطیس کے گُھٹنوں کو چُھو کر اور میرے ہاتھ کو بوسہ دے کر کہا کہ میں ایک بہت پیچیدہ بات کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جو معاشرے تاریخ سے روگردانی اختیار کرتے ہیں' ان کی رُوگردانی بھی ایک خاص معنی میں تاریخ ہی کا جبر ہوتی ہے۔ تم جو کچھ بھی کرتے ہو وہ تم نہیں کرتے۔ تم نے جو بھی لڑائی جیتی' وہ تاریخ ہی کی مشیّت کا نتیجہ ہے۔ تم نے جو بھی لڑائی ہاری' وہ تاریخ کے ایما ہی پر ہاری۔ میری یہ بات یک سر بے معنی بھی ہے اور پُر معنی بھی۔ تاریخ ایک جبر ہے' ایک بے زنہار اور قہار جبر اور اس جبر سے نہ کوئی فرد آزاد ہے اور نہ کوئی قوم ...... یہاں میں یہ بات دُہرا دوں کہ میری یہ بات بیک وقت یک سر بے معنی بھی ہے اور پُر معنی بھی۔ میں یہ نکتہ کیسے بیان نہ کروں کہ ہم متضاد حقیقتوں کے درمیان زندگی گزارتے ہیں۔ چیزیں بیک وقت یک سر بے معنی بھی ہوتی ہیں اور پُر معنی بھی۔

آخر میں جو حقیقت سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہے' وہ یہ ہے کہ وہی قومیں تاریخ کے اس جبر کی اسیر ہوتی ہیں' جو تاریخ کے مزاج سے' اس کی منشا سے اور اس کی مشیّت سے ناواقف اور تاریخ کے شعور سے محروم ہوں۔ میں نے تاریخ کے شعور کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ کا

شعور ہی تاریخ کے جبر سے نجات حاصل کرنے کا اِسم ہے' اسمِ اعظم ہے۔ اگر ہمارے لوگ اس اِسم سے' اس اسمِ اعظم سے توسّل حاصل کر لیں تو نجات ان کا مقسوم ٹھہرے گی۔ نشیان نے اپنے جملے کو دُہرایا اور بڑے ادب کے ساتھ عموّدیمقراطیس کی طرف دیکھا اور احترام اور تعظیم کے ساتھ نظریں جُھکا لیں۔ اس کے بعد اُس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور پھر میری پیشانی کو بوسہ دیا۔

سسپنس ڈائجسٹ' فروری 1994

مرثیۂ شہرِ کراچی

یہ ایک ناخوش گوار شام ہے' اپنی پوری فضا کے ساتھ ایک ناخوش گوار شام' بدحال اُمیدوں کا ابہام۔ ہوا عبث کی فضا میں بہہ رہی ہے۔ میں' پُرطور صاحبِ قلم معراج رسول' شیوا بیاں شاعر جمالؔ احسانی اور میرا ہم زاد بے کیفی میں سانس لے رہے ہیں اور شہروں کے شہر کراچی کا دُکھڑا رو رہے ہیں۔ معراج رسول کی خواہش ہے کہ میں بے کیفی کی ان ساعتوں کو رقم کروں۔

جمالؔ احسانی کے سوا ہم تینوں کراچی میں پیدا نہیں ہوئے۔ ہم یہاں سرحد پار سے آئے تھے مگر ہم تینوں نے اپنی زندگی کے بدترین اور بہترین ماہ و سال اسی شہر میں بسر کیے ہیں اور اپنی عمر کا زیادہ وقت اسی شہر میں گزارا ہے۔

وقت رشتوں کی پرورش کرتا ہے اور انھیں پروان چڑھاتا ہے۔ سو وقت نے معراج رسول' میرے ہم زاد اور میرے اور اس شہر کے رشتے کی پرورش کی اور اسے پروان چڑھایا۔ ورنہ ہے یوں کہ کراچی اور اس جیسے کسی بھی شہر' مثلاً بمبئی اور کلکتے سے ہم تینوں کا مزاج ذرا بھی میل نہیں کھاتا۔ ہمارا مزاج تو دلّی' لکھنؤ' لاہور اور ملتان جیسے شہروں کی ساخت اور پرداخت سے ملتا ہے۔

یہاں میں اپنا معاملہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے کراچی اور بمبئی جیسے مغربی ساخت کے شہروں ہی کو پسند کرنا ہوتا تو پھر میں اس ساخت کے جدید ترین اور اعلیٰ نمونوں یعنی مغرب کے شہروں کو پسند کرتا جن کی فضا میری آزادخیالی کے حق میں بے حد سازگار ہے اور جہاں مجھے اپنے طور اور طبیعت کے لحاظ سے بہترین سہولتیں میسّر آتی ہیں۔

ہے یوں کہ مسئلہ تاریخ کا ہے' معراج رسول' میرے ہم زاد اور میری ذات کا نہیں۔ ہمارے تاریخی وجود کی ساخت لاہور' ملتان' سکھر اور دلّی اور لکھنؤ کی ہم ساخت ہے۔ اگر ہم تینوں کا وجود کسی شہر کی شکل اختیار کر لے تو وہ شہر لاہور اور دلّی جیسا کوئی شہر ہوگا۔

مگر وہی بات کہ معاملہ وقت کا بھی ہے۔ وقت نے ہم کو اور کراچی کو اُنس کے ایک استوار رشتے سے باندھ دیا ہے۔ میں اپنی رُوداد بیان کرتا ہوں۔ کراچی کے کئی کوچے اور ان کے پیچ وخم میرے قدموں کی چاپ کو خوب پہچانتے ہیں اور میری آمد ورفت کی مزاج پرسی کرتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے کوچے اور خم بھی ہیں جن سے میری بعض دل دار اور دل دوز یادوں کے رشتے کو جُڑے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا ہے۔

ہم نے اس شہر میں اپنی زندگی کے سب سے خوب صورت خواب دیکھے ہیں۔ کیا میرا اور میرے ساتھیوں کا یہ دُکھ کوئی معمولی ہے کہ ہم اس شہر کے برزنوں کو سہا ہوا پاتے ہیں۔ اس کے بازار ہراساں ہیں۔ شامیں تو شامیں اس شہر کی توصبحیں بھی تھکی ہوئی سے دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے چوراہوں پر اُداسی خاک اُڑاتی ہے۔ جسامتوں کا وہ ہجوم جو اس کی شاہ راہوں سے گزرتا ہے اس ہجوم کے بارے میں کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے اگلے لمحے کا کیا مقسوم ہوگا۔ یک سر تباہی یا جاں کاہی؟

اے شہروں کے شہر! تیری رونقیں تیرے حق میں بڑی مہلک نکلیں۔ تیرے سرغنوں کی منصوبہ بندی شروع ہی سے تیرا خسارہ رہی ہے۔ تُو نے تاریخ کی منڈی میں خود کو نظر لگوانے کے لیے جس لگا تارتن دہی سے کام لیا' اس لگا تارتن دہی سے تیرے سوا بھلا اور کون کام لے سکے گا۔ تُو نے جو بھی ہنر دکھایا وہ عیب کے سوا کچھ بھی تو نہیں تھا۔

تیرے باشندوں کی ایک بھیڑ ہے جو اپنے ہونے کی ڈینگیں مارتی ہے' جب کہ اس کا ڈینگیں مارنا ہی اس کا سب سے بڑا زیاں اور سب سے بڑا ضرر ہے۔ اس بھیڑ کے چارہ گروں کی چارہ گری ہی اس کا آزار رہی ہے۔ یہ قصہ کوئی آج کا قصہ نہیں ہے۔ یہ قصہ تو بہت پرانا ہے۔ اگر کچھ لوگ اس قصے کو آج کا قصہ سمجھتے ہیں تو پھر مجھے دیر تک ایک چڑچڑی' چڑچڑی ہی نہیں' ایک زہریلی ہنسی ہنسنے کی رخصت دی جائے۔

تم چالیس پچاس برس کے آزاری نہیں ہو۔ تمھیں اور تمھارے باپ دادا کو تو گھٹی میں آزار پلایا گیا تھا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تم اور تمھارے دادا پردادا کے خاندانی معالج بھی چاہے وہ اپنے وقت کے حکیم بقراط ہوں یا جالینوس، پیدا ہی بیمار ہوئے تھے۔ ایسے بیمار جنھیں پرہیز سے بلا کا بیر تھا۔

میں بد بخت اور میرے بد بخت ساتھی تمھارے بارے میں بس اُداس ہی ہو سکتے ہیں۔ اور اُداسی ہی کو، ایک تاریخی اُداسی ہی کو ہم سب نے دل و جان سے چنا بھی تھا۔ سو، اس پر پچھتانے اور اپنے آپ کو حساس جتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

پرندے جنوب سے شمال کی طرف پرواز کر رہے ہیں اور ہوا بے مہر ہے۔ فضا نامہرباں ہے، اور میں اور ہم، آج شام کے ہم، اُداسی کا، ایک بنجر اور بانجھ اُداسی کا کھاجا ٹھہرے ہیں۔

یہ بات دھیان دے کر سُنی جائے کہ میں ہرگز کسی ایک گروہ کا نسّاب، وقائع نگار اور شاعر نہیں ہوں۔ پر یہاں میں اپنے دل کی ساماں سوختگی کے ساتھ یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ مژدہ رساں تو مژدہ رساں تمھیں تو کوئی مرثیہ خواں بھی نصیب نہ ہوگا۔ مگر یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ میں جو تمھاری افسوس ناک خود آزاریوں اور قدیمی طرفہ کاریوں سے یک سر بے سروکار ہوں، میں ہی تمھارا مرثیہ خواں ہوں، میں ہی تمھارا ریمیاہ ہوں۔ میرے پپوٹے سوج گئے ہیں اور میری آنکھیں سُوکھ گئی ہیں۔ مگر میں کیا، مگر تم کیا۔

سسپنس ڈائجسٹ، جون 1994

بے حاصلی

ملامت وملال کی ایک افسردہ شام ہے۔ دکانیں بند ہیں۔ شہر سنسان ہے۔ راہوں پر ہی نہیں شاہ راہوں پر لڑکے صبح سے کھیل کھیل رہے ہیں، جیسے شاہ راہیں نہ ہوں کھیل کے میدان ہوں۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ لڑکے بہت دانش مند واقع ہوئے ہیں کہ زندگی ان کے خیال میں محض ایک کھیل ہے، جب کہ ان کے بڑے اس کرّۂ ارض کو اور اس کی زندگی کو وجود کی سب سے زیادہ اہم حقیقت سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ کرّہ اس کائنات کا حاصل ہے، یہ بے ہودہ کرّہ بل کہ یہ اربوں کھربوں برس بوڑھی کائنات اس کرّے ہی کی خاطر وجود میں آئی تھی۔ کہکشاؤں کے وجود میں آنے کی غایت یہ تھی کہ اس کرّے کے ایک چوتھائی حصّے کے چند حصّوں میں گیہوں اور گنّے کی فصلیں اُگائی جا سکیں۔

بڑی عمر کے لوگ کتنے سادہ دل ہیں اور ان کے چھوٹے کس قدر باشعور۔ وہ صبح سے لے کر شام تک کی زندگی کو ایک کھیل سمجھتے ہیں اور جی لگا کر کھیلتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ صبح سے لے کر شام تک کی زندگی، زندگی کا ایک ایک لمحہ اگر ایک کھیل نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

ملامت اور ملال کی اس افسردہ شام میں میرا ہم زاد نشیان، بے دلی اور بیزاری میں محوِ کلام ہے۔ بے دلی اور بیزاری، یہ کیفیتیں اب اس کا مزاج بن گئی ہیں اور اس کا ہی کیا، اب تو یہ کیفیتیں بہت کم لوگوں کو چھوڑ کر سب ہی کا مزاج ٹھہری ہیں۔ بے دلی اور بیزاری، یہ دونوں کیفیتیں اس دور کا مقسوم ہیں۔ اور جو کچھ ہے وہ یہی ہے۔

نشیان کا بھی عجب حال ہے۔ وہ کبھی تو دیوتا بن جاتا ہے اور کبھی دیو اور کبھی بونا۔ اس وقت وہ ایک بونا بنا ہوا ہے۔ اور وجود کے ایک بہت چھوٹے گھیرے میں سوچ رہا ہے۔

بہ ہر حال وہ اس وقت جو کچھ کہہ رہا ہے' وہ اس قابل ضرور ہے کہ اسے سُنا جائے۔

''اِن دنوں پہلے سے کچھ زیادہ ہی یہ بات سُننے میں آتی ہے کہ پاکستان غلط بنا تھا اور یہ بات بہت ہی روح فرسا بات ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی خاص گروہ کے کچھ لوگ ہی یہ بات کہتے ہوں۔ یہ بات پاکستان کے مختلف گروہوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی زبان سے سُنی جاتی ہے۔ ہاں یہ ایک ہمت افزا بات ہے کہ لوگوں کی اکثریت اس طرح نہیں سوچتی۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ بات پوری سنجیدگی کے ساتھ سوچنے کی بات ہے کہ کچھ لوگ بھی اس طرح کیوں سوچتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جس کے کچھ لوگ یہ کہتے ہوں کہ ہمارا ملک غلط بنا تھا۔ اور یہ کہ یہ ملک تاریخ کا ایک اسقاط ہے۔ پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے' جس کا وجود ہی اس کے باشندوں کے درمیان زیرِ بحث رہتا ہے' جب کہ اس ملک کے وجود میں آنے سے بہت سوں کا بھلا ہوا ہے۔ یہ بات بھلا کیسے کہی اور سُنی جا سکتی ہے کہ لوگ پاکستان بننے سے پہلے زیادہ اچھی زندگی گزارتے تھے اور پاکستان بننے کے بعد وہ بہت بُری زندگی گزار رہے ہیں''۔

نشیان کا کہنا ہے کہ اصل بات کچھ اور ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں نے آزادی سے جو اُمیدیں وابستہ کی تھیں' وہ پوری نہیں ہوئیں۔ حالات بدلے اور بہتر ہوئے مگر انھیں اس سے کہیں زیادہ بہتر ہونا چاہیے تھا۔

جنگِ عظیم کے بعد برِّصغیر کے علاوہ جو اور ملک آزاد ہوئے' خاص طور پر مشرقِ بعید کے ملک' وہ پاکستان اور ہندوستان کے مقابلے میں جنت ہیں اور ان کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستان اور ہندوستان بیسویں صدی کے تاریخی جہنموں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم نے چند سال پہلے تک مشرق کے جن ملکوں کا نام تک نہیں سُنا تھا' ان پر پاکستان اور ہندوستان تو کیا مغرب کے بعض ملک تک رشک کرتے ہیں اور پاکستان اور ہندوستان صرف اس بات پر نازاں ہیں کہ ہم تاریخ کی قدیم ترین تہذیبوں کے وارثوں میں سے ہیں۔ رُسوا کُن حد تک پس ماندہ' الم ناک حد تک مفلس' شرم ناک حد تک جاہل' بہیمانہ حد تک بے حس' اور اشتعال انگیز حد تک متعصب ہوتے ہوئے تاریخ کی قدیم ترین تہذیبوں کے وارثوں کی فہرست

میں مندرج ہونا کیا ہمیں ایسے مجرموں کی قطار میں کھڑا کرنے کا مستوجب قرار نہیں دیتا جن کی سزا ایک ایسی جاں کنی ہو جس کی مدّت کو دراز سے دراز تر ہونا چاہیے۔

''تم جو تاریخ کی قدیم تہذیب کے وارث ہونے پر نازاں ہو' تو سُنو یہ تمھاری بے حیائی ہے' بے حیائی اور جہل۔ کیا تمھاری قدیم تہذیب مصر اور بابل کی تہذیبوں سے زیادہ عالی شان تھی؟ کیا تمھاری قدیم تہذیب نے انسانی دانست اور دانش کو اتنا پُر مایہ کیا جتنا پُر مایہ مصر اور بابل کی تہذیبوں نے کیا؟ یہ باتیں یک سر فضول اور فالتو باتیں ہیں کہ ہمارے فلاں شہر کے ایک نواحی علاقے کی کھدائی میں بارہ ہزار برس پہلے کی کنگھیاں' سرمے دانیاں اور پتھر کے ہار برآمد ہوئے ہیں''۔ نشیان نے ایک کڑوے لہجے میں کہا۔

''میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے چاہے تمھاری سرزمین کے نام تک کو بھی کوئی نہ جانتا ہو' مگر اس کے بعد چھیالیس' سینتالیس برس کا جو دور گزرا' اس میں تم نے کم سے کم انسانوں کی طرح زندگی گزارنا سیکھ لیا ہوتا' جو نہیں سیکھا۔ اسی لیے بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان غلط آزاد ہوا اور پاکستان غلط بنا'' یہ کہہ کر نشیان کھانسنے لگا۔ پھر اس نے ایک بے طوری کے ساتھ مجھے دیکھا اور بولا کہ بڑی بے حاصلی ہے۔

سسپنس ڈائجسٹ' نومبر 1994

اٹکل

ایک مغرب رُو یہ مکان، شام اور میں۔ میں برآمدے کی اُوپر کی سیڑھی پر بیٹھا ہوں، یعنی یہ کہ بس بیٹھا ہوں اور بیٹھا ہوں۔

''یعنی یہ کہ بس بیٹھے ہو اور بیٹھے ہو! مگر آخر کیوں؟''

''مگر آخر کیوں! یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ بس یوں ہی۔ ہوا کیوں چل رہی ہے؟ فضا میں تیرتے ہوئے اَبر پاروں کی مختلف شکلیں کیوں بَن اور بگڑ رہی ہیں۔ تم آخر کیوں سانس لے رہے ہو۔ اگر تم سانس نہ لو تو کیا زمین پر کوئی حادثہ پیش آ جائے گا؟ بل کہ اصل سوال تو یہ ہے کہ آخر تم پائے ہی کیوں جاتے ہو؟ اس سے بھی بہت آگے چلو اور بتاؤ کہ آخر یہ کرّۂ ارض کیوں پایا جاتا ہے۔ یہ کرّۂ ارض ہی کیا، یہ ہمارا ''شہرہ آفاق'' نظامِ شمسی آخر کیوں پایا جاتا ہے۔ اسے بھلا کیوں پایا جانا چاہیے؟ اور پھر یہ سوال بھی کیسے جانے کا ہے کہ ہماری کہکشاں اور کہکشائیں آخر کس ضرورت کو پورا کر رہی ہیں؟ تم بے تکے سوال مت کیا کرو اور مجھے میری حالت میں ہونے دیا کرو، سمجھے؟''

''ہاں جنابِ عالی، عالی مقام جنجالی! میں سمجھا اور بہت کچھ سمجھا''۔

''بس اب کچھ نہیں پوچھا جانا چاہیے!''

''جی ہاں جناب! اب کچھ نہیں پوچھا جائے گا''۔

''جانے میں کیا کہہ رہا تھا......!''

''میں کہہ رہا تھا کہ میں برآمدے کی اُوپر کی سیڑھی پر بیٹھا ہوا ہوں، یعنی یہ کہ بس بیٹھا ہوں اور بس بیٹھا ہوں''۔

میری نگاہ کے اُفق میں آج کا ایک یک سر فضول اور مجہول سورج ڈوب رہا ہے۔ (میں یہ بات آج تک نہیں سمجھ سکا کہ یہ کیوں نکلتا ہے اور کیوں ڈوبتا ہے؟) میرے سامنے مکان کے سبزہ زار کے حاشیوں پر پیڑ اور پودے فراغت اور راحت کی حالت میں لہک رہے ہیں۔

کاش کہ میں کوئی پیڑ، پودا یا پھر کوئی جھاڑی ہوتا۔ ایسا پیڑ، پودا یا جھاڑی جس نے فردوسیؔ، سعدیؔ، امیر خسروؔ، حافظؔ، عرفیؔ، ولیؔ دکنی، میرؔ اور غالبؔ کی شاعری سُنی اور سمجھی ہوتی۔ واویلا، صد واویلا! کہ میں ایک حیوانِ ناطق ہوں، شیشم، پیپل، پلکھن یا شہتوت کا پیڑ نہیں ہوں۔ واقعی انسان کے بجائے پیڑ، پودا یا کوئی جھاڑی ہونا کتنی قابلِ رشک اور نصیبہ وری اور بختاوری کی بات ہے کہ ہیں اور کسی کلاشنکوف یا اغوا برائے تاوان کے خطرے اور خدشے سے دُور پار لہک رہے ہیں اور لہلہا رہے ہیں۔ پرندوں کو اپنے آپ میں بسائے ہوئے ہیں اور ان کی ٹہنیاں ہر آنے والے مہمان پرندے کی میزبانی کرنے کے لیے ہر لحہ تیار ہیں۔

ابھی ایک گل گچی، گل چیں کی شاخ سے اُڑ کر شہتوت کی شاخ پر جا بیٹھی ہے۔ ہم اندازہ تک نہیں لگا سکتے کہ یہ گل گچی کس قدر عیش کی زندگی گزار رہی ہے! اس نے نہ صبح کا اخبار پڑھا ہے نہ شام کا۔ ماننا پڑے گا کہ یہ گل گچی اس اعتبار سے افلاطون، ارسطو، فارابی، بوعلی سینا، فردوسیؔ، سعدیؔ، حافظؔ، وارث شاہ، بابا فرید، ولیؔ دکنی، شاہ عبداللطیف، سچل سرمست اور میر تقی میرؔ سے کم تر درجے کی مالک نہیں ہے۔ نہ وہ اخبار پڑھتے تھے اور نہ یہ دانش مند گل گچی اخبار پڑھنے میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرتی ہے۔

بات پیڑوں، پودوں اور پرندوں سے چلی تھی اور پہنچ گئی اخباروں تک، روح کا سکون تباہ کر دینے والے طوماروں تک۔ جس مردم آزار شخص نے اخبار ''ایجاد'' کیا تھا نہ جانے محشر میں اس کا کیا حشر ہو گا۔

اب اس شہر میں اچھی خبریں بہت ہی کم سُننے میں آتی ہیں، بل کہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ سُننے ہی میں نہیں آتیں۔ یہ شہر اُمیدوں، آرزوؤں اور اُمنگوں سے یک سر محروم ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک گمبھیر اُداسی ہے جو دلوں پر چھائی ہوئی ہے۔ یہ کتنی بدنصیبی کی بات ہے کہ یہ

اُداس، بے حد اُداس شہر اس ملک کا سب سے بڑا شہر ہے۔

میں اور میرے دوست، میں اور میرے دشمن...... دونوں ہی روح کے خسارے میں ہیں ...... مقتول کے سوگ وار ہی خسارے میں نہیں ہیں...... قاتل کے طرف دار بھی خسارے میں ہیں...... یہ شہر اب کسی بھی تسلّی اور تشفّی کا حق دار نہیں سمجھا جاتا...... اے شہر! اگر تو کسی تسلّی اور تشفّی کا حق دار ہو بھی...... تو آخر وہ تسلّی اور تشفّی کیا ہوگی...... تیرے بوڑھے اور جوان اس بھیانک بھید کو بھلا کیا جانیں...... اور جان بھی لیں تو بھلا کیسے مانیں...... کہ ان کے لیے نہ تسلّی میں تسلّی ہے اور نہ تشفّی میں تشفّی...... اے شہر کے بے دانش دانش مندو! لفظ کی امانت کے ساتھ...... یعنی معنی کے ساتھ مسخرگی نہ کرو...... میں کوئی حکیم نہیں ہوں جو تمھیں حکمت کی تعلیم کروں...... میں تو ایک عام سا آدمی ہوں اور بس اٹکل سے...... کام چلاتا ہوں اور اسی کا روزینہ پاتا ہوں...... سو میں اٹکل سے کہتا ہوں ایک حقیر...... اور عاجز آدمی کی اٹکل سے جو کہ میں ہوں...... کہ تمھارے خسارے کے زائل ہونے کی...... ایک ہی صورت ہے۔ تمھاری بیماری کا...... ایک ہی علاج ہے اور وہ صورت اور وہ علاج...... یہ ہے کہ تم اپنے آپ سے زور آزمائی کرنا چھوڑ دو...... میں نے یہ بات بس اٹکل سے کہی ہے...... شاید میری اٹکل تمھارے کام آسکے۔

سسپنس ڈائجسٹ، دسمبر 1994

خون کے گھونٹ

شام ہے اور ذات اور ذات سے باہر کے خیال اور وجود کے احساس کے ملال کا ہنگام ہے اور میں جو ہوں' میں سوچ رہا ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں اور اُداس ہو رہا ہوں' اُداس ہو رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں۔ میری اُداسی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ لوگوں نے سوچنا چھوڑ دیا ہے' اُداس ہونا چھوڑ دیا ہے۔ وہ لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں' جو نہ سوچتے ہوں اور نہ اُداس ہوتے ہوں۔ یہاں میں یہ بات بھی کہتا چلوں کہ جو لوگ نہ سوچتے ہیں اور نہ اُداس ہوتے ہیں' وہ فقط اپنی صورت اور ہیئت کے اعتبار سے انسان ہوتے ہیں' مگر اپنی خاصیت اور خصلت کے اعتبار سے انسان نہیں ہوتے' محض اور محض حیوان ہوتے ہیں' اس لیے کہ تمام حیوانوں میں صرف انسان ہی وہ حیوان ہے' جو سوچتا ہے اور اُداس ہوتا ہے۔ چھپکلیاں' مچھر' مکھیاں' کوّے' بھیڑیں' بھینسیں' بھڑیں اور گائے بیل میرے اندازے کی رُو سے نہ سوچتے ہیں اور نہ اُداس ہوتے ہیں۔ کوئی شبہ نہیں کہ اس لحاظ سے انھیں بے حد خوش نصیب اور کامیاب حیوان قرار دیا جانا چاہیے۔

میں ایک بدنصیب اور ناکام انسان دیر سے سوچ رہا ہوں اور اُداس ہو رہا ہوں اور وہ یوں کہ جہاں میں ہوں' وہاں کی زندگی کے بازاروں میں ہر چیز بہت مہنگی ہو گئی ہے اور انسان کا خون بہت سستا' بہت ہی سستا ہو گیا ہے۔ سستا یا بہت سستا کہنا بھی ایک چونچلے کی بات ہے' ہے یوں کہ اس کی کوئی قیمت ہی نہیں ہے۔ کیا جوہڑ کے پانی کی کوئی قیمت ہوتی ہے؟ میں نے غلط کہا' جوہڑ کے پانی کی بھی کچھ نہ کچھ قیمت ضرور ہوتی ہے' پر میرے اور تمھارے خون کی کوئی بھی قیمت نہیں ہے۔

قتل کی فصل ہے کہ لہلہا رہی ہے۔ اب جو صورت ہے' وہ یہ ہے کہ کس کو کب قتل ہونا ہے۔ کس کی باری آج ہے اور کس کی کل۔ پر ایک بات تو ہے اور وہ یہ کہ یہ دن اچھے شعر کہنے اور اچھے افسانے لکھنے کے لیے بہت سازگار دن ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ شاعروں اور افسانہ نگاروں کو اس صورتِ حال یا اس موضوع سے کہیں زیادہ خیال پرور اور پُر اثر موضوع میسّر ہیں اور قابلِ احترام شاعر اور افسانہ نگار اُن کے بارے میں اپنے قلم کی جنبش کا حق ادا کر کے اپنی طبع کے اعلیٰ جوہر دکھا رہے ہیں۔

''جون ایلیا! کیا تم ایک فضول اور فالتو انکسار سے کام نہیں لے رہے اور ان قابلِ احترام اہلِ قلم میں اپنا شمار کرنے کی عزت سے اپنے آپ کو محروم ظاہر کرنا نہیں چاہ رہے ہو؟''

''حاشا لِلّٰہ! ایسا نہیں ہے۔ میں ایک شریف آدمی ضرور ہوں' مگر نامناسب حد تک شریف آدمی نہیں ہوں۔ میں ایک باقاعدہ قسم کا آدمی ہوں۔ میں جو ایک پشتینی اور پیشہ ور صاحبِ قلم ٹھہرا۔ میں اس عزت سے اپنے آپ کو بھلا کیسے محروم ظاہر کروں گا! تم بھی عجب بوڑم اور بڑیم آدمی ہو۔ تمھارے دماغ میں ایسا بے تکا خیال آخر آیا بھی کیوں؟''

''جون ایلیا! میری بات پر دھیان نہ دو۔ میں نے تو بس یوں ہی ایک بات کہی تھی۔ تم جو کہہ رہے تھے وہی کہو۔ وہی انسان کے خون کی بات' اس کے بہت سستے ہونے کی بات''۔

''تمھارا شکریہ کہ تم نے مجھے میری بات یاد دلائی۔ میں نے ان دنوں ایک نکتہ سُنا ہے اور وہ یہ کہ اب کسی آدمی کو قتل کرنا کوئی بے فیض بات نہیں ہے۔ پرسوں ایک نوجوان نے جو دو ایک آدمیوں کو قتل کر چکا ہے' مجھے بتایا کہ ایک آدمی کا خون کرنے میں وہ نشہ ہوتا ہے جو شراب کی دو بوتلوں میں بھی نہیں ہوتا۔''

''مجھے اس نوجوان کی بات سُن کر مرزا غالب بے طرح یاد آئے۔ وہ اپنی تنگ دستی کے باوجود پیتے ولایتی شراب ہی تھے اور اسی لیے انھیں بہت پریشان ہونا پڑتا تھا۔ اگر انھیں یہ نکتہ معلوم ہوتا تو وہ ولایتی شراب پر پیسا لٹانے کے بجائے نشے کی خاطر حکیم مومن خاں مومنؔ' مفتی صدرالدین آزردہ اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور اپنے ایسے ہی

دوسرے ہم نواؤں کو باری باری قتل کرڈالتے۔ چلو اگر وہ ان لوگوں کو اس لیے بخش دیتے کہ یہ لوگ اُن کے ہم درد اور غم گسار تھے تو بھلا شیخ ابراہیم ذوقؔ اور حکیم آغا جان عیشؔ جیسے حریف گروہ کے لوگوں کو قتل کرنے میں ان کے لیے بھلا کیا عذر مانع تھا؟ ان میں سے ایک ایک کو ذبح کیا کرتے اور نشے کی جاں فزا حالت میں آ کر ''آشوبِ آگہی'' کو سہنے کی طاقت پالیا کرتے۔''

''میں شاید بڑ ہانکنے لگا!''

''نہیں ہرگز نہیں! تم تو بڑے موقع کی باتیں کر رہے ہو۔ خون کی باتیں، خون بہانے کی باتیں۔ یہی تو وہ باتیں ہیں جو اَب ہر وقت کی جانی چاہییں''۔

''تمھاری مہربانی کہ تم نے میری باتوں کو کسی دیوانے کی بڑ نہیں سمجھا۔ میرے بھائی سوچو تو، کیا انسان کا خون اتنا بے قیمت ہے کہ اسے کھارے پانی کی طرح بہادیا جایا کرے؟ مجھے نہیں معلوم کہ آج زمین کے کتنے حصّوں کو انسان نے انسان کے خون سے سیراب کیا۔ میں تو اپنے گرد و پیش کی بات جانتا ہوں۔ یہاں تو یہ معاملہ ایک معمول بن گیا ہے۔ اب ہمیں صبح اُٹھتے ہی یہ خبر پڑھنے اور سُننے کی عادت ہوگئی ہے کہ آج وہاں، وہاں اور وہاں اتنے آدمی شکار کیے گئے۔ سچّی بات تو یہ ہے کہ اب کسی آدمی کے قتل ہونے کی خبر کوئی خبر نہیں رہی۔ ہوسکتا ہے کہ قتل کی خبریں اپنا اثر کھودینے کے باعث آیندہ اخباروں میں چھپنی بند ہوجائیں۔''

''ہماری قوم کے جوان، خدا انھیں نظرِ بد سے بچائے! کتنے جگر دار اور جیوٹ ہیں کہ اپنا ہی خون بہاتے ہیں اور اپنے ہی خون میں نہاتے ہیں۔ ان پر تو ناز کیا جانا چاہیے۔ ہم نفسو! محلّے محلّے جا کر عورتوں سے کہو کہ وہ ان جگر داروں اور جیوٹ نو جوانوں اور جوانوں کی بلائیں لیں۔ اے جگر دارو اور جیوٹو! تم ہمارا قابلِ رشک مقسوم ہو۔ تاریخ نے تمھاری شکل میں ہمیں سب سے بڑا عطیہ ارزانی کیا ہے۔ خدا تمھیں ہر چشم زخم سے محفوظ رکھے''۔

مجھے پورا اندازہ ہے کہ کچھ لوگ ہماری باتوں سے بدمزہ ہو کر بجا طور پر یہ کہتے ہوں گے کہ معراج رسول اور جون ایلیا نے تو ایک ہی بات کی رَٹ لگا رکھی ہے۔ پر جان لیا جائے

کہ ہم نے جس بات کی رَٹ لگا رکھی ہے وہ بات صرف ایک بستی کی بات نہیں ہے۔ میں پوری طرح سوچ سمجھ کر یہ سخن کر رہا ہوں کہ یہ بات صرف ایک بستی کی بات نہیں، اس پوری ''مملکتِ خداداد'' کی بات ہے۔ جس دن یہ بستی اپنے انجام کو پہنچے گی، اس کے بعد اس مملکت کو دنیا کا بڑے سے بڑا انجات دہندہ بھی اس کے بدترین انجام سے نہیں بچا سکے گا۔ معراج رسول کی اور میری یہ بات پوری طرح جان لی جائے اور مان لی جائے۔

بہ ہر حال آج کا دن بھی نفس کی اذیت ناک ملامتوں اور ندامتوں کے ساتھ اپنے فرجام کو پہنچا اور ہم نے خون کے گھونٹ پیے کہ ہماری یہی ایک عیاشی رہ گئی ہے۔

سوچا جانا چاہیے کہ ہماری یہ عیاشی آخر کن عالی مرتبہ لوگوں کا عطیہ ہے۔

بات تھی ایک بستی کی، ایک بد بخت ترین اور ایک بے والی اور بے وارث بستی کی۔ بیسویں صدی کے یروشلم کی۔ برادرِ عزیز معراج رسول! میں بہت دن سے جو خیال اپنے ذہن میں بھڑکتا ہوا محسوس کر رہا ہوں، وہ یہ ہے کہ میرا اور تمھارا ایک ہی مقسوم ہے اور وہ بیسویں صدی کے اس یروشلم کا یرمیاہ ہونا ہے۔ اس حقیقت، اس زہریلی حقیقت کے اعتراف سے بھلا کیا جھجکنا کہ دونوں یرمیاہ ہیں۔ دونوں کو اس بستی کا مرثیہ کہنا ہے اور اپنی سرنوشت سے دوچار ہونا ہے۔

سسپنس ڈائجسٹ، اپریل 1995

جنتِ ارضی-۱

میرا خیال ہے کہ چیل کوّے، چڑیاں، سانپ، بچھو، نیولے، کن سلائیاں، گلہریاں، تتیے، بھڑیں، مچھر، مچھلیاں، پھوے، گائے بیل، کتے، شیر اور ہاتھی...... اور شاید بندر اور لنگور بھی خواب نہیں دیکھتے۔ یہاں خواب سے خواب کا ایک خاص مفہوم اور ''دماغ'' کا ایک خاص عمل مراد ہے۔

منطق نے انسان کو ''حیوانِ ناطق'' کے خطاب سے نوازا ہے اور میں اسے ''خواب دیکھنے والا جان دار'' قرار دینے کی خواہش رکھتا ہوں۔ یہاں میں یہ بات دُہرا دوں کہ خواب سے ''دماغ'' کا ایک خاص عمل مراد ہے۔ میں نے ''ذہن'' کے بجائے دماغ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے جس کا بیان کرنا اس موقع پر غیر ضروری ہے۔ بہ ہر حال خواب کے عام مفہوم کے مطابق انسان کے علاوہ بہت سے دوسرے جان دار بھی خواب دیکھ سکتے ہیں مگر دماغ کے ایک خاص عمل کے مفہوم کی رُو سے صرف انسان ہی خواب دیکھتا ہے اور اس کی یہ خصوصیت اس کی بے حد اہم فضیلت ہے۔

اس خصوصیت کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب ہے، بد سے بہتر اور بہتر سے بہترین کی خواہش۔ میں یہ بات فرض کرنے کی ادنیٰ اہلیت بھی نہیں رکھتا کہ ہرن، نیل گائیں اور پاڑے ایک ایسے جنگل کا خواب دیکھ سکتے ہوں کہ جہاں وہ شیر اور چیتے کی خوں خواری سے محفوظ رہ سکیں یا چھوٹی مچھلیاں ایک ایسے سمندر کو تلاش کرنے کی تحریک چلا سکتی ہوں گی جس میں وہ بڑی مچھلیوں کے ''سامراج'' سے چھٹکارا پا سکیں۔

تو ہے یوں کہ جان داروں میں صرف انسان ہی وہ جان دار ہے جو خواب دیکھتا ہے

اور خواب دیکھنے کی جزا یا سزا پاتا ہے۔ انسانوں میں جو انسان سب سے زیادہ پُر مایہ اور دراز سایہ خواب دیکھتے اور دکھاتے ہیں وہ حکیم، فلسفی اور شاعر کہلاتے ہیں۔ اگر انسانوں کے علاوہ دوسرے جان دار بھی خواب دیکھ سکتے تو ان میں بھی حکیم، فلسفی اور شاعر پیدا ہوتے۔

دینوسار کی نسل تو فنا ہو گئی لیکن ہاتھی اپنے حجم اور ضخامت کے اعتبار سے اس امر کا حق دار ہے کہ وہ دوسرے جانوروں کے سامنے یہ اعلان کرتا کہ میں تمھاری فلاح اور بہبود چاہتا ہوں اور تمھیں نجات کی راہ دکھانے آیا ہوں۔

لیکن میری معلومات کے مطابق کسی بھی مغربی، افریقائی اور مشرقی ہاتھی نے کسی بھی دور میں اپنی حاکمیت کا اعلان نہیں کیا اور یہ کہ انھیں بد سے ''بہتر'' اور بہتر سے ''بہترین'' کی اُمید نہیں دلائی۔

ہاں تو خواب دیکھنے اور دکھانے کی بات ہو رہی تھی اور عرض کیا گیا تھا کہ خواب دیکھنا انسان کی بے حد اہم فضیلت ہے...... (یا شاید سب سے بڑی فضیلت ہے) اگر کوئی انسان یا انسانوں کا کوئی گروہ خواب دیکھنے کی اہلیت سے محروم ہو تو اس پر فاتحہ پڑھ لینا چاہیے۔

انسانیت کی ساری سرگزشت اور تہذیب کی ساری رُوداد دراصل خواب دیکھنے اور خواب دکھانے والوں کی ماجرا طلبی اور ماجرا سازی کی سرگزشت اور رُوداد ہے۔ خواب بھی انسانیت کا سب سے زیادہ قیمتی اندوختہ اور سرمایہ ہیں۔ اگر یہ اندوختہ اور سرمایہ نہ ہوتا تو انسان ''نستاسوں'' جیسی کوئی ''شے'' ہوتا اور وہ آج بھی اسی حالت اور ہیئت میں پایا جاتا جس حالت اور ہیئت میں آج سے لاکھوں برس پہلے پایا جاتا ہوگا۔

جو لوگ اپنے اور اپنی نوع کے دوسرے لوگوں کے لیے خواب نہیں دیکھتے، وہ نیم انسان ہوتے ہیں۔ خواب دیکھنا اپنے میں اپنے آپ سے آگے ہوتا ہے۔ جو شخص یا جو معاشرہ خواب دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ اپنے آپ میں اپنے سے پیچھے ہوتا ہے یا کم سے کم وہیں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے اور وہیں کا وہیں رہتا ہے اور اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔

سسپنس ڈائجسٹ، مئی 1995

جنتِ ارضی-۲

میری نسل کے سوچنے اور لکھنے والے لوگوں تک ایک مثالی معاشرے کے خواب دیکھنے کا رواج اور رجحان عام تھا بل کہ میری نسل کے بعد کے لوگوں میں بھی یہ رجحان باقی رہا مگر اب کئی برس سے یہ رجحان زوال پذیر ہے۔

نوخیز نسل نے خواب دیکھنے چھوڑ دیے ہیں۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کیا نوخیز نسل کٹھر ہے، کیا اس کا ذہن کاچڑ ہے، کیا وہ کڈھب ہے، آخر بات کیا ہے؟

بات یہ ہے کہ حالات کئی برس سے خواب دیکھنے اور خواب دکھانے کی حالت کے لیے سازگار نہیں ہیں۔ یہ حالت صرف پاکستان کی نوخیز نسل کا معاملہ نہیں ہے بل کہ بہت قابلِ ذکر حد تک ایک عالم گیر معاملہ ہے اور ''سوویت یونین'' کا خاتمہ اس بارے میں سب سے زیادہ موثر ثابت ہوا ہے۔

یہاں تھوڑی دیر رُک کر یہ سوچنا چاہیے کہ آیا کسی مثالی معاشرے کے خواب دیکھنا ایک بے بنیاد بات تو نہیں ہے اور یہ کہ کیا زمین پر جنت کا وجود میں آنا ممکن بھی ہے یا نہیں؟

یہ ایک بہت درہم پیچیدہ سوال ہے۔ یہ سوال اس صدی کی نویں دہائی کے تمام ہونے سے چند سال پہلے تک کوئی درہم پیچیدہ سوال نہیں تھا لیکن اس کے بعد جو حقیقت سامنے آئی وہ بہت خلافِ توقع ثابت ہوئی اور ''خواب وخیال'' کے لوگ ایک ایسی واقفیت سے دوچار ہوئے جو اُن کے لیے ناقابلِ برداشت تھی اور ہے۔

میں اپنے آپ کو قنوطیت اور یاسیت کا ایک بیوپاری کہلائے جانے کی ہتک کو کسی بھی حالت میں تسلیم نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنی نوجوانی اور جوانی کے سب سے زیادہ بیش قیمت

ماہ وسال پر اُمیدی کی حالت کو فروغ دینے میں گزارے ہیں۔ کوئی شبہ نہیں کہ میں اپنے ذاتی معاملوں اور ان کے تجربوں کے دائرے میں ایک قنوطی اور یاسیت زدہ آدمی رہا ہوں لیکن جہاں تک ''غیر ذاتی'' اور اجتماعی معاملوں کا تعلق ہے تو میری لکھت کے لاکھوں پڑھنے والے اس حقیقت کی گواہی دیں گے کہ میں نے ان کے دلوں میں ہمیشہ جان فزا اُمیدوں کی تخم ریزی کی ہے۔

میں نے جو سوال اُٹھایا تھا، اب اس عہد میں اس سوال کا حقیقت پسندانہ جواب دینے کی اذیّت میرے دل کو خون کیے دے رہی ہے اور وہ جواب یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی جنت وجود میں نہیں آسکتی لیکن اگر حقیقت پسندی ہی کے ساتھ سوچا جائے تو جنتِ ارضی کا وجود میں نہ آسکنا کوئی سوگ منانے کی بات ہرگز نہیں ہے۔ آخر ہم اپنے دلوں کو اوہام ہی سے کیوں بہلائیں؟ ہم اپنے آپ میں واقفیت سے ایک خوش گوار سروکار رکھنے کی صلاحیت آخر کیوں نہیں پیدا کر سکتے؟

اگر اس دنیا میں کسی جنت کا وجود میں آنا ممکن نہیں ہے تو یہ کوئی منہ بسورنے کی بات نہیں۔ اگر اس دنیا میں شہد اور شیر کی نہریں نہیں بہہ سکتیں تو شفاف اور شیریں پانی کی نہریں تو بہہ سکتی ہیں۔ کیا جوہڑوں کا پانی پینے والوں کے لیے شفاف اور شیریں پانی کی نہریں شہد اور شیر کی نہروں سے کچھ کم ہیں؟ سو ہمیں اپنی دنیا میں ایسی ہی نہروں کا جال پھیلانے کے لیے اپنے ذہن اور اپنے جسم کی محنت کشی کا، ارجمند ترین محنت کشی کا فرض انجام دینا چاہیے۔ ہمیں اپنی اس محنت کشی کا جو ثمرہ نصیب ہوگا، دراصل اسی کا نام جنتِ ارضی ہے۔

سسپنس ڈائجسٹ، جون 1995

شعور

شام گہری ہوگئی ہے۔ دونوں وقت مِل رہے ہیں اور مجھے نواب مرزا شوق لکھنوی کی زہرۂ اوراق اور شہرۂ آفاق مثنوی ''زہرِ عشق'' یاد آ رہی ہے جو میں نے آٹھ نو برس کی عمر میں سُنی تھی اور دس گیاہ برس کی عمر میں پڑھی تھی۔ اس حشر انگیز مثنوی کا میرے خواب خواب لڑک پن کی دنیا' دنیا نہیں بل کہ میرے لڑک پن کی کائنات پر ایک سحر طاری تھا۔ یہ مثنوی عاشقانہ شاعری اور معشوقانہ شاعری کا ایک معجزہ ہے۔

میں عشق و حُسن کے رشتے کے ایک خاص احساس کی حالت میں دیوانِ غالب تو کیا خدائے سخن میرؔ کی کلیات تک کو ''زہرِ عشق'' پر وار سکتا ہوں۔ آپ میں سے اگر کوئی صاحب میری اس بات کو غلو قرار دیں تو میں ان سے کوئی حجت اور تکرار نہیں کروں گا۔ یہ تو احساس اور تاثر کا معاملہ ہے اور احساس و تاثر کا بھلا حجت اور تکرار سے کیا واسطہ! ہاں تو اس وقت مجھے ''زہرِ عشق'' کا ایک شعر ایک عجب حال خیزی کے ساتھ یاد آ رہا ہے۔

رُخ پہ گیسو ہوا سے ہلتے ہیں
چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں

''...... دونوں وقت ملتے ہیں'' سے میرے ذہن میں اچانک ایک لفظ اُبھرا ہے اور وہ لفظ ہے انسان۔ یہ لفظ میرے ذہن میں اس لیے اُبھرا ہے کہ انسان میں بھی دو کیفیتیں ملتی ہیں۔ ایک کیفیت خیر ہے اور دوسری شر۔ اب یہ ایک الگ بات ہے کہ بعض اوقات یا اکثر اوقات انسان سراپا شر نظر آتا ہے۔

اس لفظ یعنی انسان کا ''مادّہ'' یا عربی قواعد کی اصطلاح میں ''بنا'' الف' نون' سین' یعنی

''اِنس'' ہے۔ انس کا ایک تلفظ ''اُنس'' ہے اور دوسرا تلفظ ''اُنُس'' اس کے معنی ہیں: خوش خلق، ملن سار اور ایک دوسرے سے مانوس ہونا (وغیرہ)۔

یہ تو لفظ انسان کی اصل اور اس کے مادّے یا بِنا کی بات ہوئی۔ اب میں انسان کے معنی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس لفظ کے معنی کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان وہ جان دار ہے جو اپنے دماغ یا مغزِ سر کی راست اور درست فعلیت یا اس کے رُشدِ کامل کے سبب دوسرے تمام جان داروں سے اعلیٰ اور اشرف حیثیت رکھتا ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ انسان وہ (راست قامت) جان دار ہے جو راست کار، راستی کوش اور درست راستے پر گام زن ہو۔ اور اپنی نوع کے دوسرے افراد سے اُنس رکھتا ہو۔

اس مرحلے پر آپ بھی وہی کچھ سوچ رہے ہوں گے، جو میں سوچ رہا ہوں اور وہ یہ کہ لُغت کے اعتبار سے انسان کے جو معنی ہیں، کیا ان معنی سے ہماری یعنی انسانوں کی اکثریت کوئی دُور کا بھی تعلق رکھتی ہے؟

''کیا انسان واقعی وہ جان دار ہے جو راست کار، راستی کوش اور درست راستے پر گام زن ہو؟''

''ہرگز نہیں!''

''کیا انسان واقعی وہ جان دار ہے جو اپنی نوع کے دوسرے افراد سے اُنس رکھتا ہو؟''

''ہرگز نہیں!''

اس گفت گو کا جو پُر مایہ نتیجہ نکلا، وہ یہ ہے کہ ہم یک سر بے معنی اور مہمل ہیں۔ یک سر بے معنی اور مہمل۔ اور جون ایلیا! اس میں شبہ بھی کیا ہے کہ ہم سدا کے بے معنی اور مہمل موجود ہیں۔ الّا ماشاءاللہ، ہم وقت کا ایک ٹھٹول پن اور تاریخ کی ایک ہڑبونگ ہیں۔

انسانو! چاہے تم کہکشانوں کو پٹکوں کی طرح اپنی کمروں پر باندھ لو، تب بھی تمھارا وجود یک سر بے معنی اور مہمل ہی رہے گا۔ تم کیا اور تمھارا نظامِ شمسی کیا، تمھاری کہکشانیں کیا اور تمھارے سحابیے کیا۔ جو کچھ بھی ہونے کے حال میں ہے وہ عبث ہے، سرتاسر عبث ہے۔ اور میں بھی عبث ہوں اور اس کے ساتھ ہی اس بدطور اور بے ہودہ عبثیت کا ہجوگو بھی ہوں۔ جو

ذرا بھی بھلا مانس ہے' اُسے اس بدطور عبثیت کا ہجو گو ہونا چاہیے۔

کچھ انسان اگر کسی قدر ٹھیک ٹھاک ہونے کے طور سے کچھ ہیں تو فطرت کے اس عطیے کی وجہ سے ہیں جسے شعور کہا جاتا ہے۔ اور اسی عطیے کی وجہ سے وہ اپنے بامعنی ہونے پر اصرار کرتے رہے ہیں۔ اور اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا یہ اصرار درست ہے۔ پر یہاں کہنے کی جو بات ہے' وہ یہ ہے کہ ان کی اکثریت نے فطرت کے اس عطیے سے عام طور پر بڑی بے تدبیری اور بے دانشی کے ساتھ کام لیا ہے۔

تم اپنی بدطور مہملیت اور بے ہودہ عبثیت کے باوجود اگر شعور کو جزوقتی طور پر نہیں بل کہ کُل وقتی طور پر کام میں لاؤ تو تمھاری وجودی مہملیت اور عبثیت کی چیرہ دستی تمھارا کچھ بہت زیادہ نہیں بگاڑ سکے گی۔

شعور ہی انسان کو اختیار سے نوازتا ہے اور شعور ہی آزادی عطا کرتا ہے۔ چاہے وہ اختیار بہت زیادہ نہ ہو اور چاہے وہ آزادی پوری آزادی نہ قرار پا سکے۔

ہے یوں کہ اس کائنات میں' اپنے آپ میں مگن رہنے والی اور اپنا آپا چھپانے والی اس نخریلی کائنات میں شعور کے بخشے ہوئے اختیار' ادنیٰ اختیار اور شعور کی ارزانی کی ہوئی آزادی' بہت کم آزادی کی حالت بھی فطرت کا کوئی معمولی عطیہ نہیں ہے۔

سسپنس ڈائجسٹ' جولائی 1995

ہم اُداس ہیں

میں اُداس ہوں۔تم اُداس ہو۔ہم اُداس ہیں اور بہت اُداس ہیں۔اور اب تو کچھ ایسا ہے کہ ہماری اُداسی اور ہماری بے دلی نے ہمیں ایسی حالت میں مبتلا کر دیا ہے کہ ہم خود اپنے آپ پر بھروسا کرنے سے محروم ہو گئے ہیں' محروم کر دیے گئے ہیں۔

ہم میں سے کوئی ایک بھی حساس اور ہوش مند شخص اپنے آیندہ سے اور اپنے ہم وطنوں کے آیندہ سے پُر اُمید نہیں رہا ہے۔ہم ایک ایسے ملک کے باشندے ہیں جس کا وجود ہی ہر لمحہ زیرِ بحث رہتا ہے۔یعنی میں' یعنی کوئی بھی پاکستانی سوچنے کی اس حالت میں مبتلا رہتا ہے کہ میں ہوں بھی یا نہیں اور اگر ہوں تو کیا کل تک رہوں گا یا نہیں؟

یہ ذہن کی وہ حالت ہے اور نفس کی وہ کیفیت ہے جس میں دنیا کی شاید ہی کوئی قوم مبتلا ہو۔ پاکستان ہی دنیا کا وہ یکتا اور یگانہ ملک ہے جس کے باشندے' باخبر اور باشعور باشندے یہ بات کہنے کی کم سے کم سکت بھی نہیں رکھتے کہ کل کیا ہوگا۔یعنی یہ کہ آیا کل تک پاکستان باقی بھی رہے گا یا نہیں؟

جو لوگ' خوش فہم اور خوش خیال لوگ' اس ملک کے باخبر' باشعور اور حساس باشندوں کی اس ذہنی کیفیت کو ایک نفسیاتی مرض قرار دیتے ہیں' وہ خود نفسیاتی مریض ہیں اور بہت بگڑے ہوئے مریض ہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ پہلی فرصت میں کسی نفسیاتی معالج سے رجوع کریں۔

اگر کوئی شخص پاگل نہیں ہے تو وہ میرے خیال میں اس حقیقت پر دن میں کئی بار دل ہی دل میں حیران ہوگا کہ آخر یہ ملک اب تک کیسے قائم اور باقی ہے۔خود میں بھی یہ سوچتا رہتا

ہوں کہ میں اور تم کیوں ہیں، کیسے ہیں اور آخر کس لیے ہیں اور یہ کہ کب تک ہیں؟

کیا یہ یاوہ گوئی اور رہرزہ سرائی کا کوئی طور ہے؟ کیا یہ کوئی ایسی گفتار ہے جسے بُڑبُڑاہٹ گردانا جائے۔ کیا یہ ذہن کی کوئی ایسی حالت ہے جسے سرسامی حالت سمجھا جائے۔

مجھے روزانہ اپنی شام کی مجلس میں ایسے کئی لوگوں سے ملنے کی عزت نصیب ہوتی ہے جن میں اپنے آپ کو محبِ وطن سمجھنے اور کہلانے کی شدّت پائی جاتی ہے اور اس بات میں کوئی بھی شبہ نہیں کہ یہ ایک بہت ہی نیک شدّت ہے۔ ایسے لوگوں کے نزدیک حبِ وطن کا جو مفہوم ہے، وہ یہ کہ اس ملک کو بہ ہر صورت اور بہ ہر حال ایک ایسا ملک مانا جائے جسے تاریخ کی طرف سے بقائے دوام کا یہ پروانہ عطا کیا جا چکا ہے۔

میں اب ان بدبخت لوگوں میں شمار کیا جانے لگا ہوں جو خوش فہم لوگوں کی ہر بات کو حدیث ماننے کی استعداد اور اہلیت سے یک سر محروم ہوں۔

یہ بات کبھی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ کوئی شخص زہر پی رہا ہو اور اس کے ایک گھونٹ پر نفس کے پورے اطمینان کے ساتھ یہ اُمید رکھی جائے کہ وہ بہت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی عمرِ طبعی کو پہنچے گا۔ میرے اور مجھ ایسے شوریدہ گماں لوگوں کے نزدیک اس ملک کے خواص اور عوام اس ملک کے بیری ہیں چاہے وہ حقیقت نہ جانتے ہوں کہ وہ اپنے ہر خیال اور عمل کے ذریعے اس ملک کو نیست و نابود کرنے میں دل و جان سے کوشاں ہیں، مگر ہے ایسا ہی۔ اور جو شخص بھی اس حقیقت سے انکاری ہے، اسے اپنے گھر کے بجائے رضاکارانہ طور پر کسی پاگل خانے میں قیام کرنا چاہیے۔

ایک نکتہ ہے جسے سُننے کی طرح سُننا اور سمجھنے کی طرف سمجھا جائے۔ اور وہ نکتہ یہ ہے کہ کسی ایک شخص کو سلیقے اور قرینے کی زندگی گزارنے کے لیے اتنا باہوش ہونے کی ضرورت نہیں پیش آتی، جتنی ضرورت ایک قوم کو سلیقے اور قرینے کی زندگی گزارنے کے لیے پیش آتی ہے۔

لیکن اے قوم! اے قوم! اگر تُو ایک قوم ہے تو مجھے بتا کہ کیا تُو اس نکتے پر عمل درآمد کر رہی ہے۔ کیا تُو سلیقے اور قرینے کی زندگی گزارنے کا کم سے کم میلان بھی رکھتی ہے؟

وائے ہو تجھ پر کہ تُو ایک قوم نہیں ثابت ہو سکی۔ تُو بس ایک انبوہ ہے۔ ایک سراسر فضول اور فالتو انبوہ۔ تُو اپنی ذات، اپنی طینت اور طبیعت میں ایک غصہ دلانے والی اور جھونجل اور جھنجلاہٹ پیدا کرنے والی لجیم اور شحیم بدی، بدکیشی اور بدکوشی ہے۔ تُو ہے اور نہ جانے کیوں ہے؟

اگر کوئی سوال کرنے والا یہ سوال کرے کہ پاکستان اور اس کے باشندے آخر اس لمحے تک کیوں باقی ہیں؟ تو اس ملک کا کوئی منطقی سے منطقی اور بلیغ سے بلیغ متنفس بھی اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔

وقت اب تک پاکستان اور اس کے باشندوں کو ایک خوش گوار ہست و بود کی مہلت دیتا چلا آیا ہے، مگر ہوا کیا ہے؟ ہوا یہ ہے کہ اس لمحے تک اس مہلت کو رائگاں کیا جاتا رہا ہے۔ وقت نے تم سے کہا کہ اس وقت رات کا پہلا پہر ہے اور تم نے یہ سُنا اور سُننا چاہا کہ یہ دن کا پہلا پہر ہے۔ وقت نے تم سے کہا کہ یہ دن کا پہلا پہر ہے اور تم نے یہ سُنا اور سُننا چاہا کہ یہ رات کا پہلا پہر ہے۔

تمھارے کانوں میں سڑا ہوا میل بھرا ہوا ہے۔ تم سے کہا کچھ اور جاتا ہے اور تم سُنتے کچھ اور ہو۔ اگر تم بہرے ہوتے تو تم سے کوئی بھی گلہ نہ ہوتا مگر رونا تو یہ ہے کہ تم بہرے نہیں ہو۔

تمھارا روگ بھی ایک عجیب روگ ہے اور وہ روگ یہ ہے کہ تم میں بہرا بھنڈ ہونے کی اشتعال انگیزی پائی جاتی ہے۔

ماضی کی قوموں کے عروج اور زوال کا سبب یہ تھا کہ یا ان کے خواص حقیقت سے آنکھیں چُرانے لگے تھے اور دیکھتے بھالتے اندھے بن گئے تھے یا ان کے عوام خود اپنے آپ سے بیر رکھنے لگے تھے اور خود اپنی جان کے لاگو ہو گئے تھے۔ مگر میری اور تمھاری سرگزشت دہری نحوست کی سرگزشت ہے۔

اس ملک کے خواص اور عوام دونوں اپنے ظاہر کے ظاہر اور باطن کے باطن میں خیرہ چشم قسم کے جرائم پیشہ ہیں اور ایسے جرائم پیشہ اور بداندیشہ کہ خود اپنے ہی جرائم کا عذاب سہنے کی بھیانک ہوس رکھتے ہیں۔

میں تم سے، تم سب سے بل کہ میں نے غلط کہا، خود اپنے آپ سے یہ بات پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر مجھے اس بات کی توقع کیوں ہے کہ آنے والے لمحے میں مجھے اپنے جرائم کی جو سزا ملنا ہی چاہیے، میں اس سے بچ جاؤں گا۔ یہ ایک بہت افسوس ناک بات ہے کہ میں جو تاریخ کی بدی، بدکوشی اور بدکیشی ہوں، واقعی آنے والے لمحے میں اور اس لمحے کے بعد کے ہزاروں لمحوں کے بعد بھی اس سزا سے بچا رہوں گا، جو مجھے اسی لمحے ملنا چاہیے۔

کیا کسی بھی قوم کی زندگی سے یہ مثال مل سکتی ہے کہ وہ قوم جرم پر جرم، خیانت پر خیانت اور جہالت پر جہالت پر اَڑی رہی اور اس نے اپنی ان حرکتوں کی کوئی سزا نہیں پائی۔

کیا بابل، اشوریہ، قدیم مصر، قدیم ایران، فنیقیہ، عیلام اور قدیم ہندوستان کی قومیں تاریخ کی بے زنہار گرفت سے بچ سکیں؟ بتاؤ! کیا بچ سکیں؟ اگر بچ سکیں تو مجھے ضرور بتانا کہ بچ سکیں۔

تم اپنے آپ کو غنیمت، غنیمت ہی نہیں نعمت جانو۔ مگر آنے والی کل اور آنے والی کل کی ساعتیں ہم میں سے کوئی بھی نہیں گن سکتا۔ یہاں یہ بھی سمجھ لو کہ آنے والی کل سے تاریخ کی آنے والی کل مُراد ہے۔ کیا تم اس آنے والی کل کی عقوبت سے بچ سکنے کے امکان کا کوئی تصور کر سکتے ہو؟ کیا تمھیں عقوبت سے بچے رہنے کی کوئی ضمانت دی جا چکی ہے؟ سُنو اور سمجھو کہ تمھیں تاریخ کی طرف سے ایک حیران کن مہلت ملی ہوئی ہے اور یہ مہلت میرے دل اور میری جان کا سب سے بڑا سہارا اور سرمایہ ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی میں اس مہلت پر بُری طرح جھنجھلایا ہوا ہوں۔ اور مجھے طیش بھی آتا ہے اور وہ یوں کہ شُر کو چاہیے، وہ شُر میرا اپنا آپ ہی کیوں نہ ہو، عذاب سے، بدترین عذاب سے، تاریخ کے عتاب سے، بدترین عتاب سے ایک لمحے کے لیے بھی محفوظ نہیں رہنا چاہیے۔

مژدہ ہو، نوید ہو کہ تم اس بدترین عذاب سے، تاریخ کے اس بدترین عذاب سے، اس بدترین عتاب سے اس لمحے تک محفوظ ہو۔ سو، چاہیے کہ تم اس محفوظی پر شکر ادا کرو اور شکر ادا کرنے کا سب سے پُراثر طریقہ یہ ہے کہ اپنے جرائم سے باز آ جاؤ اور اس میں ذرا بھی دیر نہ لگاؤ۔

سسپنس ڈائجسٹ، دسمبر 1995

معیار—۱

کسی گروہ کے مقسوم کو سمجھنے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کا معیارِ عزت وشرف کیا ہے؟ وہ کن لوگوں کو اہم اور کن لوگوں کو غیر اہم جانتا ہے؟ وہ کن چیزوں کو بیش قیمت اور کن چیزوں کو بے قیمت سمجھتا ہے؟ یہاں مجھے حضرت عمرؓ کے عہد کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک دن حضرت عمرؓ مدینے کے ایک چوراہے سے گزر رہے تھے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ ایک ہجوم حلقہ باندھے کھڑا ہے اور اس حلقے کے درمیان ایک بوڑھی عورت گریہ کناں کوئی مرثیہ پڑھ رہی ہے۔

یہاں میں یہ کہہ دوں کہ دنیا میں چند شاعرات سب سے اہم گزری ہیں۔ یونان میں سیفو، عراق میں رابعہ بصری، ایران میں قراۃ العین طاہرہ اور عرب میں خنسا۔ وہ میرے گمان کے مطابق تاریخِ شاعری کی سب سے بڑی شاعرہ تھی۔

خنسا کا ماجرا یہ ہے کہ اس کا بھائی صخر، مسلمانوں سے جنگ کرتے ہوئے قتل ہو گیا تھا۔ وہ اپنے بھائی صخر سے شدید محبت کرتی تھی۔ چناں چہ صخر کے قتل ہونے کے بعد اس نے ساری زندگی اس کی موت پر مرثیے کہنے میں گزار دی۔

خنسا آخری عمر میں مسلمان ہو گئی تھی اور حالتِ اسلام میں بھی وہ اپنے مشرک بھائی صخر کے مرثیے کہتی رہی اور مر گئی۔

حضرت عمرؓ اس صورتِ حال کو دیکھ کر اس حلقے کے قریب گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ خنسا اپنے بھائی صخر کی یاد میں ایک الم ناک ترین مرثیہ پڑھ رہی ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک یہ مرثیہ سُنتے رہے اور پھر انھوں نے اس مرثیے کو سُن کر اتنا گریہ کیا، اتنا گریہ کیا کہ ان کی

داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔ ظاہر ہے کہ آپ اس حقیقت کو فراموش نہیں کریں گے کہ حضرت عمرؓ مدینے کے کوئی عام شہری نہ تھے۔ دنیائے اسلام کے امیر المومنین تھے۔ دنیائے اسلام کا امیر المومنین ایک مشرک کا مرثیہ سُن کر گریہ کرے یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ حضرت عمرؓ یہ کہتے کہ کسی مسلمان شاعرہ کا اپنے مشرک بھائی کی موت پر مرثیہ کہنا خلافِ اسلام اور خلافِ ایمان ہے، لیکن حضرت عمرؓ نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اس کے بجائے خنسا کی اذیت میں شریک ہو گئے۔ اس لیے کہ وہ انسانی جذبے کے تخلیقی اظہار کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتے تھے، حالاں کہ وہ کافروں اور مشرکوں کے حق میں بہت شدید تھے۔ وہ شعر اور شعرا کی قدر و منزلت کے قائل تھے اور جانتے تھے کہ شعر میں حکمت ہوتی ہے اور حکمت لائقِ احترام ہے۔

اگر اس قسم کا کوئی واقعہ پاکستان میں پیش آتا اور یہاں کا کوئی شاعر کسی ہندو شاعر کی موت پر سرِ بازار مرثیہ پڑھ رہا ہوتا تو یہاں کا وزیر اعظم یا اس شہر کا انتظامی سربراہ اس شخص کو گرفتار کراتا اور اسے پاکستان کا غدّار قرار دیتا۔ اگر حضرت رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کی موت پر کسی شاعر نے مرثیہ کہا ہوتا تو اسے یہاں کا کوئی سرکاری رسالہ شائع نہ کرتا، لیکن حضرت عمرؓ پاکستان کے کسی سرکاری رسالے کے مدیر یا اس شہر کی انتظامیہ کے سربراہ نہ تھے، وہ خلیفۃ المسلمین تھے اور انسانی جذبوں کو ان کی وسعت و قوّت کے ساتھ محسوس کرتے تھے۔

ہمارے معیار اور ہمارے مثالیے بہت ہی رکیک اور پست ہیں۔ ہم کسی عالم، ادیب، مفکّر، مصنف، قانون داں، شاعر، افسانہ نگار اور سائنس داں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ہم نقالوں، لطیفہ گویوں، اداکاروں، مسخروں اور بے ہنگام نچنیوں اور گویوں کو اہمیت دیتے ہیں، سو ہمیں اپنے انجام اور مقسوم کو سمجھنے میں کوئی اُلجھن نہیں ہونا چاہیے۔

ہم حد سے گئے گزرے لوگ ہیں اور وقت کو چاہیے کہ وہ ہمیں بُری طرح گنوا دے اور ٹھکرا دے، اس لیے کہ ہم بُری طرح گنوا دیے جانے اور ٹھکرا دیے جانے ہی کے قابل ہیں۔

میں یہ بات آج تک نہیں سمجھ سکا کہ ہم آخر کیوں ہیں اور ہمیں آخر کیوں ہونا چاہیے؟ ہماری بُود اور ہمارے وجود کا آخر کیا جواز ہے؟ کاش! ہم پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے اور اگر پیدا

ہو گئے تھے تو پیدا ہوتے ہی مر جاتے۔ ہم تاریخ کا ایک بدترین مخول اور ٹھٹول ہیں۔

ہاں! یقین کرو میں بہ اصرار کہتا ہوں کہ تم تاریخ کا ایک بدترین مخول اور ٹھٹول ہو۔ تم اپنے آپ کو وقت کا ناز پروردہ سمجھتے ہو۔ تم تو تاریخ کا ایک اسقاط ہو۔ کم سے کم میں اور مجھ ایسے لوگ تمھیں کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ یعنی میں اپنے آپ کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ میں تم میں سے ہوں۔ تمھارا ہوں اور میں یک سر ایک فضول اور فالتو آدمی ہوں۔ ہم سب...... محض رائگاں ہیں اور ہر لحہ رائگاں جا رہے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہمیں آنے والے زمانے سے کوئی بھی اُمید کیوں رکھنا چاہیے؟

ہم نے وقت کو جانا اور مانا ہی کیا؟ ہم نے وقت اور تاریخ کے ساتھ وہ تمسخر کیا ہے، وہ تمسخر کیا ہے کہ بس! ہم اپنے آپ کو وقت سے بلند سمجھتے ہیں۔

سمجھ لیا جائے کہ وقت ہمیں وہ مار مارے گا کہ ہمارا حلیہ بگڑ جائے گا۔ میں ہرگز فضول اُمیدیں دلانے والا کوئی پیشہ ور صاحبِ قلم نہیں ہوں۔ فضول اُمیدیں، قوموں اور قبیلوں کو تباہ کرتی ہیں۔ ہم اور تم فضول اُمیدوں کے مارے ہوئے لوگ ہیں۔ فضول اور بے جواز اُمیدوں کے مارے ہوئے لوگ ہمیشہ عبرت ناک تباہی کا شکار ہوئے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم تباہی کا شکار کب ہوں گے۔ میری خواہش ہے، یقین کرو میری بڑی خواہش ہے کہ میں بہت جلد تباہی کا شکار ہو جاؤں اور تم بھی تباہی کا شکار ہو جاؤ! میں تمھیں خواہ مخواہ خوش رکھنے اور اُمیدیں دلانے کی نوکری نہیں کرتا۔ میں تمھارا کوئی چاکر نہیں ہوں۔ میں بھی رائگاں جاؤں، رائگاں جاؤں، رائگاں جاؤں اور تم بھی رائگاں جاؤ، رائگاں جاؤ...... رائگاں جاؤ۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ کہہ رہا ہوں اور خون تھوک رہا ہوں۔ وائے میں اور وائے تم!

سسپنس ڈائجسٹ، مئی 1996

معیار–۲

اب سے پہلے جو گفت گو ہوئی تھی، اس میں معیار کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ کہا گیا تھا کہ کسی فرد یا گروہ کے معیار سے اس کے مقسوم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بتایا گیا تھا کہ ہمارا معیارِ فضل و فضیلت کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے۔ 'کیا ہونا چاہیے' کے سلسلے میں حضرت عمرؓ کے ایک با کرامت رویّے کی بات کی گئی تھی۔ یعنی یہ کہ انھوں نے دنیا کی سب سے بڑی شاعرہ، عربی شاعرہ خنسا سے اس کے کافر بھائی کے قتل پر (جو مسلمانوں سے جنگ کرتا ہوا قتل ہوا تھا) کہا جانے والا مرثیہ سُنا اور اس قدر گریہ کیا کہ ان کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔ (میرے بابا علامہ سیّد شفیق حسن ایلیا نے مجھے بتایا تھا کہ اس وقت حضرت عمرؓ کا غلام قنفذ بھی ان کے ساتھ تھا اور اپنے آقا کی طرح گریہ کناں تھا) حالاں کہ سب جانتے ہیں کہ ''اشداء علی الکفار'' میں حضرت عمرؓ کا نام سرِ فہرست تھا، یعنی وہ اسلام کے دشمنوں کے حق میں بہت متشدد تھے۔ انھوں نے اس کے باوجود جو کچھ کیا، وہ عجب کچھ تھا۔ انھوں نے ادب اور حکمت کی جو قدر افزائی کی، اس کی مثالیں شاذ و نادر ہیں۔ اور یہ بات مسلمانوں کی تاریخ اور عربی ادب کا ایک بہت حقیر طالب علم یعنی جون ایلیا کہہ رہا ہے، جسے مسلمانوں کی تاریخ اور عربی ادب حفظ ہے۔

''جون ایلیا! تُو بہت ہی بڑ بولا ہے، تُو کیا اور تیری بساط کیا!''

''ہاں! میں کیا اور میری بساط کیا''۔

تو ہے یوں کہ حضرت عمرؓ نے اپنے نادر رویّے کے ذریعے ملّت کو ایک اعلیٰ معیار ارزانی کیا۔ میں اس بار بھی معیار ہی کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی خواہش رکھتا ہوں۔

اس لیے کہ میرے گمان کے حساب سے معیار کا سخن ابھی تمامی تک نہیں پہنچا۔

میں اس سلسلے میں حضرت علیؑ کے خیالات بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ خیالات آں جناب نے اپنے اشعار میں بیان فرمائے ہیں۔ یہاں یہ بات شاید قابلِ ذکر ہے کہ چاروں خلفا شعر کہتے تھے۔ بس یہ ہے کہ وہ مجھ گھس گھدے کی طرح ''پیشہ ور'' شاعر نہیں تھے۔ بہ ہر حال حیرت یہ ہے کہ جو لوگ ان حضرات سے عشق کرتے ہیں، ان کی اکثریت شعر و ادب اور فراست و حکمت کے عمل کو ٹھلوے پن کا کام سمجھتی ہے اور اس بد اندیشی اور اشتعال انگیز بے حیائی پر شرماتی بھی نہیں اور گھناؤنی تمکنت کے ساتھ اُونچے لہجے میں بات کرتی ہے۔ کاش وقت ان کو وہ مار مارے، وہ مار مارے کہ ان کا حلیہ بگڑ جائے۔ واویلا کہ ایسا ہوگا اور وادریغا کہ جلد یا بدیر ایسا ضرور ہوگا۔

بہ ہر حال اب میں معیارِ مزیت و فضیلت کے بارے میں حضرت علیؑ کے کچھ اشعار پیش کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:

ترجمہ: جمال کا تعلق ان ملبوسات سے نہیں ہے جو ہمیں زینت بخشتے ہیں۔ یقیناً جمال کا تعلق علم اور ادب سے ہے۔

ترجمہ: وہ شخص یتیم نہیں ہے جس کا باپ مر گیا ہو، یتیم تو وہ ہے جو عقل اور شرف سے محروم ہے۔

اس شعر کا ترجمہ بھی ملاحظہ کیجیے:

یعنی تم چاہے کسی کے بھی بیٹے بن جاؤ، مگر ادب کسب کرو کہ ادب کی خوبیاں تمھیں نسب سے بے نیاز کر دیں گی۔

حسب نسب والے کو زباں دانی اور ادب کے بغیر اس کی (کوئی بھی اعلیٰ سے اعلیٰ) نسبت بے نیاز اور غنی نہیں کر سکتی۔ بے شک جواں مرد وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ سُنو! میں ایسا ہوں۔ وہ جواں مرد نہیں ہے جو یہ کہتا ہو کہ میرا باپ ایسا تھا۔

وہ یہ فرما رہے ہیں کہ اصل فضیلت ادب ہے، دانش ہے۔ نسل اور نسب کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔ مگر ہم ہیں کہ ہم نے نسل پرستی اور نسب کے غرور کو اپنا ایمان بنا رکھا ہے۔ اور

دوسری نسل اور نسب کے لوگوں کی جان کو آ گئے ہیں۔ کیا تمھارے ہزاروں برس پہلے کے بزرگ بعض جانوروں سے بھی گئے گزرے نہیں تھے؟ میں اور تم ہیں کیا اور ہیں کون؟ کیسی نسل اور کہاں کا نسب۔ کیا سیّد اور کیا پیشہ ور۔ کیا برہمن اور کیا شودر۔ یہ تفریق بے نہایت بے ہودہ ہے۔ یہ سب کچھ محض خرافات ہے۔

ترجمہ: اے جہل کے باعث نسب پر ناز کرنے والے! اس کے سوا اور کیا ہے کہ تمام انسان ایک ماں باپ سے ہیں......

کیا تیرا یہ گمان ہے کہ وہ چاندی' لوہے' تانبے یا سونے سے پیدا کیے گئے ہیں؟

کیا تیرا یہ خیال ہے کہ وہ اپنی برتری اور فضیلت سے پیدا کیے گئے ہیں؟ کیا تُو ان میں گوشت' ہڈی اور پٹھوں کے سوا کچھ اور دیکھتا ہے؟

اس کے سوا کچھ نہیں کہ صرف عقلِ سلیم' خودداری' حیا' عفتِ نفس اور ادب ہی باعثِ فخر ہیں۔

ہمیں فضیلت کے معیار سے متعلق سیدنا علیؓ کے شعر جابہ جا ملتے ہیں' مگر صرف دو اشعار کا ترجمہ اور سُنیے' جو بہت مشہور ہیں۔

ترجمہ: یعنی ہم خدا کی اس تقسیم پر جو اس نے ہمارے درمیان کی ہے' خوشنود ہیں کہ ہمارے لیے علم ہے اور جاہلوں کے لیے مال۔

یقیناً مال بہت جلد فنا ہو جائے گا اور علم باقی رہے گا اور اس پر کبھی زوال نہیں آئے گا۔

عجیب بات ہے کہ اس ملک کی اکثریت مسلمان ہے اور بڑی ڈھٹائی کے ساتھ مسلمان ہونے پر نازاں ہے۔ ہر وقت اسلام کے نعرے لگاتی ہے مگر اسے اپنی مقدّس شخصیتوں کی ارجمند تعلیمات اور پُرمایہ رجحانات سے کوئی دُور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ غور کیا جائے تو جانا جائے گا کہ یہ لوگ' یہ ہمارے مسلمان' اسلام سے خدا واسطے کا بیر رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ کچھ کیوں ہے جو ہے اور بُری طرح ہے۔

ہم تو فاسق و فاجر لوگ ہیں۔ ہمارا کیا ہے اور ہم سے کیا پُوچھنا۔ پُوچھنا تو ان سے چاہیے جو دیں داری کے منافقت پیشہ دعوے دار ہیں اور ہر وقت مذہب کا کلمہ پڑھتے ہیں۔

ہندوؤں اور یہودیوں کو بات بے بات گالیاں دیتے ہیں۔ خدا اسلام کو ان کی دست برد سے بچائے اور شریف انسانوں کو ان کے شر سے محفوظ رکھے۔ ان کا معیار بدترین معیار ہے۔ وہ گھٹیا لوگوں کو بڑھاتے ہیں اور بڑھیا لوگوں کو گھٹاتے ہیں۔ وہ چھوٹوں کو اُٹھاتے ہیں اور بڑوں کو گراتے ہیں۔ ان کی تو ایسی کی تیسی! کیوں میرے فاضل ترین دانش ور بھائی معراج رسول، کیا خیال ہے؟ کیوں میرے شاعر بھائی انور فراز اور جواں سال ادیب بھائی شکیل عدنان، کیا خیال ہے؟ اور اے میری عزیز ترین ہستی اقلیم علیم اے منفرد انشا پرداز! تیری کہن کیا ہے؟

سسپنس ڈائجسٹ، جون1996

میزانیہ

لکھنے میں دُکھن ہے اور پڑھنے میں دُکھ ہے۔ بولنے میں سینے کا آزار ہے اور سُننے میں اُداسی ہے۔ جو کچھ لکھا گیا ہے اور جو کچھ پڑھا گیا ہے وہ ہمیشہ رائگاں گیا۔ جو کچھ کہا گیا، جو کچھ سُنا گیا اس میں گھاٹا ہی گھاٹا تھا۔

ایک پیڑھی کے بعد دوسری پیڑھی آئی اور اس نے اپنے ہونے کی حالت آزمائی۔ اس نے اپنے سُود اور زیاں کا حساب لگایا اور اذیّت کا اندوختہ کمایا اور اس کمائی میں پچھتاوے کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔

انسان ہزاروں سال سے اپنے ہونے اور نہ ہونے کا تماشا دیکھتا رہا ہے۔ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ "ہم نے اپنی امانت زمین اور پہاڑوں پر پیش کی مگر انھوں نے اس کے اُٹھانے سے انکار کر دیا۔ پر انسان نے اس (امانت) کو اُٹھالیا۔ البتہ البتہ انسان بڑا ظالم اور جاہل ہے"۔

البتہ البتہ انسان گھاٹے میں ہے اور یہ گھاٹا ابد تک جاری رہے گا۔ میرا وجود گھاٹا ہے۔ تمھارا وجود گھاٹا ہے اور میرا اور تمھارا شہود بھی گھاٹا ہے۔ میں اور تم گھاٹے کے کاروباری اور گھاٹے کے بیوپاری ہیں۔

اور سُنو اور سمجھو کہ جو کچھ تمھارے مسند آراؤں نے کہا اور تمھارے رہنماؤں نے تمھیں سمجھایا وہ اپنی ہوت میں گھاٹا ہی گھاٹا تھا۔ تم یعنی میں، میں یعنی تم، گھاٹے میں سوتے ہیں اور گھاٹے میں جاگتے ہیں۔ ہم گھاٹے میں بیٹھتے ہیں اور گھاٹے میں اُٹھتے ہیں۔ ہم گھاٹے میں اپنے گھروں سے نکلتے ہیں اور گھاٹے میں اپنے گھروں کی طرف پلٹتے ہیں۔ وائے ہو مجھ پر اور وائے ہو تم پر!

میں آخر کیوں بولوں اور تم آخر کیوں سُنو۔ میں آخر کیوں لکھوں اور تم آخر کیوں پڑھو، جب کہ ہے یوں کہ نہ میرے بولنے کا کچھ حاصل ہے اور نہ تمھارے سُننے کا۔ نہ میرے لکھنے کا کچھ حاصل ہے اور نہ تمھارے پڑھنے کا۔ سب کچھ مایا ہے، سب کچھ مایا ہے۔

تمھیں لُوٹا اور تمھارے ذہنوں کو لتاڑا جاتا ہے اور تم سنڈاس کے پتھر کی طرح چُپ رہتے ہو۔ تمھاری اس چُپ نے میرے سارے خوابوں کو تہس نہس کر دیا ہے۔ مجھے بڑا اچنبھا ہے کہ تم اپنے بیریوں کا تیار کیا ہوا زہر پی رہے ہو اور جی رہے ہو۔ یہ زہر فوراً اثر نہیں کرتا۔ یہ ذرا دیر بعد اثر کرتا ہے۔ کیا خیال ہے تمھارا، آخر تم کب تک زندگی کے سانس لیتے رہو گے؟ کب تک یعنی کب تک؟

وہ لوگ جنھیں تم بڑا سمجھتے ہو، وہ بہت چھوٹے ہیں۔ میں نے انھیں بہت نزدیک سے دیکھا ہے اور اپنی جھونجل اور جھنجلاہٹ میں انھیں بار بار ٹوکا ہے۔ میں نے ان کی جیبھ کو ان کے منہ میں روکا ہے اور روکے رکھا ہے۔

سُنو اور گُنو، جھوٹ اُدھیڑو اور سچ بُنو! تم اپنے مسند آراؤں اور رہ نماؤں کو ذلیل اور رذیل جانو۔ ہاں میں یعنی جون ایلیا اپنے خیال اور اپنی مقال کے پورے طنطنے کے ساتھ تم سے یہ کہہ رہا ہوں کہ انھیں ذلیل اور رذیل جانو اور ان کی کوئی بھی بات نہ مانو۔

تمھارے شہروں کے چور کوتوال بن گئے ہیں۔ تمھارے شہروں کے شہر دار جرائم پیشہ ہیں۔ تمھارے چوکی دار ڈکیت ہیں۔ تمھارے سارے مسیحا مریض ہیں اور تمھارے دادرَس قاتل ہیں۔

میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے سُنو اور میں تمھاری خاطر جو کچھ سہہ رہا ہوں اسے سمجھو! جو بھی تمھاری بھلائی کا لحاظ رکھنے کی بات کرتا ہے وہ لفنگا ہے، لقندرا ہے اور جھوٹ کی پوٹ ہے۔ اُس کی ''بھلائی'' تمھارے حق میں سب سے زیادہ زہریلی بُرائی ہے۔ جو تمھیں سیدھا راستہ دکھانے کی قسم کھاتا ہے وہ تمھیں بُری طرح بھٹکانا چاہتا ہے۔

میں اور تم قزّاقوں کے نرغے میں گھر گئے ہیں۔ جو بھی کہنے اور اپنی کہن منوانے کی طاقت رکھتا ہے وہ تمھاری صبحوں اور تمھاری شاموں کے راستے کا قزّاق ہے۔

تمھیں وہ سَر دَھرے نصیب ہوئے ہیں جن کے سر قلم کیے جانے چاہییں ۔ یہ لوگ تمھارے وجود اور تمھارے شہود کی سب سے بڑی بدبختی ہیں۔

حاکم بھی بدمعاش ہے اور حکیم بھی بدمعاش ہے۔ تمھارے ساتھ اب تک جو کچھ پیش آیا ہے تم اس پر گریہ کرنے کی بھی سکت نہیں رکھتے۔ کوئی شبہ نہیں کہ تم تاریخ کی ایک ندامت اور ملامت ہو۔ میں تمھارے دُکھ جھیلتا ہوں اور اپنے اندر شرماتا ہوں۔ میں تمھیں اپنی ذلّت اور رُسوائی جانتا ہوں اور اسی لیے میں اپنے آپ کو ذرا بھی نہیں گردانتا ہوں۔

تم اپنے اور اپنے دشمنوں کے خلاف صف آرا ہو جاؤ۔ اپنے اور ان کے سینوں سے حساب لو، اپنے اور ان کے سانسوں سے حساب لو۔ اپنے اور ان کے ہونٹوں سے حساب لو۔

میں شاید بس ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ بس ایک بات۔ اور وہ یہ کہ تم جن کی عزت کرتے ہو، جن کا احترام کرتے ہو وہ تاریخ کے سب سے زیادہ گھٹیا لوگ ہیں۔ میں نے جو اندازہ لگایا ہے، میرا جو حساب ہے وہ یہی ہے اور یہی تمھارے ماہ و سال کا میزانیہ ہے۔

سسپنس ڈائجسٹ، جولائی 1996

بھوک

''یہ اَبرو باد کی شام ہے جون ایلیا اور بہت فرحت انگیز شام ہے''۔

''ہاں! یہ اَبرو باد کی شام ہے نشیان! مگر فرحت انگیز شام ہرگز نہیں ہے''۔

''جون ایلیا! کیا واقعی یہ فرحت انگیز شام نہیں ہے؟''

''ہاں نشیان! یہ شام ہرگز فرحت انگیز شام نہیں ہے''۔

''لیکن یہ ایک فرحت انگیز شام کیوں نہیں ہے؟''

''بس نہیں ہے۔ یہ میرا باطنی احساس ہے اور رہا ''کیوں'' تو اس کا جواب نہ میرے پاس ہے اور نہ پروٹا گورس اور افلاطون کی روحوں کے پاس ہے۔ بہ ہر حال چند لمحے پہلے میں کچھ کہہ رہا تھا' نشیان! جانے کیا کہہ رہا تھا؟''

''تم روزی اور پوشش کی بات کر رہے تھے' یعنی روٹی اور کپڑے کی بات''۔

''ہاں! میں روٹی اور کپڑے اور انسان کی دوسری ناگزیر ضرورتوں کی بات کر رہا تھا۔ ذرا سوچو تو سہی' محسوس تو کرو کہ روٹی کتنی مہنگی ہو گئی ہے اور کپڑا کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔ اب تو کچھ ایسا ہے کہ ہمارے مُردے بے کفن دفن کیے جایا کریں گے اور روٹی اور کپڑے کی بات تو ہے ہی' اب تو پانی تک مہنگا ہو گیا ہے۔ روشنی تک مہنگی ہو گئی ہے۔ ہمارے اندر اتنا سوکھا پن پایا جاتا ہے کہ آنسو تک مہنگے ہو گئے ہیں۔ ہم اس تیرہ نصیبی میں مبتلا ہیں کہ بینائی تک مہنگی ہو گئی ہے''۔

''ہاں! ایسا تو ہے جون ایلیا!''

''ایسا ہی ہے نشیان! ایسا ہی ہے۔ تیری دانش اور بینش کی قسم! ایسا ہی ہے''۔

''مگر آخر ایسا کیوں ہے؟''

''ایسا یوں ہے نشیان کہ ہم بے حس ہو گئے ہیں' اتنے بے حس کہ اپنے معمولی سے معمولی حق کی بات بھی پوری دل گیری کے ساتھ ہمارے لبوں تک نہیں آتی۔ ہم نے اپنے آپ سے اتنی غیریت اختیار کر لی ہے کہ بے غیرت ہو کر رہ گئے ہیں''۔

''ہاں! سچ کہا تم نے جون ایلیا! سچ کہا۔ ہم بے حس' بے غیرت اور بے حیا ہو گئے ہیں۔ یہ تو ہمارا بینڈا پن ہے۔ یہ بینڈا پن تو ہمارا کھوجڑا کھودے گا''۔

''ارے بڈیم' بوژم! تُو اب بھی یہ کہہ رہا ہے کہ یہ بینڈا پن تو ہمارا کھوجڑا کھودے گا۔ میاں جی! اس نے ہمارا کھوجڑا کھود دیا۔ ہم اذیت اور عقوبت سہنے کے ہنر میں مشاق اور طاق ہیں۔ اس ہنر میں ہماری مہارت شہرہ آفاق ہے۔ کسی کا مقولہ ہے' شاید میرا ہی مقولہ ہے کہ ہمارا اپنی قبروں کے کتبے لکھنے میں کوئی جواب نہیں ہے۔ ہم اس باب میں بے مثال اور بے ہمال ہیں۔''

''ہماری رُوداد بڑی بُری رُوداد ہے' نشیان! ہماری تاریخ کی بدترین حرکتیں ظہور میں آرہی ہیں اور ہم خاموش ہیں۔ نہ جانے ہم ہیں بھی کیوں۔ ہم آخر دنیا کی کس کمی کو دُور کر رہے ہیں۔ ہم آخر سماج کے کس پھٹے ہوئے گریبان کی بخیہ گری کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ بتاؤ نشیان! بتاؤ۔ تمھیں دانش اور بینش کی باتیں کرنے کی لت اور دھت ہے' بتاؤ! دنیا کو ہماری آخر کیا ضرورت ہے۔ ہم آخر کیوں واقع ہوئے ہیں' آخر کیوں؟''

''مجھے تو اپنا ہونا ایک گھڑی کے لیے بھی گوارا نہیں ہے۔ سُنا جائے کہ ہم سر سے پاؤں تک ایک دھاندل ہیں' ایک دھاندلی ہیں۔ سچ جانو کہ مجھے اپنا اور تمھارا ہونا اور ہر لمحہ ہوئے جانا بہت ہی اُولوا اُولو لگتا ہے۔ ہم وقت کا ایک جنجال ہیں۔ ہم خود اپنے حق میں ایک وبال ہیں۔''

''میں تم سے باتیں کر رہا ہوں اور میرا دل خون ہو رہا ہے۔ اب رات ہو رہی ہے۔ اس وقت اس ملک میں لاکھوں گھروں کے چولھوں میں بجھی ہوئی راکھ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ لگاتار فاقوں کے سبب کتنی ہی ماؤں کی چھاتیاں اپنے دودھ پیتے بچوں کے حق میں سوکھ چکی

ہوں گی۔ وہ مہنگائی ہے' وہ کال ہے کہ ماؤں اور ان کے جایوں کے رشتے سوکھ کر رہ گئے ہیں۔ ایسے میں بولنے اور سُننے اور لکھنے اور پڑھنے کو ایک بُری طرح جھنجلا دینے والا جرم قرار دیا جانا چاہیے''۔

''میں بولتا ہوں اور تم سُنتے ہو۔ میں لکھتا ہوں اور تم پڑھتے ہو۔ پر اس بولنے اور سُننے اور اس لکھنے اور پڑھنے کا بھلا کیا حاصل ہے۔ جو کچھ بھی ہے وہ باطل ہے' باطل ہے' باطل ہے۔''

''اس ملک کے بہت کم لوگ عیش اور آرام یا آسودگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور باقی تمام لوگوں پر بھیانک نہوت کی وہ اُفتاد پڑی ہے کہ وہ مر مر کے جی رہے ہیں اور جی جی کے مر رہے ہیں۔''

''بھوکے قریب قریب ہر قوم میں پائے جاتے ہیں' (اگرچہ بعض قوموں میں ایک بھوکا بھی نہیں پایا جاتا) سو ہماری قوم میں بھی پائے جاتے ہیں اور ان کی اکثریت ہے مگر دوسری قوموں کے بھوکوں اور ہماری قوم کے بھوکوں میں جو فرق پایا جاتا ہے' وہ ''بلا کا خوش گوار'' ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ دوسری قوموں کے بھوکوں کو بھوک لگتی ہے' مگر ہماری قوم کے بھوکوں کو ذرا بھی بھوک نہیں لگتی۔ ان کے معدے تاریخِ انسانی کے عجیب و غریب معدے ہیں۔ اگر ہماری قوم کے بھوکوں کو بھوک لگتی تو ایسا نہ ہوتا جیسا کہ ہے۔''

''آخر ایسا کیوں ہے؟ ایسا کیوں ہے؟ نشیان' خدارا مجھے بتاؤ کہ ایسا کیوں ہے؟ اگر تم نہیں بتاؤ گے تو میں اس میز سے اپنا سر ٹکرا کر' اس کے شیشے سے اپنا سر پھوڑ کر اپنے بدن کو لہولہان کر لوں گا''۔

''بھوک' بھوک اور بھوک۔ جون ایلیا! تُو کچھ نہیں کر سکتا۔ بس ایک ہی کام کر سکتا ہے اور وہ یہ کہ لہو تھوک' تھوک اور تھوک۔ بھوک' بھوک اور بھوک''۔

نوید

''شیان!''

''ہاں صاجی!''

''ایک بات تو بتاؤ!''

''کیا بات؟''

''یہ بات کہ اکائی، دہائی، سیکڑا، ہزار، دس ہزار، لاکھ، دس لاکھ، کروڑ، دس کروڑ، ارب، دس ارب، کھرب، دس کھرب...... کے حساب سے وجودو شہود کی پہلی شام کب وجود میں آئی ہوگی، یعنی کب؟''

''صاجی! یہ حساب یا تو اہورا مزدا کو معلوم ہوگا یا اہرمن کو، بہ ہر حال مجھے نہیں معلوم۔ مگر تم نے یہ شام وام کا ذکر کیوں چھڑ دیا، آخر کیوں؟''

''میں نے ''شام وام'' کا ذکر کیوں چھیڑ دیا؟ یوں چھیڑ دیا کہ آج کی شام میری، تمھاری اور ہم سب کی نسبت سے اربوں اور کھربوں شاموں کی طرح ایک یوں ہی سی شام نہیں ہے۔ آج کی شام پاکستان کی عمر کے ۴۹ ویں برس کی آخری شام ہے، کیا سمجھے؟''

''سب کچھ سمجھا صاجی! یعنی کچھ نہیں سمجھا۔''

''خدا تمھارے اس فقرے کی تمھیں جزا دے اور خوب ترین جزا دے۔ بابل، کلدانیہ، اشور، نینوا اور عیلام کے کئی دانش مندوں سے میں نے یہ سخن سُنا ہے کہ ہم نے سب کچھ سمجھا اور کچھ بھی نہیں سمجھا۔ اور ہے بھی تو یہی۔''

''سخنِ فرخندہ جاری رہے صاجی!''

''اچھا تو سُنو اور گُنو۔ اس سرزمین کے ۴۹ویں برس کی یہ آخری شام کسی بھی شک اور شبہے کے بغیر ایک نہایت نافرجام اور بدہنگام شام ہے۔ نہایت نافرجام اور بدہنگام شام۔''

''ہے یوں کہ اس سرزمین کو آج تک نہ کوئی صبح راس آئی اور نہ کوئی شام۔ یہ بات شاید یوں بھی کہی جا سکتی ہو کہ یہ سرزمین نہ آج تک کسی صبح کی اہل ثابت ہوئی اور نہ کسی شام کی۔ نشیان! وائے ہو مجھ پر کہ میری اس بات میں نہ کوئی جھول ہے اور نہ کوئی بڑا بول۔''

''صاحبی! یہ تو بڑی رقّت کی بات ہے۔ اس حالت میں تو چار پائیاں اُلٹ کر بچھانا چاہئیں اور سوگ کی بساط بچھانا چاہیے۔ واویلا صد واویلا!''

''ہاں نشیان! واویلا صد واویلا! پر ہم ایسے نفرتی جان دار ہیں کہ ایسی صورتِ حال میں بھی جو کئی عشروں سے جاری ہے چودھویں اگست پر سوگ منانے کے بجائے اور اپنے اندر کھسیانے کے بجائے پوری دیدہ دلیری کے ساتھ جشن مناتے رہے ہیں۔''

''اگر کسی گروہ کو ڈھیٹ ہونے کی لَت اور دَھت پڑ گئی ہو تو اسے ہمارے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا رہا ہے کہ قوموں کی زندگی میں پچاس برس ہوتے ہی کیا ہیں۔ میں بھی یہی کہتا ہوں پر میں اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ پچاس برس بہ ہر حال پانچ برس نہیں ہوتے، پچیس برس کا دوگنا ہوتے ہیں اور یہ کہ وہ کم سے کم پچاس دقیقے پچاس ثانیے نہیں ہوتے۔''

''نشیان! اس بات کو بھلا کس طرح بُھلایا جا سکتا ہے کہ اب ہم نصف صدی کے مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ سو ہمیں اپنا حساب کتاب جاننا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی ہمیں ان قوموں، خاص طور پر بعید مشرق کی ان قوموں کے بارے میں سوچنا چاہیے جو چند سال پہلے تک ہم سے بہت پیچھے تھیں اور اب ہم سے اتنی آگے نکل گئی ہیں کہ ہمیں اپنے شرمانے پر بھی شرمانا چاہیے۔''

''صاحبی! یہ تو ہے اور یہ تو بہت بُرا ہونا ہے۔ یہ تو اپنے آپ کو بُری طرح کھونا ہے۔ یہ تو اپنے آپ کو اپنی ہی سرنوشت سے دھونا ہے۔ یہ تو اپنا نام ڈبونا ہے۔ یہ تو پل پل اپنے نہ ہونے کا بوجھ ڈھونا ہے۔''

"شیان! خدا تمھیں جزائے خیر دے۔ تم نے میری ذات کی اذیّت میں میرا ایسا ساتھ دیا ہے' ایسا ساتھ دیا ہے جسے میں بھولنے کی نہایت بے مروّت حالتوں میں بھی نہیں بھولوں گا۔"

"میں اور تم اور میری بولیر پن کی لکھت کے پڑھنے والے، دانش مند پڑھنے والے یعنی ہم سب اپنے ہونے کی شرمندگی بن کے رہ گئے ہیں۔ میں اپنے اور اپنے لوگوں، اپنے ارجمند لوگوں کے حال پر خونیں گریہ کرتا ہوں۔ ہاں اے میرے عزیز ترین عزیزو! میں اپنے اور تمھارے حال پر خونیں گریہ کرتا ہوں۔ وائے ہو مجھ پر کہ میں، میں ہوں اور وائے ہو تم پر کہ تم، تم ہو۔ پر' انصاف تو کرو کہ اگر میں، میں ہوں تو اس میں بھلا میرا کیا قصور ہے اور اگر تم، تم ہو تو اس میں بھلا تمھاری کیا تقصیر ہے؟ پر' میرے 'میں' ہونے اور تمھارے 'تم' ہونے میں کوئی ایک ایسی بات ہے جو خوش گوار ہر گز نہیں ہے۔"

"یہ اس سرزمین با تمکین کے ۴۹ ویں برس کی آخری شام ہے اور یہ بات جان کر باؤلی کھلّو بھی آپے سے باہر ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ جو کوئی اپنی عمر کا پچاسواں برس شروع کر رہا ہو اس کی گردن میں رال گدی بندھی ہو اور وہ بال جیون گھٹی پی رہا ہوں۔ باؤلی کھلّو کا آپے سے باہر ہونا ہر گز بے جا نہیں ہے۔ بے جا تو میرا آپے سے باہر نہ ہونا اور تمھارا آپے سے باہر نہ ہونا ہے۔"

"شہریوں کا گلا گھونٹا جا رہا ہے اور ان کے نوخروں سے سُروں اور راگنیوں کی ہوس رکھی جا رہی ہے۔ وجود کے پھوڑوں سے رنگ چاہے جا رہے ہیں۔ پوچھنے والا، بُود و نبود کا پوچھنے والا' یہاں کے تمام بے قرینہ موسموں سے یہ پوچھنا چاہتا ہے کہ تم کون ہو اور تم کیا تھے اور جب تاریخ کے منادی لوگوں کو سچ اور سچائی کے گرداگرد اکٹھا ہونے کے لیے ندا دے رہے تھے تو تم کہاں تھے۔ تمھارا ہونا تو بڑی بات ہے، ہم نے تو تمھارے نام تک نہیں سُنے تھے۔"

"ہم' ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ہارے مارے ہوئے ہم، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد اتنے بے دست و پا نہیں ہوئے تھے جتنے بے دست و پا گزشتہ چند

عشروں سے ہوئے ہیں۔ رانی جھانسی اور علیا حضرت، حضرت محل ہار کر بھی نہیں ہاری تھیں۔ جنرل بخت خاں اور کالے خاں گولہ انداز ہار کر بھی نہیں ہارے تھے۔ پر' ہم اب یہ محسوس کرنے لگے ہیں اور بُری طرح محسوس کرنے لگے ہیں کہ ہم آزادی کی صورت میں جیت کر بھی بہت بُرا ہارنا ہارے ہیں۔ یہ ایک دراز اور زخم طراز حکایت ہے۔ یہ ایک شرم ہا شرم ملامت ہے جس کا سُنانا بھی عذاب ہے اور سُننا بھی۔"

"ہمیں اور تمھیں وقت کے سچ اور سچائی کو اُن کی مسند سے اُتارنا اور لجلجی کہانیوں پر جان وارنا سکھایا گیا اور بڑے بھونڈے اور بینڈے ڈھنگ سے سکھایا گیا۔ تم بھی ان لوگوں کے بیچ اُکھڑے ہوئے سانس لیتے ہو اور میں بھی جو اپنے پھیپڑوں کی پونجی کو واہیات چیخ پکار میں لٹانے کے لتّی اور دھتّی ہو گئے ہیں۔"

"اب میری کہن یہ ہے کہ مجھے اور تمھیں ایک بیزار کن جشنِ آزادی کی للو پتو کرنے کے بجائے کھل کر بات کرنا چاہیے۔ ہم کھل کر بات نہ کرنے کے روگی ہو گئے ہیں۔ ہم ایک دوسرے ہی سے نہیں خود اپنے آپ سے بھی بے تکان جھوٹ بولتے ہیں اور اسے سچ کی ترازو میں تولتے ہیں۔ سُنو اور سمجھو! جشنِ آزادی تو بڑی بات ہے جس کے منانے کا ہم میں سے کسی کو بھی کوئی حق نہیں پہنچتا۔ بات تو آزادی کی ہے، ہاں آزادی کی۔ اس آزادی کی جو گزرے ہوئے پینتالیس، چھیالیس برس میں کبھی نہیں پائی گئی۔ یہ ایک جرم ہے، کس کا جرم ہے؟ خواص کا۔"

"جون ایلیا! خواص سے تمھاری کیا مُراد ہے؟"

"شیان جان! خواص سے میری مُراد سرکاری، درباری اور سیاست مداری لوگ ہیں۔ یعنی اس سرزمین کی تاریخ کے ابالسہ اور شیاطین۔"

"اور عوام سے؟"

"عوام سے......؟ عوام سے میری مُراد وہ لوگ ہیں جو سینوں میں دل رکھتے ہیں اور سروں میں دماغ اور جو تعداد میں بدخاصیت خواص سے کہیں زیادہ ہیں مگر درماندہ اور اُفتادہ ہیں۔"

''تو جون ایلیا! اگر تم اس سرزمین کی بھلائی چاہتے ہو تو پھر اُنھیں درماندہ اور اُفتادہ لوگوں کو آواز دو۔''

''ہاں، میں انھیں کو تو آواز دیتا رہا ہوں۔ وہی تو میری مراد اور میرا مقصود ہیں۔ میں انھیں کو تو آواز دے رہا ہوں۔ میں انھیں سے تو سخن کے سینے کی توانائی لے رہا ہوں۔ وہی تو میری اُمید ہیں، وہی تو آنے والے کل کی نوید ہیں۔''

سسپنس ڈائجسٹ، ستمبر 1996

بڑبڑاہٹ

"شام ہے اور ملال ہے اور یہ کہ دل کی سمتوں میں دُور دُور تک اُمیدوں کا کال ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے نشیان؟"

"ہاں! ایسا ہی ہے صاحبی!"

"شاید ایسا یوں ہے کہ اب کوئی بھی شخص، شخص نہیں رہا بل کہ محض ایک شے بن کر رہ گیا ہے یا اسے محض ایک شے بنا دیا گیا ہے۔ سو اُسے نہ اپنا احساس ہے، نہ اپنے سوا دوسروں کا۔ ایسے میں صبح بھی ایک ملال کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے اور شام بھی...... اور جب ایسا ہے تو پھر ایسا ضرور ہونا تھا کہ دل کی سمتوں میں دُور دُور تک اُمیدوں کا کال ہو...... سو وہ ہے"۔

"تم نے سچ کہا نشیان! ہم جہاں رہتے ہیں اور جن کے بیچ رہتے ہیں، ان سے احساس، شعور اور جذبوں کو چھین لیا گیا ہے۔ احساس، شعور اور جذبے افراد سے بھی چھینے جاتے ہیں اور اقوام سے بھی۔ مگر ہم سے احساس، شعور اور جذبوں کو بڑی سنگ دلی کے ساتھ چھینا گیا ہے۔ جن سے احساس، شعور اور جذبوں کو چھین لیا جائے، کیا ان کے ہونے کو ہونا کہا جا سکتا ہے نشیان!"

"نہیں ہرگز نہیں صاحبی"۔

"نشیان! ہم تو وقت کا ایک ٹھٹّا ہو کر رہ گئے ہیں اور ہمیں کس نے ٹھٹّا بنایا ہے؟"

"کس نے بنایا ہے صاحبی؟"

"ان لوگوں نے جو ہم میں سے ہر فرد کی تقدیر کا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہی ہمارے معاشرے کے سب سے بڑے مجرم ہیں۔ ان کے جرم نے، جرائم نے، ہم کو کہیں کا نہیں رکھا۔ ہم لحہ لحہ زوال کی طرف جا رہے ہیں اور کمال کا کوئی دماغ سوز خواب کبھی نہیں دیکھ سکتے۔

ایران کے شہنشاہ خسرو اوّل کے زمانے کے ایک دانش مند ''بروزیہ'' نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے:

''ہمارا زمانہ ہر پہلو سے زوال کی طرف جا رہا ہے۔ کچھ ایسا ہے کہ ہمارے لوگوں نے سچائی کو چھوڑ دیا ہے۔ جن چیزوں میں کچھ فائدہ ہو وہ ناپید ہیں۔ اور جو چیزیں پائی جاتی ہیں' وہ نقصان رساں ہیں۔ جس چیز میں خیر ہے' وہ پژمردہ ہے اور جس چیز میں شر ہے' وہ شاداب ہے۔''

''جھوٹ کا بول بالا ہے اور اچھائی میں ویرانی ہے۔ دانش ہیچ ہو کر رہ گئی ہے اور بے دانشی اُونچائی پر ہے۔ بُرائی فروغ پا رہی ہے اور شریفانہ طور روندا جا رہا ہے۔ اُنس اور دل بستگی کے برتاؤ کو بُری طرح چھوڑ دیا گیا ہے اور کینے نے قبولیت پائی ہے۔ نکوکاروں کو لطف اور مرحمت سے محروم کر دیا گیا ہے اور شرپسندوں پر لطف اور مرحمت کا دَر کھلا ہوا ہے۔''

''بے وفائی جاگ رہی ہے اور وفا سوئی ہوئی ہے۔ جھوٹ بارور ہے اور سچ بے ثمر ہے۔ راستی شکست کھا چکی ہے اور ناراستی کو جیت نصیب ہوئی ہے۔''

''اختیار والوں کا کام عیاشی اور بدمعاشی کرنا اور ہر ضابطے کو تباہ کرنا ہے۔ ہارے مارے ہوئے لوگ اپنی ذلت پر گزارہ کیے جا رہے ہیں اور جن لوگوں کو غلبہ حاصل ہے' وہ اپنے ظالمانہ غلبے پر اِتراتے ہیں۔''

''لالچ ہے کہ اس کا پیٹ ہی نہیں بھر پاتا اور وہ اِدھر اور اُدھر کی ہر جنس کو تھورے چلا جا رہا ہے۔ بدشعاروں کا دماغ آسمان پر ہے اور نکوکار پاتال میں سانس لیتے ہیں۔ جو اقتدار کے اہل ہیں' وہ اقتدار سے محروم ہیں اور جو نااہل ہیں' وہ اقتدار سے بہرہ مند ہیں۔ نیکی پر پابندی ہے اور بدی کو کُھلی چُھوٹ ملی ہوئی ہے''۔

''شیان! ایرانِ پاستاں کے دانش مند برزویہ کا یہ بیان کیا ہمارے زمانے پر صادق نہیں آتا؟''

''صاحبی! برزویہ کا یہ بیان ہمارے زمانے پر صادق آتا ہے اور حرف بہ حرف صادق آتا ہے''

''تو کیا اُس دقیانوسی دَور کے کسی دانش مند کا بیان، علم اور دانش کے اس دور پر صادق آنا چاہیے؟ اور اگر صادق آتا ہے تو کیا یہ اس دور کی ایک بدترین ہجو نہیں ہے؟''

''ہاں! صاحبی! اگر کسی قدیم دور کے دانش مند کا بیان، اس جدید دور پر، علم اور دانش کے اس جدید دور پر صادق آتا ہے تو کوئی شک نہیں کہ یہ بات اس دَور کی بدترین ہجو ہے، جس پر اس دور کو بُری طرح شرمانا چاہیے۔ شرم سے پانی پانی ہو جانا چاہیے''۔

''ہے کہ نہیں؟''

''ہاں صاحبی!''

''شیان! میں فریاد کرتا ہوں کہ میں کسی بھی دور کا آدمی نہیں ہوں، نہ قدیم دور کا اور نہ جدید دور کا۔ میں ایرانِ پاستاں کے دانش مند برزویہ کی بات کرتا ہوں اور اسے اپنی بات سمجھتا ہوں، جو میری بات نہیں ہے۔ اور اپنی بات کرتا ہوں جو برزویہ کی بات نہیں ہے۔ تو اس کا مطلب اس کے سوا آخر اور کیا ہے کہ میں اب تک بڑ ہانکتا رہا ہوں۔ میری یہ کہن بُڑبُڑاہٹ کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے، کچھ بھی تو نہیں ہے''۔

سسپنس ڈائجسٹ، اکتوبر 1996

ہمارا بھی کوئی گھر ہے

''شیان!''

''ہاں صاجی!''

''تمھیں لاہور کے زمین اور آسمان کیسے لگے؟''

''صاجی! مجھے تو لاہور کے زمین اور آسمان ہمیشہ امروہے کے زمین اور آسمان لگے ہیں۔''

''میرے نانا اور میرے دادا کا، خدا تمھیں جزائے خیر دے کہ تم شکر گزاروں میں سے ہو اور تم تو ہمیشہ ہی شکر گزاروں میں سے رہے ہو۔ امابعد، میرا اور تمھارا جو معاملہ رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہم امروہے سے آنے کے بعد بے شہر ہو کر رہ گئے ہیں۔ پر جب ہم دونوں لاہور آتے ہیں تو ہمیں ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہمارا بھی کوئی شہر ہے۔''

''ہاں صاجی! ایسا ہی ہے۔''

''شیان! یہی نہیں کہ مجھے یہاں آکر ایسا لگتا ہے کہ ہمارا بھی کوئی شہر ہے، مجھے تو ایسا بھی لگتا ہے کہ جیسے ہمارا بھی کوئی گھر ہے۔ ہمارا اَمّتی شیخ غلام ہمدانی مصحفی لکھنؤ میں اپنے آپ کو نگھرایا تا تھا تو اُس نے کہا تھا''۔

مصحفی یار کے گھر کے آگے
ہم سے کتنے نگھرے بیٹھے ہیں

''صاجی! تم نے بھی تو کراچی میں ایک ایسا ہی سخن کیا تھا۔''

''کون سا سخن؟''

"بھول گئے، تو سُنو۔"

کیا دوانوں نے ترے کوچ ہے بستی سے کیا
ورنہ سنسان ہوں راہیں نگھروں کے ہوتے

"ہاں نشیان، میں تو یہ بھول ہی گیا تھا۔ پر اب میں بات کو کچھ آگے بڑھاتا ہوں بل کہ مجھے تو یہ کہنا چاہیے کہ میں بات کو بہت آگے بڑھاتا ہوں۔"

"نشیان! بات یہ ہے کہ وجود بطور عدم کے اس مکان میں بڑا نگھرا پن ہے اور ہم اپنی تاریخ کے "ازل" ہی سے نگھرے رہے ہیں۔

"میرا گمان ہے نشیان کہ میں کچھ اور کہہ رہا تھا اور کہنے لگا کچھ اور......"

"ہاں، تم یہ کہہ رہے تھے کہ ہم دونوں کو لاہور کے زمین اور آسمان امرو ہے کے زمین اور آسمان لگتے ہیں۔"

"ہاں، میں یہی کہہ رہا تھا۔ اماں دیکھو تو، اس سرزمینِ خجستہ آئین میں ویسی ہی دیواریں ہماری نگاہوں کو چمکارتی ہیں جیسی دیواریں ہماری نگاہوں کو وہاں چمکارا کرتی تھیں۔ لکھوری اینٹوں یعنی لاہوری اینٹوں سے چُنی ہوئی دیواریں، ہے نا؟"

"ہاں صاحبی! "اندھیریا مسجد" اور "اللہ ہُو کے باڑے" کی قسم ایسا ہی ہے۔"

"ایسا لگتا ہے کہ جیسے لاہور کی سرسبزی اور شادابی کا پہلوٹھا ہو۔ پر نشیان، ایک بات بتاؤ، کیا اس شہرِ پُرمہر کے حال کا "تمام تر" یہی ہے۔"

"اب اگر تم نے وہ بات پوچھ ہی لی جو خوش مزگی میں بدمزگی پیدا کرنے والی بات ہے۔ ہے یہی کہ اس شہرِ پُرمہر کے حال کا "تمام تر" یہ نہیں ہے۔"

"تم نے وہ بات کہی جو سو میں سوچ ہے۔ اس شہر کی سرسبزی اور شادابی کے سینے میں اب ایک پژمردگی سی پائی جاتی ہے۔"

"صاحبی! آخر ایسا کیوں ہے؟"

"ایسا یوں ہے کہ یہ شہرِ فرخندہ، پنجاب میں واقع ہوا ہے، سو جدھر دیکھو اُدھر پنجابی ہی پنجابی دکھائی دیتے ہیں۔"

''پرٗ صاجی! کیا یہاں پنجابیوں کے بجائے اعرابیوں کو دکھائی دینا چاہیے تھا؟ اور اگر کہیں ایسا ہوتا تو وہ یہاں کی ساری سرسبزی اور شادابی کو چٹ کر گئے ہوتے۔''

''اچھا ہوتا نشیان اگر یہاں کے بازاروں اور برزنوں میں پنجابیوں کے بجائے اعرابیوں کے انبوہ دکھائی دیتے اوران کا کھوے سے کھوا چھل رہا ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید کسی قدر بہتر ہوتا۔''

''صاجی! ہمارے بچپن اور لڑک پن کے چین چان کی سوگند، تمھاری یہ بات میرے پلّے نہیں پڑی۔ میں ذرا بھی نہیں سمجھ پارہا کہ اس بات کے ذریعے آخر کیا کہنا چاہا جارہا ہے۔''

''یہ کہنا چاہا جارہا ہے کہ عام طور پر پنجاب اور خاص طور پر لاہور کو اس ملک کی مقسوم سازی، مبارک اور مسعود مقسوم سازی کا یادگار کارنامہ انجام دینا چاہیے تھا، جو نہیں دیا گیا۔ یہ سرزمین خوش نتیجہ فیصلے کرنے اور انھیں سُنوانے کی پاکستان کے ہر علاقے سے کہیں زیادہ استطاعت رکھتی تھی۔ پرٗ اس نے اپنی اس استطاعت سے کوئی قاعدے اور قرینے کا کام نہیں لیا۔''

''پاکستان کے بناؤ کا معاملہ ہو یا بگاڑ کا، اس معاملے سے متعلق فیصلہ کُن کردار پنجاب اور خاص طور پر لاہور کو ادا کرنا ہے۔ میں گمان کرتا ہوں نشیان کہ اگر پنجاب کے لوگوں نے اپنا فیصلہ کُن کردار، خوش گوار کردار ادا نہیں کیا اور اس ملک کی اندوہ ناک کیفیت کے زیرِ اثر خون کے گھونٹ پینے کے بجائے لسّی ہی پیتے رہے تو ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔''

میرا گمان ہے

یہ خیالِ ملال اور خیر و جمال کے شوقِ وصال کی ایک سرمازدہ شام ہے، جو اُداس بھی ہے اور جس میں آنے والے دنوں سے مہربانی کی ایک آس بھی ہے۔ یہ آس میرے اور تمھارے یاس زدہ دلوں کے لیے ایک بہت بڑا سہارا ہے۔

میں تم سے ایک ایسی بات کہنا چاہتا ہوں جس بات کے طور طور پہلوؤں کے بارے میں تم مجھ سے کہیں زیادہ جانتے ہو۔ مجھ سے زیادہ کیوں جانتے ہو؟ مجھ سے زیادہ اس لیے جانتے ہو کہ میں تو بس ایک شاعر ہوں، شاعر یعنی ایک خیالی آدمی ہوں۔ اور ایک خیالی آدمی کسی بات کے طور طور پہلوؤں کے بارے میں جاننے کی بھلا کیا استطاعت رکھ سکتا ہے۔

بہ ہر حال جو بات میں تم سے کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ انسان کا سب سے قیمتی اثاثہ اس کی آس اور اُمید ہوتی ہے۔ اور میرے لوگو! شنوائی کی پوری گرم جوشی کے ساتھ میری ایک کہن سنو، اور وہ کہن یہ ہے کہ زندگی کے کسی لمحے میں آس اور اُمید کا دامن نہ چھوڑیو۔ اس لیے کہ لمحے لمحے اور آن آن کی آس اور اُمید ہی تو زندگی ہے۔

اب ہم نئے سال کے دائرۂ اثر میں سانس لے رہے ہیں۔ میں اپنے، اپنے ادیب اور دانش ور بھائی معراج رسول کے اور تمھارے سانسوں میں زندگی اور فروزندگی کی جاں پرور حرارت محسوس کرنے کی بڑی خواہش رکھتا ہوں۔

ہم پچھلے دنوں اچانک ایک نئی صورتِ معاملہ سے دوچار ہوئے ہیں۔ یعنی محترمہ بے نظیر کی حکومت کی برطرفی سے۔ میں نے غلط کہا، ہرگز کوئی نئی صورتِ معاملہ نہیں تھی، یہ تو پرانی اور بار بار پیش آنے والی صورت ہائے معاملہ میں سے ایک صورتِ معاملہ

تھی۔ اور یہ ایک ایسا امر ہے جس کے ہم پورے دل کے ساتھ خوگر ہو چکے ہیں۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ اس طرح کی ہر صورتِ معاملہ سے ایک خاص طور کی رونق یا کم سے کم ایک دل بہلانے والی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

میں اور انیق احمد پچھلے دنوں لاہور میں مشہور مطبوعاتی ادارے ''الحمد'' کے مہمان تھے۔ الحمد ایک ناشر یا مطبوعاتی ادارہ ہی نہیں ہے' بل کہ وہ لاہور کے شاعروں' ادیبوں اور دانش وروں کا ایک ہنگامہ خیز مرکز بھی ہے۔ اور وہ اس لیے کہ اس کا بانی اور میرا چھوٹا بھائی صفدر حسین ایک مقناطیسی شخصیت کا مالک ہے۔ ''الحمد'' کی شام گاہی محفلوں میں مجھے صرف لاہور ہی کے اربابِ دانش و بینش کے افادات سے مستفید ہونے کا موقع نہیں ملا بل کہ پنجاب کے مختلف شہروں اور قصبوں سے لاہور آنے والے اور ''الحمد'' کی محفلوں کو رنگ میں لانے والے نوجوان اور جوان نسل' پختہ عمر کی نسل اور بزرگ نسل کے اہلِ دل اور اہلِ نظر حضرات کی ایک قابلِ ذکر تعداد سے ملاقات کرنے اور بہت اہم قومی اور سیاسی مسئلوں اور معاملوں کو سمجھنے کی ثروت بھی نصیب ہوئی۔

میں نے برسوں پہلے ہی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ کراچی کے رہنے والے' پاکستان کی سیاست گری یا سیاست گردی کے بارے میں صرف اسی قدر جان سکتے ہیں جس قدر کراچی کے تجارت پیشہ اور ہرزہ اندیشہ اخباروں کا ایک سادہ لوح قاری بل کہ زیادہ بلیغ معنوں میں ایک ''لالوکھیتیا'' قاری' سادہ لوح قاری جان سکتا ہے' چاہے وہ کراچی کے مشرق میں رہتا ہو یا مغرب میں' شمال میں رہتا ہو یا جنوب میں۔ یہاں عرض کر دینا ضروری ہے کہ ''لالوکھیتیا'' صرف وہ شخص نہیں ہوتا جو کراچی کی لالوکھیت نامی بستی ''شہرہ آفاق'' بستی میں رہتا ہو۔ اور اسے لالوکھیت کو لالوکھیت کے بجائے ''لیاقت آباد'' کہے جانے اور کہلائے جانے پر حد درجہ اصرار ہو۔ بل کہ ہر اُردو بولنے والا لالوکھیتیا ہوتا ہے۔ چاہے وہ کراچی کے کسی بھی علاقے میں رہتا ہو۔ کراچی کے کسی بھی علاقے کا کیا ذکر' چاہے وہ پیرس اور لندن میں رہتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ''لالوکھیتیا'' درحقیقت ایک آفاقی مزاج رکھنے والی قوم کا نام ہے جس کی مادری زبان اُردو ہے۔ ہندوستان کے

اُردو بولنے والے بھی سب کے سب لالوکھیتے ہیں اور اگر اُردو بولنے والی اس قوم کے ماضی کی طرف جاؤ تو تمھیں اندازہ ہو گا کہ میر تقی میرؔ مرزا غالبؔ اور میر انیسؔ بھی لالوکھیتے ہی تھے۔ میرے عزیزو! یہ ایک عجیب و غریب تاریخی اور تہذیبی نکتہ ہے، جس پر بڑی دل جمعی کے ساتھ سوچنا چاہیے۔

بہ ہر حال میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ مظلوم، معصوم اور یک سر بے مفہوم لالوکھیتے پاکستان کی سیاست کے بارے میں نہ پہلے کچھ جانتے تھے اور نہ اب جانتے ہیں۔ ان کی قابلِ رشک باخبری صرف چانڈو خانوں کی افواہوں کی ساکھ پر گزر بسر کرتی ہے۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ کراچی کی دیگر اقوام بھی حکمراں معاشرے کے معاملات، اس کی حرکات اور اس کی شرم ناک فعلیات کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں جتنا کوئی لالوکھیتا۔

اکتوبر کے شاید تیسرے ہفتے کی بات ہے کہ مشہور شاعر، ادیب اور صحافی برادرِ عزیز ڈاکٹر حسن رضوی نے روزنامہ جنگ کے دفتر میں مجھ سے میرے پنجاب کے دورانِ قیام کے تاثرات کے بارے میں سیاسی نوعیت کے سوال کیے اور کہا کہ آپ کے جوابات اخبار میں شائع ہوں گے۔ میں نے کہا: ''حسن میاں! مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے''۔

میرے جوابات کا حاصل یہ تھا کہ محترمہ بے نظیر میرے اندازے کے مطابق اپنی مقبولیت سے بہت ہی رضا کارانہ اور فراخ دلانہ طور پر دست بردار ہو چکی ہیں اور مجھے سخت افسوس ہے کہ پنجاب اب انھیں سہنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے افسوس یوں ہے کہ میں ان کا بہی خواہ رہا ہوں اور یہ میری محرومی ہے کہ مجھے اس بات کا ذرا بھی اندازہ نہیں کہ نواز شریف ان کا نعم البدل ثابت ہوں گے یا نہیں؟

مجھے جُد اجُدا پیڑھیوں کے جن لوگوں سے پنجاب کے نفس اور نفسیت کے بارے میں بہت کچھ جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا، میں ان کے نام، معتبر نام گِنانا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ ہیں حضرت احمد ندیم قاسمی، حضرت قتیل شفائی، جناب احمد راہی، شہزاد احمد، ظفر اقبال، راجا رسالو، بزرگ شاعر اور ادبی صحافی جوش لاہوری، پروفیسر عقیل احمد، علامہ سیّد جنید غزنوی،

ڈاکٹر حسن رضوی، خالد احمد، انگریزی صحافی اور اُردو شاعر سیّد حماد غزنوی، منصورہ احمد، ڈاکٹر سیّد خورشید رضوی، مرزا رضی الرحمٰن، ذکاء الرحمٰن، منور سعید، شعیب بن عزیز، پروفیسر معین نظامی، عباس تابش، صفدر حسین، سعود عثمانی، مقصود وفا، پرویز ہاشمی، گلزار پاویل، فیضی، راشد اقبال، فضل حسین راہی، ماہرِ نفسیات علیم، پولیس افسر اور پنجابی اور اُردو شاعر ویریا ساہی، ممتاز صحافی اور ادیب تنویر ظہور، عمر زماں، تنویر عباس نقوی، سیّد جمشید رضوی، غلام محمد سالی، احمد فرید، مظفر حسین، فیصل حنیف اور شہاب یار خان وغیرہم۔

''الحمد'' کی محفلِ شام گاہی میں ایک دن عباس تابش اور ''الحمد'' کے بانی صفدر حسین نے مجھ سے کہا کہ جون بھائی! آج تو ہم آپ کی قوالیاں سُنیں گے۔ ویسے بھی ہم آپ کے ''ہم نوا'' ہیں۔ میں نے کہا کہ باؤلے ہو گئے ہو پنجابی کہیں کے! تم قوالیاں سُننا چاہتے ہو اور یہاں طبلہ ہی تڑخنے والا ہے۔ وہ دونوں میری بات سُن کر سراپا سوال ہو گئے۔ میں نے کہا: عباس تابش، تُو بھی سُن اور صفدر حسین تُو بھی کہ بے نظیر جا رہی ہے۔ وہ دونوں باؤلے کہنے لگے کہ نہیں جون بھائی، ابھی نہیں۔ یہ سُن کر عمر زماں نے جو لندن میں کئی برس منجّم کی حیثیت سے گزر بسر کر چکے ہیں اور اُردو اور انگریزی کے شاعر اور مصنف ہیں، کہا: ''جون بھائی! سچ کہہ رہے ہیں۔ محترمہ بے نظیر دو ہفتے سے زیادہ نہیں چلیں گی'' اور عمر زماں کی یہ بات حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔

میں کہتا ہوں کہ کاش ایسا ہونا وقت کا تقاضا نہ ہوتا۔ پر، جو ہوا سو ہوا۔ اب جو کچھ ہمارے دلوں اور ذہنوں کے کشکولوں میں ہے، وہ حادثوں اور سانحوں کے خدشے ہیں اور کچھ اُمیدیں۔ ہمیں حادثوں اور سانحوں کے خدشوں سے گھبرانا نہیں چاہیے، کیوں کہ حادثوں اور سانحوں کے خدشے تو کیا، ہم تو حادثوں پر حادثے اور سانحوں پر سانحے بھگتتے چلے آئے ہیں۔ ہمیں اپنی خوش نصیبی کے احساس سے بے سروکار نہیں رہنا چاہیے۔ ہماری خوش نصیبی یہ ہے کہ ہمارے دلوں اور ذہنوں کے کشکولوں میں اُمیدیں بھی ہیں۔ ارجمند اُمیدیں اور یہ بہت ہی خجستہ اور فرخندہ حقیقت ہے۔ میرا گمان ہے، تم میرے اس گمان کو میری خواہش کہہ لو کہ اب بدتر سے بدترین نہیں پیش آئے گا۔ اور ہمیں شاید اس بات پر

پورے دل کے ساتھ خوش اور خرسند ہونا چاہیے۔ ہے کہ نہیں؟ میں آخر میں جس بات کو حاصلِ کلام سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں نے پنجاب کے دو مہینے کے قیام کے دوران جو بات بڑی دل انگیزی کے ساتھ محسوس کی، وہ یہ ہے کہ پنجاب کے خواص ہی نہیں، عوام بھی سیاسی اور اجتماعی مسئلوں کے معاملے میں پہلے سے کہیں زیادہ حساس اور باشعور ہو چکے ہیں اور میں اس کیفیت کو اپنی اور پوری قوم کی بڑی اقبال مندی اور خوش نصیبی سمجھتا ہوں۔

سسپنس ڈائجسٹ جنوری 1997ء

خارجی

میں ان دنوں اُردو کے محترم شاعر جناب ہمایوں ظفر زیدی کی دعوت پر عمان آیا ہوا ہوں اور عمان کے دارالحکومت مسقط کے ایک مہمان خانے میں پاکستانی اور ہندوستانی شاعروں کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہوں۔ اس مہمان خانے میں جو نوجوان ہماری خدمت پر مامور ہے' اس کا نام پریم ہے اور تامل ناڈو کا رہنے والا ہے۔

میں گزشتہ کئی برس سے عرب کی جن ریاستوں میں جاتا رہا ہوں' وہاں تامل' تلگو اور بنگالی بولنے والے ہندوؤں سے میرا زیادہ سابقہ پڑا۔ میرے تجربے کے مطابق عرب' مسلمان اور نامسلمان کی تفریق سے دُور کا بھی سروکار نہیں رکھتے۔ میرا یہ تجربہ ان عرب ریاستوں سے مخصوص ہے جہاں میں جاتا رہا ہوں۔

عمان کے حکم ران سلطان قابوس ہیں جو تاریخِ اسلام کے آشوب ناک اور دہشت انگیز فرقے یعنی فرقۂ خوارج سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے زنجبار بھی خوارج کے زیرِ نگیں تھے۔ بہ ہر حال میں جس دن سے یہاں آیا ہوں اس دن سے میرے ذہن میں ۳۷ھ بسا ہوا ہے۔ ۳۷ھ سے پہلے مسلمانوں میں صرف دو فرقے پائے جاتے تھے یعنی سنّی اور شیعہ۔ مگر جنگِ صفین کے نتیجے میں ایک تیسرا بے حد جسور اور سر شور فرقہ وجود میں آیا' جو خارجی کہلایا۔

میں نے جنگِ صفین کا ذکر کیا ہے۔ صفین شہرِ رقہ کے قریب دریائے فرات کے ساحل پر واقع ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ دریائے فرات بھی عجب واقعہ انگیز دریا ہے۔ اس کے ساحل نے جتنے مرثیے اور رَجز کہلوائے اور پڑھوائے' اتنے مرثیے اور رَجز دنیا کے کسی بھی دریا کے ساحل نے نہیں کہلوائے اور نہیں پڑھوائے۔

جنگِ صفین میں حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب کے لشکر کی تعداد نوّے ہزار تھی اور حضرت معاویہؓ ابنِ ابی سفیان کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار۔ لیکن اہلِ تحقیق نے دونوں لشکروں کے بارے میں جو بات کہی ہے وہ اس کے برعکس ہے۔ یہ جنگ، یہ بدبخت ترین جنگ ایک سو دس دن تک جاری رہی۔ اس جنگ نے دونوں طرف کے ستّر ہزار مسلمانوں، یعنی انسانوں کی جانوں کی بھینٹ لی۔

آپ جانتے ہیں کہ اس جنگ کے آخری مرحلے میں کیا صورتِ واقعہ پیش آئی۔ اس پیچیدہ صورتِ واقعہ کے نتیجے میں حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب کو "تحکیم" پر رضامند ہونا پڑا، یعنی یہ کہ ایک شخص حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب کی طرف سے "حَکَم" مقرّر کیا جائے اور ایک شخص حضرت معاویہؓ ابنِ ابی سفیان کی طرف سے۔ اور وہ دونوں باہمی اتفاق کے بعد فیصلہ دیں کہ حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب مسلمانوں کی سربراہی کے اہل ہیں یا حضرت معاویہؓ ابنِ ابی سفیان۔ یہ ساعتیں تاریخِ اسلام کی فیصلہ کن ترین ساعتیں تھیں۔ اگر تاریخِ اسلام پر یہ وقت نہ پڑا ہوتا تو شاید اُمتِ مسلمہ کو مسلسل سیلِ خوں سے نہ گزرنا پڑتا۔ وہ مسلمانوں کی زندگی کا روزِ خوں طلب تھا جو آنے والی خونیں صدیوں کا سرچشمہ بنا۔

اس امر یعنی "تحکیم" پر حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب کے لشکریوں کا ایک سخت گیر اور سرشور گروہ بھڑک اُٹھا اور اس نے چیخ چیخ کر نعرہ لگایا کہ "لا حکم الا اللّٰہ" یعنی فیصلہ دینے کا حق خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اور حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب کے خلاف بغاوت کردی اور خارجی (لفظ خوارج کا واحد) کہلایا۔

خوارج نے حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب سے پہلے کسی بھی خلیفۂ راشد کے فیصلے سے اختلاف نہیں کیا۔ انھوں نے "تحکیم" کے فیصلے کے سوا اس دن تک حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب کے کسی فیصلے سے بھی کوئی اختلاف نہیں کیا تھا۔ سو اُن کا یہ نعرہ کہ فیصلے کا حق خدا کے سوا کسی کو بھی حاصل نہیں، محض جہل اور ہٹ دھرمی پر مبنی تھا۔

عربی کے مشہور ادیب اور نقاد اُستاد حسن الزیات نے خوارج کے مزاج اور سیرت کا ...لعہ پیش کیا ہے، وہ استفادے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں: "خوارج کی اکثریت بدّو

غیر مہذب، خانہ بدوش...... اپنے فیصلوں میں ظلم پر عامل، مذہب کے باب میں متشدد، عبادت میں انتہا پسند، معاملات میں سخت گیر اور جدال و قتال کی قائل تھی...... انھوں نے خلفا کے اعمال اور عام مسلمانوں کے عقیدے کا جائزہ لیا اور ان میں سے بعض کو مجرم اور بعض کو کافر قرار دیا''۔

خوارج کو انسانوں کی تاریخ کا عجیب و غریب گروہ قرار دیا جانا چاہیے۔ ایسا مجموعۂ اضداد گروہ آج تک پیدا نہیں ہوا۔ بیک وقت بے حد ظالم اور بے حد عادل، بے حد حق پسند اور بے حد باطل کوش۔ دین کے لیے جان دے دینے والے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ دوسرے مسلمانوں کی عورتوں، معصوم بچوں اور بوڑھوں پر ذرا بھی رحم نہیں کھاتے تھے اور ان کے ساتھ ہیبت ناک بے رحمی سے پیش آتے تھے اور اسے بالکل جائز سمجھتے تھے، اس لیے کہ انھوں نے اپنے خیال میں اپنی جان اور اپنے مال کو جنت کے عوض خدا کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔

خوارج نے بنوامیہ کے عہد میں آہستہ آہستہ بہت زور پکڑ لیا اور حکومت کے لیے ایک مسئلہ بن گئے۔ اس دوران ان کے ایک گروہ نے عراق اور ایران میں اور دوسرے گروہ نے عرب میں تسلّط حاصل کر لیا تھا۔ بنوامیہ کے عہد کے بعد وہ بنوعباس کی جان کا جنجال بن گئے۔ کم و بیش ڈھائی تین صدی تک انھوں نے مسلمانوں کی سیاسی قوّت کو سخت نقصان پہنچایا۔ وہ خاص طور پر بنوامیہ کے حکم رانوں کو غلیظ ترین دشنام طرازی کا ہدف بناتے تھے۔

اب میں جو بات ان کے مسلک کے بارے میں عرض کروں گا، وہ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ پہلے یہ عرض کر دوں کہ سنّیوں کے مسلک کی رُو سے خلیفۃ المسلمین کا قریشی ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ آں حضرتؐ قبیلۂ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی مرتبہ خلافت کے باب میں آں حضرتؐ کی قرابت داری فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ حقِ خلافت کے بارے میں شیعوں کی منطق بھی اسی نوع کی ہے، یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ خلیفہ یا امام کا اہلِ بیت میں سے ہونا واجب ہے۔

خوارج امرِ خلافت و امامت کے بارے میں سنّیوں اور شیعوں دونوں کو غلط اندیش بل کہ گُم راہ سمجھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خلیفہ کو انتخاب کے ذریعے مقرّر ہونا چاہیے۔

اس کا قریشی، فاطمی یا عرب ہونا ہرگز ضروری نہیں ہے۔ کوئی بھی مسلمان چاہے وہ عرب ہو یا عجمی، تازی ہو یا ترکی، خلیفہ ہوسکتا ہے۔ سو اگر کوئی مسلمان، کوئی بھی مسلمان انتخاب کے ذریعے خلافت حاصل کرلے اور احکامِ الٰہی پر کاربند رہے، وہ خلیفۂ برحق قرار پائے گا۔

خوارج وقت کے ساتھ ساتھ کئی فرقوں میں بٹ گئے۔ ان کے قابلِ ذکر فرقے چار ہیں: یعنی ازارقہ، نجدات، اباضیہ اور صفریہ۔ لیکن ''ایمان'' کے بارے میں ان کے تقریباً تمام فرقے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ دین کے احکام پر عمل کرنا ایمان کا جزو ہے۔ یعنی ایمان کا تعلق صرف عقیدے سے نہیں بل کہ عقیدے اور عمل دونوں سے ہے۔ چناں چہ اگر کوئی شخص خدا کی وحدانیت اور آں حضرتؐ کی نبوت کا تو قائل ہو، مگر دین کے فرائض پر عمل نہ کرے اور گناہوں کا مرتکب ہو، وہ کافر ہے اور اس کا قتل واجب ہے۔ ان کے اس مسلک کے مطابق سنّیوں اور شیعوں کی اکثریت کافر قرار پاتی ہے۔ اس لیے انھوں نے بنوامیّہ اور بنوعباس کے عہد میں ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ وہ کئی صدی تک حاجیوں کے قافلوں کو لوٹتے اور مارتے رہے۔

عمان میں اباضی خارجیوں کی حکومت اور انھیں کی اکثریت ہے۔ میں نے عمان کی حکومت کے مزاج میں ایک جمہوریت کی سی کیفیت پائی۔ کوئی ایسا سنّی اور شیعہ جو عمان نہ گیا ہو، کیا سوچ بھی سکتا ہے کہ خوارج کے ملک میں اس کے لیے ایک دن بھی زندہ رہنا ممکن ہے؟ اور یہ کہ اس ملک میں امام باڑے بھی پائے جاسکتے ہیں؟ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ وہاں کی مسجدوں کے دروازے مسلمانوں کے تمام فرقوں پر کھلے ہوئے ہیں۔ چاہے کوئی ہاتھ باندھ کے نماز پڑھے یا ہاتھ کھول کے۔ مجھے بتایا گیا کہ بہت پہلے ایک عام خارجی اس بات پر حیران ہوا کرتا تھا کہ نماز ہاتھ باندھ کے بھی پڑھی جاسکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صدیوں تک دوسرے مسلمانوں سے کٹے ہوئے ہونے کی وجہ سے ان کے مختلف فقہی مسلکوں سے واقف نہیں تھے۔

عمان میں خوارج، غیر خوارج اور مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی۔ وہاں ہر مسلک کے لوگ اپنے مسلک کی تبلیغ کرنے میں آزاد ہیں اور یہ ایک ایسی بات تھی جس پر

مجھے بہت حیرت ہوئی۔ میں جو وہاں کی کئی باتوں پر حیران ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اب سے چالیس اکتالیس برس پہلے اسلام کی عربی تاریخوں کا جو مطالعہ کیا تھا' ان میں چوتھی پانچویں صدی ہجری تک خارجیوں کا تذکرہ پایا۔ اس کے بعد مورّخین خوارج کے بارے میں آہستہ آہستہ خاموش ہوتے چلے گئے' چناں چہ میں اپنے مطالعے کی روشنی میں خوارج کو اُجڈ' اَڑیل اور خونی اور جنونی سمجھتا رہا۔ مجھے اس حقیقت کا ذرا بھی علم نہیں تھا کہ خوارج میں گزشتہ کئی صدیوں سے رفتہ رفتہ تبدیلی آتی چلی گئی اور وہ کچھ کے کچھ ہوتے چلے گئے۔

اب ایک اور بات سُنو۔ بات یہ ہے کہ ایک دن میں اُردو کے جواں سال شاعر عابد فاروق کے ساتھ مسقط کے ایک ہوٹل میں گیا۔ اس کا نام ''فندق قصر البستان'' ہے۔ میں نے اس ہوٹل کو اپنی دیکھی ہوئی مشرقی اور مغربی دنیا کا سب سے زیادہ شان دار ہوٹل پایا۔ میں اسے دیکھ کر ششدر رہ گیا' لیکن چند لمحوں کے بعد میں نے جو کچھ دیکھا' اس نے مجھے ''فندق قصر البستان'' کے حُسنِ تعمیر سے بھی زیادہ ششدر کیا۔ میں نے وہاں متعدد میزوں پر مشرق و مغرب کے لوگوں کو شراب پیتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اپنی ششدری کی کیفیت پر قابو پانے کے بعد عابد فاروق سے پوچھا: ''یا اَخی! یہ کیا ماجرا ہے؟'' اس نے کہا: ''جون بھائی! کیا ماجرا' کیسا ماجرا......'' تو میں نے مختلف میزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''یہ' یہ' یہ اور وہ' وہ اور وہ'' تو اس نے کہا کہ یہاں شراب پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

مجھے جو اِس بات نے بے حد ششدر کیا' اُس کی وجہ یہ ہے کہ خوارج اپنی ایک خاص اُفتاد اور اپنے مزاج کے اعتبار سے دوسرے مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ''مسلمان'' رہے ہیں۔

اب ایک اور بات سُنو! وہ یہ کہ میں مشرق کے متعدد ملکوں میں گیا ہوں اور بارہا گیا ہوں۔ میں نے انھیں طرزِ تعمیر کے اعتبار سے عین مین مغربی پایا۔ مگر عمان میرے دیکھے ہوئے مشرقی ملکوں میں واحد ملک ہے' جس کی عمارتیں اپنی ساخت اور ''شناخت'' میں یک سر مشرقی ہیں اور ان کا نمایاں ترین امتیاز ''محراب'' ہے۔

میں نے اس سلسلۂ کلام میں خوارج کے بارے میں اگر ایک بات نہ کہی تو ان کے

مزاج اوران کے کردار کے تغیر اور انقلاب کا معاملہ ایک معجزہ قرار پائے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ معجزوں کا عہد گزرے ہوئے ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ رہی ''کرامت'' تو اس باب میں گفت گو کا سلسلہ ''دراز'' ہو سکتا ہے۔ خوارج کے ذہن اور مزاج میں جو تغیر آیا' اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں تاریخِ اسلام کی کئی صدیوں کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ یہاں میں اس تغیر اور انقلاب کا آخری سبب بیان کروں گا۔ وہ سبب کیا ہے؟ وہ ہے برطانیہ کا تسلّط۔ عمان ایک زمانے سے برطانیہ کے زیرِ تسلّط رہا ہے اور اس کے بعد امریکی تسلّط کا اضافہ ہوا۔ بہ ہر حال یہ ایک طول طلب موضوع ہے۔

میں نے جو گفت گو کی' وہ یوں ہی نہیں کی۔ اس گفت گو کا ایک خاص مقصد ہے۔ میں جو کانٹے کی بات کہنا چاہتا تھا' وہ یہ ہے کہ پاکستان کا ہر فرقہ دوسرے فرقوں کو بڑی فراغت اور سہولت کے ساتھ بات بات پر کافر قرار دے دیتا ہے' لیکن خوارج جو مسلمانوں کی اکثریت کو صدیوں تک کافر قرار دیتے رہے ہیں' اب ایک زمانے سے وہ بھی اپنی اس حرکت سے باز آ چکے ہیں۔

یہ تو خوارج کا معاملہ ہوا۔ اب ذرا خود سنّیوں اور شیعوں کے مسلّم مسلک کو دیکھیے۔ ان کے عقیدے اور مسلک کی رُو سے خوارج کبھی غیر مسلم نہیں قرار پائے' حالاں کہ خوارج ان کی اکثریت کو کافر ٹھہراتے رہے اور ان کی جان کو آتے رہے' یہاں تک کہ انھوں نے ان کے چوتھے خلیفہ اور شیعوں کے پہلے امام حضرت علیؓ کو شہید کر دیا۔

کہیے کیا حکم ہے' دیوانہ بنوں یا نہ بنوں؟

سسپنس ڈائجسٹ' مئی 1997

قابلِ برداشت

شام ہے اور بے ہنگام ہے۔ بے ہنگام ہے اور نافرجام ہے۔ میرے وجود کی شش جہت میں جو کچھ بھی ہے وہ میرے حق میں یک سر ایک الزام ہے۔

"جون ایلیا! تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"نشیان، میری جان! میں شاید کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا۔ اس لیے کہ کہنے میں ضرر ہے اور سُننے میں زیاں۔"

"دیکھو جون ایلیا! چاہے کہنے میں ضرر ہو اور سُننے میں زیاں مگر تم بھی جانتے ہو کہ یہ تمھارا مقسوم ہے کہ تم کچھ کہو اور وہ یوں کہ تم کچھ کہے بغیر رہ نہیں سکتے۔ جو دو پایہ جان دار، جون ایلیا نام کا دو پایہ جان دار اگر کچھ نہ کہے تو وہ جون ایلیا نہیں ہو سکتا۔ وہ آج سے لاکھوں برس پہلے کے دور کا، غار میں رہنے والا دو پایہ اور راست قامت جان دار قرار پائے گا جو کچھ کہہ سکنے اور زبان استعمال کرنے کی اہلیت سے محروم تھا اور اسی لیے اسے پوری طرح انسان قرار نہیں دیا گیا۔ اسے یا تو نینڈرتھل انسان کہا گیا یا کرومیگنن انسان۔"

"ہاں نشیان، یہ تو ہے اور واقعی مجھے "حیوانِ ناطق" یا انسان کہلانے کی شدید ہوس ہے یعنی میں وہ موجود کہلانا چاہتا ہوں جس نے کرۂ ارض پر تہذیب اور تمدن کو ایجاد کیا۔"

"اچھا جون ایلیا! اگر کرۂ ارض کی وسعت کو قربان کر کے اور تاریخ گیر دائرے کو تنگ کر کے تم اپنی بات کو، اپنے خیال کو اور اپنے اعتبار کو اس قطعۂ ارض تک محدود کر لو جسے پاکستان کہتے ہیں تو تمھارے احساس اور اظہار کی صورتِ حال کیا ہوگی؟"

"نشیان! آج تو مجھے کچھ ایسا لگ رہا ہے کہ تُو مجھ سے بالکل اَن جان ہے۔ یہ میری

اور تیری عمر بھر کی یک جانی اور یک گمانی کو کیا ہوا؟ میرے اور تیرے ان خوابوں کو کیا ہوا جو ہمیشہ میری اور تیری آنکھوں میں سُلگتے رہے۔ بول اور میرے کانوں میں اپنے دانش آفریں سخن کو گھول۔ اس وقت مجھ میں اور تجھ میں یہ کیسی دوئی پیدا ہوگئی ہے۔ تُو تو میرا ہم زاد ہے یا میں تیرا ہم زاد ہوں۔ یہ کیا بولیر ہے؟ یہ کیسا بھینچک پن ہے کہ تُو سب کچھ جانتے ہوئے مجھ سے سوال پر سوال کیے جا رہا ہے۔ تیرا استیاناس جائے۔"

"یہی ہے تو پھر یہی سہی۔ تُو اس قطعۂ ارض کی بات کر رہا ہے جسے بڑی بے طور شتابی کے ساتھ پاکستان قرار دیا گیا تھا اور جس پر مسلم ہندوستان کی ایک ہزار سال کی تاریخ کو ہار دیا اور وار دیا گیا تھا۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ تُو میری گویائی کی جھنجلاہٹیں کمانا چاہتا ہے۔ میری جھونجل سے اپنے دل کا سکون پانا چاہتا ہے۔ تجھ پر بھی لعنت ہو اور مجھ پر بھی لعنت ہو کہ تُو بھی اپنے گمانوں میں رائگاں گیا اور میں بھی اپنے گمانوں میں رائگاں گیا۔ رائگانی ہے، رائگانی ہے اور بس رائگانی ہے۔"

"پاکستان، میرا پاکستان اور تیرا پاکستان، تاریخ کی ایک میزان ثابت ہوا جس کے پلڑوں میں ہمارے سیاسی دانش مندوں ورحکیموں کی اکثریت بے وزن ثابت ہوئی۔ اس نے خود اپنے ہی لوگوں کے حق میں بار بار بے رحمانہ منصوبہ بندی کی۔ ہمارے ان سیاسی دانش مندوں کو چند کے سوا تاریخ کے بازار میں اونے پونے بیچ دیا جانا چاہیے تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سیّد احمد خاں، علّامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح کے سوا ہمارے بیش تر دانش مند اور حکیم سخت مردم آزار اور ناہنجار نکلے۔"

"جون ایلیا، کیا تم اس قوم کے یرمیاہ، پیغمبرِ نوحہ خواں یرمیاہ کہلانے کی ہوس رکھتے ہو؟ لیکن اس سے کیا حاصل؟ یہ اذیت ناک عہدہ آخر تم کیوں حاصل کرنا چاہتے ہو؟ یہ عذاب ناک ذمّے داری ادا کرنے کی تم میں آخر کیوں اشتہا پائی جاتی ہے؟"

"نشیان! کیا تُو بھی اب میرا مذاق اڑائے گا؟ کیا تُو بھی لوگوں کو مجھ پر ہنسوائے گا؟ یہ تو افسوس ہی افسوس ہے، یہ تو حیف ہی حیف ہے، یہ تو ندامت ہی ندامت ہے۔ کیا اب میں

اپنے آپ کو کوسنے دوں؟ کیا میں اب خود اپنے آپ پر لعنت بھیجوں؟"

"مجھے جون ایلیا ہونے کے سوا کچھ بھی ہونے کی ہوس نہیں ہے اس لیے کہ جون ایلیا سے زیادہ بے مغز اور بے دانش انسان کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔"

"سُن اور گُن۔ جو کچھ ہو گیا، وہ ہو گیا۔ ان دنوں پاکستان کے وجود کی پچاسویں سال گرہ منائی جا رہی ہے اور میرے سارے زخم ہرے ہو گئے ہیں اور وہ یوں کہ میرے حساب سے پاکستان کی زندگی کے شروع کے چند سال چھوڑ کر اس آدھی صدی کے بقیہ برس یک سر رائگاں گئے۔"

"اب میں کچھ اُمید کی روزی کمانا چاہتا ہوں۔ مسلم لیگ دوبارہ نسبتاً کسی قدر سلیقے کے ساتھ اقتدار میں آئی ہے اور اب پاکستان کی ساری اُمیدیں مسلم لیگ کے حکم رانوں سے وابستہ ہیں۔ عصر کی قسم، میں اس وقت جو بات کہنے والا ہوں، اس میں نہ کوئی طنز ہے، نہ طعن۔ مسلم لیگ کے حکم راں اپنے وجود کی ماہیت میں پاکستان بنانے والوں سے بہت چھوٹے اور بونے ہیں۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ بہت دردمند ہیں۔ انھیں اقتدار میں آئے ہوئے کوئی چار مہینے ہوئے ہوں گے اور تُو گواہ ہے کہ میں نے بجا یا نا بجا طور پر ان کی اپنے دستور کے خلاف آج تک کوئی مخالفت نہیں کی اس لیے کہ ہم یعنی قوم کے آدم قد شہری اگر ان کم قامتوں کی مخالفت پر اُتر آئے تو ہم سب کو بہت بڑا نقصان پہنچے گا۔ میرے اندرونِ اندروں کی اور باطن باطن کی یہ آرزو ہے کہ یہ کامیاب اور کامران رہیں اور میں، تُو اور سب جو خواب دیکھتے ہیں وہ ان کے ذریعے کسی نہ کسی حد تک پورے ہو جائیں۔ اور نشیان! ایک بات گرہ میں باندھ لے کہ کسی سے بہت زیادہ اُمیدیں رکھنا خود آزاری کے سوا اور کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔ ہمیں تو بس ایک قابلِ برداشت زندگی کی آرزو رکھنا چاہیے۔"

سال گرہ

پچھلے مہینے کی بات ہے کہ میں پاکستان کے قیام کے پچاسویں سال کے بارے میں گفت گو کر رہا تھا۔ وہ گفت گو کیا تھی اور کیا نہیں تھی' اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ گفت گو اس وقت بالکل بے معنی ہے۔ اس وقت جو بات بامعنی اور قابلِ ذکر ہے' خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے' وہ یہ ہے کہ حکومت یا قوم' قوم یا حکومت یا دونوں یا صرف حکومت' پاکستان کی پچاسویں سال گرہ کا جشن منا رہی ہے۔

ولادت کی سال گرہ ہی منائی جاتی ہے' اس شخص کی ولادت کی جو کم سے کم سرطان میں مبتلا نہ ہو۔ مُزمن اور مہلک مرض سے نجات پانے اور صحت یاب ہونے کی سال گرہ منائی جاتی ہے۔ تخت نشینی کی سال گرہ منائی جاتی ہے یا۔ وغیرہ وغیرہ۔

تخت نشینی کی بات آئی ہے تو میں یہ عرض کرتا چلوں کہ ستمبر ۱۸۵۷ء (یعنی انگریزوں کی زبان میں ماہِ غدر) سے پہلے پیرومرشد' ظلِ الٰہی حضرت سراج الدین ظفر نور اللہ مرقدہ حقیقتِ احوال کے پیشِ نظر ہرگز بھی اپنے سالِ جلوس کا جشن نہیں منا سکتے تھے' سو انھوں نے اس کا جشن نہیں منایا۔

سوچیے تو سہی کہ مغل حکومت کئی نسل سے احتضار اور سکرات کے عالم میں مبتلا ہے اور کوئی شاہ عالم ''حاکمِ دلّی تا پالم'' اپنے سال جلوس کا یادگاری جشن منا رہا ہے۔ بھلا ایسی مضحکہ خیز اور مجنونانہ صورتِ واقعہ کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟

اگر کوئی ۵۰ سالہ آدمی اپنی زندگی کے ۴۸ یا ۴۹ سال کے دوران میں لگاتار زیاں' ضرر' زوال اور زبونی کی اذیت جھیل رہا ہو تو کیا اس کی زندگی کے پچاس سال پورے ہونے پر

کوئی سال گرہ قسم کی خطیبانہ تقریب منائی جائے گی؟ سوچو اور جواب دو۔

بات چوں کہ وقت کے سچ اور سچائی کی ہو رہی ہے اور بات کرنے والا اور بات سُننے والے سچ اور سچائی کے سوا کوئی دوسری بات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں' اس لیے دونوں یہ چاہیں گے کہ پاکستان کے وجود کی پچاسویں سال گرہ منانے کے کوئی معنی ہونا چاہییں اور اگر اس کے کوئی معنی نہیں ہیں تو یہ محض جنون ہے کہ ہم یک سر لامعنویت کے عالم میں سال گرہ منائیں۔

سو میں یہ کہتا ہوں کہ پاکستان کے وجود کی سال گرہ منانے کے معنی دریافت کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہے اور میں نے وہ معنی دریافت کر لیے ہیں اور ان معنی کی بنیاد پر پاکستان کی سال گرہ' پچاسویں سال گرہ کسی بے حسی اور بے ضمیری کے بغیر منائی جا سکتی ہے۔ لیکن ان معنی سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہمیں حقیقت پسندی اختیار کرنا ضروری ہے اور حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ ہم پاکستان کی ۵۰ سالہ تاریخ کو فراموش نہ کریں اور خاص طور پر یہ واقعہ نہ بھولیں کہ پاکستان اپنے قیام کے پچیس سال بعد ۱۶ ویں دسمبر' ۱۹۷۱ء کو ٹوٹ گیا تھا۔ یہ واقعہ بل کہ یہ حادثہ ایسا نہیں ہے کہ اسے ماضی کی ایک ناخوش گوار بات سمجھ کر ٹال دیا جائے۔ اس کا جو باقی حصہ بچا وہ (باقی ماندہ) پاکستان کہلایا۔ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی دانش و بینش کے سبب اسے ایک ایسا نام دیا جو شاید ان کی کسی حکمتِ عملی سے یا اس وقت کے حالات کے اقتضا سے مناسبت رکھتا تھا اور وہ نام تھا ''نیا پاکستان'' ظاہر ہے کہ پرانا پاکستان ختم ہو چکا تھا۔

میں نے جو اُوپر عرض کیا کہ پاکستان کے وجود کی پچاسویں سال گرہ منانے کے کوئی معنی ہونا چاہییں' کوئی قابلِ فہم معنی۔ سو وہ معنی یہ ہیں کہ پچاس سال گزرنے کے بعد خدا کے فضل و احسان اور بذل و کرم سے موجودہ پاکستان ٹوٹنے سے محفوظ رہا اور وہ ایک زندہ حقیقت کے طور پر موجود ہے اور یہ ہماری ایک ایسی خوش بختی اور بختاوری ہے جس کے ہم کسی بھی درجے میں حق دار نہیں ہیں۔

ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے' میں نے غلط کہا ہم تو بے چارے عوام ہیں' ہمارا کیا

شمار۔ پاکستان کے تمام متوّلی خاندانوں، سرداروں، جاگیرداروں اور گزشتہ حکم رانوں میں چند کو چھوڑ کر کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس نے پاکستان کی جڑیں نہ کھودی ہوں۔ یہ تو تاریخ کا ایک حیران کن واقعہ ہے کہ پاکستان آج بھی قائم ہے۔

یادرکھا جائے اور میری کہن کو سُننے کی طرح سُنا جائے۔ میری کہن یہ ہے کہ تاریخ ان سے ضرور حساب لے گی، بڑا مہیب اور مدہش حساب، جنھوں نے پاکستان کے حق میں نہایت ظالمانہ بدحسابی برتی۔ یہ ٹولا آج جو کچھ بھی ہے وہ پاکستان اور صرف پاکستان کی وجہ سے ہے۔ تم ہی سوچو کہ اگر پاکستان نہ ہوتا اور خدانخواستہ ۱۹۷۱ء میں پورا پاکستان ٹوٹ گیا ہوتا تو یہ کہاں ہوتے، کس حال میں ہوتے اور ان کی کیا حیثیت ہوتی۔ ان کا تو کوئی نام بھی نہ جانتا۔

پاکستان کی پچاسویں سال گرہ کا جشن مناتے ہوئے پاکستان کے عوام کو اپنی اور اپنے جذبوں کی قدر و قیمت اور اہمیت کا ارجمندانہ احساس ہونا چاہیے۔ وہی پاکستان کے خالق ہیں اور وہی پُر اعتمادی کے ساتھ اسے ایک تابندہ و درخشندہ مملکت بنائیں گے، وہ مملکت جس کا انھوں نے خواب دیکھا تھا۔

یہ سر زمینِ بشارت نہ رائگاں جائے
یہ اپنے خواب کی جنت نہ رائگاں جائے
کہاں کہاں سے ہم آ کر ہوئے ہیں جمع یہاں
یہ اجتماع یہ صحبت نہ رائگاں جائے
یہ شہر شہر کی محنت یہ شاہ کارِ نمود
یہ شہر شہر کی محنت نہ رائگاں جائے
رہے خیال یہ مہلت ہے آخری مہلت
رہے خیال یہ مہلت نہ رائگاں جائے

ہم سب کو پاکستان کی پچاسویں سال گرہ مبارک ہو۔

سسپنس ڈائجسٹ، اگست 1997

مبارک ترین

''جنابِ نسیان! آداب، بندگی، کورنش! تو آپ تشریف لے آئے۔ آپ نے مجھ پر ہی نہیں...... میری آنے والی نسلوں پر بھی احسان فرمایا...... مگر میری آنے والی نسلیں! میرا تو نہ کوئی بیٹا ہے اور نہ بیٹی...... میں تو مقطوع النسل ہوں۔ بہ ہر حال آپ نے مجھ پر اور میرے باپ دادا پر بڑا احسان فرمایا......''

''جون ایلیا! آخر بات کیا ہے۔ تم اتنے تیہے میں کیوں ہو؟''

''میں اتنے تیہے میں کیوں ہوں؟ نسیان! اس صورت میں میرا اور تمھارا نباہ ممکن نہیں ہے''۔

''کس صورت میں جون ایلیا' آخر ہوا کیا ہے؟''

''ہوا یہ ہے کہ دوپہر سے سہ پہر ہوئی' پھر دھوپ روکھوں پر چڑھ گئی اور اب شام کا اخیر ہے اور آپ اب تشریف لائے ہیں۔ آپ کی شہر گردی اور بیروں نوردی روزافزوں ہے۔ میں تم سے بار بار ایک بات کہتا چلا آیا ہوں اور وہ یہ کہ مجھے زیادہ دیر تک اکیلا نہ چھوڑا کرو...... مگر تم جو ہو' تمھارے سُننے کی اہلیت بہرے پن کی ایک لگا تار اور شان دار شروعات ہوتی جارہی ہے اور اسے بھگت کر اب میں کم سے کم آدھا گونگا ہو چکا ہوں۔ میں دوپہر سے لے کر ایک ساعت پہلے تک افلاطون اور ابنِ مسکویہ سے بات چیت کرتا اور آپ کی منتظری میں مبتلا رہا ہوں۔ آخر وہ دونوں مجھ سے رخصت طلب کر کے ''المباری'' میں چلے گئے...... پھر آپ کے انتظار میں وقت کاٹنے کے لیے میں ابنِ فارض اور عرفی سے استفادہ کرنے میں لگ گیا۔ وقت کاٹتا رہا اور اپنے آپ کو اپنے آپ میں بانٹتا رہا' اس حالت میں کہ آپ اب آئے اور اب آئے۔ پَر تم نہیں آئے' یعنی نہیں آنا چاہا''۔

''تم میری اس بات کا بہت بُرا ماننا کہ تم بہت ملن سار اور مجلسی ہوتے جارہے ہو' یعنی فرنگی زبان میں ''سوشل''، پچھلے دنوں مجھے بہت سے لوگوں نے یہ بتایا کہ تم ایک دن اپنے

ایک اُلّو کے پٹھے دوست کی شادی کی سال گرہ کی تقریب میں پائے گئے......ایک بار تم کسی عزیز کے بچے کے موُنڈن میں دکھائی دیے۔ ایک دن تم، یعنی تم کسی قرابت دار کی لڑکی کی منگنی میں میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے نظر آئے۔ ایک رات بارہ بجے تک تم کسی جنے کی شادی میں ایک ''منتظمِ اعلیٰ'' کا عہدہ سنبھالے ہوئے تھے۔''

''میرے دماغ میں جو چھن ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تم بہت ''ملن سار'' مرنجاں مرنج اور مجلسی ہو گئے ہو۔ مجھے تو یہ بتایا گیا ہے کہ اب تم اپنے دن کا ایک قابلِ ذکر حصّہ ریستورانوں میں شاعروں کے ساتھ بیٹھ کر گزارتے ہو۔ شاید پندرہ بیس دن پہلے کی بات ہے کہ تمھاری زبان سے ایک نہایت فحش جملہ صادر ہوا تھا۔ وہ کچھ یہ تھا کہ 'عبیداللہ علیم نے اسد محمد خان پر آج ایک عجب فقرہ لگایا'۔ میں نے تمھارا یہ جملہ نہ سُننے کی طرح سُنا اور پھر بُھول گیا، مگر اب میں سمجھا ہوں کہ تم بھی شاعروں کی صحبتِ بد کے اثر میں آکر میری چھ سو برس کی زبان کی ناموس بگاڑنے میں کوشاں ہوں۔ ''فقرہ لگانا'' کیا اُردو کا کوئی محاورہ ہے؟ تمھیں اتنی بے ہودہ زبان بولنے کی ہمت کیسے ہوئی؟''

''جونی! تم ان دنوں بہت کھولے ہوئے اور تپے ہوئے رہتے ہو۔ تم اپنے احساسِ جمال اور اپنے دل کے شاعرانہ جذبوں تک سے بے سروکار ہو گئے ہو۔ اس لیے کہ تمھیں تمھارے اصل طیش اور حقیقی غصّے، یعنی اپنے لوگوں، کروڑوں لوگوں کے طیش اور غصّے سے بے واسطہ کر دیا گیا ہے...... بدل کر دیا گیا ہے یا یوں کہہ لو کہ تم ایک قسم کی دل شکستگی، نااُمیدی اور لاتعلقی میں مبتلا کر دیے گئے ہو اور دل کے دل اور جان کی جان سے یہ سمجھنے لگے ہو کہ تمھارا اور تم ایسے لوگوں کا لکھا بُری طرح غارت گیا۔ اس وقت بھی تم بہت کھولے اور تپے ہوئے ہو، یعنی بہت''۔

''ہاں نشیان! بہت اور بہت سے بھی کچھ زیادہ ہی...... مگر اس وقت میری جھونجل کی وجہ میرا یہ احساس ہے کہ تم بہت ''ملن سار'' ہو گئے ہو اور کیا ہم دونوں یہ بات نہیں جانتے کہ ملن سار ہونے کا کیا مفہوم اور کیا مطلب ہے۔ ملن سار کے صحیح کیفیت اور مفہوم کے اعتبار سے کئی مترادف ہیں، مثلاً دوغلا، ٹینی اور منافق وغیرہ۔''

"ملن سار ظالم کا بھی نیاز مند ہوتا ہے اور مظلوم سے بھی دعا سلام رکھتا ہے۔ وہ بچوں کا بھی جی بہلاتا ہے اور جھوٹوں کو بھی لطیفے سناتا ہے۔ وہ سقراط کے حامیوں سے بھی دردمندی کا رشتہ جوڑے رکھتا ہے اور ایتھنس کی اس عدلیہ کے ارکان میں سے ہر رکن کے حضور بھی آداب گزارتا ہے، جس نے سقراط کو اسیری اور پھر شوکران کا قرابہ پلانے کی سزا دی تھی۔ وہ مقتول کے سوگ واروں کو بھی "پُرسہ" دیتا ہے اور اس کے "ظلِ الٰہی قاتل" کو بھی سینے پر دونوں ہاتھ رکھے نیم قد ہو کر کورنش بجالاتا ہے۔ وہ چور سے بھی نباہتا ہے اور کوتوال کو بھی سراہتا ہے۔ نشیان! ملن سار انسان، انسان کی سب سے زیادہ بودی، بھدّی، بھونڈی اور بینڈی قسم ہے۔ میں نے غلط کہا، ملن سار انسان یزداں یا اہرمن تو ہو سکتا ہے کہ اس کا سروکار سب سے رہتا ہے، مگر وہ انسان نہیں ہوتا...... اور اگر تمھیں اس کے انسان ہونے پر اصرار ہے تو میں تمھیں اتنی رعایت دے سکتا ہوں کہ وہ ایک بدترین، بدکوش، بزدل اور بدنہاد انسان ہوتا ہے۔ وہ "وقت" کے ہر موسم سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔"

"اماں نشیان! مجھے "وقت" کے لفظ پر یہ بات یاد آئی کہ یہ مہینا ۱۹۹۷ء کا آخری مہینا ہی نہیں، بل کہ یہ اس سال کے آخری دن ہیں اور ہم وہیں کے وہیں ہیں، جہاں گزشتہ سال، گزشتہ سال ہی نہیں بل کہ گزشتہ بیس اکیس سال پہلے تھے۔ اور سچ پوچھو تو ہم اس سے بھی بہت پیچھے چلے گئے ہیں۔ ہماری طبع کی جولانی، جودت اور ہنگامہ سامانی کا اقتضا یہ ہے کہ ہم نے ان دنوں پاکستان کے قیام کا پچاسواں جشن، جس اہتمام سے منایا ہے، اب نئے سال کے دوران پاکستان کے زوال کا "جشن" بھی پورے کرّ وفر کے ساتھ منائیں۔ آخر تو ہمیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ ہم گزشتہ پچاس سال سے بڑے سلیقے اور قرینے کے ساتھ "واپس" ہوتے چلے گئے ہیں۔ میں نے غلط کہا، صحیح بات یہ ہے کہ جو "واپس" ہوتے چلے گئے ہیں، وہ اس ملک کے حکمراں، سیاست داں، صاحبانِ قوّت اور افسر شاہی کے گندے، گھٹیا اور گھناؤنے دوپائے ہیں۔ ان سب کو نیا سال یک سر نامبارک ہو اور اس ملک کے اصل مالکوں کے حق میں، یعنی عوام کے حق میں یہ سال مبارک ترین سال ثابت ہو۔ ہاں نشیان! ہمارے حق میں یہ سال مبارک ترین سال ثابت ہو۔"

سسپنس ڈائجسٹ، دسمبر 1997

پھوہڑ

''شیان! مجھے بہت جاڑا لگ رہا ہے۔ میں تو جما جا رہا ہوں، کیا تمھیں بھی......''

''ہاں جونی! میں بھی ٹھٹھرا جا رہا ہوں۔ پچھلے برس بھی اس موسم میں ہم نے جڑاول کا کوئی بندوبست نہیں کیا تھا۔ ہم اس وقت بھی ایک بنیان اور ایک باریک کپڑے کا کرتا پہنے رکھتے تھے۔ نہ کوئی صدری تھی اور نہ کوئی رضائی۔ ہم اپنے آپ کی طرف سے کچھ زیادہ ہی بے توجہی برتتے چلے آ رہے ہیں۔''

''ہاں! ہم اپنے بارے میں کچھ زیادہ ہی بے توجہی سے کام لیتے رہے ہیں اور یہ شاید کوئی اچھی بات نہیں ہے مگر شیان یہ بھی تو ہے کہ اس دیارِ پُر آزار کے رہنے والوں میں سے کروڑوں رہنے والوں میں ایسے لوگ بہت ہی کم ہوں گے جنھیں جڑاول جڑی ہو۔ جو صدری اور رضائی کی آرزو بھی کر سکتے ہوں۔ سو جب ایسا ہے تو پھر ہمیں یہ سوچ کر چُپ ہو جانا چاہیے کہ ہم بھی ان میں سے دو جنے سہی۔''

''ہاں جونی! تم نے میرے دل کی بات کہی۔''

''مگر شیان! یہ جو کچھ بھی ہے وہ آخر کیوں ہے اور اسے کیوں ہوتے رہنا چاہیے۔ یہ قلاشوں کا ملک ہے اور اس ملک کے مالکوں کو ایک لمحے کے لیے بھی یہ احساس نہیں ہوتا کے قلاشوں کا آقا ہونا سب سے بڑا کمینہ پن ہے۔ سب سے زیادہ بھدّی اور بھونڈی حرام زدگی ہے۔ یہ کمینے آخر کس طرح اپنے چہروں کو دیکھنے والوں کا سامنا کر پاتے ہیں۔ انھیں تو اپنے چہروں پر نقاب ڈال کر اپنے گھروں سے باہر نکلنا چاہیے مگر یہ کُھلے بندوں سینہ تان کر چلتے ہیں۔ ان میں اگر ذرا سی بھی سمجھ ہوتی تو یہ اپنے حُلیے اور اپنے نام بدل لیتے مگر

ان میں اگر کوئی سمجھ پائی جاتی تو پھر رونا ہی کس بات کا تھا۔"

"مجھے کسی بھی احتیاط سے کام لیے بغیر اپنے سینے کی گہرائی سے بات کہہ دینا چاہیے کہ اس ملک کے تمام خداوند اور خداوندگار سفیہہ تھے، سفلے تھے اور سٹھیائے ہوئے تھے۔ وہ تاریخ کے مزبلے کے کیڑے تھے، سڑے ہوئے کیڑے۔ نشیان! میں چاہتا ہوں اور بُری طرح چاہتا ہوں کہ انھیں تاریخ کے روزِ حساب میں حاضر کیا جائے اور ان سے ان کی بدکیشی اور بدکوشی کا حساب لیا جائے"۔

"ان بدکاروں اور بدشعاروں نے سرحد پار کے مسلمان انسانوں کی زندگی بھی اجیرن کی اور پاکستان کے علاقے میں ہجرت کرنے والے اور یہاں کے قدیمی باشندوں کی زندگی بھی"۔

"میں وقت کا ایک سادہ لوح شہری ہوں۔ نشیان! میں یعنی میں اور نشیان! تم یعنی تم...... ہم دونوں شاید یہ بھید کبھی نہیں سمجھ پائیں گے کہ جو کچھ ہوا، وہ آخر کیوں ہوا۔ اسے کیوں ہونا چاہیے تھا؟"

"اور یہ کہ اسے کیوں ہونے دیا جانا چاہیے تھا۔ جو اُدھر رہ گئے وہ بھی مارے گئے اور جو اِدھر رہ رہے ہیں، وہ بھی مارے جا رہے ہیں"۔

"یہاں اس بات کو جانا جانا چاہیے کہ ان سطروں کا لکھنے والا نہ یہودی ہے، نہ زرتشتی، نہ صابی ہے، نہ مسیحی، نہ ہندو اور نہ مسلمان۔ وہ صرف ایک انسان ہے، ایک عاجز انسان۔ ایک ایسا انسان جو طرح طرح کے مذہب اور مسلک رکھنے والے آسودہ گماں اور آسودہ یقیں لوگوں کے ارجمند نرغے میں گھرا ہوا ہے اور ان سے براءت چاہتا ہے۔"

"ہاں، میں تم سے براءت چاہتا ہوں اور وہ اس لیے کہ تم انسان نہیں ہو، تم یہودی اور مسیحی ہو، تم مسلمان اور ہندو ہو، تم سکھ اور زرتشتی ہو اور میں ان لفظوں کے معنی اور مفہوم سے یک سر ناواقف ہوں۔ میں بھی اور میرا ہم زاد نشیان بھی۔ میں تمھاری مملکت میں ایک ذمّی ہوں اور یہ میری خوش بختی ہے کہ تمھارے معتبر انشا پرداز معراج رسول میرے وجود کے "ذمّے دار" ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ میرے وجود کے ذمّے دار ہونے کی کوئی کڑی سزا پائیں

اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ ایسا ہو مگر وہ ہیں کہ مجھے میرے طور کے ساتھ ہونے دے رہے ہیں اور مجھ سے باز نہیں آتے۔ کاش یہ انشا پرداز اور ادیب معراج رسول اپنے شاعر جون بھائی سے باز آ جائے۔ کیا لوگ اپنی بُری عادتوں سے عاجز آ کر باز نہیں آ جاتے؟''

''میرے اندر اور میرے باہر دُکھ ہے اور دُکھ ہی دُکھ ہے۔ کہنا بھی دُکھ ہے اور سُننا بھی دُکھ ہے۔ جاننا بھی دُکھ ہے اور ماننا بھی دُکھ ہے۔ رہنا بھی دُکھ ہے اور سہنا بھی دُکھ ہے۔ ''دُکھم دُکھم دُکھم۔''

''بھوک ہے اور جاں کنی کی بوکھلاہٹ ہے۔ مگر مذہب کے متوّلی اور سیاست اور حکومت کے مؤکل عیش کرتے ہیں اور طیش دلانے والی عیاشی کی داد دیتے ہیں۔ یہ بے حس اور بے حیا، بے حسی اور بے حیائی چھپانے کا ہنر بھی نہیں جانتے۔ میں اس چور اور ڈکیت کو دل سے داد دوں گا جو اپنی چوری اور ڈکیتی کو چھپانے کا ہنر جانتا ہو مگر یہ چور اور ڈکیت اتنے پھوہڑ ہیں کہ ان کی حرکتیں دیکھ کر میں اتنا ہنستا ہوں، اتنا ہنستا ہوں کہ میرے پیٹ میں بَل پڑ جاتے ہیں۔''

سسپنس ڈائجسٹ، فروری 1998

صدافسوس

میرے ذہن نے بچپن سے لے کر لڑکپن تک اور لڑکپن سے لے کر نوجوانی تک اور نوجوانی سے لے کر اس لمحے تک سیاست اور سیاست دانوں اور حکومت اور حکم رانوں کو کبھی اس قابل نہیں سمجھا کہ ان سے کوئی خوش گوار اثر قبول کرے۔

میرے بے مایہ اور یک سر بے پایہ گمان کی رُو سے سیاست اور سیاست داں اور حکومت اور حکم راں دانش اور بینش سے کوئی دُور کی نسبت بھی نہیں رکھتے۔ یہ معلوم تاریخ سے لے کر آج تک بے دانشی اور بے بینشی کا ڈھکوسلہ رہے ہیں۔ میں انھیں تاریخ کی بدمزہ ترین مسخرگی سمجھا کیا ہوں۔ یہ تھے اور تھے۔ یہ ہیں اور ہیں اور ہوئے چلے جاتے ہیں۔

یہاں میں اپنی ایک نظم کا ماحصل پیش کرتا ہوں۔ میں نے اس نظم میں تاریخ کے دور بہ دور اور عہد بہ عہد احوال کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے سیاست اور سیاست دانوں اور حکومت اور حکم رانوں کے کردار کے بارے میں اپنے احساس کو رقم کیا ہے اور وہ یہ ہے:

جس کا اور جن کا کام سکیرنا تھا اس نے
اور انھوں نے سکیرنے کے بجائے بکھیرا
اور یہ بکھیرنا بُری طرح کا بکھیرنا تھا
اور اس کو فیروزمندی اور سرخ رُوئی ٹھہرایا گیا۔

O

جس کا اور جن کا ذمہ جوڑنا تھا سچ کا جوڑنا
اُس نے اور انھوں نے جوڑنے کے بدلے توڑا

اور بُری طرح توڑا' پر اس کو ایک عالیّت
منوایا گیا' ایک عالیّت اور ایک فضیلت
تاریخ' اے تاریخ! تُو نے ہمیشہ شَر کی تاج پوشی کی
تیرا حساب لیا جائے گا' گھٹنوں کے جوڑوں کو
ڈِھیلا کر دینے والا حساب
ہاں ایسا تو ہونا ہے اور خود تیرے ہی یومِ حساب میں۔

میں نے سیاست اور حکومت کو ہمیشہ کے ہمیشہ میں ایک بدکیشی اور بدکوشی جانا ہے اور سیاست دانوں اور حکم رانوں کو بدکیش اور بدکوش مانا ہے کہ ایسا تو ہے اور ایسا ہی ہے۔ اور اگر کسی سقراط اور بقراط میں ہمت ہے تو اس کو جھٹلا کر دکھلائے۔

یہاں میں بدکیشی اور بدکوشی کے بجائے بدمعاشی اور بدکیش اور بدکوش کے بجائے بدمعاش رقم کرنا چاہتا تھا مگر میں نے بیان اور بلاغ کے طور پر رعایت سے کام لیا اور رعایت سے کام لینا بُری بات نہیں ہے۔

مگر میں سوچتا ہوں کہ آیا ''علم'' ''آ گہی'' اور ''شائستگی'' کے اس ''عالی شان دور'' میں اس نوع کی رعایت سے کام لینا بجا ہے' روا ہے؟ شاید نہیں۔ ہاں شاید نہیں۔ پھر کیا' کیا جائے' یعنی کیا؟

''پھر کیا' کیا جائے' یعنی کیا؟''

''یہ کیا جائے' یعنی یہ کہ دنیا کے تمام محروموں اور مظلوموں سے ظالموں کے خلاف بغاوت کرنے کا عہد لیا جائے اور انھیں جی جان سے سہارا دیا جائے''۔

مگر یہ بات بڑے افسوس کی بات ہے کہ جو محروم اور مظلوم لوگ ہمارے حصّے میں آئے ہیں' ان کا ضمیر برفانی ہے۔ ایسا برفانی کہ احساس اور شعور کی زبان کے شعلوں کی لپک انھیں پگھلانے میں رائگاں ہی گئی ہے۔ میں جب بھی یہ بات سوچتا ہوں تو میرے سینے میں ہَول اُٹھنے لگتی ہے' افسوس کی دُھول۔ افسوس میں' صد افسوس میں!

میں اور کیا کہہ سکتا ہوں

''میاں نشیان ہفت زبان، ایک بات تو بتاؤ؟''

''کیا بات صاحبی؟''

''یہ بات کہ یہ جو ہمارا ڈھنڈار ہے اس میں اُگنے وا— سارے موجود چاہے وہ پیڑ ہوں یا پودے، کیا کوہستانی نہیں ہیں اور برفانی اور بودے؟''

''ہاں صاحبی، ایسا ہی ہے۔''

''میں یہ بات تو مانتا ہوں نشیان کہ یہ بہت ہرے ہیں، بہت ہرے پر ان کے پتوں اور پھولوں میں نہ کوئی بُو ہے نہ باس۔ ان کا ستیاناس۔ میاں یہی بات میں نے گزشتہ انیس بیس برس کے دوران مغرب کے ملکوں میں پائی۔ بہت سے لمبو (لمبو) گھنے اور چھتنار حضرات ہیں جو کسی بھی لان، میدان یا کوہستان میں خوامخواہ اُوپر تک اُٹھتے چلے گئے ہیں یا ٹنگو پودے ہیں جو ہیں اور ہوئے چلے جاتے ہیں۔ ان کی ٹہنیوں، پتوں اور چپڑ قناتیا پھولوں کا دیکھنے سے تو ایک اچھا سمبندھ ہے پر سُونگھنے سے بڑا ابچیل سمبندھ ہے۔''

''سیّد نشیان، اُرّی، ممفلیسی، فلسطینی، مکّی، مدنی، بغدادی، سامری، صیداوی، واسطی، سہروردی، امروہوی، ثُم لامکانی! سُنو کہ اقبالؒ نے ایک دن عجیب تر سخن کیا تھا۔ وہ سخن مجھے اس وقت جوں کا توں تو یاد نہیں آ رہا پر اس کا مفہوم میرے ذہن پر نقش ہے۔ اُبھرواں نقش جو یہ ہے کہ رنگ تو مغرب کے پھولوں میں ہے پر خوش بُو نہیں۔''

''یارانِ یار! اقبال کو یورپ ہرگز نہیں جانا چاہیے تھا۔ اقبال کا یورپ جانا ایک ایسی ہی اَڑنگ بَڑنگ اور ٹیڑھی بجنگ بات ہے جیسے خواجہ فریدالدینؒ عطار یا حکیم سُنائی کا پیرس

کے کسی کیبرے یا ڈزنی لینڈ جاتا ہے۔ ہے کہ نہیں؟ استغفراللہ۔"

"علّامہ نشیان! میرے اور تمھارے ساتھ، ہمارے ساتھ تاریخ اور تقویم نے بلا کی سفاک زیادتی کی ہے۔ ہاں تاریخ اور تقویم نے۔ مگر ان کی تو ایسی کی تیسی۔ ہمیں کم و بیش دوسو یا پونے دوسو برس سے خاص طور پر ذلیل اور خوار کیا جاتا رہا ہے اور یہ کارنامہ کس نے انجام دیا؟ برطانیہ کے لچے اور لفنگے گوروں نے، ڈھوروں نے۔"

"اس لمحے میرے ذہن میں ایک خاص سلسلۂ خیال جاری ہو گیا ہے اور اچانک میرے دہکتے ہوئے حافظے میں اپنے دراز ریش بزرگ سیّد احمد خاں کا نام دہک اُٹھا ہے۔ ہماری ہاری ہوئی تاریخ نے اپنے ایک بے حد بد بخت دور میں قبلہ و کعبہ سیّد احمد خاں کو چھُری کانٹے سے کھانا کھانے کا ہنر سکھایا، یا اس کی ترغیب دلائی۔"

"اُن بزرگ سے میرا اور تمھارا خون کا رشتہ ہے۔ مجھے شاید یہاں اپنے کلام کے سلسلے سے کچھ ہٹی ہوئی بات کہنا تھی۔ جانے نہ جانے وہ کیا بات تھی، وہ بات یعنی یہ کہ.....لو میاں! مجھے وہ بات یاد آ گئی"۔

"وہ بات یہ ہے کہ ہمارا وہ عالی شان بزرگ حالات کی مانگ سے کچھ زیادہ ہی "معاملہ کار، یعنی ہوشیار، یعنی طرّار یعنی دنیا شناس"..... نشیان، میں یہاں "دنیادار" نہیں کہہ رہا جب کہ "معاملہ کار، ہوشیار اور طرّار" کے قافیوں کا اقتضا یہ تھا کہ یہاں میں "دنیاشناس" کے بجائے "دنیادار" استعمال کرتا مگر یہ بہت کڑی بات ہوتی۔ بہ ہر حال ہمارا وہ بزرگ، عظیم بزرگ بہت بے ہنجار نکلا۔"

"سیّد احمد خاں مغفورؔ کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے میرے استادوں کے استاد، ارسطوئے ہند مولانا و بالفضل اولانا حضرت فضلِ حق خیر آبادی طاب ثراہُ جیسی کسی ہستی کو سخن کرنا تھا لیکن اس باب میں کوئی سخن کرنا حضرت کی شان کے شایان نہ تھا اور پھر یہ بات بھی ہے کہ سیّد احمد خاں سے مغفور کا کوئی سخن کرنا حضرت مولانا کے حق میں ازالۂ حیثیتِ عرفی کا سبب بن سکتا تھا اور وہ یوں کہ سیّد احمد خاں مرحوم نے نوجوانی کا ایک بیش قیمت حصہ پہلوانی کی ورزش میں بسر فرمایا تھا۔"

''تم جانتے ہو کہ وہ ''کس قدر'' لحیم شحیم واقع ہوئے تھے۔ یہ لحیمی شحیمی انھوں نے ورثے میں نہیں پائی تھی یہ لحیمی اور شحیمی ان کی خصوصیت اوران کا امتیاز تھی جو ہماری تاریخ اور تہذیب کے دفاع میں ذرا بھی کام نہ آئی بل کہ اس نے میرے گمان کے حساب سے بُری طرح پیٹھ دکھائی۔''

''یہاں میں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ کسی بھی شایستہ اور شریف انسان کو لحیم شحیم نہیں ہونا چاہیے اور اگر وہ قضائے کار سے لحیم شحیم ہو گیا ہے تو اس کو رضا کارانہ طور پر اپنی لحیمی شحیمی سے دست بردار ہو جانا چاہیے تا کہ مہذّب محلّے والوں کو اس کی طرف سے کسی شورہ پشتی اور سرشوری کا خدشہ نہ ہو۔ وما علینا الا البلاغ۔''

''جونی صاحب! آپ اس وقت کچھ زیادہ ہی جھونجل اور جھنجلاہٹ کی حالت میں ہیں۔ اگرچہ آپ نے اپنی اس گفتار کو لطفِ گفتار کے ساتھ ختم کیا ہے مگر آپ کم سے کم میری اس بات کو کسی طرح بھی نہیں جھُٹلا سکتے کہ آپ کا لطفِ گفتار بلا کا شَرربار ہوتا ہے۔ آپ کی یہ حالت آج صبح، دوپہر اور سہ پہر کی حالت سے کہیں زیادہ شعلہ ور اور سوزندہ تر ہے۔ علاّمہ وفہامہ! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''کیا علاّمہ اور کیا فہامہ نشیان! تم بھی اب میرا مذاق اُڑانے لگے۔ کیا بابل اور نینوا سے موئن جوداڑو...... نالندا، ٹیکسلا، لاہور اور دلّی تک کی تاریخ کی ہار اور ہزیمت کا دُکھ سہنا اور سہے جانا اور وہ دُکھ کہنا جھونجل اور جھنجلاہٹ ٹھہرایا جائے گا اور وہ بھی تمھارے ہونٹوں سے۔''

''چلو میں مان لیتا ہوں کہ میں اس وقت کچھ زیادہ ہی جھونجل اور جھنجلاہٹ میں ہوں۔ پر میرے احساس، میری اپنی عالی شان اور ہاری ماری تاریخ کے احساس کی نسبت سے میرا بُری طرح جھونجل اور جھنجلاہٹ میں ہونا کیا کوئی ٹکچل بات ہے۔ نشیان! بولو، بکو اور بڑبڑاؤ۔''

''مجھے کوئی اندازہ نہیں کہ بات کس طرح شروع ہوئی تھی، کس طرح چلی اور اس لمحے کہاں تک آپہنچی ہے۔ میں یہ کہے بغیر باز نہیں آؤں گا کہ قبلہ وکعبہ سیّد احمد خاں...... اور ہاں نشیان! تمھیں اس دوران یہ بات ضرور سوچنا چاہیے تھی کہ میں نے اب تک قبلہ وکعبہ کا نام

اس کے مقدّس اور معلّیٰ سابقے یعنی ''سر'' کے بغیر لیا ہے اور وہ یوں کہ میں اپنے کسی بزرگ کو گالی دینے کے گمان اور اس گمان کے گمان کے دُور کے حاشیے پر کھڑے ہونے کے تصور کی حالت میں بھی اپنے لبوں کو جنبش دینے کی ادنیٰ سی ادنیٰ ہمت نہیں رکھتا۔''

''میں کیا کہہ رہا تھا......؟ ہاں میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ قبلہ و کعبہ سیّد احمد خاں انگریزوں سے بات بٹی ہاڑنے میں جہاں تک گئے، کیا انھیں وہاں تک جانا چاہیے تھا؟ تم جانتے ہو کہ آزادی کی جنگ کے بعد یعنی ہماری صدی صدی کی دانش اور علم کے اذیّت زدہ نفسِ غیور اور ہماری حمیت کے علم دار حضرت مولانا فضلِ حق خیر آبادی۔ ہماری غیرت کے دردمند پاسبان جنرل بخت خاں، کالے خاں گولہ انداز، راجا کنور سنگھ، راجا امر سنگھ، رانی جھانسی اور حضرت محل کی خون تھوکتی ہوئی ہزیمت کے بعد قبلہ و کعبہ سیّد احمد خاں نے ہمارے بزرگوں، انگریزوں کے جانی دشمن اور مجاہد بزرگوں کی جاگیریں بحال کرانے میں ''ان داتا'' کا سا کام بل کہ کارنامہ انجام دیا۔ ہم ۱۸۶۰ء کے گرد وپیش سے لے کر ۱۹۴۷ء کے بعد تک ان مغفور کے احسان مند رہے ہیں، کاش! مجھے سعادت نصیب ہو سکے کہ میں ان کی شان میں ایک قصیدہ کہہ کر ان کے احسان کا قرض چُکا سکوں۔ مگر نشیان! کیا میں اپنے وجود کی ان خراشوں، ان زخموں اور خوں چکاں شگافوں کو بُھول سکتا ہوں جو گوروں، حرام خوروں کا عطیہ تھے۔ مجھے اپنے اندرون کے اندرون میں جو دُکھ ہے وہ یہ ہے کہ سیّد احمد خاں نے ہمارے معاملے کو کچھ اور ہی طرح سمجھنے اور اسے نمٹانے کی کوشش کی اور یہیں سے میں ان کے بارے میں دریدہ دہن ہو جاتا ہوں اور میں اسے اپنی بے ہودگی اور گستاخی کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ بہ ہر حال ہے یوں کہ دلِ خونیں کی یہ داستان درازی چاہتی ہے۔''

بے تکی

''آقائے نشیان!'' ''خوش آمدید وصفا آوردید!''

''آیۃ اللہ سرکار، سیّد جون ایلیا سہروردی ثم امروہوی، آپ میرے بارے میں اس لہجے کو استعمال کرنے کے بجائے یہ فتویٰ صادر فرمائیں کہ نشیان پور بزرگِ اُمید مرتد ہوگیا ہے سؤاسے سنگ سار کیا جائے۔''

''یارا، دوست دارا! تُو جو ہے یعنی تُو ''یعنی میں''، ''ہم دونوں دو نہیں ہیں، ایک ہیں۔ لو میاں اس لفظ یعنی ''ایک'' پر مجھے اپنے لڑک پن کی ایک بات یاد آ گئی ہے۔''

''جون ایلیا، ایک کے لفظ پر یعنی ''ایک'' پر آخر کیا بات یاد آسکتی ہے۔ ہاں، اگر ایک کے لفظ پر کوئی بات یاد آسکتی ہے تو ''حرف الف'' یاد آسکتا ہے۔ ازل کا الف اور ابد کا الف۔ اور ہاں ''اللہ'' کا الف یا پھر ابتدا اور انتہا کا الف۔''

''ہاں نشیان! تم نے بھی کوئی بے تکی قیاس آرائی نہیں کی مگر مجھے اپنے لڑک پن کی جو بات یاد آئی ہے، وہ کچھ اور ہے۔ فیثا غورس اور حکیم بوعلی سینا کی ریاضیات الشفا کی قسم، کچھ اور ہے۔ ہاں وہ یہ ہے کہ ''ایک'' عدد نہیں ہے۔''

''عدد نہیں ہے! اماں، کیا کہہ رہے ہو؟ اگر ایک عدد نہیں ہے تو پھر دو بھی عدد نہیں ہے۔ دس بھی عدد نہیں ہے، سو بھی عدد نہیں ہے۔ ہزار، دس ہزار، لاکھ، دس لاکھ، کروڑ، دس کروڑ، ارب، دس ارب، کھرب، دس......''

''میں تمھاری اُلجھن سمجھ گیا ہوں نشیان۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے اب سے برسوں پہلے ''اللہ ہُو کے باڑے'' میں تمھیں ایک قصہ سنایا تھا، مولوی عبدالسلام دہلوی اور علی گڑھ کے ڈاکٹر ضیاء الدین کا قصہ۔ کچھ یاد آیا کہ نہیں؟''

''مجھے یہ دو نام تو یاد آ گئے مگر نشیان، وہ قصہ یاد نہیں آیا۔ کیا تھا وہ قصہ؟''

''راویانِ حقائق اور حاکیانِ وقائق بیان کرتے ہیں کہ ڈاکٹر ضیاء الدین جو ہندوستان کے سب سے بڑے ریاضی دانوں میں سے تھے، ایک دن مولانا عبدالسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا عبدالسلام ایک مجذوب قسم کے فیلسوف تھے۔''

''وہ منطق، علم الخلاف، علمِ کلام اور فلسفے کے یگانۂ روزگار عالم تھے۔ میں نے انھیں اپنے بچپن میں آغا طاہر نبیرہ مولانا محمد حسین آزاد کے یہاں دیکھا تھا۔ شاید یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ بابا علامہ سیّد شفیق حسن ایلیا مجھے وہاں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس مجلس میں مسجد فتح پوری کے امامؒ صاحب اور مغفور مولانا عبدالسلام بھی تشریف فرما تھے۔ بابا، مسجد فتح پوری کے امامؒ اور مولانا عبدالسلامؒ تینوں جوانی کے زمانے کے دوست تھے۔ کچھ دیر بعد اسی مجلس میں نواب خواجہ محمد شفیع ''دلّی کی آوازوں'' کے مؤلف بھی تشریف لے آئے۔ انھوں نے آتے ہی بابا سے کہا ''علاّمہ یار، ایک شعر سُن لو'' اور پھر انھوں نے دوسرے حضرات کی طرف متوجہ ہو کر ایک شعر سُنایا ؎

میں نہ جاتا تھا باغ میں اُس دن
مجھے بُلبل پکار لائی ہے

اگرچہ یہ شعر سب کا سُنا ہوا تھا مگر اس وقت نہ جانے کیوں اس شعر کو عجب طرح سُنا گیا اور سر دُھنا گیا۔ بابا پر اختلاج کا دورہ سا پڑ گیا۔

خوشا روزے و خرم روزگارے

''میں کیا کہہ رہا تھا نشیان؟''

''تم کہہ رہے تھے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین ایک دن مولانا عبدالسلامؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جدید مغرب کے صفِ اوّل کے اس ریاضی داں نے نیاز مندانہ طور سے عربی مکتبِ علم کے اس درویش صفت عالم سے عرض کی ''حضرت، میں آپ سے ریاضیات کے بارے میں کچھ کسبِ فیض کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ میرا نام ضیاء الدین ہے اور میں علی گڑھ یونی ورسٹی میں ریاضیات کا معلم ہوں۔''

مولانا نے ڈاکٹر سر ضیاء الدین کا یہ معروضہ سُنا اور فرمایا ''جزاک اللہ، ثم جزاک اللہ۔ میاں! ہم معلّم تو کیا متعلّم بھی نہیں ہیں۔''

یہ بات مولانا نے اپنے مزاج کے یک سر برخلاف کہی تھی ورنہ میری دانست کے مطابق وہ نہایت درجے کے کلبی اور پُرخشونت بزرگ واقع ہوئے تھے۔ سُنا گیا ہے کہ وہ عام طور پر چراغ پا رہتے تھے۔ یہ سُن کر سر ضیاء الدین عرض پرداز ہوئے ''حضرت، میں آپ کے فیض کا طلب گار ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھے اپنی فیض رسانی سے محروم نہیں فرمائیں گے۔''

''اچھا تو میاں، یہ بتاؤ کہ 'ایک' عدد ہے یا نہیں؟''

اس سوال کے جواب میں سر ضیاء الدین نے عین قیاس کے مطابق یہ کہا ''جی ہاں، ایک پہلا عدد ہے۔''

یہ سُن کر مولانا کی آواز بھڑک اُٹھی اور انھوں نے ہماری تہذیب کے خاندان کے دل، دلاور، ویر سپاہی، سورما یعنی ناکام مجاہدِ آزادی حضرت جنرل بخت خاں کی سی خونیں نگاہوں سے سر ضیاء الدین کو دیکھا۔ میں نہ جانے کیوں یہ سمجھتا رہا ہوں کہ جیسے ''سر'' ضیاء الدین میجر ہڈسن ہوں، جس نے پیر و مرشد کے فرزندوں کو قتل کر کے ان کے حلقوم سے اپنا منہ لگا دیا تھا اور سارا خون پی گیا تھا، ہاں وہ حرام زادے سامراج کا حرام زادہ میرا سارا خون پی گیا تھا۔

''میں کچھ سمجھ رہا ہوں جون ایلیا! پر تم اس بارے میں کچھ اور کہو۔''

''کچھ اور کیا کہوں؛ تم سب کچھ جانتے ہو پر شاید کچھ بھول سے گئے ہو۔''

''ہاں کچھ ایسا ہی ہے، کچھ ایسا ہی ہے۔ وقت، وقت، وقت بھولِ ہے اور گمان کے گمان کی دُھول ہے۔''

''سو تو ہے نِشیان، میں تمھیں یاد دلاتا ہوں کہ جب حضرت پیر و مرشد لال قلعے سے رُخصت ہو کر ہمایوں کے مقبرے میں پناہ گزیں ہوئے تھے یا انھیں ''پناہ گزیں'' کرایا گیا تھا تو ایک دن، یاد نہیں کس دن، جنرل بخت خاں ظلِّ الٰہی کی حضوری میں باریاب ہوئے، گویا اپنے وجود، اپنے پارہ پارہ اور ریزہ ریزہ وجود کی دُوری میں باریاب ہوئے۔ وہاں اُردوئے معلّٰی کے چند سہمے ہوئے آخری نفوس اپنے نہ ہوسکنے کی حالت میں سانس لے رہے تھے۔ ان

میں میری تاریخ کا ایک لقندرا، لُچا، لوفر، لفنگا اور ننگا وجود نابود بھی موجود تھا۔ وہ کون تھا؟ وہ پیرو مرشد کا خسر تھا۔ وہ بڑے ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب کا سڑا ہوا خسارہ تھا یعنی حضرت پیرو مرشد کا وہ خسر، وہ ہمارا خسران۔"

"حضرت جنرل بخت خاں اپنے سینے کے بائیں طرف دایاں ہاتھ رکھ کر سرِ خم ہوئے اور بندگی بجالائے۔ پھر عرض کی "عالم پناہ! ہم نے دلّی ہاری ہے، دل نہیں ہارا۔ مشرق میں جمنا کے پار دوآبہ پھیلا ہوا ہے۔ وہی ہماری قوّت کا طول اور عرض ہے۔ آپ مجھے اپنی ہم رکابی کا شرف عطا فرمائیے۔ یہ جنگ تو ہمیں جیتنا ہی ہے۔"

یہ سُن کر پیرو مرشد کا خسر، گوروں کا سیاہ رُو بھڑوا بولا کہ ظلِ الٰہی یہ پٹھان ہمیشہ سے ہم مغلوں کے جانی دشمن رہے ہیں۔

سو پھر وہ ہوا جو ہوا "جمشید دست گاہ"، "شاہانِ شاہ"، "جہاں پناہ" حضرت پیرو مرشد نے جنرل بخت کو "ہندوستان" ہزیمت خوردہ "ہندوستان" کی تاریخ کی سب سے زیادہ روہن ہار دعا دی اور فرمایا "نوجواں! الوداع، الوداع۔"

"جنرل بخت خاں ہمایوں کے مقبرے کے مشرقی دروازے سے نکل کر دوآبے کی سنگین اور خشمگیں تاریخ کے غیرت مند تاریخ کے پُر ہول راستوں میں بھڑ کتا ہوا، حساس اور پُر حمیت قوم کے دل کی طرح دھڑ کتا ہوا، غنیم کو قدم قدم پر گھڑ کتا ہوا اور اپنے زخم زخم وجود سے بے حیا اور سفاک حریفوں کو شیرانہ وار جھڑ کتا ہوا اور ہندوستانِ کی نوسو برس کی تاریخ کا خوں چکاں رَجز پڑھتا ہوا لحواں کی ابدیت میں گم ہو گیا اور میں آج بھی اس کی تلاش میں ہوں، اس کی تلاش میں۔ اور میں اسے تلاش کرتے ہوئے تھک گیا ہوں۔ ہاں نشیان! میں بُری طرح تھک گیا ہوں۔ بات یہ ہے کہ جنرل تو بہت ہیں۔ جو بلا کے چاق چوبند ہیں مگر...... مگر بخت خاں کوئی نہیں ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ سب ہم سب کے سب بد بخت خاں ہیں، بد بخت خاں۔ سُنا نشیان! اور جانا جائے کہ میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں نے آج بڑی بے تکی ہانکی ہے"۔

کہیں کا نہیں

میں ''کرومیگنی انسان'' میں لاکھوں برس پہلے سے لے کر اس پل تک کا انسان بہت دُکھیا ہوں۔ دُکھ ہے دُکھ ہے اور دُکھ ہے۔ ''دُکھم دُکھم دُکھم۔'' حدیثِ پاک میں آیا ہے ''موتو قبل ان تموتو'' یعنی مر جانے سے پہلے مر جاؤ۔ سو میں مرنے سے پہلے مر چکا ہوں اور وا واویلا صد واویلا کہ جو مرنے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں وہ بد بخت کبھی نہیں مرتے۔ ان کا تن تو مر جاتا ہے پَر ان کا نام جیتا رہتا ہے اور نشیان، کیا تم جانتے ہو کہ ان کا نام کتنے دُکھ بھوگتا ہے، کتنے دُکھ۔ اور صدی صدی بھوگتا رہتا ہے۔ کل انگلستان میں رہنے والے ایک پڑھے لکھے آدمی نے مجھ سے بات چیت کی۔ وہ آدمی ملکوں اور قوموں کے بارے میں لوگوں کی رائے اور ان کی سوچ جاننے اور ان کو برطانوی نشر گاہ کے ذریعے کروڑوں لوگوں تک پہنچانے کا کام کرتا ہے۔

اس بھلے مانس نے مجھ سے کہا کہ آپ ایک شاعر ہو اور ہندوستان کے وزیرِاعظم اٹل بہاری باجپائی بھی شعر و شاعری سے گہرا سمبندھ رکھتے ہیں۔ انھوں نے وزیرِاعظم کا عہدہ سنبھالنے کے بعد پاکستان کے بارے میں بڑی بھیانک باتیں کہی ہیں اور بے حد تباہ کار ارادوں کو ظاہر کرنے کے ساتھ تباہ کار ترین کارروائیوں کی نمائش کی ہے۔ انھوں نے جوہری بموں کے بدترین دھماکے کرائے ہیں۔

نشیان! میں نے اس بھلے مانس کی بات سُنی اور کچھ لمحوں تک خاموش رہا۔ پھر میں نے کہا کہ بھائی جی! اٹل بہاری باجپائی شعر و شاعری سے گہرا سمبندھ ہی نہیں رکھتے، وہ تو شاعر ہیں، سچ مچ کے شاعر۔ وہ جب سیاست کی بولی بولتے ہیں تو کوئی اور بولی بولتے ہیں اور

جب اپنی بولی بولتے ہیں تو وہ بولی بولتے ہیں جو امیر خسروؔ قلی قطب شاہ اور میرا بائی سے شروع ہوئی اور ولی دکنی اور میر تقی میرؔ تک پہنچ کر جنبشِ لب کا معجزہ بن گئی ہے۔ ہے یوں کہ وہ ایک سیاست داں ہیں اور سیاست داں دُہرے یا دو غلے آدمی ہوتے ہیں۔ اٹل بہاری باجپائی اُردو قوم اور اُردو تہذیب کے پیمبر، طوطیِ ہند امیر خسرو کے چیلے اور ان کے دوہوں کے نابینا حافظ نہیں "بینا حافظ" ہیں۔ وہ اُردو آدمی ہیں اور اُردو شمالی برِصغیر کی سب سے چہیتی زبان ہے۔ چاہے وہ دیوناگری میں لکھی جائے یا عربی کے نستعلیق رسمِ خط میں۔ لندن سے آنے والے بھلے مانس! تم نے سوال تو کچھ اور کیا تھا اور میں جواب کچھ اور دے رہا ہوں اور اس "کچھ اور جواب" کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ یہاں تمھیں ایک بات یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخ اور تہذیب کے بارے میں ایک سوال، دو سوال یا تین سوال کر کے پورا جواب پانے کی ہوس وہی رکھ سکتا ہے جس کی مسیں نہ بھیگی ہوں۔

ہاں تو اس "کچھ اور جواب" کا جاری سلسلہ یہ ہے کہ اُردو کا نام "اُردو" سرے سے غلط ہے۔ میری اور میرے کم سے کم ساڑھے پانچ سو یا چھ سو برس پہلے کے پرکھوں کی زبان کو آغاز سے لے کر پنجاب اور دوآبے میں انیسویں صدی کے شروع تک تین ناموں سے یاد کیا گیا یعنی "ہندوئی، ہندوی اور ہندی۔"

مجھے ابھی ایک بات یاد آئی ہے اور اس کے یاد آنے سے میری ذات بہت شرمائی ہے اور وہ بات یہ ہے کہ امروہے کے پُرانے تھانے کے سامنے کی حویلی میں رہنے والا ایک شیخ، مسمّی غلام ہمدانی شاید وہ پہلا آدمی تھا جس نے شمالی برِصغیر کے ہزاریوں اور بزاریوں کی مہربان، ترجمان، خاک سار اور کرشمہ کار زبان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان کو غیر عربی، غیر ایرانی اور مسلمان زبان کو پہلی بار "اُردو" کہا۔

یہ تہذیب کی جنتری کا وہ جرم ہے وہ جنایت ہے جس کی عقوبت میں مسمّی غلام ہمدانی المعروف بہ مصحفی کے نام ہی کو نہیں، پورے امروہے کو تاریخ کی سُولی پر چڑھا دیا جانا چاہیے۔

بھلے مانس! تم نے بھارت کی نوخیز اور بدترین سرکار کی جہنمی بدکاری کے بارے میں مجھ سے اختصار کے ساتھ کچھ پوچھنا چاہا تھا مگر میاں! میں بُری طرح پھیل گیا۔ ایسا پھیلا کہ

اگر کھِلّو باؤلی بھی سُنے تو ہنستے ہنستے ضعیف ہو جائے۔ میری بات شاید تمھاری سمجھ میں نہیں آئے گی پر بات یہ ہے کہ بات تو بات ہوتی ہے چاہے وہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے، سُنو اور سمجھو! بھارت نے بم کے جو غیر انسانی، غیر شریفانہ، رذیلانہ اور غیر ''ہندوستانیانہ'' دھماکے کیے ہیں' ان کا ایک سلسلہ ہے جس کے سرے کو انگلستان کے گوروں نے جنبش دی تھی جسے فورٹ ولیم کالج نے اور تیز کر دیا۔ ایک زبان کو دو زبانوں میں بانٹ دیا۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ بھارت نے جو ہری بم کے جو دوزخی دھماکے کیے ہیں ان کا فورٹ ولیم کالج سے کیا تعلق ہے؟

میں تمھاری اس سوچ کے دُکھ کو پوری طرح سمجھتا ہوں اور وہ یوں کہ خود میں بھی بہت دُکھ میں ہوں۔ میں پلاسی کی جنگ سے لے کر اس مہینے کے، اور اس مہینے کے اس دن کے اور اس دن کی اس شام کے اس لمحے تک بہت بڑے دُکھ جھیلتا رہا ہوں۔ بھلے مانس! تم شاید صرف میرا نام جانتے ہو۔ مجھے نہیں جانتے۔ میں نہ بھارت کا آدمی ہوں اور نہ پاکستان کا۔ ایک زمانہ تھا جب میں ہندوستان کا آدمی تھا یعنی برِ صغیر کا آدمی۔ اس کے بعد میں نے از خود ساری دنیا کی قومیت اختیار کی اور پھر میں کہیں کا نہیں رہا۔

سسپنس ڈائجسٹ' جون 1998

دنگل

''نشیان، اے صاحبِ وجد و وجدان، اے صاحبِ حجت و برہان! وہ کلام کیا تھا جو ہم کر رہے تھے؟''

''صاحبی! ہم ان پانچ جوہری بموں کے دھاکوں، جوہری بموں کے جہنمی دھاکوں کے بارے میں کلام کر رہے تھے جو پچھلے دنوں ہندوستان نے کیے اور گاندھی جی کی اہنسا' امن اور آشتی کے لیے اور زندگی کی نرمی، نمی، شادابی اور شادیانگی کو ننگے، بے ڈھنگے اور لفنگے طعنے دیے اور پھر اس کلام میں برطانیہ کے سامراج کی سازشوں کے بارے میں اختصار کے ساتھ کچھ کہا گیا تھا۔''

''ہاں نشیان! مجھے یاد آیا کہ اس کلام کا سلسلہ یہی تھا اور یہ بھی یاد آیا کہ پھر اس کے چند روز کے بعد ہم نے سرزمین خوش آب و شاداب کا رُخ کیا تھا اور اپنے شجرے کے بزرگ سیّد وارث شاہ کے فیضان کے مہمان ہوئے تھے۔ ہم نے وہاں حقیقت کی حقیقت کے صحیفے سے اس کے مغز اور معنی کا رزق حاصل کیا تھا اور اس کی ہڈیوں کو کتوں کے سامنے ڈال دیا تھا۔''

''حضرت صاحب، جونی جی! کچھ ایسی ہی بات فارسی کے کسی عالی مرتبہ شاعر نے بھی کہی ہے۔ یعنی یہ بات کہ ہم نے مغز کا عرفانِ عرفان اور فیضانِ فیضان تو کسب کر لیا۔ اب رہیں ہڈیاں تو وہ وقت کے برزنوں اور بازاروں میں پھیرے لگانے والے جان داروں کے تھوبڑوں کے آگے ڈال دی ہیں۔''

''تمھیں خوب یاد آیا نشیان!''

''سو تو ہے مرشدی۔ پر حضرت نے یہ جو فرمایا کہ تمھیں خوب یاد آیا تو وہ کیا نکتہ ہے جو مجھے خوب یاد آیا؟''

"ہاں مجھے یاد آیا اور وہ یہ کہ ہندوستان کے جوہری بموں کے دھماکوں کے بعد ہم دونوں پنجاب چلے گئے۔ کچھ دن بعد وہاں جو کچھ ہوا وہ تو بہت حیران کرنے والا تھا۔ یعنی مئی کے مہینے کی کسی تاریخ کو پاکستان نے بھی جوہری بم کے پانچ دھماکے منعقد کر دیے۔ اس دفاعی جہاد نے پنجاب کے خاص و عام کو پائے کوبی، دست افشانی اور وَجد کے حال میں مست و بے خود کر دیا اور جب ان دھماکوں کے دوسرے دن پاکستان نے پانچ اور پانچ کا حساب برابر کر کے چھٹا دھماکا کیا تو پنجاب کے لوگوں کو کچھ ایسے معجزاتی فیضان کی رَسد نصیب ہوئی جو کسی کسی کو نصیب ہوئی ہوگی۔"

"تو بات یہ ہے کہ مجھے ان دنوں پنجاب کے شہروں میں نشاط وطرب کی وہ کیفیت کارفرما دکھائی دی جس کا مجھے آزادی کے بعد دو تین بار ہی تجربہ ہوا ہوگا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے سقوط کے بعد پاکستان کے ماہر فوجی مبصّرین نے جو خودنوشتیں رقم فرمائی تھیں ان میں اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا تھا کہ ہندوستان، پاکستان سے دس گنا طاقت ور ہے۔"

"سال ہا سال کی اس کیفیاتی صورتِ معاملہ کے ذہنوں میں نقش ہو جانے کے بعد جب پاکستان نے ہندوستان کے پانچ جوہری بموں کے دھماکوں کے بعد چھ جوہری بموں کے دھماکے کیے تو قوم جہاد کے سرورِ مقدّس سے سرشار ہو گئی اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک ایسی کیفیت تھی جس کو سمجھنے میں کسی دشواری کی گنجایش نہیں تھی۔ پھر یہ کہ پاکستان کے خواص اور عوام کو جو اخلاقی برتری حاصل تھی وہ یہ تھی کہ جوہری بموں کی ہلاکتیں برسانے میں ہندوستان نے پہل کی تھی، پاکستان نے نہیں۔"

"پنجاب کے اخباروں نے اس بارے میں میرے خیالات بھی اپنے پڑھنے والوں تک پہنچائے۔ میرے ان خیالات کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کے شاعر وزیر اعظم جناب اٹل بہاری باجپائی نے نہایت غیر شاعرانہ رویّے کا ارتکاب کیا اور یہ کہ انھوں نے ہندوستان میں جوہری بموں کے پانچ دھماکے کیے اور پاکستان میں چھ دھماکے کرائے۔ جن کا حاصل جمع کیا ہوا؟ گیارہ دھماکے یعنی یہ گیارہ دھماکے میرے بزرگ محترم جناب اٹل بہاری باجپائی

کا تاریخی کارنامہ ہیں۔ برِصغیر کی تاریخ کا سب سے بڑا کارنامہ۔"

"رہے پاکستان کے تازہ وارد سیاست داں اور ناقابلِ قبول حد تک خوش بخت وزیراعظم نواز شریف تو انھوں نے سچ مچ یعنی گویا سچ مچ ایک دھما کا بھی نہیں کیا۔ بھلا اس بات میں کیا شبہ ہے کہ اگر ہندوستان نے جوہری بموں کے دوزخی دھماکوں کا ہلاکت انگیز کھیل نہ کھیلا ہوتا تو پاکستان ایک پٹاخا بھی نہ چھوڑتا۔"

"شیان! میں نے صورتِ معاملہ کے ایک رُخ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ میرے گمان میں قابلِ لحاظ حد تک درست ہے۔ مگر جانا اور مانا جائے کہ اس کا ایک اور رُخ بھی ہے اور اس کے باب میں پاکستان کے سب سے زیادہ توجہ طلب مسئلوں کے نہایت محترم اور معتبر ماہروں اور عالموں نے ہمیں بڑی دانش جوئی، دانش طلبی، دانش یاری اور دانش مندی کے ساتھ پُرزور اور ارجمند افادات سے نوازا ہے۔ ان کے افادات کا جوہر یہ ہے کہ ہم اپنے اُلجھے ہوئے معاملوں کو پہلوانوں اور جوابی کارروائی کے پُرجوش اور جہاد پسند تنومندوں کی طرح طے کریں گے تو چاروں خانے چت ہوں گے اور حریف ہمیں تاریخ کے دنگل میں بُری طرح گندہ کر کے مارے گا۔ مانا کہ زندگی ایک دنگل ہے مگر زندگی کی نسبت سے دنگل کے وہ معنی نہیں ہیں جن کی نسبت سے ہمیں گاما پہلوان اور امام بخش پہلوان کی یاد آتی ہے۔ چلیے مان لیا کہ زندگی ایک دنگل ہے جس میں کشتی لڑی جاتی ہے اور "دھوبی پاٹ" اور "لوکان" جیسے داؤ مارے جاتے ہیں۔ مگر زندگی دنگل کے علاوہ بھی کچھ ہے بل کہ اس کے علاوہ ہی سب کچھ ہے۔ وہ دانش، دلیل، حجت اور برہان کی ایک مباحثہ گاہ ہے جہاں قوموں کی قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جہاں انسانوں کے حال اور مستقبل کے سب سے زیادہ مبہم اور اہم قضیوں کو طے کیا جاتا ہے۔ یہ دور دنگلوں اور "میدان داریوں" کا دور نہیں ہے۔ یہ تفکر اور تدبر کا دور ہے۔ اس دور کا ہم سے جو سب سے زیادہ توجہ طلب تقاضا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنے بالستیہ وجود شائقۂ بقا اور اپنے ہمہ جہت ارتقا کے وسط اور گرد و پیش سے آگاہی حاصل کریں۔"

"ہم فاقہ کش اور فلاکت زدہ ڈھور ڈنگر ہیں۔ ہم جہل اور جنگلی پن کا ایک بے ڈھنگا

ریوڑ ہیں۔ ہماری آبادی کے سب سے بڑے گلّے کو کسی طرح بھی ''حیوانِ ناطق'' کے خانے میں مندرج نہیں کیا جاسکتا۔ ہم زیادہ سے زیادہ ''نیم انسان'' ہیں۔''

''ہم نے ہندوستان کے پانچ جوہری بموں کے دھماکوں کے جواب میں یعنی ''جوابِ آں غزل'' کے طور پر ایک رُستمانہ کارنامہ انجام دیا ہے لیکن ہمیں انسانیتِ عالیہ کی قسم کھا کر اپنے آپ سے یہ پوچھنا چاہیے کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے نام نہاد دو تین برس بعد سے لے کر آج تک کیا ہم نے جمہوریت کا کوئی ایک دن بھی گزارا ہے؟ اس دوران ہم نے چھچھورے، چُھٹ بھیے اور لے چورے سربراہوں کی سَڑی اور بُھسی ہوئی غلامی میں گھناؤنی زندگی تیر نہیں کی؟''

''جان لیا جائے کہ میں یعنی جون ایلیا کسی بھی نسلی، لسانی اور مذہبی گروہ کی خوشنودی کمانے کی خاطر بے ہودہ نگاری اور قلم دوات اور کاغذ کی فحاشی کا مجرم قرار پانے کے لیے اپنے آخری سانس تک تیار نہیں ہوں گا۔ سُنا جائے اور سمجھا جائے کہ ''جون ایلیاؤں'' کو دو وقت کی روٹی چاہیے۔ انھیں تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے چاہییں۔ ان کے بیمار ڈھانچوں اور ڈھچروں کو دوائیں چاہییں۔ ان ڈھور ڈنگروں کو کسی نہ کسی حد تک انسان کہلائے جانے کے لیے حرفوں کی شُد بُد چاہیے۔ یہ ذہن کی جولانی، جہد اور اجتہاد کا دور ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو ماننے میں الکساہٹ سے کام لے رہے ہیں انھیں اپنے جسد کے لیے کافور اور کفن کا بندوبست کر لینا چاہیے۔ وما علینا الا البلاغ۔''

سسپنس ڈائجسٹ' جولائی 1998

ہر بات کا جواب

''نشیان ہو......ت!''

''ہا......ں......ں! کیا بات ہے؟''

''اماں تم ہو کاں، کس حال میں ہو، کیا کر رہے ہو؟''

''حسین والے، میں ہوں۔''

''کیا مطلب، یعنی تم امروہے میں ہو اور وہ بھی ''محلہ لکڑا'' المعروف بہ دربارِ شاہ ولایت میں! اور مجھے جاتے وقت بتایا بھی نہیں۔ حد ہے۔''

''حد ہے! یعنی چہ۔ سفر ایسا تھا کہاں کا جو تمھیں بتاتا۔ کوئی میل دو میل جانا تھا؟ آنکھ میچی اور میچتے ہی کھول لی۔ لو میاں پاکستان سے ہندوستان۔ کراچی سے امروہے پہنچ گئے۔ علّامہ! کچھ دن سے تم جھینچک جھینچک سے ہو گئے ہو۔ ہے کہ نہیں؟ اگر کھلّو باوَلی بھی تمھاری باتیں سُنے تو ہنستے ہنستے بے حال ہو جائے۔''

نشیان! بکواس بند کرو۔ آخر میرا کہا سچ ٹھہرا کہ نہیں۔ میں نے تم سے کتنی بار کہا کہ اُردو کی کتابیں مت پڑھا کرو۔ ''معراج العاشقین'' ''سب رس'' ''کربل کتھا'' ''بوستانِ خیال'' ''باغ و بہار'' ''فسانۂ عجائب'' ''آبِ حیات'' ''مقدمۂ شعر و شاعری'' ''شعر العجم'' اور اس دور کے بعد کی کوئی بھی کتاب مثلاً ''محاسنِ کلامِ غالب'' یا...... یا...... ہرگز مت پڑھا کرو لیکن تم مجھ سے چُھپا کر اس فعلِ شنیع کے مسلسل مرتکب ہوتے رہے ہو۔ اُردو کوئی پڑھنے کی زبان ہے۔ تم ایمان سے کہو کہ کیا اس نوع کی کوئی حرکت ہمارے خاندان کے کسی نفر کو زیب دیتی ہے؟ تم نے کھلّو باوَلی کا نام لیا۔ نشیان ''اللہ ہُو کے باڑے''

''اندھیریا مسجد''، ''بانس دیو پارک'' اور ''محلّہ چاہِ سیاہ کے مندر'' کی قسم اگر کھلّو باؤلی اُلّو کی پٹھی میری اذیت کے رمز کو سمجھ لے تو دادے جی سیّد حسین شرف الدین شاہؒ ولایت کی قسم، وہ رابعہ بصری ہو جائے۔''

''جونی! تمھیں تپا آ گیا۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ مجھے معاف کر دو اور تم تو جانتے ہو کہ تم سے کوئی اور نفر معافی نہیں مانگ رہا۔ تم خود اپنے نفس سے معافی نہیں مانگ رہے ہو۔ تم نے پوچھا ہے کہ میں کس حال میں ہوں؟ تو حال یہ ہے کہ آموں کے باغ اُجڑتے چلے جاتے ہیں۔ فجری رہ گیا ہے جو ''بہار'' کے خاتمے کا ڈفیل نشان ہے، صدی صدی کا نشان۔ سو یہ اپھارا مارا اپنے انجام کو پہنچ رہا ہے۔ میں نے اور تم نے اکثر اس سے کہا ہے کہ اَبے تُو آم ہے کہ مٹھن رام موٹو حلوائی۔ تمھیں ''تاریخِ ثمراتِ القدس'' کی وہ روایت یاد ہوگی کہ چوں فصلِ اَنبہ بہ اختتام رسد...... ''خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جولائی کے آخر اور اگست کے کم و بیش وسط کے دوران فجری میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔''

''نکیان! تم نے سچ کہا۔ اللہ تمھیں جزائے خیر دے۔ تم ذرا اس اتفاق کو ملحوظ رکھو کہ فجری، ڈفیل فجری، تو ندو فجری' اگست میں اپنے بھونڈے انجام سے دوچار ہوتا ہے اور میں اور تم اگلے مہینے ستمبر ۱۸۵۷ء کے آخر تک اپنے بھونڈے زوال کو پہنچے تھے۔ گویا ہم ''ستمبر کے فجری'' تھے۔ یہاں ''فجر'' اور ''فجری'' کے لفظوں سے حظ اندوز ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں۔''

وقت کا نقیب صدا دیتا ہے ''نگاہ رُو بہ رُو، نگاہ رُو بہ رُو، شہنشاہِ ہند، غرّۂ ناصیۂ دودمانِ گورگانی، ظلِ سبحانی حضرت پیر و مرشد محمد سراج الدین ظفر جلوہ فرما ہوتے ہیں۔ نگاہ رُو بہ رُو، نگاہ رُو بہ رُو!''

''اُستاد سیّد پہلوان علی کے دیو ہیکل فرزند سیّد استاد گل زار پہلوان فرمایا کرتے تھے کہ ہیجڑے گوروں، حرامیوں اور حرام خوروں کے بائیس خواجہ کی چوکھٹ پر قبضہ جمانے سے بہت پہلے ہی ہمارے بزرگ، مغل فوج کے میسرے کے تلوریے تند پلے ہو گئے تھے۔ اس دور سے پہلے وہ گھوڑوں سے نہیں اُترتے تھے اور کوٹھوں پر نہیں چڑھتے تھے۔ ان کے پیٹ

چیٹے، کمریں ہرن کی کمرں کی طرح پتلی اور سینہ چوڑا ہوتا تھا۔ جب وہ اپنی کلائیوں اور بازوؤں سے تناؤ اور کساؤ کے ساتھ زاویۂ حادہ بناتے تھے تو شاہِ مرداں کی قسم اُن کے بازوؤں کی مچھلیاں اُبل پڑتی تھیں۔"

"ہاں آغائے جون ایلیا! تمھارا کہا حرف بہ حرف دُرست ہے۔ تم نے پوچھا ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ بس محلّے محلّے کی لونڈ ھار کو ساتھ لیے جنگل جنگل، صحرا صحرا گھوم رہا ہوں، لوٹیں لگا رہا ہوں، پٹخنیاں کھا رہا ہوں۔ اماں "سیّد عضد الدین شیعی" کی درگاہ کے سامنے کا وہ جو برگد ہے نا؟ اس سے میرا عجیب سخن رہا۔ اس نے آغازِ کلام ہی سے مجھے "دیوانِ سیدنا" کے شعر سُنانے شروع کر دیے اور پھر چند لمحوں کے وقفے کے بعد اس نے مجھے جو شعر سُنایا وہ میرا اور تمھارا ہزاروں بار کا سُنا ہوا شعر تھا۔ مگر اس سے وہ شعر سُن کر میں پانی پانی ہو گیا۔ اور مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ شعر میں نے پہلی بار سُنا ہو۔"

رضينا قِسمة الجبار فينا لناالعلم وللجهال مال

ہم نے جو ہجرت کی اور جس ہجرت کا احساس جتاتے جاتے ہم یہاں کے قدیم باشندوں کی ساعت کی جان کو آ گئے ہیں، کیا وہ ہجرت، ہم نے علم، ایمان اور عرفان کے لیے کی تھی؟

"اماں ہاں نشیان! یہ تو بتاؤ کہ وہاں آزادی کا دن کیسے منایا گیا؟"

"کیسے منایا گیا! جی جان سے منایا گیا۔ بھوکے اور ننگے بھی صبح سے شام تک دل کے دل اور جان کی جان کا رنگ کھیلتے رہے۔ مجھے یہ بات بہت ہی اُولوا اُولو لگی۔ یہ بھی کیسے بے حس لوگ ہیں،...... فاقہ کش ہندوستان کے چلتے پھرتے ڈھانچے، کئی برس بعد تک کی جاں کنی کے کھانچے۔"

"نشیان! اقطع کلامک۔ بکواس بند کرو۔ تم تاریخ کے مزاج اور شعر کے کوئی مفتی نہیں ہو۔ سو بے حسی اور بے حیائی کے ساتھ ساتھ فتوے صادر کرنا چھوڑ دو۔ تمھیں یک سر جاہلانہ فتوے صادر کرنے کے شوق میں کس چوٹی کے جِنّے نے مبتلا کیا۔ وہ، یعنی وہاں کے لوگ، وہاں کے عام لوگ نہ تو بھاٹ ہیں اور نہ میراثی۔"

''معاف کرنا۔اب مجھے تم بتاؤ کہ وہاں یعنی کراچی میں آزادی کا دن کیسے منایا گیا؟''

''تم جانتے ہو نشیان کہ میں اسی نظامِ شمسی کا ایک گوشہ نشیں متنفس ہوں۔ میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کے بازاروں اور برزنوں میں آزادی کا دن چاہے حکم رانوں اور ''زورمند مسلح شوروں'' کی چاپلوسی ہی کے لیے سہی، منائے جانے کی طرح منایا جانا چاہیے تھا پر، شاید ایسا نہیں ہوا۔تم پوچھو گے کہ ایسا کیوں نہیں ہوا؟ تو شاید میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ایسا ہونے نہیں دیا گیا اور شروع ہی سے ایسا نہیں ہونے دیا گیا۔ یہ بات شاید تمھیں عجیب لگے، عجیب، پر میں کیا کروں۔ مملکتِ اسلامیہ پاکستان کی برکت ہر رعیت کے لوگوں کو حاصل رہی ہے کہ ہم آزادی کا دن آزادی کے بے ساختہ احساس کے اظہار کی حالت، سرگرم حالت اور آزادانہ حیثیت کے ساتھ نہ منا سکیں۔''

''مگر آخر کیوں؟''

''یوں...... مگر ہر بات کا جواب میں ہی کیوں دوں؟''

سسپنس ڈائجسٹ، ستمبر 1998

خیرِ اعلیٰ کی قسم

''جون! تم شاید کسی سوچ میں غلطاں ہو۔ ہو کہ نہیں؟ اور یہ بھی کہ تم ہونے اور نہ ہونے سے بھی یک سر بے سروکاری کا سروکار رکھتے ہو۔ اور یہ بھی کہ تم اپنے ہونے کے چاروں طرف سے بل کہ ہونے کی چھیوں جہتوں سے تنگ آ چکے ہو۔ کیا ایسا ہی کچھ ہے کہ نہیں؟''

''ثیان! مجھے کچھ ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے تم سقراط ہو اور میں تمھارا شاگرد افلاطون ہوں اور افلاطون ہونا تو بڑی بات ہے، میں تمھارا ایک گیا گزرا شاگرد زنوفن ہوں۔ مگر میں نے تمھاری اس بات کا ذرا بھی بُرا نہیں مانا۔ اور ایک بات ایسی ہے جو ہم دونوں کو جاننا چاہیے اور وہ بات یہ ہے کہ نہ تم کسی بات کو بُرا ماننے کا کوئی حق رکھتے ہو اور نہ میں۔''

''تم نے جو کچھ کہا وہ حرف بہ حرف دُرست ہے۔ ہاں میں اپنے ہونے کے چاروں طرف سے بل کہ ہونے کی چھیوں جہتوں سے تنگ آ چکا ہوں۔ پر، میری اور تمھاری جو مشکل ہے وہ یہ ہے کہ ہم ان سوختہ بختوں میں سے ہیں جو اپنے اندر ہی سے نہیں اپنے باہر کے معاملوں سے بھی جاوداں سروکار رکھتے ہیں۔ وہ عذاب جو ہمارے اندر ہی نہیں بل کہ ہمارے باہر آئے ہیں اور آتے رہے ہیں۔ ہم نے ان عذابوں کو اپنی نوجوانی، اپنی نازاں، عشوہ کار اور کج کلاہ نوجوانی، ارجمند ترین نوجوانی کی سرسبز فصلوں اور موسموں میں پوری تمکنت سامانی اور سمادھانی کے ساتھ بھگتا ہے۔''

''میں دل کے دل اور جان کی جان سے گواہی دیتا ہوں کہ ایسا ہی ہوا ہے۔ ہم نے وہ کچھ بھگتا ہے جسے بھگتنے پر شرم آتی ہے۔''

''شرم آنے کی کیا ضرورت ہے۔ میاں، ہم تو اپنی تاریخ کے ازل سے بے شرم ٹھہرے۔ نشیان! سچ مچ سوچو تو سہی کہ ہم کتنے بے شرم ہیں۔ پر اُس لمحے میرے دماغ میں ایک بات آئی ہے جو میں تمھیں ابھی بتاؤں گا۔ پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ بات دماغ میں آتی ہے، گھٹنوں میں آتی ہے یا ٹخنوں میں؟''

''تمھاری کتاب فرنود کی قسم، میں نے اس بارے میں آج تک نہیں سوچا جب کہ یہی بات تو سوچے جانے کی بات تھی۔''

''نشیان! تمھارے سر کی قسم، میں نے بھی یہ بات آج تک نہیں سوچی۔ خیر آسانی اسی میں ہے کہ ہم یہ سوچیں کہ بات دماغ میں نہیں ٹخنوں میں آتی ہے۔ ہم دماغ سے نہیں ٹخنوں سے سوچتے ہیں۔''

''ابے ہتق ہے تو کچھ ایسا ہی۔''

''نشیان! یہی مان لینا ٹھیک ہے کہ ہے کچھ ایسا ہی اور وہ یوں کہ ہم جس کشور میں، جس ''کشورِ یزداں'' میں سانس لینے کا ثواب کماتے ہیں، وہ ''کشورِ یزداں'' نہیں کشورِ اہرمن ہے اور اہرمن اپنے اس کشور کے گماشتوں کو یزداں کا جانشین منوانا چاہتا ہے۔ سو اہرمن کے گماشتے آپے سے تیر ہیں۔ تمھیں یہ قصہ بھلا کیسے یاد نہ ہوگا کہ زمانوں کے زمانوں سے پہلے کے زمانے میں یزداں نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں (اپنا) جانشین بنانا چاہتا ہوں اور ان دنوں اہرمن ہی میں نہیں، اہرمن کے گماشتوں میں جو زور ازوری کی حالت پیدا ہوئی ہے وہ تو ایسی عذابی ہے کہ ہمارا شمال، ہمارے جنوب سے اور ہمارا جنوب ہمارے شمال سے ٹکرا جائے اور کسی بھی ہونی کا آخری لمحہ آجائے۔''

''اہرمن کے گماشتے اتنے سینہ زور ہو گئے ہیں کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک ناشدنی کو ''یزداں کا جانشین'' ٹھہرانا چاہتے ہیں۔ ان کی اتنی ہمت' ان کا اتنا حوصلہ! ان کی اتنی جرأت۔ ان کی اتنی جسارت! نشیان! اُٹھو، ہم ایک دوسرے سے اپنے ماتھے ٹکرا لیں اور اتنے زور سے کہ ہمارے بدن لہولہان ہو جائیں۔''

''ہمارے زمانے کی تاریخ کے یہ گندگی زادے ہمارے دائیں بائیں، آگے پیچھے اور

اُوپر نیچے کی سڑاند ہیں، زہریلی سڑاند۔ اس سڑاند کو اپنے طیش کی تیز اور تُند تیزابی بوچھاڑ سے اپنے احساس اور گمان کے اَن دیکھے اُفقوں تک دھوڈالو۔ اسے فنا کی موج خیزی کے ہمیشہ میں ڈُبوڈالو۔"

"شیان! اس ملک کے مسلمانوں اور میرے ہمیشہ ہمیش کے محاورے کی رُو سے اس ملک کے شریف انسانوں کو کسی خلیفۃ المسلمین اور کسی خلیفۃ الناس کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔ جو خلیفۃ المسلمین یا امیر المومنین بننے کی حسرت میں مبتلا ہیں انھیں جاننا چاہیے کہ ان سے پہلے بھی ایک امیر المومنین گزرے ہیں۔ یہ زیادہ پرانی بات نہیں۔ اور یہ بھی جان لینا چاہیے کہ اس ملک کے غریب اور نجیب عوام اب کسی بھی فریب اور کسی بھی فحش فریبانی کے دام میں نہیں پھنسیں گے۔ وہ فقیر سہی، فریب کاروں کے نزدیک حقیر سہی مگر وہ فقیر اور "حقیر" حکم رانوں اور سلطانوں کے گریبان پکڑ کر انھیں ایک دم کے لیے بھی سانس نہیں لینے دیں گے۔ ایک دم کے لیے بھی۔ "خیرِ اعلیٰ" کی قسم، وہ ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے، ہرگز نہیں۔"

سسپنس ڈائجسٹ اکتوبر 1998

شعور، دانائی اور دانش

میں اپنے گمان کی رُو سے انسانوں کو بے حد عزیز رکھتا ہوں۔ مجھے مظلوم اور محروم انسانوں سے بے نہایت محبت ہے اور یہ محبت میرے نزدیک سب سے بڑی عبادت بل کہ میرے نفس کی سب سے بڑی فضیلت ہے۔ اور میرا گمان ہے کہ میرے قابلِ احترام پڑھنے والوں کی اکثریت بھی انسانوں سے بے نہایت محبت کرتی ہے اور وہ ان کو نسل، زبان، مسلک اور علاقوں میں نہیں بانٹتی۔

مگر عام معاملہ یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ ہر شخص اپنے آپ میں مگن ہے۔ رہے خونی رشتے تو وہ بہت معتبر سمجھے جاتے ہیں۔ مگر جب ان کی آزمایش کا وقت آتا ہے تو گنی چُنی مثالوں کے سوا نتیجہ بہت دل شکن ثابت ہوتا ہے۔

انسان اپنے آپ کو جان داروں بل کہ کہنا یہ چاہیے کہ "جانوروں" کا سب سے عمدہ نمونہ سمجھتا اور سمجھتا آیا ہے۔ وہ ایسا کیوں سمجھتا اور کیوں سمجھتا آیا ہے؟ یوں سمجھتا آیا ہے کہ اس نے پتھروں کو گِھس کر برچھیاں بنائیں اور دوسرے جان داروں یا جانوروں کی جان کو آیا۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اپنے سے کہیں زیادہ طاقت ور جانوروں کے خونیں ضرر سے اپنے آپ کو ہرگز نہیں بچا سکتا تھا۔

اگر انسانوں کے درمیان رائے شماری ہو اور اس مسئلے پر کہ وہ چنگیز خان کو اپنا حکم راں بنانا پسند کرتے ہیں یا کسی چیتے کو؟ تو فلسفی ہوں، شاعر ہوں یا روحانی پیشوا، سب کے سب چنگیز خان کے حق میں رائے دیں گے۔ اس لیے کہ چنگیز خان آخر انسان تو تھا۔ وہ کم سے کم اپنی بیوی یا بیویوں، اپنے بیٹوں اور بیٹیوں اور کچھ دوسرے قریبی لوگوں سے تو اُنس رکھتا تھا۔

یعنی اس سے کچھ انسان بل کہ کئی سو یا کئی ہزار انسان تو محفوظ تھے۔ مگر چیتے سے تو کوئی بھی انسان محفوظ نہیں ہے۔

اب ایک سوال ذہن میں اُبھرتا ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا ایک چیتے سے دوسرے چیتے محفوظ ہیں یا نہیں؟

''کشیان! تمھارا کیا خیال ہے؟ میں نے یہ سوال تم سے اس لیے کیا ہے کہ اگر میں اپنے اس سوال کا خود کوئی جواب دوں تو اسے ایک قسم کی دعوے داری سمجھا جائے گا''۔

''میرے صاحب! میری رائے یا میرا خیال یہ ہے کہ چیتا اپنے آپ کو دوسرے چیتے سے محفوظ سمجھتا ہے۔ کوئی بھی چیتا اس خدشے میں مبتلا نہیں ہوگا کہ مجھے کوئی بھی چیتا پھاڑ کھائے گا۔ یعنی کسی ایک چیتے سے چیتے کی نوع کو ہرگز کوئی خطرہ نہیں ہے''۔

''تو گویا میری اور تمھاری رائے چیتوں کے بارے میں ایک ہے۔ اب چیتے کی بات چھوڑ کر چنگیز خان کی طرف آؤ۔ کوئی شبہ نہیں کہ چنگیز خان سے اس کے قریبی لوگوں کو خطرہ نہیں تھا، مگر اس کے قریبی لوگوں اور اس کے حامیوں کے سوا جو لاکھوں اور کروڑوں انسان تھے، کیا وہ چنگیز خان کی خوں خواری اور خوں آشامی سے محفوظ تھے؟''

''ہرگز محفوظ نہیں تھے۔ چنگیز خان نوع انسان کی ایک مختصر تعداد کو چھوڑ کر باقی تمام نوعِ انسانی کے حق میں ایک خوں خوار چیتا تھا''۔

''کشیان! وقت تمھیں راس آئے، تم پھلو اور پھولو۔ تم نے وہ سچ بولا جس کو زندگی کی تاریخ کا درندہ ترین جان دار، جانور یعنی انسان ہرگز نہیں جھٹلا سکتا۔ بھلا کون یہودی، مسیحی اور مسلمان تورات اور قرآن کا یہ قصہ جھٹلا سکتا ہے کہ مخلوق کی سب سے شریف نسل، آدمؑ کی نسل کے پہلے دو بیٹوں میں سے ایک بیٹا...... دوسرے بیٹے کا، یعنی اپنے بھائی کا قاتل تھا''۔

''کیا کسی درندے کی نسل کے دو بیٹوں میں سے کسی ایک نے دوسرے کو قتل کیا؟ اب ایک اور بات کو دھیان میں لایا جائے اور وہ بات یہ ہے کہ کیا درندوں کے کسی ایک گروہ نے درندوں کے کسی دوسرے گروہ کے خلاف اپنی حفاظت یا اس پر برتری پانے کے لیے کبھی کوئی ہتھیار ایجاد کیا؟ درندوں کی بات چھوڑو، عام بات کرو۔ سانپ اور نیولے جنم جنم سے

ایک دوسرے کے بیری ہیں۔ ہیں کہ نہیں؟ سو بتاؤ کہ کیا کسی سانپ یا کسی نیولے نے ایک دوسرے کے خلاف کوئی غلیل یا کمان ایجاد کی؟''

تو یہ ہے انسان اور نوعِ انسانی' جان داروں یا جانوروں کی وہ نوع' جس کو جان داروں یا جانوروں کی ہر نوع پر برتری حاصل ہے۔

مگر اس نوع نے جو شعور' دانائی اور دانش سے بہرہ مند ہے' جس کے علم نے سیاروں پر اپنی فتح مندی اور بلندی کے پرچم لہرائے ہیں' یہ نوع خود اپنے حق میں عذابِ جہیم بن گئی ہے۔ اس نے دنیا کو خود اپنے لیے ایک جہنم بنا رکھا ہے۔ کیا شعور' دانائی اور دانش سے اس صورتِ حال کی توقع رکھی جا سکتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ شعور' دانائی اور دانش نے انسانیت اور انسان دوستی کو سخت مایوس کیا ہے۔ مگر ہم شعور' دانائی اور دانش کی نہاد سے ایک بہت باردار اور خجستہ کار اُمید رکھتے ہیں' اس لیے کہ شعور' دانائی اور دانش اپنی نہاد اور اُفتاد میں خیر سے عبارت ہیں۔

سسپنس ڈائجسٹ' نومبر 1998

قاتل کون تھا؟

میں جو ہوں یعنی میں، کئی ہفتے سے بہت اُداس ہوں۔ اُداسی شاید ایک بے کسی ہوتی ہے، ایک عاجزانہ اور مجبورانہ بے کسی۔ میں فرشِ عزا پر بیٹھا ہوں۔ میں سوگ کے دن گزار رہا ہوں۔ عزا اور سوگ کی حالت رقّتِ قلب، گداختگی اور برشتگی کی حالت ہوتی ہے۔ یہ حالت کسی شخص یا گروہ پر اس وقت طاری ہوتی ہے جب اس کی سب سے قیمتی متاع اس سے ہمیشہ کے لیے چھین لی گئی ہو یا پھر ایک ایسی ہستی اس سے جُدا ہو گئی ہو جس کی جُدائی اس کا بہت بڑا خسارہ ہو۔

کوئی شبہ نہیں کہ چنگیز خان، ہلاکو خان اور ہٹلر کا بھی بڑی اذیت اور دل سوختگی کے ساتھ سوگ منایا گیا ہوگا۔ مگر ان کا سوگ منانے والے ان کے اپنے گروہ، اپنی نسل، اپنی زبان اور اپنی زمین کے جنبہ دار لوگ ہوں گے۔ سو اس طور کے سوگ کو تنگ نظری، تنگ دلی، بے عقلی، بے دانشی، بے حسی اور شرم آور عصبیت کے سوا اور کوئی کیفیت نہیں کہا جا سکتا۔ جب بابل کا حکم ران بخت نصر اور صدیوں کے بعد اسی سرزمین کا عامل حجاج بن یوسف مرا ہوگا تو کیا اس سرزمین یعنی دجلہ و فرات کی وادی کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد نے غم میں اپنے گریبان چاک نہ کیے ہوں گے؟

ہر چیز کی کم سے کم دو قسمیں ہوتی ہیں۔ سو عزا اور سوگ کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک سوگ یا عزا وہ ہے جو ظالموں اور قاتلوں کے حمایتی مناتے ہیں اور ایک سوگ یا عزا وہ ہے جو مظلوموں اور مقتولوں کے حامی اور پس ماندگان مناتے ہیں اور کانٹے کی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ دونوں قسم کے لوگ اپنے اپنے طور پر اپنے آپ کو حق بہ جانب سمجھتے اور اپنی

سوگ واری اور عزاداری کو ایک شریفانہ انسانی حالت جانتے ہیں۔

حکیم محمد سعید طاب ثراہٗ کا مسیحانہ وجود خون میں نہلا دیا گیا۔ جن لوگوں نے اُن کے مسیحانہ وجود کو خون میں نہلایا' انھوں نے اپنے اس عمل کو ایک ''کارگزاری'' گردانا ہوگا اور اس پُر رنگ اور ''پُرطور رنگ'' کارگزاری پر وَجد وطرب کے ساتھ حالتِ رقص میں آئے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے وہی کچھ کیا ہوگا جو ظالموں' قاتلوں اور ان کے حمایتیوں کو کرنا چاہیے۔

''پُرطور رنگ'' پر مجھے مسیح آخرالزماں حکیم محمد سعید' اپنے ''سعید بھائی'' کا سراپا یاد آ گیا ہے اور بے نہایت اذیت رسانہ اور...... جہنمی عذاب کے ساتھ یاد آیا ہے۔ گورا چٹا رنگ' چندن کے رنگ کی سی مہربان ترین مسکراہٹ' سفید شیروانی' سفید پاجامہ اور سفید نعلین۔ سفیدی ہی سفیدی اور اس پر سُرخ رنگ' تازہ اور گرم رنگ کی موقلم کاری۔ سبحان اللہ! واہ وا!

سعید بھائی! آپ تو ''بڑے سوچے سمجھے'' طور کے جان دار نکلے۔ اپنے قاتل بھی چُنے تو وہ جو لاریب ''بے نہایت قسم'' کے مصّور واقع ہوئے تھے اور رنگ منصوبے (COLOUR SCHEME) میں بلا کے تردست تھے۔ اب رہے آپ تو آپ طبِ یونانی کی اصطلاحی جمالیات کے خوکردہ تھے۔ یہاں مجھے بے ساختہ طور پر ایک لفظ یاد آ گیا ہے' جو آپ کے فن کی اصطلاح ہے' یعنی خِلط (HUMOR) جس کی چار قسمیں ہیں' جو ''اخلاطِ اربعہ'' کہلاتی ہیں' یعنی صفرا' سودا' بلغم اور خون۔

آپ صرف طبیب نہیں بل کہ حکیم بھی تھے اور حکمت ہی تناسب یا جمال کا صحیح شعور رکھتی ہے۔ جمال کے بہت سے رنگ ہیں' سات رنگوں سے بھی زیادہ۔ اور ان رنگوں میں سب سے زیادہ نخریلا رنگ' سُرخ رنگ ہے۔ سو آپ کو تو وہی رنگ پسند آنا تھا۔ روح افزا کا رنگ' ماء اللحم کا رنگ' عرقمبر اور تن سکھ کا رنگ۔ خمیرۂ ابریشم' شربتِ عناب والا کا رنگ اور شربتِ انارین کا رنگ۔ گمان یہ ہے کہ آپ شوخ رنگ کی سُرخ ہوس میں مارے گئے۔ آخر تو لال قلعے کی دلّی کے تھے۔

آپ کے قاتلوں کا عجیب وغریب قسم کی قیاس آرائی کے ساتھ سراغ لگایا گیا اور بڑی

خیال انگیزی کی حالت میں ایک جماعت کو آپ کے قتل کی واردات کا ذمے دار ٹھہرایا گیا' حالاں کہ اس قیاس آرائی اور خیال انگیزی کا دائرہ بہت وسیع ہوسکتا ہے۔

یہ بات جاننا ذرا بھی مشکل نہیں ہے کہ حکیم محمد سعید' طب کے مسیحِ آخرالزماں حکیم محمد سعید کا قاتل کون تھا۔ سامنے کی حقیقت ہے کہ حکیم محمد سعید کو حکیم محمد سعید نے قتل کیا۔

جو شخص اس جرائم پیشہ معاشرے میں عدل' شرافت' انسانیتِ فاضلہ' دانش' دردمندی' شعورِ عالی اور خیرِ اعلیٰ کی باتیں کرے گا اور نہایت بے باکی کے ساتھ کیے چلا جائے گا' وہ اپنا خون خود بہائے گا۔

سسپنس ڈائجسٹ' دسمبر 1998

سب سے بڑی خواہش

میں یہ بات سوچتے ہوئے ایک اَن جانی اور داستانی سی کیفیت محسوس کر رہا ہوں کہ نئے سال کا تمام بیسویں صدی کا اختتام اور قریب کر دے گا۔ اس کیفیت میں ایک اور بھٹکی ہوئی اُداسی بھی ہے اور ایک کھٹکتی ہوئی اُمنگ بھی۔ اس سال کے اتمام پر ہمیں کو نہیں ساری دنیا کو ایک یادگار معاملہ کرنا ہے۔

بیس صدیاں تاریخ کے شمار سے بھی کوئی خاص اعتبار نہیں رکھتیں۔ اب رہا وقت یا زمانہ یا زمان کا تو اس کے اعتبار سے تو یہ مدّت ایک لمحے کے سنکھ، مہاسنکھویں حصّے کے برابر بھی بھلا کیا بیچتی ہے۔ یوں سمجھو کہ کائنات کے وجود اور نمود کی ابھی ایک پلک بھی نہیں جھپکی۔ وجود کی نمود ابھی ایک گمان کے گمانوں اور ان گمانوں کے گمانوں اور ان کے گمانوں کے گمانوں کا ایک گمان بھی نہیں ہے۔

یہاں مجھے انسان کی پیدائش کے قضیے کا خیال آ گیا۔ انسان کی پیدائش کا واقعہ آخر کب ظہور میں آیا تھا۔ حدیث میں آیا ہے کہ کسی شخص نے پوچھا کہ آدم سے پہلے کون تھا؟ فرمایا گیا کہ آدم۔ پوچھنے والے نے پوچھا کہ ان سے پہلے کون تھا؟ ارشاد ہوا کہ آدم۔ پھر تیسری بار سوال کیا گیا۔ اس سوال کا بھی یہی جواب دیا گیا اور اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا کہ اے شخص، اگر تُو عمر بھر یہ سوال کرتا رہے تو ہم اس کا یہی جواب دیتے رہیں گے۔

بیسویں صدی کے سالہا سال پہلے کے ایک سائنسی گروہ نے کہا کہ شروع کے شروع میں ایک نقطہ تھا جو ہمیشہ سے تھا۔ وہ نقطہ پھٹا یا عربی زبان میں ''انفجارِ عظیم'' اور انگریزی زبان میں (BIG BANG) واقع ہوا۔ وہ نقطہ ایک اِنچ کا مہاسنکھواں حصّہ تھا۔ علمی دنیا کے عوام ہی نہیں بل کہ خواص کے حساب یا قیاس کی رُو سے وہ نقطہ گویا تھا ہی نہیں۔

اس عہد کے شہرہ آفاق سائنس داں ہاکنگ نے لکھا ہے کہ اس کائنات سے پہلے بھی کئی کائناتیں تھیں۔ ہمارے بدن کے کسی تِل کے نہاسنکھویں حصّے میں بھی ایک کائنات ہو سکتی ہے۔ مجھے جناب ہاکنگ کی ہاں میں ہاں مِلا کر یہ کہنا ہے کہ میری ایک مفروضہ محبوبہ کے ایک تِل میں بھی بے شمار کائناتیں سرگرمِ شہود ہیں۔

ہے یوں کہ سب کچھ ہوسکتا ہے اور ہم بیسویں صدی میں سب کچھ ہوسکنے اور اس کے ذہنی بوجھ کو ڈھو سکنے کی لذّت اور اذیّت کا اچھا خاصا تجربہ کر چکے ہیں۔

بیسویں صدی میں انسانوں کا وقت بہت تیز گزرا۔

اور وقت کی گزران کا معاملہ وقت گزارنے والے سے ہے۔ ایک شخص کا ایک لمحہ ایک ہزار برس کے برابر ہوسکتا ہے اور دوسرے شخص کے نوّے یا سو برس ایک لمحے کے کسی کسری حصّے میں گزار سکتے ہیں۔

بیسویں صدی، انیسویں صدی کی وارث ہے اور آپ اس طرح صدیوں کے شجرے کے اُوپر تک چڑھتے جائیں۔ ہے یوں کہ ہر آنے والی صدی جانے والی صدی سے کچھ زیادہ چاق چوبند ہوتی آئی ہے۔ مگر میرے گمان میں انیسویں صدی، اٹھارویں صدی کے مقابلے میں اتنی جُدا ماجرا نہیں تھی جتنی بیسویں صدی، انیسویں صدی کے مقابلے میں پُر واقعہ، پُرطور اور جُدا ماجرا گزری۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے پہلے دہے تک سائنس نے انسانوں کو اس یقین سے مالا مال کیا جو اپنے مقبولِ عام میلان اور رجحان کے اعتبار سے روحانیت اور مذہب سے بہت مغرورانہ رویّہ رکھتا تھا۔

مجھے بیسویں صدی کے قریب ترین اختتام کے مرحلے پر خصوصیت کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان اور عمومی طور پر ساری دنیا کے معاملوں سے سروکار رکھنا چاہیے اور اس کے تلخ اور شیریں مزے کو پوری حسیّت کے ساتھ چکھنا چاہیے۔

کوئی شبہ نہیں کہ بیسویں صدی بہت دُور اندیش، بہت دُور رَس اور بے حد دُور طلب صدی رہی ہے۔ یہ تو اس کے علم، اختراع اور ایجاد کا پہلو ہے جس سے منکری کرنا کفر بھی ہے اور کفرانِ نعمت بھی۔ مگر ملک اور ملک، برِّ اعظم اور برِّ اعظم، زبان اور زبان، نسل اور نسل،

رنگ اور رنگ، سیاست اور سیاست، حکمتِ عملی اور حکمتِ عملی اور انسان اور انسان کے درمیان حکم رانوں اور سیاست کاروں نے جس جرم، شیطانی جرم اور حرام کارانہ طغیانی جرم کا ارتکاب کیا اس کی مثال اس صدی سے پہلے کی صدیوں میں میرے گمان کے مطابق ناپید ہے۔ میری اس بات کو شاید اس بات سے بڑھاوا ملے کہ یہ صدی، معلوم تاریخ کی سب سے زیادہ پڑھی لکھی صدی رہی ہے۔

اس صدی نے دنیا کے شریف انسانوں کو شریفانہ خیال اور خواب دیے۔ شریفانہ اور مثالی خیال اور خواب اور اس کے ساتھ ہی اذیّت ناک ترین عذاب پہنچائے۔ یہ مساوات کی صدی، یہ انسانی برادری کے خوابوں کی تعبیر کی صدی، یہ آزادی کی صدی اور جمہوریت کی صدی تھی۔

دنیا کے دانش مندوں، دانش پرستوں، دانش یاروں اور شاعروں کو اپنے ذہنوں کی برکتیں عام کرنے کا ایسا ماحول شاید کبھی فراہم نہیں کیا جیسا ماحول اس صدی نے فراہم کیا۔ اس نسبت اور اضافت سے میں اس صدی کے حضور کورنش بجالاتا ہوں۔ مگر میں جانتے بوجھتے یہ کیسے نہ کہوں کہ یہ صدی نہایت دوغلی ثابت ہوئی، دوغلی اور نہایت درندہ خصلت۔ اس نے ہم سے، ساری دنیا کے عوام سے، عزت مآب عوام سے سارے رخشندہ اور درخشندہ خواب چھین لیے۔ ہمیں بے مایہ اور بے سایہ کردیا۔

آخر ایسا کیوں ہوا؟ ایسا یوں ہوا کہ ہم نے انسان کی خجستہ تمناؤں کا سارا سرمایہ سیاست دانوں کے حوالے کردیا۔ سیاست دانوں کا طائفہ تاریخ میں ہمیشہ ایک کمینہ، پُرکینہ، ذلیل اور رذیل طائفہ رہا ہے۔ چیڑ قناتیے اور چوٹے صرف ایک ہی رعایت کے حق دار ہیں اور وہ یہ کہ انھیں، ان سب کو آنے والی صدی میں سر کے بل، سڑے ہوئے جوہڑوں میں دھکیل دیا جائے۔ گمان یہ ہے کہ نئی صدی کے عوام کو تاریخ اور لگاتار تجربوں نے ایک ایسے شعور سے نوازا ہے کہ اب وہ سیاست کے ''حرمزدین'' کے سڑیلے بہکاووں میں بھی نہیں آئیں گے۔ میری اس وقت کی سب سے بڑی خواہش ہے' سب سے بڑی خواہش کہ پاکستان کے عوام اور ساری دنیا کے عوام کو نیا سال راس آئے۔

سسپنس ڈائجسٹ' جنوری 1999

تاریخ کی نکوئی

اے سرزمینِ بدآئین، ناشدنی ترین! اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے تیرے لوگ، ہونے کا روگ، باہر کے قزّاقوں کے غلام تھے اور اب بھیتر کے قزّاقوں کے غلام ہیں، بے دام غلام۔ گویا یوں ہے کہ پہلے ہمارے آقا، آدمیت سے یک سر بے علاقہ پرائے تھے اور اب اپنے ہیں۔ یہ اپنے اور پرائے کی بھی خوب ہے۔ آخر کون اپنا اور کون پرایا۔ اگر باہر سے آنے والے قزّاق حکم ران پرائے تھے تو یہ بھیتر کے قزّاق حکم ران کیا ہمارے اپنے ہیں؟

تیسری جون ۱۹۴۷ء کے دن سے زیادہ فیاض، فرحت بخش، مبارک، مسعود، میمون، سرشار اور بختیار دن میری زندگی میں کبھی نہیں آیا۔ وہ ستر ہزار عیدوں سے میرے لیے کہیں زیادہ جاں فزا دن تھا۔ اس دن یہ اعلان ہونا تھا کہ ۱۵ اویں اگست کو ہمیں آزادی مل جائے گی اور ہم اپنے گورے خداوندگاروں؛ جرم اور جنایت کے کارنامہ گزاروں، سیاست کے حرام کوشوں، حرام کاروں، نفاق پروری کے ناقہ سواروں، ''تہذیب آموزی'' کے شر گفتاروں اور مدنیت کے شیطان شعاروں سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پالیں گے۔

میں اس زمانے میں جوبلی ہائی اسکول کے نویں کلاس کا طالب علم تھا۔ نہایت اجہل طالب علم۔

تیسری جون کے اعلانِ آزادی کو ریڈیو پر سُن کر میں کچھ کا کچھ ہو گیا۔

اس اعلان میں میری یاد کے مطابق لارڈ ماؤنٹ بیٹن، مہاتما گاندھی، قائداعظم، پنڈت نہرو اور سکھ رہ نما سردار تارا سنگھ (یا سردار بلدیو سنگھ) نے تقریریں کی تھیں۔ میں نے یہ تقریریں سُنیں اور اپنے چپل اپنے ہاتھ میں لے کر محلّے کی گلیوں میں دھوم مچانے اور دیوار

دیوار، دریچے اور دکان دکان کو یہ مژدہ سُنانے کے لیے نکل گیا۔

میری باتوں سے ہرگز یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیے کہ میں نویں کلاس کا ۳۳ نمبر حاصل کر کے کامیاب ہونے والا طالب علم کوئی بہت باشعور اور سیاسی بصیرت رکھنے والا لڑکا تھا۔ میں نہ تو مسلم لیگی تھا اور نہ کانگریسی۔ میں تو بے فرس اور بے تیغ و سپر بخت جان، حضرت بخت جان تھا۔ میں پوری انگریز نسل کی ہڈیاں چبا جانا چاہتا تھا۔ آج مجھے یہ بات سوچ کر اپنے آپ سے شرم آتی ہے کہ پندرھویں اگست کو میری خواہش کے مطابق ایک ایک انگریز مرد، ایک ایک انگریز عورت اور انگریز۔ کے ایک ایک بچّے کے بدن کو قینچے سے قتلے قتلے کر دینا چاہیے تھا۔ میں نے اس زمانے میں مغرب کے متعدد اشرافِ تاریخ کا نام سُن رکھا تھا۔ انگلستان کے فلسفیوں میں جو نام میں نے اپنے گھر میں بار بار سُنا تھا وہ سی ایم جوڈ کا نام تھا۔ میں اسے گنڈی سے ذبح کر دینا چاہتا تھا۔ میں جب سوچتا ہوں کہ غلامی کے احساس نے، اس کے طیش نے مجھے کتنا خوں خوار بھیڑیا بنا دیا تھا تو میں اپنے آپ کو سڑی ہوئی گالیاں دینے لگتا ہوں مگر یہ بات تو آنے والے کئی برس بعد کی بات ہے۔ اس وقت تو میں گوروں، گند کے بوروں کو ماں اور بہن کی ایسی ایسی گندی گالیاں دیتا تھا کہ بس۔ مثلاً یہ کتّے کے بچّے، یہ حرامی پلّے، یہ سور کے جنے ان کی تو ستّر نسلوں کی......

ہم نے اِن بھوتنی والوں کو، لاکھوں برس کے مبروصوں کو ناصرہ کا یسوع مسیح دیا، مسیحا دیا۔ ہم نے انھیں انجیل بخشی اور سورج عطا کیا۔ اور ان اندھیروں کے اندھا دھند لٹیروں نے ہمیں، اپنے منجّی یسوع مسیح کے چچیرے بھائیوں اور ان کے ہم وطنوں، ان کے برِّ اعظم یعنی مشرق زمین کے بیٹوں کو لُوٹا کھسوٹا اور اپنے محسنوں کی ناک میں غلامی کی نکیل ڈالی۔ ان کی تو ایسی کی تیسی۔ انھیں تو ایسی اور ویسی۔

انھوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں میں بین ڈالا۔ انھوں نے ہندوستان کے باشندوں کو نفوریت کے سانچوں میں ڈھالا اور ایک ہزار برس کے رشتے کو ایک دوسرے کے وجود سے قے کی طرح نکالا۔ یہاں اس بات کو تاریخ کی طیبہ طیبات کو ہرگز نہ بھولا جائے کہ ہم نے اپنی تہذیب، اپنی حمیت، اپنی غیرت اور اپنی حکمت اور اپنے غیرفانی

دانش مندوں کے وارثوں کی ناموس کو کسی ایک دن بھی مسلم لیگ کے حوالے نہیں کیا۔ ہم کبھی سیاست کے جوہڑ میں نہیں بہے چاہے وہ کانگریس کی سیاست ہو یا مسلم لیگ کی۔

میں ایک غاسق اور فاسق، میں ایک فاجر اور کافر اپنے ایک فقیر سلسلۂ نسب کی نسبت سے جو ہمارے نسّاب مکّے اور مدینے کے نساب، انبار کے نسّاب، بغداد (کرخ) کے نسّاب، سامرہ کے نسّاب، صیدا کے نسّاب، واسط کے نسّاب، سہودرا کے نسّاب اور امروہے کے نسّاب، نسل نسل، قرن قرن اور صدی صدی سے ہر شادی کے موقع پر سُناتے رہے ہیں۔ میں اپنے آپ کو یہ کہنے پر مامور گمان کرتا ہوں کہ تم ناپاکی کو پاکی قرار دینے والے ہوتے کون ہو؟ تم اپنے ذہن کے نشیب سے فراز تک ایک رذیلت اور غوایت ہو۔ تم اپنے پہلے ہی سانس سے منافقت ہو۔ تم انسانوں اور انسانوں میں تفریق کرتے رہے ہو۔ یہ بکواس کرنے والے تم کون ہوتے ہو کہ فلاں گروہ برتر ہے اور فلاں کم تر۔ سو برتر کے لیے ایک ریاست کو وجود میں لایا جانا چاہیے۔

ایک ساعت ہے۔ ایک سریت ہے جو مجھ سے یہ کہلوا رہی ہے کہ اے لوگو! اب اپنے ستر اسّی برس کی جہولیت اور اجہلیت کے شرکو نہ بھوگو اور قلبِ ماہیت کا عمل انجام دو اور اس کا انعام لو۔ خاک ساری اور وقت کی شکر گزاری اختیار کرو، اس وقت کی شکر گزاری جس نے تمھیں ابھی تک ملیا میٹ نہیں کیا۔ جب کہ تمھیں کبھی کا ملیا میٹ ہو جانا چاہیے تھا۔ اپنے آپ کو وقت کے دائرے کا وہ نقطہ جانو جو تاریخ کے سیرت نگار کی اندازہ گیری کی رُو سے ناپاک ہے۔ سو دانش اور بینش کا غسل کرو اور اپنے پورے پن کو پالائش کی پوشاش میں دھرو اور تاریخ کی نکوئی کسب کرو۔ تمام انسانوں کو ایک جانو۔

مسلمان مسجد

آج دوپہر کی بات ہے، میں اور طالیس ایک بازار سے گزر رہے تھے۔ وہ بھی خاموش تھا اور میں بھی کہ یک بارگی طالیس نے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ جو مسجد ہے، اس میں جمعہ اور عید بقرعید کی نماز سنّی بھی پڑھتے ہیں اور شیعہ بھی۔ یہ دونوں کی مسجد ہے۔''

اس کی یہ بات سُن کر میرا رنگ فق ہو گیا اور میرے قدم جہاں تھے وہیں جم کر رہ گئے۔ وہ نوجوان میرا خون تھا، میرا جگر گوشہ تھا اور اس پر اچانک دماغی دورہ پڑ گیا تھا۔ میں نے خود پر نہ جانے کیسے قابو پایا اور اس کے دائیں کاندھے پر ہاتھ رکھا اور ہکلاتے ہوئے کہا ''آؤ، تھوڑی دیر کے لیے اس پیڑ کے نیچے بیٹھ کر دم لے لیں۔''

میری آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں نے اس کی آواز سُنی ''نانو جانی! کیا آپ کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے۔ یہاں کوئی پیڑ نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنے ہاتھوں سے سہارا دیا۔

وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ مجھ پر دماغی دورہ پڑ گیا ہے۔ میں پوری بات سمجھ گیا یعنی یہ کہ اس نے میری بات کو دیوانے کی بڑ سمجھا تھا۔ سو میں نے اپنے حواس کو بحال کیا اور چند ثانیوں کے بعد اس سے کہا ''طالیس! تم میری اکلوتی بہن سیّدہ شاہِ زناں عرف خیزراں نجفی کے نواسے ہو گویا میرے نواسے ہو۔ میری سب سے بڑی بھانجی، ادیبہ بھانجی، ہما جمال اور جمال کے بیٹے ہو۔ میرے خیال میں تمھارا مجھ سے مذاق کرنا شاید کوئی بہت مناسب بات نہیں۔''

اُس نے کہا ''نانو جانی! میں اور آپ سے مذاق کروں، میں سمجھا نہیں کہ مجھ سے

اَن جانے میں کیا گستاخی سرزد ہوگئی ہے؟"

میں نے اُس کی بات سُن کر کہا "جانِ عزیز! کیا کوئی ایسی مسجد بھی ہوسکتی ہے جو سنّیوں کی بھی ہو اور شیعوں کی بھی۔"

"ہندوستان اور پاکستان میں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ ایک دیوبندی، بریلویوں کی مسجد میں اور ایک بریلوی دیوبندیوں کی مسجد میں نماز پڑھنا تو بڑی بات ہے اس کے احاطے میں بھی داخل نہیں ہوسکتا۔ تم نے جو بات کہی اس کو میں ہی نہیں، کوئی بھی نہیں مان سکتا۔ میاں! نماز پڑھنے والے کا مسلک ہی نہیں، ہر مسجد کا بھی اپنا ایک مسلک ہوتا ہے۔ مسجد یا تو سنّی ہوتی ہے یا شیعہ، بریلوی یا دیوبندی۔ میں نے آج تک کوئی مسلمان مسجد نہیں دیکھی۔"

اس نے کہا "نانو جانی! آپ کے سر کی قسم، میں نے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں کہا۔ آپ گھر چل کر کسی سے بھی پوچھ لیجیے گا۔ اگر میرا کہا جھوٹ ثابت ہوا تو میں اپنے گولی مارلوں گا۔"

مجھے اس کی بات پر یقین کرنا پڑا اور اس کے ساتھ ہی میں اُداس ہوگیا۔ مجھے اس مسجد کو دیکھ کر پاکستان کا خیال آیا اور اس خیال نے مجھے وہاں کے فرقہ وارانہ گروہوں کے دہشت ناک خیال میں مبتلا کردیا۔ میری دہشت زدگی یہ سوچ کر اور بھی بڑھ گئی کہ محرّم قریب ہے۔ جب دوسرے مہینوں میں یہ گروہ اپنے حریف گروہ کے لوگوں کو مقدّس مقامات، شاہ راہوں، بازاروں، راہ گزاروں اور گلیوں میں لہولہان کرتے رہے ہوں تو وہ محرّم اور صفر میں کیا کچھ نہیں کریں گے۔

سسپنس ڈائجسٹ، مئی 1999

جو بڑے کہلاتے ہیں

ہم نہ جانے کس طرح رہ رہے ہیں اور رہ بھی رہے ہیں کہ نہیں۔ ''رہنے'' کی بات آئی ہے تو پِسُّو، تتیے، مچھّر، کھٹمل، آنکھ پھوڑ بِڈّا اور چوہے بھی رہ رہے ہیں۔ چھپکلیاں، چمگادڑیں، گھونسیں، بھڑیں، ڈبک سوئیاں، کھوڑیاں اور مکھّیاں بھی رہ رہی ہیں۔

حاشا وکلا میری ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ میں مذکورہ بالا ''خواتین'' اور ''حضرات'' کو انسان کے مقابلے میں کہتر یا کم تر درجے کا جانور ٹھہراؤں بل کہ میری اٹکل تو یہ کہتی ہے کہ فطرتِ فاطرہ نے آفرینش کا سب سے بڑا کمال سب سے کم جسامت رکھنے والے جان داروں کی آفرینش میں دکھایا ہے، جیسے بھنگے۔

اماں جاؤ بھی جون ایلیا! تم بھنگے کو کم تر درجے کی جسامت رکھنے والا جان دار سمجھتے ہو۔ میرے بھائی وہ تو دیو قامت جان دار ہے۔ کیا تم ان جان داروں کو بُھول گئے جو سوئی کی ایک نوک پر کروڑوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور پائے چلے جاتے ہیں۔

اُوپر کی سطروں میں زبان کا ایک سنگین قضیہ پیش آ گیا ہے اور اس کا احساس مجھے ابھی ایک لمحے پہلے ہی ہوا۔ قضیہ یہ ہے کہ مادّہ جان داروں کو ''خواتین'' اور نَر جان داروں کو ''حضرات'' کہا گیا۔ دَھت ترے کی...... یہ ایک ایسی غلطی ہے جو میری زبان میں بار بار، بار پا رہی ہے۔ ''خواتین'' اور ''حضرات'' میں ''خواتین'' حشو ہے نہایت فحش قسم کا حشو۔ ''حضرت'' یا ''حضرات'' کا لفظ دونوں کے لیے ہے۔ یہ بدعتِ سیئہ انگریزی کے لفظ بہ لفظ ترجمے کا اسقاط ہے یعنی ''لیڈیز اینڈ جنٹلمین'' کا اور یہ ایک بے نہایت خچر پاتری پن ہے۔

بات جان داروں کی ہو رہی تھی۔ بہ ہر حال بات ہو رہی تھی، انسان کے علاوہ

دوسرے جان داروں بل کہ زیادہ بلیغ تعبیر کی رُو سے جانوروں کی۔ جانوروں کے بارے میں یعنی اپنے ہم جنسوں کے بارے میں میرا وہی مسلک ہے جو ایک شریف جان دار، جانور کا ہونا چاہیے اور وہ مسلک یہ ہے کہ تمام جانور برابر ہیں۔ جانور ہونے کی حیثیت سے مصر کے دانش مند ترین اور متحرک فرعون اخناتون ...... اور امیبا اور جیلی مچھلی میں کوئی فرق نہیں ہے۔

انسانوں کا معلّمِ ثانی ابونصر فارابی اپنے گھر کے حجروں اور غرفوں کی دیواروں کی سطح پر بود و باش رکھنے والی چھپکلیوں پر کوئی بھی برتری نہیں رکھتا تھا۔ میں اس لمحے جس گمان سے دوچار ہوا ہوں وہ گمان یہ ہے کہ جس ''گھر'' نام کی عمارت میں ابونصر فارابی رہتا تھا اسے ہمارے زمانے کے محاورے میں ''فارابی منزل'' کہا جائے گا۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ ''فارابی منزل''یعنی فارابی کا گھر، فارابی کا گھر تھا یا اس گھر کے حجروں، رواقوں اور غرفوں کی دیواروں کی سطح پر رہنے والی چھپکلیوں کا؟

یہاں مجھے ایک نکتے سے نوازا گیا ہے، ایک عجب نکتے سے۔ اور وہ نکتہ یہ ہے کہ نقل و حرکت کے اعتبار سے چھپکلی فارابی پر بلاشبہ ایک قابلِ لحاظ فوقیت رکھتی ہے۔ جو شخص اس بات کو سن کر حیرت کا اظہار کرے میں اس پر سرپرستانہ اور مربیانہ حیرت ہی نہیں کروں گا بل کہ اسے سراد رسٹھ قرار دوں گا۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا فارابی پیٹ کے بَل دیوار کی سطح پر نیچے سے اُوپر، اُوپر سے نیچے، دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں نقل و حرکت کرنے کی ادنیٰ سے ادنیٰ اہلیت بھی رکھتا تھا؟

اس مرحلے پر یہ بات سمجھ لی جانا چاہیے کہ اس طور کی نقل و حرکت کے لیے جس کا تعلق دیوار کی سطح سے ہو، ہرگز کپڑے پہنے ہوئے ہونے کا مشورہ نہیں دیا جا سکتا۔

کیا ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ انسانوں کا معلّمِ ثانی فارابی ننگ دھڑنگ، دیوار کی سطح پر نیچے سے اُوپر کی طرف حرکت کر رہا ہے اور کوئی مکھی، مچھر، پتنگا یا دکھوڑی اس کا ہدف ہے اور ان میں سے کوئی اُڑ کر یا رینگ کر دائیں طرف جا بیٹھتا ہے تو معلّمِ ثانی دائیں طرف رینگنے

لگتا ہے۔ اُس کا شکار تیزی سے نیچے چلا جاتا ہے یا اُڑ جاتا ہے تو انسانِ اعلیٰ یا جانورِ اعلیٰ، معلّمِ ثانی ایک دوسری حکمت بہتر حکمتِ عملی اختیار فرماتے ہیں اور اپنے ان شکاروں میں سے کسی شکار کو چَٹ کر جانے میں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ اسی دوران انھیں بائیں طرف اپنا ایک گھاجا دکھائی دیتا ہے سو وہ بائیں طرف کا رُخ کرتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ یہ ہے۔

اگر کسی شے کو ایک جان دار، جانور ہونا ہے تو پھر اسے ایسی حالتوں کو ناگزیر طور پر قبول کرنا پڑے گا، چاہے وہ ''شے'' معلّمِ ثانی ابونصر فارابی ہو یا شنکر آچاریہ۔ اگر یوں ہوگا تو پھر یوں ہوگا۔

ہاں تو کہا جا رہا تھا کہ ہم نہ جانے کس طرح رہ رہے ہیں اور رہ بھی رہے ہیں کہ نہیں۔ ہم جس طرح رہ رہے ہیں، کیا اس رہنے کو احساس اور شعور کی حالت میں رہنا کہا جا سکتا ہے؟ سچ بتایا جائے کہ کیا ہم رہنے کی طرح رہ رہے ہیں۔ ہمارے دُکھوں، ہماری جھونجلوں، ہماری اُلجھنوں اور ہماری کُڑھنوں کی قسم، ہم رہ نہیں رہے۔ ہم رہ ہی نہیں سکتے۔ جو بات ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں رہنے دیا جا رہا ہے۔ یہاں ہم ایک دوسرے سے یہ سوال کرنے پر مجبور ہیں کہ آخر وہ کون ہے جو ہمیں رہنے دے رہا ہے۔

ہم میں سے کوئی نہ کوئی اس سوال کا جواب دے گا اور صحیح جواب دے گا اور وہ جواب یہ ہوگا کہ وہ کوئی ایک شخص نہیں ہے جو ہمیں رہنے دے رہا ہے۔ وہ تاریخ کا ایک لوفر اور لفنگا ٹولا ہے جس کے جاہ و جلال، عروج و کمال، جس کی رفعت اور عظمت، جس کی قوّت اور قدرت، جس کی ارجمند معاشی اور عزت مآب بدمعاشی کے لیے ہمارا ہونا اور رہنا ضروری ہے۔

میں تمھاری حالت محسوس کر کے اپنے رہے سہے اوسان بھی کھونے لگتا ہوں اور بُری طرح چڑچڑا اُٹھتا ہوں اور پھر اول فول بکنے لگتا ہوں۔ کبھی کبھی تو مجھے خود پر اور تم پر بڑا گھٹیا رونا آتا ہے سو میں جھینپ سا جاتا ہوں۔

مجھے اس ملک کے کارنامہ گزاروں (''گذاروں'' غلط ہے) نام داروں اور خداوندگاروں کے بارے میں وہ بات سُنانے دو جو یزید الرقاشی نے بنوعباس کے پہلے

حکم ران عبداللہ السفاح کو سُنائی تھی۔ وہ بات یہ ہے کہ ایک تنوخی آدمی بنو عامر کے ایک قبیلے میں وارد ہوا تو اس نے اپنے سروسامان سے کوئی سروکار رکھے بغیر ایک شعر پڑھا۔

''میں تیری قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جب تک عامریوں کے بدنوں پر اُن کی کھال باقی ہے، اس وقت تک کنجوسی کے سبب ان کے بھید بوسیدہ نہ ہوں گے۔''

اس مرد تنوخی نے یہ شعر پڑھا ہی تھا کہ ایک کنیز اس کی طرف بہت تپاک اور گرم جوشی سے بڑھی اور اس سے اس کی خیر، خیریت پوچھی اور پھر کہنے لگی کہ اے نووارد! تُو بھلا کس قبیلے سے ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں بنو حمیر کا آدمی ہوں۔ کنیز نے کہا کہ کیا تُو اس شاعر کو جانتا ہے جس نے یہ شعر کہے ہیں؟

''بتانے والوں نے مجھے بتایا کہ قبیلہ حمیر کے لوگ میری ہجو کرتے ہیں تو میں نے اُن سے کہا میں تو انھیں کچھ بھی نہیں گردانتا اور نہ وہ پیدا ہوئے ہیں کہ قبیلہ حمیر کی کوئی اصل ہی نہیں ہے۔ وہ چٹیل میدان کی لکڑی کے مانند ہیں جس میں نہ تو تری ہوتی ہے اور نہ پتے۔ اور اگر کوئی لومڑی ان پر پیشاب کردے تو وہ غرق ہو جائیں۔''

میں جون ایلیا پوری بے مروتی اور تُند گفتاری کے ساتھ پوچھتا ہوں اور اپنے لوگوں اور اپنے پڑھنے والوں کی ہم آوازی کے ساتھ پوچھتا ہوں کہ وہ کون ہے جو مجھے میری گفتار، میرے لوگوں کی گفتار کو یا وہ گوئی، ہرزہ سرائی اور ژاژ خائی ٹھہرائے۔ ہم یہاں بلند بارگاہوں اور جمشید جاہوں کے بارے میں وہی کچھ کہتے ہیں جو ہمیں کہنا چاہیے۔ میری طرف سے یہ نکتہ یاد رکھا جانا چاہیے کہ جو ''بڑے'' کہلاتے ہیں وہ بہت ہی چھوٹے ہوتے ہیں۔ ہمارے بڑے تو بہت ہی چھوٹے ہیں۔ تو ہمیں ان کو بہت چھوٹا، بہت ہی چھوٹا جان کر ان سے معاملت کرنا چاہیے اور لحہ لحہ خود شناسی کے زینوں پر قدم دھرنا چاہیے۔ اسی طرح ہم اپنے حق سے محروم لوگ اپنے حق کو پا سکیں گے۔

وقت، وقت، وقت

پاکستان کے ایک جواں سال اور نام ور مصور نے فون کر کے مجھے بتایا ہے، شدید آزار پہنچایا ہے کہ خمار صاحب ختم ہو گئے۔ حضرت خمار بارہ بنکوی ختم ہو گئے۔

''کیا بکتے ہو تم!''

''ہاں جون بھائی، آپ کے خمار بھائی ختم ہو گئے۔''

ہندوستان کا ایک کوی یہاں آیا ہے اور ہندوستان کا ایک شاعر یہاں سے، عالمِ وجود سے چلا گیا ہے۔ اِن سینہ چھلنی کرنے والوں، اِن گزرنے والوں، اِن مرنے والوں نے مجھے، نظمیں اور غزلیں کہنے والے شاعر کو ایک مرثیہ گو بنا کے رکھ دیا ہے۔ یہ جرم ہے۔ لوگو، یقین کرو کہ یہ جرم ہے اور اس کی سزا موت سے کہیں زیادہ ہے۔ کیا یہ کوئی قرینے کی بات ہے کہ ایک شاعر کو، بگڑا شاعر بنا دیا جائے۔

ہم سماج کے غریبوں اور اجنبیوں کے لیے، ہم لفظوں کے آہنگ سے دل اور جان کا معاملہ رکھنے والوں کے لیے یہ زمانہ بڑی جان لیوا پَت جھڑ کا زمانہ ہے۔ مشاعرہ آرائی کا، اُردو کی عالم گیر مشاعرہ آرائی کا جادو گر جوان، افسوں پرور، ہنرمند سلیم جعفری گستاخ، میرے سینے پر گھونسا مار کے، اپنے جون بھائی کے سینے پر گھونسا مار کے آرام سے لیٹ گیا۔ پھر میاں جی وہ بس یوں ہی، بس یوں ہی مر گیا۔ کمینہ کہیں کا۔ میاں جی بھلا کوئی بات ہے۔

جمالؔ احسانی مجھ سے اپنا مرثیہ کہلوانے کے شوق میں سرشاری کا زہر پی کے قبر میں جا لیٹا۔ ہم نے اس کو بہت آوازیں دیں، نہیں اُٹھا۔ ہم بھی اس پر خاک ڈال کے چلے آئے۔ وہی تو سب کچھ نہیں تھا ہم بھی تو کچھ تھے۔ وہ اپنے ہی اکثر شعروں کا مطلب نہیں

سمجھا۔ خاص طور پر اس شعر کا۔

یہ کس مقام پہ سُوجھی تجھے بچھڑنے کی
کہ اب تو جا کے کہیں دن سنورنے والے تھے

اس کے بعد اپن کے آڑی عبیداللہ علیم کے دل میں بیٹھے بٹھائے اپنے سے گزر جانے کی ہوس پیدا ہوئی تا کہ اِس نانجار کا یارِ نابکار اُس کا مرثیہ کہہ کے چھپوائے اور دونوں کی مشہوری ہو۔ سو میاں جی، وہ اپنے سے بے طورانہ گزر گیا۔ اس کے بعد کسی بھی قرینے کے بغیر رضی اختر شوق رَفو چکر ہو گیا۔ نہ جانے سالوں کے دلوں میں کیا سمائی تھی۔ اب تم نے ہمیں بھی بتا دیا ہوتا۔ اگر یوں ہی رَفو چکر ہو جانا کوئی مزے کی سیر ہے تو ہم بھی تمھارے ساتھ چلے چلتے۔

اور اب مجھے یہ سُنا وَنی سُنائی گئی ہے کہ ہمارے مشاعروں کی جان اور غزل کے شستہ اور شایستہ آہنگ کی آن، ہماری نسل کے بے حد عزیز، بے حد محبوب بزرگ حضرت خمار بارہ بنکوی ہم سے چھین لیے گئے۔ ہائے خمار بھائی، ہائے خمار بھائی کا یہ شعر۔

اُٹھ کے اِک بے وفا نے مرے دی جان
رہ گئے سارے باوفا بیٹھے

تُو جو ہے نا، تُو، اپنا کان میرے ہونٹوں کے پاس لا، آ، بس آ جا "وقت، وقت، وقت" سُن لیا کہ نہیں، بس چُپ جا۔

سسپنس ڈائجسٹ' جولائی 1999

دونوں سے

میرے لوگو! میں بہت دن بعد تم میں آیا ہوں اور آنے کی طرح نہیں آیا ہوں، میں اس دیری اور دُوری کے دوران اپنے آپ کو مشرق اور مغرب کے ملکوں اور شہروں میں رُسوائی کماتا ہوا گھسیٹتا پھرا ہوں۔ ہے یوں کہ اب میں ایک خانہ بدوش انسان ہوں۔ کوئی ایک بنجارا۔ میرا کوئی ٹھور ٹھکانا اور ٹھیا نہیں ہے۔ کہاں میری گزران اور کہاں میرا ریٹھان۔ مجھے اپنی سرنوشت خوش آئی۔ بہت خوش آئی۔ میں اپنی خانہ بدوشی میں خوش اور اپنی شہر شہر اور دیار دیار رُسوائی میں سرخوش ہوں۔ کیا تم میری ایک کہن سُنو گے اور اسے سچ مانو اور سچ جانو گے۔ شاید تم اسے سچ نہ جانو اور سچ نہ مانو اور آخر تم اسے سچ جانو اور سچ مانو بھی کیوں۔ خانہ بدوشی ہونے اور اپنے آپ کو لمحوں لمحوں میں ڈھونے اور رہنے سہنے کی مشقت بھگتنے کا ایک لاکھوں برس پرانا سچ مچ پن ہے۔

ان دنوں میں اسپتالوں میں بھی رہا، مرنے سے ذرا دیر پہلے کا عیش اُڑانے کے لیے اور مشرق اور مغرب کے ننگے ناچ کے ہالوں میں بھی لے جایا گیا۔ رائگانی کی لذت بھگتانے کے لیے۔ یعنی میں نے اذیت میں بھی اپنا سینہ خالی کیا اور لذت میں بھی اپنے سینے کے اندر دُھول اُڑائی۔

سب کچھ لایعنی ہے، ہاں سب کچھ لایعنی اور آنی ہے۔ ہم جہاں بھی اور جس حالت میں بھی ہیں وہ ایک بے امانی کی حالت ہے، پُر زیانی کی حالت ہے۔ جون ایلیا کیا تُو کوئی اکیلا اور دنیا سے نرالا خانہ بدوش ہے؟ سُن اور گُن اور اپنی سبک سری کا سر دُھن۔ ہر ذرّہ اور ہر سیارہ خانہ بدوش ہے اور فریاد کر کہ خود وجود خانہ بدوش ہے۔ شہود اور نمود خانہ بدوش ہیں۔

کہکشائیں خانہ بدوش ہیں۔ سحابیے خانہ بدوش ہیں۔ کیا تُو نے کسی آن اور کسی لمحے کو کہیں ٹِکا اور ٹھہرا ہوا دیکھا ہے؟ یہاں یوں ہی سی ایک بات میرے دل میں آئی ہے جو مجھے کتنے ہی زمانوں کی اذیت ناکی نے سمجھائی ہے اور وہ یہ ہے کہ زندگی سے دل لگی کرو، اٹکھیلی کرو، سوچی سمجھی دل لگی اور اٹکھیلی۔ پر زندگی سے دل نہ لگاؤ اور ہاں! اگر تم زندگی کو سلیقے اور سمادھانی سے برت لو تو زندگی خیر ہے اور اگر زندگی تمھیں برتنے لگے تو پھر وہ شَر ہے اور ضرر ہی ضرر ہے۔

بھلا میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں، آخر کیا؟ شاید میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ تم جو ہونا! تم یعنی تم یا شاید تم، اپنا ایک پچھتاوا ہو اور پچھتاوا بہکاوے کی دین ہوتا ہے۔ تم بھی پچھتاوا ہو اور میں بھی پچھتاوا ہوں اور ہم سب بہکاوے کی دین ہیں۔ ہمیں جو بھی زورآور بہکانا چاہتا ہے وہ بڑی آسانی سے بہکا لیتا ہے۔

زورآور کے لفظ پر میرا خیال کہیں سے کہیں چلا گیا ہے یوں کہ ہمیں ہمارے شہنشاہوں، جمشید جاہوں، دارا بارگاہوں اور ظلِّ الٰہوں نے ایسا بہکایا، ایسا بہکایا کہ بس۔ اگر کسی ملک کے حکم رانوں کو بہکانے کا فن سیکھنا ہے تو وہ ہمارے حکم رانوں سے سیکھیں اور اگر کسی ملک کے لوگوں کو بہکنے کا ہنر سیکھنا ہے تو وہ ہم سے سیکھیں۔

معاملے کی صورت یہ ہے کہ ہم میں سے زیادہ لوگ دو بڑے گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک بڑا گروہ وہ ہے جو ہمارے صوبے کے ایک ''خاندانِ شاہی'' بل کہ ''ایک نومسلم خاندانِ اہلِ بیت'' کی غلامی کو اپنی فرنامی اور سرنامی جانتا ہے۔ یہ خاندانِ شاہی ہمیں بار بار بڑے کڑوے دھوکے دیتا رہا، بساندے اور بھسے ہوئے دھوکے، سڑے ہوئے اور کیڑے پڑے ہوئے دھوکے۔ ہمیں اس سے بھلا کیا ملا، کیا ملا ہمیں اس سے ''اس سوال کا ایک ہی جواب ہے اور وہ ہے ڈھینڈس۔ ہم میں سے دوسرا بڑا گروہ وہ ہے جس نے اس دقیانوسی ٹولے کو اپنا مہدی اور ہادی جانا جو چند سال پہلے ہندوستان کے بٹوارے سے پہلے کے نعرے لگانے میں جٹ گیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو پاکستان کی بانی جماعت کا جانشین منوانے کی مضحکہ خیز خوش فعلی یا بدفعلی کو اپنی حکمتِ عملی کی دستاویز بنایا اور عوام کو اپنے موروثی

اور پشتینی حق کا واسطہ دیا اور اس طرح ان چیلوں نے عوام کی ایک بڑی تعداد کی چڈھی گانٹھ لی۔ اس ٹولے کو ایک بار کے بعد دوسری بار بل کہ تیسری اور چوتھی بار سجدہ کیا گیا اور اس ٹولے نے چوتھی بار بھی سجدے کی پیشانی کو اپنے جوتوں کی ٹھوکروں سے نوازا اور خوب نوازا۔

یہاں میری رُوداد بھی سُن لو۔ میں شمالی مغرب کے ایک شہر میں تھا کہ ناگہاں ایک شام مجھے بتایا گیا کہ پاکستان کی بانی جماعت کے "وارث" اپنی سلطنت کے تھنوں کے دودھ کا ایک ایک قطرہ پی کر مجرمانہ اور قاتلانہ ڈکاریں لینے کی حالت میں رخصت ہوئے اور وادریغا اور وااسفا! کہ ان کی جگہ فوجی آ گئے اور وہ یوں کہ وزیراعظم نے پہلے تو عساکرِ پاکستان کے سپہ سالار کو معزول فرمایا جو سری لنکا سے واپس آ رہے تھے اور کراچی کے ہوائی اڈے کے نگرانوں کو حکم دیا کہ ان کے طیارے کو ہوائی اڈے پر نہ اُترنے دیا جائے۔ یہاں جو میرا مسئلہ ہے اس کا تعلق عساکرِ پاکستان کے سپہ سالار سے نہیں ہے۔ ویسے "سپہ سالار" بھی بہ ہرحال ایک انسان ہوتا ہے' میرا مسئلہ طیارے کے ان دو سو یا سوا دو سو مسافروں سے تعلق رکھتا ہے جن کی جان دار ہونے کے سوا نہ کوئی حیثیت تھی اور نہ ان کا وجود کسی کے لیے رکاوٹ بن رہا تھا۔ اگر یہ طیارہ ہوائی اڈے پر نہ اُتر پاتا تو فضا ہی میں ان کے وجود کے چیتھڑے اُڑ جانے کی پھلجھڑیاں چھوٹتیں۔ ویسے ایک بات ہے کہ یہ منظر بڑا پُر رونق منظر ہوتا۔

وزیراعظم کے حکم کی تعمیل نہ کی جا سکی اور طیارہ کراچی کے ہوائی اڈے پر اُتر گیا اور جناب وزیراعظم اپنے تخت سے اُتار دیے گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں ایک بات ہر اعتبار سے گفتنی ہے اور وہ یہ ہے کہ جناب وزیراعظم' پاکستان کی بانی جماعت کے وارث نہیں بل کہ سپہ سالارِ عساکرِ پاکستان جناب ضیاء الحق" کی آمریت کے وارث تھے۔ خدائے غفور و رحیم مرحوم آمرِ مطلق کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ ویسے ہے یوں کہ مجھے فوجیوں کے سربراہ کا آنا اچھا نہیں لگا۔ میں اپنے سمجھنے کے لیے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ فوجی کون ہوتے ہیں' کیوں ہوتے ہیں اور کس لیے ہوتے ہیں اور یہ معاشرے کے شایستہ گرد و پیش میں درّانا آ کر ہونے اور ہو سکنے کی فضا کو کیوں گمبھیر بنا دیتے ہیں۔ یہ کیوں آتے

ہیں، کیوں آ جاتے ہیں۔ انھیں آخر کیوں آنا چاہیے۔ کیوں آ جانا چاہیے؟ شاید یہ ایک بہت سنگین یا ایک بہت سرسری سوال ہے۔ پر اس بار خاص طور پر اِس بار اِس سوال کا جواب عساکرِ پاکستان کے سپہ سالار اور عساکرِ پاکستان کو نہیں دینا بل کہ پاکستان کی بانی جماعت کے ''سعادت مند وارثوں'' کو دینا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے اور تمھارے ساتھ باون برس سے لگاتار طرح طرح کا مذاق کیوں کیا جا رہا ہے۔ آخر ہم نے کیا قصور کیا تھا۔ میں یہ سوال جانے والوں سے بھی کر رہا ہوں اور آنے والوں سے بھی۔

سسپنس ڈائجسٹ، جنوری 2000

میں نشے میں نہیں ہوں

بہار کی ایک بے مہر اور ملال انگیز شام ہے اور میں سکوت میں کلام کر رہا ہوں۔ شاید اپنے آپ سے، شاید اپنے لوگوں سے یا شاید تاریخ سے یا پھر وقت سے۔ اور اس کے ساتھ ہی میں تاریخ کے قبیلوں اور قوموں کو آنک رہا ہوں، ان کے بھیتر جھانک رہا ہوں۔

شاید سارے فیصلے وقت کے ہیں، پُر جلال اور پُر جبروت وقت کے اور تاریخ، وقت کا پُر جلال اور پُر جبروت وقت کا، اس کے مہا سنکھ ضرب مہا سنکھ، ضرب مہا سنکھ، ضرب مہا سنکھ، ضرب......ضرب......ضرب......ضرب سرور کی ایک پل بھی نہیں ہے بل کہ وقت اور تاریخ کے درمیان کسی دُور سے دُور کی نسبت کے گمان کا گمان کرنا بھی آخری حد کی دیوانگی ہے۔

بات تاریخ کی چل پڑی ہے، انسانوں کی تاریخ کی یعنی معلوم تاریخ کی اور اس بات نے میرے ذہن میں چھ سات ہزار برس کی گزراں کا خیال دوڑا دیا ہے۔ اس گزراں میں بہت سی سلطنتیں اُبھریں اور بہت سی ڈوبیں۔ ان کے اُبھرنے اور ڈوبنے اور ان کے چڑھنے اور بچھڑنے کی ایک عجب سرگزشت ہے۔

پرانے دنوں، بہت پرانے دنوں میں تین سلطنتوں نے اوج اور عروج کا سب سے بلند مرتبہ پایا۔ یہ سلطنتیں بے حد زور آزما، زور آور اور زور مند سلطنتیں گزری ہیں۔ ان کے نام ہیں مصر، ایران (+عیلام = ماد) اور رومتہ الکبریٰ۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ تھیں اور وہی تھیں۔ ان کے بعد ان کی جگہ لینے والی سلطنتوں نے ان کے کمال اور زوال سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ مصر کیوں خراب و خوار ہوا، ایران کیوں نا استوار و بے مدار ہوا اور رومتہ الکبریٰ کیوں بے وقار اور مہلکے سے دوچار ہوا۔

سُنا اور سمجھا جائے کہ تاریخ کی ایک عقل فعال ہوتی ہے جو قوموں اور ملتوں کی ایک ایک بات کا حساب رکھتی ہے اور اسی حساب کے مطابق ان سے معاملت کرتی ہے۔ نشیان نے ایک بار بحرین کے ایک بہت پرانے گورستان میں عجب کچھ کلام کیا تھا۔ اس نے کہا تھا ''اے تم، اے تم! تم تھے اور ہونے کی طرح تھے۔ تم ''دلمون'' کی شایستگی اور بالستگی کے مالک تھے۔ تمھارا پانچ چھ ہزار برس پہلے کا زمانہ شایستگی اور بالستگی کے زمانوں کا زمانہ تھا اور ارجمندانہ تھا۔ پھر تم نے خود اپنے ساتھ بُرا معاملہ کرنا شروع کیا اور جو قوم اور ملّت خود اپنے ساتھ بُرا معاملہ کرنے لگے اسے تاریخ کبھی معاف نہیں کرتی۔ اے تم! اے تم......''

قومیں آخر کیوں ایک مدّت تک نمو اور نمود پاتی اور پھر خود ہی اپنا ڈھانچا کھڑکھڑاتی ہیں۔ اپنی ناک کے نتھنوں سے اپنے گرد و پیش کی شنوائیوں کو آزار پہنچاتی ہیں۔ شاید ایسا ہے کہ انسان کے گروہوں میں سے ہر گروہ اپنی زندگی کا ایک دور گزار کر خود اپنے آپ سے اور اس کے ساتھ دوسروں سے بُرا معاملہ کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے اندر اور اپنے باہر کسی بات کو کوئی دھیان نہیں دیتا۔ اس کے سر دھرے اور سرغنہ خود اپنے لوگوں کے بل کہ خود اپنے بیری ہو جاتے ہیں۔ اس حالت کو تم ایک اکتاہٹ کہہ سکتے ہو۔ یہ حالت' یہ اکتاہٹ جان لیوا ہوتی ہے اور جو گروہ اس اکتاہٹ کا آزاری ہو جائے وہ کبھی پنپنے نہیں پاتا۔

مصر، ایران اور رومتہ الکبریٰ کے زوال کا سبب بھی کچھ ایسا ہی تھا اور یہ بھی کہ انھوں نے اپنا اچھا بُرا حساب لگانے کے سوا اپنے زمانے کے دوسرے گروہوں کا حساب لگانا بُری طرح چھوڑ دیا تھا۔

نشیان نے روم کے قابلِ صد احترام حکم راں، فلسفی حکم راں مارکس آریلینس کو یاد کرتے ہوئے روم کے حکم رانوں کی ایک ''وحشیانہ شاہانہ تفریح'' کے بارے میں بھی کلام کیا ہے۔

''جہاں سارے راستے جاتے تھے وہاں ہمارا اپنا ایک آدمی بھی گزرا ہے
ایسا آدمی جس کے سامنے حکیم اور حاکم اپنی گردنیں جھکائیں اور اس کا
ادب بجا لائیں جس طرح کاہنوں کا ادب بجا لایا جاتا ہے
وہ اتنا سریف آدمی تھا کہ اس کی ملکہ اس کے غلام کی ناز بردار تھی

ہم اس کا ذکر سقراط کے ساتھ کرتے ہیں سقراط کی بیوی سقراط کو بڑی گندی گالیاں
دیتی تھی بڑی گندی گالیاں پر وہ سقراط کے غلام کی منظورِ نظر نہ تھی
اس لیے کہ سقراط کا کوئی غلام نہیں تھا

☆☆☆

وہاں سیاہ نسل کے ایک تنو مند غلام کو دوسرے تنومند غلام سے
فرمان کے مطابق کسی ایک کے جان ہارنے تک لڑوایا جاتا تھا
حریفوں میں سے کوئی بھی دوسرے کا دشمن نہیں ہوتا تھا
جیتنے والا جان ہارنے والے کا جاں نثار اور سوگ وار ہوتا تھا
اپنی زندگی کے آخری سانس تک

میں نے پرانے زمانے کی تین عظیم الشان سلطنتوں کا ذکر کیا تھا، مصر، ایران اور رومتہ الکبریٰ کا۔ اِس زمانے کا مصر، ایران اور رومتہ الکبریٰ امریکا ہے اور ان تینوں سے کہیں زیادہ دراز دست، محیط اور دہشت ناک۔ ہمیں، تمام کمزور قوموں کو اس ''آقاؤں کے آقا'' سے چھٹکارا پانا ہے۔ اس کے لیے ہتھیار نہیں، اپنے آپ پر اعتماد اور اعتبار ہونا چاہیے۔ مجھے یہی کہنا تھا اور یہ کہ میں نشے میں نہیں ہوں۔

سسپنس ڈائجسٹ' اپریل 2000

پہلا فرض

کیا تم نے لفظ کو معنی سے الگ کر کے اس کے ساتھ کوئی برتاؤ کیا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ کیا ہو مجھے یاد نہیں۔ ویسے ہے یوں کہ یہ ایک بادل گت اور بولیر کی بات ہے۔ کوئی بھی بھلا لفظ کو معنی سے الگ کر کے اس کے ساتھ کوئی برتاوا بھلا کیوں کرے گا۔

اناں ہاں! ایک بات ہے اور وہ یہ کہ لفظ کو معنی سے الگ کر کے ایک خاص طور پر برتاوا کیا جا سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ معنی کے بجائے کیفیت سے سروکار رکھا جائے۔

اب لفظ کی نسبت سے کیفیت کے بارے میں میری کہن سنو۔ کیفیت، لفظ یا لفظوں کے آہنگ سے پیدا ہوتی ہے معنی یا مفہوم سے نہیں۔ یہاں مجھے خدائے سخن سیّد ببر علی انیس کے دادا میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' کا ایک مصرع یاد آ رہا ہے کہ دھوں دھوں خوشی کی خبر کیوں نہ دوں۔ نہ جانے پہلا مصرع کیا ہے یا مثلاً یہ کہ میاں! بشیرا نے تو اپنے آپ کو ''دھنا سیٹھ'' سمجھ رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں ''دھنا سیٹھ'' کے کوئی معنی مراد نہیں ہیں، کیفیت مراد ہے۔ اس لیے کہ ''دھنا'' کے کوئی معنی ہی نہیں۔ ایک بات دھیان میں آ گئی ہے سو کہتا چلوں، بات تو کیا ہے بس زبان کا ایک نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ''معنی'' کا لفظ واحد استعمال کرنا ابوجہلیت ہے۔ معنی ہمارے یہاں ہمیشہ جمع استعمال ہوتے ہیں۔ میری ایک غزل کا مطلع ہے، سال ہا سال پرانی غزل کا۔

دل میں ہے کیا مجھے نہیں معلوم
اس کے معنی مجھے نہیں معلوم

کچھ کچھ خیال آ رہا ہے کہ میں نے برسوں پہلے کسی ''ابوجہلیے'' کا ایک لکھا، پڑھا تھا۔

اس نے عجب ٹکےچل ہانکی تھی جو کچھ یوں تھی ''اصل مسئلہ تخلیقی عمل کا معنی دریافت کرنا ہے'' میں نے یہ جملہ پڑھ کر عالمِ خیال میں اس کے رُو بہ رُو ہو کر اس سے کہا تھا کہ ابے او، کھلّو باؤلی کے دھیوتے! تیری تو دُم میں نمدا، تیری تو ایسی کی تیسی۔ چلا ہے اُردو کے قلم سے اپنی قابلیت بگھارنے۔ ہشت!

کسی بھی لفظ کے صرف ایک معنی نہیں ہوتے۔ ایک سے زیادہ معنی ہوتے ہیں۔ اگر کسی اور زبان میں کسی لفظ کے صرف ایک ہی معنی ہوتے ہیں تو ہوتے ہوں۔ کم سے کم میری زبان میں تو نہیں ہوتے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ایک بہت مدعیانہ استقرا (INDUCTION) ہے مگر میں کیا کروں کہ ہے۔

بات کچھ اور ہو رہی تھی اور ہونے لگی کچھ اور۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ با - کچھ اور ہو رہی ہوتی ہے اور ہونے لگتی ہے کچھ اور۔ ہاں، تو بات لفظ، معنی اور کیفیت کے بارے میں ہو رہی تھی۔ دیکھا جائے تو کبھی کبھی لفظ کی صوت یا اس کے آہنگ سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ معنی سے کہیں زیادہ بلیغ ہوتی ہے۔

میرا اندازہ ہے کہ آج سے لاکھوں برس پہلے کا انسان جب کسی دوسرے انسان سے اپنی بات کہنا چاہتا ہوگا تو اپنے منہ سے ایسی آوازیں نکالتا ہوگا جنھیں وہ شے ہرگز نہیں بھگت سکتی ہوگی جسے ہم اِدھر چند ہزار برس سے معنی کہتے ہیں۔ ان آوازوں میں کیفیت ہوتی تھی، کیفیت جس میں معنی سے کہیں زیادہ بلاغت پائی جاتی ہے بل کہ اس موقع پر ''بلاغت'' سے زیادہ مناسب لفظ ''بلاغ'' ہے۔

میں نے جو کچھ کہا وہ یہ کہا کہ لفظ یا بامعنی ہوتے ہیں یا کیفیت دار۔ تم انھیں کیفیت پرور کہہ لو مگر یہ طرزِ تعبیر کچھ شاعرانہ سا ہو جائے گا۔ اس لیے ''کیفیت دار'' کی ترکیب شاید زیادہ مناسب ہے۔ الغرض لفظ یا بامعنی ہوتے ہیں یا کیفیت دار۔ یہاں میں نے لفظ کی تیسری قسم کا ذکر نہیں کیا اور وہ ہے مہمل۔ اس لیے نہیں کہ لفظ کی یہ تیسری قسم ''بامعنی لفظ اور کیفیت دار لفظ سے کہیں زیادہ برتر ہے اور وہ کم سے کم میرے بیان کی گرفت میں نہیں آسکتی۔''

میں اس مرحلے میں یہ کہن کہنا چاہتا ہوں کہ جب سے سیاست اور حاکمیت نے دنیا میں بُری طرح چھاؤنی چھائی ہے اور بلا کی ہڑبونگ مچائی ہے، اس وقت سے بس لفظ رہ گئے ہیں بس لفظ، کھک کھوکھلے اور کھٹل لفظ، معنی اور کیفیت سے یک سر عاری۔ ہم اور تم روز لفظوں کے ایسے ڈھانچ اور ڈھچر کہتے ہیں جن پر صرف چتا اور شمشان کا حق ہے۔ یہاں میں ایک ڈھانچ اور ڈھچر کی مثال دیتا ہوں۔ لفظوں کے ڈھانچ اور ڈھچر کی۔ ملاحظہ ہو۔

''کل شام پانچ بجے روم کے وزیرِاعظم اور قرطاجنہ کے وزیرِاعظم یا ویلیم کے وزیرِ خارجہ اور بربر کے وزیرِ خارجہ نے باہمی دل چسپی کے اُمور پر گفت گو کی۔''

میں پوچھتا ہوں کہ کیا لفظوں کا یہ اُٹالا زبان کی فحاشی نہیں ہے۔ کیا یہ بیان کی ایک عین بدمعاشی نہیں ہے۔ ایک بات تو بتاؤ کہ بھلا کس کی ماں نے دھونسا کھایا ہے جو ''ہم جنس پرستی'' کے امرِ اہم کو ''باہمی دل چسپی کے اُمور'' سے خارج کر سکے۔ اگر روم کے وزیرِاعظم اور قرطاجنہ کے وزیرِاعظم یا ویلم کے وزیرِ خارجہ اور بربر کے وزیرِ خارجہ دونوں...... باہمی دل چسپی کے اُمور پر گفت گو نہ کرتے بل کہ صرف ایک دوسرے کے گالوں کی مٹّھیاں لیتے یا ان کو لقوہ مار گیا ہوتا تو کیا ان کے ملکوں کے عوام عاد و ثمود کی طرح فنا ہو جاتے؟

برادرِ عزیز القدر معراج رسول لکھنوی! یہ ''وزیرِ خارجہ'' کی ترکیب بھی عجب مخنث ترکیب ہے۔ جانے وہ کون ناشُدنی خواجہ سرا تھا جس نے یہ ترکیب ایجاد کی۔ ''وزیر'' ''مذکر'' ہے اور ''خارجہ'' ''مونث'' سو ''وزیرِ خارجہ'' کا مطلب کیا ہوا؟ اس کا مطلب ہوا وہ شخص جو بہ یک وقت مرد بھی ہو اور عورت بھی یا نہ مرد ہو نہ عورت۔ یہ تو عجب وقوعہ ہے۔ یہ تو جنس یا صنف کا عجیب برزخ ہے۔ ارے مار ڈالا!

گر نازنیں کہے کا بُرا مانتے ہیں آپ
میری طرف کو دیکھیے میں نازنیں سہی

زبان کے قاعدے کی رُو سے وزیرِ خارجی ہونا چاہیے تھا۔ میں پوچھتا ہوں کیا خارجی مسلمان نہیں ہوتے۔

یا اُخی جون ایلیا! تم نے بیان کا یہ کون سا نہج اختیار کیا؟ تم تو سیّد القریش جناب ہاشم بن عبد مناف کا خون ہو، مزاح نگاری تو اشراف کے لیے عیب و عار کی بات ہے۔ یہ صرف اُردو والوں کو زیب دے تو دے، تمھیں ہر گز ہر گز زیب نہیں دیتی۔ ایھا الحبیب اللبیب! یوں بھی تم دیوبندی دارالعلوم اور شیعہ دارالعلوم کے فارغ التحصیل ہو۔ تم نے اس صدی کے علمائے اعلام اور جہابذۂ کرام کی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔ انھوں نے ازرہِ خُدّام پروری تمھارے سر پر دستارِ فضیلت باندھی ہے۔ اب رہی تمھاری شاعری تو وہ کون بندہ بشر ہے جو عیب سے پاک ہو، بے عیب تو بس خدا کی ذات ہے۔

مجھے کہنا کیا تھا اور کہا کیا ہے یوں کہ میں سفر کی حالت میں ہوں۔ مگر میں کہاں اور سفر کہاں۔ سفر تو گھر سے ہوتا ہے اور میرا نہ کوئی گھر ہے نہ در۔ میں کاندھے پر زنبیل ڈالے شہروں شہروں اور ملکوں ملکوں جوتیاں چٹخاتے پھر رہا ہوں۔ میں کیا اور میری بساط کیا۔ میں کیا اور میری اوقات کیا پر میں ولایتوں کے والیوں اور ملکوں کے حاکموں کو ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ اگر میں کوئی فیلیا اور فیل ہایا فقیر ہوتا تو ان کے سروں پر جریب رسید کرتا۔ پر میں تو فقر کیش ہوں سو نصیحت ہی کر سکتا ہوں۔ میری نصیحت یہ ہے کہ یا قوم! حرافی اور لفاظی کی بدکاری سے حذر کرو اور اپنی "حکمت عملی" کی ناہنجاری سے باز آؤ اور اپنے محروم و مجبور اور معذور لوگوں سے عاجزانہ طور کے ساتھ یہ اعتراف کرو کہ ہم اب تک تمھاری چڈھی چڑھے رہے اور تمھارے سینوں پر جوتے پہنے کھڑے رہے۔ اب ہم اپنے ہر جرم اور اپنی ہر جنایت کو مانتے ہیں اور صرف تمھیں داددار، دادگستر اور داور جانتے ہیں اور یہی بات حق اور حقیقت ہے۔ تمھارا ایک ہی دُکھ تھا اور وہی دُکھوں کا دُکھ تھا اور وہ تھا بھیانک بھوک، بیماری اور ناچاری کا دُکھ پر ہم تمھیں دھوکے دیتے رہے، ہم جنھوں نے اپنے آپ کو تمھارا مسیحا جتلایا تھا۔ ہاں، ہم اقرار کرتے ہیں کہ ہم نے ہرگز وہ کچھ نہیں کیا جو ہمیں کرنا تھا۔ ہم اپنے اسی فرض کو ادا کرنے سے غافل رہے جو ہمارا سب سے پہلا فرض تھا۔ مجھ فقیر کی بس یہی ایک نصیحت ہے۔ سب کا بھلا ہو، سب کی خیر۔

سسپنس ڈائجسٹ، مئی 2000

جنت جہنم

ہمارا پورا وجود مسئلوں میں پھنسا ہوا ہے۔ ہم تاریخ کے بہت قابلِ رحم لوگ ہیں۔ ہم تو اتنے قابلِ رحم ہیں کہ خود ہمیں اپنے اُوپر بھی رحم نہیں آتا۔ ہمارا باون برس کا ماضی ندامت ثابت ہوا۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ ہمارا حال نحوست ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ ہمارا مستقبل نا اُمیدی ہے۔ کیا ایسا دکھائی نہیں دیتا؟

کیا یہ طورِ امر ہمارا مقسوم اور مقدر تھا؟ کیا اس بدترین طورِ امر کے سوا بہترین طورِ امر ممکن ہی نہیں تھا؟ میں کہتا ہوں کہ اس طورِ امر، اس بدترین طورِ امر کے بجائے بہترین طورِ امر ممکن ہی نہیں، یقینی تھا۔

ہماری بدبختی کے کئی سبب ہیں۔ ان میں سے ایک سبب کشمیر ہے۔ ہمیں اس جنت نے جہنم میں جھونک دیا اور اس کے ذمے دار پنڈت جواہر لعل نہرو ہیں۔ پنڈت جی میری پسندیدہ شخصیت رہے ہیں۔ میں نے انھیں اُردو تہذیب کے ایک شان دار مظہر کے طور پر دیکھا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں اپنی پڑھائی لکھائی کے لحاظ سے انگریز ہوں، اپنے خاندان کے لحاظ سے ہندو ہوں اور اپنی تہذیب کے اعتبار سے مسلمان ہوں۔ ان کی اس بات کی ہرگز تردید نہیں کی جا سکتی اور یہی تو دُکھ کی بات ہے۔ دُکھم دُکھم دُکھم دُکھم۔

سیّد جمال الدین عرفی نے کشمیر پر ایک نظم کہی تھی۔ اس کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

؎ ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید گر مرغ کباب است کہ بابال و پر آید

یعنی اگر کوئی سوختہ جاں کشمیر آ جائے تو وہ ایسا پرندہ ہو جو کباب ہو چکا ہو تو کشمیر کی حیات بخش اور نمو پرور فضا میں اس کے بال و پر نکل آئیں گے۔ یہاں یہ کہتا چلوں کہ

میرے نسلی بزرگ سیّد عرفی نے اس شعر میں زبان کی صحت کا خیال نہیں رکھا اور کوئی شبہ نہیں کہ ان جیسے عظیم الشان شاعر کو اس کا پورا حق حاصل ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے یہ شعر صحیح یاد نہ رہا ہو۔

بات کشمیر کی ہو رہی تھی۔ یہاں مجھے کسی قدر دراز نفسی سے کام لینا ہوگا۔ میرے منجھلے بھائی اور پاکستان کے نام ور فلسفی سیّد محمد تقی مرحوم دلّی ہی سے روزنامہ جنگ کے مدیرِ اعلیٰ رہے۔ میرے بڑے بھائی رئیس امروہوی بھی اسی زمانے سے ۲۲ویں ستمبر ۱۹۸۸ عیسوی یعنی اپنے روزِ قتل کی شام تک جنگ کے بے حد اہم بل کہ سب سے اہم رکن کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ جمعرات کے دن قتل ہوئے تھے۔ عجیب بات ہے کہ انھوں نے دو تین دن پہلے جنگ میں اشاعت کے لیے جو کالم بھیجا تھا وہ موت پر تھا اور وہ دوسرے دن جمعے کو شائع ہوا۔ واضح رہے کہ میرے یہ دونوں بھائی مسلم لیگ کے معاملات کو جتنا جانتے تھے اتنا کم ہی صحافی جانتے ہوں گے۔ میں نے اپنے ان دونوں بھائیوں سے اور نواب صدیق علی خاں مرحوم سے سُنا ہے کہ جب انگریز آزادی دے کر جانے والے تھے تو انھوں نے کچھ مسلمانوں سے یہ بات جاننا چاہی تھی کہ ریاست حیدر آباد اور کشمیر کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جانا چاہیے؟

مسلمانوں نے کہا تھا کہ ریاست حیدر آباد اور کشمیر کے معاملے کو جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ آخر ان چند مسلمانوں کے اس طرزِ عمل کی کیا وجہ تھی؟ بات یہ ہے کہ ان کا بجا طور پر یہ اندازہ تھا کہ ریاست حیدر آباد پاکستان سے رشتہ جوڑے گی اس لیے کہ ریاست حیدر آباد کا حاکم مسلمان ہے یعنی نظام حیدر آباد عثمان علی خاں۔ رہی رعایا تو اس کی تعداد اگرچہ مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے مگر وہ کر ہی کیا سکتی ہے۔ اب رہی ریاست کشمیر تو اس کا معاملہ حیدر آباد کے برعکس تھا۔ وہاں کا راجا تو ہندو تھا اور پرَجا ہندوؤں سے کہیں زیادہ تھی۔ سو اُس وقت کے مسلمانوں نے بجا طور پر یہ بے عدیل اور بے بدیل قیاس قائم کیا تھا کہ کشمیر کے لوگوں کی اکثریت پاکستان کا حصہ بننا چاہے گی اور راجا کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ یہاں میرے ذہن میں یہ کہاوت ہرگز نہیں ہے کہ چت بھی اپنی پٹ بھی اپنی اور انٹا اپنے باپ کا۔

اقوامِ متحدہ نے کشمیر کے بارے میں جو فیصلہ کیا تھا وہ یک سر بجا اور درست تھا۔ وہ فیصلہ یہ تھا کہ کشمیر کے معاملے کا فیصلہ کرنے کا حق صرف کشمیریوں کو حاصل ہے، نہ ہندوستان کو نہ پاکستان کو۔ ہندوستان نے اس وقت یہ بات مان لی تھی اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کو صحیح تسلیم کیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو ہندوستان کی تاریخ کے بہت بڑے سیاست داں تھے۔ وہ فقط سیاست داں ہی نہیں تھے بل کہ ایک ادیب اور مؤرخ بھی تھے۔ میرا دُکھ یہ ہے کہ یہ بات میرے لیے ناقابلِ فہم ہے کہ پنڈت نہرو جو بہت بڑے آدمی تھے، وہ آخر کشمیر کے معاملے میں اتنے چھوٹے کیوں پڑ گئے۔ گزشتہ باون برس میں ہندوستانی سیاست کے تجزیہ نگاروں نے پنڈت نہرو کا نفسی تجزیہ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ کشمیر اُن کی کم زوری تھا اس لیے کہ وہ کشمیری تھے۔ کشمیری ہونے ہی کی وجہ سے وہ دنیا کے ایک عالی شان کشمیری شاعر، مسلمان شاعر علّامہ اقبال سے گہرا ذہنی تعلق رکھتے تھے۔ مشہور فلسفی برٹرینڈ رسل نے کہا تھا کہ پنڈت نہرو جیسے بڑے آدمی نے کشمیر کے سلسلے میں بہت غلط موقف اختیار کیا۔ یہ تو رہی بات پنڈت نہرو اور ہندوستانی سیاست دانوں کی مگر پاکستان اب بھی اقوامِ متحدہ کے اس فیصلے کو مانتا ہے یعنی یہ کہ کشمیر میں استصوابِ رائے کرایا جائے۔

میں پاکستان اور ہندوستان میں سیکڑوں کشمیریوں سے ملا ہوں اور ان سے ان کے دل کی بات پوچھی ہے۔ مجھ سے انھوں نے جو کچھ کہا وہ یہ کہ دونوں حصّوں میں رہنے والے کشمیری ایک ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ دونوں حصّوں کا ایک ہونا ہمارا خواب ہے۔ مختصر یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ کشمیر، کشمیریوں کا۔ ہوسکتا ہے کہ میرا یہ محدود جائزہ درست نہ ہو اور کشمیری کچھ اور چاہتے ہوں۔

کشمیر کا نام بھی عجیب نام ہے۔ یہ نام شاید عالمِ غیب خداوند ہی نے رکھا ہو گا مگر ہم اس کو غلط ادا کرتے ہیں۔ ہم کشمیر کے کاف کو زَبر کے ساتھ ادا کرتے چلے آئے ہیں جب کہ اس کے کاف کو پیش کے ساتھ پڑھنا اور ادا کرنا چاہیے یعنی ''کُش میر'' یعنی مار ڈال، مر جا۔

کشمیر کا مسئلہ نہ اِس طرح حل ہو گا جس طرح ہندوستان چاہتا ہے اور نہ اُس طرح جس طرح اقوامِ متحدہ اور پاکستان چاہتے ہیں۔ میاں! میرے گمان کے مطابق کشمیر کے

مسئلے کا بس ایک ہی حل ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں مل کر کشمیر کو ناگاساکی اور ہیروشیما بنا دیں اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب دونوں میں یہ استطاعت اور شان دار اہلیت پوری طرح پائی جاتی ہے۔ اس لیے کہ دونوں کے پاس اب ایٹم بم موجود ہے۔

میری سمجھ میں یہ بات آج تک نہیں آئی کہ ہندوستان اور پاکستان گزشتہ باون برس سے اپنے اذیت ناک بل کہ عذاب ناک ترین مسئلوں پر لعنت بھیج کر کشمیر اور کشمیریوں کے مسئلے میں کیوں جتے ہوئے ہیں۔ آخر کس فراق میں؟ پچھلے دنوں سے کچھ اُمید تو پیدا ہوئی ہے کہ شاید روزِ حشر تک حل نہ ہونے والا یہ مسئلہ اب حل ہو جائے گا۔ اس طرح دونوں کا ایٹمی قوّت ہونا بہت مسعود و مبارک امر ہے۔ میں ہندوستان، پاکستان دونوں کو یہ مشورہ دوں گا کہ وہ کشمیر کے مسئلے کے حل کی تقریب میں جلد سے جلد ایٹم بم استعمال کریں، آخر اس میں کیا مضائقہ ہے۔ یہاں میں مسئلے کو ایٹم بم کے ذریعے حل کرنے کا مشورہ اس لیے بھی دے رہا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے باشندے بہت گھٹیا جان دار ہیں بل کہ وہ تاریخ کے مزبلے کے کیڑے ہیں۔ کیڑوں کے سوا کچھ نہیں۔ اب رہے کشمیر کے لوگ تو وہ یہودیوں کی طرح خداوند کی چیدہ اور برگزیدہ مخلوق ہیں۔

میں ایک فاترالعقل اور نیم دیوانہ انسان ہوں مجھ سے بھلا کسی بھی معاملے میں کون رائے لے گا مگر میں اپنی نیم دیوانگی بل کہ پوری دیوانگی کی بڑ میں ایک بات کہوں گا جو نہ جانے خوش گوار ہے یا ناخوش گوار۔ اور وہ یہ کہ کشمیر ہرگز نہ ہندوستان کا مسئلہ ہے اور نہ پاکستان کا۔ ہندوستان کے باب میں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں لیکن پاکستان کے باب میں، میں پوری دل سوزی اور جاں کنی کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کے صاحبانِ امرو قدر کا سب سے پہلا اور آخری مسئلہ کشمیر نہیں، پاکستان کے عوام ہیں جو بھوک، بیماری اور بھیانک محرومیوں میں جی رہے ہیں، مر رہے ہیں اور پاکستان کے صاحبانِ امر و قدر کو اس کی کوئی پروا نہیں رہی ہے۔ میں اس جنت کو لے کر کیا کروں جو میرے لوگوں کے لیے جہنم بن جائے۔

بیش قیمت اُمید

مسیحی تقویم کا دوسرا ہزارہ (MILLENNIUM) ختم ہو رہا ہے اور میں بیسویں صدی کا آخری انشائیہ مرتب کر رہا ہوں۔ اُردو کے لوگ بھی عجب کچھ لوگ ہیں۔ یہ لوگ (MILLENNIUM) کو ہزاریہ کہتے ہیں۔ اَبے اُردو والو، ہزاریہ کوئی لفظ نہیں ہے۔ درست لفظ ہزارہ ہے۔

ہاں تو مسیحی تقویم کا دوسرا ہزارہ ختم ہو رہا ہے اور ہم تیسرے ہزارے میں جا رہے ہیں۔ ہم تیسرے ہزارے میں نہ جا رہے ہیں اور نہ تیسرا ہزارہ آرہا ہے۔ ہم تیسرا ہزارہ درآمد کر رہے ہیں۔

ہے یوں کہ ہم بیسویں صدی سے اکیسویں صدی میں داخل نہیں ہو رہے بل کہ "صدی بدر" کیے جا رہے ہیں جیسے لوگ شہر بدر کیے جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں بیسویں صدی آئی ہی نہیں بل کہ وقت ہمارے بال کھینچ کر، جھنجوڑ کر ہمیں بیسویں صدی میں خوامخواہ لے جا رہا تھا ورنہ ہم تو گیارھویں، بارھویں صدی عیسوی کے لوگ تھے۔

یہ صدی معلوم صدیوں کے مقابلے میں سب سے اہم صدی رہی ہے۔ اس صدی کا اندازہ لگا کر گمان گزرتا ہے کہ وقت پیچھے نہیں جاتا بل کہ آگے بڑھتا ہے۔ یہ کوئی بہت گہری بات نہیں ہے، پر ایک بات ہے۔ بیسویں صدی بہ ہر حال کئی لحاظ سے ایک پیش قدم اور رونده صدی رہی ہے۔

مغرب کے نام بردہ عمرانی مفکر اشپنگلر نے کچھ ایسی بات کہی ہے۔ آج سے دو ہزار

برس پہلے کا سماج، آج کے سماج سے پیچھے نہیں رہا۔ ہر سماج کا اپنا حساب کتاب اور اپنا نصب العین اور نصاب ہوتا ہے۔ ہر سماج کی اپنی نیکی اور بدی ہوتی ہے۔ معیار اور اعتبار ہوتا ہے۔ وہ سماج کسی سماج سے نہ پیچھے ہوتا ہے اور نہ آگے مگر میں کچھ اور طرح سوچتا ہوں۔ ہے یوں کہ میرا اس بزرگ سے کوئی ٹنٹا نہیں ہے۔ پر میں یہ گمان کرتا ہوں کہ پہلی صدی مسیحی کتنے ہی طور اور تطوّر کے ساتھ دوسری صدی مسیحی، پانچویں صدی مسیحی، نویں صدی مسیحی، بارھویں صدی مسیحی، اٹھارویں صدی مسیحی، انیسویں صدی مسیحی سے بیسویں صدی کسی شبہے کے بغیر اپنی بدی اور نیکی میں سب سے آگے کی صدی گردانی بل کہ مانی جائے گی۔

بیسویں صدی کا شر بھی گزشتہ صدیوں سے کہیں زیادہ شرم ناک رہا ہے اور اس کی خیر بھی گزشتہ صدیوں کی خیر سے کہیں زیادہ فرخندہ اور فروزندہ رہی ہے۔

مگر یہ تو وقت کے حساب کتاب کی ایک بے حس رُوداد نگاری ہے۔ اس سے اس دور کے محروموں اور مظلوموں کو ایک شمّہ بھر سکون نہیں مل سکتا۔ بل کہ ایک مشتعل، بے سکونی پیدا ہو سکتی ہے۔

اس وقت جاڑوں کی رات کے ساڑھے بارہ بجے ہیں اور اس ملک کے باشندوں کی ایک بہت بڑی تعداد کسی پوشش کے بغیر سڑکوں کے کنارے اپنے دونوں ہاتھ اپنی دونوں رانوں میں دیے ہوئے ''ہمزہ'' کی طرح پڑے ہیں اور لطیفہ یہ ہے کہ نہ انھیں اپنے خدا سے کوئی شکایت ہے اور نہ خداوندوں سے۔ ہَت تمھاری کی۔

یہ تمھارے ۯالی اور متولی بہت اُبھر چلے ہیں، بہت ابھر چلے ہیں۔ یہ ہمیں چنگیز خاں کے دور تک پہنچانا چاہتے ہیں اور ایک ثانیے کے لیے بھی اپنے ہوش میں نہیں آنا چاہتے۔

اگر تمھاری آنکھیں ہیں تو دیکھو، ناک ہے تو سُونگھو، کان ہیں تو سُنو، کھال ہے تو چھوؤ، اور زبان ہے تو چکھو۔ پر تم بڑی ہی موٹی کھال کے ہو، اتنی موٹی کھال کے کہ اگر تم بقرعید کے دنبے ہوتے تو تمھیں ذبح کرنے میں قصاب کی چُھری کھٹلی ہو جاتی۔

تمھاری جیبھ کے تلے جیبھ ہے، اسی لیے تو تم عجب اینڈی بینڈی طرح جیبھ کرتے

ہو۔ تم بتے باز ہو، تم بودی کرتے ہو۔ تم نے آدھی صدی سے زیادہ کی مدّت تباہ کر دی۔ تم نے ایک شستہ تاریخ کو ابتر کر ڈالا۔ تم نے ہمیں زَیر و زَبر کر ڈالا۔

یہ صدی، بیسویں صدی، بہت خوش بخت اور بہت بد بخت ہے۔ اس صدی میں جانی ہوئی تاریخ کی سب سے وحشیانہ اور درندگانہ جنگیں لڑی گئیں۔ اس صدی میں انسانی ذہن نے ہر صدی سے زیادہ علم حاصل کیا۔ یہ صدی' سائنسی کارپردازی کی سب سے زیادہ نام بردہ صدی کہلائی جانے کا حق رکھتی ہے لیکن میں کیا کہوں کہ یہ صدی کئی اعتبار سے بڑی گندی اور گھناؤنی صدی گردانی جائے گی۔

پُرانے دور میں اگر وحشت، بربریت اور بہمیت پائی جاتی تھی تو وہ دور بھی تو جہل، جاہلیت اور جہولیت کا تھا۔ اس دور کے حیوانِ ناطق میں دوسرے حیوانوں سے کوئی بہت زیادہ فرق نہیں پایا جاتا تھا مگر یہ صدی تو حیوانِ ناطق کے اوج، عروج اور کمال کی صدی ہے۔ آج کا حیوانِ ناطق تو ایک معجز نما حیوانِ ناطق ہے۔ اس نے دانش اور بینش کا جو سرمایہ حاصل کیا ہے، وہ حیران کن اور بلاشبہ قابلِ رشک ہے۔ آج کا ایک عام شہری اور وہ بھی امریکا، چین، جاپان، جرمنی، فرانس اور انگلستان کا شہری نہیں، ایک پس ماندہ ملک کا عام شہری بھی مشہور مفکر، طالیس ملیٹی، انباذ قلس، پارمنائیڈیز، انکسامانس، پروٹا گورس، گورجیاس، سقراط، افلاطون، ارسطو، اسکندر افرودیسی، پلوٹینس، یعقوب کندی، فارابی، بوعلی سینا، ابوبکر زکریا رازی، ابنِ رشد، ابنِ طفیل، محقق طوسی، طامس اکویناس، راجر بیکن، فرانسس بیکن، ڈیکارٹ، اسپی نوزا، کانٹ اور......اور...... کے مقابلے میں دنیا سے زیادہ واقفیت رکھتا ہے۔ ایک عام شہری ہی نہیں، ایک لڑکا بھی۔

لیکن یہاں ایک بات جان لینا چاہیے کہ واقفیت رکھنا اور بصیرت رکھنا یہ دو جُدا باتیں ہیں۔ کولمبس نے امریکا دریافت کیا اور ارسطو نے امریکا کا نام بھی نہیں سُنا تھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کولمبس، ارسطو سے بڑا آدمی تھا۔ خیر یہ بات تو بیچ میں آ گئی تھی۔ کہنا یہ ہے کہ ہم طوعاً و کرہاً اکیسویں صدی تک آ تو گئے ہیں لیکن ہمیں بدترین رُسوائی کا بدترین خطرہ ہے۔ ہم جب انیسویں اور بیسویں صدی ہی میں بُری طرح ذلیل ہوئے تو پھر اکیسویں صدی

میں کیسے ''عزیز'' قرار پائیں گے۔ ہم تو اب یک سر بعد از وقت لوگ ہو گئے ہیں۔ ہم نے بیسویں صدی میں اپنا ماضی بھی تباہ کیا اور حال اور مستقبل بھی تباہ کر رہے ہیں۔ اب اگر ہم، ہم رہے تو ہم نہیں رہیں گے۔ ہم ہونے کے دائرے سے بُری طرح باہر نکال دیے جائیں گے۔

ہم میں سے بعض لوگ اور بعض وہ لوگ جو ہم میں سے نہیں ہیں، کہتے ہیں کہ اکیسویں صدی روحانی صدی ہوگی۔ میرا گمان یہ ہے کہ یہ بات اپنے آپ کو خوش کرنے کے لیے کہی جاتی ہے۔ ہے یوں کہ اکیسویں صدی ہمت شکن حد تک مادّی صدی ہوگی۔ ہمیں اکیسویں صدی کے بارے میں یہ پیش گوئی کر کے وہ روحانی صدی ہوگی، سکون اور لذّت حاصل کرنے کی ہوس نہیں رکھنا چاہیے ورنہ ہم اکیسویں صدی کے پہلے ہی عشرے میں تباہ ہو جائیں گے۔ میں اپنے مزاج میں پُر اُمید آدمی نہیں رہا، ہوسکتا ہے کہ یہ میری خامی ہو یا میرا تجربہ۔ دنیا کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہذب انسانیت امریکا کے مجرمانہ ترین رویوں سے بھیانک گھاٹا اُٹھائے گی۔ مہذب دنیا کو تاریخ کے سب سے بڑے لفنگے گروہ یعنی امریکا کی سیاست، جنایت کاروں اور جفاشعاروں سے بچ کے رہنا چاہیے۔ انھیں انسانیت کی خاطر وقت کے بہاؤ میں ایک نئے رُخ سے بہنا چاہیے اور وہ رُخ ہے شریف انسانیت کے ساحلِ مراد کا رُخ۔ کاش اگر ہو سکے ورنہ انسانیت کو اکیسویں صدی میں امریکا کی طرف سے شدید ترین ہلاکت اور تباہی کا خطرہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ لوفر امریکا انسانیت اور تہذیب کو تباہ کر دے مگر میں اُمید رکھتا ہوں کہ دنیا کے مہذب انسان اور خود امریکا کے عوام ایسا نہیں ہونے دیں گے اور یہی میری سب سے بیش قیمت اُمید ہے۔

سسپنس ڈائجسٹ، جنوری 2001

اکیسویں صدی

یہ اکیسویں صدی کا پہلا انشائیہ ہے۔اب سے پہلے ہم میں سے شاید کسی نے بھی کسی صدی کی پہلی تحریر نہیں لکھی۔ کسی بھی صدی کی پہلی تحریر لکھنا شاید سب سے خوش گوار تجربہ قرار پایا جانا چاہیے سو اِس اعتبار سے یہ میرا بے حد خوش گوار تجربہ ہے۔

ہے یوں کہ اکیسویں صدی پاکستان میں آئی نہیں ہے بل کہ اغوا کر کے لائی گئی ہے۔ ہم تو ابھی تک اپنی قرونِ مظلمہ سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھے۔

ہند ایرانی معاشرے کے زوال پر ایک زمانہ گزر چکا ہے جو دسویں صدی عیسوی کے گرد و جوار سے شروع ہو کر انیسویں صدی میں اپنے بہت نمایاں اوج و عروج کو پہنچا۔

میں ایک برس پہلے تک یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اکیسویں صدی کا آغاز پاکستان میں اس بے مثال تزک و احتشام سے کیا جائے گا۔

خوشی ہے، خوشی سی خوشی ہے کہ اکیسویں صدی کا استقبال ہماری مملکتِ الٰہیہ کے کسی عام "امیر المسلمین" نے نہیں بل کہ منتظمِ اعلیٰ نے کیا ہے۔ "منتظمِ اعلیٰ" کی ترکیب اپنی معنویت کے اعتبار سے اُردو کے حق میں ایک عطیہ ہے۔ امیر المسلمین یا خلیفہ پرانی تعبیریں ہیں جنھیں جدید مذہب پرست برتتے ہوئے جھینپتے ہیں۔ سو امیر المسلمین یا خلیفہ کا اگر کوئی بہترین بدل ہو سکتا ہے تو وہ منتظمِ اعلیٰ ہے۔

وقت نے اکیسویں صدی کے سرزد ہونے سے بہت پہلے ہی اکیسویں صدی کے آغاز کا دہاڑا لکھ ڈالا تھا۔ ہے یوں کہ اب سے اچھے خاصے دنوں بعد تک کے لوح و قلم نے ہمارا معاملہ محفوظ کر دیا ہے۔

ہم نے اپنے آپ سے، اپنے آپے سے شکست کھائی اور شکست کی شکست۔ ہم ایسی شکست سے اپنے بدترین دشمنوں کے لیے بھی پناہ مانگتے ہیں۔ اے تاریخ، اے تقویم! اے دوام! اے دیموم! ہمارا ٹینٹوا چبانے والوں اور ہمارے نرخرے کا خون ڈکوسنے والوں کو بھی ایسے عذاب اور عتاب سے پناہ میں رکھ۔

گھاٹا ہے اور کیسا گھاٹا ہے۔ ایسا گھاٹا ہے کہ بول گھٹ گئے ہیں۔ گھٹن ہے اور ایسی گھٹن ہے کہ ہونٹوں سے سانس کٹ گئے ہیں اور ہم پھر بھی زندہ ہیں۔

اگر ناکامی اور شوم انجامی کے کوئی بھی معنی ہیں تو یہ بات نہایت فضیحت، انائیت اور فحشیت کے ساتھ اپنی شنوائیوں کے چہ بچوں میں اُتار لینا چاہیے، کہ ہم ہَست کا ننگ ہیں۔ ہم تہذیب کے رنگ میں بھنگ ہیں۔ ہم تاریخ اور تقویم کا اڑنگ بڑنگ ہیں۔

تم اتنے مشکل ہو کہ میرا اَنٹا تو ڈھیلا ہو گیا ہے۔ تم انڈ وبیل ہو، تم انسانوں کے شایستہ کنبے میں کیسے بھگتے جاؤ گے۔ جب تم ماشیوں میں بھی جگہ نہیں پاؤ گے تو آخر کہاں پاؤ گے۔

تم جن حکیموں اور حاکموں کے شاگرد پیشہ ہو وہ اندری بس ہیں۔ تم ان سے اندری جلاب لیتے رہو گے اور سارے جگ میں تمھاری تھڑی تھڑی مچے گی۔

سرزمین کے چپے چپے پر جھونج کے بیج بکھیرے گئے ہیں اور جلد ہی جھونجلوں اور جھنجلاہٹوں کی فصل کاٹی جائے گی۔

میں اکیسویں صدی کو نہایت بددلی سے بسر کر رہا ہوں۔ نہایت بے زادی سے گزار رہا ہوں۔ بیسوی صدی ہمارے لیے ایک بدترین صدی ثابت ہوئی، دیکھو اکیسویں صدی کیا گُل کھِلائے گی۔

دیکھنا یہ ہے کہ تمھاری تمکنت، مناعت اور مکنت، حرام کار اور ناقابلِ رشک صدیوں کی اس وارث صدی کے ساتھ کس طرح پیش آئے گی کہ اس پر ہماری خیر کے امر کا دار و مدار ہے۔

آخر میں مجھے جو بات کہنا ہے وہ یہ ہے کہ ماہ وسال اور صدی کا حساب لگانا یا ان سے فال لینا ایک پاگل پن کا بچپن ہے۔ اصل معاملہ روز وشب اور صدی کا نہیں ہے معاملہ روز وشب اور صدی گزارنے والوں کا ہے۔ صدیاں کیا بیچتی ہیں، اصل بات انسان کی ہے۔ اس انسان کی جو لاکھوں سال تک بدترین شب وروز طے کرتا آیا ہے اور آخر اس نے اپنے گرد و پیش پر فتح پائی ہے۔

اکیسویں صدی کسی بھی فضا میں شروع ہوئی ہو ہمیں بہ ہر حال اس پر فتح پانا ہے۔

سسپنس ڈائجسٹ مارچ 2001

گرد

میں مزارِ قائدِاعظم سے گزرتا ہوا شاہراہِ قائدِاعظم کی طرف مُڑتا ہوں۔ کچھ دُور جا کر دائیں طرف ایک دیوار پر مجھے ایک نعرہ لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ میں اسے پڑھتا ہوں، دوبارہ پڑھتا ہوں اور چلتے چلتے رُک جاتا ہوں۔ مجھے ایک عجیب روحانی فرحت محسوس ہوتی ہے اور میں اطمینان کا گہرا سانس لیتا ہوں۔ یہ نعرہ شہر کی دیواروں پر لکھے ہوئے تمام نعروں سے جُدا ہے۔

یہ دور فتنہ انگیزیوں اور خوں ریزیوں کا دور ہے۔ اگر دیواریں ذی روح ہوتیں تو وہ اپنے سینوں پر لکھے ہوئے زہریلے نعروں کے اثر سے ہلاک ہو جاتیں۔ آپ دیواروں پر لکھے ہوئے نعروں کو پڑھتے چلے جایئے اور خوف اور خدشات سے کم زور پڑتے چلے جایئے۔ آپ کو کوئی بھی ایسا نعرہ نظر نہیں آئے گا جو دل میں ایک خوش گوار کیفیت پیدا کرتا ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم دردمندی، امن پسندی اور خرسندی کے اتنے بیری کیوں ہو گئے ہیں۔ ہمیں تباہی اور تباہ کاری کے شوق نے اتنا سنگ دل اور سفاک کیوں بنا دیا ہے؟

انسان میں زندگی کی خواہش کے ساتھ موت کی خواہش بھی پائی جاتی ہے، خودکشی اور خودکشی کا رجحان اس کی بہت سادہ اور عام فہم علامت ہے۔ نفرت، بغض، غیظ و غضب اور درشت خوئی، موت کی خواہش کی پیچیدہ علامتیں ہیں۔ افراد کی طرح اقوام میں بھی موت کی خواہش پائی جاتی ہے اور بہت سے افراد ہی خودکشی نہیں کرتے، بعض قومیں بھی اقدامِ خودکشی کی مرتکب ہوتی ہیں۔ تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ مگر زندگی کی خواہش موت کی خواہش پر غالب رہتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نوعِ انسانی کبھی کی فنا ہو چکی ہوتی۔

ہم نے جن نعروں کا ذکر کیا وہ زندگی کے جذبے کو کم زور کرتے ہیں اور موت کے رجحان کو تقویت پہنچاتے ہیں' چاہے وہ اپنی موت کا رجحان ہو یا اپنے حریف کو ہلاک کرنے کا رجحان۔ ان نعروں میں ایک دوسرے کے لیے زہر پایا جاتا ہے۔ وہ ذہنوں کو مسموم کرنے کے سوا اور کوئی فرض انجام نہیں دیتے۔ انھوں نے مرگ و ہلاکت کی فضا پیدا کردی ہے۔ سیاسی نفرت انگیزی' لسانی نفرت انگیزی اور مذہبی نفرت انگیزی' ان کا حاصل کیا ہے؟ ہلاکت' ہلاکت اور صرف ہلاکت۔ اگر ان نعروں میں سے کوئی ایک نعرہ بھی پوری طرح کام یابی حاصل کرلے' معاشرے میں دہشت ناک تباہی پھیل جائے۔

قوموں کی زندگی میں کمال کے دور کے بعد زوال کا دور آتا ہے۔ یہ تاریخ کا ایک عمومی رجحان ہے لیکن ہماری زندگی میں تو کمال کا دور آیا ہی نہیں' پھر یہ مسلسل زوال پذیری کی حالت ہمارا مقسوم کیوں قرار پائی ہے؟ یہ بات بار بار سوچنے کی بات ہے اور ہم میں سے ہر شخص کے سوچنے کی بات ہے۔

یہ حقیقت پورے ہوش گوش کے ساتھ سُن لی جائے کہ تاریخ افراد اور اقوام کے ناز اور نخرے اُٹھانے کی عادی نہیں رہی۔ جب بھی اس کے قانون کی خلاف ورزی کی گئی ہے تو خلاف ورزی کرنے والے چاہے اپنے وقت کے عالی شان کج کلاہ ہوں یا عظیم الشان قومیں اور قبیلے...... تاریخ انھیں روندتی ہوئی گزر گئی ہے۔ ہمیں تاریخ کے مزاج سے ہم آہنگی پیدا کرنا پڑے گی۔

عجیب صورتِ حال ہے۔ ہم میں سے جو بھی گروہ ہے وہ آپے سے باہر ہے' جسے دیکھیے وہ دوسرے کو نیست و نابود کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے خلاف زہر اُگلنے کو مذہبی فریضہ اور سیاسی ضابطہ خیال کرتے ہیں۔ ہر گروہ کو توڑنے کی باتیں کرنے کی لت پڑ گئی ہے۔ جوڑنے کی باتیں کرنے والا کوئی نہیں۔ کیا یہ زندگی گزارنے کے طور ہیں؟ اگر تمھارا یہی وتیرہ رہا تو یقین کرو کہ تم اپنے وجود کا جواز کھو بیٹھو گے' تمھارے طور مجرمانہ ہیں اور تمھارے طریقے مفسدانہ' بعض قومیں اتنی گئی گزری ہوتی ہیں کہ ان پر غصہ نہیں رحم آتا ہے۔ کیا تم انھی قوموں میں سے تو نہیں ہو؟ میں تمھیں ان قوموں میں شمار کرنے کی ہمت

نہیں رکھتا۔ بہ ہر حال جو کچھ بھی ہے وہ بہت ہمت شکن ہے۔ جو کچھ بھی ہے' وہ افسوس ناک ترین ہے۔

ہاں تو دیواروں کے فتنہ انگیز نوشتوں کو چھیل ڈالو' ورنہ تم کُھرچ ڈالے جاؤ گے۔ ایک دوسرے کے لیے معقول لہجہ اختیار کرو۔ دلیل اور برہان کے ساتھ بات کرنا سیکھو۔ میں نے شاہراہِ قائداعظم کی ایک دیوار پر لکھے ہوئے ایک شریفانہ اور دانش مندانہ نعرے کا ذکر کیا تھا' وہ نعرہ یہ ہے:

"فرقہ پرستی کے بتوں کو پاش پاش کر ڈالو!"

جس محترم تنظیم نے یہ نعرہ رقم کیا ہے' اس تنظیم کو میرا مودبانہ سلام پہنچے۔ اگر مجھے اس تنظیم کے کسی رکن سے واقف ہونے کی عزت حاصل ہوتی تو میں اور میرے برادرِ عزیز معراج رسول اسے اپنے سینے سے لگاتے اور اس کی پیشانی کو بوسہ دیتے' اگر ہم ایسا نہ کر سکتے تو ہم بھی بہتوں کی طرح تاریخ کی گرد بن کر رہ جانے والوں میں شامل ہوتے۔

سسپنس ڈائجسٹ' اپریل 2001

راہ گیر

میں گلیوں سے گزر رہا ہوں، بازاروں میں چلتا چلا جا رہا ہوں، چوراہوں پر بٹ رہا ہوں۔ میرا ذہن اور میرا ارادہ نہیں چل رہا۔ بس میرے پیر چل رہے ہیں۔ یعنی میرے پنجے چل رہے ہیں، میری ایڑیاں چل رہی ہیں۔ میں لاہور، کراچی، پشاور اور پشین کا کوئی بھی ایک آدمی ہوں۔ کوئی بھی آدمی، جس کا کوئی نام نہیں ہے، جس کا کوئی پتا نہیں ہے۔ مجھے کسی بھی نام سے پکارا جا سکتا ہے۔ میں رات گئے کسی بھی فٹ پاتھ کے کنارے پڑا ہوا مل سکتا ہوں۔

جس طرح میں نے اپنے آخری جوتوں کو اُن کے تلے گھسنے اور تسموں کے ٹوٹنے کے بعد اپنے پیروں سے اُتار پھینکا ہے اور اب میرے تلووں کے نیچے کوئی چمڑا نہیں ہے، اسی طرح میرے پیروں کے نیچے کوئی ایسی زمین بھی نہیں ہے جس سے میرے پنجوں، میرے تلووں اور میری ایڑیوں کا کوئی موروثی رشتہ ہو۔ میں نے اپنی زمین اپنے تلووں کے نیچے سے نکال باہر کی ہے۔ اب میں اپنی زمین پر نہیں، روئے زمین پر چلتا ہوں۔

یہ محنت اور مشقت کے شہر کی ایک صبح ہے، ایک دوپہر ہے، ایک شام ہے۔ دھات کے بدن اور گوشت پوست اور ہڈیوں کے قامت دوڑ رہے ہیں۔ چاہے ان میں سے کچھ دوڑتے دکھائی نہ دیتے ہوں۔ پر وہ سب دوڑ ہی تو رہے ہیں، چاہے اپنے باہر دوڑ رہے ہوں یا اپنے اندر۔

مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ بل کہ مجھے تو ان راہ گیروں پر رشک آتا ہے جنھیں کہیں پہنچنے اور کہیں سے واپس آنے کی جلدی ہوتی ہے۔ میں کوئی ایسا شہری نہیں ہوں جس کا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہوتا ہے۔ مجھے کوئی بھی ضروری کام نہیں اور اگر سچ پوچھتے ہو تو مجھے کوئی کام نہیں

ہے۔ پیر چلنے کے لیے ہیں۔ اس لیے میں اپنے پیروں پر چل رہا ہوں۔ اگر پیر سر کھجانے کے لیے ہوتے تو میں ان سے اپنا سر کھجا رہا ہوتا۔ میں تو بس یوں ہی چلتا چلا جا رہا ہوں۔

یہاں مجھے اپنی زبان کے ایک بہت بڑے شاعر کا ایک شعر یاد آتا ہے۔ یہ شعر مزاح اور ظرافت کی شاعری کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ شاعر نے یہ شعر اپنے دل کی بہت سنگین حالت میں کہا تھا' یعنی کہا ہوگا مگر شاعر کیا اور اس کے دل کی سنگین حالت کیا۔ بس چُپ رہو، کچھ کہو مت۔ وہ شعر یہ ہے۔

یہ جو پڑا ہے سایۂ دیوارِ یار میں
فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے

جان لیا جائے کہ میں بھی فرمان روائے کشورِ ہندوستان ہوں۔ تم کہو گے کہ اے شخص، تُو بھنگ پی گیا ہے۔ میں اس کا یہ جواب دوں گا کہ تم بھنگ پی گئے ہو۔ تم...... ہاں، تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ میں بھنگ پی گیا ہوں۔ سُنو! میں تو اس دن سے بھنگ پیے ہوئے ہوں جس دن ہمارا آدمی، ہمارا شاعر، ہمارا شاہ، ہمارا پیر و مرشد اور ہمارا درویش اپنے ویران تکیے، لال قلعے کو چھوڑ کر اپنے دادا کے مقبرے میں جا بیٹھا تھا۔

میں نے پہلی بار اسی دن بھنگ پی تھی اور اسی رات ترا ہا بیرم خان پر لڑکھڑایا تھا۔ میں نے پہلی بار ایک جوہڑ کو جمنا سمجھا تھا۔ میں نے اپنے جوتے پیروں سے اُتار پھینکے تھے اور میں نے زمین کو اپنے تلووں کے نیچے سکیڑ لیا تھا اور بس یوں ہی چل پڑا تھا اور رات کے دوسرے پہر پنجہ شریف کے دروازے کے سامنے، جا سلام کیا تھا...... عشق اللہ...... مگر جواب میں ''مدد اللہ'' نہیں سُنا تھا۔

بُھول جاؤ، سب کچھ بُھول جاؤ اور دُور کی بات کی طرح اپنے دھیان میں بھی نہ لاؤ کہ تم پہلی بار کب لڑکھڑائے تھے اور کب راہ سے بے راہ ہوئے تھے اور وہ یوں کہ زمانے کے راستوں میں لڑکھڑانا ہی تمھارا نصیب ہے اور جب بھی گھر سے باہر نکلا کرو اپنے دائیں اور بائیں کی طرف کی دیواروں کو دھیان سے پڑھتے ہوئے چلا کرو کہ یہ دیواریں ہی تمھارا نصاب ہیں۔ ان دیواروں پر حکمتیں، بصیرتیں اور ہدایتیں رقم کی گئی ہیں اور رقم کی جاتی رہتی ہیں۔

چشمِ بد دُور کہ تمھارا یہ نصاب تمھارے نوجوانوں نے تجویز کیا ہے۔ چشمِ بد دُور کہ تمھارے نوجوان جامہ زیب ہی نہیں، اپنے وقت کے جاماسپ بھی ہیں۔ اسی نصاب میں جو سب سے قیمتی نکتہ تعلیم کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ جہاں بھی رہو، وہاں نہ رہو۔

میں گلیوں اور بازاروں میں چلتا چلا جارہا ہوں۔ میں کہیں سے بھی دیر کر کے نہیں چلا ہوں اور نہ مجھے کہیں پہنچنے کی جلدی ہے۔ میں تو بس چل رہا ہوں، چلتا چلا جارہا ہوں...... چلتا چلا جارہا ہوں اس لیے کہ پیر چلنے کے لیے ہیں۔

سسپنس ڈائجسٹ، اکتوبر 2003

اُمید

وہ قبیلوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور قوموں کے دلوں کا چین رہی ہے۔ ان زمانوں میں بھی جن کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ ان زمانوں میں بھی جن کی کچھ نشانیاں ہمارے ہاتھ لگی ہیں۔ ان زمانوں میں بھی جن کے بارے میں ہم نے کچھ دُھندلی کہانیاں سُنی ہیں۔ ان زمانوں میں بھی جو نیم تاریخی کہے جاتے ہیں۔ ان زمانوں میں بھی جو تاریخی کہلاتے ہیں اور اس زمانے میں بھی جس میں ہم اور تم سانس لے رہے ہیں۔ ہاں وہ قبیلوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور قوموں کے دلوں کا چین رہی ہے اور ہے۔

انسان نے اس کی زندہ رکھنے والی آنچ کے سہارے نہ ختم ہونے والے برفانی دور گزارے۔ وہ سب کچھ وہاں زمین، آسمان اور آگے پیچھے اور دائیں بائیں کا سب کچھ سہتا رہا اور صرف اسی کے سہارے رہتا رہا۔ وہ نہ ہوتی تو آج انسانی تاریخ نام کی کوئی چیز بھی نہ پائی جاتی۔

تُو ہم میں ہے اور اس طرح ہے جس طرح ہم تجھ میں ہوں۔
اگر تُو ہم سے ہمارے دلوں سے کُوچ کر جائے
تو ہمارا ہر سانس جاں کنی کا سانس ہو۔
ہماری پتلیاں پتھرانے لگیں اور ہم دم توڑ دیں۔
تُو ہم میں ہے اور اس طرح ہے جس طرح ہم تجھ میں ہوں۔
اے مسیحا زادی! تُو ہماری صحت اور طاقت ہے۔
اے دل آبادی! خزاں، بہار اور ان کے بیچ ہماری دل آبادی

تُو زردی میں بھی ہمارا آسرا ہے اور سرسبزی میں بھی
ہم نے تجھے چبوترے پر بٹھایا اور تیرے دونوں پاؤں
چبوترے سے نیچے اپنے سینے پر رکھے
اور پھر بیج ڈالنے والوں نے اُتر سے دکن تک
اور پچھم سے پورب تک بیج ڈالے
اور تیرے دونوں پاؤں ہمارے سینے پر تھے
اور پھر فصل پکی اور کاٹی گئی
اناج کو گاہا گیا
اور تیرے دونوں پاؤں ہمارے سینے پر تھے
ہم تیرے ہی سہارے زندہ ہیں۔
اور تیرے ہی بھروسے پر دن اور رات کے سارے کام کرتے ہیں۔
تُو ہی ہمارا آسرا اور ہمارا بھروسا ہے۔
یہ دن بہت بُرے دن ہیں۔
یہ راتیں بہت بُری راتیں ہیں۔
پر ہم تیرے آسرے اور تیرے بھروسے پر گزران کر رہے ہیں۔
ہمارے چاروں طرف بپتیں، دہشتیں اور ہلاکتیں ہیں
مگر ہم قبیلوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور قوموں کے دلوں کے چین کے سہارے جیتے ہیں۔
ہم تیرے سہارے جیتے ہیں۔
اور اب بھی اچھے دنوں اور اچھی راتوں کے خواب دیکھتے ہیں۔
اے قبیلوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور قوموں کے دلوں کے چین!

ایک طور

میں گلہ کرتا ہوں، میں لہو میں لتھڑا ہوا گلہ کرتا ہوں۔ زندگی اس شہر میں بُری طرح بے حرمت ہوئی ہے۔ خوں ریزی کے اُن جانے ہنرمندوں نے اس شہر کی زندگی کو بڑی سفا کی سے لتاڑا ہے اور اس شہر کا حلیہ بگاڑا ہے اور اس کی راہوں اور اس کے چوراہوں کو بڑی شقاوت سے اُجاڑا ہے۔

''جون ایلیا! یہ بات تو تم نے پرسوں بھی کہی تھی اور کل بھی۔''

''ہاں، یہ بات میں نے پرسوں بھی کہی تھی اور کل بھی۔ اور یہ بات میں آج بھی کہہ رہا ہوں، کل بھی کہوں گا، پرسوں بھی کہوں گا اور کہتا ہی رہوں گا اس لیے کہ جو کچھ تھا، وہ ہے اور جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ ہوئے جا رہا ہے۔ مجھے اس شہر کے شہریوں کے دُکھ جھیلنے کی نوکری ملی ہے۔ اگر اس نوکری سے میرا دل اچاٹ ہوگا تو میں اپنے آپ کو حرام خور سمجھوں گا۔ یہ نوکری پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ نے مجھے بڑی بڑی سفارشوں کے بعد دی ہے۔''

''ہاں، میں اس شہر کے وجود کے سڑے ہوئے زخموں کا، پھپھوندے ہوئے پھوڑوں کا نوکر ہوں، چاکر ہوں اور یہ نوکری، یہ چاکری میرے لیے بڑی عزت کی نوکری اور بڑے فخر کی چاکری ہے کہ اس کی کوئی تنخواہ نہیں ہے۔ کیا میں زخموں سے، اپنے ہی زخموں سے تنخواہ لوں گا؟ کیا میں پھوڑوں سے، اپنے ہی پھوڑوں سے روز ینہ طلب کروں گا؟''

''تم جو ہو یعنی تم! تم بھی عجب ہو اور تمھارا روگ بھی عجب ہے۔''

''ہاں، میں بھی عجب کوئی ہوں اور میرا روگ بھی عجب کچھ ہے۔ مجھے اپنے اس روگ کی پہچان نے دل اور دماغ کی جو صحت بخشی ہے، وہ میری روح کا بہت ہی بڑا ابتلا ہے۔

میں اپنی روح کے اس ابتلا سے کسی طرح بھی نجات نہیں پا سکتا۔"

"تم اپنی روح کے اس ابتلا سے کسی طرح بھی نجات نہیں پا سکتے! آخر ایسا کیوں ہے؟"

"ایسا یوں ہے کہ یہ ابتلا میرا، میرا ہی نہیں ہمارا مقسوم ہے۔ یا یوں کہہ لو کہ یہی میری بُو دو نبود ہے۔ ہماری بُو دو نبود ہے۔"

"لوگو! کیا تم نہیں جانتے، کیا تم میری یہ بات نہیں مانتے کہ میں تم میں ایک عمر سے بڑی اذیّت ناکی کے ساتھ تڑپایا گیا ہوں۔ پر کسی کے نہ جاننے اور نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے اور ایسا تو ہونا ہی تھا۔ مجھے تو اپنے لہو سے اپنے زخموں کو دھونا ہی تھا۔ پر میں ہوں کون؟ یعنی یہ کہ میں ہوں کون، میں کوئی بھی تو نہیں ہوں یعنی یہ کہ تم، یعنی یہ کہ میں۔ ہاں، میں اور تم!"

"میں اپنے آپ پر اور اس شہر کے شہرۂ آفاق شہریوں پر صبح سے شام تک اتنی بار ہنستا ہوں، اتنی بار ہنستا ہوں اور اتنی بار روتا ہوں، اتنی بار روتا ہوں کہ بس۔ کیا ہماری سرِ نوشت ایسی نہیں ہے کہ اس پر بار بار ہنسا اور بار بار رویا جائے؟"

"ہاں، تمھاری سرِ نوشت ایسی ہی ہے کہ اس پر بار بار ہنسا اور بار بار رویا جائے۔"

ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں اپنے ہونے کا ایسا بھگتان بھلا کس گروہ نے بھگتا ہوگا جیسا بھگتان تم نے بھگتا۔ مجھے تمھارا ہونا، ہر لمحہ ہونا بہت ہی اَولو اَولو لگتا ہے، بہت ہی اَولو اَولو کہ ہو اور ہرگز نہیں ہو۔

کھڑکی کے باہر رات بَلا کی اندھیری ہے۔ جانے اس وقت کیا بجا ہوگا! وقفے وقفے سے گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ہم ان آوازوں کو اپنے وجود کا لحن کیوں نہ جانیں۔ اپنی نمود کا آہنگ کیوں نہ گردانیں؟ اے گروہ! اگر تیری تہذیب کے سب سے بڑے نوا گر امیر خسرو اس لحن اور اس آہنگ کو سُنتے تو کتنے چاؤ سے سر دُھنتے!

"اس شہر کا چارہ گر کون ہے اور تیماردار کون؟"

"اس شہر کا چارہ گر کون ہے اور تیماردار کون...... یہی تو کہا نا تُو نے؟"

"ہاں، میں نے یہی کہا اور اپنی اس کہن کو سہا۔"

اس شہر کا کوئی چارہ گر نہیں ہے، کوئی تیماردار نہیں ہے۔ دوسرے شہر اس شہر کی حالت پر

بس ترس ہی کھا سکتے ہیں اور اس کے سوا بھلا وہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟ سو وہ ترس کھا رہے ہیں۔ اے ترس کھانے والو! میں تم سے اس شہر کی حالت پر بہت زیادہ ترس کھانے کی بھیک مانگتا ہوں۔ یہ شہر اپنے ہونے کے جس عذاب میں مبتلا ہے، اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہے۔ پر اس کا اندازہ لگانا اس ملک کی ہر بستی اور ہر شہر کا فرض ہے۔ یہ شہروں کا شہر ہے۔ یہ کسی ایک زبان بولنے والے گروہ کا شہر نہیں ہے۔ یہ تو برادریوں کی برادری کا شہر ہے۔

"اے شہر! یرمیاہ نبی نے یروشلم کا مرثیہ کہا تھا۔ میرا سینہ بھی دُکھ سے بُری طرح بھرا ہوا ہے۔ میرے پپوٹے بھی سوج گئے ہیں۔ تیری راتیں مجھے بڑی بے رحمی سے جگاتی ہیں۔ تیرے دن مجھے جان لیوا اذیّت سے ہلکان رکھتے ہیں۔ تیری گلیاں، تیرے راستے اور تیرے چوک میرے خون سے لتھڑے ہوئے ہیں۔ میرا خون میں نہایا ہوا بدن جگہ جگہ پڑا ہوا تڑپ رہا ہے، میں جگہ جگہ دم توڑ رہا ہوں۔ آخر میں اپنی لاشیں کہاں کہاں سے اُٹھاؤں؟"

"میں تجھے پھر سے تازہ دم دیکھنا چاہتا ہوں۔ تجھے ایک نئے انداز کی زندگی سے آراستہ دیکھنے کی آرزو رکھتا ہوں۔ مجھے ایک بات کہنا ہے۔ میری اس بات کو دھیان دے کے سُننا اور وہ یہ کہ زندگی ایک طور کا نام ہے۔ نفس کے ایک طور کا نام ہے۔ تُو بہت ہارا مارا ہے پر دیکھنا نفس کے اس طور کو کبھی نہ ہارنا۔"

سسپنس ڈائجسٹ، جولائی 2004

جرم

ہمارے یہاں جس چیز نے سب سے زیادہ فروغ پایا ہے، وہ جرم ہے۔ جرم کو اتنی سازگار فضا کبھی نہیں ملی تھی جتنی کہ گزر جانے والی دہائی میں ملی ہے۔ اس لیے کہ نہ سزا کا خوف ہے اور نہ سزا۔ وہ کیفیت جسے معاشرے کی گرفت کہتے ہیں، وہ اپنا اثر کھو بیٹھی ہے۔ سو نہ تو نیکی کی داد ہے اور نہ بدی کی فریاد۔ کوئی کچھ بھی کر گزرے، اسے کوئی روکنے والا نہیں، ٹوکنے والا نہیں۔ اب یہ کوئی خبر نہیں رہی کہ نامعلوم افراد نے سرِراہ گولیاں چلا کر دس آدمیوں کو ہلاک کر دیا بل کہ اب یہ بات خبر کہلائے گی کہ آج ہمارے اردگرد قتل، ڈکیتی یا اغوا کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

جرائم پیشہ لوگ کسی ایک طبقے یا کسی ایک گروہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ سماج کے ہر طبقے ا ر ہر گروہ کے لوگ اپنی اپنی پسند کے جرائم کا ارتکاب کرنے میں سرگرم ہیں۔ ان کی راہ میں نہ کوئی مانع ہے اور نہ کوئی مخل۔

جس سماج میں جرائم کو معمولات کی حیثیت حاصل ہو جائے، اس سماج کے وجود کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اس صورتِ حال کا ذمّے دار آخر کون ہے؟ کیا مجرم اس کے ذمے دار ہیں؟ ظاہر ہے کہ مجرم اس کے ذمّے دار نہیں اس لیے کہ اگر مجرم جرم نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے؟ عوام جاننا چاہتے ہیں کہ آخر وہ کیا کریں اور پوچھنا چاہتے ہیں کہ اربابِ اختیار کیا کر رہے ہیں؟ اب تو یہ عالم ہے کہ جب ہم جرائم کی مذمت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجرموں کو عبرت ناک سزا دی جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم کوئی بہت ہی لچر اور پوچ بات کہہ رہے ہوں۔

کبھی کبھی تو اپنی مرضی سے جرم کرنے والوں یا جرم کرنے پر مجبور کر دیے جانے والوں سے میرا یہ بات پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ اے عزیزو! ہمارے حکم رانوں کے ذہن میں ملک سے متعلق بہت سے منصوبے ہیں۔ تمھیں بھی ان ہی کی طرح کچھ کم اثر و نفوذ حاصل نہیں ہے لہٰذا تمھارے ذہن میں بھی اپنے ملک سے متعلق کچھ منصوبے ہوں گے اس میں سے کسی ایک منصوبے کے یا دو ایک منصوبوں کے بارے میں معلوم تو ہو کہ آخر ان کی کیا نوعیت ہے اور یہ کہ تم نے اپنی قوم کے لیے آخر کیا سرنوشت تجویز کی ہے؟ اس کے علاوہ مجھے تم سے کچھ ذاتی قسم کی باتیں بھی پوچھنا ہیں یعنی یہ کہ کیا تمھارے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے؟ کیا تم کسی کے باپ اور کسی کے بیٹے اور کسی کے بھائی اور کسی کے دوست نہیں ہو؟ اے عزیزو! کیا تم سارے رشتوں سے آزاد ہو؟ اگر ایسا ہے تو یہ کیفیت بہ ہر حال زمینی کیفیت تو ہرگز نہیں ہے۔ آسمانی ہو تو ہو۔ شاید ایسا ہی ہوگا۔ اس لیے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر تم جرائم کی انجام دہی میں اتنی دل جمعی اور مستعدی نہ دکھاتے۔ اس لیے کہ جو کسی کا باپ نہ ہو وہی مسلسل دل جمعی اور مستعدی کے ساتھ کسی کے بیٹے کو خون میں نہلا سکتا ہے، جو کسی کا بیٹا نہ ہو وہی کسی کے باپ کو بے تکان قتل کر سکتا ہے اور جو کسی کا بھائی یا دوست نہ ہو، وہی آزاد مرد پورے احساسِ آزادی اور بے ساختگی کے ساتھ کسی کے بھائی یا دوست کے سینے کو گولیوں سے چھلنی کر سکتا ہے، ہے کہ نہیں؟

کیوں نہ مل کر سوچیں کہ ہم آخر کس راستے پر چل رہے ہیں، کہاں جا رہے ہیں اور کہاں جا کر ٹھہریں گے۔ میرا گمان ہے کہ حالات نے تمھیں جس راستے پر ڈال دیا ہے، وہ راستہ ہرگز تمھارا پسندیدہ راستہ نہیں ہے۔ تم میں سے اکثر نے اپنے لڑک پن میں یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ وہ جوان ہو کر جرم کو اپنا پیشہ بنائیں گے۔ آج بھی اگر تم سے یہ پوچھا جائے کہ کیا ملک کے لوگوں کی اکثریت کو جرائم پیشگی کا راستہ اختیار کر لینا چاہیے تو شاید تمھارا جواب یہ ہو گا کہ نہیں۔ میرے خیال میں اگر تم سے مجرم اور منصف میں سے کسی ایک حیثیت کا انتخاب کرنے کے لیے کہا جائے تو شاید تم منصف کی حیثیت کا ہی انتخاب کرو گے۔ تو اے عزیزو! جب ایسا ہے تو پھر سر جوڑ کر کیوں نہ سوچا جائے۔ تمھارا ہم سے اور ہمارا تم سے یہ رشتہ ہے کہ

ہم ایک ہی قوم کے فرزند ہیں۔ تم نے یہ راہ خود اپنائی ہے یا پھر ہم ہی شاید تمھیں یہاں تک لائے ہیں۔ تو آؤ کیوں نہ مل کر یہ سوچا جائے کہ ایک نئی راہ اختیار کی جائے۔ خوش گوار خیالات اور خوش آیند خوابوں کی راہ۔

ایک خوش انجام سعی و عمل اور ایک درخشاں مستقبل کی راہ کہ اسی میں عزیزو، تمھاری اور ہماری سب کی نجات ہے!

سسپنس ڈائجسٹ، ستمبر 2004

حساب فہمی

ہماری قوم کے بڑوں نے راستی کو بھلا دیا اور جھگڑے کو اس کی حدوں سے بڑھایا۔

ہمارے خواب اور ہماری خواہشیں، اقتدار کی رسموں سے روندی گئیں اور ہماری خوشیاں حُبِ جاہ کی چکّی میں باریک پیسی گئیں۔

ہمارے ایوانوں میں دانائی ترک ہوئی اور فراست پسپا۔

الزام کی دلدل نے ہمیں نگلا اور بہتان کی مچھل پائی نے اپنوں کے خلاف زہر اُگلا۔

قوموں کے درمیان ہم پراگندہ ہوئے اور ہمسایوں کی ملامت نے ہمارا پیچھا کیا۔

چاروں طرف سے ہم پر دشنام کے تیر برستے ہیں اور ہم دل جوئی کے چند بولوں کو ترستے ہیں۔

ہم مصیبت کے ٹاٹ پر بیٹھے اور پشیمانی کی خاک ہم نے اپنے سروں پر ڈالی۔

اپنے بڑوں کی طرف ہم نے دیکھا اور چاہا کہ وہ اپنی پُرنخوت انا کے زرہ بکتر اُتاریں اور عجز وانکساری کا لبادہ پہنیں۔

ہم نے چاہا کہ وہ حاکمیت کی چوک میں کھڑے ہوں تو ان کے ہاتھوں میں انسان پرستی اور خرددوستی کا نصاب ہو اور آنکھوں میں عدل وانصاف کے خواب۔

وائے ہوان پر جنھوں نے ہماری خواہشوں کو ببول کے کانٹوں پر بچھایا اور ہمارے خوابوں کو خزاں کے سپرد کیا۔

وائے ہوان پر جنھوں نے بُردباری کا ذخیرہ دریابرد کیا اور تحمل کے کھلیان کو آگ لگائی۔

ایسا کیوں ہوا لوگو! کہ تم پر وہ مسلّط کیے گئے جو مسلّط کیے گئے؟

یاد کرو لوگو! کہ تاریخ محکوموں کے اعمال کے مطابق ہی ان کے حاکم منتخب کرتی ہے، سو

محض اپنے سَر دَھروں کو بُرا مت کہو، اپنے کیے ہوئے کو اپنے ایمان کی میزان پر تولو۔

اے لوگو! زمانہ ان ہی سے منہ پھیرتا ہے جو خود سے منہ پھیریں۔

تاریخ، قوموں اور گروہوں کو نہ ان کے حق سے کم کرتی ہے اور نہ زیادہ۔

جغرافیہ ان ہی سے رُوٹھتا ہے جو اپنے دریاؤں، پہاڑوں، سمندروں، کھیتوں، کھلیانوں، بستیوں اور بنوں، باغوں اور باغیچوں کی نگہداری نہیں کرتے۔

ہم نے جھوٹ کی بیساکھیوں سے دنیا میں اپنا قامت بڑھانے کی کوشش کی اور منہ کے بَل گرے۔

ہم نے اپنے جغرافیے کو مالِ غنیمت جانا اور اس سے محض سمیٹنے کو اپنا حق سمجھا۔

آج ہم اپنے حال پر زار و قطار روتے ہیں اور اپنی بد بختیوں کی ذمّے داری کبھی تاریخ، کبھی جغرافیہ، کبھی دوستوں اور کبھی دشمنوں کے کھاتے میں ڈالتے ہیں۔

حقائق کا آئینہ ہمارے سامنے ہے لیکن ہم اس سے رُوبہ رُو نہیں ہوتے، کبھی ہم اس کے سامنے تو ہوں، اس میں اپنی صورت تو دیکھیں۔

ہم کبھی اپنی تاریخ میں قریب اور بعید کی غلطیوں پر نظر تو کریں، کبھی اپنے جغرافیے سے پوچھیں تو سہی کہ اس نے ہمارے ہاتھوں کتنے زخم اُٹھائے ہیں۔

ہم، جنھیں دوسروں سے حساب فہمی کا عارضہ ہے، ہم کبھی اپنا حساب بھی دیں۔ اپنے نامۂ اعمال پر ایک نظر تو ڈالیں۔

تب ہی ہم اس کے اہل ٹھہریں گے کہ اپنے نادان اور ناعاقبت اندیش بڑوں سے کہہ سکیں کہ انھوں نے راستی کو بھلا دیا اور جھگڑے کو اس کی حدوں سے بڑھا دیا۔

لیکن عزیزو! پھر اس کی نوبت ہی کیوں آئے گی؟

تم حیران و سرگرداں ہو، میرے اس جملے پر......!

شاید تمھیں یاد نہیں رہا، ابھی چند ساعتوں پہلے میں نے تم سے کہا تھا کہ تاریخ محکوموں کے اعمال کے مطابق ہی ان کے حاکم منتخب کرتی ہے!

کیا واقعی، تم اب بھی نہیں سمجھے کہ میں تمھیں کیا سمجھا رہا ہوں؟

مشاعرہ

مشاعرے کے معنی ہیں شاعروں کا ایک دوسرے کو شعر سُنانا یا شاعروں کا فنِ شعر گوئی میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا۔ پہلے معنی کے پیشِ نظر غیر شاعر سامعین کا مشاعرے سے کوئی تعلق نہیں، یہ شاعروں کا آپس کا معاملہ ہے۔ اب رہے دوسرے معنی تو ان معنی کی رُو سے مشاعرے کا سامعین سے بنیادی تعلق ہے اس لیے کہ جب شاعروں کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوگا تو اس مقابلے کا فیصلہ کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جو شاعر نہ ہوں اور اگر شاعر ہوں تو اس مقابلے میں شامل نہ ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اب ناقد کہلاتے ہیں۔ یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ عرب کے دو عظیم شاعروں میں مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے کا فیصلہ کرنے کے لیے ان دو شاعروں میں سے ایک شاعر کی بیوی مقرّر کی گئی جو شاعری کی بہت بڑی پارکھ تھی۔ اس خاتون نے اپنے شوہر کی نظم کے خلاف اور حریف شاعر کی نظم کے حق میں فیصلہ دیا۔ عجب خاتون تھی۔ اس نیک بخت خاتون کا انجام کیا ہوا، یہ بات مجھے یاد نہیں رہی بہ ہر حال اگر ہم میں سے کسی کی بیوی ہماری تخلیق کے خلاف اور ہمارے حریف کی تخلیق کے حق میں فیصلہ دیتی تو ہم اسے طلاق دے دیتے۔ ہمارے یہاں مشاعرے کا مفہوم مختلف ہے اور اپنے اس مفہوم کے پیشِ نظر مشاعرہ صرف اُردو زبان سے مخصوص ہے۔ عربی میں مشاعرے کا جو دوسرا مفہوم ہے یعنی دو شاعروں کا باہمی مقابلہ، اس مفہوم کے اعتبار سے اُردو مشاعرے اور عربی مشاعرے کی کیفیت میں قریبی مناسبت پائی جاتی ہے۔ اُردو مشاعرے میں بھی دو شاعروں کے درمیان تو نہیں، مشاعرے میں شریک ہونے والے تمام شاعروں کے درمیان خوانخواہ مقابلے کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ اس فضا

کے پیدا کرنے میں سامعین حسبِ ذوق اور بر بنائے جانب داری بنیادی کردار ادا کرتے ہیں اس کے نتیجے میں کوئی ایک شاعر یا چند شاعر داد و تحسین کی بنیاد پر مشاعرے کے فتح مند شاعر قرار پاتے ہیں۔ مگر فتح مندی کا یہ فیصلہ ایک ہنگامی فیصلہ ہوتا ہے اور اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہوتی لیکن مشاعرے کے عام سامعین بل کہ تماش بین اس شاعر کو جسے سب سے زیادہ داد ملے اور جس سے بار بار شعر سُنانے کی فرمایش کی جائے سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں چناں چہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بدترین شاعر یا بہت معمولی شاعر اپنے اشعار کے سطحی اور اپنی پڑھت کے انداز کے موثر ہونے کی وجہ سے بہترین شاعر قرار پاتا ہے لیکن اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بڑے شاعروں کو مقابلے کی اس سطح سے بلند سمجھا جاتا ہے۔ ان کا کم یا زیادہ داد پانا کسی کسوٹی کی حیثیت نہیں رکھتا۔ پھر یہ بات بھی واضح ہے کہ مشاعروں کے انعقاد کا مقصد یہ فیصلہ کرنا ہرگز نہیں ہوتا کہ کون شاعر یا کون کون سے شاعر بڑے یا بہترین شاعر ہیں۔

اُردو کے قدیم مشاعروں کے سامعین معاشرے کے وہ لوگ ہوتے تھے جو اعلیٰ ادبی اور فنی شعور رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا تعلق اعلیٰ طبقے سے ہوتا تھا۔ اس زمانے میں مشاعرہ کوئی عوامی ادارہ نہیں تھا۔ یہ مشاعرے درباروں اور امرا کی حویلیوں میں منعقد ہوتے تھے۔ مشاعرے کو عوامی حیثیت اس وقت حاصل ہوئی جب کالجوں اور یونی ورسٹیوں یا دورانِ سال کی خاص سماجی تقریبات کے مواقع پر مشاعرے برپا ہونے شروع ہوئے۔ سیاسی تحریکوں نے بھی مشاعروں کو ایک خاص اہمیت بخشی۔ بہ ہر حال ''عظیم الشان'' مشاعرے بیسویں صدی کی پیداوار ہیں اور اُردو زبان کے خواص و عوام کے لیے سب سے اہم تہذیبی ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے خواص اور عوام کے فرق کو دُور کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

مشاعرے کا تذکرہ ہو رہا ہے تو اس ضمن میں ایک خاص بات قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ مشاعرے کی نسبت سے دیکھا جائے تو شاعری کی چار قسمیں متعین ہیں۔ شاعری کی ایک قسم وہ ہے جو اچھی بھی ہو اور مشاعرے میں بھی پسند کی جائے۔ دوسری قسم وہ ہے جو اچھی

ہو مگر مشاعرے میں داد حاصل نہ کر سکے۔ تیسری قسم وہ ہے جو بُری ہو اور مشاعرے میں بھی بُری قرار پائے اور چوتھی قسم وہ ہے جو بُری ہو مگر مشاعرے میں بہت پسند کی جائے۔ بہ ہر حال مشاعرہ ایک ایسا خطرناک ہنگامہ ہے جس میں شاعر کی عزت لحظہ لحظہ خطرے کی زَد میں رہتی ہے۔ یہاں مجھے برادرِ عزیز معراج رسول نے ایک خاص معاملے کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان کے کہنے کا حاصل یہ ہے کہ جو افراد یا ادارے مشاعرے منعقد کرتے ہیں وہ بلاشبہ قابلِ داد ہیں اس لیے کہ وہ ایسے "ہنگامے" بھی برپا کر سکتے ہیں جن سے عوام الناس کو مشاعروں سے کہیں زیادہ دل چسپی ہے اور جن کے ذریعے مشاعرے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مالی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے لیکن اب بعض مثالیں ایسی بھی پائی جانے لگی ہیں کہ مشاعرے ادبی اور تہذیبی ذوق کی تسکین کے بجائے محض تجارتی مقصد کے پیشِ نظر برپا کیے جاتے ہیں اور ان میں ایسے "شعرا" اور "شاعرات" کو خاص الخاص طور پر مدعو کیا جاتا ہے جو محض گویوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس قبیل کے لوگوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو خود کہتے ہیں اور بہت بُرا کہتے ہیں مگر اپنی گائیکی کی وجہ سے مشاعرے کو تہ و بالا کر ڈالتے ہیں اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو خود نہیں کہتے بل کہ کسی "مردِ غیب" سے کہلوالاتے ہیں اور اپنے ٹینٹوے کے زور پر مشاعرے کو لوٹ لیتے ہیں۔ اس قسم میں شاعرات کی تعداد زیادہ ہے۔ ہندوستان میں یہ صورتِ حال بہت عام ہے۔ ہماری اس گفت گو کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ترنّم سے پڑھنے والے شاعروں کی تنقیص کریں۔ ترنّم سے پڑھنے والے بے شمار شاعر ایسے بھی ہیں جن کی ادبی حیثیت سے انکار ممکن نہیں۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ مشاعرے کے عوام پسند اور خواص پسند تہذیبی ادارے کو اب آہستہ آہستہ محض ایک سطحی قسم کے تفریحی ہنگامے کی حیثیت حاصل ہوتی جا رہی ہے اور اس کے ذمّے دار وہ افراد اور ادارے ہیں جو مشاعروں کو اپنا تجارتی مقصد حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور یہ وہ معاملہ ہے جس کی شدید ہمت شکنی کی جانا چاہیے۔ کیوں کہ اب مشاعرہ ہی وہ سب سے بڑا ادبی اور معیاری ادارہ رہ گیا ہے جو اعلیٰ ذہنی فرحت بخشی اور تہذیبِ نفس کا فرض انجام دیتا ہے اور اس کی اس محترم اور اہم حیثیت کی حفاظت کرنا ہمارا تہذیبی فرض ہے۔

مخول-۱

زمانے کا بھٹکایا ہوا ایک مسافر، ایک عام سا مسافر، ایک عام سا راہ گیر اپنے آپ کو شاہ جہاں آباد کی جنوبی سمت سے شمال کی طرف گھسیٹنے کی حالت میں ہانپ رہا ہے، ہانپ رہا ہے اور اپنے آپ کو گھسیٹ رہا ہے۔ وہ اس راستے میں اپنے آپ ہی کو نہیں گھسیٹ رہا، اپنے ماضی اور اپنی تاریخ کی یادوں کو بھی گھسیٹ رہا ہے۔ فقط وہی نہیں ہانپ رہا، اس کے ساتھ اس کی تاریخ کی یادیں بھی ہانپ رہی ہیں۔

اس وقت نہ دن کا پہلا پہر ہے، نہ دوسرا، نہ تیسرا پہر ہے نہ چوتھا۔ اور نہ رات کا پہلا پہر ہے اور نہ دوسرا......بس وقت ہے جو بہہ رہا ہے اور بہے جا رہا ہے۔ ہر لمحہ آغاز اور ہر لمحہ انجام۔

وقت کا بھٹکایا ہوا مسافر اب ایک چوراہے سے گزر رہا ہے اور لمحہ لمحہ بکھر رہا ہے۔ لمحہ لمحہ بکھر رہا ہے اور گزر رہا ہے۔ گزرتے جاؤ اور بکھرتے جاؤ۔ اپنے ہونے کا رنگ رچاؤ اور اپنے ہونے کے ساتھ اپنے سکوں بخش نہ ہونے کا سوگ مناؤ۔

اب وہ اپنے آپ کو ایک سنگی دروازے کے رُوبہ رُو پاتا ہے اور اس کا جگر خون ہو جاتا ہے۔ وہ خوں ریز دھماکوں کی آواز سُنتا ہے اور ۱۸۵۷ء کے کسی مہینے کے کسی دن لہولہان ہو جاتا ہے اور دَم توڑ دیتا ہے۔

''کہاں لہولہان ہو جاتا ہے، کہاں دَم توڑ دیتا ہے؟'' میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں اور پھر اپنے آپ کو جواب دیتا ہوں۔

''خونی دروازے کے سامنے۔''

زمانے کا بھٹکایا ہوا مسافر دم توڑتے ہوئے ایک خوں چکاں ہنسی ہنستا ہے، ایک فالتو، ایک فضول اور ایک یک سر رائگاں ہنسی اور پھر سانس لینے لگتا ہے اور جینے کا عذاب سہنے لگتا ہے۔ ازاں بعد وہ پتھر کی طرح ساکت اور صامت کھڑا رہ جاتا ہے۔ اس پر ایک بے غیرت بے حسی مسلّط ہو جاتی ہے پھر وہ اپنے آپ کو آگے کی طرف گھسیٹتا ہے۔ آگے کی طرف گھسیٹتا ہے اور ایک بارگی نظر اُٹھاتا ہے تو اپنے آپ کو دلّی دروازے کے رُو بہ رُو پاتا ہے۔

''نگاہ رُو بہ رُو، نگاہ رُو بہ رُو'' ۱۷ویں اور ۱۸ویں صدی کی مودبانہ آواز وقت کے گنبد میں گونجتی ہے اور ہاں ۱۹ویں صدی کے سینے کی زخم خوردہ اور ہزیمت نصیب آواز بھی۔

مسافر کا سر تعظیم اور تکریم سے جھک جاتا ہے۔ تاریخ کی تعظیم اور تکریم اور تاریخی تعظیم اور تکریم سے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھی جائے کہ مسافر مذکور شاہوں اور کج کلاہوں کے تخت و تاج کو بُری طرح روندتا چلا آیا ہے۔

مسافر اپنا بایاں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کورنش بجالاتا ہے۔ اسی اثنا میں ایک آواز اس کے دل میں گونجتی ہے۔ ''اور بستی نہیں یہ دلّی ہے'' اور پھر ایک اور آواز ''دلّی کے نہ تھے کوچے اوراق مصوّر تھے'' اس آواز میں ایک اور آواز گڈمڈ ہو جاتی ہے ''دلّی، دلّی ہائے دلّی، بھاڑ میں جائے دلّی'' پھر یہ آوازیں ایک اور آواز کے آہنگ سے اور بھی گھنی ہو جاتی ہیں ''سوادِ رومتہ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے۔''

مسافر کے پیر شل ہو چکے ہیں پھر بھی وہ اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے...... بہ صد اشتیاق اور بہ صد اذیّت آگے بڑھ رہا ہے۔ فیض بازار (دریا گنج) کی طرف۔ وہ بُری طرح ہلکان ہے پر آگے تو جانا ہے، پیروں کو چھالوں سے تو سجانا ہے۔ سو وہ اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا آگے جا رہا ہے کہ اس زندیق، اس دوزخی کی نظر تاریخ کی ایک مقدّس سربلندی، شاہ جہانی مسجد کی دید سے شرف اندوز ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس مسجد میں ماہِ رمضان کے آخری جمعے کی نماز ادا کرنے کا ثواب حج کے ثواب کے برابر ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

اس کی نگاہ میں دُھند پھیل جاتی ہے۔ دُھند اور وقت، خیال کا وقت، یاد کا وقت اور تاریخ کا وقت۔ لمحے سسک رہے ہیں اور مر رہے ہیں اور وقت ماضی میں گزرتا چلا جا رہا ہے۔

شاہ جہانی مسجد کے حوض پر غنی کاشمیری اور ناصر علی بیٹھے ہوئے باہم سخن کر رہے ہیں اور مسافر اپنے لڑک پن کے زمانے میں اپنے گمان کے مطابق ان دونوں کے برابر بیٹھا ہے کہ اتنے میں شعلے کی طرح بھڑکتا ہوا ایک قامت، ایک مردِ قلندر، ایک شاعر سویدائے سرمد حالتِ برہنگی میں ہاؤ ہو کرتا ہوا مسجد کے شمالی دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ غنی کاشمیری اور ناصر علی یک بارگی گنگ ہو جاتے ہیں اور پھر...... اور پھر احترام اور تعظیم کی حالت میں گویا ہوتے ہیں۔

''سرمد، آغا جان چہ گونہ ای، چہ حالت است؟'' کیا حال ہے کیا حالت ہے؟

مخول-۲

سرمد یہ سُن کر ایک لمحے کے لیے ٹھہرتا ہے اور انھیں ان کی بینائی میں شگاف ڈال دینے والی نگاہوں سے، ایک ماجراناک ہنسی ہنستی ہوئی نگاہوں سے گھور کر دیکھتا ہے اور حالتِ حال میں ایک شعر سر کرتا ہے اور ہوا کے حاشیوں میں آگ لگا دیتا ہے۔

دیر یست کہ افسانۂ منصور کہن شد

من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

منصور حلاج کا افسانہ پُرانا ہو چکا ہے۔ میں نئے سرے سے دار و رسن کی جلوہ دہی کروں گا۔"

وہ یہ کہہ کر قہقہہ لگاتے ہوئے، ایک اسرار آگیں اور مہیب قہقہہ لگاتے ہوئے مسجد کے جنوبی دروازے سے باہر نکل جاتا ہے اور ایک سناٹا ہے کہ چھا جاتا ہے۔ لمحے لمحے کی گزران، اُداسی اور افسوس کا سناٹا۔ تاریخِ ہند کی ۱۷ویں صدی کا سب سے اُداس اور پُرافسوس سناٹا۔

مسافر اپنے پونے سات سو برس کے وطن میں مسافر اور اجنبی، اس مقدّس سربلندی کو اذیّت زدہ نگاہ سے دیکھ رہا ہے، دیکھے جا رہا ہے اور پھر بُڑبُڑا اُٹھتا ہے۔

"میں ایک زندیق ہوں، ایک دوزخی ہوں، بالکل اسی طرح جس طرح میرا نام ور بزرگ مرزا نوشہ ایک زندیق اور دوزخی تھا۔ میں نے اور میرے اس بزرگ نے اس مسجد میں کبھی نماز نہیں پڑھی پر میرا دل، مجھ زندیق کا دل اس مسجد کا دعا گو ہے۔"

مسجد کے مناروں کی سربلندی دُھند میں کھو گئی ہے۔ مسافر سر اُٹھائے ہوئے اس

سر بلندی کو ڈھونڈ تا ہے۔ اس کی گردن دُکھنے لگی ہے مگر اپنے دل میں اپنی دلّی میں ایک مسافر، ان گنبدوں اور ان مناروں کو د یئے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے؟

"اے گنبدو اور منارو! تمھارا کوئی بھی متولّی بیسویں صدی کے پہلے دہے سے لے کر دسویں دہے تک کا کوئی بھی متولّی، کوئی بھی بڑبولا متولّی، کوئی بھی سیاست پیشہ متولّی اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے۔" مسافر گریہ ناک آواز میں کلام کرتا ہے۔

"تیرے گنبد، گنبد نیلی فام کے مانند ہمیشہ ہمیش فضا پرور رہیں۔ تیرے مناروں کی سر بلندی اور ارجمندی پر کبھی پستی کی درازدستی کا زور نہ چلے۔ یہ دعا ایک زندیق، ایک دوزخی کی دعا ہے، اپنے صدیوں کے وطن میں ایک بے وطن زندیق اور دوزخی کی دعا۔"

"یہ گنبد اور یہ منارے ایک ہارے مارے، بے تدبیر اور دانش دشمن گروہ کے عہدِ عروج کی وقت آزما یادگار ہیں اور میں جو کوئی بھی نہیں ہوں، وہ "میں" ہارے مارے گروہوں کا غم گسار رہا ہوں۔ میں تاریخ کے ہارے مارے گروہوں کا نوحہ خواں رہا ہوں اور ہوں۔ سو اے گنبدو اور منارو! میں تمھارا ارمیاہ ہوں' تمھارا نوحہ خواں، تمھارا مرثیہ گو"

مسافر اپنے سینے میں کراہنے لگتا ہے۔

مسجد کے مشرقی دروازے کے سامنے کچھ نفوس عدم کی ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان میں سے ایک نفس جب زندہ تھا تو اپنی خطابت کا بے تاثیر اور بے حاصل ہنر دکھایا کرتا تھا۔ اس نے اس مسجد، شاہ جہانی مسجد میں جانے کتنی بار اپنے شوقِ خطابت کی ہوس پوری کی۔

"عزیزانِ گرامی! میرے لیے شاہ جہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع نیا نہیں ہے۔ میں نے اس زمانے میں بھی تم سے یہیں خطاب کیا تھا، جب تمھارے چہروں پر اضمحلال کے بجائے اطمینان اور تمھارے دلوں میں شک کے بجائے اعتماد تھا۔ آج تمھارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند سالوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔"

"تمھیں یاد ہے، میں نے تمھیں یہیں سے پکارا اور تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میرا احساس زخمی ہے۔ سوچو تو سہی، تم کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی

نہیں؟اور کیا تمھارے حواس میں اختلال نہیں آ گیا۔ یہ خوف تم نے خود فراہم کیا ہے۔"

مسافر اپنے سینے میں کراہے جا رہا ہے۔ اس اثنا میں اس کی نگاہ دائیں جانب اُٹھتی ہے۔ دائیں جانب ایک سرخ سنگینی، خم کھائی ہوئی ایک طویل سنگینی سینہ پھیلائے کھڑی ہے اور وقت سے ٹھٹول کر رہی ہے' ایک عالی شان ٹھٹول۔ اور وقت' با جبروت وقت، اس سے ٹھٹول کر رہا ہے۔ ایک با جبروت اور پُر جلال ٹھٹول اور یہ سلسلہ کئی پشتوں سے جاری ہے۔

"نگاہ رُو بہ رُو! نگاہ رُو بہ رُو!"

دربارِ عام کی حضوری، بد بخت حضوری، حاضری اور بدانجام ترین حاضری نسل ہا نسل کے حافظے کا تمسخر بن چکی ہے، ایک بے رحم، بے حد بے رحم اور یک سر بجا تمسخر۔ اگر وقت سے مخول کی جائے گی تو اس کی سزا بھی بھگتی جائے گی۔ انھوں نے وقت سے مخول کی اور اس بات کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا کہ وقت سب سے بڑا مخول کرنے والا ہے۔

دربارِ خاص سے ایک آواز آتی ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

مسافر یہ آواز سُن کر ہنسی کے مارے بے قابو ہو جاتا ہے اور اتنا ہنستا ہے کہ انجام کار رونے لگتا ہے مگر نہ اس کے منہ سے کوئی آواز نکلتی ہے اور نہ اس کی آنکھوں سے کوئی آنسو۔

نفرت

شام ہے اور دل بہت بے آرام ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جذبات کے بارے میں گفت گو ہو رہی تھی۔ نفرت اس گفت گو کا خصوصی موضوع تھی۔ میں نے اس گفت گو سے بہت استفادہ کیا۔

انسان فطرت کی لاکھوں برس کی ریاضت کا حاصل ہے۔ فطرت انسان کی صورت گری کی منصوبہ بندی میں لاکھوں برس تک رَدوبدل کرتی رہی ہے اور تب یہ راست قامت دو پایہ وجود میں آیا ہے۔ میں کبھی کبھی بڑے دُکھ کے ساتھ یہ سوچتا ہوں کہ یہ دو پایہ کس قدر بدبخت جان دار ہے اور بدطینت بھی۔ اس کی بدبختی اور بدطینتی کا سب سے بڑا ثبوت وہ جذبہ ہے جس مجرمانہ ترین جذبے کو نفرت کہتے ہیں۔ یہ جذبہ ایک انتہائی مہلک بیماری ہے اور عجب کا مقام ہے کہ مذہب، علم اور فلسفہ بھی اسے اس بیماری سے نجات نہیں دلا سکے۔ نفرت انسان کی سیرت بل کہ فطرت بن چکی ہے۔

انسان ہونا یعنی اشرف المخلوقات ہونا میرا اپنا انتخاب نہیں ہے۔ یہ تو فطرت کا ایک جبر ہے۔ اگر فطرت میری ماہیت تجویز کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھتی کہ تُو حیوانوں کی کون سی نوع کا فرد بننے کی خواہش رکھتا ہے تو میں شاید یہ کہتا کہ مجھے مور، فاختہ، کبوتر یا قاز بنایا جائے۔ مجھے قازیں بہت ہی پسند ہیں۔ یہ منظر میرے لیے بہت ہی دل کش رہا ہے کہ شام ہو رہی ہے، موسمِ گرما کا صحن ہے اور قازیں مختلف ہندسی شکلیں بناتی ہوئی جنوب سے شمال کی طرف پرواز کر رہی ہیں اور میرے احساسِ وجود کا ایک عجیب سا طور اُن کے ساتھ پرواز کر رہا ہے۔

شاید آپ کا بھی یہ تجربہ ہو کہ قازوں کی پرواز کے دوران نیل گوں فضا میں ایک عجیب سا جمال اور ملال اور ایک عجیب سی ہم آہنگی کا جاوداں آہنگ بہتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

بات نفرت کی ہو رہی تھی۔ نفرت ذہن کی ایک انتہائی بے ہنگم ناہم آہنگی کی مہلک ترین کیفیت ہے۔ یہ انسان کے ذہن کا سب سے زیادہ زہریلا عارضہ ہے۔ نفرت کا تو لفظ ہی ایک بے حد قابلِ نفرت لفظ ہے۔ اس لفظ کا ''نون'' نحوست کا ''نون'' ہے۔ اس لفظ کی ''فے'' فتنے اور فساد کی ''فے'' ہے۔ اس کی ''رے'' رذالت کی ''رے'' ہے۔ اس کی ''تے'' تباہی اور تباہ کاری کی ''تے'' ہے۔

ایک زمانے میں ہیضہ، تپ دق اور چیچک ناقابلِ علاج بیماریاں تھیں اور چیچک تو ہلاکت کی دیوی تھی۔ اسی لیے اسے ''ماتا'' کہا جاتا تھا اور طاعون تو امراض کا ''فرعون'' تھا اور اسے موت کے قہر و جبروت کے دیوتا کی حیثیت حاصل تھی۔ اپنے زمانے کے حکیم جالینوس اور حکیم بقراط اس کے قہر و جبروت کے سامنے عاجز تھے۔ لیکن چند مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر اس عہد کی طبی دانش نے ان بیماریوں پر پوری طرح قابو پالیا ہے۔

یہ بات کتنی اُداس اور مایوس کر دینے والی بات ہے کہ انسانی دانش اپنی تمام تر معجز نمائی کے باوجود سب سے زیادہ مہیب اور مہلک بیماری یعنی نفرت کا علاج کرنے میں آج تک بُری طرح ناکام رہی ہے۔

انسان میں زندہ رہنے کی خواہش کے ساتھ ہی مرنے کا بھی ایک بہت پیچیدہ رجحان پایا جاتا ہے۔ انسانوں کی باہمی محبت زندہ رہنے کی خواہش کی علامت ہے اور ان کی باہمی نفرت مرنے کی خواہش بل کہ مرنے کی شہوت کی علامت۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ محبت زندگی اور زندگی دوستی کا استعارہ ہے اور نفرت موت اور موت پسندی کا۔

یہ ایک قابلِ شرم اور الم ناک حقیقت ہے کہ آج کا انسان بھی اپنے تمام تر علم اور تہذیب کے باوصف طرح طرح کی نفرتوں، غلیظ نفرتوں میں مبتلا ہے۔ لسانی نفرت، نسلی نفرت، مذہبی نفرت، وطنی نفرت اور تہذیبی نفرت۔ ایک زمانے میں یا یوں سمجھ لو کہ دُوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے چند سال بعد تک نفرتوں کی اتنی قسمیں نہیں پائی جاتی تھیں، جتنی

قسمیں آج یعنی علم اور تہذیب کے سب سے زیادہ ارجمند دور میں پائی جاتی ہیں۔ یہ کس قدر حیران کن اور ملال انگیز حقیقت ہے کہ انسان اپنے انتہائی شان دار اوج اور عروج کے عہد میں شاید پہلے سے کہیں زیادہ کٹھل، کٹھور اور سینہ زور ہو گیا ہے۔

سوچنا یہ ہے کہ ان انواع و اقسام کی نفرتوں کو جنم دینے اور پالنے پوسنے والے لوگ کون ہیں۔ وہ لوگ کون ہیں جنھوں نے زبان اور تہذیب کے نام پر مختلف گروہوں کو ایک دوسرے کا جانی دشمن بنا دیا ہے۔ یہاں میں اپنی گفت گو کو پاکستان کے دائرے میں محدود رکھ کر اپنے احساس کا یا اپنے نفس کی اذیّت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

وہ لوگ جنھوں نے زبان اور تہذیب کے نام پر مختلف گروہوں کے درمیان زہرناک نفرتوں کو فروغ دیا ہے، وہ عوام میں سے نہیں ہیں، خواص میں سے ہیں۔ بات کو ہیر پھیر سے کیا کہنا۔ سیدھی سچی اور کھری بات یہ ہے کہ وہ اس بد بخت ترین ملک کے شاعروں، ادیبوں، عالموں اور دانش وروں کے زمرے سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ اس زمرے کے کوئی کم تعداد لوگ نہیں ہیں۔ یہاں یہ بات پوری طرح جان لی جانی چاہیے کہ اس ملک کے عوام (نیز عوام الناس) کا جرم اور جنایت کے اس کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر کہیں یہ لوگ بھی اس کاروبار اور بیوپار میں لگ جاتے تو یہ ملک باقی ہی نہ رہ سکتا۔ یہی تو وہ عالی مرتبت اور سامی منزلت لوگ ہیں جن کا ہر گروہ سے زیادہ احترام کیا جانا چاہیے۔

ایک عام آدمی کا' ایک مزدور، کاری گر اور کسان کا اس بے ہودہ بحث سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ سندھ کی تہذیب زیادہ قدیم ہے یا سمیری تہذیب۔ پہیا بابل کی ایجاد ہے یا عیلام کی۔ آگے چلیے، وارث شاہؒ بڑے شاعر تھے یا شاہ لطیفؒ، میر تقی میر بڑے شاعر تھے یا خوش حال خاں خٹک۔ ہماری تہذیب کے نمایندے صرف اسی قبیل کے افراد کے درمیان موازنہ فرمائی تک محدود نہیں رہتے، ان کی قوم پرستی یا قومیت پرستی کی 'معاملہ فہمی' اس نوع کے بے حد اہم قضیے بھی فیصل کر لینا چاہتی ہے کہ سلطانہ ڈاکو زیادہ جیالا تھا یا مبین ڈاہری؟

تہذیب اور نفرت میں تضاد پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی شخص تہذیب کے تنوّع کی بنیاد پر یعنی تہذیبوں کی گوناں گونی کی نسبت سے انسانوں کے

درمیان تفرقہ پیدا کرتا ہے تو وہ شخص ہرگز دانش ور نہیں ہوسکتا۔ اسے صرف ایک لفندر اور لفنگا سمجھا جانا چاہیے۔ اگر تہذیب اپنے صحیح النسب مفہوم میں تہذیب ہو تو پھر وہ دانش کا ثمرہ ہے اور دانش انسانیت کے رشتے کو جوڑتی ہے، توڑتی نہیں۔ توڑ ہی نہیں سکتی ورنہ اسے دانش نہیں کہا جائے گا۔ پھر وہ بے دانشی ٹھہرے گی اور ہمیں اور تمھیں بے دانشی کے بے ہودہ کیشی اور بے ہودہ کوشی کے خلاف، نفرت کے خلاف فیصلہ کن لڑائی لڑنا ہے۔

سسپنس ڈائجسٹ، نومبر 2007

درمیاں

اس زمانے میں جہاں اور بہت سے بھونڈے اور بے ہودہ تعصبات نے فروغ پایا ہے، وہاں سنّی اور شیعہ تعصّب کو بھی روزافزوں ترقی نصیب ہوئی ہے۔ یہ وہ تعصّب ہے جس نے مسلمان معاشرے کو شدید ترین نقصانات پہنچائے ہیں۔ ہمیں سیاسی اور مصلحت پسندانہ اندازِ بیاں سے پرہیز کرتے ہوئے پوری تاریخی حقیقت پسندی کے ساتھ یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ یہ مردود اور مطرود تعصّب چودہ صدیوں سے جاری ہے۔ بس یہ ہے کہ یہ کبھی مغلوب رہا اور کبھی غالب۔ جب غالب ہوا ہے تو وہ حوادث ظہور میں آئے ہیں جن کو یاد کر کے دل کانپ اُٹھتے ہیں اور آنکھیں خونابہ فشاں ہو جاتی ہیں۔

اس وقت ایک سلسلۂ خیال ہے کہ جاری ہے۔ اس سلسلۂ خیال کے دوران مجھے اچانک ''قدیم مسلم لیگ'' کا خیال آ گیا ہے۔ مسلم لیگ کی تحریک کے بارے میں برِصغیر اور برِصغیر کے باہر کے سیاسی مفکّرین نے متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن ایک بات کو سب نے تسلیم کیا ہے اور وہ بات یہ ہے کہ قدیم مسلم لیگ یا یوں کہہ لیجیے کہ تقسیمِ ہند سے پہلے کی مسلم لیگ، پاکستان ساز مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی سب سے نمایندہ جماعت تھی۔

یہاں یہ حقیقت بھی قابلِ ذکر ہے کہ مسلمانوں کی متعدد تنظیموں نے مسلم لیگ کے مزاج اور کردار سے شدید اختلاف کیا۔ اختلاف کرنے والی ان تنظیموں میں ایسی متعدد شخصیتیں بھی شامل تھیں جنھیں برِصغیر کے مسلمان معاشرے میں سیاسی طور پر تو مقبولیت حاصل نہ ہو سکی مگر اس واقعیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ برِصغیر میں مسلمانوں کی تہذیب کے نمایندوں کی حیثیت سے مسلم لیگ میں دو ایک شخصیتیں ہی ان کے مقابلے میں لائی

جا سکتی ہیں۔ یہاں میں ان دو ایک شخصیتوں کے نام یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پہلی شخصیت......؟ علامہ اقبال، دوسری شخصیت......؟ مولانا حسرت موہانی، تیسری شخصیت......؟ مولانا ظفر علی خاں۔

مسلم لیگ سے اتفاق رکھنے والے ہی نہیں اختلاف کرنے والے بھی مختلف توجیہات کے ساتھ اس واقعیت کو تسلیم کرتے ہیں کہ مسلم لیگ نے آزادی سے پہلے کے چند سال کی مدّت کے دوران مسلمانانِ ہند کے مختلف فرقوں کی اکثریت کے درمیان ایک یادگار اتحاد پیدا کرنے میں مثالی کام یابی حاصل کی۔

۱۹۳۸ء میں سنّیوں اور شیعوں کے درمیان ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے زیادہ لچر اور پوچ مگر سب سے زیادہ گھمبیر تصادم کا ایک انتہائی جاہلانہ سلسلہ وقوع میں آیا۔ اس سلسلے میں جو بات سب سے زیادہ افسوس ناک ہے وہ یہ ہے کہ شمالی ہند کا سب سے زیادہ نفیس، لطیف اور شایستہ شہر لکھنؤ اس بے ہودہ ترین تمثیل کا اسٹیج قرار پایا۔ وہ لکھنؤ جو شیعہ و سنّی عوام اور خواص اور شیعہ اور سنّی علما، فضلا اور شعرا کے دلی رشتوں اور جذبوں کا ایک عجب پُر فضا شہر رہا تھا۔ یہاں مجھے لکھنؤ اسکول کے ایک معتبر ترین اور محترم ترین شاعر لسان القوم حضرت صفی لکھنوی کی نظم کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ یہ نظم بدنصیب سنّیوں اور بد بخت شیعوں کے باہمی رشتے کے موضوع پر لکھی گئی تھی۔ وہ شعر یہ ہے

پردہ ہائے ساز رنگا رنگ تھے
چھیڑ دے کوئی تو ہم آہنگ تھے

میں نے کہیں پڑھا تو نہیں مگر اپنے مردان خانے میں سُنا ہے کہ لکھنؤ کے اِن سنّی اور شیعہ فسادات کے زمانے میں ایک فرقے نے مولانا ابوالکلام آزاد سے یہ خواہش کی کہ وہ اپنے خاندانی مسلک کی تائید و حمایت کے لیے میدان میں اُتر آئیں اور ایک فرقے نے قائداعظم کو توجہ دلائی کہ وہ اپنے ''جذبۂ ایمانی'' کا ثبوت دیں اور اس معرکے میں حصّہ لیں مگر مولانا ابوالکلام آزاد اور قائداعظم نے اپنے اپنے ان ''ہم مسلکوں'' کو جھڑک کے لوٹا دیا۔

۱۹۳۸ء کے وہ سنّی شیعہ بلوے جن کو افغانستان تک محسوس کیا گیا تھا، مسلم لیگ کی غیر فرقہ وارانہ تحریک کی کارگزاری کے باعث ۱۹۳۹ء تک بھولی ہوئی کہانی بن چکے تھے۔ مسلم لیگ کی اس اثریت کے اسباب کیا تھے؟ یہ موضوع ایک مفصّل معاشی، سماجی اور سیاسی توجیہ کا متقاضی ہے۔ یہاں ۱۹۳۸ء کے ان بلووں کے بارے میں یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ ان میں بات سر پھٹول اور چاقو زنی کے چند واقعات سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ ہاں گرفتاریاں پیش کرنے کے لیے ہزاروں لوگ ہندوستان کے بعید ترین حصّوں سے لکھنؤ پہنچے تھے۔

مسلم لیگ کی کارگزاری کے زیرِ اثر تقریباً گیارہ بارہ برس تک سنّی شیعہ اتحاد کی ایک ایسی فضا قائم رہی اور یہ دونوں اس انداز سے شانہ بہ شانہ رہے جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں کم ہی ملے گی بل کہ شاید نہ ملے۔ ظاہر ہے کہ مسلم لیگ سے میری مُراد پاکستان ساز مسلم لیگ ہے۔ آج وہ مسلم لیگ باقی نہیں ہے جس نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی اکثریت کے دائرے کی حد تک ایک غیر متعصب کردار ادا کیا تھا لیکن اس کا غیر فرقہ وارانہ طرزِ سیاست ہمارے لیے ایک انتہائی شان دار نمونے کی حیثیت رکھتا ہے اور آج کے سنّی شیعہ تعصب کی زہریلی فضا میں ایک نسخۂ شفا ثابت ہوسکتا ہے۔

یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھی جائے کہ مسلمان تاریخ کے سب سے درخشندہ اور تابندہ معاشرے وہ تھے جو سنّیوں اور شیعوں کے مشترکہ معاشرے تھے۔ بغداد کا معاشرہ اس حقیقت کی سب سے زیادہ درخشندہ مثال ہے۔ سنّیوں اور شیعوں کے اس عظیم الشان معاشرے کو کس نے تباہ کیا، زوالِ بغداد جس پر شیخ سعدیؒ خون کے آنسو روئے تھے، کس بات کا نتیجہ تھا؟ تو سُنیے کہ سنّی اور شیعہ تعصّب کا اور ان خوں ریز فسادات کا جو محرم میں ہوا کرتے تھے۔ آخر کار محرم کے مہینے کے ایک خوں ریز فساد کے نتیجے میں بغداد کا کام تمام ہو گیا۔ آخر میں مجھے یہ عاجزانہ گزارش کرنا ہے کہ سنّی اور شیعہ تعصّب کو سر اُٹھانے کی قطعاً مہلت نہ دی جائے، قطعاً اور اس بات پر ایک تاریخی فیصلے کی طرح عمل کیا جائے۔ تاریخ کی حقیقتوں کے درمیان یہ ایک ناگزیر فیصلہ ہے۔

تمھارا شکریہ

نشیان، سحر البیان!

تم نے سُنا جون ایلیا مر گئے۔

کیا کہا، جون ایلیا مر گئے؟

ہاں، ہاں...... ہاں، جون ایلیا مر گئے۔

لیکن تمھیں یقین کیوں نہیں آرہا "نشیان، بلیغ البیان!" کیا میں اتنا بڑا اور احمقانہ جھوٹ بول سکتا ہوں؟ کیا میں تم سے ٹھٹول کر رہا ہوں؟ نہیں نشیان، نہیں۔ نہ یہ مخول ہے نہ ٹھٹول! یہ حقیقت ہے۔ بیّن اور ٹھوس حقیقت۔ جس سے نہ منہ موڑا جا سکتا ہے اور نہ انکار کیا جا سکتا ہے۔

اچھا! چلو میں تمھاری اس دل پذیر تقریر پر اعتبار کر لیتا ہوں۔ میں مان لیتا ہوں کہ تم سچ بول رہے ہو۔ ممکن ہے کہ تم سچ ہی بول رہے ہو۔ "شاید" تم سچ ہی بول رہے ہو۔ اچھا بھئی، تم یقیناً سچ بول رہے ہو، اب اگر ایسا ہی ہے "یعنی" یہ کہ تم سچ ہی بول رہے ہو تو سُنو، ذرا غور سے سُنو!

اب تم بول چکو اور میری بات سُنو، آج صرف میں بولوں گا، صرف میں۔ اس لیے کہ جون ایلیا تو مر گئے۔ ان کے سامنے تو میں کیا، کوئی بھی بول ہی نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا ان کی موجودگی میں چُپ رہ رہ کر میرا سینہ جہنم بن چکا ہے۔ میرے اندر ایک آگ لگی ہوئی ہے اور میں...... اور میں آج اس آگ کو بُجھا کر ہی دم لوں گا اور اس آگ میں تم کو جَلا کر ہی دم لوں گا۔

اب تم انتہائی خاموشی! جاں گُسل خاموشی کے ساتھ سُنو۔

تم نے کہا کہ "جون ایلیا مر گئے" یہی کہا ہے نا؟ دیکھو، اپنے بیان سے پھر مت جانا کہ آج دنیا کا یہی چلن ہے اور تم...... تم ہی تو دنیا ہو یا "شاید" دنیا تم ہو۔ بہ ہر صورت تم جو کوئی بھی ہو، بس ہو۔ لہٰذا سُنو۔

میں نشیان، سحر البیان پوری دنیا کو، پورے اُردو گلوب کو آج یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جون ایلیا نہیں مرے۔ آج کے بعد کوئی یہ لفظ اپنی لَپ لَپاتی زبان سے ادا نہ کرے کہ جون ایلیا مر گئے ورنہ گدّی سے اس کی زبان کھینچ لی جائے گی۔

کیوں...... نشیان، کیوں؟ آخر اس حقیقت کی حقیقت سے انکار کیوں؟ میرا خیال ہے کہ تم جون ایلیا کی محبت میں جذباتی ہو رہے ہو۔

خاموش! لَب کشائی کی جرأت مت کرو۔ دریدہ دہن انسان خاموش!

اگر حوصلہ ہے تو سُنو ورنہ دفع ہو جاؤ۔ میں یہ کبھی نہیں مان سکتا کہ جون ایلیا مر گئے۔ اس لیے کہ اگر میں یہ مان لوں تو پھر تمھیں جو کچھ ماننا پڑے گا تم اس کے لیے ہرگز ہرگز تیار نہیں ہو گے۔

کیا کہا؟ تم سب کچھ ماننے کے لیے تیار ہو، اچھا تو پھر سُنو۔

اگر میں یہ مان لوں کہ جون ایلیا مر گئے تو پھر تمھیں یہ ماننا پڑے گا کہ آج ایک سقراط مر گیا، ہومر مر گیا، تاسیس ملیٹی! ہاں، وہ بھی گیا۔ ارسطو، وہ بھی۔ ہاں، ہاں...... ہاں! ابنِ مسکویہ، فارابی، ابنِ رشد، بوعلی سینا، طوسی، خیام، سعدی، عرفی، رومی، نطشے، برٹرینڈ رسل، برنارڈ شا سمیت یہ سب مر گئے۔ ایک پوری کی پوری بستی فنا کے گھاٹ اُتر گئی۔

پڑ گئیں نا شکنیں پیشانی پر؟ تو کیا میں ڈر جاؤں گا!

نہیں مربی نہیں۔ میں بہت ڈر لیا۔ اب مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ جب جون ایلیا مر گئے تو اب مجھے موت کا کیا ڈر۔ سُنو، اب تو جہنم ہی سُنو!

جون ایلیا مرے نہیں ہیں۔ میں بار بار یہی کہتا رہوں گا کہ جون ایلیا نہیں مرے۔ ہاں میں یہ مان لوں گا کہ جون ایلیا ہار گئے۔

مربی، اب تم پھر ادبی جملہ بولو گے کہ جون ایلیا موت سے ہار گئے لیکن ایسا بالکل نہیں ہے مربی!

پیارے نشیان، ذرا دم لے لو، تمھارا سانس پھول چکا ہے۔ اک ذرا دم لے لو۔ یہ لو! یہ دو گھونٹ پانی پی لو۔

میں پانی پی کر بھی آج تمھارا شکریہ ادا نہیں کروں گا۔ اور تمھارا یہ پانی!...... یہ چند گھونٹ میرے لیے، میرے اندر کے جہنم کے لیے قطعاً بے کار اور نا کافی ہیں۔

سُنو......اور صرف سُنو! تم نے صرف ایک ہی فن سیکھا ہے اور وہ ہے خوشامد۔ میری خوشامد مت کرو۔ مجھے پانی مت پلاؤ بس اگر ہو سکے تو صرف سُنو!

جون ایلیا زندگی سے نہیں ہارے بل کہ وہ تمھاری دنیا سے ہارے ہیں۔ خوشامد سے ہارے ہیں۔ فریب سے ہارے ہیں۔ دغابازی سے ہارے ہیں۔ نمک حرامی سے ہارے ہیں، احسان فراموشی سے ہارے ہیں۔ وہ تو تم سے ہارے ہیں، مربی! تم سے۔

بس چند جملے اور سُن لو مربی! اور ذرا کلیجے کو تھام لو کہ میں اب ان لوگوں کے نام لینے والا ہوں جن سے جون ایلیا ہار گئے ہیں۔

جون ایلیا! تنہائی اور بے وفائی سے ہارے ہیں۔

جون ایلیا! علمی بونوں سے ہارے ہیں۔

جون ایلیا! اپنے خون سے ہارے ہیں۔

جون ایلیا! اپنی ثقافت سے ہارے ہیں۔

جون ایلیا! اپنی روایت سے ہارے ہیں۔

یہ ہیں جون ایلیا کے قاتل۔

مربی، اب اگر تم ان ناموں سے واقف نہیں ہو تو یہ تمھاری کم علمی اور سہل پسندی ہے۔ اک ذرا سی کوشش کرو تو تم ان چہروں سے بھی آشنا ہو جاؤ گے۔

جاؤ مربی، جاؤ۔ اپنے اس جہنم میں دفعان ہو جاؤ جو تم نے خود تیار کیا ہے۔ ہو جاؤ مگن دنیا میں......لیکن یاد رکھو، جون ایلیا کے یادگاری جلسوں میں کہا جانے والا یہ لفظ بے معنی ہے

کہ ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جو تادیر پُر نہیں ہو گا۔ کوئی خلا پیدا نہیں ہوا۔ یہ مان لو، نہیں مانتے...... کیا کہا، نہیں مانتے؟ دیکھو، سوچ لو۔ اگر نہیں مانو گے تو پھر تمھیں میرے اس جملے سے مکمل اتفاق کرنا پڑے گا اور یاد رکھو، پھر یہ جملہ تمھارا مقدر ہو جائے گا۔ وہ مقدر جس کو تم بدل نہیں سکو گے۔

اور وہ جملہ یہ ہے کہ آج ادب، تاریخ، فلسفے، منطق اور ذہن و زبان و ثقافت کا ایک مکمل دور ختم ہو گیا ہے۔ خلا...... کیا کہا خلا... ہاں یاد آیا، مربی! تم نے خلا کی بات کی تھی۔ بھائی، تم جس خلا کی بات کر رہے ہو، وہ خلا تو جون ایلیا کی زندگی ہی میں پُر ہو گیا تھا۔

نشیان! پیارے، راج دُلارے...... یہ کیسے ممکن ہے، یہ خلا کس نے پُر کیا؟ کیسے ہوا، بھلا کیسے؟ یہ اَن ہونی، یہ ناممکن...... ناممکن ہے۔

نہیں مربی! نہیں، تمھاری دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے لیکن تم نہیں مانو گے۔ تم کیسے مان سکتے ہو۔ بھلا کہیں اندرائن کے پیڑ میں بھی انگور کے خوشے لگے ہیں۔ اچھا! تم نہیں مانتے، چلو...... میں مان لیتا ہوں۔ تو پھر سُنو کہ یہ خلا تمھارے بونوں نے جون ایلیا کی زندگی ہی میں پُر کر دیا تھا۔

پھر وہی نہیں!

ہاں نشیان! نہیں، نہیں، نہیں......

اچھا مربی! تو پھر آج ہم اور تم اس بات کو آخری فیصلہ قرار دیتے ہیں کہ یہ خلا کبھی، کبھی، کبھی...... پُر نہیں ہوگا۔ کیا تم اس بات سے اتفاق کرتے ہو مربی! اگر ہاں تو پھر تمھارا شکریہ مربی، ڈھیروں شکریہ!



”ہم ایک ہزار برس سے تاریخ کے دسترخوان
پر حرام خوری کے سوا اور کچھ نہیں کر رہے۔“

جون ایلیا